TIGHT BINDING BOOK



مخزن

نِت نئے نظارے

(۵) سلہ

وینس کی مشہور عمارت میں تاریخی دلچسپی کے لحاظ سے کوئی عمارت ڈوجز کے محل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ سیاح جب کشتی پر سوار ہو کر بڑی نہر کے رستے شہر کیطرف آتا ہے تو اسی محل کی خوبصورت دیوار پہلے دامنِ دلکو کھینچتی ہے۔ اس محل کے در و دیوار نے خوشی اور غم کے کیا کیا تماشے نہیں دیکھے۔ اسی میں وہ بڑے بڑے ہال ہیں جہاں وینس کے عروج کے دنوں میں یہاں کے حکمران مجالس شوریٰ کر کے قرب و جوار کی قسمت کے فیصلے کرتے تھے۔ اور انکے پاس بڑی بڑی سلطنتوں کے سفیر آکر باریاب ملازمت ہوتے تھے اور اسی میں وہ تیرہ و تار تہ خانے اور کوٹھریاں ہیں جہاں بعض بدنصیب قیدی دھکیل دیئے جاتے تھے۔ اور باقی عمر کے لیئے ایسے گم ہو جاتے تھے کہ گویا کبھی دنیا میں آئے ہی نہیں۔ اِس محل کی زندگی ققنس کی سی زندگی رہی ہے کہ یہ بار بار راکھ ہو کر پھر پیدا ہو گیا ہے اسکی بنیاد سنہ ۸۲۰ء میں ڈالی گئی۔ اُس دن سے آجتک پانچ دفعہ آتشزدگی اور دیگر حوادث سے خاک کا ڈھیر ہوا اور پھر بنا اور ہر مرتبہ نئی شان سے بنا۔ اِسکے ہال اور کمرے فنِ تصویر کے قدیم اُستادوں کی صنعت سے آراستہ تھے۔ مگر سنہ ۱۵۷۷ء میں جو آگ لگی اِسمیں وہ سب تصویریں جل گئیں۔ لیکن اُسوقت سے آجتک جو مشہور استادانِ فن اٹلی میں گزرے ہیں اُنکے کمال کے نمونے اب بھی اِس محل کی زینت ہیں۔ ہر اتوار کو

سلہ اِس سلسلہ کا چوتھا نمبر نومبر سنہ ۱۹۰۸ء کے مخزن میں شائع ہو چکا ہے ۔

اور دوسری تعطیل کے دنوں میں اسکے اندر جانے کی عام اجازت ہوتی ہے اور داخلہ کا ٹکٹ معاف ہوتا ہے۔ باقی ایام میں فیس داخلہ دینی پڑتی ہے جو کوئی بارہ آنہ کے قریب ہوتی ہے محل کے اندر داخل ہونیکے کئی دروازے ہیں مگر سب میں بڑا دروازہ پورٹا ڈلا کارٹا کے نام سے مشہور ہے۔ پورٹا اطالیہ میں وہی لفظ ہے جو انگلستان میں پورٹ یعنی دروازہ یا باب ہے۔ کارٹا بمعنی کارڈ (کھلا خط یا اعلان) ہے۔ گویا اسکا نام باب الاعلان ہے۔ کیونکہ ایک زمانے میں حکومت جمہوری کے سب احکامات اعلان کے طور پر اس دروازے پر اطلاع عام کے لیئے چسپاں کر دیئے جاتے تھے ؎

اس دروازہ سے داخل ہوتے ہی وسیع صحن آتا ہے۔ جسکے گرد دو منزلہ محراب دار دالان ہیں۔ وسط صحن میں دو کنوئیں ہیں۔ جہاں اکثر عورتیں پانی بھرتی نظر آتی ہیں کیونکہ اس کنوئیں کا پانی وینس بھر میں اچھا ہے۔ ہندوستان سے ملتی جلتی رسم بھی سوائے اٹلی کے شاید کسی اور حصہ یورپ میں نظر نہیں آ سکتی ؎

محل کے کمروں تک پہنچنے کے لیئے ایک بڑے زینے پر چڑھنا ہوتا ہے۔ جسے بلحاظ ان بڑے بتوں کے جو زینے کے خاتمہ پر بنے ہوئے ہیں زینۂ دیوزادان کہتے ہیں جس زمانہ میں ڈوج کا انتخاب ہوتا تھا تو ہر نیا ڈوج اسی زینے پر کھڑا ہو کر اپنے عہدے کے نشان اور لباس پاتا تھا۔ اسکے بعد ایک مذہبی رسم میں شریک ہو کر چند آدمیوں کے کندھوں پر سوار ہو کر پیازا کا چکر لگاتا تھا اور بعد ازاں محل کے اندر متمکن ہو جاتا تھا۔ اسی زینہ پر ۱۴۵۷ء میں بوڑھا ڈوج فوسکاری غم واندوہ کے مارے غش کھا کر گر پڑا جب اسے تیس سال محل کے عیش و آرام میں گزرنے کے بعد نکالا گیا۔ زینہ کے بائیں طرف ایک سرخ عمارت ہے جسمیں سلویو پیلیکو نامی شاعر محبوس رہا تھا۔ دائیں طرف ایک مسقف رستہ ہے جسمیں مشہور اُمرا علماء اور فضلاء کے بسٹ رکھے ہیں۔ ان میں گلبیو

سلہ ۵ھ عیسوی جس میں نصف ضمون لکھایا گیا ہو ۱۲

موجود ہیں اور مارکو پولو کے بسٹ قابل ذکر ہیں ۔

آگے زینۂ زرّیں آتا ہے۔ اسے صرف اس لیے زرّیں کہتے ہیں کہ جمہوری حکومت کے زمانے میں فقط وہ اُمرا، اس زینہ کے استعمال کرنیکا حق رکھتے تھے جن کے نام کتاب زرّیں میں درج ہوں۔ اور کتاب زرّیں ایک قسم کا سرکاری رجسٹر تھا جس میں تمام اُمرا کے نام لکھے رہتے تھے۔ اور اُنکے ہاں کی پیدایش۔ موت اور شادی برابر اس میں مندرج ہوتی تھیں ۔

کونسل کا ہال نہایت عالیشان ہے۔ ۱۷۵ فٹ لمبا اور ۸۵ فٹ چوڑا ہے۔ اس میں تمام وہ اُمرا، جنکے نام کتاب زرّیں میں درج تھے بہ حیثیت مشیران حکومت اسمیں بیٹھتے تھے۔ چاروں طرف دیواروں پر چھہتر ڈوجز کی تصویریں ہیں جو ایک بڑے نامور استاد کی بنائی ہوئی ہیں۔ یہ تصویریں تاریخوار ترتیب میں ہیں۔ ممکن ہے کہ سیّاح کی نظر سے یہ بات رہ جائے کہ تصویروں کے مجموعے میں ایک جگہ خالی ہے۔ جہاں بجائے تصویر کے لاطینی عبارت لکھی ہوئی ہے جسکا مفہوم یہ ہے :- "یہ جگہ میرینو فلیرو کی تھی جو جرم کی وجہ سے مقتول ہوا" اسکا قصہ یہ ہے کہ فلیرو ایک مغلوب الغضب امیر تھا۔ ایک دفعہ ایک پادری نے اسے دیر تک تکلیف انتظار دی۔ اور اُسنے غصہ میں آکر پادری کو ایک مکا مارا۔ پادری اُسوقت تو چپ رہا۔ مگر کینہ اُس کے دلمیں رہا۔ ۱۳۵۴ء میں بڑھاپے میں یہی فلیرو وینس کا ڈوج منتخب ہو گیا۔ اور اُسنے ان دنوں میں ایک شخص سٹینو نامی پر ناراض ہو کر اُسے دھکے دلوا دیئے۔ سٹینو نے کچھ ہتک آمیز الفاظ ڈوج کے تخت پر لکھدیئے۔ جب یہ حال معلوم ہوا تو یہ قضیہ کونسل کے روبرو پیش کیا گیا اور سٹینو کو ایک سال کی جلاوطنی اور دو سال کی قید کی سزا ہوئی۔ اسکے بعد ایک امیر البحر کا مقدمہ فلیرو کے سامنے آیا۔ جسنے شکایت کی تھی کہ ایک امیر باربیرو نامی نے اسے مارا ہے۔ فلیرو کو رنج تھا کہ کونسل نے سٹینو کو کچھ سخت سزا نہیں دی۔ بگڑ کر امیر البحر سے کہنے لگا۔" میں تمھاری کیا مدد

کروں۔ خود مجھے سٹینو نے کیسی گالیاں دیں۔ اِسپر کونسل نے اُسے کیا سزا دی" امیر البحر نے جواب دیا۔" حضور افسوس ہی کہ آپ نام کو تو حاکم ہوں اور حکم دوسروں کے اختیار میں ہو۔ اگر آپ یہاں کے حاکم خود مختار ہونا چاہیں تو میں اپنی ہمت اور دلاوری سے اس کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ ان سرکش اُمرا کو جو آپ کی کونسل کے رکن ہیں تہ تیغ کر کے آپ کو خود مختار بنا دوں گا" فلیرو نے اس رائے کو پسند کیا۔ اور وہ دونوں چند اَور آدمیوں کو اس سازش میں شریک کر کے سارے اُمرا کے قتل کا مشورہ کرنے لگے۔ مگر اتفاق سے یہ راز کھل گیا۔ فلیرو قید کر لیا گیا۔ اور آدھی رات کے قریب کونسل کے روبرو لایا گیا۔ حال جرم ثابت قرار دیا گیا۔ اور قتل کا حکم ہوا۔ اور دوسرے دن وہ محل ہی میں قتل کر دیا گیا۔ شہر میں یہ سب حال معلوم ہو چکا تھا۔ ہزاروں آدمی نتیجہ کے انتظار میں باہر کھڑے تھے کہ اُمرا میں سے ایک شخص خون آلودہ تلوار ہاتھ میں لیئے گیلری میں نکلا اور گروہ عوام کو دکھا کر بولا۔ وہ غدار جسنے اپنے ملک کے ساتھ بے وفائی کا عزم کیا تھا اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا ہے" اسپر محل کے دروازے کھولدیئے گئے۔ اور سب نے اپنی آنکھوں سے بوڑھے مقتول ڈوج کا چہرہ دیکھا اور عبرت حاصل کر کے گھروں کو چلے گئے ؞

بڑے ہال کے بعد جو ہال خصوصیت سے دلچسپ ہے وہ ووٹ گھر ہے یعنی جہاں انتخاب کے موقع پر رائے لیجاتی تھیں۔ اس کمرے میں ارکین کونسل کا انتخاب ہوتا تھا اور یہ ارکین اسکے بعد ڈوج کو نامزد کرتے تھے۔ انتخاب کے متعلق یہ امر قابل ذکر ہے کہ گو اس محل کے کمروں میں عام طور پر سوائے ارکین اور خاص اُمرا کے کسی کا دخل نہیں ہوتا تھا لیکن انتخاب کے دن یہاں آنے کی عام اجازت ہوتی تھی۔ اور خواہ کتنا ہی راز کا معاملہ ہو جسپر رائے لیجا رہی ہو۔ پھر بھی بیرونی لوگوں کو اجازت ہوتی تھی کہ یہ دیکھنے کے لیئے کہ کارروائی ٹھیک حسب ضابطہ ہوتی ہے۔ چپکے سے اپنا چہرہ چھپا کر وہاں آ بیٹھیں۔ رائے بیلٹ کے طریق سے لیجاتی تھی۔ یعنی ایک کا حال دوسرے کو معلوم نہ ہو اور ہر شخص آزادانہ رائے

دے سکے۔ تین بڑے بڑے برتن اس کمرے میں رکھے رہتے تھے۔ ایک سفید جسمیں موافق رائیں اور ایک سبز جسمیں مخالف رائیں ڈالی جاتی تھیں۔ اور ایک سُرخ جسمیں وہ لوگ اپنے پرچے لکھکر ڈال دیتے تھے جو کسی طرف رائے نہ دینا چاہتے ہوں۔

ایک بڑا کتب خانہ بھی اس محل میں ہے۔ جسمیں ایک لاکھ بیس ہزار مطبوعہ کتابیں اور دس ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ کتب خانہ کے مقابل اشیائے قدیمہ کا عجائب گھر ہے۔ اسکے ایک کمرہ میں اُن ممالک کے نقشے ہیں جنکی سیاحت مارکو پولو اور دیگر وینیسی سیاحوں نے کی۔ ایک نقشہ دنیا ہے جو سنہ ۱۴۵۷ء اور سنہ ۱۴۵۹ء کے درمیان تیار ہوا ہے۔ اِسوقت کی معلومہ دنیا اسمیں دکھائی گئی ہے۔ اسمیں ایک کرۂ ارض دل کی صورت کا ہے جو وینس والوں کو ایک ترکی عجائب خانہ سے ملا تھا۔ اور ٹیونس کے ایک صناع حاجی محمد نامی کا بنایا ہوا ہے ۰

عجائب گھر سے واپس آئیں تو محل کی بالائی منزل پر چڑھنے کا زینہ ملتا ہے۔ اوپر کے کمرے بھی خوش وضع ہیں۔ اور آرایش میں نیچے کے کمروں سے کسیطرح کم نہیں۔ دس کی کونسل کا کمرہ ان میں خصوصیت سے ذکر کے قابل ہے۔ وینس میں دو کونسلیں تھیں ایک جو چالیس کی کونسل کہلاتی تھی۔ اور دوسری اس سے زیادہ با اثر مجلس خاص جو دس کی کونسل کہلاتی تھی۔ اس کمرے میں اِس مجلس خاص کا اجلاس ہوتا تھا اس مجلس تک شکایات یا اطلاع پہنچنے کا یہ طریق تھا کہ کمرے کی ایک دیوار میں بڑا سا سوراخ کر کے اسمیں شیر کا مُنہ لگا دیا تھا۔ اور شکایات تحریری اُس مُنہ میں پھینک دی جاتی تھیں اور اسی ذریعے سے کونسل اپنے جابرانہ اور اٹل احکام شائع کرتی تھی۔ یہ شیر کا مُنہ اُس زمانہ میں بہت مقبول تھا۔ سنگ مرمر کا سر اور جبڑے کھُلے ہوئے ہر محلہ کے دروازے پر موجود تھا اور جیسے شیر کے مُنہ میں جانیوالے کی جان کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ اسیطرح جو اس شیر کے مُنہ میں جاتا تھا شکار اجل ہوجاتا تھا۔ شکایات تحریری ہوں یا زبانی مسافر کے

خلاف ہوں یا مقیم کے دستخط کے ساتھ ہوں یا گمنام۔ سب شیر کے منہ میں ڈالی جاتی تھیں۔ کسی بدنصیب پر الزام کا لگنا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ پکڑا جائے۔ پکڑا جانا یہ معنی رکھتا تھا۔ کہ اُسے سزا کا حکم ہو۔ سزا کا حکم یہ معنی رکھتا تھا کہ اُسکا خاتمہ ہوا۔ پھر کوئی نہیں سُنتا تھا کہ وہ کون تھا اور کہاں گیا۔ بس وہ غائب ہو جاتا تھا۔ کسی گھر میں سے اچانک ایک آدمی ندارد۔ کسیکو خبر نہیں کہ کہاں ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ پوچھے کہ کیا ہوا۔ بعض اوقات آدھی رات کو چلتے چلتے کسی کے کان میں آدمی کے پانی میں گرنے کی آواز آتی سہم کر اور دم بند کرکے وہ سُنتا مگر پھر دوسری آواز نہ آتی۔ اور وہ ڈرتا ہوا اپنی جان لیکر چُپ چاپ آگے چل دیتا۔

عبدالقادر

غزل فارسی

نسیم صبح بہار حتم بجاں برساں — پیام بندہ بہ آں خاک آستاں برساں
وفورِ شوق شکیبائی تواند شد — روا مدار درنگ و ہمیں زماں برساں
متاع جاں و ہم ار پے عزدمی خواہی — وگرنہ لطف بفرمائے رائگاں برساں
حدیث شوق نہ چنداں کہ در بیاں گنجد — اگر نہ جملہ تواں انچہ می تواں برساں
تصرفے مکن از پیش خود در و چیزے — چناں کہ من بتو گویم تو ہمچناں برساں
بہ آستانۂ او سر نہ و ز روے ادب — درود گوی و دعایم زماں زماں برساں
بگو کہ بر طبق وعدہائے پے در پے — بپاؤ مرتبہ من بہ آسماں برساں
سلام شوق و تمنا ز بندہ نعمانی — بہ ساکنان دراو یگاں یگاں برساں

شبلی

ایک مقدّس گروپ

آج ورقِ اول پر جو تصویر شائع ہوئی ہے وہ ایک پُرانی دستی تصویر کا عکس ہے اور ہم اسلیئے اسکو شائع کرتے ہیں کہ وہ دستی تصویر جسکی نقل ہے عجائبات میں شمار ہوتی ہے کیونکہ شاہی عجائب گھر سے ملی ہے۔ ورنہ اِس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ مسلمان تصویر سے عموماً پرہیز کرتے رہے ہیں۔ اور اس بات کے باور کرنیکی کوئی وجہ نہیں کہ بزرگان اسلام جن کی تصویریں کہیں کہیں ملتی ہیں خود بھی تصویر کھنچوانے بیٹھے ہوں۔ ان تصاویر پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ تاہم اِن سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک یہ کہ باوجود عام طور پر فنِ مصوری کی بے رواجی کے ہندوستان اس فن سے خالی نہیں رہا۔ اور دوسرے یہ کہ جو حلیے ان بزرگوں کے کتب سیر میں ملتے ہیں اُن سے ایک حد تک یہ تصویریں مطابقت رکھتی ہیں۔ گو ہر شخص کا تخیل ایک ہی حلیے کے متعلق جداگانہ ہوتا ہے۔ فوٹو جس سے یہ تصویر لیگئی ہے ہمیں جناب نقی محمد خانصاحب سب انسپکٹر پولیس الہ آباد نے ارسال فرمایا ہے۔ اور اُسکے ساتھ مندرجہ ذیل خط لکھا ہے:۔

"یہ گروپ میرے ایک دوست مرحوم نے کچھ عرصہ ہوا مجھے عنایت کیا تھا۔ اور اُسکے واقعات تحقیق کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا کرتے تھے کہ "یہ تصویر ایک زمانہ میں لکھنؤ میں واجد علی شاہ کے میوزیم میں رکھی تھی۔ اور وہاں سے علیحدہ ہو کر زمانہ کی گردش کے ساتھ اکثر خاندانوں میں تبرکاً منتقل ہوتی رہی اور اس طرح بعد کوشش سے مجھ تک پہنچی ہے"۔"

افسوس کہ اُسپر مصور نے کوئی تاریخ نہیں لکھی جس سے اُسکی قدامت کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔ تصویروں میں سے کسی کی شباہت اصلی یا نقلی ہونے کی بحث اگر علیحدہ کردی جائے تو پچھلے زمانہ کی دستکاری کا ایک اچھا نمونہ ضرور ہے۔

میں نے خیال کیا کہ اس تصویر کو راز پنہاں بناکر بکسوں میں بند رکھنا (جیسا کہ اس وقت تک ہوتا رہا ہے) فضول ہے کیونکہ جابجا سے رنگ روغن خراب ہو چلا ہے اس لیے یہ مناسب سمجھا کہ اصل تصویر کو بجنسہ فریم کرا کر نظام میوزیم علیگڈھ میں بھیجدیا جائے اور تصویر کا فوٹو مخزن میں چھپ جائے" +

یہ گروپ حضرت محبوب سبحانی رض اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کی ملاقات دکھا رہا ہے۔ اور دیگر اولیائے کرام بھی مجلس میں حاضر ہیں۔ تصویر کی پشت پر جو نام لکھے ہیں۔ اُن کے حساب سے دائیں ہاتھ پر حضرت خواجہ مودب بیٹھے ہیں اور بائیں ہاتھ پر حضرت محبوب سبحانی تشریف فرما ہیں۔ نیچے دائیں ہاتھ پر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح اور بائیں ہاتھ پر حضرت شاہ شرف بو علی قلندر رح۔ اسکے بعد دائیں ہاتھ پر حضرت بابا فرید شکر گنج رح اور بائیں ہاتھ پر حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی رح۔ اور ان کے بعد دائیں ہاتھ پر حضرت سلطان ابراہیم ادہم رح اور بائیں ہاتھ پر حضرت بدرالدین شاہ مدار ہیں۔ یہ تصویر بجائے خود معتبر ہو یا غیر معتبر۔ اسکی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ جو بے سند تصویریں ان بزرگوں کی آج کل دکانوں میں نظر آتی ہیں اُن سے بہتر ہے +

اڈیٹر

مانا نغمہ مرا خوش آیند نہیں | اور پردگیاں عشق خورسند نہیں
لیکن یہ خروش دل ہے یہ ہیں جذبات | جذبات کبھی ادب کے پابند نہیں

نالہ سے مرے کسکو نہ کچھ جوش ہوا | نغمہ مرا کسکے نہ در گوش ہوا
تھی آہ میں میری بیخودی کچھ ایسی | جسنے اُسے سُن لیا وہ بیہوش ہوا

شادابیٔ لالہ زار آنے سے رہی | گلہائے لب ہزار آنے سے رہی
دل کی پژمردگی ہے بڑھتی جاتی | اس باغ میں اب بہار آنے سے رہی

نادر علیخاں نادر کاکوروی

روح کی بیداری

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

آسمان وستارے

علمی دنیا کی یہانتک سیر کی تھی کہ عمر کی ڈاک گاڑی اٹھائیسویں برس کے اسٹیشن پر جا پہنچی۔ ایک روز یوں ہی بیٹھے بیٹھے نظر اوپر گئی تو آسمان کی شفافی۔ وسعت نے حیرت کی عینک آنکھوں پر چڑھادی اور ستاروں کی چمک نے اور بھی چوندھیا دیا۔ مگر خضر عقل نے بہت جلد دستگیری کی یعنی جلد ہی سمجھ میں آگیا کہ یہ بھی اجسام ہیں۔ کیونکہ ابعاد ثلثہ یعنی لمبائی چوڑائی اور گہرائی ان میں بھی موجود ہیں۔ خیر یہ معاملہ تو آسانی سے سلجھ گیا۔ مگر ذہن رسا نے فورًا ریشم کی گتھیوں میں پھنسا دیا ع لے روشنئ طبع تو برمن بلا شدی۔ اب یہ فکر پیدا ہوئی کہ آسمان کی لمبائی چوڑائی اور گہرائی آیا غیر متناہی ہیں کہ کہیں ختم ہی نہ ہوں یا محدود اور ختم ہونیوالی۔

آسمان متناہی ہے

اس مشکل مسئلے نے بہت عرصہ تک غلطاں پیچاں مشوش و پریشان رکھا آخر عقل کی قوت اور دماغ کی تیزی نے یہ خلش بھی کھودی اور سمجھا دیا کہ کسی جسم کے غیر متناہی ہونے کا خیال ہی بالکل خلاف عقل اور محال ہے بلکہ درحقیقت کوئی خیال ہی نہیں۔ کیونکہ یہ وہ تصور ہے جو انسان کے ذہن میں کبھی اور کسیطرح آہی نہیں سکتا۔ بہت دلیلوں سے جو وقتًا فوقتًا اسکے ذہن میں آتی گئیں۔ یہ خیال راسخ ہوتا چلا گیا۔ غرض جب بدلائل ثابت ہو گیا کہ آسمان متناہی اور محدود ہے تو اسکی شکل دریافت کرنے کی فکر ہوئی۔ واقعی سچ کہا ہے کہ "آنراکہ عقل بیش غم روزگار بیش۔ رباعی

در گردش ایں دائرہ بے پایاں ۔ برخورداری دو نوع مردم راداں
یا باخبرے از خود و از ہر چہ بود ۔ یا بیخبرے از خود و از ہر دو جہاں

آسمان کروی ہے

یہ تو روز کا مشاہدہ تھا کہ سورج، چاند اور ستارے مشرق سے مغرب کی طرف جاتے ہیں نیز یہ کہ بعض آسمان کے بیچوں بیچ اور بعض شمال یا جنوب کو بچے ہوئے چلتے ہیں۔ اب اس معائنہ کو ذرا غور سے دیکھا تو یہ معلوم ہوا کہ جو ستارے ٹھیک سر پر ہو کر گزرتے ہیں وہ سب سے بڑے دائرہ میں گردش کرتے ہیں۔ باقی سمت الراس سے جو جتنے فاصلہ پر ہیں خواہ شمال کیجانب یا جنوب کی طرف وہ اول الذکر ستاروں کی نسبت اُتنے ہی چھوٹے دائروں میں گردش کرتے ہیں یہاں تک کہ سب سے چھوٹے دائروں میں گردش کرنے والے وہ ستارے ہیں جو قطبین کے گرد گھومتے ہیں یعنی سہیل جو قطب جنوبی کا طواف کرتا ہے اور فرقدین جو قطب شمالی پر قربان ہوتے ہیں۔

چونکہ وہ ایسے جزیرے میں رہتا تھا جو معدل النہار پر واقع تھا اس لیے یہ سب دائرہ افق کو زاویہ قائمہ بناتے ہوئے قطع کرتے تھے اور ہر ایک دائرہ کے کل حصہ قطبین سے ایک سی نسبت رکھتے تھے۔ اگر ایک ستارہ بڑے دائرہ میں طلوع ہوتا اور دوسرا چھوٹے دائرہ میں تو دونوں ایک ہی وقت میں دورہ ختم کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ غروب ہوتے تھے۔ اسمیں کسی زمانے میں فرق آتے نہ دیکھا۔ اس لیے ثابت ہو گیا کہ آسمان کی شکل کروی ہے اور جب بعد غروب ہر ایک ستارہ کو دوبارہ مشرق میں پلٹ آتے دیکھا تو یہ خیال اور بھی مضبوط ہو گیا۔ اسکے علاوہ آسمان کا کروی ہونا اس طرح بھی ثابت ہوتا تھا کہ ہر ایک ستارہ طلوع ہوتے وقت جتنا بڑا معلوم ہوتا تھا اتنا ہی اُس وقت جب آسمان کے بیچوں بیچ اور اُتنا ہی غروب ہوتے وقت نظر آتا تھا۔ اگر دائرہ

میں گردش نہ کرتا ہوتا تو ضروری تھا کہ بعض وقت آنکھ سے قریب اور بعض وقت دور ہوا ور اِس صورت میں قریب ہو تو بڑا اور دور ہو تو چھوٹا نظر آئے حالانکہ ایسا نہ ہوتا تھا۔ اِسیطرح اور بہت سے مسئلے علم ہیئت کے اُس نے اپنی عقل دوربین سے دریافت کر لیے اور اِس فن کا ماہر ہوگیا۔ چنانچہ اُس کی یہ بھی آسانی سے سمجھ میں آگیا کہ سیّارے مختلف کروں میں گردش کرتے ہیں اور ان سب کا سرتاج یعنی سب کو گھیرے ہوئے اور سب کے اوپر ایک اور کرہ ہے جو دن رات کے عرصہ میں اِن سب کروں کو ایک مرتبہ گردش دیدیتا ہے۔ لیکن اِس علم میں جو جو ترقیاں اُسنے کیں اُن سب کو مفصل بیان کرنا بہت طول فضول چاہتا ہے۔ ہم جتنا لکھ چکے وہ ہماری اغراض کے لیئے بالکل کافی ہے*

غرض کہ علم ہیئت کی اِس منزل پر پہنچکر ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ دن رات چکر کھانے ولے آسمان اور وہ تمام چیزیں جنپر یہ محیط ہیں ملکر ایک کل ہے جس کے اجزاء آپسمیں مربوط و منتظم ہیں۔ گویا ایک مہیب جانور ہے جس کے ستارے حواس ہیں کرّے ہاتھ پاؤں ہیں اور وہ تمام اجسام جن میں کون و فساد ہوتا ہے اندرونی حصوں سے مشابہ نظر آتے تھے۔

عالم قدیم ہے یا حادث

جب نیچے کی دنیا کے جسموں کیطرح تمام عالم کی ماہیت ایک نظر آنے لگی اور اُسکے مختلف حصے ایسے آپسمیں مربوط پائے گئے کہ ایک کُل کے جزو معلوم ہوتے تھے تو اُسکے دماغی اکھاڑے میں دو ایسے پہلوانوں کی کُشتی شروع ہوئی جو طاقت میں بھی برابر اور پہستی میں بھی یکساں اُستاد تھے یعنی اُس کا دماغ اِن دو خیالوں کی کشمکش میں پڑگیا آیا (۱) یہ عالم ہمیشہ سے چلا آتا ہے یا (۲) ایک زمانہ میں اسکا وجود نہ تھا۔ اور پھر شروع ہوا (حکما کی زبان میں قدم اور حدوث اِنہیں دو خیالوں کے نام ہیں*

اِس سوال کے متعلق بہت سے شبہے اور شک اُس کے ذہن میں پیدا ہوتے تھے اور اِن دونوں رایوں میں سے کوئی بھی دوسری پر غالب نہ آتی تھی کیونکہ اگر عالم کو قدیم مانتا تھا تو جسموں کا نامتناہی ہونا محال معلوم ہوتا تھا اسیطرح وجود کے نامتناہی ہونے کی نسبت بھی کثرت سے اعتراض ذہن میں آتے تھے۔

مذکورہ بالا اعتراضوں کے علاوہ اگر کسی جسم میں ایسی صفتیں ہوں جو اُس سے علیحدہ نہ ہو سکیں اور یہ صفتیں حادث ہوں تو ضرور ہے کہ وہ جسم بھی حادث ہو کیونکہ جب یہ صفتیں اُس سے جُدا ہو ہی نہیں سکتیں تو اُس کا وجود اِن صفتوں سے پہلے اور انکے بغیر متصوّر نہیں ہو سکتا۔ اور جس چیز کا وجود ہم حادث صفتوں سے پہلے نہیں مان سکتے وہ ضرور اِن صفتوں کے ساتھ ساتھ وجود میں آیا ہوگا اور اِس لیئے حادث ہوگا۔

رہی دوسری شق کہ عالم حادث ہے۔ اسکو مانتا تھا تو اور قسم کے اعتراض وارد ہوتے تھے۔ خاصکر "وجود بعد عدم" خود ایک ایسا خیال ہے کہ زمانہ کو وجود سے پہلے ماننے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ورنہ عدم کو وجود سے پہلے اور وجود کو عدم کے بعد کس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ زمانہ خود عالم سے وابستہ ہے اور اُس سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اسلیئے عالم کا زمانہ کے بعد ہونا محض مہمل خیال ہے۔

اِس کے ماسوا اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ عالم حادث ہے یعنی عدم سے وجود میں آیا ہے تو کوئی موجد یا پیدا کرنے والا ہونا چاہیئے۔ اور اسصورت میں سوال یہ ہوگا کہ کیا وجہ اُس خالق نے عالم کو اُسوقت خاص پر (پیدایش عالم کا جو کوئی زمانہ بھی فرض کیا جائے) پیدا کیا اُس سے پہلے کیوں نہ پیدا کیا۔ کیا خود خالق کی ذات کا کوئی تغیر اِس کا باعث ہوا۔ اگر ایسا ہوا تو اِس تغیر کا کیا باعث

ہوا۔ برسیں گزر گئیں کہ اِس بھول بھلیاں میں یونہیں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتا رہا۔ مگر باہر آنے کا کوئی رستہ نظر نہ آیا یعنی اِن دونوں میں سے جس رائے کو بھی اختیار کرتا تھا۔ ہزاروں دلیلیں اُسکے خلاف ذہن میں آجاتی تھیں اِسلیئے کسیکو بھی ترجیح نہ دیسکتا تھا۔ کیا خوب فرمایا ہے خواجہ حافظ نے کہ

شعر حدیث از مطرب و مے گو سے و رازِ دہر کمتر جو ٭ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را ٭

۱۰ [illegible]

اجب اِس مسئلہ کا کوئی قطعی فیصلہ نہو سکا۔ اور کسی طرح یہ عقدہ حل ہوتا نہ معلوم ہوا تو اُس نے دلمیں سوچنا شروع کیا کہ اِن دونوں رایوں میں سے ایک ایک کا لازمی نتیجہ کیا ہے شاید نتیجہ کے اعتبار سے دونوں یکساں ہوں ٭ پہلے حدوث کے پہلوؤں پر نظر دوڑائی تو حسبِ ذیل قیاسات اونٹوں کی قطار کی طرح ذہن میں آتے گئے ٭

اگر عالم حادث ہی تو ماننا پڑے گا کہ خود بخود موجود نہیں ہوگیا۔ بلکہ اُسکا کوئی فاعل یا بنانے والا بھی ہے۔ یہ فاعل ظاہر ہے۔ کہ حواس کی دسترس سے باہر ہونا چاہیے کیونکہ اگر محسوس ہوا تو جسم ہوگا اور جسم ہوگا تو عالم کا جُزو اور حادث ہوگا۔ اور اُسکا وجود خود ایک علت کا محتاج ہوگا۔ اب اگر یہ علت یا دوسرا فاعل بھی جسم ہوا تو تیسرے کا محتاج ہوگا اِسیطرح تیسرا چوتھے کا اور چوتھا پانچویں کا یعنی یہ سلسلہ یونہیں چلا جائیگا۔ کہیں ختم ہی نہو گا۔ اور اصلی فاعل تک کبھی رسائی ہی نہو گی۔ حالانکہ یہ عقل کے بھی بالکل خلاف ہی۔ اور جو کچھ ہم ابھی مان چکے کہ عالم کا کوئی فاعل ہے اُس کے بھی مخالف ہو کیونکہ جو خود مخلوق ہو وہ ہرگز فاعل کہلانیکا مستحق نہیں ٭

لہذا ماننا پڑے گا کہ خالقِ عالم بے جسم ہے اور بے جسم ہے تو اُسکو حواس سے

معلوم کرنا بھی ناممکن - کیونکہ حواس کی مدد سے ہم سوائے جسموں یا جسمانی صفتوں کے اور کچھ نہیں دریافت کر سکتے - بلکہ حواس تو حواس ادراک سے بھی اُسکا دریافت کرنا محال - کیونکہ ادراک کسے کہتے ہیں کسی چیز کی صورت کا بغیر ہیولیٰ یا مادہ کے ذہن میں آنا +

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم | وز ہر چہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر | ما ہمچناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

اور جب خالق عالم جسم نہیں تو کوئی جسمانی صفت بھی مثل لمبائی چوڑائی اور گہرائی کے اُسکی طرف منسوب نہیں کر سکتے بلکہ وہ اُن سے اور نیز اور تمام صفاتِ جسمانی سے پاک اور منزہ ہے - اسیطرح بحیثیت خالق عالم ہونیکے یہ بھی ضروری ہے کہ اُسکو دنیا و ما فیہا کا علم ہو اور علم مطلق ہو - اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (کیا جس نے پیدا کیا وہ نہیں جانتا حالانکہ وہ عمدہ آگاہی والا ہے)

اچھا اب اگر دوسری شق کو اختیار کیا جائے یعنی فرض کیا جائے کہ عالم قدیم ہے اور ہمیشہ سے اسیطرح چلا آتا ہے تو ضرور ماننا پڑیگا کہ حرکت بھی قدیم ہے جس سے پہلے کبھی سکون نہ تھا کیونکہ وجود عالم بلا حرکت متصور ہی نہیں ہو سکتا اور ہر ایک حرکت کے لیئے کوئی محرک ہونا چاہیئے - اب یہ محرک یا تو کوئی جسمانی قوت ہوتی ہے - خواہ جسم متحرک میں ہو یا کسی اور جسم میں یا ایسی قوت ہوتی ہے جو کسی جسم سے تعلق نہیں رکھتی +

ہر ایک جسمانی قوت جسم کے ساتھ منقسم بھی ہو سکتی ہے اور اُسمیں اضافہ بھی ہو سکتا ہے - مثلاً میلان مرکزی جو ہر ایک چیز کو اوپر سے نیچے آنے پر مجبور کرتا ہے - ایک جسمانی قوت ہے اگر ایک پتھر کے دو حصے کر دیئے جائیں تو یہ قوت بھی دو حصوں میں منقسم ہو جائے گی - اور اگر اُس پتھر کے ساتھ ایک

اور اُسکا ہم وزن پتھر جوڑ دیا جائے تو یہ قوت بھی دو نی ہو جائیگی۔ اگر یہ ممکن ہو کہ پتھر بڑھکر غیر متناہی ہو جائے تو اُسکا میلان مرکزی بھی غیر متناہی ہو جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر یہ پتھر ایک حد تک بڑھکر رہجائے تو یہ قوت بھی اُسی حد تک بڑھکر رہجائے گی۔ مگر ثابت ہو چکا ہے کہ ہر ایک جسم متناہی ہے۔ لہٰذا ہر ایک جسمانی قوت بھی متناہی ہوگی۔ اب اگر ہمکو کوئی ایسی قوت نظر آئے جس سے غیر متناہی اثر پیدا ہوا ہو تو ماننا پڑے گا کہ یہ قوت جسمانی نہیں ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ آسمان کو دائمی حرکت ہے جو کبھی نہیں رُکتی۔ پس جب ہم اِس حرکت کو قدیم مانتے ہیں تو لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو قوت اس حرکت کا باعث ہے وہ نہ خود جسم فلک میں ہے نہ اور کسی جسم میں۔ بلکہ کسی ایسی چیز میں ہے جو جسمانیت سے بالکل پاک ہے اور جس کے جسموں پر صادق آنے والے لفظوں میں تعریف بھی نہیں ہو سکتی +

عالم کون و فساد پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہر ایک جسم کی ماہیت کا اشرف جُز اُسکی صورت نوعی ہے جو نام ہے جسم کے میلان کا مختلف حرکتوں کیطرف رہا دوسرا جُز یعنی ہیولیٰ یا مادہ تو وہ نہایت لغو اور ہیچکارہ ہے بلکہ سمجھ میں بھی مشکل ہی سے آتا ہے[۱]۔ لہٰذا عالم کے موجود ہونیکے اسکے سوا کوئی معنی نہیں کہ اُس محرک کی تحریک سے متحرک ہے جو جسم اور جسمانی اوصاف سے بری ہے۔ سب محسوسات سے الگ اور ادراک کی رسائی سے باہر ہے۔ اور چونکہ وہ عالم کی حرکت یا وجود کی علت ہے۔ اِس لیئے ضروری ہے کہ اُسکا حاکم مطلق ہو اور کامل علم رکھتا ہو +

[۱] مصنف کے اِس خیال کی داد وہی لوگ دے سکتے ہیں جو برکلے، ہیوم، اور کینٹ کی رایوں سے واقف ہیں تعجب ہے کہ ابن طفیل صدیوں پہلے مادہ کی نسبت وہی رائے دیگیا جو کینٹ نے دی ہے یعنی ایک شے نامعلوم۔

غرض کہ اس طریق استدلال سے بھی نتیجہ وہی پیدا ہوا جو حدوث عالم کی صورت میں نکلتا تھا۔ اور حدوث و قدم کی نسبت جو شبہہ تھا وہ ذرا بھی مخل نہوا۔ کیونکہ جونسی شق بھی اختیار کرتا تھا نتیجہ یہی نکلتا تھا کہ عالم کا پیدا کرنیوالا جسم نہیں ہو سکتا بلکہ جسموں کا بنانے والا ہے کیونکہ ہر جسم کو مادہ کے ساتھ صورت نوعی کی ضرورت ہے۔ بغیر اسکے اُسکا وجود محال، اور صورت نوعی کا وجود ایک فاعل مختار پر موقوف ہے لہذا ہر چیز کا وجود اُس فاعل سے وابستہ ہے اور اُسی کے سہارے قائم ہے۔ یہ تمام چیزوں کی علت اور وہ سب اسکے معلول ہیں خواہ قدیم ہوں یا حادث۔ بغیر اسکے اُن کا قیام محال ہے، بغیر اسکے وجود کے اُن کا وجود ناممکن، اور بغیر اسکے قدیم ہوئے وہ قدیم نہیں ہوسکتے۔ لیکن اسکو نہ اُن کی ضرورت ہے نہ کسیطرح انکا محتاج شعر ہر چہ آفرینش وبستی طراز ٭ نیازت نہ اے از ہمہ بے نیاز ٭ اور اسکے خلاف ہو بھی کیونکر سکتا ہے جب یہ ثابت ہو چکا کہ عالم کو حرکت دینے والی قوت نا متناہی ہے اور ہر ایک جسم اور متعلق جسم متناہی ہے ٭

مختصر یہ کہ عالم اور جو کچھ اُسمیں ہے یعنی آسمان زمین ستارے اور جو کچھ ان سے متعلق ہے خواہ انکے اوپر ہو یا نیچے سب اُسکے پیدا کیے ہوئے ہیں اور طبعاً اُس سے موخر ہیں گو زمانہ کے اعتبار سے موخر نہوں۔ مثلاً اگر تم کوئی چیز اپنے ہاتھ میں لیکر ہاتھ کو حرکت دو تو وہ چیز بھی ہاتھ کی وساطت سے اور اُسکے ساتھ ساتھ حرکت کریگی مگر چونکہ اُسکی حرکت ہاتھ کی حرکت کے تابع ہے اسلیئے طبعاً اُس سے موخر ہے حالانکہ زمانہ کے اعتبار سے کچھ بھی آگا پیچھا نہیں۔ دونوں حرکتیں ایک ہی آن میں شروع ہوتی ہیں ٭

ان تمام دلیلوں سے اسکو یقین کامل ہو گیا کہ عالم کا ایک پیدا کرنیوالا ہے جو زمانہ پر بھی سابق ہے وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُس سے صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے[51] ٭

(باقی دارد) فدا علی خان

[51] اس آیہ کریمہ سے اقتباس ہے اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ یعنی ہم جب کسی

شہیدِ جفا

پائی نہ تیغِ عشق سے ہم نے کہیں پناہ
قربِ حرم میں بھی ہیں تو قربانیوں میں ہم

۳- جنوری ۱۶۶۱ء

شاہجہاں بادشاہ کی چاہیتی بیوی جسکا خطاب ممتاز محل تھا جب مرنے لگی اور اُسکا دم کھنچکر سینہ میں آگیا تو لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہنے لگی۔ اچھی ذرا کوئی جہاں پناہ کو تو میرے پاس بُلا لائے۔ مجھے کچھ وصیت کرنی ہے۔ بادشاہ سلامت اُسی وقت محل میں تشریف لائے اور ممتاز محل کو جاں کنی کیحالت میں دیکھکر زار قطار رونے لگے۔ ممتاز محل نے کہا۔ جہاں پناہ! میں نے اپنے بچوں کو بڑے چاؤ چوچلوں سے پالا ہے۔ اور ہاتھوں چھاؤں کی ہے۔ اگر میرے پیچھے یہ بچین ہوئے تو مجھے قبر میں بے چینی ہوگی۔ خدا کو مان کے اِنکو پیٹھ نہ دینا اور ان کی ہر طرح دلداری کرتے رہنا ۰

بادشاہ سلامت۔ بیگم! تمھاری اولاد تو میری آنکھوں کا تارہ اور کلیجہ کا ٹکڑا ہے تمھارا کدھر خیال ہے میری جان تک اُن کے لیئے حاضر ہے ۰

ممتاز محل حضور۔ خدا رکھے آپ ٹھیرے مرد۔ مرد ان باتوں کو نہیں جان سکتے سوکن کو سوکن کی اولاد ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔ اور میاں کی پہلی بیوی کے بچوں کو بن ستائے رہتی ہی نہیں۔ بی سارہؓ نے بی ہاجرہؓ کے جیتے جی حضرت اسمٰعیلؑ کو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں سنسان جنگل میں جلتی جھلستی ریت پر پھکوا دیا تھا۔ اور موئے پیچھے تو کَون کسی کا لحاظ کرتا ہے اور رہگئی تو دنیا داری بادشاہ

میں کون اور تو کون۔ دیکھئے میری آنکھ بند ہوتے ہی ان پر کیا گزرتی ہے۔ اور میرے لاڈے بچوں کو کس کس کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑتے ہیں ؁

بادشاہ سلامت۔ تم خاطر جمع رکھو میں انشاءاللہ تعالیٰ دوسری شادی ہی نہیں کرونگا۔ جو تمھارے پیچھے سوکن آئے اور تمھارے بچوں کو ستائے ؁

ممتاز محل۔ بھلا قسم تو کھائیے ؁

بادشاہ سلامت۔ خدا کی قسم۔ رسول کی قسم۔ بس ؟

ممتاز محل۔ ہاں بس۔ اب مجھے یقین آگیا اور اب میں اطمینان کے ساتھ خدا کے ہاں سدھارتی ہوں۔ لو اللہ بیلی۔ یہ کہتے کہتے ممتاز محل کا دم ہوا ہوگیا ممتاز محل ماتا نے کارن اولاد کے آرام کے لیئے کیا کیا بندوبست نہ کرگئی مگر خدا کے سامنے نہ کسی شہزادی کی بیری چلتی ہے نہ کسی ملکہ کی۔ ممتاز محل کو اس بھید کی خبر نہ تھی کہ تیری کوکھ سے پیدا ہوئے بچے جن سب نے تیرے ہی پیٹ میں پاؤں پھیلائے ہیں جو سگے بھائی بہن کہلاتے ہیں ایک دوسرے کے نگلنے کیلئے سانپ کے سپولیئے اور اژدھے بنجائیں گے۔ اور ایک۔ ایک کے خون کا پیاسا ہوگا۔ بھائی۔ بھائی کا گلا کاٹے گا۔ سولی پر چڑھائیگا۔ آنکھوں کو نکلوا کر پاؤں سے روندیگا۔ مُردے کو بازاروں اور گلی کوچوں میں گھسٹوائیگا۔ جو کچھ کربلا میں ہوا ہی وہ دہلی آگرے میں پھر ہو گزرے گا بوڑھا باپ شاہجہاں آگرہ کے جیلخانہ میں نوجوان اور رشک قمر بیٹوں کی سُناونی پر سناونی سُنیگا۔ اور ہُوں نہ کرسکے گا۔ اس اجمال کی تفصیل ہم کیا لکھیں۔ اسکول کے اردو پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں کہ حضرت عالمگیر متقی اور درویش صفت بادشاہ نے داراشکوہ۔ میرزا شجاع میرزا مراد وغیرہ کے قتل کرنے میں جس بے رحمی اور سنگدلی سے کام لیا اُسکے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور کلیجہ مُنہ کو آجاتا ہے۔ سُنا ہے کہ داراشکوہ کے

دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام سپہر شکوہ اور دوسرے کا نام سلیماں شکوہ تھا۔ سپہر شکوہ نے دارا شکوہ کا مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا اور دارا شکوہ کی شہادت کے بعد وہ گوالیار کے جیل خانہ میں مُدت تک جیتا رہا۔ سلیماں شکوہ جان بچانیکے لیئے بے نام ونشاں ہوگیا۔ اور عالمگیر کے ہاتھ نہ لگا۔ مہینوں جنگل بیابانوں میں پڑا پھرتا رہا۔ انسان کی صورت سے ایسا ڈرتا تھا جسطرح جنگلی ہرن پرچھائیں سے بھڑکتا ہے قضاو قدر اُسے سری نگر کی سرحد میں لے پہنچی۔ صبح کا سُہانا وقت تھا ایک چشمہ کے کنارے پتھر کے سہارے گھانس کے مخملی بچھونے پر بیٹھا ہوا اپنی صورت پانی کے آبدار آئینہ میں دیکھ رہا تھا جو سری نگر کا راجہ پرپوش گھوڑے پر سوار شاہانہ لباس پہنے ہتیار لگائے ہاتھ پر باز بٹھائے شکار کھیلتا ہوا اتفاقاً آن پہنچا سلیماں شکوہ کی دلفریب شکل بڑی بڑی تیموری غلاف دار آنکھیں۔ سیاہ اور کمان جیسی کھنچی تنی بھویں۔ اونچی ناک۔ چھوٹا دہانہ۔ پتلے ہونٹ۔ لال لال رخسار چاند سی پیشانی۔ سر سے پاؤں تک نور کے سانچہ میں ڈھلا ہوا دیکھکر حیران ہوگیا +

راجہ۔ تم کون ہو۔ اور کہاں سے آئے ہو +

شاہزادہ۔ سچ سچ کہوں یا جھوٹ +

راجہ۔ سچ ہی کہو۔ سچ دنیا میں بڑی چیز ہے +

شاہزادہ۔ سچ کہنے میں مجھے جان کا خوف ہے +

راجہ۔ جان کا خوف دل سے نکال ڈالو۔ اب تم سری نگر کی حد میں آگئے ہو۔ خدا چاہے تو تمہارا بال بھی بیکا نہوگا +

شاہزادہ۔ میرا نام سلیماں شکوہ ہے۔ شاہجہاں بادشاہ دہلی کا پوتا اور دارا شکوہ کا بیٹا ہوں۔ مگر قسمت کا ہیٹا ہوں۔ باپ کا قتل بھائی کی گرفتاری۔ چچا جان کی غداری۔ اپنی مصیبت اسطرح سُنائی کہ راجہ رُوتے رُوتے دیوانہ ہوگیا۔ اور بڑی تعظیم

تکریم سے شہر میں لیگیا اور خاص محل میں ٹھیرایا۔ اور فرمایا جب تک میری جان میں جان ہے میں آپ کا حامی اور مددگار رہوں۔ آپ پاؤں پھیلا کر بے کھٹکا سوئیے اور جو کچھ دال دلیا موجود ہے وہ کھائیے۔ سلیماں شکوہ نے کچھ کم تین برس بسم اللہ کے گنبد میں کاٹے۔ اور سری نگر میں رہکر راجہ کی بدولت خوب خوب عیش کیے مگر عالمگیر اسکی فکر سے غافل نہ تھا۔ اور آخر اُسنے معلوم کر لیا کہ میرا شکار سری نگر کا راجہ لے اُڑا ہے۔ پہلے تو صلح و آشتی کے خط راجہ کو بھیجے کہ ہمارا آپ کا واحد معاملہ ہے۔ اچھے دل بُرے نہ کرو اور سلیماں شکوہ کو میرے پاس بھیجدو۔ مگر جب دیکھا کہ راجہ کسیطرح نرم نہیں ہوتا اور ٹکا سا جواب دیتا ہے تو لشکر کشی کی دھمکی دی۔ مگر راجہ بات کا پکا اور قول کا سچا تھا وہ عالمگیر کے اِس ڈراوے کو بھی خاطر میں نہ لایا۔ اور سلیماں شکوہ کو نہ بھیجنا تھا اور نہ بھیجا۔ اورنگ زیب کے دل میں بھتیجے کی زندگی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ اُس نے اُسکے پکڑوا بُلانے کیواسطے ایک اور جل کھیلا۔ اور ایک اَور راجہ کو جو بڑا مدبّر اور عقیل تھا اور سری نگر والے راجہ سے اُسکی دانت کاٹی روٹی تھی بیچمیں ڈالا اور سلیماں شکوہ کے بھیجدینے کی اُس سے سفارش چاہی۔ مدبّر راجہ نے اِس کام کا بیڑا اُٹھایا۔ اور دوست کو ایسا جھانسا دیا کہ اُس نے بے گناہ سلیمان شکوہ کو پابزنجیر کرکے دہلی روانہ کر دیا۔ سلیماں شکوہ کا دہلی میں داخل ہونا حضرت یوسف علیہ السلام کے پہلے پہل مصر میں داخل ہونیکے برابر تھا۔ بازاروں میں خلقت کے ہجوم ٹھٹھ لگ گئے تھے۔ تھالی پھینکو تو سروں پر جاتی تھی۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ درودیوار اور چھت اور کوٹھوں پر عورتیں اور بچے پٹے پڑے تھے اور اُس نامرادکی نوجوانی پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے۔ جب اُسکی سارے شہر میں تشہیر ہولی تو نواب سعداللہ خاں وزیر کو حکم ہوا کہ تم جاؤ اور اُس نالائق کا سر اپنے روبرو کٹوا کر ہمارے سامنے لاؤ۔ مگر جب سعداللہ خاں نے

جاکر سلیماں شکوہ کی پیاری صورت دیکھی تو جی جان سے اُسپر فدا ہوگیا اور اُسکا دل بھر آیا۔ کئی گھنٹہ تک اِس سوچ میں رہا کہ اِس یوسفِ ثانی کو بے سبب بے وجہ کیونکر جلاد کے حوالہ کردوں۔ آخرکار رحم دل وزیر ایک منصوبہ سوچ کر حضور میں حاضر ہوا اور دست بستہ عرض کی۔ جہاں پناہ۔ قیدی سے حسب دستور پوچھا گیا کہ اگر کوئی ارمان یا حسرت تیرے دلمیں ہو تو بیان کر۔ قیدی نے کہا کہ میری آخری آرزو یہ ہے کہ مرنیسے پہلے ایک بار بادشاہ ظل اللہ کا دیدار دیکھ لوں۔ چونکہ حجت شرعی تھی اسلیئے اُسکے قتل میں درنگ کی گئی۔ اب جو حکم سلطانی ہو بجالائیں +

عالمگیر رناک بھوں چڑھاکر) خیر اب تو مغرب کا وقت قریب ہے۔ اِسوقت ہم اُس ناشدنی کو اپنے سامنے نہیں بلا سکتے ہیں۔ کل دس بجے دن کے اُسکو اور جلاد کو دونوں کو دربار میں حاضر کرو۔ سعد اللہ خاں سلام کرکے دلمیں خوش ہوتا ہوا پیچھے ہٹا اور رات کی رات سلیماں شکوہ کی جان بچگئی۔ سعد اللہ خاں نے یہ تدبیر محض اِس مصلحت سے کی تھی کہ شاید عالمگیر اپنے بھتیجے کے حسن و جمال کو دیکھکر پسیج جائے اور اِس بے خطا کی خطا معاف ہو جائے۔ بات کی بات میں صبح ہو گئی۔ اور گل نے کسی مقتولِ جفا کے ماتم میں اپنا نازک پیراہن چاک کر ڈالا اور باغ کا پتہ پتہ اُوس کے آنسوؤں سے رونے میں مشغول ہوا۔ آفتاب نکل آیا اور اُسکی لمبی کرنیں جو شفق کی سُرخی طے کرکے زمیں پر پہنچیں تو یہ معلوم ہوا کہ کسی نوجوان خورشید رخسار کا سر نیزہ پر چڑھایا گیا ہے جسکی شہ رگوں سے خون ٹپک رہا ہے +

دیوان عام میں اورنگ زیب عالمگیر نے تخت جواہر نگار پر جلوس فرمایا۔ وزیر امیر۔ منصبدار۔ ہفت ہزاری۔ پنجہزاری خاص و عام اپنے اپنے رتبہ اور عہدہ کے

کے مقاموں پر دست بستہ کھڑے ہوئے جسوقت سلیماں شکوہ دس
سپاہیوں کی حراست میں تلواروں کے سایہ تلے دیوان عام کی تیسری سیڑھی
پر پہنچا تو اتفاقاً اُسکی آہنی بیڑی پتھر سے جا لگی اور اُسکی جھنکار سے سارا ایوان گونج
اُٹھا۔ بیڑی زبانِ حال سے ظفر کا یہ شعر پڑھکر عالمگیر کو سُنا تی تھی ؎

پائے کوباں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں — آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

حکم ہوا کہ بیڑی کاٹ دی جائے۔ صرف ہاتھوں میں سونے کی زنجیر پڑی رہے
سلیمان شکوہ نے جب اپنے تئیں عالمگیر کے آگے اور جلاد کو ننگی تلوار لیئے
پیچھے دیکھا تو تھر تھر کانپنے لگا۔ چاند سے چہرے کو گہن لگ گیا۔ منہ کے اندر زبان
خشک ہوگئی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئیں۔ دل دھڑکنے لگا۔ سر پھرنے لگا۔ سارا
دربار پیکرِ تصویر بن گیا تھا۔ اور اُس مظلوم کا مُنہ تک رہا تھا۔ عالمگیر نے جھلا کر
سلیماں شکوہ سے کہا۔ کہو برخوردار کیا حال ہے۔

سلیماں شکوہ۔ (شعر)

حالِ من از ہجر دار الکتہ از یعقوب نیست — او پسر گم کردہ بود و من پدر گم کردہ ام

عالمگیر۔ سعد اللہ خاں تم نے دیکھا۔ موت سر پر کھیل رہی ہے اور حواس وہ درست
ہیں کہ شعر تصنیف ہو رہے ہیں۔ اور جو زندگی کی کچھ دنوں اُس پر تو شاید آسمان کے
تارے توڑ لائے۔ یہ زندہ رکھنے کے قابل ہے؟ توبہ توبہ! افعی کُشتن و بچہ اش
را نگاہ داشتن کار خردمنداں نیست"۔ بہت اچھا۔ اگر آپ اپنے ابا جان کے
فراق میں بے چین ہیں تو ہم آپ کو ابھی اُنکے پاس ہمایوں کے مقبرہ میں دست
بدست پہنچوائے دیتے ہیں۔

سلیماں شکوہ۔ عالمگیر سے مخاطب ہو کر شعر

پس از مُردن گرانی بے مروّت بر مزار من — بہ تعظیم تو خوش ستانہ برخیزد غبار من

عالمگیر۔ جلاد سے مخاطب ہو کر۔ ہُوں۔ ہُوں کے ساتھ پیچھے سے جلاد کی تلوار سلیمان شکوہ کی گردن پر پڑی۔ اور اُس بیکس کا سر تن سے جدا ہو کر چار قدم دور جا پڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ +

میری جان! یہ جھوٹی کہانیاں نہیں ہیں سچے قصے ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو میرے ساتھ ہمایوں کے مقبرے میں تشریف لے چلیئے۔ مقبرے کے صحن میں سنگ مرمر کی مزار کے پاس جو در اصل دارا شکوہ کا مرقد ہے + میں آپ کو اِس نامراد کی قبر دکھا سکتا ہوں۔ جس پر حسرت کا شامیانہ کھنچا ہُوا ہے اور یاس و الم کی جھالر لٹک رہی ہے داغ

کہتے ہیں سب یہ قبر کسی نوجواں کی ہے ۔ حسرت برس رہی ہے ہمارے مزار پر

حکیم سید ناصر نذیر فراق دہلوی

مرحومہ کی یاد

تجھکو کیونکر کہوں زباں سے نہیں ۔ حسرتیں تیری دل میں رکھتا ہُوں
جان کے ساتھ ہیں ترے ارماں ۔ میں اِنہیں کے لیئے تو زندہ ہُوں
دیکھتا ہوں نشانیاں تیری ۔ کھو کے تیرے پتے کو پاتا ہُوں
داغ کی طرح جل رہا ہے دل ۔ پھول کی طرح ڈبڈباتا ہوں
تو نہیں کیوں کہ تیری آنکھوں کے ۔ کتنے تارے ہیں جنکو گنتا ہوں
دانے دانے میں ہیں یہاں خرمن ۔ پتے پتے سے گل کھلاتا ہوں
قرب روحی میں بعد کو کیا دخل ۔ اس کو میں دھیان میں بھی لاتا ہوں
یہ تو ممکن نہیں کہ تو نہ رہے ۔ تو نہیں اور میں تو میں کیا ہُوں

آزاد عظیم آبادی

النحل

(نوع) شہد کی مکھی پردار کیڑوں کے اُس جنس کی ایک نوع ہے جن کے چار جھلی دار بازو ہوتے ہیں اور اُن میں باریک باریک نسیں جال کی طرح بنی ہوئی رہتی ہیں اس خاندان کے کیڑوں میں شہد کی مکھیاں بھڑیں پردار چیونٹیاں ڈنس وغیرہ داخل ہیں۔ ان کیڑوں کا بازو برہنہ ہوتا ہے۔ چڑیوں کے بازو کی طرح اُن پر بال و پر نہیں ہوتا۔ ان کا پچھلا دھڑ گاؤدم ہوتا ہے اور پیٹی میں سانپ کی کینچلی کی سی لہریں ہوتی ہیں۔ اور اکثر اس خاندان کے کیڑوں کی دُم پر ایک ڈنک ہوتا ہے جس سے وہ اپنے دشمن پر حملہ کرتے ہیں۔ یہ کیڑے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا بچہ ابتدا میں محض ایک پلو ہوتا ہے جو گنڈلی مارے ہوتا ہے۔ لیکن بعد کو وہ اپنا روپ بدلکر ایک خوشنما پردار کیڑا بن جاتا ہے۔ شہد کی مکھی جو اس خاندان میں داخل ہے اسیطرح پیدا ہوتی ہے۔ اسکی زندگی کی تاریخ تبدیل اشکال کی ایک عجیب کہانی ہے جسکو سنکر عقل انسانی حیرت میں آتی ہے شروع میں انڈے سے پلو پیدا ہوتا ہے۔ دو ڈھائی روز تک یہ پلو دن رات اپنی غذا کھائے جاتا ہے بعد کو وہ اپنے مُنہ سے مکڑی کی طرح سُوت کاتنا شروع کرتا ہے اور اپنے جسم کے چاروں طرف اس سُوت کی گولی بناکر اپنے کو اسمیں چھپا لیتا ہے اور خود بیہوش ہو جاتا ہے اور اسی حالت میں وہ کوسے کے اندر بند رہتا ہے اور تھوڑے زمانے میں پلو سے ایک شہد کی مکھی بن جاتا ہے۔ اُسوقت کوسے کو کترکر باہر نکل آتا ہے اور اپنا کام کرنا شروع کرتا ہے۔ مکھی کے اعضا کی تشریح دیکھو تو تم کو ہرگز باور نہیں ہوگا کہ وہ ایک بے دست و پا پلو کی تبدیل ہیئت سے بنے ہیں

ہر ایک عضو کی پر حیرت بناوٹ جسکا ذکر آگے آئیگا۔ شہد کی مکھی کی غذا کے لحاظ
سے نہایت موزوں واقع ہوئی ہے۔ اصول ارتقا کے ماہرین یہ بیان کرتے
ہیں کہ زرگل کو کھانے اور پھولوں کے رس چوس کر زندگی بسر کرنے کی ضرورت
نے شہد کی مکھی کے اعضا کی ساخت کو جسکو دیکھکر تم حیرت کرتے ہو اپنے ڈھب
کا بنالیا۔ اور اِسیطرح ضروریات زندگی غذا کے تعلق آب و ہوا کے اثر نے اِس
خاندان کے کیڑوں میں شدہ شدہ ایسا اختلاف پیدا کردیا کہ وہ اب پہچانے نہیں
جاتے۔ ورنہ شہد کی مکھی اور اِس خاندان کے دوسرے کیڑے جو اِسوقت زمین
پر موجود ہیں۔ ایک ہی کیڑے کی نسل سے ہیں جو اِن سب کا مورث تھا۔ اور زمانہ
قدیم میں اِس زمین میں زندہ رہا۔ اور مرگیا۔ لیکن سچ پوچھو تو شہد کی مکھیاں اور اُنکے
ہم جنس کیڑے جن کی صورتیں جداگانہ ہیں اپنے خالق کی قدرت کاملہ کی نشانیاں
ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اِن کی مختلف نوع کیونکر وجود میں آئی +

(تاریخی بیان)

شہد کی مکھیاں اپنی حیرت خیز عقل حیوانی کی وجہ سے قدیم زمانہ سے مشہور
ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ اِس عجیب وغریب مخلوق نے بنی نوع انسان کی توجہ
کو ابتدائی زمانہ سے اپنا اسیر اور دلدادہ بنا رکھا ہے کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں
گزری ہے جس نے شہد کی مکھیوں کی خوش ذائقہ اور مفید پیداوار سے نفع
نہیں اُٹھایا ہو۔ تاریخ اِن نام برآوردہ مکھیوں کی حیرت انگیز کہانی کو مزید تحقیقات
اور مشاہدات کے ساتھ دُہراتی آئی ہے۔ انسان کو تزک شاہی آداب خسروانہ
تمدُّن اور رموز سیاست کے سکھانے میں شہد کی مکھیاں ایک کامل فن معلم کا
کام دیتی رہی ہیں۔ ایثار نفسی کفایت شعاری آپس کی ملت لگاتار محنت اور وقت
کی پابندی کا سبق ہم نے اُن سے سیکھا ہے۔ دنیا کے نامور شعرا اور فلاسفر اخلاقی
مضامین کو بیان کرنے میں شہد کی مکھیوں کے حالات زندگی سے استدلال کرتے

رہے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت انسان شہد کی مکھیوں
سے تاریخی زمانہ کے قبل سے مانوس ہیں۔ روم مصر یونان کی تاریخ میں شہد کا ذکر
موجود ہے۔ وید میں مدھ کا لفظ پایا جاتا ہے۔ آسمانی کتابوں میں شہد کی مکھیوں کا
ذکر آیا ہے۔ قرآن میں سورۂ نحل میں خود خدا نے اس مخلوق کی حیرت خیز زندگی
کو اپنی قدرت کی ایک نشانی قرار فرمائی ہے۔ پہلے جس شخص نے شہد کی مکھیوں
کے حالات کو قلمبند کیا ہے وہ ارسطو تھا۔ آج دو ہزار دو سو اڑتیس سال کی مُدت
گزری کہ اس حکیم نے اپنی کتاب تاریخ حیوانات میں اس مخلوق کی زندگی کو بیان
کرتے ہوئے خیالی باتوں کے ساتھ گہرے مشاہدات درج کیے ہیں۔ روم کے
مشہور شاعر ورجل نے اپنے دیوان کے چوتھے حصہ میں شہد کی مکھیوں کے
حالات کو شاعرانہ جذبات کے ساتھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا
وجد میں آجاتا ہے۔ اور خدا کی شان اُسکے دل میں اپنی جگہ کر لیتی ہے۔ پلانی نامی
یورپ کے ایک مورخ نے اِن مکھیوں کا ایک معمولی تذکرہ لکھا تھا۔ لیکن اس کے
بعد چودہ سو برس تک پھر کسی نے اِس مضمون کی طرف خیال نہیں کیا۔ سترھویں
صدی کے آخر حصہ میں اس مخلوق کی زندگی گہری نگاہ سے دیکھی جانے لگی
اور سائنس کے اصول کے مطابق دقیق مشاہدات اور تحقیقات کے بعد تاریخ
طبعی لکھی جانی شروع ہوئی۔ کسی نے شہد کی مکھیوں کو شیشہ کے مصنوعی چھتے میں
پالا اور اُن کے اندرونی کام کو مشاہدہ کیا۔ کوئی اس ننھی سی مخلوق کی تشریح کی اُدھیڑ
بُن میں لگا رہا۔ اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ جس مکھی کو امیر نحل کہتے ہیں وہ نر نہیں
بلکہ مادہ ہے اور اِس لحاظ سے وہ ملکہ کے خطاب سے پکاری جانے کی مستحق ہے
غرض اس مضمون پر بہت سی مستقل کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ہیں اُن میں
سب سے زیادہ خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنے کے قابل ریومر صاحب کی کتاب ہے

جو ۱۷۴۴ء میں نہایت تحقیق کے ساتھ لکھی گئی - ایک کتاب کا ذکر اور سُن لو جو اسوقت تمام دنیا کے نزدیک صحیح اور مستند مانی جاتی ہے - یہ کتاب جو ۱۸۱۴ء میں شائع ہوئی - ھیوبر صاحب کی قابل قدر تصنیف ہے - اسمیں شہد کی مکھیوں کی نسبت حیرت انگیز مشاہدات اور تجربات درج ہیں ؀

(ملکہ مکھی)

تاریخ علم حیوانات میں سب سے نرالی بات جو شہد کی مکھیوں کو دوسرے پردار کیڑوں سے الگ کر دکھاتی ہے وہ اُنکی ایک ساتھ ملکر رہنے کی عادت ہے - ان کی تمدُنی حالت آپس میں کام کی تقسیم حیرت خیز ہے - ان سب باتوں کو خیال کرنے سے ان کیڑوں میں عقل کے نورانی جوہر کی چمک دکھائی دیتی ہے - فرائض زندگانی کے لحاظ سے ایک چھتے میں تین طرح کی مکھیاں ہوتی ہیں - سب مکھیوں سے بڑی چھتے میں ایک مکھی ہوتی ہے - جسکا بدن چھریرا قد لمبا - اور کمر نازک و گاودم ہوتی ہے - اُسکا رنگ زیادہ سیاہ اور چمکدار ہوتا ہے - یہ مکھی کُل مکھیوں کی رانی ہے اور چھتے کی ساری حکومت اِسکے تعلق ہوتی ہے - چھوٹی مکھیاں اپنی ملکہ کو پیار کرتی ہیں اور دس بارہ مکھیاں اُسکے جلو میں ہروقت حاضر رہتی ہیں - اِسکے رہنے کے لیئے چھتے میں ایوانِ شاہی نہایت تکلف سے تیار کیا جاتا ہے - اور اُسکی غذا کو جو نہایت مقوی ہوتی ہے فراہم کرنے میں ایک خاص اہتمام ہوتا ہے - ملکہ مکھی جسکو سابق میں امیر نحل کہتے تھے نہایت شان سے رہتی ہے - اِس کے بازو کمزور اور نازک ہوتے ہیں - جب چھتے سے باہر پرواز کرتی ہے تو کُل مکھیاں اِسکے ساتھ ہو لیتی ہیں اور جہاں اُنکی ملکہ تھک کر ٹھیر جاتی ہے - خادم مکھیاں اِسکے ہر چہار طرف ہجوم کر لیتی ہیں - ملکہ مکھی کی زبان چھوٹی اور پر کمزور ہوتے ہیں - اِس سے کوئی کام نہیں ہوسکتا اِسکی زندگی کا فرض محض انڈے دینا ہے - ملکہ کی زندگی کل پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی -

اور کھلی ہوئی ہوا میں زیادہ رہتی ہے اور جب انڈے دینے کے قابل ہو جاتی ہے
تو ملکہ بامراد اپنی اقلیم کو واپس آتی ہے اور انڈے دینا شروع کرتی ہے۔ تم سُنکر
حیرت کرو گے کہ ملکہ ایک دن میں دو ہزار انڈے دیتی ہے۔ اسکو ایک انڈے دینے
والی قدرتی کل سمجھو جو دن رات لگاتار انڈے دیئے جاتی ہے اور ایک مہینہ کے عرصہ
میں چھتے کے کُل خانوں کو جو پچاس ساٹھ ہزار ہوتے ہیں انڈوں سے بھر دیتی ہے
ہر ایک خانہ میں ایک انڈا ہوتا ہے۔ اسکا ذکر آگے آئیگا۔ ابھی دوسری باتیں سُنو
مکھیوں کی رانی کو تم آسانی سے تمیز کر سکتے ہو۔ اسکی صورت سے وقار شاہی اور
تمکنت نمایاں رہتی ہے اور جہاں وہ رہتی ہے مکھیاں اُسکے اردگرد ہر طرف سے جمع
رہتی ہیں اور سب کا رُخ ملکہ کی طرف ہوتا ہے۔ جب مکھیوں کی ملکہ زچہ خانے میں
وفات کر جاتی ہے یا نئے جھول کو لیکر اُڑ جاتی ہے تو چھتے کا کل کام بند ہو جاتا ہے
اور خادم مکھیوں پر ایک آفت آ جاتی ہے۔ اُسوقت وہ یا تو کسی اجنبی ملکہ کو اپنا حاکم
تسلیم کر کے چھتے کی حکمرانی اُسکے سپرد کرتی ہیں یا چھتے کی نوخیز شہزادیوں میں
چُن کر کسیکو اپنی رانی بناتی ہیں۔ ملکہ مکھی اور خادم مکھیاں ایک ہی قسم کے انڈوں
سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیئے مکھیوں میں یہ قدرت ہے کہ وہ جس بچہ کو چاہیں بشرطیکہ
وہ نر نہو مقوی غذائیں کھلا پلا کر نئی رانی تیار کر لیتی ہیں +

(نر مکھی) ہر چھتے میں دو ہزار سے آٹھ ہزار تک ایسی مکھیاں ہوتی ہیں جنکا بدن چوڑا
چکلا اور بھاری ہوتا ہے۔ اُن کا سر گول اور کمر موٹی ہوتی ہے یہ مکھیاں نر ہیں جنسے
ملکہ جوڑ کھاتی ہے۔ ان مکھیوں کے ڈنک نہیں ہوتا اور انکی پرواز نہایت تیز ہوتی ہے
جس سے ایک گونجتی ہوئی آواز پیدا ہوتی ہے۔ نر مکھیوں کی آنکھیں بڑی ہوتی ہیں
اور انکی صورت کچھ ایسی بھدی سی ہوتی ہے کہ تم دیکھکر فوراً پہچان سکتے ہو۔
نر محض کاہل ہوتے ہیں۔ اُنکو نہ شہد جمع کرنا آتا ہے اور نہ موم بنا سکتے ہیں۔ دن رات

اپاہج کی طرح بیٹھے ہوئے چھتے میں شہد چاٹا کرتے ہیں اور خادم مکھیوں کی محنت اور جانفشانیوں کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ نروں کی تمام زندگی کا فرض محض ایک اتنا ہی کام ہے۔ کہ وہ ملکہ مکھی کو انڈے دینے کے قابل کر دے جب تک یہ ضروری کام انجام نہیں پاتا۔ خادم مکھیاں نروں کو خوشامد سے اپنے چھتے میں رہنے کی اجازت دیتی ہیں۔ اور بیکار بیٹھکر شہد کا کھانا گوارا کرتی ہیں۔ لیکن جب ملکہ حاملہ ہو جاتی ہے اور انڈے دینا شروع کرتی ہے تو نر چھتے سے باہر نکال دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر وہ اس ذلت کو گوارا نہ کریں اور باہر نکل جانا نہ چاہیں تو خادم مکھیاں اُنکو ڈنک مار کر نہایت بے رحمی سے ہلاک کر ڈالتی ہیں۔ مئی یا جون کے مہینوں میں نر کثرت سے نظر آتے ہیں۔ لیکن جاڑوں میں اِن کا پتہ نہیں ملتا +

(خادم مکھی) چھوٹی چھوٹی مکھیاں جنکو تم دن رات چھتے سے باہر آتے جاتے دیکھتے ہو یہ خادم مکھیاں ہیں۔ اِن کا قد چھوٹا ٹانگیں بڑی اور رنگ کالا ہوتا ہے۔ اِن کے پچھلے پیروں میں سخت بال ہوتے ہیں جو زر گل کو جھاڑنے میں کوچی کا کام دیتے ہیں۔ ایک چھتے میں عموماً خادم مکھیوں کی تعداد بیس ہزار سے تیس ہزار تک ہوتی ہے۔ اور اِن سب کی سردار ہر چھتے میں ایک مکھی ہوتی ہے جسکا ذکر اوپر سُن چکے ہو۔ خادم مکھیوں کا کام محنت کرنا ہے۔ پھُولوں کا رس لانا زرگل کا ذخیرہ جمع کرنا بچّوں کی خبر گیری اُنکو کھلانا اور پرورش کرنا موم بنانا اور چھتے کی پُر حیرت عمارت کا تیار کرنا۔ یہ کل کام چھوٹی مکھیاں انجام دیتی ہیں۔ کام کرنے والی یا خادم مکھیاں اپنے چھتے کی رانی کی اطاعت و فرمانبرداری کا پُورا پُورا حق ادا کرتی ہیں۔ اپنی ملکہ کی یہ جاں نثار رعایا ہیں جنکی وفاداری قابل رشک ہے چھتے میں اگر کوئی غنیم مثلاً چوہا۔ گھونگھا۔ یا چھپکلی گھُس آتی ہے تو خادم مکھیاں ڈنک مار مار کر اُسکو اُتو بنا دیتی ہیں۔ اور اِس طرح اُسکو ہلاک کر ڈالتی ہیں کہ اگر غنیم اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا تو خیر

ورنہ اُسکی لاش کو خانہ ساز سریش سے چپکا کر چھتے میں دفن کر دیتی ہیں۔ یہ سب
کچھ ہوتا ہے اور ہزاروں مکھیاں اِس اہم اور خوفناک جنگ میں جان بحق ہوجاتی
ہیں۔ لیکن اپنی ملکہ پر جیتے جی کوئی خطرہ نہیں آنے دیتیں کام کرنیوالی مکھیاں
زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکتیں۔ دن رات کی محنت آخر انکی جان پر بن آتی ہے
وہ چھ سات ہفتہ کی زندگی کے بعد کام کرتے کرتے مرجاتی ہیں اور نوخیز بچوں
کو جن کا رنگ بھُورا ہوتا ہے اور تم دیکھکر اُنکو تمیز کر سکتے ہو اپنا جانشین چھوڑ جاتی
ہیں۔ خادم مکھیوں کی تشریح سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وہ حقیقت میں مادہ
ہیں گو کہ ظاہرا اِن میں نر یا مادہ ہونے کی کوئی علامت موجود نہیں ہوتی ہے لیکن
اِن مکھیوں میں بیضہ داں کا نشان صاف نظر آتا ہے جسکو دیکھنے سے یہ بات
معلوم ہوتی ہے کہ اُسکی نشو و نما پوری نہیں ہونے کی وجہ سے وہ ناقص رہگیا ہے
اور یہی وجہ ہے کہ خادم مکھیاں جب کبھی اپنی ملکہ کی مقوی غذا کو کھا لیتی ہیں
تو وہ خود انڈے دینا شروع کرتی ہیں۔ لیکن اِن انڈوں کا قوائے حیوانی بیمار
ہوتا ہے اور اُن سے محض نر مکھیاں پیدا ہوتی ہیں جنسے چھتے کی آبادی خراب
ہوجاتی ہے۔ کام کرنے والی مکھیوں اور اُنکی ملکہ کی ذات ایک ہی فرق اتنا ہے
کہ ملکہ عمدہ اور مقوی غذائیں کھا کھاکر پھُوٹ کر جوان ہوجاتی ہے اور خادم مکھیوں
کی نمو جنکے کھانے کو معمولی غذا دی جاتی ہے۔ دب جاتی ہے اور اُن کا عضو
تولید ناتمام رہجاتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جب چھتے کی رانی مرجاتی ہے اور خادم
مکھیاں آیندہ نسل کی فکر و سوچ میں پڑجاتی ہیں تو خود انڈے دینے کے تہیہ
میں خلوت نشیں ہوجاتی ہیں اور اُنکے جذباتِ نفسانی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سچ مچ اِن
میں انڈا دینے کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے + (باقی آیندہ)

سید راحت حسین بی۔ اے۔ از بھاگلپور

امیر مینائی

اس نامور فلسفی شاعر کے مولد ہونیکا فخر خاک پاک اودھ اور شہر مینو سواد لکھنؤ کو حاصل ہے۔ نواب مرزا شوق کے سوا تقریباً کل کے کل شعراے لکھنؤ کی شاعری کی امتیازی صنعت ابہام اور مراعات رہی ہے۔ امیر مرحوم نے زمانہ کی روش سے متاثر ہو کر یا اپنی طبع خداداد کی رہبری سے ان ظاہری مصنوعی خوبیوں کو نظرانداز کر کے اداے معانی و مطلب کا مسلک پسندیدہ اختیار کیا۔ امیر کو ایک طرف عاشقانہ تغزل کی صف اول میں ممتاز درجہ حاصل ہے تو دوسری طرف تصوف و معرفت میں اپنے خاص رنگ میں اُنکا کوئی سہیم و عدیل نہیں۔ قدرت نے فقیرانہ دل اور متاثر قلب ودیعتاً امیر کو ودیعت کیا تھا۔ ساری عمر نعت گوئی اور عارفانہ تغزل میں گزری۔ آخر وقت زمانہ کے دیکھا دیکھی عاشقانہ شاعری اختیار کی اور باوجود فن مستعار ہونیکے اسمیں بھی وہ وہ طبیعت کے جوہر دکھلائے کہ نقادان سخن نے ان کو بلبل ہندوستان داغ کا ہم پلہ و ہمصفیر قرار دیا۔ مدتوں والئی ریاست رام پور کے ہاں بزم مشاعر کے شمع انجمن رہے۔ اور جب قدردانئی اہل کمال کا چراغ ریاست مذکور میں گل ہو گیا تو وطن کو خیرباد کہکر دکن کی طرف روانہ ہوئے اور غربت ہی میں جان شیریں مالک حقیقی کے سپرد کر دی +

مرحوم کا کلام صاف ستھرا روزمرہ سے مالامال اور اکثر اصناف شاعری سے پُر ہے۔ ایک لہلہاتا باغ ہے جسمیں انواع و اقسام کے پھول اپنی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ کہیں رندی و شاہد بازی ہے تو کہیں تصوف اور معرفت، کہیں بندگانہ عجز و نیاز کی دلکش تصویریں ہیں تو کہیں مناظر قدرت کے دل آویز نظارے۔

موسیقیانہ انداز، لطفِ بندش، اور ردیف قافیہ کی چاشنی سے کلام کا کلام مملو ہے اور غزلیں کی غزلیں اپنی آپ ہی نظیر ہیں*

روزمرّہ روزمرّہ اِس سے بہتر اَور کیا ہوگا۔ فرماتے ہیں*

تاک جھانک اغیار سے دن رات ہے ۔۔۔ اب یہ کچھ چوری چھپے کی بات ہے

وصل کے نام پر کہا۔ کیا خوب! ۔۔۔ جو مری چڑ وہ آپ کا مطلب

ایک جان اور حسرتیں لاکھوں ۔۔۔ ایک دل اور ہزارہا مطلب

مُنہ لگے کوُن روز ناصح کے ۔۔۔ بات سمجھے۔ نہ بات کا مطلب

بُری ہو نہ قسمت الٰہی کسی کی ۔۔۔ کہ جو سُوجھتی ہے بُری سُوجھتی ہے

شوخی روزمرّہ اور شوخی کا باہم تال میل ہے۔ ایک کو دوسرے سے فروغ ہوتا ہے۔ امیر اِن دونوں خوبیوں کو بڑی کامیابی کے ساتھ جمع کرتے ہیں۔ اوپر کے اشعار شوخی کی بھی بے مثل نظیریں ہیں۔ پھر اِسکے علاوہ فرماتے ہیں*

یہ وضع مجکو نہیں ہے پسند۔ جاؤ بھی ۔۔۔ ادا نکالی ہے تیوری چڑھا کے آئینکی

لے چکے دل تو ہنس کے فرمایا ۔۔۔ پیار اب کیجئے گا کس دل سے

آئینہ دیکھکر وہ شرمائے ۔۔۔ آنکھ نیچی ہوئی مقابل سے

نکیلے تم ہو۔ سجیلے ہو تم۔ رسیلے تم ۔۔۔ پھر اَور دل کو میں رکھ چھوڑوں کس طرح اِن کیلئے

ذرا رُخ پا کے اُن کا لیلیا بوسہ تو وہ بولے ۔۔۔ کسی کے مُنہ لگانے ہی نہیں ہم کو مشکل ہے

یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

کام آگئی شوخی کہ نقاب اُس نے اُلٹ دی ۔۔۔ شب کو تو مجھے مار ہی ڈالا تھا حیا نے

ذیل کی غزل شوخی اور روزمرّہ کی مثال ہے*

اُن کی یہ ضد کہ نہیں۔ آج نہ دینگے بوسہ ۔۔۔ دل کی یہ ضد کہ بہلتا نہیں بہلائے سے

قاضیِ شہر ہو یا شیخِ حرم کوئی ہو ۔۔۔ جو نہو مست نکالو اُسے میخانے سے

شیخ جی اُٹھے تو لغزش نے قدم لیکے کہا اُٹھ کے کیوں بیٹھ گئے۔ جاؤ نہ یخانے سے
چاہ کی آنکھ سے جوبن کو جو دیکھا تو کہا کہیں یہ مال ملا جاتا ہے للچانے سے
زاہد و وعظ کی مجلس سے ہی کس کو انکار تم چلو۔ پی کے ہمیں آیا ابھی میخانے سے
شیخ جی رہتی ہیں کیوں سرخ تمہاری آنکھیں شب کو کیا لال پری آتی ہے میخانے سے
کل نظر آئے تھے جاتے ہوئے مسجد کو بہر آج دیکھا تو چلے آتے ہیں میخانے سے

پھر فرماتے ہیں *

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب وہ الگ باندھکے رکھا ہے جو مال اچھا ہے
شیخ جی چھپکے یہ حجرے میں اُڑانا بوتل واہ وا آج تو حضرت تمہیں ہم مان گئے

پھر فرماتے ہیں *

محتسب پوچھ نہ تو شیشہ میں کیا رکھا ہے پارسائی کا لہو اس میں بھرا رکھا ہے
آپ نے غیر کا خط ہم سے چھپا رکھا ہے دیکھئے دیکھیئے تکیے میں وہ کیا رکھا ہے
ہیں تغافل میں بھی سرگرم ستم وہ آنکھیں آپ تو سوتے ہیں فتنوں کو جگا رکھا ہے

ذیل کی غزل میں شوخی اور روزمرہ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں *

ہو چکا وعدہ کہ کل آئیے گا دیکھئے اب نہ بدل جائیے گا
وعدہ آنے کا جو فرمایئے گا جیسے آج آئے تھے کل آئے گا
اتنی گھر جانے کی جلدی کیا ہے بیٹھئے۔ جائیے گا جائیے گا
کہتے ہیں۔ کہہ تو دیا آئیں گے اب یہ کیا چڑ ہے کہ کب آئیے گا
رات اپنی ہے۔ ٹھہریے تو ذرا آئیے۔ بیٹھئے۔ گھر جائیے گا
وصل میں بوسہ لب دیکے کہا مُنہ سے کچھ اور نہ فرمایئے گا

جذبات حسن پرستی عوام الناس کا بھی شیوہ ہے۔ مگر اہل دل حسن دیکھکر اور بھی تڑپتے ہیں۔ فرماتے ہیں *

گھٹا ہیں برق جو چمکی تو یاد آئی مجھے
ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

بزم جنت کی کھینچی ہے تصویر
رنگ لیکر تمھاری محفل سے

اس ادا سے وہ آئے وصل کی رات
کہ نکل آئیں حسرتیں دل سے

یہ شعر ملاحظہ ہو +

طنابیں کھینچ دے یارب زمین کوئے جاناں کی
کہ میں ہوں ناتواں اور دن ہے آخر دور منزل ہے

پھر فرماتے ہیں +

جوڑا جو کھلا دوڑ پڑے سیکڑوں فتنے
لیں بڑھ کے بلائیں ترے بالوں کی بلائے

سوز و گداز ملاحظہ ہو +

ہے وہی حسرت دیدار وہی شوق وصال
دل گیا ہائے مگر دل سے نہ ارمان گئے

دل کو تاکا کسی ناوک نے تو اللہ رے شوق
بڑھ کے لینے کو بہت دور تک ارمان گئے

قسمت جو لے چلی مجھے کوچہ سے یار کے
حسرت سے دیکھ کے سوئے گردوں اک آہ کی

فریاد کس سے کوچۂ الفت میں کیجئے
سنتا نہیں ہے کوئی کسی داد خواہ کی

موسیقیانہ انداز اور اظہار محبت اس سے بڑھکر اور کہاں ملیگا +

کوچۂ یار پر ختن صدقے
سگ محبوب پر ہرن صدقے

ایک سیدھی نگاہ پر تیری
لاکھ بانکوں کا بانکپن صدقے

تو وہ ہے شمع انجمن جس پر
انجمن کی ہے انجمن صدقے

خط عارض پہ سبزہ زار نثار
گل رخسار پر چمن صدقے

پھر فرماتے ہیں +

رتبہ شہید عشق کا گر جان جائیے
قربان ہونیوالے کے قربان جائیے

ہم کو تو ہائے کوئی کہیں پوچھتا نہیں
پوچھے تو لاکھ مرتبہ مہمان جائیے

یہ شعر ملاحظہ ہو +

گھر غیر کے منہ سے مری جان چاہیئے — شوخی و شرم دونوں نگہبان چاہیئے
محشر میں بھی شہید محبت کو ہے یہ رٹ — اک ہاتھ اور بھی ترے قربان چاہیئے

ذیل کی غزل کی غزل جذبات محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ہر ایک شعر دوسرے شعر سے بڑھ چڑھ کر ہے +

آغاز جوانی میں ادا اور ہی کچھ ہے — اٹھتی ہوئی کونپل میں مزا اور ہی کچھ ہے
اے چرخ حسینوں کی جفا اور ہی کچھ ہے — معشوق کی چھیڑوں میں مزا اور ہی کچھ ہے
قاصد یہ زباں اسکی بیاں اسکا نہیں ہے — دھوکا ہو تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے
آفت تو ہے وہ ناز بھی انداز بھی لیکن — مرتا ہوں میں جس پر وہ ادا اور ہی کچھ ہے

تخیل ملاحظہ ہو +

چہرے کو چھپائیں وہ بدن کو بھی چرائیں — آنکھیں یہی کہتی ہیں حیا اور ہی کچھ ہے
بیداد کی فریاد کو کوئی نہیں سنتا — جس پر ہے اثر عرش وہ دعا اور ہی کچھ ہے
کیا خاک ہو بیمار محبت کو افاقہ — درد اور ہی کچھ اور دوا اور ہی کچھ ہے

تخیل پھر ملاحظہ ہو +

کی میں نے لجائی ہوئی چتون کی جو تعریف — آنکھوں نے کہا جھک کے حیا اور ہی کچھ ہے
انداز حسینوں کے سنورنے میں ہے کچھ اور — بگڑیں تو بگڑنے میں ادا اور ہی کچھ ہے
بے لطف تو شمشیر قضا بھی نہیں قاتل — لیکن تیرے خنجر میں مزا اور ہی کچھ ہے

پھر تخیل ملاحظہ ہو +

منہ سے تو کہا وصل کو تم نے مگر اے جاں — آنکھوں نے اشاروں میں کہا اور ہی کچھ ہے

ذیل کی غزل اپنا آپ ہی جواب ہے +

عجب عالم ہے اسکا۔ وضع سادی شکل بھولی ہے — کھبی جاتی ہے دل میں کیا رسیلی نرم بولی ہے
ادائیں کھیلتی ہیں رنگ۔ تلوار اُس نے تولی ہے — لہو کی چلتی ہیں پچکاریاں مقتل میں ہولی ہے

عجب ملبوس ہی ہم وحشیوں کا رختِ عریانی   گریباں ہی نہ دامن ہی نہ پردہ ہی نہ چولی ہی
پری نے قاف میں دیکھی جو وہ تصویر بول اٹھی   میں اس صورت کے صدقے ہائی کیسی بھولی بھولی ہی
خفا کیوں ہو جو آوازے کسی عاشق نے غیروں پر   یہ آزادوں کی باتیں ہیں یہ انکی بولی ٹھولی ہی

اس شعر میں شوخی اور تخیل ملاحظہ ہو۔

صراحی دور میں آتی ہی زاہد ہوں جو محفل میں   جھکالیں اپنی آنکھیں دخترِ رز کی یہ ڈولی ہی

ذیل کے اشعار بھی اپنے رنگ میں بے مثال ہیں۔

تیغ کھینچے جو یار آتا ہے   اور بھی مجھکو پیار آتا ہے

اس شعر کی شوخی ملاحظہ ہو۔

دل کو اب کب قرار آتا ہے   سن لیا ہے کہ یار آتا ہے

اس شعر میں صنعت مقابلہ ملاحظہ ہو۔

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ   ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے

اس غزل کا ایک ایک شعر باعتبار شوخی و جذبات لاجواب ہے۔

حور ہے یارب جو مومن کے لیے   بھیجدے دنیا میں دو دن کیلیے
پی بھی لے زاہد جوانی میں شراب   عمر بھر ترسے گا اس دن کیلیے
ہے جوانی خود جوانی کا سنگار   سادگی گہنا ہے اس سن کیلیے

اس شعر کی شوخی ملاحظہ ہو۔

سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند   اب کوئی حور آئے گی ان کیلیے
وصل کا دن اور اتنا مختصر   دن گنے جاتے تھے اس دن کیلیے
گالیوں میں بھی بتوں کی ہے مزا   اک ہنر ہے عیب بھی ان کیلیے
مجھ سے رخصت ہو مرا عہدِ شباب   یا خدا رکھنا نہ اس دن کیلیے

شوخی ملاحظہ ہو۔

بوسہ بازی میں انھیں دھوکے دیئے ۔ بے گنے دس میں دس گن کیلئے

ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ سوز و گداز توجہ کے قابل ہے ٭

عشق میں جی سے گزرتے ہیں گزرنیوالے ۔ موت کی راہ نہیں دیکھتے مرنیوالے

آخری وقت بھی پورا نہ کیا وعدۂ وصل ۔ آپ آتے ہی رہے مر گئے مرنیوالے

آسماں پر جو ستارے نکل آئے تو امیر ۔ یاد آئے مجھے داغ اپنے اُبھرنیوالے

مقطع میں مناظر قدرت کی تشبیہ لیکر کیفیات قلب کو بیان کر جانا امیر مرحوم کا خاص حصہ ہے اور مرحوم کے بعد جو کوئی اس رنگ کو اختیار کریگا مرحوم کا متبع ہوگا۔ ذیل کے چند اشعار ایک اچھا خاصہ مرثیہ ہیں ٭

نہ سُنے درد دل مرا نہ سُنے ۔ میں کہوں گا سُنے وہ یا نہ سُنے

کسی نا آشنا کا کیا شکوہ ۔ آشنا کی جب آشنا نہ سُنے

لاکھ دل چسپ ہو مرا قصہ ۔ مگر اُسنے کبھی سُنا نہ سُنے

درد پر دل نثار دل پر درد ۔ ایسے دیکھے ہیں آشنا نہ سُنے

اس شعر کی تڑپ ملاحظہ ہو۔ تخیّل داد طلب ہے ٭

لوٹ ہو جسپہ تبسم وہ دہن کسکا ہے ۔ باتیں مُنہ چومیں وہ اندازِ سخن کسکا ہے

ذیل کے اشعار میں آرزومندی کا کتنا دلفریب نقشہ ہے ٭

ساقی ہوں تری بزم میں میں تشنہ جگر بھی ۔ صدقے تری آنکھوں کے کوئی جام ادھر بھی

تو چشم سخنگو سے بیٹھے پوچھ سکے اتنا ۔ میں باتیں ہی باتیں کہ ہے کچھ مدِ نظر بھی

اس شعر کا تخیّل اور وارفتگی ملاحظہ ہو ٭

انکھڑیاں تیری ہیں نظروں میں مری تو دل میں ۔ سیر ہے آنکھوں میں پریاں ہیں پری رو دل میں

یہ چار شعر ملاحظہ ہوں ٭

محبت کے جو داغ ڈالے ہوئے ہیں ۔ اُبھر کر وہی دل میں چھالے ہوئے ہیں

زمانہ قضا کے حوالے ہے اور ہم تمھاری ادا کے حوالے ہوئے ہیں
ہائے وہ دن کہ گزر جاتی تھی شب باتوں میں اب نہ باتوں میں مزا ہے نہ ملاقاتوں میں
صورت تری دکھا کے کہونگا میں روزِ حشر آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

ذیل کی غزلیں امیر مرحوم کی اُن مشہور غزلوں میں سے ہیں جن کا جواب کبھی ممکن نہیں۔ اور جو بجائے خود امیر کو شعراے اُردو کی صفِ اول میں داخل کرنیکے لیے کافی ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

وہ بیکس ہوں۔ نہیں ہے کوئی میرے غمگساروں میں
فقط اِک دل ہے سو وہ بھی تمھارے جاں نثاروں میں

ہوئے ہم قتل جب۔ جلسہ نظر آیا حسینوں کا
بٹا یہ خونِ ناحق چُلّو چُلّو گلعذاروں میں

خدا جانے کہاں دل۔ جان کس جلسے میں ہے اپنی
بظاہر بُت بنے بیٹھے ہیں ہم ہر چند یاروں میں

سوئے گورِ غریباں آئیں وہ یہ پوچھتے یارب!
مرے کُشتہ کی تربت کون سی ہے ان مزاروں میں

رہے ہم زمینوں کی قبر میں یارب کوئی روزن
مزے مرکر بھی اُٹھیں چاندنی آئے مزاروں میں

یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

بہار آئی۔ گھٹا چھائی۔ چلے ساغر۔ کھُلے بوتل
نہ تم پرہیزگاروں میں نہ ہم پرہیزگاروں میں

پچھلے شعر میں صنعت تقسیم بھی امیر مرحوم کا خاص حصہ ہے۔ یہ دو تصویریں ملاحظہ ہوں ؎ پہلی تصویر ؎

تڑپا ہیں جو آنکھوں کو پسند آگئیں آنکھیں
دو جام تھے لبریز کہ چھلکا گئیں آنکھیں
تیغیں تھیں کہ یا رب مرے قاتل کی نگاہیں
بسمل کی طرح سے مجھے تڑپا گئیں آنکھیں
آفت کی سفیدی تھی قیامت کی سیاہی
نیرنگِ دو عالم مجھے دکھلا گئیں آنکھیں

دوسری تصویر*

تیغ قاتل پہ ادا لوٹ گئی
رقص بسمل پہ قضا لوٹ گئی
پس گیا چشم سیہ پر سرمہ
پائے رنگیں پہ حنا لوٹ گئی
اونچی چوٹی کی ادا گر دیکھی
نیچی نظروں پہ حیا لوٹ گئی

یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

مرے بس میں یا تو یا رب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا
وہ فراد یا تڑپنے کہ یہ آرزو ہے یا رب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

مناظر قدرت مناظر قدرت کی شاعری پرانی روش کے شعرا میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ مگر امیر نے اس صنفِ خاص میں بھی طبیعت کے جوہر دکھلائے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں*

بہار آئی ہے۔ ساقی۔ عام فیضِ مے پرستی ہے
در و دیوار سے اس دَور میں مستی برستی ہے

اس شعر کا تخیل کسی بڑے سے بڑے انگریزی شاعر کے لیئے بھی قابلِ فخر ہو

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر
ادا کسی کی وہ پردہ اُٹھا کے آنیکی

یہ چلبلا شعر اور تخیل بھی قابل ملاحظہ ہے۔

صبا ان مُنہ بندھی کلیوں نے کسکی شب کو چوری کی
کہ تُو نے صبح کو ایک ایک کی بُقچی ٹٹولی ہے

ذیل کی غزل اس رنگ خاص میں قابل داد ہے*

ذوقِ مینوشی بڑھاتی ہو گھٹا برسات کی
اور لے اُڑتی ہو مستوں کو ہوا برسات کی

ابر و دریا سبزہ۔ساقی یار مطرب دُختِ رز
ہوں یہ سب ساماں تو پھر دیکھیں فضا برسات کی

رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں نو عروسانِ چمن
پتّی پتّی سے برستی ہے ادا برسات کی

مور ناچے۔کوئلیں کوکیں پپیہے بول اُٹھے
وصل کے دن آ گئے فصل آ گئی کیا برسات کی

ساقیا جام و سبو سے ایسی آرایش بڑھے
آ کے میخانہ پہ صدقے ہو گھٹا برسات کی

یہ شعر خصوصاً ملاحظہ ہو:

برق چمکاتی ہوئی کہسار سے اُٹھی نہیں
نیچے کھینچے ہوئے آئی گھٹا برسات کی

فنا فنا کے مضامین اور شعرا نے بھی باندھے ہیں۔مگر امیر کا رنگ کچھ اور ہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

فسانہ رہ گیا حسنِ محبت کا زمانے میں
نہ مجنوں ہے نہ لیلیٰ ہو نہ ناقہ ہو نہ محمل ہے

دیکھ غفلت میں جوانی کو نہ کھو
عمر بھر میں اک یہی تو رات ہو

کبھی سُونی نہیں ہوتی ہو سرائے دنیا
اور دس آ گئے۔دو چار جو مہماں گئے

اہلِ عدم سے کیوں نہ ہو منزل پہ میل جول
ہے ان مسافروں میں ملاقات راہ کی

پھر فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں:

ٹھوکریں کھلوائیگی یہ چال اٹھلائی ہوئی
کیا جوانی پھرتی ہے جوبن پہ اترائی ہوئی

لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کیلئے

بعد مرنے کے بھی چھوڑی نہ رفاقت میری
مری تربت سے لگی بیٹھی ہے حسرت میری

چین سے خوب کے آغوش میں میں سوتا ہوں
سیج فردوس کے پھولوں کی ہے تربت میری

ذیل کی بے نظیر غزل عدم کی ہو بہو تصویر ہے:

سرِ راہِ عدم گورِ غریباں طرفہ بستی ہے
کہیں غربت برستی ہے کہیں حسرت برستی ہے

تری مسجد میں واعظ خاص ہیں اوقات رحمت کے
ہمارے میکدہ میں رات دن رحمت برستی ہے

جوانی لے گئی ساتھ اپنے سارا جوش مستی کا صراحی ہی نہ شیشہ ہی نہ ساغر ہی نہ مستی ہے
کبھی کروٹ نہیں لیتا کوئی گور غریباں میں یہ کیسی نیند سوتے ہیں یہ کیسی انکی مستی ہے

یہ شعر خاصکر ملاحظہ ہو:۔

ترے قربان اے مرگ غریبی جلد اب لے چل وطن کے دیکھنے کو روح مدت سے ترستی ہے
دل ویراں کو میرے دیکھکر کہتی ہے ویرانی خدا آباد رکھے اسکو کیا دلچسپ بستی ہے

یہ شعر پھر ملاحظہ ہو:۔

نہ گھبرا اے دل واماندہ اب منزل قریب آئی اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے

عجز و نیاز فنا کی طرح عجز کے مضامین بھی امیر نے اپنی طرز خاص میں نہایت ہی دلفریبی کیساتھ ادا کیے ہیں۔ ذیل کی غزل فنا اور عجز کا مشترک رنگ لیے ہوئے ہے:

گزشتہ خاک نشینوں کا یادگار ہوں میں مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں میں
زمین قصر سلاطیں سے آ رہی ہے صدا کہ آج منزل غربت ہوں کل مزار ہوں میں

یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

کچھ آج میں نے نئی پی ہی حضرت واعظ! ازل کا مست پرانا شراب خوار ہوں میں
ترے کرم میں کمی کچھ نہیں کریم ہے تو مرا قصور ہے۔ جھوٹا امیدوار ہوں میں
نگاہ گرم سے مجکو نہ دیکھ اے دوزخ خبر نہیں تجھے کسکا گنہگار ہوں میں

یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

پھر اسکی شان کریمی کے حوصلے دیکھے گناہگار یہ کہدے گناہگار ہوں میں
وہ کشتہ ہوں کہ مری لاش جسطرف گزری زمیں پکار اٹھی قابل مزار ہوں میں
بلائیں لیتی ہے پھر پھر کے گرد نومیدی یہ کس کے در پہ الٰہی امیدوار ہوں میں
وہ بیقرار ہوں دیکھے اگر تڑپ میری قرار بھی یہ پکارے کہ بیقرار ہوں میں
بڑے مزے سے گزرتی ہے بیخودی میں امیر وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

یہ اور دو غزلیں اسی رنگ میں ملاحظہ ہوں۔ اہلِ حال و قال کی جان ہیں شوخی ملحوظ رہے۔ اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ کن مضامین میں شوخی سے کام لیا ہے ؎

حشر میں جسنے کہا بندہ خطا کاروں میں ہے ۔۔۔ رحمت اُسکی بولی چل تو کن گنہگاروں میں ہے
میں ہوں عاجز اور اُسکو عاجزی مرغوب ہے ۔۔۔ بے نیازی اُسکی میرے ناز برداروں میں ہے
حشر کے دن دیکھکر آغوش رحمت میں مجھے ۔۔۔ پوچھتی ہے خلق تو کسکے گنہگاروں میں ہے
ابر جب گھر گھر کے آتا ہے۔ پلاتا ہے شراب ۔۔۔ رحمت اُسکی آج ساقی بنکے میخواروں میں ہے

دوسری غزل"

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں ۔۔۔ تو سراپا ناز ہے۔ میں ناز برداروں میں ہوں
ہائے رے غفلت نہیں ہے آجتک اتنی خبر ۔۔۔ کون ہے مطلوب میں کسکے طلبگاروں میں ہوں

یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر ۔۔۔ چیخ اُٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہگاروں میں ہوں

یہ شعر پھر ملاحظہ ہو ؎

بیگناہوں میں چلا زاہد جو اُسکو ڈھونڈنے ۔۔۔ مغفرت بولی ادھر آ۔ میں گنہگاروں میں ہوں
اونچے اونچے مجرموں کی ہوگی پرسش حشر میں ۔۔۔ کون پوچھے گا مجھے۔ میں کن گنہگاروں میں ہوں

تصوف یہ وہ فقیرانہ رنگ ہے جو امیر کا ملبوسِ خاص ہے' اور جو باوجود ہمرنگ ہونیکے جملہ شعرائے متصوفین میں امیر کو شانِ امتیازی بخشی ہوئی ہے۔ تصوف کے باریک رموز اور نکات کو جس بے ساختگی اور آسانی سے امیر نے بیان کیا ہے شاید ہی کسی اور شاعر نے بیان کیا ہو۔ امیر کا تصوف لسانی تصوف نہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے دل سے کہتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُسکے دل کی نکلی ہوئی بات دل میں گھر کر لیتی ہے

چنانچہ ارشاد ہے ؎

کیا جانے کسے دیکھ رہا ہوں میں بتوں میں ۔۔۔ آنکھوں میں ہے کچھ۔ دلمیں بسا اور ہی کچھ ہے

ذرہ ذرہ دُردِ مے کا زاہدو دُور بیں ہے چشمِ باطن کیلئے
خودی سے بیخودی میں آ جو جوشِ حق پرستی ہے جسے تو نیستی سمجھا ہے اے غافل وہ ہستی ہے

اِس شعر کا تخیّل ملاحظہ ہو:

رازِ میخانے کے باہر نہ ہوں میخانے سے محتسب چھین نہ لے خط کہیں پیمانے سے

پھر فرماتے ہیں:

دل میں تم آنکھ میں تم کعبہ میں تم دیر میں تم تم جہاں چاہو چھپو۔ ہم تمہیں پہچان گئے

پھر فرماتے ہیں:

حسن و عصمت دونوں یکجا ہوں یہ ممکن ہی نہیں گھر میں وہ پردہ نشیں ہے۔ شور بازاروں میں ہے
خورشید بھی اُس نور کا مظہر ہے قمر بھی اے بے بصر و کچھ تمہیں آتا ہے نظر بھی

آفرینش کے مضمون کو کس شوخی سے ادا کرتے ہیں:

ستارے مِرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں یہ سب گیند اُنکے اُچھالے ہوئے ہیں

وحدت الوجود کے رنگ میں فرماتے ہیں:

دوسرا کون ہے جہاں تُو ہے کون جانے تجھے کہاں تُو ہے
لاکھ پردوں میں تُو ہے بے پردہ سو نشانوں پہ بے نشاں تُو ہے
تو ہی خلوت میں تو ہی جلوت میں کہیں پنہاں کہیں عیاں تُو ہے
نہیں تیرے سوا یہاں کوئی میزباں تو ہے میہماں تُو ہے
جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی جان کہتی ہے جانِ جاں تُو ہے

اسی مضمون کو زیادہ متانت سے یُوں ادا فرمایا ہے:

شوقِ خلوت میں بھی ہے انجمن آرائی کا آئینہ خانہ ہے گوشہ مری تنہائی کا
آئینہ دیکھ کے آئے ہیں مزے میں ایسے خود وہ مُنہ چُومتے ہیں اپنی تماشائی کا
دشت میں لالہ ہے۔ گلزار میں گل بزم میں شمع ہر جگہ رنگ نیا ہے مرے ہرجائی کا

یہ شعر خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے *

پھرتی ہے حسرت پابوس دو عالم میں تباہ اِک جگہ پاؤں ٹھہرتا نہیں ہرجائی کا

فنا فی الذات کے مضمون کو کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے *

کسی کی روح پہ صدمہ ہو اشکبار ہوں میں کسی کے دل میں اُٹھے درد بیقرار ہوں میں

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

عشق حقیقی کی تصویر ذیل کی غزل میں کھینچتے ہیں *

حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا

لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا

میں پرانا مست ہوں۔ جنت مرا کاشانہ تھا

حور ساقی۔ چشمۂ کوثر میرا پیمانہ تھا

سُن لیئے دو حرف جسنے ہوگیا سرمست عشق

چشم افسوں کار کا افسوں میرا افسانہ تھا

وعظ کی مجلس میں بھی آئے تو یوں مستانِ عشق

مے کی بوتل تھی بغل میں ہاتھ میں پیمانہ تھا

یہ شعر خصوصاً ملاحظہ ہو *

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخ حرم

آج کعبہ بن گیا۔ کل تک یہی بُت خانہ تھا

بیٹھے بیٹھے حکم دے اُٹھے وہ قتل عام کا

جب کہا یہ کیا۔ تو بولے ناز معشوقانہ تھا

تلاش محبوب کا مضمون کن الفاظ میں ادا کرتے ہیں *

اِس توقع پہ پھرا کرتا ہوں گلزاروں میں کہ کسی گل میں کبھی آئے تری بُو مجھکو

وطن کا مضمون یوں بیان فرماتے ہیں +

اِک عمر ہوگئی کہ اقامت سفر میں ہے — نقشہ مگر وطن کا ابھی تک نظر میں ہے
کیا ہستی و عدم کا کہیں حال اے امیر — اِس گھر سے تنگ جب ہوئے اُس گھر چلے گئے

کوچ کے مضمون کو کس دلفریبی کے انداز سے بیان کیا ہے +

تا چند امیر اس چمنستاں کا نظارہ — دل سیر سے اکتا گیا پتھرا گئیں آنکھیں
لامکاں میں نہ پتا ہی نہ مکاں میں میرا — مجکو کیا جانے کدھر لیگئی وحشت میری

امیر کی فقیرانہ طبیعت کا گہرا رنگ فنا۔ عجز اور تصوف کے مضامین میں صاف نظر آتا ہی جس خوبی اور سوز و گداز کے ساتھ مرحوم ان مضامین کو ادا کرجاتے ہیں وہ متاخرین تو کیا متقدمین میں بھی بہت کم کا حصہ ہی۔ یہ وہ میدان ہے جہاں داغ امیر کا ساتھ نہیں دیتے اور امیر اُن سے جدا ہوکر اِس میدان میں ایسے جاتے ہیں جیسے کوئی واقفکار راہرو جاتا ہو۔ امیر چمنستان ہستی صحرائے عدم اور ملک جاودانی سب کی راہوں سے واقف ہیں اُن کے دلمیں دنیا کی جائز محبت ہی۔ موت کی طرف سے بے پروائی۔ اور وصال حقیقی کا انتہا درجے کا شوق۔ امیر ایک حوصلہ مند شوقین مسافر ہی جو بازار عالم کی سیر کے لیے گھر سے نکلتا ہے۔ جبتک سیر میں دل لگا رہتا ہے سیر کے لطف اُٹھاتا ہے۔ اِس کے بعد منزلیں طے کرتا ہوا آرام و اطمینان کے ساتھ اپنے مسکن مالوف کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں +

ہمیں شاہد پرستی میں سمجھ معذور اے واعظ — جوانی کا ہی نشہ۔ بیخودی ہی جوش مستی ہی
بہنے کیا آئے تھے دنیا میں امیر — سیر کرلی۔ اور اپنے گھر چلے

امیر کی کوئی تعریف کامل نہیں ہوسکتی جب تک امیر کے نعتیہ کلام کا اُسمیں ذکر نہو مگر بدقسمتی سے امیر کا نعتیہ کلام بہت کمیاب ہے۔ اور ہمیں میسر نہیں +

ناشاد

غارہائے ایلورہ

غارہائے ایلورہ واقع اورنگ آباد کا تفصیلی بیان شروع کرنیسے قبل یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی قدیم طرز معاشرت اور اُنکی صناعی کا کسیقدر ذکر کیا جائے۔

ہندوستان کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا جنوبی حصہ یعنی دکن ابتدا سے ایک عرصہ تک تاخت و تاراج سے محفوظ رہا ہے۔ اور جو معرکہ آرائیاں۔ آفتیں اور مصیبتیں پیش آئیں۔ اُسمیں زیادہ تر شمالی ہندوستان کے لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ تاخت و تاراج و تباہی کے مصائب بھی اُنھوں نے زیادہ اُٹھائے ہیں۔ چنانچہ جسوقت آریہ وسط ایشیا سے روانہ ہو کر ملک اودھ و پنجاب کے زرخیز میدانوں میں سکونت پذیر ہوئے ہیں اُسوقت اُنھوں نے اُس مقام کا نام آریہ ورت رکھا۔ اور وہاں کے اصلی باشندوں سے لڑکر اُنکو ہندوستان کے جنوبی حصوں میں بھگا دیا۔ اور اُن بیچاروں نے اپنا ملک آبائی چھوڑ کر ان ہی پہاڑوں میں پناہ لی +

یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی قدیم سلطنتیں جنکے فرماں روا اہل ہنود و جین و بدھ وغیرہ مختلف اوقات میں رہے ہیں وہ نہایت جلیل القدر اور باثروت تھے۔ اور مختلف اقسام کے متعدد معدن بھی یہاں موجود ہیں۔ اسلیئے یہاں کے فرمانروا اور رعایا ہمیشہ سے نہایت خوشحال اور دولتمند رہے۔ اُنکو صدیوں تک نسلاً بعد نسل فارغ البالی اور اطمینان نصیب تھا جسکی وجہ سے اُنھوں نے جن کاموں کا عزم بالجزم کر کے بیڑا اُٹھایا اُسکو نہایت حُسن و خوبی کے ساتھ انجام کو پہنچایا۔ انہی کا ایک نمونہ ہم غارہائے ایلورہ و اجنٹہ وغیرہ کو دیکھ رہے ہیں

انکی صنعت محنت و مشقت پر غور کیجئے تو عقل حیران ہوتی ہے کہ ایسے کون سے اپنے ارادوں کے پکے اور خیالات کے مستقل لوگ ہوں گے کہ جنہوں نے اس اطمینان کے ساتھ صدیوں تک یکے بعد دیگرے ایک ایسی مشکل اور دشوار تعمیر کو جاری رکھا۔ اگر ایک شخص ایک درخت لگاتا ہے تو عموماً وہ اسکا ثمر کھانے سے پیشتر ہی دنیا سے نابود ہو جاتا ہے۔ کجا کہ ایسے عظیم الشان پہاڑوں کا تراشنا اور اُن میں عمیق مکانات تیار کرنا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ جس راجہ نے انکی تعمیر شروع کی ہوگی۔ اور ان غاروں کو عملی صورت میں ظاہر کرنے کا ارادہ کیا ہوگا وہ انکی تکمیل سے پہلے ہی فنا ہو گیا ہوگا۔ اور وہ کیا اُسکی نسل کے بہت سے افراد یکے بعد دیگرے انکی تعمیر جاری رکھکر کوچ کرتے گئے ہوں گے ۔

اگرچہ یہ غار مختلف اوقات اور مختلف مذاہب کے فرقوں نے تعمیر کئے ہیں۔ تاہم مجملاً انکی آخری تعمیر کا زمانہ دو ہزار سال سے کسیطرح کم نہیں۔ اگر اس سے زیادہ ہو کچھ عجب نہیں ہے۔

مکانوں کی ساخت

مکانوں کی ساخت اور اُنکی طرزِ تعمیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انکو فنِ انجنیری سے کامل مہارت تھی۔ اور فنِ تعمیر سے بدرجۂ غایت واقفیت تھی۔ سب سے پیشتر یہ امر حیرت انگیز ہے کہ انھوں نے پہاڑوں کا انتخاب کس طرح سے کیا ہوگا کہ یہ پہاڑ تراشنے کے قابل ہے اور ان میں کامل صلاحیت اس امر کی موجود ہے جو دوسروں میں نہیں ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو مکانات ایک جانب تراشے گئے ہیں اُنکا جواب دوسری جانب بھی موجود ہے۔ یہ ممکن تھا کہ ایک طرف کے پتھر میں اس قسم کی صلاحیت ہوتی اور دوسری جانب وہ قابلیت نہ ہوتی۔ مگر اس قسم کا نقص کہیں موجود نہیں ہے اگر اس قسم کا موقع کہیں اتفاقاً پیش بھی آ گیا ہے تو انھوں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ

اُس کا طرز اور نقشہ بدل دیا ہے ؛

وزن کا اصول

بعض غار سہ منزلہ اور دو منزلہ تراشے گئے ہیں۔ جن میں متعدد دالان و حجرے بنے ہوئے ہیں۔ وزن کا اصول اس عمدگی کے ساتھ قائم کیا ہے کہ درجہ بدرجہ وزن تقسیم ہوتا چلا گیا ہے۔ ستون اوپر سے نیچے تک ایک قطار میں تراشے گئے ہیں اگر درمیانی یا نیچے کا کوئی ستون آفاتِ ارضی یا سماوی کی وجہ سے منہدم و شکستہ بھی ہوگیا ہے۔ تب بھی دوسرے اوپر کے ستونوں پر جو اُسکے متوازی واقع ہیں کسی قسم کا صدمہ نہیں پہنچا ہے۔ تمام مکانات میں عموماً دو طرفہ زینے تراشے گئے ہیں

زینوں کی چوڑائی

زینوں کی چوڑائی اسقدر ہے کہ چار پانچ آدمی پہلو بہ پہلو سیڑھیوں پر چڑھ سکتے ہیں عموماً دُہرے تہرے دالان تیس چالیس فیٹ سے زیادہ عریض اندر چلے گئے ہیں سب کے اندر ہر ایک اندرونی دالان کے وسط میں ایک حجرہ بنایا گیا ہے اور اُسکے اندر سب سے بڑا بُت پرستش کے لیے تراشا گیا ہے۔ یہ عموماً بُدھا کی مورت ہے ؛

روشنی کا اصول

روشنی کا اصول اس عمدگی کے ساتھ رکھا ہے کہ آفتاب کی پہلی شعاعیں اس اندرونی بت کے اوپر پڑتی ہیں۔ اور دالان کے تمام کمروں میں کافی روشنی رہتی ہے یعنی صبح اور شام دونوں وقت غاروں کے اندر تک روشنی کی یہی کیفیت رہتی ہے ؛

بتوں کے اعضا کا تناسب

بتوں کی ساخت میں عجب حیرت انگیز صناعی دکھائی گئی ہے۔ فنِ بت تراشی میں دو چیزیں نہایت اہم و دشوار ہیں ؛

(۱) بتوں کے تمام اعضا کی بناوٹ اور قدرتی تناسب کے لحاظ سے درست و ٹھیک ہونا

اور جسم کے تمام اعضا کا جسامت کے لحاظ سے موزوں ہونا +

(۲) ان کے خد و خال حرکات و سکنات اور چہروں سے مختلف قسم کے جذبات کا نمودار ہونا +

یہ دونوں اصول تمام بتوں کے تراشنے میں بدرجۂ اولیٰ مدنظر رکھے گئے ہیں عورتوں میں ایک خاص قسم کی دلفریبانہ ادا پائی جاتی ہے اور اُن کا ہر ایک انداز نرالا ہے۔ خادم و مخدوم کے درجات کا کافی طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ خادم اپنے آقا کے سامنے نہایت مؤدبانہ و عاجزانہ حالت میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترحم کا خواستگار ہے مخدوم کی آلاتِ حرب سے آراستگی اور اُسکی عظمت و جلالت و شان اس امر کو ظاہر کر رہی ہے کہ وہ نہایت عالی حوصلہ بہادر و جری ہے۔ بہت سے عظیم الشان و مہیب و ہولناک بُت ہیں جو غصہ اور خونخواری کے جذبات کا کامل نمونہ ہیں۔ مثلاً بھیرو دیوتا جو لحاظ اپنے غصّے اور بھیانک و ڈراؤنی ہیئت و شکل کے اس نام سے موسوم ہے اور اقسام کے دیوتا جنھوں نے مختلف اوتاروں کے برن میں روپ بدلا ہے۔ جا بجا مختلف صورتوں میں درشن دے رہے ہیں۔ بتوں میں سب سے زیادہ تعداد بدھا۔ مہادیو اور پاربتی کی ہے۔ کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مہادیو جی کا سب سے اول اپنی کیلاس کے پہاڑوں پر ظہور ہُوا ہے۔ اور وہ تنہا مع اپنی بیوی پاربتی کے اِن پہاڑوں اور جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ اور اُنکی زندگی کے مختلف واقعات کی ہزارہا روایتیں مشہور ہیں +

قدیم روایتیں

اوّل یہ کہ ایک زمانہ میں مہادیو جی پاربتی سے ناراض ہوکر "مہادیشور مال" پہاڑ کی جانب جو اِسی سلسلہ میں واقع ہے چلے آئے تھے۔ پاربتی کو جب انکی جدائی گوارا نہ ہوئی تو بھیلن کا بھیس بدلکر وہ اس پہاڑ پر آئیں اور مہادیو جی کو دھوکے سے اپنے ناز و کرشمے دکھا کر فریفتہ کر لیا۔ آخر جب مہادیو جی اور پاربتی کا ملاپ ہوگیا تب اُنھوں نے

انہی پہاڑوں میں سکونت اختیار کرلی۔ اور اس جنگل کا نام "کامیکساون" یعنی "مقام شیو اُئی" مشہور ہوگیا۔

دوم یہ کہ مہادیوجی کا سب سے بڑی "پنڈی" جو "جوتی لنگ" کے نام سے موسوم ہے انہی غاروں سے ایک مندر یعنی سیتا کے حمام میں رکھی ہوئی ہے۔ اسکے علاوہ ہندوستان کے اور مختلف مقامات میں مہادیوجی کے اور گیارہ پنڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔

اگرچہ یہ تمام روایات غیر معتبر ہیں مگر ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہادیوجی اس زمانہ میں "ایلورہ" اور "مہادیشورمال" کے پہاڑوں میں سکونت رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ پہاڑ اپنی عجیب منظر اور جائے وقوع کی خوبصورتی کے لحاظ سے نہایت دلفریب ہیں متبرک دیوتاؤں کی قیام گاہ ہونے کی وجہ سے وہ مقدس خیال کیے گئے اور اُن کی یادگار میں پہاڑوں کو کاٹ کر مندر تراشے گئے۔ چونکہ اہل ہنود کو ابتدا سے فن تاریخ کی طرف مطلق رغبت نہ تھی۔ اسوجہ سے پُرانی عمارتوں قدیم بتوں۔ سکوں اور کتبوں یا ان قصہ کہانیوں کی کتابوں سے جنہیں یا تو نسلاً بعد نسلٍ لوگ اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آئے تھے یا وہ روایتیں جو بطور کتھا کے پنڈتوں نے اس زمانہ میں تصنیف کرلی تھیں۔ اس زمانہ کی حالت وطرز معاشرت کا کچھ پتہ ملتا ہے۔ چنانچہ کیلاس یا رنگ محل میں جو برہمنوں کی تراشیدہ ایک مندر کی طرز کی نہایت عالیشان عمارت ہے اُسمیں جابجا کتبے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اور مختلف مقامات پر جنگ مہابھارت کے سین ہیں جو اُس زمانہ کا طریقہ جنگ بتلارہے ہیں۔ اور نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس زمانہ میں کس قسم کے آلاتِ حرب استعمال کرتے تھے۔

خوبی رنگ و نقش و نگار

سب سے زیادہ وہاں کے نقش ونگار کی صنعت ورنگ کی خوبی قابل تعریف ہے اگرچہ اب وہاں عرصہ بعید گزرنے اور آفات ارضی وسماوی اُٹھانیکے بعد بہت کم مقامات

پر چونے کی استر کاری اور نقش و نگار باقی رہ گئے ہیں تاہم جس جگہ کچھ تھوڑا سا حصہ بھی باقی رہ گیا ہے وہ اپنی اسی آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔ رنگ آمیزی کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ پہلے تمام در و دیوار اور اصنام پر چونے سے روغن اور روئی کو کوٹ کر مرکب بنایا گیا تھا جو کھل گیا ہے۔ بعد ازاں انکو رنگ نقش و نگار اور مختلف قسم کے زیور و لباس سے آراستہ کیا ہے +

اللہ اللہ وہ بھی کیا قابل قدر لوگ ہوں گے جنہوں نے کن مصالحوں سے چونے کو پھونکا اور تیار کیا ہوگا۔ اور کون سے ایسے پائدار رنگ کا نسخہ اُن کو یاد ہوگا کہ اب تک باوجود آفت روزگار کے جہاں تھوڑا بہت بھی کوئی نمونہ قائم ہے وہ بجنسہ اپنی اصلی حالت میں ہے۔ اور جس وقت یہ مجسم انسان رنگا رنگ کا لباس و زیور پہنے کھڑے ہوں گے اُسوقت خدا کی قدرت اور انسانی صنعت کا کامل نمونہ نظر آتا ہوگا۔ بعض جگہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی ان سنگین در و دیوار اور چھتوں پر جہاں ضرورت سے زیادہ گڑھے تراشنے میں پیدا ہو گئے ہیں۔ انکو مٹی سے (جسکو غالباً انہی اجزا سے مرکب بنایا گیا ہے) جسکی دبازت دو ڈیڑھ انچ سے کم نہیں ہے لیپ دیا ہے اور اسکے اوپر چونے کی نہایت باریک استر کاری کر کے رنگین نقش و نگار بنائے ہیں۔ اس موجودہ حالت میں بھی وہ مٹی اسقدر مضبوط ہے کہ بڑی مشکل سے وہ اپنے جسم یعنی پتھر سے علیحدہ ہوتی ہے۔ گویا کہ مٹی کو پتھر میں یک جان وصل کر دیا گیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ زمانہ کی دست برد اور ناقدردانی نے بہت کچھ ان اصنام کو بگاڑنے اور بدصورت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس اُجڑی ہوئی حالت میں بھی یہ شعر انکے حسب حال ہے ؎

نہ کچھ پیری چلی بادِ صبا کی ۔۔۔ بگڑنے میں بھی زلف اُنکی بنا کی

لاکھ انکے بناؤ کو مٹایا گیا ہے مگر اب بھی اُن کا حسن دلفریب باقی ہے +

بعض غار مدت مدید اور عرصہ بعید گزرنے کی وجہ سے اور پہاڑوں کے اوپر سے بارش کے ساتھ ہزارہا من مٹی او پتھر جمع ہونیکے بعد تقریباً بند ہو گئے تھے اور اُن کے آگے تمام کانٹے دار جھاڑیاں اور خود رو درخت اُگ آئے تھے اور یہ مقامات درندوں کے مسکن ہو گئے تھے۔ مگر خدا اعلیٰ حضرت علی قدر قدرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کی سلطنت کو تا ابد قائم و دائم رکھے کہ ہزارہا روپیہ خرچ کرکے اِن تمام غاروں کو صاف کروایا گیا ہے۔ اور ان تک پہنچنے کے لیئے پختہ سڑکیں بنادی گئی ہیں۔ اب ہر شخص بلا وسواس انکی سیر کر سکتا ہے۔ سلسلہ وار نمبر ڈالدیئے گئے ہیں تاکہ اِنکے حالات لکھنے اور ایک دوسرے سے تمیز کرنے کا موقع مل سکے +

بہت سے برہمن جو بستی ایلورہ میں رہتے ہیں۔ خاص ان تمام مقامات کی سیر کروانے کی غرض سے وہاں موجود رہتے ہیں اور جھوٹ سچ کی روایتیں جو وہ پیچے بادیگرے اپنے بزرگوں کی زبانی سنتے چلے آئے ہیں۔ ناظرین کو سُناکر اپنا حقِ محنت وصول کرتے ہیں +

اِنکے علاوہ ضلع اورنگ آباد میں بہت سے غار ہیں اور قلعہ دولت آباد کے زمیں دوز راستوں میں کئی ستون ایسے بھی پائے گئے ہیں جو غارہائے ایلورہ کے ستونوں سے ملتے جُلتے ہیں۔ دولت آباد کے جنوب مشرق میں ایک پہاڑی ہے جسکو چمن ٹیکری کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک قلعہ ہے جو اپنی شہرت اور پائداری میں قلعہ دولت آباد سے ہرگز کم نہیں ہے۔ مگر اِس سے کسیقدر چھوٹا ضرور ہے +

روہیلہ گڈھ کا ایک اور قلعہ اورنگ آباد سے بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہے جسمیں متعدد حوض اور غار ہیں۔ ٹیکہ اور پٹن کے گرد و نواح میں کئی کہنہ عمارتیں ہیں اورنگ آباد کی چھاؤنی کے جنوب مشرق میں تین میل کے فاصلہ پر موضع ستارہ کے قریب ایک پہاڑی ہے اسمیں بھی غار بنے ہوئے ہیں۔ اور مختلف مقامات پر

بڑی پتھر کی مورتیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ایک مندر میں پھلری کے دروازہ کے قریب بُدھ کی مورتیں بنی ہوئی ہیں۔

موضع قادرآباد میں بھی کچھ قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔اوران میں بھوانی کی دو مورتیں ہیں جو ایلورہ کی برہمنی مورتوں کی مانند ہیں۔اورنگ آباد کے قریب ایک پہاڑی کے کونے پر جہاں سے غارہائے ایلورہ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ایک مندر میں پارسناتھ کی ایک عظیم الشان مورت رکھی ہوئی ہے جو گزشتہ صدی کے آغاز میں تعمیر ہوئی ہے۔اسکے ایک گھٹنے سے دوسرے گھٹنے تک کا فاصلہ نو فیٹ ہے۔ اوراسکی بلندی سر سے لگاکر تخت (سماسانہ) تک جسپر کہ مورت رکھی ہوئی ہے ساڑھے دس فیٹ ہے۔اہر سانپ کے پھن سے لیکر جو اسکے اوپر سایہ کیئے ہوئے ہے سماسانہ کی بنیاد تک ۱۶ فیٹ ہے۔اسکے دائیں اور بائیں جانب پجاری ہیں جن میں شو اور بھوانی بھی شامل ہیں۔اس تخت پر جسپر یہ مورت رکھی ہوئی ہے ۱۲۳۴ء یا ۱۲۳۵ء کا مفصلہ ذیل کتبہ لکھا ہوا ہے۔

"مبارک ہو!۔یہ عمارت ۱۱۵۶ سکا مین برہسپت کے زمانہ میں تعمیر کی گئی۔رنوگی کی پیدائش تری وردھاپور میں ہوئی۔اسکا لڑکا گلوگی اسکی دوسری بیوی سوترنا کے بطن سے پیدا ہوا جسکو سارا زمانہ چاہتا تھا ان دونوں کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے ان میں سے چکسوا اُسکا سردار تھا جو بوجہ اپنی بخشش کے سب میں ممتاز تھا۔اُس نے اس پہاڑی پر جہاں چرانوں کا گزر تھا۔پارسناتھ کی ایک یادگار بنوائی اور اُسکے ذریعے اپنے کرموں سے نجات حاصل کی۔ علاوہ ازیں اس نے دیوتاؤں کی بڑی بڑی مورتیں قائم کروائیں۔اور اسکے باعث چارندری کو ایک تیرتھ بنادیا جسطرح بھرت نے کیلاس کو ایک متبرک مقام بنادیا تھا۔یہ مذہب

سکا بڑا پابند اور اپنے ارادوں کا پکا تھا۔ اپنی نیک اور وفادار بیوی سے مُحبت کرتا تھا۔ چلسو اڑا اپنے پاک مذہب کا حامی اور پانچواں واسودیو ہُوا ہے"۔

اِسکی تاریخ تیسری پھاگن سنہ ۱۵۶ سدی سکا لکھی ہوئی ہے۔ جو انگریزی تاریخ کے بموجب چہارشنبہ ۱۴۔ فروری سنہ ۱۲۳۵ء ہوتی ہے۔

غارہائے ایلورہ کے عین شمال میں جو پہاڑی ہے اُسکے مغربی رخ کو مہیش مالا کہتے ہیں۔ اِسمیں بھی پتھروں کو تراش کر مکان بنائے گئے تھے جو اب صرف ٹیلوں کی شکل میں باقی رہ گئے ہیں۔

روضہ خلدآباد میں بھی اِسی قسم کے اَور غار پائے جاتے ہیں۔ کلاں مسجد کی شکل سے جو اِسی مقام پر واقع ہے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی یہ شیو کا مندر تھا۔ گردو نواح کے کھنڈروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کبھی نہایت عظیم الشان شہر آباد تھا۔ اور یہاں کی پُرانی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارتیں جو آسانہ کے زمانہ کی ہیں جو سورج بنسی خاندان کے اوّل راجاؤں میں سے تھا۔ بعض پُرانے قصوں میں ایک راجہ پور چندرائے کا بھی ذکر آیا ہے۔

روضہ خلدآباد میں اگر کوئی سیّاح مسلمانوں کے تعمیر شدہ دروازے کے قریب کھڑے ہوکر دیکھے تو اُسکو ایک پُرانے تالاب کی جانب جو جانب شرق واقع۔ اور "سُلطان تالاب" کے نام سے موسوم ہے۔ شہر کی شمالی اندرونی فصیل دکھائی دیگی جسکا سلسلہ جانبِ غرب مسلمانوں کی عمارتوں سے مِلگیا ہے اور وہاں سے روضہ خلدآباد پر ایک سرسری نظر ڈالے جو قدیم شہر کے ایک حصہ میں بسا ہوا ہے۔ تب اُسکو دور فاصلہ پر قلعہ دولت آباد دکھائی دے گا جسکے درمیانی میدان کسی زمانہ میں عمارتوں سے پُر تھے۔ اور جنکے وسط کا بازار ایک ٹیلہ پر تھا جو کاغذی پورہ کے

ایک میل جانب شمال واقع ہیں۔اور دولت آباد کے گرد و نواح کی پہاڑیاں اسکے جنوبی مورچے تھے۔روضۂ خلد آباد سے جانب غرب دو میل کے فاصلہ پر ایک قدیم چشمہ ہے جو "گنج رواں" یا "پاربتی کے تالاب" کے نام سے موسوم ہے اس شہر کا موقع دیکھکر محمد تغلق بہت خوش ہوا تھا۔اور اسکو اپنا دار الخلافہ بنانا چاہتا تھا۔چنانچہ دہلی کو برباد کرکے دولت آباد بسایا گیا ❊

اس بادشاہ کا دار الضرب "پاربتی کے تالاب" کے قریب تھا۔جہاں اب بھی بعض اوقات کسانوں کو ہل چلاتے ہوئے اُس زمانہ کے سکے ملجاتے ہیں ❊

حاصل کلام غارہائے ایلورہ کی تعریف صرف الفاظ میں بیان کرنی ایک امر محال ہے۔صرف پڑھنے سے ناظرین کو وہ لطف حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اِن تمام مقامات کا خود عینی مشاہدہ نہ کیا جائے۔تمام عمارتوں کے نمونے قدیم دراوڑی طرز کے پائے جاتے ہیں۔اِنکی وسعت اور محنت اہرام مصری کے مقابلہ کا دم بھرتی ہے اور اپنی شہرت اور قدامت کے لحاظ سے یہ عمارات اِن سے کسی طرح کم نہیں ہیں ❊

یہ غار تعداد میں ۳۴ ہیں جو تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ تک جنوب سے شمال تک مسلسل چلے گئے ہیں۔ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حال انشاء اللہ آیندہ بیان ہوگا ❊

محمد حشمت اللہ خاں از حیدر آباد دکن

پیاری

(۲)

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

انشاءاللہ اور دھن مل

پیاری واقعی نازنین تھی لیکن ایک خاص وضع کی۔ حُسن کے معیار دنیا میں مختلف ہیں کوئی گوری رنگت پر فدا ہے۔ کوئی ملاحت کو صباحت پر ترجیح دیتا ہے۔ کسی کو سیاہ بال کسی کو سنہری بال پسند ہیں۔ کوئی چشم ازرق کو چشم سیاہ پر ترجیح دیتا ہے۔ کسی کو دراز قد کسی کو میانہ پسند ہے۔ کوئی نازک کوئی بھرا بھرا جسم پسند کرتا ہے۔ پیاری اک نرالی نازنین تھی جسکے حُسن کی نسبت کسی کو اختلاف رائے نہ تھا۔ اُسکا سراپا سُنیے ؛

پیاری کا رنگ مانند سیم سفید تھا۔ طوطے کی سی آنکھیں نہایت چھوٹی دور سے ہیرے کی کنیاں معلوم ہوں اس سرعت سے کھلتیں اور بند ہوتیں کہ بعض اوقات بصارت کے معدوم ہونے کا شبہ ہو۔ کان ایسے مختصر کہ کوئی سمجھے کہ اُسے طاقت سماعت ہی نہیں۔ دانت ایسے خوبصورت جیسے موتیوں کی لڑی۔ لب ایسے سرخ جیسے لعل آتشیں۔ ناک ایسی خمدار جیسے مچھلی پکڑنے کی کانٹی۔ رخساروں کی جھلک سونے کی کلس سے کم نہیں۔ قد عجیب طرح کا جب چاہے دراز یا میانہ ہو سکے۔

لباس بھی نرالا پہنے ہوئے ہے ایک ڈوپٹہ اوڑھے ہوئے جس کے حاشیہ کے بیل میں روپے اور پیسے کے نقش چھپے ہوئے اور جسکے متن میں ایسے نقش جو دور سے نوٹوں کے معلوم ہوں۔ گلے میں جواہرات کے ہار ڈالے ہوئے لعل شب چراغ کی جھلک نیلم کی شعاع سبزے کا عکس۔ بے سنیا کی دورنگی۔ فیروزہ کی خوشرنگی۔ زمرد اور الماس کی کرنیں بہ ہیئت مجموعی اُسکے سینہ پر قوس قزح کی رنگ آمیزی دکھلاتی تھی اُسکے ہاتھ میں

ایک سونے کا کڑا ہے جسے وہ ہر لحظہ چکر دیتی رہتی ہے۔ اس نازنین کے متعلق میر انشاء اللہ خان اپنے ایک دوست سے فرماتے ہیں۔

ارے میاں۔ تم نے پیاری دیکھی۔ چند دنوں سے ہمارے شہر میں ایک باغ میں فروکش ہے۔ واللہ کیسی نازنین ہے۔ ہم بھی ایک روز اُسکے در دولت پہ حاضر ہوئے تھے۔ ہم نے ایک رباعی سنائی اُسکے ہیرے سے سخت دل پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ پھر ایک ترکیب بند پھڑکتا ہوا سنایا اُسمیں اُسی کی ستایش تھی معاذ اللہ ہمنے اُسے خدا سے بھی بڑھا دیا تھا اُسکے کان پر جوں تک نہ چلی پھر ایک مثنوی سنائی جسکا ایک ایک شعر ایک ایک اشرفی کو بکتا لیکن وہاں خبرے نباشد۔ میں سمجھا اُسکی طبیعت نظم سے مانوس نہیں۔ نثر شروع کی وہاں کان بہرے ہوگئے۔ آخر مایوس ہوکر ایک واسوخت سنا آتے۔ ابھی ہوس باقی ہے۔ خدا نے چاہا ایک وار تو ہم بھی اور کرینگے۔ خدا گواہ ہے شاعر و ناثر صدیوں خامہ فرسائی کریں اُسکے حسن کی داد نہیں دے سکتے۔" اوگاؤدی تیری عقل گئی ہے"

اُنکے دوست دہن ال بولے " ہم بھی اُسکی حضور میں حاضر ہوئے تھے۔ آپ جانتے نہ ہمارے پاس علم نہ فضل۔ نہ کوئی وصف ہم کو تو حکمت عملی آتی ہے اور اسی سے ہم دنیا کے سب کام حل کر لیتے ہیں۔ ہم نے اُس نازنین کو وہ وہ بھرے اور چکمے دئے کہ باید و شاید۔ یقین مانو وہ میرا ہی کلمہ پڑھتی ہے ایشر نے چاہا تو اس طرح دام میں پھنساؤں گا کہ لوگ عش عش کرینگے۔ میر صاحب کبھی کبھی مجھے شک سا گذرتا ہے کہ کہیں یہ نازنین انجام کو کوئی چھلاوا نہ نکلے۔ ایسی عیارہ کہیں دیکھی نہ سنی اُسکے پاس کوئی ایسا طلسم ہے کہ ہر شخص کو تسخیر کرتی ہے۔ اُسکے قبضہ میں ایسا مقناطیس ہی کہ مرد۔ عورت۔ بوڑھا جوان جسے دیکھو اُسکے پھندے

میں پھنستا ہے۔ اور وہ طوطے کی مانند آنکھیں پھیر لیتی ہے۔ خیر ہم بھی اُس پری کو شیشے میں اتار ینگے۔

انشار ہراساں تو تمہاری دہن ملی کی گفتگو سُنکر اور حیران و پریشان ہوا کہ یہ ان پڑھ آدمی زیور علم سے بے بہرہ۔ دولتِ حسن سے محروم جسکے ہاتھ سے کوئی بیر لیکر نہ کھائے کیونکر پیاری سی نازنین پر قابو پا سکے گا۔ آخر وہ بولا۔

انشار اللہ خان۔ ارے میاں کیوں دون کی لیتے ہو۔ بے تکی اُڑاتے ہو کہاں پیاری اور کہاں تم۔ جناب من پیاری ایک بےمثل عیارہ ہے۔ تمہیں اُس نے جھوٹے وعدوں سے خوش کر لیا ہوگا۔ وہ کسی کی ریت نہیں۔ وہاں شہزادے آئے وزیرزادے رئیس زادے سبکے آئے اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔ بھلا وہ تم پر ریجھے گی۔ ناممکن۔

دہن ملی۔ میر صاحب آپ سمجھتے ہو کہ فضیلت علمی سے لفظوں کی رنگینی سے کہیں معشوق قابو میں آتے ہیں۔ شاعروں کے دیوان اس امر کے شاہد ہیں کہ ہجر و فراق مایوسی کج ادائی بیوفائی ستم و ظلم وغیرہ وغیرہ کی شکایتوں کے دفتر کے دفتر لکھ کے چھوڑ گئے ہیں۔ کسی کو شربت وصال نصیب نہیں۔ میر صاحب کہیں لفظوں کی مرصع کاری سے بھی معشوق ملتے ہیں۔

میر صاحب۔ لالہ جی آپ کلام کی طاقت کے قائل نہیں۔ اگر آپ کبھی شعرا اور فصحا کا کلام پڑھو تو معلوم ہو کہ الفاظ میں کیا طاقت ہے۔ سیف زبان میں جو طاقت ہے وہ کسی ہتیار میں نہیں۔ یہ الفاظ ہی ہیں کہ جسکو چاہیں رُلا دیں جسے چاہے ہنسا دیں تلواریں میانوں سے نکلوا دیں۔ سلطنتیں اُلٹا دیں۔ ایسے نشے چڑھائیں کہ صدیوں نہ اُتریں۔ نرم دل کو سخت دل کر دیں۔ سنگدل کو موم کر دیں۔ صدیوں کے عقیدے بدل دیں۔ عادتیں بدل دیں۔ غرض جو طاقت قیاس میں آسکتی ہے وہ الفاظ کو

حاصل ہے۔ البتہ اُنکے استعمال کی لیاقت ہر کسی کو عطا نہیں ہوئی۔ مصور رنگ سے کام لیتا ہے اور تصویر ہو بہو بولتی ہے۔ انشا پرداز لفظوں سے رنگ آمیزی کرتا ہے۔ لیکن پیاری عجب معشوق ہے کہ اُسپر اصلا کسی لفظ کا اثر نہیں ہوتا۔

دہن مل۔ آپ ہزار کہئے۔ ہمیں اسبات کا یقین نہیں آتا کہ معشوق بھی کبھی محض لفظوں سے ریجھے ہیں۔ ان سے کوئی چال کھیلئے۔ چکمہ دیجئے۔ چال سے کام نکلتا ہے۔ پیاری میرے ہاتھ آنے دیجئے۔ دیکھنا کس کس طریق سے اُسے قابو میں رکھتا ہوں۔ اُس گل تک ہوا کو بھی راہ نہ دوں۔

میر صاحب۔ دیدہ باید۔ ایک سعی تو ہم بھی کرینگے۔

(۳)

پیاری اور پیاس رام

پیاری ایک باغ پُر فضا میں مقیم تھی۔ شروع شروع میں بے نقاب رہتی تھی۔ لوگوں کا تار بندھا رہتا تھا۔ شہر میں اسکی دہوم مچی ہوئی تھی۔ ایک عجیب طلسم تھا۔ جو دیکھتا اُسکے عشق کا دم بھرنے لگتا۔ کوئی سمجھتا کہ یہ عیارہ کوئی بگڑی ہوئی شہزادی ہے۔ کوئی اُسے بیسوا سمجھتا۔ کسی کسی کو اُسکی نسبت بھوت پریت کا شبہ ہوتا۔ لوگ اُس سے باتیں کرتے اور حیرت میں پڑتے تھے۔ اُسکی توجہ بھی مذبذب اور متلون تھی۔ کسی سے زیادہ متوجہ ہوتی۔ کسی کو صرف اشارہ کنایہ سے ٹالدیتی تھی۔ حسین نوجوان آتے اشاروں کنایوں سے عشق جتاتے۔ امید بھرے جوابوں سے آج خوش ہوتے تو کل سرد مہری پلتے گرمجوشی اور تپاک کی باتیں کرتے اور وہاں سے بعض اوقات صدائے برنخواست

بجے آتے۔ اُنکا جی للچاتا۔ کہ اِس سونے کی چڑیا یا سنگ مرمر کی گڑیا کو اُٹھا لے جاتے اور اُس سے کھیلتے۔ اُسکے گلے کے ہار اتارتے اور کھیلنے کی گولیاں بناتے۔

بڈھے آتے اور "پیرے کہ دم زعشق زند" کے مصداق بنتے۔ لوگ اُنکی گت بنتی دیکھ کر مضحکہ اوڑاتے۔

مستورات آتیں میٹھی میٹھی باتیں کرتیں۔ اُن کا بھی دل چاہتا کہ اس نازنین کو گھیرے جائیں۔ اسکی سہیلیاں بنتیں۔ تیجوں میں اسکے ساتھ رنگ رلیاں منائیں جھولے جھولتیں۔

ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ انشاء اللہ خان ایک مرتبہ نازنین کے حضور میں حاضر ہوکر اپنی موزونیت طبع۔ فصاحت بلاغت صرف کر گئے۔ لیکن ناکام واپس گئے تھے۔ لوگ حیرت میں تھے کہ دہن دل میں کیا وصف تھا کہ اُسکی جانب توجہ زیادہ مبذول ہوئی۔ نازنین نے اُسکے بشرہ سے نہ معلوم کیا قیافہ پایا تھا کہ وہ اُسکی گوں کا معلوم ہوتا تھا۔

الغرض منجملہ اُن شائقین کے جنکا تار لگا رہتا تھا ایک ضعیف العمر پارس رام نامی بھی اُفتاں وخیزاں پیاری کے دیدار کے لئے پہونچے۔ یہ پیر فرتوت کسی زمانہ میں عاشق مزاج و رنگین طبع رہ چکا تھا۔ مثل مشہور ہے "مرد چوں پیر شود حرص جوان میگردد"۔ اُس نے جوانی کے عالم میں ہزار فریبوں سے دولت کمائی تھی جسے اُس نے مصیبتیں سہہ سہہ کر رکھا تھا۔ آخر ایک شب ڈاکو پڑے اور سب کچھ لوٹ کر لے گئے تھے۔ اب یہ بیچارہ کبھی آیرن سیف کو دیکھتا۔ کبھی اسکی چابیاں دیکھتا اور ہر وقت کف افسوس ملتا رہتا۔ اُس نے سنا کہ ایک ایسی نازنین آئی ہوئی ہے جو گوندنی کے زیور سے لدی ہوئی ہے۔ شوق چرایا کہ آؤ ہم بھی اسکے چاہنے والوں میں بنیں۔ شاید کہ ؎

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد

وہ سنتا تھا کہ اس نازنین کی ملاقات کے لئے جو جو نوجوان گئے بیرنگ واپس

آئے اِس سے اُسے یہ یقین ہوتا کہ غالباً وہ کسی پختہ کار عاشق کی طلبگار ہے چنانچہ لالہ صاحب موصوف عصا ہاتھ میں لئے بیک بینی و دوگوش خیالی پلاؤ پکاتے ملاقات کو روانہ ہوئے۔ سچ کہا ہے ؎

کوئی جو کام ہو پیری میں کس طرح ہو ذوق

کہ ہیں نہ پاؤں سنبھلتے نہیں سنبھلتے ہاتھ

لکڑی ٹیکتے ٹیکتے منزل طے ہوئی اور دربان نے نازنین کی حضور میں اطلاع کی اور وہ بلائے گئے۔

نازنین۔ فرمائیے جناب آپ کا یہاں کس طرح آنا ہوا۔

یاس رام۔ سنا تھا کہ حضور کے دربار میں ہر کس و ناکس کو حضوری کی اجازت ہے۔ میں نے سوچا کہ چلو ہم بھی درشن کر آویں۔ درحقیقت میں اپنی طبیعت سے لاچار ہوں۔ ساری عمر عشق کی دُھن میں رائگاں گئی۔ جہاں کسی معشوق کا پتہ ملا ہمیں شوقِ دیدار گدگدانے لگتا ہے اور بن دیکھے صبر نہیں آتا جب سے ڈاکو گھر بار لوٹ لے گئے۔ گھر میں سناٹا ہے۔ ہائے ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم پہ بھی انگلیاں اُٹھتی تھیں۔ اور اب یہ صورت ہے کہ لوگ قہقہہ مارتے ہیں۔ گو میں بڈھا ہوں لیکن دل جوان رکھتا ہوں۔ جوان کیا۔ جوانوں کے دنوں سے بھی دل زیادہ گرمجوش ہے۔

نازنین۔ آپ کا اسم مبارک کیا ہے۔

یاس رام۔ میرا نام دولت رام تھا۔ جوانی کی عمر میں شعر شاعری سے مس رہا۔ یاؔس تخلص کرتا تھا۔ اُن دنوں یہ تخلص موزوں نہ تھا۔ اب چند سال سے یہ تخلص موزوں ہو گیا ہے۔ لوگ مجھے اب یاس رام کہتے ہیں یہاں نہ دولت رہی نہ دہ بیوی رہی دونوں ڈاکو لوٹ لے گئے۔ ہائے کس طرح

دونوں کو سینے سنبھال کر رکھا تھا۔

نازنین۔ لالہ یاس رام۔ اس ضعیفی کی عمر میں جب کہ کوچ میں تھوڑے سال باقی ہیں تم کو چاہئے تھا کہ ایشر کا دھیان کرتے۔ مالا جپتے اگلے جنم کے لئے توشہ جمع کرتے۔ جوانی کی باتیں جوانی کے ساتھ ہوا کرتی ہیں جن دنوں رگوں میں لہو پھرتا ہے۔ چہرہ پر سرخی ہوتی ہے۔ عشق عاشقی پھبتے ہیں۔ اب بھلا تمھاری عمر ہے کہ ایسے خیالات دل میں لاؤ۔ نوجوان معشوق سے دل لگانا تم سے بڈھوں کا کام نہیں (نازنین نے تبسم کیا اور گردن اس بانکپن سے نہوڑائی کہ بڈھے کا دل ہاتھ سے جاتا رہا وہ جوش میں آکر بولا)۔

یاس۔ اگر ز لعل لب یار بوسہ یابم + جواں شوم ز سر و زندگی دوبارہ کنم +

پیاری نازنین پریوش مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تو نوجوان عاشقوں کی دلدادہ ہے جوانی دیوانی مشہور ہے۔ جوان عاشق کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے جہاں تم سی اور نظر آگئی وہیں ریجھنے لگے۔ حق تو یہ ہے کہ جوان ہرجائی ہوتے ہیں۔ چاہنے والا سب سے اچھا بڈھا ہوتا ہے۔ اسے معشوق کی قدر ہوتی ہے۔ طبیعت پختہ کار سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ گرم سرد زمانہ کا دیکھے ہوئے دنیا کے نشیب و فراز سے واقف ہوتا ہے۔ معشوق کی تواضع و تکریم ایسی کرتا ہے کہ دنیا و مافیہا سب اُسی پہ ختم ہیں۔ بڈھے کے گھر جوان بیوی حکمرانی کرتی ہے۔ خاوند مطیع بالکل حلقہ بگوش۔ رات دن بیوی کی ہر ادا پر نثار اے ملکہ حسن ذرا سوچ نوجوانوں کے بہتروں میں نہ آجانا اگر نوجوان عاشق کے پھندے میں پھنسوگی تو وہ تمھیں غلام کے مانند رکھے گا۔ تمھاری ساری شیخی کرکری ہو جائے گی۔

(باقی آئندہ)

کہاں میں جاکر رہوں؟

کہاں میں جاکر رہوں؟ کہ مجکو سکون حاصل کوئی گھڑی ہو
نجات ہو شورش جہاں سے بچوں ضرر سے بچوں زیاں سے
بُری نگہ سے، بُری زباں سے

نہ دل مرا بستیوں میں بہلے نہ سیر صحرا مجھے خوش آئے
نہ شاد میں بزم یار میں ہوں نہ دل شگفتہ بہار میں ہوں
غرض عجب خلفشار میں ہوں

اگر رہوں جاکے دور۔ بن میں شگفتہ پھولے پھلے چمن میں
تو باد صرصر کی گل فشانی نہیں ہے دلپر کم از گرانی
وہاں بھی مفقود شادمانی

وطن میں پابندیاں وطن کی نہیں کم از لذت اسیری
بعینہٖ جیسے کوئی قیدی جو تال پر اپنی بیڑیوں کی
تھرک رہا ہو۔ وہ گت ہے میری

جو مال و دولت کما کے بھرلوں یہ ٹھانکر "خوب چین کرلوں"
تو کاہشوں سے کہاں مفر ہے کہ خلق مرنے کی منتظر ہے
غرض یہ سودا بھی دردسر ہے

اگر کسی سے میں دل لگاؤں کسی حسین نازنیں کو چاہوں
تو چاہنے کا ہے یہ نتیجہ کہ یک سر اور صد ہزار سودا
خراب، خستہ، ذلیل، رُسوا

کسی سے رکھوں اگر نہ مطلب تو کام دنیا کے بند ہیں سب

ملوں تو ملتا ہے کاوشوں میں کچھ اپنی کچھ اُسکی خواہشوں میں
غرض کہ ہے جان کاہشوں میں

کوئی ہے بیکار مجھسے شاکی کوئی ہے بیوجہ میرا بیری
سکوت میں اُسکو اور جرأت مقابلہ سخت ہی جہالت
غرض کہ ہر طرح ہے مصیبت

یہ عرصۂ کارزار ہستی بساط ہے تازہ کشت و خوں کی
لڑوں تو دنیا مرے مقابل جو بھاگ نکلوں تو سب میں بُزدل
غرض یہ بازی بھی سخت مشکل

ملازمت میں ہے یہ خرابی کہ میری عادت ہی صاف گوئی
مجھے خوشامد سے سخت نفرت وہاں ہے اِسکی بڑی ضرورت
غرض بسر کی نہیں ہے صورت

کہاں ملے مجکو دوست ایسا جو ٹھیک ہو ہمخیال میرا
کہ مثل آئینہ جس کا باطن دکھاوے اُسکے مجھے محاسن
نہیں تو ہے میل غیر ممکن

میں رہ کے دنیا میں ترک دنیا کروں۔ یہ ممکن نہیں ہے حاشا
بفرضِ امکان جوگ لوں میں سہاگ کو چھوڑوں سوگ لوں میں
تو جان کو اور روگ لوں میں

میں کیا کروں سخت و چتر لیسکر کہاں رہوں گا میں تلخ دیکر؟
اِسی جہان خراب میں؟ تو میں صاف کہتا ہوں یاد رکھو
"سلام ایسی زندگی کو"

مرے لیئے تنگ یہ زمیں ہے مرا ٹھکانا کہیں نہیں ہے

نہ دن کو باغِ بہار میں ہے — نہ شب کو آغوشِ یار میں ہے

جو ہے تو کنجِ مزار میں ہے

نادر علیخاں نادر، کاکوروی

یادِ وطن

شامِ غربت مجھ سے کہتی ہے کہ اے جانِ وطن — یاد آتی ہوگی اب صبحِ فروزانِ وطن

ہائے یاروں کا بہم راتوں کو ملکر بیٹھنا — پھرتے ہیں آنکھوں میں وہ خوابِ پریشانِ وطن

اے جنوں غربت میں وقتِ سیرِ گلہائے چمن — یاد آتے ہیں مجھے خارِ بیابانِ وطن

داغِ دل کیسا؟ شبِ تاریکِ غربت کیلئے — ساتھ لیتے آئے ہیں شمعِ شبستانِ وطن

یہ بھی کوئی زندگی ہے عمر غربت میں کٹی — ایک دو دن کو کبھی ہو آئے مہمانِ وطن

کرکے پرزے دامنِ صحرائے غربت اے جنوں — دستِ شوق اپنا رسا ہوتا بدامانِ وطن

شوقِ کنعاں حضرتِ یوسف کے دل سے پوچھیے — قصرِ شاہی مصر کا اچھا کہ زندانِ وطن

میں ہوں کیا ننگِ وطن اے خانماں آوارگی — بڑھ گئی میرے نہ رہنے سے کوئی شانِ وطن؟

دلمیں ہے یارب یہ کن آئینہ رویوں کا خیال — گو وطن سے دور ہوں لیکن ہوں حیرانِ وطن

رہنے دے بس اے ستم غربت یہ ٹھنڈی گرمیاں — یاد ہے کیفیتِ صبحِ زمستانِ وطن

دامِ غربت میں کیا صیادِ گردوں نے اسیر — ہائے مجکو جان کر مرغِ خوش الحانِ وطن

بیکسی! اچھا وطن خواہاں نہیں میرا نہو — جان سے دل سے مگر ہوں میں تو خواہانِ وطن

زخمِ دل پر شامِ غربت میں نمکپاشی کرے — کچھ مزا دے یادِ شورِ صبحِ خندانِ وطن

کس سے پرسی کے سوا دلسوزیٔ غربت میں کون — کیجیے کس سے بیانِ سوزِ پنہانِ وطن

کیا مزا پردیس میں دیتی ہے اے ذوقِ خلش — دل کو یادِ ناوکِ جورِ عزیزانِ وطن

جلد پہنچا دے وطن مجکو دیارِ غیر سے — المدد اے جذبۂ شوقِ فراوانِ وطن

نام لیتا ہوں وطن کا جان میں آتی ہے جاں
کیا وطن ہے نام پیارا۔ اسی میں قربان وطن

دل میں ہے حب وطن جیسے کہ شیشے میں پری
میں ہوں دیوانہ وطن کا یا سلیمان وطن

ہمصفیرو کچھ نہ پوچھو رعب کا غربت میں حال
عندلیب خوشنوا ہے محو دستان وطن

رعب قریشی انصاری شاہ آبادی

شور محشر

ہمارے دوست مولوی محمد ظفر علیخاں صاحب بی اے اڈیٹر دکن ریویو نے حیدرآباد کے ایک عظیم الشان جلسہ میں جو مصیبت زدگان طغیانی رود موسی کی امداد کی غرض سے منعقد ہوا تھا ایک نہایت پُراثر نظم پڑھی تھی جسے اُنہوں نے رسالہ کی صورت میں شائع کرکے بعض احباب میں تقسیم بھی کیا ہے چونکہ وہ نظم مستقل قدر کے قابل ہے اسلیئے اسکے پہلے چھ بند ہم ان اوراق میں بھی شائع کرتے ہیں۔

(۱)

اس باغ میں ہے کیسا یہ مجمع پریشاں
صورت سے فکر ظاہر چہروں سے غم نمایاں

لالہ کی طرح سب کے سینوں میں داغ تاباں
شبنم کیطرح سب کی آنکھوں سے اشک غلطاں

کیوں اُوس پڑ گئی ہے اس باغ پر کہ ایک
جاتی رہی وہ رونق باقی نہیں وہ خوشیاں

بجتے تھے جسمیں کل تک شادی کے شادیانے
شان خدا وہیں ہیں ماتم کے آج ساماں

ماتم بھی ایک دو کا گر ہو تو صبر کرلیں
لیکن یہاں تو صد الگھر ہوگئے ہیں ویراں

موت اور زندگی میں ہے ایک حد فاصل
لطف جناب باری یا قہر و خشم یزداں

قہر خدا کی صورت نازل ہوا دکن پر
بنکر قضائے مبرم موسیٰ ندی کا طوفاں

وہ نہر شہر میں ہے جو مدتوں سے جاری
صد ہا برس سے ہمپر جو کررہی تھی احساں

تھا گھونٹ گھونٹ جسکا امرت سے ہمکو بڑھکر
تھی جرعہ نوش جسکے یکساں گدا و سلطاں

یکساں عنایتیں تھیں خلق خدا پہ جس کی
ہم مشرب تھیں جسکے تھے کفر اور ایماں

بیٹھے ہوئے تھے جسکو ہم شہر کی رگِ جاں — میں جسکے وصف میں تھا کل اسطرح غزلخوان

(۲)

طبع شگفتہ میری صرفِ سخنوری ہے — منظور مجکو مشقِ افسونِ سامری ہے

چشمہ نکالنا ہے پتھر سے آج مجکو — موسیٰ سے آج مجکو کرنی برابری ہے

کس شانِ تمکنت سے بہتی ہے نہر موسیٰ — لہرا رہی ہے ناگن یا جلوہ گر پری ہے

یا موجِ کہکشاں نے افلاک سے اُتر کر — کی ساحتِ دکن پر انوار گستری ہے

اے نہر تیرا پانی شیریں ہے اور گوارا — مصری کی اک ڈلی ہے جو تیری کنکری ہے

جاں بخش تیری لہریں دلکش تری روانی — قدرت نے تجکو بخشی کیا شانِ دلبری ہے

رامشگری میں یکتا ساقی گری میں پُرفن — گوہر سے خوشنماتر فیروزہ سے کھری ہے

موتی لڑھک رہے ہیں ہیرے چمک رہے ہیں — کیا کیا جواہرات سے جھولی تری بھری ہے

خدمتگزار تیرے بادِ صبا کے جھونکے — آئینہ دار تیرا خورشیدِ خاوری ہے

تیری روانیوں میں رنگِ مزاجِ جاناں — اور پیچ و خم میں تجکو کاکل سے ہمسری ہے

وقتِ خرامِ بستاں لیلیٰ کی شان تجھمیں — وقتِ گزارِ صحرا تو قیسِ عامری ہے

کھیتوں کی تجھسے رونق باغوں کی تجھسے زینت — دہقاں کو تو ہی زہرہ سلطاں کو مشتری ہے

موجوں کے آستاں پر سبزہ کا لہلہانا — آبِ رواں کا آنچل جھالر ہری ہری ہے

جنگل میں ہو رہا ہے تیرے قدم سے منگل — تو صنعِ ایزدی ہے تو شانِ داوری ہے

چلمن پڑی ہوئی ہے تجھپر کہیں کنول کی — اور نرسلوں سے تیری دہلیز اخضری ہے

عکسِ شفق سے تیری رونق ہوئی دوبالا — نکھری ہوئی ہے رنگت بکھری ہوئی زری ہے

ساون میں تو نے اوڑھا جب اگرئی دوپٹا — دنیا یہ سمجھی جوگن کے بھیس میں پری ہے

آتی ہے تو ازل سے جاتی ہے تو ابد کو — تیرا حدی سرا جوں اور ناقہ جنوری ہے

کرتا ہے فیض تیرا پیدا شجر حجر سے — عیسیٰ کا تو نفس ہے یا سحرِ سامری ہے

ہے تیری مچھلیوں پر ہمکو گمانِ انجم — گردوں پہ جنکا جھرمٹ صرفِ شناوری ہے

طبع رواں ہے میری یا آبشار تیرا — یا ساتگین قدرت انوار سے بھری ہے

تیرہ ادھار سے ہیں نقد ہمکو اچھے — یہ وجہ ہے کہ کوثر پر تجھکو برتری ہے

ہے رود نیل و گنگا سے بڑھکے رتبہ تیرا — قامت کی کہتری سے قیمت کی بہتری ہے

اُس شہریار کے گھر میں ہے گزار تیرا — جو نازش اماثل اور زیب سروری ہے

ہیں عتبہ بوس جسکے سال و مہ و شب و روز — حلقہ بگوش جسکا اک چرخ چنبری ہے

آصف کہ جسکے سر پر ہو سایہ کبریا کا — جسکی جبیں سے ظاہر شان سکندری ہے

جو کچھ کہا ہے میں نے اے نہر تیری نسبت — الزام شاعری ہے افسوس میری نسبت

(۳)

او نامراد ندی تجھپر غضب خدا کا — اُٹھا ہی تو نے تختہ یاران آشنا کا

ہمسے تو وہ وفائیں اور تجھسے یہ جفائیں — بدلا دیا ہے تو نے اچھا ہمیں وفا کا

اچھا کیا ادا حق ہمسائگی کا تو نے — ہم تجھسے او دغا ہیں تو نے ہمیں کو تاکا

اک کاروان آصف اُترا ترے کنارے — او ناسپاس تو نے ڈالا اُسی پہ ڈاکا

تیری ہر ایک ٹکر داعی بنی اجل کی — تیرا ہر اک تھپیڑا قاصد بنا قضا کا

منجدھار میں ہے کشتی ٹوٹا ہوا ہے لنگر — سر پر ہے رات کالی طوفان ہے بلا کا

تقدیر ہنس رہی ہے تدبیر رو رہی ہے — مورد ہو نا خدا کیوں الزام ناروا کا

شب ہے شب قیامت دن ہے حساب کا دن — وقت آگیا سزا کا عہد آگیا جزا کا

خالی امید کا گھر دروازہ توبہ کا بند — آئے اثر کہاں سے موقع نہیں دعا کا

اس واقعے کا ماتم برسوں بپا رہے گا — کانٹا ہر ایک دل میں غم کا چبھا رہے گا

(۴)

اُمڈی ہوئی ہے ندی چھایا ہوا ہے بادل — پاٹ اسقدر بڑھا ہے سب ہو گیا ہے جل تھل

ہے شب نے دن پہ اندھیرا ڈال رکھا — خورشید خاوری ہے ابر سیہ کے اوجھل

اکبارگی گئے کھل گردوں کے سب دریچے — بادل چلا ہے بنکر طوفان کا ہراول

قدرت کی طاقتوں کو دست قضا ہے روکے — انساں کی کوششیں ہیں بیکار اور معطل

غصہ کا ہے یہ عالم کف در دہاں ہے ندی — وقفِ شکن ہیں ابرو ماتھے پہ ہیں پڑے بل

جوش و خروش اسکا ہر لحظہ بڑھ رہا ہے — سہمی ہوئی ہے خلقت ہوش و حواس ہیں شل

ساحل پہ گھر ہیں جنکے وہ بلبلا رہے ہیں — مرنا ہمیں ہے آخر مرنا ہمیں ہے اول

پانی ہر اک طرف سے گھیرے ہوئے ہے گھر کو — جاں تلملا رہی ہے دل ہو رہے ہیں بیکل

گرنے لگے مکاں جب بہنے لگے مکیں سب — ہے آج کوچ اپنا ساماں چلا گیا کل

ہر ہر کھنڈر میں لاشیں صدہا پڑے ہوئے ہیں — بلدہ کا ہر محلہ ہے کربلا کا مقتل

واں موجب اجل تھی پیاسوں کو تشنہ کامی — یاں باعث فنا ہے آب بقا کی چھاگل

محشر کا صور پھونکا موسیٰ نے کو بکو ہے — شورِ نشور برپا بلدے میں سو بسو ہے

(۵)

واحسرتا وہ صدہا گھر بار کا اجڑنا — ہر نخل آرزو کا بنیاد سے اکھڑنا

وہ نقشۂ اجل کا آنکھوں کے آگے پھرنا — کوہِ قضا کا سر پہ پل بھر میں ٹوٹ پڑنا

دیوار و بام و در کا پانی میں غرق ہونا — سنگیں عمارتوں کا پتوں کی طرح جھڑنا

وہ جسم بے اماں کا موجوں کی نذر ہونا — وہ جان ناتواں کا کشتی قضا سے لڑنا

اُس ہاتھ کا نہیں ہے کچھ جسمیں جان باقی — بہتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں پکڑنا

ماں سے لپٹ کر بچہ کا وہ بلکنا — اور صدمہ سے اُسکے سینے پر ایڑیاں رگڑنا

بچہ کا ہاتھ آکر پھر ماں سے چھوٹ جانا — زخمِ جگر کے ٹانکوں کا یک بیک اُدھڑنا

سب دل کے ولولوں کا پیوندِ آب کرنا — اک رات کی دلہن کا نوشہ سے یوں بچھڑنا

وہ ڈوبتے ہوؤں کا سب کو سلام کرنا — اور اُنکی حسرتوں کا جا کر دلوں میں گڑنا

تھا فتنۂ قیامت اک سیلِ رودِ موسیٰ — من کر ترا اچھلنا بنکر ترا اکڑنا

شانِ جلالِ باری قہرِ خدا کا نقشہ — ہر لہر کا بپھرنا ہر موج کا اکڑنا

کیوں ساتھ ساتھ اپنے لیکر چلا نہ ہم کو — جو قافلہ چلا ہے سرِ منزلِ عدم کو

(۶)

چمکے ہیں جو شرارے اُڑ کر مرے بیاں سے — وہ مستعار میں نے مانگے ہیں سوزِ جاں سے

اس مرثیہ میں میں نے رنگ انیس اڑایا — لایا ہوں اس زمیں کو میں جا کے آسماں سے

پھر بھی نہیں ہے لیکن یہ غم وہ غم کہ جسکا — حق ہو ادا زباں سے یا چشم خونفشاں سے

منت کش شنیدن قصہ نہیں ہمارا — آتی ہے بوئے حسرت اس غم کی داستاں سے

صدہا ہزار کا گھر ڈوبا ہوا ہے غم میں — کیا خاک انکی تسکیں ہو ایک نوحہ خواں سے

آئے قرار کیونکر انکے دل حزیں کو — بے خانماں ہیں ہو کر رخصت ہوئے مکاں سے

جینا ہے ان کا مرنا اس سے بھی بلکہ بدتر — جنکے عزیز پیارے گزرے ہیں اس جہاں سے

ایسی مصیبتوں کا جنسے فلک بھی کانپے — کیونکر مقابلہ ہو اک مشت استخواں سے

ندی کے دونوں جانب ہے ایک ہو کا عالم — حیراں ہے عقل آئے اتنے کھنڈر کہاں سے

منظر ہے عبرت افزا ٹوٹے ہوئے پلوں کا — وحشت برس رہی ہے ہر پل کی ہر کماں سے

بازار اجڑ گئے ہیں ویران ہیں دوکانیں — سنسان ہیں محلے رستے ہیں بے نشاں سے

پامال ہو گئی ہے بستی یہ آفتوں کی — تاراج ہو گیا ہے یہ گلستاں خزاں سے

اللہ کے کرم کے امیدوار ہیں ہم — مایوس کیوں ہوں لطف خدایگاں سے

صدہا ہزار کو سیل بلا نے مارا — کچھ لوگ بچ کے نکلے اس سخت امتحاں سے

کیا جانے پیش آتی کیا ان کو گر نہ ہوتی — انکی جبیں کو نسبت آصف کے آستاں سے

طوفاں سے وہ رعایا پہنچی ہے شہ کے در پر — بلبل کو ہے شکایت گلچیں کی باغباں سے

یہ محض ہے تصدق شہ کی عنایتوں کا — جو بچ رہے ہیں باقی ہیں امن و اماں سے

لاکھوں ستم رسیدہ جو فاقہ کر رہے تھے — اٹھے ہیں سیر ہو کر اسکے کرم کے خواں سے

ڈھکنے کو تن کے کپڑا جنکو نہ تھا میسر — جا جا کے وہ دوشالہ لائے اسکے ہاں سے

اجڑا یہ شہر اس نے پھر بات میں بسایا — دنیا ہوئی ہویدا جس طرح کن فکاں سے

ظلمت برس رہی تھی جن رستوں پہ کل تک — اب وہ تمام سڑکیں ملتی ہیں کہکشاں سے

احسان مانتے ہیں اپنے نظام کا ہم — منت پذیر دل کی زینت ہے امتناں سے

تازہ غزلیں

من کہ در بندِ غمِ دشوار و آسان نیستم | ہیچ باک از خشمِ گردونِ گزران نیستم

شیوۂ کفر ارچہ حدِ چوں منے نبود لے | من باین شادم کہ آخر خود مسلمان نیستم

گر لبِ جاں بخشِ جاناں چارہ فرمائی کند | من بروں آیم ازیں دعوی کہ درمان نیستم

فرصتم بادا کہ با رندی و مستی خو کنم | چوں رہ و رسمِ ریا را مردِ میدان نیستم

گرچہ خود دانم کہ چنداں عاقل و دانا نیم | باز ہم چوں ناصحِ کم مایہ نادان نیستم

آسماں طرفے نہ خواہد بست در سودای من | زاں کہ او دوں طبع و من ایں مایہ ارزان نیستم

شاعری از من مجو دور از سوادِ بمبئی | حالیا شبلی شدم رندِ غزلخوان نیستم

عدم کے رہنے والے بھی مکینِ لامکانی ہیں | نہ رسمِ خط کتابت ہے نہ پیغامِ زبانی ہیں

جہاں کے جسقدر جھگڑے ہیں سب قصّے کہانی ہیں | کہ گل بوٹے ریاضِ دہر کے سب نقشِ فانی ہیں

حباب آسا نہالِ گلشنِ دنیائے فانی ہیں | یہ جتنے پھول پھل ہیں بے نشانی کی نشانی ہیں

حسینوں کے بہارِ حُسن کے دن بھی خزانی ہیں | عبث یہ بیخبر مستِ شرابِ نوجوانی ہیں

سراسر بے بقا بود و نمودِ کارخِ ہستی ہے | فنا ہونے کو غافل کل زمین آسمانی ہیں

چھلکتے ہیں مئے خونِ جگر سے دیدۂ پُرنم | ہمارے پاس دو جامِ شرابِ ارغوانی ہیں

بہارِ نوجوانی عالمِ برقِ جہندہ ہے | برنگِ بادِ صرصر چند روزہ زندگانی ہیں

سراپا شور ہیں مثلِ جرس ہم زار نالی سے | ہمارے نالۂ موزوں بھی اشعارِ فغانی ہیں

فنا ہونے کو ہی دنیا میں جتنی آفرینش ہے | عبث زردار مغرورِ نشاطِ کامرانی ہیں

بجز ذاتِ خدا کوئی نہیں اپنا زمانے میں | یہ باتیں دیکھی بھالی جانچی تولی امتحانی ہیں

نگاہیں کیا پھریں تیری کہ دل بھی پھر گیا ہم سے | نہ وہ مہر و محبت ہے نہ الطافِ زبانی ہیں

نہیں جائے اقامت رہگذارِ وادیِ ہستی | مسافر میہمانِ منزلِ دنیائے فانی ہیں

نظر آتے ہیں بازاروں میں کیا کیا چاند کے ٹکڑے
زمینی ماہ پارے بھی نجومِ آسمانی ہیں

بنایا دستِ قدرت نے جو اس مٹی کے پتلے کو
خدا جانے کہ مخفی اس میں کیا رازِ نہانی ہیں

پسِ مُردن نہیں ہوتا کسی کا آشنا کوئی
مگر ہاں زندگی کے یار سب احباب جانی ہیں

خدا معلوم زیرِ خاک کیا دلچسپ بستی ہے
مکیں جس جا ہزاروں تاجور نوشیروانی ہیں

نسیمِ صبح ہنستی ہے بہارِ خندۂ گل پر
نوا سنجانِ گلشن نغمہ سنجِ نوحہ خوانی ہیں

مآلِ عیش وقتِ نزع غافل تلخکامی ہے
نہایت خوش مزہ ہر چند لذاتِ جہانی ہیں

ظہیر اشعار کیا لکھیں کہ اب کی روشنی والے
غزل سُن سُن کے کہتے ہیں کہ یہ باتیں پُرانی ہیں

میان سے باہر جو وہ تلوار ہو کر رہ گئی
میری آسانی مجھے دشوار ہو کر رہ گئی

کاوشِ غم۔ جان کو آزار ہو کر رہ گئی
پھانس جو دل میں لگی تھی خار ہو کر رہ گئی

کام بگڑے بن گئے جس وقت دن اپنے پھرے
بدنصیبی طالعِ بیدار ہو کر رہ گئی

عرضِ مطلب پر تسلی دے گئی نیچی نظر
شرم اُن کی پہلوئے اقرار ہو کر رہ گئی

اس ادا سے میرے مرنے کا کسی نے غم کیا
ایک دنیا جان سے بیزار ہو کر رہ گئی

مجھ سے لاغر کو شبِ غم کیا کہوں کیونکر کٹی
جو شکن بستر پہ تھی تلوار ہو کر رہ گئی

بارہا بیمارِ غم کروٹ بدل کر رہ گیا
کس کے آنے کی خبر ہر بار ہو کر رہ گئی

غیر کا مذکور بھی کوئی پیامِ وصل تھا
کس لیے نیچی نگاہِ یار ہو کر رہ گئی

آخر اُن کو بن سنور کر میرے گھر آنا پڑا
آرزو اُن کے گلے کا ہار ہو کر رہ گئی

ان بتوں کی چاہ کر کے کس بلا میں پڑ گیا
تیری کیا حالت دلِ بیمار ہو کر رہ گئی

دید کے قابل تھی حسرت اس دلِ مایوس کی
جب نظر اُن کی جگر کے پار ہو کر رہ گئی

نا امیدی نے شبِ غم ایسے کچھ چھینٹے دیئے
سرو اپنی آہ آتشبار ہو کر رہ گئی

اُس نے وصفِ غیر کر کے دل کو زخمی کر دیا
بات جو ظالم نے کی تلوار ہو کر رہ گئی



H. H. Maharaja Sir Madho Rao Scindhia of Gwaliar, G. C. S

مخزن

اکاڈمی

"اُردو سبھا" کے متعلق جو تجویز گزشتہ دسمبر میں اوراق مخزن میں شائع ہوئی ہے اُسکا ایک جزو ضروری یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ شائقین و ہوا خواہانِ زبانِ اردو کی اِس کانفرنس سے جو زیر تجویز ہے ایک ایسی جماعت چالیس پچاس نامور اہل قلم کی انتخاب کیجائے جو اُردو زبان کی تحقیق و توسیع اور اُسکے علم ادب کی ترقی کیلیے ہندوستان میں وہی خدمات انجام دے جو فرانس "اکاڈمی فرانسیز" عرصہ دراز سے انجام دے رہی ہے۔ اکثر انگریزی خواں حضرات اس مشہور فرانسیسی انجمن کے نام اور کام سے واقف ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو انگریزی کتابوں کے ذرائع اطلاع سے محروم ہیں۔ اُن کے کان اِس لفظ سے اور وہ خود اسکے معنی سے غالبًا نا آشنا ہیں۔ اور اِس لحاظ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس اصطلاح کی تشریح اختصار کے ساتھ کردیجائے لیکن اِس غرض کے ادا کرنے سے پہلے شاید غیر موزوں نہوگا کہ ناظرین کو اِس امر کی اطلاع دیجائے کہ اردو سبھا کے خیال کو بالعموم بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا

گیا ہے۔ بہت لوگوں نے تائیدی خط لکھے ہیں۔ بعض اصحاب نے زبانی اظہار موافقت کیا ہے۔ بعض نے اِس کوشش میں سرگرمی سے شریک ہونے پر آمادگی ظاہر کی ہے اِن خطوط اور آرا کا خلاصہ آیندہ نمبر میں درج ہوگا۔ اور حتی الوسع یہ کوشش جاری رہے گی کہ یہ مضمون ملک کی اُردو خواں جماعت کے پیش نظر رہے۔ اور اُسوقت تک جب اِس تجویز کی تکمیل کا زمانہ آئے لوگ اِس سے غافل نہو جائیں۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بہت سے اہل الرائے حضرات ایسے ہیں کہ جو اِس تجویز کے موافق ہیں۔ مگر اُنھوں نے اب تک اپنے خیال کا اظہار نہیں کیا۔ امید ہے کہ وہ اب تحریر کے ذریعہ اپنے خیالات سے مطلع فرمائیں گے۔ کیونکہ اُنکی رائیں جمع ہوکر دوسروں کیلئے باعث ترغیب ہونگی کہ وہ بھی اِس کوشش میں شریک ہوں *

دنیا بھر کی زبانوں میں لفظ "اکاڈمی" یونانی زبان سے آیا ہے اور اصل میں ایک اسم معرفہ سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلی اکاڈمی افلاطون اکاڈمی تھی۔ شہر اتھینز دارالحکومت یونان سے کوئی ایک میل باہر ایک خوش فضا باغ میں ایک درسگاہ تھی جو ایک شخص سائمن نامی نے اپنے اہل شہر کی نذر کی تھی اور یونانی بہادر اکاڈیمس کے نام پر اسکا نام رکھا تھا۔ حکیم افلاطون اور اُن کے تلامذہ اکثر اِس باغ میں جایا کرتے تھے اور وہیں حکیم ممدوح اپنی حکمت کے دریا بہاتے اور علم کے پیاسے شاگرد اُن کے فیض سے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ اِس اتفاقی امر نے ایک معمولی تفرجگاہ کو مخزن علم و حکمت بنا دیا۔ اور یونانی اکاڈیمس کے نام کو جاودانی زندگی بخشدی۔ ہر چند کہ اکاڈیمس کی شہرت صرف جسمانی ہمت کے کارناموں سے تعلق رکھتی تھی اور دماغی قوت میں اُسنے نام پیدا نہیں کیا تھا۔ تاہم افلاطون کے قدم کی برکت سے اکاڈمی دماغی قوت کا مرکز بن گئی۔ اور پچاس سال تک حکیم اور اُسکے شاگرد وہاں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ حکیم کے بعد مختلف شاگردوں کے جُدا جُدا

مسلک قرار پائے۔ اور ہر شاگرد کے تلامذہ اپنے اپنے استاد کی راہ پر چلنے لگے
اور جہاں اُسکے موافق تعلیم ہو۔ اُسکو ایک جدا اکاڈمی قرار دے کر اپنے استاد کے
نام سے منسوب کرنے لگے۔ ایک شاخ قائم ہوئی جسے پُرانی اکاڈمی کہتے ہیں
جو ۳۸۷ء قبل مسیح سے ۲۷۰ء قبل مسیح تک رہی۔ اِسمیں فیثا غورث کے اصول
مقبول تھے۔ اطالیہ کا مشہور اور فصیح عالم سسرو کہتا ہے کہ ہر قسم کے علوم اسمیں
مروج تھے۔ تاریخ کے مطالعہ پر خاص طور پہ زور دیا جاتا تھا اور خوش بیانی سکھائی
جاتی تھی۔ دوسری اکاڈمی جسے وسطی اکاڈمی کہتے تھے ۳۱۶ء قبل مسیح سے ۲۱۶ء
قبل مسیح تک رہی۔ اِسمیں افلاطون کی تعلیم کا وہ حصہ غالب تھا جس کے رو سے
سب امور معرضِ شک میں ہیں اور کسی چیز پر قطعی اور یقینی حکم نہیں لگایا جا سکتا
تیسری اکاڈمی جسے نئی اکاڈمی کہتے تھے ۲۱۴ء قبل مسیح سے ۱۲۹ء قبل مسیح تک
رہی۔ اور اِس اکاڈمی کے حکما ہر چیز کے فی الحقیقت موجود ہونے سے لاعلمی ظاہر
کرتے تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ ظن غالب پر تمام امورِ دنیا کی بنیاد رکھتے تھے۔ اُس
زمانہ سے آجتک برابر اکاڈمی کا وجود مختلف صورتوں میں چلا آتا ہے۔ اور اب اِس لفظ کا
اطلاق مدرسوں اور تعلیم گاہوں پر بھی ہوتا ہے۔ اور ایسی انجمنوں اور مجالس پر بھی جنکا
مقصد علوم و فنون کی ترقی ہو۔ ہمیں اس لفظ کے جن معنوں سے اسوقت سروکار
ہے وہ یہی معنی ہیں اور اِس اکاڈمی کو جسکی تجویز اردو سبھا کے متعلق پیش کیگئی ہے
"جلسۂ ادبیہ اُردو" کہہ سکتے ہیں یا کوئی اور نام اس قسم کا اسکے لیے وضع
کر سکتے ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ نام کا آخری فیصلہ تو خود وہی جماعت کر سکے گی جو اس
انجمن کو قائم کرے۔ اور ابھی سے اسکے نام کے متعلق بحث عبث ہے۔ تاہم میں محض
ذاتی رائے کے اظہار کے لیئے اس قدر کہدینا کافی سمجھتا ہوں کہ میرے خیال میں ایسی
اصطلاحات کا ترجمہ کرنا خلاف مصلحت ہے اور اسے بجنسہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اب پ

دیکھئے کہ گویہ لفظ یونانی زبان میں کوئی بامعنی لفظ نہ تھا مگر یورپ کی دوسری زبانوں نے جب علومِ یونان سے فائدہ اُٹھانا شروع کیا تو اِس لفظ کو صرف کسیقدر تغیر تلفظ کے ساتھ اپنی اپنی زبان میں داخل کرلیا حالانکہ وہ بآسانی اسکے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کرسکتے تھے۔ اِسمیں علاوہ اختصار اور سہولت کو مدنظر رکھنے کے یہ فائدہ ہے کہ آج انگلستان۔ فرانس۔ جرمن اور دیگر ممالک کی زبانوں میں یہ لفظ اور ایسی اور اصطلاحات علمی مشترک ہیں۔ اب اگر ہم بھی اصطلاح کو اسیطرح اصطلاحی صورت میں اختیار کرلیں تو ہمیں فوراً دُنیا کی دوسری ذی علم قوموں سے اس بارے میں ایک رشتہ یگانگت حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ بھی پہچاننے لگتی ہیں کہ وہ ہی آلاتِ ترقی جو اُنکے پاس موجود ہیں۔ مشرق میں بھی استعمال میں آنے لگے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود ملک کے اندر اختلافات اصطلاح کی تکلیف سے ہم اس طرح بچ سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ اُردو کی ایک انجمن نے ایک اصطلاح کا ترجمہ عربی لفظوں میں کیا۔ اور ہندی کی کسی سبھا نے اسی اصطلاح کا ترجمہ سنسکرت میں کیا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں قومیں جو اُن اصطلاحات کو کام میں لائیں گی ایک دوسرے کے کام کی نوعیت تک سمجھنے سے رفتہ رفتہ قاصر ہوجائیں۔ لیکن اگر اصطلاح بجنسہ لے لی گئی تو نہ صرف ہندی داں اور اردو داں میں اتحاد اصطلاحات ہوگیا۔ بلکہ تمام مہذب دُنیا کی اصطلاحات سے اشتراک پیدا ہوگیا۔ یہ موقع مسئلہ ترجمہ کے اِس پہلو پر بہ تفصیل بحث کرنے کا نہیں ہے۔ اور اسلیئے میں "اکاڈمی فرانسے" کی طرف آتا ہوں +

یورپ میں مختلف زمانوں میں جتنی اکاڈمیاں قائم ہوئیں۔ اُن سب کی تواریخ گو بجائے خود بہت دلچسپ ہے۔ لیکن اِس مضمون میں اسکا ذکر بالاجمال بھی نہیں ہوسکتا۔ یہاں یہی کافی ہے کہ "اکاڈمی فرانسے" کا کچھ ذکر کردیا جائے جسے ہم اپنے لیئے بطور نمونہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ "اکاڈمی" شہرت اور وقعت کے

اعتبار سے دنیا بھر میں اول مانی جاتی ہے۔ اہل فرانس اسپر بجا ناز کرتے ہیں فرانس میں ایک "انسٹی ٹیوٹ" ہے جسکے مقاصد حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سائنس کی ترقی۔

۲۔ علمی جستجو کی تشویق۔

۳۔ نئی نئی دریافتوں کی اشاعت۔

۴۔ دوسری انجمنوں سے خط وکتابت اور سائنس کی کتب مفیدہ تیار کرنا۔

اس انسٹیٹیوٹ کی پانچ شاخیں ہیں اور ہر شاخ ایک خاص فن کے لیے مخصوص ہے۔ ان پانچوں میں "اکاڈمی فرانسیز" جو زبان کی تحقیق اور ادب فرانسیسی کی ترویج کی ذمہ دار ہے۔ سب سے اہم شمار کیجاتی ہے۔ انسٹیٹیوٹ کا ایک بڑا مشترکہ کتبخانہ ہے۔ اور سب شاخوں کا سرمایہ بھی یکجا رہتا ہے۔ لیکن انتظام کے اعتبار سے ہر شاخ خودمختار ہے۔ انہیں اس زباندانی والی شاخ کی ابتدا ۱۶۳۰ء میں ہوئی۔ چند علم دوست احباب ایک دوست کے مکان پر جمع ہو کر محققانہ بحث مباحثہ کرتے اور علمی گفتگو میں شریک ہوتے تھے۔ اور اپنے جلسوں میں کی کارروائی پوشیدہ رکھتے تھے۔ کیونکہ اُن دنوں علم جلسے کرنے اور انجمنیں قائم کرنا خلافِ قانون تھا مگر کسی نہ کسی طرح اس انجمن کا شہرہ اس مکان کی چار دیواری سے باہر پھیلا اور اسکے مفید کام کا اعتراف خود حکومت کیطرف سے ہوا۔ اور ۱۶۳۵ء میں رچلیو نے اسکا مربی ہونا منظور کیا۔ اور اسکے باضابطہ انعقاد کی اجازت دی۔ اب اکاڈمی نے اپنے اغراض و مقاصد مرتب کیئے۔ جن میں ذیل کے مقاصد قابل ذکر ہیں:-

۱۔ زبان کے قواعد منضبط کرنے کے لیے محنت اور سرگرمی سے کوشش کرنا۔

۲۔ زبان کو صاف اور فصیح بنانا۔ اور اس قابل بنانا کہ علوم و فنون کے ہر قسم کے مطالب ادا کرسکے۔

۳۔ زبان کی ایک مستند لغت تیار کرنا۔ اور کتاب صرف و نحو ترتیب دینا۔

۴۔ فن بلاغت اور نظم پر رسائل تیار کرنا۔

اس اکاڈمی کے چالیس ممبر مقرر ہوئے اور ۱۶۳۶ء میں اُنھوں نے باقاعدہ کام شروع کیا۔

۱۶۹۴ء میں ایک عالم ڈی واگلس نامی نے کتاب لغت تیار کی جو اکاڈمی نے پسند کی۔ اسوقت سے ۱۸۷۸ء تک اسکے سات ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اب اکاڈمی کی کوشش سے ایک جسیم ڈکشنری لکھی جا رہی ہے۔ جسکی پہلی جلد ۱۸۵۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور اب چوتھی جلد چھپ چکی ہے۔ باقی ابھی زیر طبع ہے۔ اکاڈمی کے زمانۂ قیام سے آج تک فرانس کے قریب قریب سب بڑے مصنف اس کے اراکین میں رہے ہیں۔ اور دن بدن اسکا اثر اور اقتدار روبہ ترقی رہا ہے۔ بعض لوگوں نے اسکے مفید ہونے سے اختلاف کیا ہے اور اُنکی یہ رائے ہے کہ اس سے طبائع میں قوتِ ایجاد کم ہوگئی ہے۔ اکاڈمی گویا ایک سانچا لیئے بیٹھی ہے اور چاہتی ہے کہ ہر تصنیف یا تالیف اس سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو۔ ممکن ہے کہ کسی حد تک چند تصانیف پر بعض قیود کا مضر اثر پڑا ہو۔ لیکن بڑے بڑے بلند پایہ نقادانِ سخن جیسے میتھو آرنلڈ انگلستان میں اور رینان فرانس میں اس رائے پر متفق ہیں کہ فرانسیسی زبان کی پر معنی سادگی اور لطافت اکاڈمی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اور اُن بے غرضانہ مساعی سے جو سینکڑوں عالی رتبہ علما اور دردمندان ملک کی طرف سے کئی پشتوں سے جاری ہیں۔ فرانسیسی زبان اور فرانسیسی ادبیات نے وہ جلا پائی ہے اور اسقدر منجھے ہیں کہ دوسری زبانوں میں اسکی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔

عبد القادر

ہولی کی رنگ رلیاں

لُوٹو غنچو بہار ہولی ہے — ہو تو بلبل نثار ہولی ہے
جبتک ہو یں نہ یار محفل میں — اپنی آنکھوں میں خار ہولی ہے

بسنت سے ہولی تک جو دن گزرتے ہیں ہم اُنہیں موسم بہار کے نام سے تعبیر کیا کرتے ہیں ان دنوں میں اَور مُلکوں کی تو خبر نہیں مگر ہندوستان میں رنگ برنگ کی کیفیتیں ظہور پکڑتی ہیں۔ گنوار سے لیکر ہوشیار تک اس کیفیت میں رنگا ہوا دکھائی دیتا ہے جوں جوں اس موسم کا سکہ بیٹھتا ہے اور ہولی کے دن قریب آتے ہیں اکثر آدمی شراب کے بغیر ہی متوالے ہو جاتے ہیں جو عالی ظرف ہیں وہ اس مزے کو بڑی بُردباری سے لُوٹتے ہیں۔ اُنکے چہروں پر سُرخیاں اُنکے دلوں میں گدگدیاں مگر مُنہ سے ہُوں - نہیں نکالتے جن کی طبیعتوں میں اس خوشی کی سمائی کم ہے وہ ناچتے ہیں۔ کودتے ہیں۔ شراب پئیں یا نہ پئیں مگر خوب بنکارتے ہیں۔ بعض قوموں کی عورتیں بھی ان دنوں میں اپنی اُمنگ خوب نکالتی ہیں *

یہ وہ دن ہیں کہ ہمارے خون کے تھتلے پگھلتے ہیں۔ جاڑا پا در رکاب ہوتا ہے گرمی کی آمد آمد ہوتی ہے۔ ہر ایک چیز حدِ اعتدال پر آجاتی ہے۔ ہمارے خون کو ستی سستی ہوا لگتی ہے جس سے وہ گرما کر باہر پاؤں نکالتا ہے۔ کثافت نیچے بیٹھتی ہے لطافت بن پروں اُڑتی ہے۔ وحشیوں کی طرح کلانچیں مارنے کو جی چاہتا ہے جو صلے کو یہ فراخی ہوتی ہے کہ شہروں کی آبادی کو تنگ جان کر جنگل کا راستہ لینے کو دل چاہتا ہے وہ یہی دن ہیں جنمیں طبیعت آزادی کو نہایت ڈھونڈھتی ہے وہ یہی زمانہ ہے جسمیں ہر ایک کام کی اُمنگ دلمیں اُٹھتی ہے۔ کھیتیاں پک پکا کر تیار ہوتی ہیں۔ زمیندار اناج کی فکر سے بچنت اور بزعم خود اپنے اپنے کھیت کے شہر یار بنے ہوتے ہیں۔ انہی دنوں میں

تو دل سبزی۔ سُرخی۔ زردی کو دیکھکر لہراتا ہے۔ اِن ہی دنوں میں تو عشق اپنی کارستانیاں دکھاتا ہے بقول شخصے ؎

نفرت شراب سے ہے نہ رغبت کباب سے کوسوں ہیں دُور ہم غمِ زہد و ثواب سے

اسی موسم کو غیر ملکوں کے مورخوں نے مذاقیہ اپنی تاریخوں میں لکھا ہے کہ ہم نے ہندوستان میں ایک ایسا موسم دیکھا ہے جس میں سب کے سب پاگل ہوجاتے ہیں میرے نزدیک اگر اِس موسم کی خوبی اور اُس کی تمام حرکات پر غور کیجائے تو بڑا عمدہ نتیجہ نکلے اور اہل مذاق کو عجب لطف آئے۔

کرشن جی جو ایک خوش طبع۔ ظریف۔ پرمذاق۔ خوش مزاج توحید سے بھرے ہوئے اوتار ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے خاص کر اِس موسم میں وہ جان ڈالدی ہے کہ اُن کے نام۔ اُنکی ہولیوں۔ اور اُنکی بانسلی سے مرجھائے ہوئے دل بشاش ہوجاتے ہیں بانسلی کی دُھن وہ دُھن نہ تھی کہ کسی گوپی کو اُنکے رس میں کھینچ نہ بلاتی۔ گھر میں بیٹھی ہوئی ایک سکھی دوسری سکھی سے بار بار یہ ہی کہتی تھی کہ ایلو! وہ پھر بجی۔ کاش وہ بن جل جائے وہ بانس اُجڑ جائے جس سے ایسی رسیلی بانسلی بنی ہے۔

اُس زمانے میں جسقدر ہولیاں بنائی گئیں اور جن کے چربے آج تک اُتارے گئے وہ ایسی ولولہ انگیز ہیں کہ اُنکے سُننے سے کسی مذہب کا محقق کیوں نہو اپنی دلی خواہش کو بجبر دبائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ موحدوں کے لیئے یہ ایک عجیب سماع ہے۔ صوفیوں کے واسطے یہ ایک غضب کا روحانی سرور ہے۔ عاشق مزاجوں کے حق میں عشق کامل کا رہبر۔ مجنوں صفت۔ دیوانوں کے رنگ میں رنگ ملا دینے والا اور فرحت افزا موسم اگر ہے تو یہی ہولی کا موسم ہے فقط

سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ

روح کی بیداری

گزشتہ اشاعت سے آگے

عجائبات قدرت کی سیر

جب یقین ہوگیا کہ تمام موجودات اور کل کائنات کا ایک بنانیوالا ہی تو ہر طرف اسکی قدرت، صنعت، حکمت، اور وسعتِ علم کے آثار نظر آنے لگے۔ معمولی سی معمولی چیز بھی جسکو ابتک نہایت بے اعتنائی سے دیکھتا رہا تھا رموز حکمت کا آئینہ بن گئی اور چھوٹی سے چھوٹی شئے بھی عجائباتِ قدرت کا میوزیم معلوم ہونے لگی جس طرف نگاہ جاتی تھی حیرت سے روبکاری تھی **شعر**

این ہمہ نقش عجب بر درو دیوارِ وجود ہر کہ فکرت نہ کند نقش بود بر دیوار

عقلی دلیلوں کے بعد جو تھوڑی سی بے اطمینانی باقی رہجاتی ہے۔ اس حیرانی نے جو معرفت کا پیش خیمہ ہے اسکو بھی رفع کردیا۔ اطمینان کامل ہوگیا کہ یہ سب چیزیں جو حکمت اور صنعت کے خزانے ہیں اُسی مبدأ فیاض سے چلی آتی ہیں جسکا کمال بے حد و نہایت سب کمالوں سے برتر و بہتر ہے۔ اور جس سے نہ ایک ذرہ پوشیدہ ہی نہ اُس سے کوئی چھوٹی یا بڑی چیز خواہ آسمان میں ہو یا زمین میں[۱]

جانوروں میں جو نگاہ کی تو اُن میں اور چیزوں سے بھی زیادہ حکمت الٰہی کا جلوہ نظر آیا۔ ہر جانور کو اُسکی حالت اور ضرورتوں کے مناسب جسم عطا ہوا ہے اور پھر ایک

۱؎ ترجمہ ہے اِس آیۂ کریمہ کا وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ (دور اور غائب نہیں ہے تیرے پروردگار سے بمقدار ایک ذرہ بھی خواہ زمین میں ہو یا آسمان میں اور نہ اُس سے چھوٹی یا بڑی چیز ۱۲

کو اُسکا استعمال بھی ایسا ٹھیک سکھایا گیا ہے کہ باوجود عقل سے بے بہرہ ہونیکے کبھی غلطی نہیں کرتا۔ اگر محض جسم پیدا کرکے چھوڑ دیئے ہوتے' ان آلوں کا استعمال صحیح نہ سکھایا ہوتا تو جن اغراض سے یہ بنائے گئے تھے وہ ہرگز پورے نہوتے اور جانوروں کو ان سے کوئی بھی فائدہ نہوتا۔ بلکہ اُلٹے وبالِ جان ہوجاتے۔ اللہ اللہ کیا رحمت ہی کیا مہربانی ہے! اب تو وہ جس میں جمال' کمال' قوت' یا اور کوئی خوبی دیکھتا فوراً ذہن خداوند مہربان کی طرف منتقل ہوجاتا کہ یہ بھی اُسی کی عنایت' اُسی کی بخشش ہے

جانوروں میں رہتے رہتے اور اپنی اور اُنکی حالتوں کا مقابلہ کرتے کرتے اچھی طرح ذہن نشین ہوچکا تھا کہ مجھ میں جو صفتیں ہیں وہ زیادہ کامل' مستقل' کارآمد' عمدہ اور پائدار ہیں۔ اب تحقیق کا قدم آگے بڑھایا۔ اور صفات کمالی پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ سب فاعلِ حقیقی کی ذات میں موجود ہیں بلکہ اُسی سے ان کا چشمۂ فیض جاری ہوتا ہے اور اُسی کو سب سے زیادہ سزاوار ہیں۔ بعد ازاں نقائص کی تلاش کی تو ایک کا بھی اُس ذات پاک میں پتہ نہ پایا۔ اور پاتا بھی کیونکر اسلیئے کہ عدم کمال تو ایک قسم کی کمی پر دلالت کرتا ہے اور ذات باری میں جو بسیط بلکہ حقیقی جوہر فرد ہے کمی کا دخل کہاں ؎

نہ پراگندہ تا فراہم شوی نہ افزودہ نیز تا کم شوی

اُسی نے ہر چیز کو وجود عطا فرمایا ہے اور اُسکے سوا کوئی بھی موجود نہیں **شعر**

پناہ بلندی و پستی توئی ہمہ نیستند انچہ ہستی توئی

هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ [۵۱] + الْخَالِقُ الْبَارِئُ [۵۲] + بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [۵۳] + عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ [۵۴] + كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ [۵۵] +

۵۱ وہی جیتا ہے زندہ و قائم ۱۲ ۵۲ پیدا کرنے والا اور ایجاد کرنے والا ۱۲ ۵۳ بنانے والا آسمانوں اور زمین کا ۱۲ ۵۴ جاننے والا غائب اور موجود کا ۱۲ ۵۵ جو کوئی دنیا پر ہے فنا ہونے والا ہے اور باقی رہیگی اُس رب کی ذات جو بڑائی اور بزرگی والا ہے ۱۲

حقیقتِ رُوح

خداوند لایزال کا علم حاصل ہونے کے بعد جو کسی علت کا معلول نہیں اور ہر چیز کے وجود کی علت ہی۔ اسکو یہ شوق پیدا ہُوا کہ دریافت کرنا چاہیئے۔ یہ علم مجھے کن ذریعوں سے حاصل ہوا۔ یعنی مجھ میں وہ کونسی قوت ہی جس کی مدد سے میں نے خدا کو پہچانا۔ سب سے پہلے حواس کو جانچنا شروع کیا۔ مگر دیکھا کہ ان سے تو سوائے جسموں اور جسمانی صفتوں کے اور کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا مثلاً کان یعنی سُننے کی قوت کے سوائے آوازوں کے (جو ہوا کی موجوں سے پیدا ہوتی ہیں اور یہ موجیں جسموں کے آپس میں ٹکرانے سے) اور کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ اسیطرح آنکھ یا دیکھنے کی قوت سے رنگ، ناک یا سونگھنے کی قوت سے بوئیں، زبان یا چکھنے کی قوت سے مزے، اور چھونے کی قوت سے جو تمام جسم کی کھال میں پھیلی ہوئی ہے سردی، گرمی، خشکی، تری، کھرکھراہٹ یا چکناہٹ کے سوا کچھ نہیں دریافت ہوتا۔ متخیلہ بھی صرف اُنہیں چیزوں کو سمجھ سکتی ہی جن میں لمبائی، چوڑائی، اور گہرائی ہو +

صفات مذکورۂ بالا سب جسمانی ہیں اور ہمارے حواس انکے سوا کسی چیز کو دریافت نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ ایسی قوتیں ہیں جو ہمارے جسموں میں پھیلی ہوئی اور جسموں ہی کی طرح قابل قسمت ہیں۔ اسلیئے سوائے قابل قسمت جسموں کے اور کچھ معلوم نہیں کر سکتیں علیٰ ہذا القیاس ہر ایک جسمانی قوت سے سوائے جسموں اور جسمانی صفتوں کے اور کسی چیز کا علم نہیں ہو سکتا +

مگر ثابت ہو چکا ہے کہ واجب الوجود تمام مادی صفتوں سے بالکل پاک ہی لہذا اُسکو سمجھنے والی بھی کوئی ایسی قوت ہونی چاہیئے جو نہ مادہ ہو نہ مادہ میں ہو نہ اُسپر موقوف ہو نہ اُس سے کسی قسم کا لگاؤ رکھتی ہو +

ان دلیلوں سے اُسکو یقین ہوگیا کہ نہ میں اپنے جسم، ہاتھ، پاؤں، دل، جگر وغیرہ محسوسات

کے ذریعہ سے خدائے عزوجل کو جان سکتا ہوں نہ حواس وغیرہ قوائے جسمانی کی مدد سے لہذا یہ واجب الوجود کو جاننے والی چیز جسکو میں "میں" کہتا ہوں ان سب سے الگ کوئی چیز ہے۔ اُسکا نام نفس، روح یا کچھ ہی ہو مگر اسمیں شک نہیں ہو سکتا کہ یہ جسمانی نہیں اور کل جسمانی صفتوں سے پاک ہے۔

اِس پردے کا اُٹھنا اور حقیقتِ روح کا ظاہر ہونا تھا کہ وہ جسم جس کے آسایش و آرام کے لیئے اب تک ہزاروں فکریں اور تدبیریں کی تھیں بالکل بے وقعت اور ذلیل معلوم ہونے لگا اور سب توجہ اُس جوہر شریف کی طرف مبذول ہو گئی جسکی بدولت واجب الوجود کا علم حاصل ہوا تھا۔

معرفت کی اس دشوار گزار گھاٹی سے نکلکر دم لینے کی بھی مُہلت نہ ملی تھی کہ بے چین دماغ نے جسکو ترقی کے رستہ میں کہیں ایک لمحہ کا وقفہ گوارا نہ تھا ایک اور منزل ہفتخواں کو طے کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اب یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ یہ جوہر لطیف فانی ہے یا غیر فانی؟ لفظ فانی کے معنی پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ مٹنا اور فنا ہونا جسم کا خاصہ ہے کیونکہ کسی چیز کے فنا ہونے سے اسکے سوا کچھ مراد نہیں ہوتا کہ اسکی شکل بدلجاتی ہے یعنی ایک صورت کو چھوڑکر دوسری صورت اختیار کر لیتی ہے نہ یہ کہ مادہ گم ہو جاتا ہے مثلاً پانی بھاپ بن جاتا ہے اور بھاپ پھر پانی ہو جاتی ہے یا گھاس پات گل سڑکر مٹی ہو جاتے ہیں اور مٹی پھر گھاس پات کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ لہذا غیر مادّی چیز جو کوئی صورتِ نوعی نہیں رکھتی اسکے فنا اور تباہ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔

جذبۂ وصل

حواس اور قوے کے کاموں پر نظر تحقیق ڈالی تو معلوم ہوا کہ کبھی بالقوّۃ کام کرتی ہیں اور کبھی بالفعل۔ مثلاً اگر آنکھ بند کر لیجائے یا جس چیز کو دیکھ رہی ہے اُس سے پھیر لیجائے تو اُسکا کام بالقوّۃ رہجائے گا۔ یعنی اگرچہ وہ اب کسی چیز کو

یا شئے خاص کو نہ دیکھے مگر آیندہ دیکھنے کی قوت اور قابلیت رکھتی ہے۔ لیکن جب دوبارہ کھولدیجائے یا شئے مذکور کیطرف پھیر دیجائے تو اُسکا کام بالفعل ہوگا یعنی حقیقتاً کام میں مصروف ہوگی +

اس فرق کے دریافت کرنیکے بعد ذہن میں آیا کہ اگر کسی قوت کو بالفعل کام کرنا نصیب ہی نہوا ہو بالقوۃ ہی کام کرتی رہی ہو۔ یا یُوں کہنا چاہیے کہ قوت کے احاطہ سے نکلکر فعل کی حد تک پہنچی ہی نہو تو اسکو کسی چیز کے دریافت کا بھی شوق نہوگا کیونکہ جب ایک چیز سے واقف ہی نہیں تو اُسکا اشتیاق کیا ہوگا۔ جیسے مادرزاد اندھے کی حالت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی قوت بالفعل احساس یا ادراک کرچکی ہو اور بعد ازاں اُس سے معذور ہوجائے یعنی اُسکا کام بالقوۃ رہجائے تو اُسکو شئے معلوم کے دوبارہ ادراک یا احساس کی بڑی حسرت ہوگی کیونکہ وہ گویا ایک ایسی نعمت سے محروم ہوجائے گی جسکی لذت اُٹھا چکی ہے جیسے کوئی انکھیارا اندھا ہوجائے تو جن چیزوں کو وہ دیکھ چکا ہے اُنکو دوبارہ دیکھنے کے لیے اُسکی طبیعت سخت بیقرار اور بےچین ہوگی۔ اور جسقدر یہ چیزیں زیادہ خوبصورت، شاندار اور کامل ہونگی اُسیقدر اُنکے پھر دیکھنے کی حسرت زیادہ ہوگی۔ اور اُنکے دیدار کی لذت سے محروم ہوجانیکا افسوس قلق اور رنج ہوگا۔ لہذا اگر کسی چیز کے حسن جمال کی نہایت، جاہ وجلال کا پایان اور کمال کی حد ہی نہو تو جو کوئی اس سے واقف ہونیکے بعد اسکے نظارہ سے محروم ہوجائے اُسکو اس مفارقت اور جدائی کا رنج و قلق بھی بیحد و نہایت ہوگا۔ پس میری روح جو دیدار الٰہی کے شوق میں تڑپتی ہے اُسکو بھی معلوم ہوتا ہے۔ کسی وقت جمالِ خداوندی کا نظارہ ضرور نصیب ہوچکا ہے[1] +

[1] یہ خیال مذہب اور فلسفہ دونوں میں مشترک ہے۔ قصہ میثاق تو شاعری کا زیور بنکر ایسا مشہور ہوا ہے کہ شاید ہی کوئی شخص جسکو فارسی یا اردو شاعروں کے کلام سے آگاہی ہے اس سے ناواقف ہوگا۔ یعنی ازل میں خداوند تعالیٰ نے تمام روحوں کو جمع کرکے پوچھا اَلَستُ بِرَبِّکُم (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں) سبنے بالاتفاق جواب دیا بَلیٰ (بیشک ہے) + اسیطرح بعض یونانی حکما کا خیال ہے کہ روحیں عالم باقی میں جو کچھ دیکھ چکی ہیں وہ کسیکو زیادہ کسیکو کم یاد ہے۔ جس کو یہ خواب جتنا زیادہ یاد ہے اُتنا ہی اُسکا رجحان نیکی اور بھلائی کیطرف زیادہ ہے جسکو جتنا کم یاد ہے اُتنا ہی اُسکا میلان بدی کی جانب زیادہ ہے ۱۲

ذکر و فکر

اب تو حضرت واجب الوجود سے ایسی لَو لگی کہ دوسرے خیال کے آنے سے تکلیف ہونے لگی۔ سب سے اول محسوسات سے رشتہ الفت توڑا۔ حواس اور قوائے جسمانی کو اُن کے افعال طبیعی سے روکا اور معطل کیا۔ ضرورتوں کو جہاں تک ممکن ہوا کم کیا۔ مگر چونکہ مادیات سے قطع تعلق کئے بغیر یہ قبضہ میں آنیوالی نہ تھیں لہذا عالم اجسام سے حتی الوسع سب رشتوں اور علاقوں کو توڑ کر ایک غار میں رہنا اختیار کیا۔ سر زانو پر رکھے اور آنکھیں بند کیے کل توجہ اور تمام خیالات کو واجب الوجود کیطرف رجوع کرنیکی کوشش کی۔ آخر ریاضت اور مجاہدہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ قوائے جسمانی کے ضعف کے ساتھ ہی اول تو وہ نفسانی خواہشیں جن کا پورا ہونا جسمانی حرکتوں پر موقوف ہے کمزور ہوگئیں۔ دوسرے روح کے تصرفات جو جسم کے پابند نہیں قوت پکڑ گئے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُسکا استغراق ایسا کامل اور جسم کی آلائشوں سے پاک ہونے لگا کہ حضرت واجب الوجود کا مشاہدہ نصیب ہوجاتا تھا۔ غرض ہر وقت ایک ہی دھیان اور ایک ہی دُھن میں رہنے لگا۔ اگر اتفاقاً ماسوا کا خیال حریم دل میں بھولے سے قدم رکھ لیتا تو فوراً جسارت اور گستاخی کی سزا پاتا اور نکال باہر کیا جاتا۔ اسمیں اُسے یہاں تک اصرار ہوگیا کہ بعض اوقات کئی کئی روز برابر نہ کچھ کھاتا نہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا۔ تصور الٰہی میں سر بگریباں بیٹھا رہتا۔ **شعر**

دل من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش — دم تسلیم سر عشر و سر زانو دبستانش

رفتہ رفتہ یہاں تک اجتماع خیالات پر قادر ہوگیا کہ ماسوا کا خیال اُسکے مراقبہ کے حصار میں قدم رکھ ہی نہ سکتا تھا۔ اب تو موجود حقیقی کے تصور میں ایسا غرق ہوا کہ غیر تو غیر خود اپنا وجود بھی فراموش ہوگیا۔

سر و سامان وجودم شرر عشق بسوخت — زیر خاکستر دل سوز تمنائم باقیست
کاروانم ہمہ بگذشت ز میدان شہود — ہیچ نقش کف پائم نہ نشانم باقیست

سوائے واحد حقیقی کے کچھ نہ رہا اور یہ آواز کانوں میں آنے لگی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (آج کسکی بادشاہت ہے۔ خدائے واحد زبردست کی) خود رفتگی کا یہ عالم ہوا کہ وہ حالت جسکی نسبت ارشاد ہوا ہے کہ لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ (نہ جسکو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سُنا نہ کسی انسان کے دل میں اسکا خیال آیا) اپنی آنکھ سے دیکھ لی ۔

جب اس حالت استغراق سے آپے میں آیا تو ایسا معلوم ہوا کہ میرے اور موجود حقیقی کے وجود میں غیریت نہیں بلکہ اُسکے سوا مجھ میں کچھ بھی نہیں نیز یہ کہ موجود حقیقی ہرگز قابل کثرت نہیں اور اُسکا علم ذات ہی عین ذات ہی جس سے اُسنے استدلال کیا کہ " مجکو علم ذات ہی اور جسکو علم ذات ہو وہ عین ذات ہی لہذا میں عین ذات ہوں "

مکاشفہ

سرخرو بردہ بجیبے دو جہاں می نگرم عشق از تار نظر بافت گریبان ما

عالم قدس کی سیر و سیاحت سے پھر عالم تعلق میں آیا تو اس دنیاوی فانی زندگی کے مکروہات اور پریشانیوں سے اُسکو سخت نفرت ہوئی اور حیات جاوید کے زبردست شوق اور پُرجوش تمنا سے ساغر دل لبریز پایا۔ پھر پہلے طریقہ سے حالت بیخودی کے حصول کی کوشش کی۔ اب کی مرتبہ پہلے کی نسبت آسانی سے کامیابی ہوئی اور زیادہ عرصہ تک لطف اُٹھانا نصیب ہوا۔ اس روحانی معراج میں اُسنے جو کچھ دیکھا اُسکو مفصل بیان کرنیکے لیے تو ایک دفتر چاہیے۔ مختصر حال یہ ہے کہ کرہ فلک الافلاک پر ایک موجود نظر آیا جسکا کوئی موجد نہ تھا۔ یہ آفتاب کے اُس عکس کیطرح تھا جو عمدہ صیقل کیے ہوئے آئینہ میں پڑے۔ اِسکے علاوہ خود اس علیحدہ اور ممتاز کرہ کے نفس میں وہ کمال جلال اور جمال نظر آیا کہ زبان اُسکی عظمت کے بیان سے عاجز اور الفاظ اُسکی شوکت کے اظہار سے قاصر ہیں۔ وہ کیسی مسرت بلکہ جیسے انتہا بہجت میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس سے

نیچے کا کرہ یعنی فلک ثوابت بھی ایک نفس رکھتا تھا جو موجود حقیقی اور فلک الافلاک کے نفس دونوں سے ممتاز تھا۔ اور آفتاب کے اُس عکس سے مشابہ تھا جو مقابل کے آئینہ سے کسی دوسرے آئینہ میں پڑے۔ اسمیں بھی اسکو ویسی ضیا، حُسن اور نشاط نظر آئی جیسی فلک الافلاک کے نفس میں دیکھ چکا تھا۔ اسیطرح باقی تمام کروں میں بھی اُس نے اِسی قسم کے غیر مادی مگر متمیز نفوس دیکھے اور ویسی ہی ضیا و بہجت نظر آئی۔ اُسکی آنکھ سے وہ حسن و نور، نشاط و سرور گزرا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا تھا۔ رفتہ رفتہ عالم سفلی یعنی عالم کون و فساد کیطرف آیا جسپر فلک قمر محیط ہے۔ اِس نفس کے جو مثل دیگر نفوس کے غیر مادی تھا۔ ستر ہزار چہرے، ہر چہرے میں ستر ہزار مُنہ اور ہر مُنہ میں ستر ہزار زبانیں تھیں جو ہر وقت حضرت واجب الوجود کی تسبیح و تہلیل میں مشغول تھیں۔ اب اُسکو اپنے نفس اور اپنے ہم رتبہ دوسرے نفسوں میں بھی وہ انتہا کا حسن و ضیا، و نور نظر آنے لگا جسکو سوا اُن لوگوں کے جن کی یہاں تک رسائی ہو چکی ہے اور اپنی آنکھ سے دیکھ چکے ہیں نہ کوئی بیان کر سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے ◆

ساتھ ہی بہت سے نفوس ایسے بھی نظر آئے جو زنگ آلود آئینوں کیطرح تھے اُن کے میلے، مکدر چہرے اُن صیقل شدہ آئینوں سے جن میں آفتاب کا عکس پڑ رہا تھا صاف علیحدہ معلوم ہوتے تھے۔ اِسقدر میل چڑھا ہوا اور اتنے کثرت سے عیب تھے کہ وہم و گمان میں بھی نہ آئیں بے انتہا دردوں اور تکلیفوں میں مبتلا تھے کہ آہ و نالہ سے دم لینے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ عذابوں نے اُنکو گھیر رکھا تھا اور فراق کا آتشیں نقاب چہروں کو جلا رہا تھا ◆

اب اُس نے اول الذکر مقبول بارگاہ نفوس کی طرف پھر نگاہ کی تو دیکھا کہ جسم اور اُسکی تمام آلودگیوں سے بالکل پاک ہیں، صرف موجود حقیقی سے جو اُن کے وجود کی علت ہے وابستہ ہیں اور اُسی کے محتاج ہیں ◆

چونکہ دونوں عالم پیش نظر تھے مقابلہ کیا تو صاف معلوم ہونے لگا کہ گو عالم اجسام عالم ارواح کے ساتھ وہی تعلق رکھتا ہے جو سایہ کو جسم کے ساتھ ہے اور گو عالم ارواح کو نہ اسکی ضرورت ہو نہ احتیاج۔ تاہم اسکو فانی سمجھنا خیال محال ہی کیونکہ یہ عالم ارواح کا تابع ہے۔ اور اسکی فنا استحالہ یا تبدیلِ صورت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے نہ نیستی کی چنانچہ خداوند تعالیٰ خود قیامت کے بیان میں فرماتا ہے یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ (جس روز انسان مثل پراگندہ پروانوں کے ہوں گے اور پہاڑ مثل دھنکی ہوئی اون کے)

نظارہ دو عالم سے ہنوز ذرا بھی سیری نہ ہوئی تھی کہ دفعتًہ اس خواب نوشیں سے چونک پڑا تو دیکھا کہ بدستور عالم اجسام کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ہوں۔ مگر آنکھ کھلتے ہی پھر عالم بالا کی سوجھنے لگی۔ اور حالت گزشتہ کے حصول کیلئے رسیاں تڑانے لگا۔ اب کی مرتبہ اور بھی آسانی سے منزل مقصود پر پہنچنا میسر ہوا اور آرام کی بھی زیادہ مہلت ملی۔

قاعدہ ہے کہ مزاولت سے ہر ایک کام خواہ کیسا ہی مشکل ہو آسان ہوتا چلا جاتا ہی چنانچہ جی کی بار بار جانفشانیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ روز بروز اس حالت کا حاصل کرنا سہل اور قرار کی مدت دراز ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اب تو جب اور جتنی دیر اسکا جی چاہتا اس صحرائے پُر نور کی گلگشت کرتا۔ صرف ضرورت جسمی کا کانٹا اب بھی کبھی کبھی عین مزے میں چبھ جاتا تھا اور اسکے نکالنے کیلئے بمجبوری گلشن روح افزا سے علیحدہ ہونا پڑتا تھا مگر اس نے کوشش کر کے ان جسمانی ضرورتوں کو بھی ایسے تنگ احاطہ میں قید کر لیا کہ اس سے زیادہ تنگ دائرہ وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔

تماشا یہ تھا کہ جسقدر حصول مقصود آسان ہوتا جاتا تھا اور جتنی زیادہ دیر شاہدِ مراد سے ہمکنار رہتا تھا۔ اتنا ہی جدائی کا زمانہ اگرچہ ایک منٹ ہی کیوں نہ شاق گزرتا تھا۔ شعر۔ وصالِ یار سے دونا ہوا عشق ٭ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ٭ لہذا

اُسے سخت حسرت ہوتی تھی کہ کاش قادر مطلق مجکو جسم کی آلائیشوں سے بالکل ہی آزاد کر دیتا کہ ہمیشہ اسیطرح محو بیخودی رہتا اور رنج وغم کے خمار سے چھوٹ جاتا۔ کیونکہ جب کبھی جسمانی ضرورتیں زبردستی اُسکو عالم محویت سے بدر کر دیتی تھیں تو دوہری تکلیف ہوتی تھی۔ ایک تو گلشن روح پرور سے نکلنے کی۔ دوسری مکروہاتِ جسمانی میں پھنسنے کی۔

ہمجنس کی ملاقات

اِس اثنا میں اُسکی عمر پچاس سال کی ہوگئی۔ اسوقت دفعتہً اُسکی زندگی میں ایک تغیر عظیم واقع ہوا یعنی ایک عجیب اتفاق سے اُسکی ملاقات ایک اپنے ہم جنس اصل نامی سے ہوئی۔ اس تعارف کی صورت یہ ہوئی کہ جس جزیرہ میں حی پیدا ہوا تھا (جیسا اُسکی ولادت کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے) اُس کے قریب ہی ایک اور جزیرہ تھا۔ پرانے انبیاء علیہم السلام کے مذہبوں میں سے ایک مذہب کے ماننے والے کچھ لوگ دنیا کے غل غپاڑے سے گھبرا کر اطمینان سے زندگی بسر کرنیکی غرض سے اُس جزیرہ میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ یہ لوگ ایسی فصیح گفتگو اور ایسی عمدہ تقریر کرتے تھے۔ اور اس خوبی سے اپنے خیالات کو تمثیلوں اور حکایتوں کے ذریعہ سے دوسروں کے ذہن نشین کرتے تھے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُنکے مذہب کی ایسی شہرت اور وہ عروج ہوا کہ خود حاکم جزیرہ بھی اُنکے مذہب میں داخل ہوگیا اور رعایا نے بھی یہی دین اختیار کر لیا۔
اس مذہب کے پیروؤں میں دو شخص اصل اور سلمان نامی ایسے پیدا ہوئے جنکو مبدا فیاض سے بہت سی خوبیاں اچھی عادتیں اور عمدہ خصلتیں عطا ہوئی تھیں اور نیکی کے دلدادہ تھے یہ دونوں اپنے مذہب کے نہایت پابند تھے اور تمام فرائض کو بلاقضا ادا کرتے تھے۔ اِسی کار خیر میں ایک دوسرے کی مدد کرنیکی غرض سے دونوں نے آپس میں دوستی کا عہد و پیمان کیا اور مذہب کے اکثر مسئلوں کی مثل خدا کے وجود اُس کے فرشتوں، روز قیامت اور آیندہ زندگی میں سزا و جزا کی ملکر تحقیق کی۔

اصل اور سلمان کی طبیعتوں کا اختلاف

اگرچہ فرائض کے ادا کرنے اور نفسانی خواہشوں کو زیر کرنے میں دونوں یکساں مستعد اور سرگرم تھے۔ مگر پھر بھی بہت سی باتیں ایسی تھیں جن میں کسی طرح اتفاق نہ کر سکے وجہ یہ کہ دونوں کی طبیعتوں میں اختلاف تھا۔ اصل زیادہ بات کی تہ کو پہنچنے والا اور بال کی کھال نکالنے والا تھا۔ لفظوں کے پوشیدہ معانی دریافت کرتا۔ اور نہایت جانفشانی سے تاویلیں کرتا تھا۔ بخلاف اس کے اُسکا ساتھی سلمان ظاہر بین تھا۔ تاویلات کی زحمت کبھی گوارا نہ کرتا تھا۔ اور باریکیوں اور دقتوں سے جی چراتا تھا +

ان کے مذہب میں بعض قول ایسے تھے کہ گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی کیطرف رغبت دلاتے تھے۔ اور اشارۃً بتاتے تھے کہ اصلی خوشی اور نجات اسی ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر ایسے قول بھی بکثرت تھے جو مل جلکر رہنے آپسمیں اچھا سلوک کرنے اور ایک دوسرے کی رائے سے فائدہ اُٹھانے کی ہدایت کرتے تھے +

اصل چونکہ فطرتاً باریک بین اور تحقیق کی طرف مائل تھا اُسنے پہلے قولوں کو ترجیح دی اور گوشہ نشینی کو نجات و فلاح کا ذریعہ سمجھا۔ کیونکہ تجرد و تنہائی سے اُسے بہت اعلیٰ مقاصد کے پورا ہونے کی امید تھی۔ سلمان کی طبیعت میں سلامت روی تھی اور باریکیوں سے گھبراتا تھا۔ لہذا اُسنے دوسرے قولوں کو دستورالعمل بنایا۔ اور میل جول اور تبادلہ خیالات کو پسند کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ہمجنسوں کی محبت میرے خیالات کے درست رکھنے کا سب سے اچھا وسیلہ ہے۔ اور نفس امارہ کے اشاروں اور تحریکوں کیطرف متوجہ ہونے سے روکتی ہے +

آخر باوجود یار غار ہونے کے اس معاملۂ خاص میں اختلاف رائے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کو ایک دوسرے سے جدائی اختیار کرنی پڑی + (باقی دارد)

فدا علی خاں از بڑودہ

النحل

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

مکھی کی بناوٹ

یوں تو شہد کی مکھیاں طرح طرح کی ہوتی ہیں اور اُن کے مختلف انواع کی تعداد ۱۷۷ ہے۔ لیکن جس مکھی کا تذکرہ اس چھوٹے رسالہ میں ہے وہ معمولی شہد کی مکھی ہے جو ہر ملک میں پائی جاتی ہے۔ جہاں کہیں شہد کی تشریح اور اُسکی ساخت کا بیان ہے وہاں اسی معمولی مکھی کی بناوٹ مُراد ہے۔ تشریح کی تمام باریک باتوں کو یہاں بیان کرنا میں پسند نہیں کرتا اِسلیئے کہ اُسکے پڑھنے میں تم اُلجھ جاؤگے اور کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ محض ضروری باتیں بیان کرتا ہوں اُنکو سُنو! مکھی کی ساخت کو خیال کرو تو اُسکا دھڑ تین ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ سر۔ سینہ۔ اور پیٹ۔ یہ تو بڑے بڑے حصّے ہیں جو اور کیڑوں میں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اِسکے اعضائے مفرد کی بناوٹ جداگانہ ہوتی ہے جو شہد کی مکھی کے لیئے مخصوص ہے۔ سر میں دو آنکھیں دو سینگ اور اوپر تلے کے دو جبڑے اور دو دانت ہوتے ہیں۔ اُن اعضا کے علاوہ جو جفت ہوتے ہیں طاق عضو بھی ہیں مثلاً وہ سونڈ یا زبان مُنہ اور حلقوم ہے۔ سر کل حواسوں کا مرکز ہے ۔

سونڈ

سونڈ شہد کی مکھی کی زبان ہے جو نیچے والے لب پر جڑی ہوتی ہے۔ وہ ہر جانب کو مُڑ سکتی ہے اور سانپ کی زبان کی طرح تیزی سے اندر باہر آتی جاتی ہے۔ اُسکی حفاظت کے لیئے اُسپر دُہرا غلاف ہوتا ہے۔ اندر تو نہایت تنگ جھلی ہوتی ہے۔ لیکن اوپر دو پتلے پتلے چھلکے ہوتے ہیں جو مُنہ کو ڈھکے رہتے ہیں۔ نوک کے پاس سونڈ ذرا سی خم ہوتی ہے جسکو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسکے اندر جوف ہے۔ لیکن سونڈ اندر سے کھوکھلی نہیں ہوتی ہے اِسکی دونوں جانب کو مہین بالوں کی قطاریں ہوتی ہیں

جسکی لاگ سے مکھی پھولوں کے رس کو اوپر مُنہ میں چڑھالیجاتی ہے۔ جسوقت شہد کی مکھی پھولوں پر جاکر بیٹھتی ہے تو اپنی نوکدار تیز سونڈ کو اُسمیں چبھودیتی ہے اور اُسکو آہستہ آہستہ زبان میں لگاکر چاٹتی جاتی ہے۔ سونڈ چونکہ اندر سے خالی نہیں اس لیئے مکھی رس کو چوس نہیں سکتی مکھی اپنی اور پتلی غذاؤں کو مثلاً شکر کا قوام شربت یا پتیوں پر جمی ہوئی میٹھی اوس کو اسی انداز سے کھاتی ہے۔ کام کرنے والی مکھیوں کی سونڈ جو زبان کا کام دیتی ہے نر مکھی یا ملکہ مکھی کی سونڈ سے دوگنی بڑی ہوتی ہے اس لیئے کہ عام مکھیوں کی زندگی کا فرض شہد کا جمع کرنا ہے۔ اور اگر اسکی سونڈ اتنی لمبی نہ ہوتی تو وہ پھولوں کے اندر سے رس کو اچھی طرح نہیں نکال سکتی +

دانت اور جبڑے

مکھی کے مُنہ میں دو ننھے ننھے دانت ہوتے ہیں جو اوپر تلے نہیں بلکہ دائیں بائیں ایک دوسرے کے سامنے ایک سیدھ میں برابر ہوتے ہیں۔ مکھی ان دانتوں سے اپنی غذا کھانے میں مدد نہیں لیتی یہ دانت چھتے کی عمارت تیار کرنے میں کاٹنے والے اوزار کا کام دیتے ہیں۔ مکھی اپنے دانتوں سے موم کترتی ہے اور اپنے تیار کیئے ہوئے سریش کو جو نہایت چمڑا اور لیس دار ہوتا ہے کاٹ کر چھتے میں لگاتی ہے۔ یہ دانت دونوں جانب کے جبڑوں میں جڑے ہوتے ہیں۔ ان جبڑوں کو مکھی کا قدرتی چمٹا سمجھو جو سخت چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پھولوں کو کاٹ کر سوراخ بنانے میں کام آتا ہے۔ دانتوں اور جبڑوں کے مددینے والے سچ پوچھو تو مکھی کے اگلے چاروں پیر ہیں جو ہر سمت میں حرکت کرسکتے ہیں۔ جس چیز کو کاٹنا ہوا جھٹ پٹ مکھی اُسکو اپنے پیروں سے تھام ڈھب پر لاتی ہے اور تیز تیز دانت والے جبڑوں سے کاٹ کر اُسکے پرزے اڑادیتی ہے +

آنکھیں

سر کے دونوں بغل میں شہد کی مکھی کی آنکھیں ہوتی ہیں جنسے وہ بہت دور کی چیزوں کو اچھی طرح دیکھ سکتی ہے۔ تم سُن کر تعجب کروگے کہ ان آنکھوں میں ہزاروں ننھی ننھی پتلیاں ہوتی ہیں جنکی وجہ سے شہد کی مکھی کی قوت باصرہ نہایت تیز اور

دوربین ہوتی ہے۔ سب سے نرالی بات یہ ہو کہ شہد کی مکھی کی آنکھیں اور جانوروں کی آنکھوں کی طرح حرکت نہیں کرتیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ننھے ننھے بلور کے ریزے جڑ دیئے ہیں۔ اور اس ذری سی جگہ میں چیزوں کے دیکھنے کے لیئے ہزاروں مرکز ہیں جو اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں اور مکھی کو اُنکے گھٹانے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تم نے اگر انسان کی بنائی ہوئی دوربین کا حال پڑھا ہے تو تم اس قدرتی ننھی سی دوربین کی بناوٹ کی حیرت انگیز کاریگری کا قیاس کر سکتے ہو۔ شہد کی مکھی جسوقت پھولوں کے رس اور زرگل سے لدی ہوئی گھر کو واپس آتی ہے تو ذرا کی ذرا چھتے کے دروازے پر ٹھیر جاتی ہے اور پھر چل نکلتی ہے۔ تم کہوگے کہ وہ دم لینے کو ٹھیرتی ہے لیکن نہیں۔ اس ذراسے رُک جانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ نزدیک سے نہیں دیکھ سکتی نزدیک کی چیزوں کو مکھی اپنے سینگ سے ٹٹول کر جانتی ہے۔ جسکا بیان آگے آئے گا مکھی کی دونوں آنکھوں کے اوپر تین چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہوتی ہیں۔ اکثر ماہرین علم حیوانات کا خیال ہے کہ یہ آنکھیں خوردبین کا کام دیتی ہیں۔ لیکن اسوقت تک اسکی پوری تحقیق نہیں ہوئی +

سینگ

مکھی کا سینگ ایک نہایت ہی ذکی الحس جنت عضو ہے جو ہر ساعت چٹ پٹ کرتا رہتا ہے۔ وہ ہر سمت میں مڑ سکتا ہی۔ اور شہد کی مکھی اپنے ان نازک سینگوں سے چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ٹٹولکر اُسکی حالت کو معلوم کر لیتی ہے۔ یہ عضو جسکی پوری صراحت دوسری جگہ بیان کیجائیگی مکھی کے اکثر حواسوں کا مرکز ہے۔ اگر اسکو توڑ دو تو مکھی اپنی سُتی بھولجاتی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ یہ سینگ سر کے دونوں جانب باریک سُوت سے نکلے ہوتے ہیں۔ اور ان میں ننھی ننھی پوریاں ہوتی ہیں۔ نر مکھیوں کے سینگ میں تیرہ ۱۳ پوریاں ہوتی ہیں اور مادہ میں بارہ ۱۲ +

صدر

شہد کی مکھی کا ننھا سا سینہ بیضاوی شکل کا ہوتا ہے۔ اس حصے میں دو جوڑے بازو اور

تین جوڑے پیروں کے ہوتے ہیں۔ پیروں کے آخر حصے میں پنجہ ہوتا ہے جس سے
مکھی زنجیرہ باندھکر لٹک جاتی ہے اور چکنی چیزوں پر چل سکتی ہے۔ پر جھلی دار ہوتا ہے
جسکے آر پار کی چیزیں نظر آسکتی ہیں۔ جسوقت مکھی آرام کرتی ہے تو اُس کے چاروں
بازو تہ ہوکر اُسکی پشت پر رہتے ہیں۔ لیکن جب وہ اُڑنا چاہتی ہے تو اُس کے چاروں
پر کُھل جاتے ہیں اور پروں کا اگلا جوڑا پچھلے جوڑے کیساتھ باریک چھوٹے کانٹوں
کے لاگ سے گُتھ جاتا ہے جسکی وجہ سے مکھی نہایت تیزی سے پرواز کرسکتی ہے۔ اور
کوسوں اُڑتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ پروں کو غور سے دیکھو تو اُنمیں باریک نسیں نظر آتی
ہیں۔ ان نسوں میں ننھے ننھے سوراخ ہوتے ہیں۔ جن میں ہوکر ہوا اندر جاتی ہے
اور اِس سے مکھی کو پرواز کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے ؎

ٹانگیں

تم سُن چکے ہو کہ مکھی کی ٹانگیں جفت عضو ہیں اور اُن کے جوڑے ہوتے ہیں
اگلی ٹانگوں کا جوڑا تو ہاتھ کا کام دیتا ہے۔ جس سے مکھی چیزوں کو پکڑتی ہے ملو بہت سے
دوسرے دوسرے کام کرتی ہے۔ ٹانگوں میں کئی حصے ہوتے ہیں کولھا۔ ران۔ پنڈلیاں
اور پنجے کے لحاظ سے ان حصوں کی ساخت جداگانہ ہوتی ہے۔ بیچ کی ٹانگوں کا جوڑا
جوا ڑنے میں مدد دیتا ہے۔ پچھلی ٹانگوں کی بناوٹ سے نہیں ملتا۔ پچھلے پیروں کی
رانیں قوسی شکل کی ہوتی ہیں۔ ان کے بائیں جانب کو سیدھے اور سخت بالوں کی
کُونچیاں ہوتی ہیں جنسے مکھی زرگل کو جھاڑتی ہے۔ اور دائیں طرف کو بڑے بڑے
خمدار بال ہوتے ہیں جو دونوں جانب سے گتھ کر زرگل کو ڈھونے میں ایک ننھی سی جالیدار
ٹوکری کا کام دیتے ہیں۔ پیروں میں دُہرے پنجے ہوتے ہیں اُن کے سہارے سے
مکھی چل پھر سکتی ہے۔ اور جب چھت دیوار یا درختوں کی شاخ میں چھتہ بناتی ہے
تو انہیں پنجوں کے ذریعہ سے مکھی دوسرے سے چمٹ کر خاموش لٹک جاتی ہے

پیٹ

شہد کی مکھی کے جسم کا آخر حصہ اُس کا پیٹ ہے جس کا رنگ سیاہی مائل بھورا ہوتا ہے

اِس حصے میں جا بجا سوراخ ہوتے ہیں جنسے مکھی سانس لیتی ہے۔ ان سوراخوں کی محافظ باریک جھلیاں ہیں جو سوا ہوا کے دوسری چیزوں کو اندر جانیسے باز رکھتی ہیں مکھی کی بھنبھناہٹ انہیں جھلی دار پردوں کے کھُلنے اور بند ہونے سے پیدا ہوتی ہے مکھی کے جسم میں ہوا آنے جانیکے لیئے تنگ نالیاں ہیں جن کی باریک شاخیں تمام بدن میں جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے جو دونوں جانب پہلو میں ہوتے ہیں ہوا مکھی کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور تمام جسم میں دوڑتی ہوئی پھر آتی ہے۔ اور اِس طرح مکھی کا خون جسکا رنگ سُرخ نہیں ہوتا ہر لحظہ تازہ ہوتا رہتا ہے تم سُنکر حیرت کروگے کہ مکھی کے پھیپھڑا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ پھر بھی سانس لیتی ہے اور بلا ہوا کے زندہ نہیں رہ سکتی +

معدہ

مکھی کے پیٹ میں دو معدے ہوتے ہیں۔ جن کی بناوٹ حیرت خیز ہے۔ پہلا معدہ تو ایک باریک جھلی کی چھوٹی سی تھیلی ہوتی ہے۔ جس میں مکھی پھُولوں کا رس بھر لاتی ہے یہ معدہ چڑیوں کے پوٹوں کا کام دیتا ہے۔ لیکن اِسمیں غذا کے ہضم کرنے کی قوت نہیں ہوتی ہے۔ رس جسکو مکھی اپنے ننھے معدے میں بھر لاتی ہے جوں کا توں رہتا ہے۔ اِسمیں کوئی کیمیاوی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ چھوٹی سی قدرتی جھولی نہایت نازک عضلات کی بنی ہوئی ہے۔ جسکی وجہ سے مکھی اُسکو سُکیڑ سکتی ہے۔ اور اِس طرح پھولوں کے رس کو جو اِسمیں بھرا رہتا ہے وہ چھتے کے خانوں ہیں اُگل دیتی ہے اور اِس سے شہد بناتی ہے۔ دوسرا معدہ جسمیں مکھی کی غذا ہضم ہوتی ہے پہلے معدے کے اندرونی سطح سے ملا ہوا رہتا ہے۔ اِسکی شکل لمبی اور مخروطی ہوتی ہے۔ اِسمیں ایک سوراخ ہوتا ہے جو اندر کو کھُلتا ہے۔ اس سوراخ سے مکھی کی غذا جسکو وہ اپنی ننھی سی جھولی میں بھر لیتی ہے اندر داخل ہوتی ہے۔ لیکن سوراخ کے قدرتی چھوٹے سے دروازے کی بناوٹ ایسی ہے کہ غذا پھر باہر نہیں نکل سکتی۔ دوسرے معدے سے غذا کے آنتوں

میں جانے کے دروازے ایسی ساخت کے ہیں جو باہر کو اُبھرے ہوئے ہیں اور اندر کو کھلتے ہیں۔ مکھی کا پیٹ جسوقت شہد سے بھرا رہتا ہے تو ان دروازوں کی بناوٹ خوردبین سے نظر آتی ہے ۔؛

ڈنک

قدرت نے شہد کی مکھیوں کو اپنے غنیم پر حملہ کرنیکے لیئے ڈنک عطا فرمایا ہے جو جسم کے آخر حصے میں ہوتا ہے۔ ڈنک ایک نہایت باریک تیز کانٹا ہے جو ایک قدرتی میان میں چھپا رہتا ہے۔ اسکا اندرونی سرا جھلی کی ایک چھوٹی سی تھیلی سے لگا رہتا ہے جسمیں زہر بھرا ہوتا ہے۔ زہر میں تیزاب ہوتا ہے جو تھیلی کے آس پاس والی غدودمیں پیدا ہوتا ہے۔ مکھی جب ڈنک مارتی ہے تو اس زہر کا ایک قطرہ میان کے اندر ہوتا ہوا کانٹے کی لاگ سے زخم میں ٹپک جاتا ہے۔ جس سے مجروح کو اذیت ہوتی ہے اور سوزش جلن کے بعد ورم ہوجاتا ہے۔ ڈنک کی نوک میں دندانے ہوتے ہیں جسکی وجہ سے وہ زخم کے اندر ٹوٹ کر رہجاتا ہے اور مکھی خود مرجاتی ہے۔ مکھی کے ڈنک مارنیکا تماشا دیکھنا چاہو تو تو اُسکو آئینہ پر رکھکر چھیڑو۔ غصہ میں آکر وہ ڈنک مارتی ہے۔ اور زہر کا قطرہ ٹپک جاتا ہے خوردبین سے اگر اس قطرے کو دیکھو تو رطوبت خشک ہوجانے پر ایک قسم کے زہریلے نمک کا باریک نوکدار قلم جما ہوا نظر آتا ہے۔ مکھی اپنے زہر سے ایک اور ضروری کام انجام دیتی ہے وہ یہ کہ جسوقت وہ چھتے کے خانوں کو پھول کے رس سے بھردیتی ہے تو اپنے ڈنک کو نکالے ہوئے ان خانوں پر رینگتی پھرتی ہے۔ جسکی وجہ سے زہر ٹپک ٹپک کر رس میں ملجاتا ہے۔ اور اُسمیں غلیان پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اگر مکھی اس طرح زہر نہ ٹپکائے تو پھولوں کا کچا رس پھٹ کر شراب یا سرکہ بنجائے اور ہرگز شہد تیار نہ ہو۔؛

بیضہ دان

زہر کی جھلی کے پاس دائیں بائیں اور دو چھوٹی چھوٹی جھولیاں ہوتی ہیں جن کو بیضہ دان کہتے ہیں۔ ان جھولیوں میں انڈے پیدا ہوتے ہیں اور یہ صرف ملکہ مکھی میں پائے جاتے ہیں خادم مکھیوں میں جو ذات کی ہیں تو مادہ لیکن انڈے نہیں دیسکتیں۔ بیضہ دان کا ایک

چارمینار اور مکہ مسجد

جناب حکیم سید شمس اللہ قادری صاحب کی جدید تالیف محبوب الآثار سے جو تیار ہے مگر ابھی شائع نہیں ہوئی۔ یہ مضمون باجازت صاحب مؤلف اخذ کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ نہ صرف دکن میں بلکہ دیگر حصص ہندوستان میں یہ مضمون شوق سے پڑھا جائیگا۔ کیونکہ حیدرآباد کی دو مشہور عمارات کے دلچسپ تاریخی حالات اِس میں درج ہیں +

(۱) چارمینار

یہ عمارت شہر کے عین وسط میں ہے اور پتھر اور چونے سے بنائی گئی ہے۔ مربع اور چومنزلہ عمارت ہے۔ اسکے چاروں رخ مشرق مغرب شمال جنوب کو ٹھیک ٹھیک قائم کیئے گئے ہیں۔ اسکی ہر سمت ساٹھ فیٹ چوڑی اور بیالیس فیٹ اونچی ہے۔ چاروں طرف چار بڑے بڑے محرابدار دروازے ہیں۔ جو چوبیس چوبیس فیٹ بلند اور تیس تیس فیٹ چوڑے ہیں جنکے مقابل چار بڑی بڑی سڑکیں نکلی ہیں۔ اسکی سب سے پہلی چھت گنبد کیطرح بنائی گئی ہے۔ اندرونی جگہ ایسی ہی کھلی ہوئی ہے۔ جیسے کہ باہر کیجانب کے برآمدے کھلے ہوئے ہیں۔ دیوار میں آمد و رفت کے لیئے متعدد دروازے بنے ہوئے ہیں۔ اس چھت کے اوپر دو اور منزلیں ہیں جن کے بیرونی طرف محرابیں بنی ہوئی ہیں عمارت کے چاروں گوشوں پر دو ازدہ رُخے چار مینار ہیں۔ ان کا ارتفاع اسی اسی فیٹ ہے ہر مینار کے چار درجے ہیں جن کے بیرونی رخوں پر خوبصورت محرابدار کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں۔ تمام عمارت پر بیل بوٹے۔ گل کاری کی ہوئی ہے۔ یہ عمارت شہر سے باہر بہت دور سے نظر آتی ہے۔ اور شہر کی تمام عمارتوں میں سب سے عمدہ اور خوبصورت ہے۔ موسیو تھیونو فرانسیسی سیاح جو عبداللہ قطب شاہ (سنہ ۱۰۳۵ سنہ ۱۰۸۳) کے عہد میں حیدرآباد میں

آیا تھا۔ اِسکی نسبت لکھتا ہے۔ "شہر بھر میں جیسی یہ عمارت باہر سے خوشنما دکھائی دیتی ہے ویسی اور کوئی نہیں ہے[۵۱]" اس کے میناروں پر چڑھنے سے شہر کے اطراف کا آٹھ آٹھ دس دس کوس تک کا نظارہ ہوتا ہے۔ مورخ محمد ہاشم خافی خان نظام الملکی انکی بلندی کی نسبت لکھتا ہے کہ "منارہائے آن با آسمان دعوئے ہمسری دارند[۵۲]"۔

چار مینار سلطان محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کا بنوایا ہوا ہے۔ سنہ ۱۰۰۰ھ میں اسکی تعمیر شروع ہوئی[۵۳]۔ وجہ تعمیر میں مورخین مختلف البیان ہیں۔ بعض مورخین لکھتے ہیں کہ سلطان محمد قلی کو منظور تھا کہ شہر کی آبادی مشہد مقدس کیطرح ہو۔ اس لیے اُس نے حضرت امام ضامن علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے روضہ کے عوض چار مینار تعمیر کروایا[۵۴]۔ بعض کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جب حیدرآباد بسا تھا تو شہر میں اور گولکنڈہ میں وبا پھیلی تھی۔ اس بلا کے دور کرنیکے لیئے یہاں کے باشندوں نے ایک تعزیہ اور علم نکالا۔ اتفاقاً بیماری کا زور جاتا رہا۔ اسکی یادگار میں یہ چار مینار بادشاہ نے بنوایا[۵۵]۔ یہ روایت صحیح ہو تو تعجب نہیں کیونکہ چار مینار کی صورت ایک عظیم الشان تعزیہ کی سی معلوم ہوتی ہے۔

عہد قطب شاہی میں اُن دونوں منزلوں سے جو بمنزلہ بالاخانوں کے ہیں پہلی منزل پر مدرسہ[۵۶] تھا اور طلبا کی سکونت کے لیئے حجرے بنے ہوئے تھے[۵۷]۔ دوسری منزل مسجد اور خزانہ آب کا کام دیتی تھی[۵۸]۔ یہاں چھوٹی سی مسجد جو نہایت خوبصورت ہے اسوقت

[۵۱] سیاحت نامہ موسیو تھیونو صفحہ ۶۲۔ [۵۲] منتخب اللباب جلد سوم [۵۳] تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۲ [۵۴] تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۲ و تاریخ محبوب السلاطین صفحہ ۵۲ ۳ [۵۵] سلسلہ آصفیہ جلد چہارم صفحہ ۲۷ ۳ [۵۶] تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۲ و تاریخ رشید الدین خانی صاحب تاریخ حدیقۃ العالم جلد اول صفحہ ۲۱ تاریخ قطب شاہی [۵۷] تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۱۲ و سلسلہ آصفیہ جلد چہارم صفحہ ۲۷ ۳ [۵۸] سلسلہ آصفیہ جلد چہارم صفحہ ۳۲۷

بھی موجود ہے۔ خزانہ آب مدور اور خوب عمیق ہے۔ کوکاپل سے بذریعہ نہروں کے اسمیں پانی آتا تھا۔ اور یہاں سے محلات شاہی میں جاتا تھا[لہ]۔ اتنی بلندی پر خزانہ آب کے بنانیکی وجہ یہ تھی کہ یہاں سے محلات کے تمام حصوں میں جاسکے اور وہاں جو اونچے سے اونچے کمرے ہیں اُن میں بھی پہنچ سکے[لہ]۔

چارمینار کی تعمیر پر دو لاکھ ہون صرف ہوئے ہیں[سے]۔ عہد قطب شاہی میں ہون ساڑھے چار روپیہ مغلیہ کے برابر ہوتا تھا۔ لیکن آجکل کے حساب سے ہون سات روپیہ کلدار سے بھی زائد ہوتا ہے اگر فی ہون سات روپیہ فرض کرلیں تو اس رقم کی تعداد چودہ لاکھ کلدار ہوئی۔

(۲) مکہ مسجد

مکہ مسجد چارمینار سے جانب جنوب قریباً پچاس قدم کے فاصلہ پر واقع ہے سرزمین دکن میں یہ ایک بہت بڑی عظیم الشان عمارت ہے اور شہر کے باہر بہت دور سے نظر آتی ہے۔ خاص مسجد ۲۲۵ فیٹ لمبی اور ۱۸۰ فیٹ چوڑی اور ۷۵ فیٹ بلند ہے اسکا احاطہ مستطیل صورت کا ہے جسکی ایک جانب ۳۶۰ فیٹ ہے۔ اسکی چھت ستونوں پر قائم ہے جسمیں بڑی بڑی پندرہ محرابیں بنی ہوئی ہیں۔ اور اوپر کے شمالی جنوبی گوشوں پر جانب غرب سو سو فیٹ بلند دو بڑے بڑے گنبد ہیں۔ پوری عمارت سنگ بستہ ہے۔ اور بھورے رنگ کے پتھر سے اسکی تعمیر ہوئی ہے۔ یہ پتھر گلکن کے پہاڑوں سے لائے گئے تھے جو حیدرآباد سے جانب جنوب سولہ کوس کے فاصلہ پر واقع ہیں[سمہ]۔ چنانچہ اب تک وہاں ان پتھروں کا تھوڑا سا ذخیرہ موجود ہے۔ مسجد میں ایسے بڑے بڑے پتھر لگے ہوئے ہیں کہ جنھیں دیکھنے سے عقل دنگ ہو جاتی ہے کہ انہیں اسقدر بلندی پر بغیر کلوں کے کیونکر لیگئے ہونگے۔ اور خاصکر وہ محراب جہاں امام کھڑا ہو کر

[لہ] سیاحت نامہ موسیو تھیونو صفحہ ۸۹ [سے] تاریخ محبوب السلاطین صفحہ ۲۵۲ [سمہ] تاریخ گلزار آصفیہ (۳۶)

نماز پڑھاتا ہے سب سے زیادہ تعجب انگیز ہے۔ وہ ایک ہی عظیم الشان پتھر سے بنی ہوئی ہے۔ جسکو پانچ چھ سو آدمیوں نے علی التواتر پانچ برس کام کر کے بمقام کان سے نکالا تھا اور اُسکو اِس مسجد تک لانے میں اِس سے بھی زیادہ مدّت لگی تھی اور ایک ہزار چارسو بیل کھینچکر لائے تھے[۱]۔

بیرونی احاطہ اینٹ اور چونے کا بنا ہوا ہے۔ اسمیں شمال مشرق جنوب کیجانب تین بڑے بڑے دروازے ہیں۔ جنوبی دروازہ محلات شاہی میں ہے اور چھپا ہوا ہے۔ مسجد کے دو صحن ہیں۔ پہلا صحن سڑک کی سطح کے برابر ہے۔ دوسرا جو سنگین ہے اُس سے قریبًا سات فیٹ بلند ہے۔ اِسکے اطراف میں حال میں لوہے کا کٹہرہ لگایا گیا ہے۔ یہ صحن شرقی جانب بہت بڑا ہے جسکے اخیر کنارے پر ایک حوض ہے اور حوض کے پاس دو آٹھ آٹھ فیٹ لمبی سیاہ پتھر کی سلیں رکھی ہوئی ہیں جیسے کوئی تخت بچھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سلیں ایک مندر کی ہیں جسے سلطان ابوالحسن قطب شاہ (سنہ۔ سنہ) کے وزرا اکنا مادنا نے ملیسرم میں بنایا تھا[۲]۔ صحن کے جنوب مشرقی حصہ میں شاہان آصفی کے مقابر ہیں +

سلطان محمد قطب شاہ (سنہ ۱۰۲۰ھ۔ سنہ ۱۰۳۵ھ) مکہ مسجد کا بانی ہے۔ اُس نے اپنے ایام حکومت میں اسکی بنیاد رکھی تھی۔ مگر اسکے ختم ہونیسے پہلے اسکی عمر ختم ہوگئی پھر اِسے سلطان عبداللہ قطب شاہ اور سلطان ابوالحسن نے بنایا اور اورنگ زیب نے ختم کیا۔ سنہ ۱۰۲۲ھ میں تعمیر کا کام شروع ہُوا۔ ابتدا میں بادشاہ نے اُس میدان میں جہاں مسجد بننے والی تھی ملک کے تمام علماء و فضلاء کو بنیاد کا پتھر رکھنے کیلئے بلوایا اور کہا کہ جس شخص کی نماز تہجد کبھی قضا نہوئی ہو وہ اِس مسجد کی بنیاد کا پہلا پتھر رکھے۔ مگر جب سب نے کہا کہ ہم میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے تو خود بادشاہ نے یہ کہکر کہ خدا شاہد ہے

---

[۱] سیاحت نامہ موسیو ٹیورنیر صفحہ ۲۴ [۲] سلسلہ آصفیہ جلد چہارم صفحہ محبوب السلاطین صفحہ ۳۵۳۔

میری اب تک نماز تہجد قضا نہیں ہوئی اپنے ہاتھ سے پتھر رکھکر مسجد کی بنیاد قائم کی[۱]۔ الغرض تعمیر کا کام جاری ہوا۔ بادشاہ نے میرزا فیض اللہ بیگ اور ہنرمند خاں رنگیا چودہری کو داروغہ مقرر کیا۔ اور آٹھ ہزار بایں تفصیل۔ دو ہزار معمار۔ دو ہزار سنگتراش چار ہزار کماٹی تیاری میں مصروف ہوئے[۲]۔ بادشاہ کی وفات تک کام اسیطرح جاری رہا۔ جب سلطان عبد اللہ قطب شاہ ۱۰۳۵ھ سے ۱۰۸۳ھ تخت نشین ہوا تو اُس نے بھی کام اسیطرح جاری رکھا۔ اگر عبد اللہ کا کام مسلسل جاری رہتا تو مسجد اسی کے عہد میں تیار ہوجاتی۔ بادشاہ نے تھوڑی مُدت تک کام جاری رکھنے کے بعد ملتوی کردیا جو اُسکے انتقال تک بند رہا۔ ٹیورنیر فرانسیسی سیاح لکھتا ہے کہ بادشاہ کے داماد سید محمد مکی نے یہ کہکر کام موقوف کرادیا تھا کہ اگر اِس مسجد کو بنوایا گیا تو ملک پر نہایت خوفناک آفت نازل ہوگی[۳]۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے بعد ابوالحسن ناناشاہ برسر حکومت ہوا۔ اُس نے کام کو جاری کردیا جو اُسکے اخیر عہد تک برابر جاری رہا۔ مسجد تیار ہوگئی تھی۔ آہک کاری اور احاطہ کی دیوار وغیرہ کا بنانا باقی رہگیا تھا کہ اورنگ زیب نے حیدرآباد فتح کرلیا۔ اور دولت قطب شاہیہ کا خاتمہ ہوگیا۔ اورنگ زیب نے تکمیل تعمیر کے لیئے آٹھ لاکھ روپیہ دیئے اور اپنے میر عمارت کو تیاری کا حکم فرمایا۔ میر عمارت نے احاطہ کی دیوار صحن۔ حوض۔ اور حوض کے بُرج اور چھت پر شمال مغرب کی جانب کے رواق اور طاق بنوائے۔ گنبدوں پر کلس لگوائے مگر شرقی جانب اور گنبدوں کی رواقیں باقی رہ گئیں۔ میر عمارت نے بارگاہ شاہی میں درخواست کی کہ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے جسکی تکمیل کے لیئے ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ اورنگ زیب نے اپنے ہاتھ سے عرضی پر لکھدیا کہ

[۱] تاریخ قطب شاہی۔ تاریخ قادر خانی۔ حدیقۃ العالم صفحہ ۔ سلسلۂ آصفیہ جلد چہارم صفحہ ۳۸۱ تاریخ عزیز دکن صفحہ ۲۸ [۲] تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۷۰ و تاریخ خورشید جاہی صفحہ ۴۳۲ [۳] سیاحت مسیو ٹیورنیر صفحہ ۴۳۔

کار دنیا کسے تمام نہ کرد ۔۔۔ ہر چہ گیرید مختصر گیرید

اور کام موقوف کروادیا[۵۱]۔ جو حصہ تعمیر سے باقی رہ گیا تھا اب تک ویسا ہی ہے۔ اس کام کے اختتام کا سنہ ۱۱۰۴ھ ہے جو صدر دروازے پر سنگ مرمر کی تختی پر کندہ کرواکر نصب کیا گیا ہے ۔

سلطان محمد قطب شاہ نے مسجد کا نام بیت العتیق رکھا تھا[۵۲]۔ جو تاریخی نام ہے مگر مشہور نہوا۔ کہتے ہیں کہ مکہ مسجد اورنگ زیب کا رکھا ہوا نام ہے[۵۳]۔ ایک اور مؤرخ لکھتا ہے عربی لغت میں عتیق کعبہ کو کہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اسی وجہ سے اسکا نام مکہ مسجد ہوگیا ہو[۵۴]۔ قدیم تاریخوں میں اسکی عجیب مگر نہایت ہی سادہ وجہ تسمیہ لکھی ملتی ہے کہ جیسا کہ مکہ معظمہ میں طواف کے لیئے ہر وقت لوگوں کا مجمع رہتا ہے۔ چونکہ اسی طرح اس مسجد میں عبادت کیلیئے مصلیوں کا ہجوم رہتا ہے۔ اسلیے من جانب اللہ مسجد کا نام مکہ مسجد زبان زد خلائق ہوگیا[۵۵]۔ ایک شاعر مکہ مسجد کی تعریف کرتے ہوئے اس نام کی اسی وجہ تسمیہ کو مدنظر رکھکر کہتا ہے ؎

طواف کعبۂ اشرف میسر گر نیست ۔۔۔ بیا بہ کعبۂ ملک دکن عبادت کن

مسجد کی تیاری پر تئیس لاکھ ہون صرف ہوئے ہیں[۵۶]۔ جسکی تعداد روپیوں کے حساب سے سوا کروڑ ہوتی ہے۔ یہ مسجد بلحاظ اپنی رفعت و عظمت کے بلاشبہ بےنظیر ہے۔ ایک سیاح موسیو ٹیورنیر جسنے اسکو بنتے ہوئے دیکھا تھا لکھتا ہے۔ اور فی الحقیقت سچ لکھتا ہے "پچاس برس ہوئے جب سے یہاں ایک عظیم الشان مسجد بن رہی ہے۔ اگر پوری ہوگئی تو تمام ہندوستان کی مسجدوں سے بڑی ہوگی اور یقیناً تمام ایشیا کی عمارتوں سے بہتر ہوگی"[۵۷]۔

حکیم سید شمس اللہ قادری

---

[۵۱] گلزار آصفیہ صفحہ ۳۰۶ [۵۲] تاریخ قطب شاہی تاریخ قادرخانی۔ تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۱۱۴ [۵۳] گلزار آصفیہ صفحہ ۳[illegible] [۵۴] تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۱۱۴ [۵۵] تاریخ قطب شاہی تاریخ قادرخانی تاریخ حدیقۃ العالم [۵۶] تاریخ قطب شاہی تاریخ قادرخانی۔ تاریخ حدیقۃ العالم [۵۷] سیاحت نامہ موسیو ٹیورنیر صفحہ ۱۴۴ و ۱۴۵

حیاتِ روح

جسمِ خاکی سے جدا ہوجانیکے بعد روح کے باقی اور موجود رہنے کے ثبوت میں قوی دلائل موجود ہیں۔ لیکن علاوہ دلائل خارجیہ کے خود روح کی فطرت میں تحصیل تکمیل و ترقی کا جو رحجان ہے بعض محققین کے نزدیک جسم کے ساتھ روح کے فنا نہونے کی بنفسہ اچھی خاصی دلیل ہے ؎

روح انسانی اپنی تکمیل میں ہمیشہ ترقی کرتی رہتی ہے مگر اس زندگی میں کسی ایسے کمال پر پہنچ جانا جسکے آگے ترقی نہو محالاتِ عادیہ میں سے ہی۔ لیکن برخلاف روح کے جسمِ خاکی کسی نہ کسی حد پر پہنچکر رک جاتا ہے۔ صحت و قوت و حسن میں ترقی کرتے کرتے ایسی ترقی حاصل کرتا ہے جس سے زیادہ ترقی اُسکے لیئے ممکن نہیں ہوتی۔ پس کیونکر خیال کیا جاسکتا ہی کہ جسم کے ساتھ روح بھی فنا ہوجائے گی۔ جسم اس زندگی میں اپنی تمام تکمیلیں حاصل کر لیتا ہے۔ اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ جاتا ہے اُسمیں اور زیادہ ترقی کرنے کی توفیق و قوت ہی باقی نہیں رہتی۔ اُسکے ساتھ وہ روح کیونکر فنا ہوسکتی ہے جو اپنی منزل مقصود کو نہیں پہنچی جسنے اس زندگی میں اپنی ترقیاں ختم نہیں کیں اپنا کمال حاصل نہیں کیا۔ اور نہ ترقی و کمال کی آرزو و قدرت ہی اُسمیں ختم ہوئی ہے ؎

انسان کو اپنی حالت سے حالتِ اعلیٰ میں ترقی کرنے کی قدرت ملی ہے اور اس قدرت کے ساتھ ہی ترقی کی کبھی کم نہونے والی کبھی قانع نہ ہونے والی خواہش بھی اُس میں ہے۔ جسم امراض و افکار و حوادثِ روزگار یا درازیٔ سن سے کہنہ اور فرسودہ ہو جاتا ہے۔ مگر روح مٹی کے اس بوسیدہ کھنڈر میں کسی کمسن معشوق کیطرح حیات بخش رہتی ہے۔ جسم کی انتہائی فرو ماندگی بھی روح کی تازگی و سرسبزی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔

روح میں وہ شادابی ہے جو یہاں کی بادِ سموم سے پژمردہ نہیں ہوتی وہ اولوالعزمی ہے
کہ یہاں کے کسی کمال سے اُسکا قانع ہونا کسی تکمیل پر پہنچکر رُک جانا ممکن نہیں۔
ترقی کے میدان میں وہ ہمیشہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایک کمال کے بعد دوسرا کمال
حاصل کرتی ہے مگر کمالات سے مستغنی نہیں ہوتی۔ ایک بزرگی سے دوسری اور پھر
تیسری اور اسیطرح بے انتہا بزرگیاں حاصل کرتی جاتی ہے مگر سیر نہیں ہوتی۔ اس سے
ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام کمالات تمام ترقیاں تمام بزرگیاں اُس علو ترتبت اُس غیر محدود
قابلیت اور خواہش کا جو وجود انسانی سے توام ہے اقتضائے وقتی نہیں ہیں جب ہی
تو انسان کی قابلیتوں کو کلیتہً صرف اور خواہشوں کو فی الجملہ پورا نہیں کرسکتیں۔ وہ
کمالات اور بزرگیاں جنکی تحصیل کی بے انتہا آرزوئیں اور بیشمار قابلیتیں انسان کو ملی
ہیں یقیناً اس دنیا کی نہیں ہیں بلکہ کسی ایسے عالم کی ہیں جو اس عالمِ آب و گل سے زیادہ
لطیف و برتر ہے +

انسان کی زندگی پر غور کرنیسے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں وہ اپنی نسل پھیلانے
اور اپنی نوع بڑھانیکے لیئے پیدا ہُوا ہے۔ سب کو وارث کی ضرورت ہے۔ وارث کے بہم
پہنچتے ہی ہر شخص اپنی جگہ اُسکے حوالے کرتا اور خود پیوندِ زمین ہوجاتا ہے جس طرح
ناپیداکنار سمندر میں ایک موج دوسری موج کی جگہ چھین لیتی ہے۔ اسیطرح آئے دن
ایک شخص دوسرے کا قایم مقام ہوتا ہے۔ اس روداد سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو
زندگی سے خود لطف اُٹھانیکے لیئے پیدا نہیں ہوا بلکہ اپنے لطفوں کو دوسروں کے
کے لیئے چھوڑ جانے کو پیدا ہوا ہے۔ آدمی کن کن جانکاہیوں سے سامانِ عیش و طرب
بہم پہنچانے میں ساعی ہوتا ہے مگر جب خاطر خواہ سامان بہم ہوجاتے ہیں تو اُن سے
وہ راحت جسکو روح بھٹکتی تھی نصیب نہیں ہوتی۔ یہاں کی راحتوں کا چمن غموم و
آلام سے خارزار۔ یہاں کی مسرتوں کا جام انواعِ افکار سے ہمیشہ مکدر ثابت ہوتا ہے

جملہ اسباب راحت روح تو روح راحتِ جسم کے بھی ضامن نہیں ہوتے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں کا عیش وطرب دراصل وہ سچا عیش وطرب نہیں ہو جسکی خواہش روح کی فطرت میں ہے۔ اِس دنیا کی تمام راحتیں۔ کامیابیاں۔ انسان کی خواہشوں کو پورا نہیں کر سکتیں اور انسان کی بیتاب قابلیتوں کو تسکین نہیں دے سکتیں۔ اسلیئے خواہشاتِ بشری کا اقتضائے واقعی نہیں ہیں۔ وہ عیش و راحت۔ وہ تکمیل و کامیابی جو روح کا اقتضائے واقعی اور مقصدِ اصلی ہے۔ کسی اور ہی دنیا یا مقام کی ہیں +

جانور پیدا ہونیکے کچھ روز بعد ہی اپنے انتہائے کمال پر پہنچ جاتے ہیں جس سے زیادہ ترقی اُنکے لیئے ناممکن الحصول ہوتی ہے۔ اُنکی زندگی کا ایک دن اُنکی تمام زندگی ہوتا ہے۔ آئے دن اُنہیں ایک ہی قسم کی باتیں اور مشاغل درپیش رہتے ہیں۔ اگر کوئی جانور ہزار سال بھی زندہ رہے تو بھی نرا جانور ہی رہے گا۔ جیساکہ اب ہے۔ جانور اپنی حیات قلیل میں سارے لطف تمام۔ سب کام پورے کر لیتے ہیں اور صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ ایک کام بھی ایسا باقی نہیں رہتا جسکے کرنے کی اُنہیں قابلیت ہو اور اُنہوں نے نہ کیا ہو۔ یا زیادہ صحیح الفاظ میں اِسی مطلب کو یوں کہنا چاہیئے کہ کوئی قابلیت اور توفیق اُن میں ایسی نہیں ہوتی جو کسی نہ کسی کام میں کما حقہٗ صرف نہوئی ہو۔ کوئی تکمیل ایسی نہیں جسکی خواہش اُنہیں ہو اور حاصل نہ ہوئی ہو۔ ریشم کے کیڑے نے اِدھر ریشم کاتا۔ انڈے رکھے اُدھر رخصت۔ کام ختم ہوا اور چل بسا۔ مگر آدمی کے کام زندگی میں کبھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ اپنے علم کو تکمیل پر نہیں پہنچا سکتا۔ اپنے جذبات پر قادر و توانا نہیں ہوتا۔ نہ اپنی ذات کامل کر سکتا ہے نہ اپنی ذات کے متعلق اپنی معلومات۔ اِس پر طرہ یہ کہ اِس دنیا کی تمام قوتیں نہ اُسکی تمناؤں اور خواہشوں کو پورا نہ اُسکے جذبات اور توفیقوں کو جذب کر سکتی ہیں۔ پھر بے انتہا کمال کی کبھی قانع نہونے والی تمنا انسان کو کیوں دی؟ کیا اِسلیئے کہ کبھی پوری نہو؟ یہ مہتم بالشان قوتیں تحصیلِ کمال کی اُسے کیوں

کیوں عطا ہوئیں ؟ کیا اس لیئے کہ بیکار پڑی رہیں یا ان قوتوں کے ایک معتد بہ حصہ
سے زیادہ کبھی استعمال نہ کیا جائے۔ اُس حکیم مطلق نے جس میں بہار آفرینش کو اس حسن سے
سرسبز و پُر بہار کرنے کی عقل تھی کیا انسان کو ایسے خالی از عقل انجام کے لیئے پیدا کیا ہے
انسان کو اپنے خالق کی بے انتہا حکمت و عظمت اور اچھائی کا جب ہوش آنے لگے۔
اپنے معبود کی بے تعداد مخلوق پر حیرت و اشتیاق و تعظیم سے نظر ڈالنا اور رموز و قوانین
قدرت اور غوامض و دقائق فطرت بقدر اپنے فہم کے سمجھنا شروع کر دے تو صفحہ ہستی
سے مٹا دیا جائے۔ علم و کمال کی اس ابتدائی حالت پر پہنچتے ہی فنا کر دیا جائے۔ انسان سے
باعقل و ہوش مجمع صفات و جذبات مخلوق کو علم و بزرگی و کمال کی اس آغاز پر قدم رکھتے
ہی نیست و نابود کر دینے میں کیا حکیم مطلق اور محسن کو کچھ مسرت ہو سکتی ہے ؟ نہیں
ہرگز نہیں +

ہماری خواہشیں اس دنیا میں ہر چند کہ پوری نہ ہوں مگر ہم میں خواہشوں اور ہمارے
خالق میں کسی شئ کو بیکار پیدا نہ کرنے کی عقل کا ہونا حجت ہے کہ خواہشیں ضرور پوری ہوں
گی۔ گو کسی دوسری دنیا میں ہوں۔ ہمارے یہ جذبات۔ قوتیں۔ توفیقیں اس زندگی میں
اگر روبکار نہیں آسکتیں تو کسی دوسری زندگی میں روبکار آئیں گی مگر آئیں گی ضرور۔ یہ
مسلمات سے ہے کہ ہم میں رنگا رنگ جذبات اور بوقلمون قابلیتیں بھری پڑی ہیں جنکی
فقط ایک تعداد قلیل کو ہم اس زندگی میں محسوس و معلوم کر سکے ہیں اور جو کچھ معلوم کر سکے
ہیں بیشتر انکے کماحقہٗ استعمال کی نوبت اس دنیا میں نہیں آتی۔ زیادہ تر حصہ ہماری
توفیقوں اور قوتوں کا ہم میں پڑا سوتا ہے اور ہمیں خبر نہیں ہوتی۔ مگر ؎

خواب آن نرگس فتان تو بے چیزے نیست

ہماری قوتوں کی یہ پُر خوابی کسی آنیوالی بیداری کی دلیل۔ موجودہ گم شدگی آیندہ
بہت کچھ پا لینے کی کفیل۔ ان کا یہاں کے کاموں میں کسی طرح صرف نہ ہو سکنا۔ ان

کاموں کا نشان دے رہا ہے جن کے انجام دینے کیلئے یہ انسان کو ملی ہیں +

حکیم مطلق کی اُس بے انتہا عقل اور حکمت کو جو اُس کے تمام کاموں سے نمایاں ہے خلقت بشری میں ہم صرف اسی طرح پا سکتے ہیں کہ اس حیاتِ عنصری کو تمہید یا دیباچہ سمجھیں - ایک دوسری حیات کا جہاں کی ترقیاں اور تکمیلیں ہمیں اُن نامعلوم بزرگیوں پر پہنچائے گی - جن کی تحصیل کی یہ بیشمار قوتیں مقتضی اور یہ ستم کی تمنائیں ہماری فطرت میں متمنی ہیں +

موجودات کی سب سے زیادہ دانشمند اور مدلل مخلوق انسان کی لکھو کہا - کروڑہا قوتیں ریگِ بیابان کیطرح بیشمار - وقت کی طرح مسلسل - حشرات الارض کیطرح سریع الفنا یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں اور فنا ہو گئیں - مگر وہ کلیتہً فنا نہیں ہوئی ہیں - خاک خاک میں - پانی پانی میں - ہوا ہوا میں ملگئی ہے - مگر روحیں یہاں سے زیادہ موافق آب و ہوا میں جہاں لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا[51] - برومند و سعادت اندوز و ترقی پذیر ہیں جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا[52] +

وہ اس عالمِ آب و گل میں لباس فانی پہنکر کبھی فنا ہونے والی زندگی کا آغاز کرنے آئی تھیں - ایسی زندگی کا آغاز جسکے قیاس و گمان وہم سے سوا دلکش اور عجیب و غریب منظروں پر لاعلمی کا گہرا حجاب پڑا ہے - ہماری مادی نظریں اِس حجاب کے پار نہیں جاتیں ہمارے مادی خیال ان غیر مادی حقیقتوں تک اگرچہ پہنچ نہیں سکتے مگر اُن کا تھوڑا بہت اندازہ اپنے طور پر کر لیتے ہیں - اپنی روح کی اس لافانی ہستی اور علوِ مرتبت کا خیال گو نامکمل ہی سہی کیسا دلفریب اور عالیشان خیال ہے - اُن بزرگیوں اور راحتوں کا تصور جو اِس قید

[51] نہ دیکھینگے بیچ اُسکے آفتاب کو اور نہ سردی کو - یعنی ہوا معتدل ہوگی - گرمی ہوگی نہ سردی - قرآن مجید پارہ ۲۹ سورۂ دہر ۲

[52] بہشتیں کہ جاری ہیں نیچے محلوں یا درختوں کے بہتی نہریں - ہمیشہ رہیں گے وہ بیچ اُن بہشتوں کے - قرآن مجید پارہ ۲۷ سورۂ واقعہ ۱۲

عنصری سے نکلکر نصیب ہونگی کیسا روح پرور اور دل افروز ہے۔ کیسی سچی ہوگی وہ راحت جو امراض و افکار و تکالیف جسمانی سے آزاد ہو کر خود بخود حاصل ہوگی۔ زندگی کی ضروریات و حوائج کا نتیجہ ناگزیر یعنی محتاجی استغنا میں بدلجائیگی۔ قید مادی کی بیڑی کٹتے ہی روح کا قدم جادۂ رفعت و وقار میں بڑھنا شروع ہوگا۔ علم حواس خمسہ کی قید سے آزاد ہوجائے گا۔ ایک قدرت و عظمت کے بعد دوسری اور تیسری اور اسی طرح بے انتہا بزرگیاں حاصل ہونگی۔ مگر روح کے تصرفات فقط روز افزوں ہی نہوں گے بلکہ آفتاب لازوال بن کر عالم بقا کو بھی اپنی تجلی و نور سے معمور و منور کر دینگے۔ تاہم اس کمال کو پہنچکر بھی اُسکی ترقیاں اتمام کو نہ پہنچیں گی اُسکی بزرگیاں اور بڑھیں گی۔ اُسکا علم مطلق اور سرمدی ہوتا جائے گا۔ اُسکے استغنائے کامل کی ہستی۔ لوازمات بے اختیارانہ کی مستی۔ ارتفاع راحت کو بقائے دوامی کے ڈھنگ سکھانے لگے گی۔ اُس کے انوار جاوید طراز ہو کر بہترین فضائل کی تسہیل تحصیل کا سبب ہوں گے۔ یہاں تک کہ اطمینان و سکون۔ مسرت و راحت۔ علم و استغنا۔ قدرت و عظمت کا وہ درجۂ رفیع حاصل ہوگا۔ع

جس سے بالاتر تصور کیجئے تو کچھ نہیں

ستارے دُھندلے اور چاند سورج بے نور ہو جائینگے۔ مگر روحانی جلال اپنے ہی معاقب ثاریں سے ہمیشہ مستشرق رہے گا۔ وقت زمین و آسمان کو فنا کر دے گا۔ بڑے بڑے سیارے آپسمیں ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جائینگے۔ انتزاع مادی سے موجودات زیر و زبر۔ فساد اجسام سے یہ کارخانہ درہم و برہم ہو جائے گا۔ خود نیچر تصاریف الدہور سے بوڑھی اور ضعیف ہو جائے گی۔ مگر روح کی سدا بہار جوانی کو کوئی شئے نقصان کوئی چیز آسیب

لـه ہلائی جائے گی زمین سخت ہلایا جانا اور پارہ پارہ کیئے جائیں گے پہاڑ سخت پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کرنا پس ہو جائینگے پہاڑ مثل اُس غبار کے جو دیوار کے روزن میں آفتاب کی شعاع سے دیکھا جاتا ہے پراگندہ اور بکھرا ہوا۔ قرآن مجید پارہ ۲۷ سورۂ واقعہ ۱۲

نہ پہنچا سکے گی۔ یہ ہستیِ محض میں فنا ہوکر باقی اور محیطِ کل میں محو ہوکر موجود رہتے[51] گی +
یہی وہ ترقی اور کمال ہے جو انسان کے قواے موقعتہ و مخزاتِ قدسیہ کا
مقصدِ اصلی اور منزلِ آخری ہے۔ بس یہی ہے وہ بزرگی جو جبلتِ بشری میں متضمن و
مستتر خواہشوں کو پورا کرسکتی ہے ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ[52]۔ ترقی اور کمال کا یہ تصور
اللہ اللہ کیسا دلفریب و فرح آسا تصور ہے۔ نہ صرف ہمارے لیئے بلکہ واجب الوجود کی
کسی شان کو اگر ہم مسرت کہہ سکیں تو ضرور کہیں گے کہ اپنی صنعتکاری کو اس مرتبہ کامل
اور اپنی مخلوق کو اپنی شان سے ہمتا کے اسقدر مشابہ پاکر عجب نہیں کہ اُس جلال کو
بھی مسرت ہو جسے ہم اپنے خالق کے نام سے یاد کرتے ہیں +

سید محمود جعفری

۵۱ تختوں کے اوپر جو بُنے گئے ہیں سونے کے تاروں سے جس وقت کہ تکیہ لگانے والے ہوں گے اوپر اُن تختوں کے آمنے سامنے بیٹھنے والے ہونگے ہمیشہ رہنے والے لڑکے اُن کے حکم پر خدمت کرتے۔ پھرنیوالے ہونگے ساتھ آبخوروں کے اور آفتابوں کے اور پیالوں سے شراب صاف سے بھرے ہوئے۔ اُس شراب سے نہ سر میں درد ہوگا نہ بیہوشی اور مستی اور میوے اُس قسم سے کہ پسند کریں۔ اور گوشت جانوروں کا ایسا جسے طبیعت چاہے اور پھرینگی گرد اُن کے خدمت کرتی حوریں گورے بدن والیاں کشادہ چشم مانند موتی پوشیدہ کئے گئے کی۔ بدلہ اُس چیز کا کہ تھے کرتے نہ سُنیں گے وہ بیچ اُس بہشت کے بیہودہ بات کو اور نہ گناہ کی باتیں مگر کہنے کو آپس میں سلام ہی سلام ہی۔ اور صاحب دست راست کیا ہیں صاحب دستِ راست بیچ سایہ درخت بیری بے خار کے اور بیچ درخت کیلے کے تہ بتہ رکھی گئی ہوں کی پھلیاں اُسکی نیچے سے اوپر تک اور بیچ ہمیشہ رہنے والے سایہ کے ہوں گے اور پانی گرتا ہوا اور بیچ میووں بہت کے ہونگے ہمیشہ رہنے والے ہونگے وہ میوے اور کھانے سے کوئی منع نہ کرے گا۔ قرآن مجید پارہ ۲۷ سورہ واقعہ ۱۲

۵۲ یہ ہی ہے وہ مراد پانا بزرگ۔ قرآن مجید پارہ ۲۷ سورہ حدید۔ ۱۲

پیاری

(گزشتہ اشاعت سی آگے)

نازنین - اوبڈھے تو سٹھیا گیا ہے۔ ہوش کی دوا کر۔ چل دور ہو۔ (نازنین نے ہاتھ کے کڑے کو گھمایا اور طوطے کیطرح آنکھیں پھیر لیں۔ بڈھے پر ہراس طاری ہوا اور فرطِ الم سے بولا

یاس ؎ مزن بر دل ز نوکِ غمزہ تیرم — کہ پیشِ چشمِ بیمارت بمیرم
نصابِ حسن در حدِ کمال ست — زکوٰتم دہ کہ مسکین و فقیرم
قدح پُر کن کہ من از دولتِ عشق — جواں بختِ جہانم گرچہ پیرم

نازنین پیاری! تو سمجھتی ہے کہ قلاش اور مفلس عاشق مناسب نہیں ہوتا۔ یہ بات صحیح نہیں۔ بیوی کو اور کیا چاہیئے کہ خاوند اُسکے پاؤں دھو دھو پیئے۔ اُسکے ہر کرشمے اور ہر ادا پر جان نثار ہو۔ ہمہ تن مفتوں رہے۔ اور جس عورت کے پاس کروڑوں روپیہ اپنا موجود ہو۔ اُسکو تو ضرور مفلس خاوند پسند کرنا چاہیئے۔ اُسکے پاس دو زبردست طاقتیں یعنی حسن و دولت خاوند کو غلام بنائے رکھنے کیلیے کافی ہیں۔ جوانی کیا چیز ہے۔ چار دن کی چاندنی۔ گورے گورے رخساروں پر فدا نہونا چاہیئے۔ یہ چار دن کی عارضی خوب صورتی ہے۔ دو چار سال گزرے اور ڈھاک کے تین پات رہ گئے۔ مجھے مفلس نہ سمجھنا گو زر پاس نہیں ہے۔ ایک دولت میرے پاس بھی ہے ؎

فراواں گنجِ غم در سینہ دارم — اگرچہ مدعی بیند فقیرم

اے شہِ حسن و دولت۔ تجھے پختہ مغز۔ تجربہ کار قدردان۔ غلام خاوند پسند کرنا چاہیئے نوجوان۔ سُرخ و سفید۔ البیلے نوجوانوں کا کیا اعتبار کہ ہر بامداد ش بود میلے ؎

نازنین - اے بڈھے فرتوت تو تو بڑا لسان ہے۔ منطق چھانٹنی خوب جانتا ہے

بھلا یہ تو بتا کہ کسی نوجوان نازنین کو محض زبانی ستایش و نازبرداری سے کیا حاصل اگر خاوند بڈہا ہو تو نوجوان بیوی کو لطف زندگی کیا ہے۔ سٹری ہوا ہے؟ کہ میں تجھسے بڈھے سے ناطہ جوڑوں۔ اور اپنی عمر عزیز رائگاں گنواؤں +

یاس۔ اور جو میں جوان ہو جاؤں۔ پھر تو وعدہ کرتی ہو۔ باقی رہی میری غلسی اُس کا علاج تمہارے پاس موجود ہے +

نازنین۔ دیوانہ ہوا ہے۔ کہیں بڈھے بھی جوان ہوا کرتے ہیں؟ +

یاس۔ بیشک بڈھے بھی جوان ہو جایا کرتے ہیں۔ کیونکہ؟ ؎

گرچہ پیرم تو شبی تنگ در آغوشم گیر تا سحرگاہ بہ کنار تو جواں برخیزم

نازنین۔ بڈھا مطلب کا پکا۔ دیوانہ بکار خویش ہشیار۔ کھو لالہ یاس رام جوانی کی عمر میں معلوم ہوتا ہے بڑے عاشق مزاج رہ چکے ہو۔ یہ دیوانہ پن بڑھاپے میں پیدا نہیں ہوتا۔ رسی جل گئی بل باقی ہے۔ چور چوری سے گیا ہیرا پھیری سے نہیں گیا

یاس۔ میرے ایام جوانی کے قصے بہت طول و طویل ہیں۔ کئی معشوقوں پر عاشق ہوئے۔ سب نے دغا دی۔ سب بیوفا نکلے۔ آخر یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ جملہ معشوق احمق ہیں یا تو وہ دولت چاہتے ہیں یا حسن جوانی۔ آخر کو وہ پچتاتے ہیں۔ اور تجربہ کاروں کی مانگ ہونے لگتی ہے۔ ہم نے بھی کچھ دولت پاپ پن کر کے کمائی تھی۔ جوانی میں اُسکی چنداں پروا نہ کی۔ جیسے جیسے عمر ضعیف ہونے لگی۔ دولت بہت پیاری معلوم ہونے لگی +

نازنین۔ یہ تو دولت کا ذکر ہے۔ عشق کا تذکرہ سناؤ +

یاس۔ وہ کون سے گرو ہیں جو ہم نے نہیں گھوسے۔ آخری واردات سنئیے۔ چند سالوں کا ذکر ہے کہ یاروں نے چار ہزار قیمت دیکر ایک دُلہن خریدی۔ اُسکی عمر چودہ سال کی تھی۔ جب مجھے چار ہزار کا خیال آتا تو دل پر صدمہ گزرتا اور جب نو عمر دُلہن

کو دیکھتا۔ دل باغ باغ ہو جاتا۔ حق تو یہ ہے کہ دونوں جذبات ایک ہی وقت پیدا ہوتے رہتے تھے۔ وہ بیچاری مجھسے بہت خوش رہتی۔ میں اُسکی غلامانہ اطاعت کرتا حتّٰی کہ وہ پڑوس کی عورتوں پر قہقہہ لگا کر کہا کرتی تھی کہ دیکھو میرا گھر میں راج ہے۔ تم تو خاوندوں کی لونڈیاں ہو۔ اب ماجرا یوں گزرا کہ ایک رات ڈاکو آئے۔ میں لوہے کے صندوق پر چارپائی بچھائے اپنی پیاری بیوی کے پہلو میں سویا ہوتا تھا۔ پلنگ کی چادر کے حاشیے اتنے لمبے لٹکے ہوئے تھے کہ ذرا شبہہ تک نہ ہووے کہ اسکے نیچے لوہے کا صندوق ہے۔ واللہ سوائے خدا کے کسیکو معلوم نہیں۔ البتہ تفصیل شیطان کو بھی بخوبی معلوم ہے کہ کس کس چالبازی سے ہزاروں روپیہ میں نے جمع کیا تھا۔ ڈاکوؤں کی کیفیت سُنیئے کہ اُنہوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور نہ مجھے مُہلت دی کہ منت سماجت کرتا۔ فوراً گردن پکڑ کے مجھے زمین پر ڈالدیا۔ اور پیاری بیوی کو مع مال و زر اُٹھا کر لیگئے پولیس تحقیقات کو آئی وہ ایسی ایسی باتیں کرنے لگی کہ خدا کی پناہ۔ مشکل سے اُنہیں میں نے رخصت کیا۔ اب میں واقعی یاس ملم ہوں۔ دولت دام نہ رہا۔ بس اب تو یہ تمنا ہے کہ تم سی کوئی بیوی ملے۔ نعم البدل پاؤں۔ ہر طرح کی آسایش ہو۔ اور میرے گھر کا چراغ روشن ہو۔ کاش تو میرے حال پر رحم کھائے +

نازنین۔ مجھے واقعی تیری حالت پر رحم آتا ہے۔ تیری عقل کے فتور پر اور زیادہ رقت آتی ہے مگر اس خیالِ خام سے درگزر +

یاس۔ ایسا جواب صاف حضور کے شایاں نہیں۔ اتنا تو وعدہ کرو کہ میری عرض پر آپ غور فرماویں گی شاید میرے نصیب یاوری کریں۔ اور میں ہی پسندِ خاطر ہو جاؤں بسا اوقات حسن و زر ایسی جگہ واقع ہوتے ہیں کہ لوگ حیران رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بے محل واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ع ہر اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا + اے شہ حسن ع روا مدار کہ محروم زآستاں برویم +

نازنین۔ اچھا یاس رام تو ہراساں مت ہو۔ تیری التجا پر غور کرونگی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر پھر ڈاکو آئے اور مجھے لیگئے تو کیا کیفیت گزرے گی؟

یاس۔ ضمانت تو میں کسی قسم کی نہیں دیسکتا۔ البتہ یہ کرسکونگا کہ تمھارا گہنا پاتا زمین میں دبا دوں۔ اور تمھیں میلے کچیلے کپڑے پہنا دوں۔ اور تمھارا مُنہ کسی کو دیکھنے نہ دوں۔ اور جو کوئی پوچھے تو کہدوں کہ ایک بُڑھیا کھانا پکانیوالی نوکر رکھی ہے۔

نازنین۔ واہ صاحب واہ۔ اچھی ہماری تواضع تکریم کیجیے گا۔ لو اب یہ تجویز تمھارے لیئے بتاتی ہوں۔ کوئی مال مست ہوتا ہے تم حال مست ہوجاؤ۔ عاشقوں والی حالت اپنے پر طاری کرلو۔ اور اسی خیال میں مست رہو کہ تم میرے عاشقوں میں سے ہو۔ مجھسے کوئی پوچھے گا تو میں قبول لیا کرونگی کہ واقعی تمھارا مجھپر دل آیا ہے اور بقول ناسخ

اب تو ناسخ بھی ہمارے چاہنے والے ہوئے ۔۔۔ وہ پری پیکر کہا کرتا ہے اکثر فخر سے

نازنین نے یاس رام کو انداز معشوقانہ سے رخصت کیا۔ بُڈھا حال مست اسی خیال میں کہ وہ مقتولوں میں شمار ہوا۔ اس حالت کو غنیمت سمجھکر رخصت ہوا۔ ایک آس سی اُسکے دلمیں پیدا ہوگئی کہ شاید کبھی اُسکے بخت خفتہ جاگیں۔ سچ ہے جبتک سانس ہے آس ہے۔ فی الحقیقت بُڈھے کی یہ صورت تھی

ہر چند پیر وخستہ دل و ناتواں شدم ۔۔۔ ہرگہ کہ یاد روئے تو کردم جواں شدم

باب چہارم

انشاء اللہ کی دوسری ملاقات

ہم ذکر کر آئے ہیں کہ انشاء اللہ خاں ایک بیعدیل ناظم و ناثر تھا۔ فصاحت و بلاغت اس شخص میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن ہمیشہ تنگ دست ہی رہتا تھا۔ اور زمانہ کی شکایت اور اپنی مفلوک الحالی کی کیفیت اُسکے ورد زبان رہتی تھی۔ البتہ طبیعت

طبعی طور پر عاشقانہ واقع ہوئی تھی۔ اور قدرے اصرار کا مادّہ اُسمیں موجود تھا۔ یہ عقدہ تو اُسپر کھل چکا تھا کہ الفاظ کی رنگ آمیزی سے پیاری کے دلپر اثر نہوا تھا تاہم اُس نے سوچا کہ آؤ ایک مرتبہ اور سعی بلیغ کریں شاید مطلب برآری ہو جائے۔ چنانچہ وہ دوبارہ اُس نازنین کے حضور میں حاضر ہوئے ۔

نازنین۔ فرمایئے میر صاحب آج پھر کیسے آنا ہوا ۔

میر صاحب۔ حضور خود ہی سمجھ سکتے ہیں ؎ ہر کجا چشمۂ بود شیریں ۔ مردم و مرغ و مور گرد آیند ۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے آنیکا مقصد یہ ہے ؎

گوشۂ محرابِ ابروئے تو میخواہم زبخت ۔ تا در آنجا ہمچو مجنوں درس عشق از بر کنم

نازنین۔ خیر آپ کا مقصد تو میری سمجھ میں آیا۔ لیکن آپ کام کیا کرتے ہیں ۔

میر صاحب۔ بندہ مصور ہے۔ لیکن میری رنگ آمیزی الفاظ سے ہوتی ہے۔ پچھلی مرتبہ حضور کو کچھ نمونے اپنی تصنیف نظم و نثر کے سُنائے تھے۔ الّا شومیٔ طالع سے کچھ ادھر توجہ نہوئی ۔

نازنین۔ گویا آپ شاعر ہیں یعنی قافیوں۔ ردیفوں۔ میزانوں اور بحروں کے خبط میں مبتلا ہیں۔ اور آپ نثر بھی لکھتے ہیں۔ یعنی فقرہ بندیوں۔ استعاروں۔ اور چُست بندشوں میں تضیع اوقات کرتے ہیں جسے لوگ انشا پردازی یا عبارت آرائی بولتے ہیں۔ ایسے ایسے دل آویز چٹکلوں سے تو ہلکی طبیعت کے لوگ قابو میں آجاتے ہیں یہ کہیئے کہ آپکے دلمیں سچا عشق ہے یا خالی خولی باتیں ہی باتیں ہیں۔

میر صاحب۔ میرا دل دولتِ عشق سے معمور ہے لیکن دنیا میں کوئی معشوق وفادار نہیں ملتا۔ جھوٹا وعدہ کرتے رہتے ہیں۔ اور دلِ عشاق ناحق جلاتے ہیں۔ عشاق فراق کے صدموں سے تنگ آکر واسوخت لکھنے لگتے ہیں۔ عاشق کی مختصر زندگی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ پہلے معشوق کی ستایش شروع کرتا ہے۔ امید کی جھلک نظر

آتی ہے۔ بعدازاں عشق جتاتا ہے۔ جواب اُسکا جور و تعدی سے ملتا ہے۔ ادھر فراق کے صدمے۔ اُدھر سے مضحکے۔ ادھر بےچینی اُدھر سے بے اعتنائی۔ اسی طرح برسوں جان کاوش میں رہتی ہے۔ آخر یاس۔ الم۔ اندوہ۔ حسرت۔ ارمان عاشق کے مونس بنتے ہیں۔ کوئی ضعیف البنیان عاشق تو جان دیدیتا ہے۔ کوئی بگڑے دل واسوخت لکھنے لگتا ہے۔ بس بندہ تو اب آخری مرحلہ پر ہے۔ یعنی اب تجربہ ہو چکا ہے۔ محض ایک حضور سے کچھ امید پڑتی ہے کیونکہ حضور کے ہاں زر کی تو کمی نہیں۔ ایک عاشق جان نثار چاہیئے +

نازنین۔ یہاں بھی فقرہ بازیاں استعمال ہونے لگیں۔ کروڑوں کے جواہرات جو میرے تن پر ہیں وہ آپ کو کھینچ لائے ہیں۔ درحقیقت آپ کو زر کی خواہش یہاں لائی ہے۔ سُنئے میر صاحب۔ ایک استاد کا شعر ہے ؎

نہ رسم بے وفائی ہے نہ ذوق کج ادائی ہے
جفا و جور جو کچھ ہے خیالِ امتحاں تک ہے

یہ فرمایئے کہ عاشق پر معشوق کی تعمیل ارشاد ضروری ہے یا نہیں +

میر صاحب۔ بیشک۔ لاکلام۔ بسر و چشم۔ بہر کیف۔ بہمہ وجوہ +

نازنین۔ تو آپ اتنی شد و مد سے فرماتے ہیں کہ تعمیل ارشاد ضروری ہے فرض کیجئے معشوق کوئی ایسا کام بتائے جو خلاف اخلاق یا مذہب یا وضع یا نیک ضمیری ہو تو عاشق پر تعمیل لازمی ہے +

میر صاحب۔ مفروضات کو کیوں معرض بحث میں لایا جائے۔ فرض محال سے کیا بحث ہے۔ ایسا نامعقول معشوق کیوں فرض کیا جا سکے +

نازنین۔ فرض محال کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ یہ تصور کیجئے کہ میں کوئی کام بتادوں۔ آپ تعمیل کے لیئے تیار ہیں؟ +

میر صاحب۔ اس تذکرے کو چھوڑیئے۔ موقع موقع کی بات ہے۔ اس قسم کے عہد

و پیمان قائم نہیں رہا کرتے۔ حضرتِ انسان کی طبیعت کے اُتار چڑھاؤ کی عجیب کیفیت ہے۔ بعض اوقات وہ کروڑوں کے لیئے بھی ایمان نہیں کھوتا۔ اور وہی شخص دوسرے موقع پر چار ٹکوں پر ایمان فروخت کر دیتا ہے۔ زاہدِ صد سالہ عمر بھر نفس امارہ پر قابو رکھتا ہے۔ اور اُسکی طبیعت میں خوبرو پریزادوں سے رم کرنے کی تقریبًا جبلی خصلت ہو جاتی ہے۔ کسی موقع پر ایسا بھٹکتا ہے کہ ناگفتہ بہ۔ حضور یہ باتیں یوں طے کرنے کی نہیں۔ آزمایش کا وقت بھی آجائے گا۔ بالفعل میری عرض تو سنیئے ؎

اے خسرو خوباں نظرے سوئے گدا کن رحمی بمن سوختۂ بے سرو پا کن
دارد دل درویش تمنائے نگاہے زاں چشم سیہ مست بیک غمزہ روا کن

نازنین۔ میر صاحب آپ تو اپنے ہی مطلب کی کہے جاتے ہیں مجھے ویسا معشوق نہ سمجھنا کہ لفاظی۔ لسانی۔ چرب زبانی کارگر ہو۔ میرے ہاں انواع و اقسام کے عشقباز آتے ہیں۔ اور طرح طرح کی تجویزوں سے مجھے دام میں لانے کی کوشش کرتے ہیں کل ایک بُڈھے سٹھیائے ہوئے پیر فرتوت آئے اُنکی کیفیت اور لجاجت اگر آپ دیکھتے تو ایک نظم کے لیئے سامان ملجاتا۔ ایک اور دلچسپ شخص پرسوں آئے۔ انہیں لوگ دھن مل کہتے ہیں۔ یہ حضرت ہر ایک سانچے میں جاکے ڈھل جاتے ہیں۔ یہ حضرت بھی ایک نیچر کی غلطی ہیں۔ میری اُنپر کبھی نگاہ پڑتی ہے کہ یہ شخص میرے کام کا ہے البتہ اُسنے وعدے ہر کام کرنیکے کر لیئے ہیں۔ غلیظ سا غلیظ کام بھی اُسکے دائرے سے باہر نہیں۔ اور جہاں میرا زور آزمایا جائے گا وہ ایک وہی شخص ہے۔ تاہم میرے دفتر میں امیدواروں کی فہرست بہت ہی۔ آپ صاف صاف فرمایئے کہ جو میں کہوں عیب ہو یا ثواب۔ پاپ ہو یا پُن۔ آپ کو کرنا ہوگا ؞

میر صاحب۔ حضور یہ تو بہت کڑی سُنائی۔ یہ عہدہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ دنیا کا

کوئی کام نہو گا۔جس سے عاشق کو احتراز نہو گا۔ہیں نے مانا کہ ؎

نہ من بر آں گل عارض غزل سرایم و بس کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزار انند

لیکن یہ ناچیز۔ درماندہ۔عاجز۔مسکین۔کس مپرس قابل رحم ہے۔یہاں تو نہ مردانہ حسن ہے جو آپ کو کھینچے۔ نہ زر جو اکثر معشوقوں کو مول لیتا ہے اور جس کی آپ کے ہاں کمی نہیں۔ نہ کوئی اور ہنر یا قابلیت یا کمال جو جناب کو پسند آئے۔ہم فقط آپ پر فدا کرنے کو جان رکھتے ہیں۔بس یہ جان حاضر ہے۔عشق کے دریا دل میں اُمنڈ رہے ہیں۔فرط محبت سے دل شرابور ہو رہا ہے۔عشق کا بدلہ عشق ہے اور عشق قیمت عشق کی ہے۔

نازنین آپکے کلام سے معلوم ہوا کہ دراصل آپ عشق عشق جو پکارتے ہیں یہ درپردہ ایک زر کا سوال ہے۔یوں کیوں نہیں کہتے کہ آپ کی نظم و نثر جو جانکاہی سے آپنے لکھی تھی اُسکی قدر نہوئی اور مول نہ ملا۔ ورنہ بندہ نواز اگر آپ سچے شاعر ہوتے یا سچے ناثر ہوتے تو مجھ سے معشوق کیجانب آپکا رخ تک نہوتا۔ آپ کسی اور نشہ میں چور رہتے۔ جا بیئے جا بیئے شعر و سخن کی قدر افزائی میں کامیابی معلوم۔ایسے معشوق کہیں اور ڈھونڈھیئے ۔

میر صاحب۔آپ میری بے مایگی کا ذکر فرماتی ہیں شعرا کا اکثر یہ حال رہا ہے چنانچہ ایک صاحب فرماتے ہیں ؎

یارب تو کجائی کہ مرا زر نہ دہی بیرحم خدائی کہ مرا زر نہ دہی

نے نے نہ تو غائبی و نے بیرحمی بے مایہ چو مائی کہ مرا زر نہ دہی

ان دنوں یاروں نے بھی ایک نظم لکھی ہے۔جس میں ثابت کیا ہے کہ دولت اندھی ہے جب جاتی ہے کسی نامعقول یا فاسق کے پاس جاتی ہے۔صاحب دولت کون ہیں۔

(۱) جو کسی مالدار کے گھر پیدا ہو گئے۔ اتفاق سے چاندی کا چمچہ مُنہ میں لیئے پیدا ہوئے

اُن کا کام کیا ہے۔ گاؤ تکیئے لگائے بیٹھنا۔ دن کو سونا رات کو سیاہ کاری کرنا۔ غربا کے حقوق پائمال کرنا۔ اوروں کی محنت کے ثمر اُنکی عیش و طرب میں استعمال ہوتے ہیں۔ دولت اُن کے عیوب کی پردہ پوش ہے۔ بازار میں نکلیں سلام کا تار بندھ جاتا ہے۔ سرکار دربار میں وہ سرفراز و ممتاز ہیں۔ خدا اُنہیں فراموش ہے +

(۲) چور۔ ڈاکو۔ قزاق۔ رہزن جو لوگوں کی نیک کمائی لُوٹ لیتے ہیں اور چَین اُڑاتے ہیں +

(۳) وہ لوگ جو روپیہ سے روپیہ کماتے ہیں۔ محنت سے عار رکھتے ہیں اور سود پر عیش اُڑاتے ہیں۔ اہلِ ضرورت یعنی مقروضوں کا خون پیتے ہیں۔ رات کو سوئے اور صبح ہوتے روپیہ بن گیا۔ صبح و شام یہی دعا مانگتے رہتے ہیں کہ کسی پر مصیبت آوے اُسکا مکان گروی رکھ لیں اور کوڑیوں میں خرید لیں +

(۴) جو بزورِ شمشیر دوسروں کے ملک فتح کرتے ہیں۔ کُشت و خون کی داد پاتے ہیں بہادر کہلاتے ہیں۔ تاریخ میں اُنکے نام روشن ہوتے ہیں۔ اُنکی اولاد پدرم سلطان بود کے ناز میں رہتی ہے +

(۵) جو بدوضعی سے۔ رشوت ستانی سے۔ خیانت سے لوگوں کے مال اُڑاتے اور مزے کرتے ہیں +

(۶) وہ پالیسی کے مشاق لوگ ہیں جو مذہب کی آڑ میں فرقہ بندیوں کے ذریعہ سے جھوٹ۔ فریب۔ مکاری۔ چکمہ بازی سے لوگوں کا مال مُوستے ہیں اور شرفا کہلاتے ہیں۔ دراصل وہ بے وقوفوں کا شکار کرتے ہیں۔ تاہم لوگ اُنکی عزت کرتے ہیں +

ازیں قبیل بہت سے لوگ مالدار ایسے ہیں جن کی کمائی نیک افعال سے پیدا نہیں ہوتی۔ اُنکو چھوڑ کر باقی رہے اہل حرفہ و صنعت اور ماہرانِ علم ادب۔ مزدور قلی۔ یہ سب مفلس قلاش ہیں۔ یہ قول پُرانا ہے لیکن اِسوقت تک صادق آتا ہے ؎

اے زرتو خدا نۂ و لیکن بخدا   ستار عیوب و قاضی الحاجاتی

سُنا ہے کہ ایسے ملک بھی ہیں جہاں معاملہ برعکس ہے۔ وہاں حرفت صنعت۔ شعروسخن کی بے انتہا قدر ہے۔ واقعی وہ ملک بہشت ہوں گے۔ جہاں لوگ اپنی محنت۔ جودت لیاقت کا صلہ پاتے ہونگے۔ اپنی طبیعت تو چاہتی ہے کہ اُس ملک میں نقل مکان کریں ؎

سخندانی و خوشخوانی نمے ورزند در شیراز   بیا حافظ کہ ما خود را بملکِ دیگر اندازیم

پھر سوچتا ہوں کہ اپنا ملک چھوڑکر باہر کیوں جایئے۔ دولت کیلئے؟ اُس بے وفا معشوق کی تلاش میں جو کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی۔ جو ہرجائی کی مانند گھر گھر پھرتی۔ اور کبھی استقلال سے نہیں رہتی۔ ہم اپنی حالت پر شاکر رہیں قناعت سے کام لیں۔ کیا ہمیں اپنی طبع سلیم کا فخر کم ہے ؎

حافظ ار سیم و زرت نیست برو شاکر باش   چہ بہ از دولتِ لطفِ سخن و طبعِ سلیم

نازنین۔ آپ واقعی لسان اعلےٰ درجے کے ہیں۔ کیا دولت کو آپنے ایسا رذیل سمجھ رکھا ہے۔ انگور کھٹے ہیں۔ سب مفلوک مفلس قلاش یوں ہی کہا کرتے ہیں جو خود ہمت سے دولت پیدا نہ کرسکیں وہ اہلِ دول کو اِسیطرح بُرا بھلا کرتے ہیں۔ اجی جناب دولت وہ چیز ہے کہ دنیا کی ہر شئے مہیّا کرسکتی ہے۔ گدھے پر دولت کی جھول ڈالیئے ترکی و تازی نبچا تا ہے جنھیں لوگ شریف اور عالی خاندان کہتے ہیں سب دولت کے کرشمے ہیں۔ ورنہ ٹائیں ٹائیں فش۔ ہاں یہ مانا کہ دولت متلون مزاج جنس ہے لیکن یہ ہی اُسکی ہستی کا راز ہے ٭

میر صاحب۔ کس کمبخت نے کہا کہ دولت بیکار شئے ہے۔ شکایت ہی تو یہ ہے کہ حق بحقدار نمیرسد۔ مناسب تو یہ تھا کہ دولت اُسکا حق ہے جو جسم اور دماغ سے کام لے جسکے اخلاق اچھے ہوں۔ جو نیک کردار ہو۔ اور یہاں معاملہ برعکس ہے خیر اِس قصے کو جانے

دیجیے۔ اب اس ناچیز پر رحم فرمایئے۔ مانا کہ حضور خسروِ خوباں ہیں اور قابض جاہ و حشم ہیں۔ آخر ہم بھی مداحِ حُسن اور دلدادہ زلف پیچاں ہیں۔ جان نثار لعلِ رخسار ہیں قربانِ اداے خوباں ہیں۔ آخر صاحب علم و فضل ہیں اور سب باتیں جانے دیجیے ۵

عشق تو دُود جودم و مہر تو دردلم   یا شیر دردروں شدُ یا جاں بدر شود

کیا حضور کی نظر فیض اثر میں جوہرِ شاعری کچھ حقیقت نہیں رکھتا؟ شعر میں وہ طاقت ہے کہ سخت سے سخت دل کو موم کر دے مردہ دل میں جان ڈالدے۔ اسمیں بھی وہ طاقتِ تسخیر ہے کہ کسی اور شئے میں نہیں۔ تعلی نہ سمجھیے گا ۵

منم آں شاعرِ ساحر کہ بافسونِ سخن   از نۓ کلک ہمہ شہد و شکر میبارم

افسوس! ہزار افسوس!! جو جوہر خداوند تعالیٰ نے مجھ میں ودیعت کیا ہے وہ تیری نظر میں حقیر ہے۔ کیا تیرا حسن فراواں محتاج اس بات کا ہے کہ تو عاشق کو ارتکاب گناہ پر مجبور کرے اور تب ریجھے۔ کیا مجھ سا طبیعت دار بندۂ خدا تیرے فیضان کا مستحق نہیں؟ ۵

گر من از باغ تو یک میوہ بچینم چہ شود   پیش پائے بچراغ تو بہ بینم چہ شود

یارب اندر کنفِ سایہ آں سرو بلند   گر من سوختہ یکدم بنشینم چہ شود

آخر اے خاتمِ جمشید سلیماں آثار   گر فتد عکس تو بر لعلِ نگینم چہ شود

اے سنگدل تجھے ذرا خیال نہیں کہ حُسن بھی ایک عارضی چیز ہے دولت بھی عارضی شئے ہے قابلِ قدر وہ دل ہے جو عشق رکھتا ہے ہائے افسوس! "کلکِ ما نیز زبانے و بیانے دارد"۔ لیکن کس کام کا۔ اگر تیرا دل تسخیر نہ کر سکے۔ تو آج نہیں کل کسی عیار کے ہاتھ بک جاویں گے۔ مانا کہ تیرا دل ہیرے کی کنی سا سخت ہے۔ تجھے بھی ایسا عیار ملیگا کہ قلعی جیسی ملائم زبان سے پھندے میں پھنسائیگا اور تو ع "وہ راز لب ہر خسیس و دوں باد" پر عمل نہ کر سکے گی۔ اے ملکۂ حسینانِ عالم۔ اب بھی مان جا ۵

بیا جاناں منور کن ز روئیت مجلس مارا — کہ در پیشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

میری مفلسی کا خیال نہ کر۔ ہماری وہی صورت ہے۔ ”در لباس فقر کار اہل دولت می کنم“
تیری فہرست میں جتنے امیدوار ہیں وہ عشق سے خالی ہیں۔ محض زبانی داخلے ہیں۔
نازنین عشق عشق عشق۔ یہ لفظ اکثر لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے معانی سے
واقف نہیں ہیں۔

در رہِ عشق نشد کس بیقین محرمِ راز — ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد

اے زبان آور شاعر! تو نے مجھے ابھی نہیں پہچانا۔ نہ تو نے میری طبیعت کا صحیح اندازہ
کیا۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ مجھ سی حسینہ تیرے ساتھ رابطہ عشق و عاشقی پیدا کرے
انتظار کرنا چاہیے شاید تیری قدردانی کا زمانہ بھی آجائے۔ سردست تو گمراہ ہے۔ جا اور
اپنی دھن میں مگن رہ۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ میری طبیعت لاابالی ہے۔ سلطان
وقت بھی مجھے پابہ زنجیر نہیں رکھ سکتا۔

میر صاحب۔ گویا امیدوار بودہ بد آنند کا مضمون ہے۔ لیجیے سلام۔

باب پنجم

شانتی باوا

جہاں قطرہ رہین بحر مواج نہیں۔ جہاں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کا محتاج نہیں۔ جہاں نفسی نفسی کا راج نہیں
جہاں جاہ و حشم زندگی کا معراج نہیں۔ جہاں کسی ملکی راجہ کا راج نہیں۔ جہاں دنیا کی
کوئی شئے ناموافق مزاج نہیں۔ وہ بھی کیا مقام ہوگا۔ واقعی بہشت وہی مقام ہونا
چاہیے۔ جہاں ”کسے را باکسے کارے نباشد“۔

واقعی وہ مقام جہاں شانتی باوا بیٹھے ہیں۔ ایسا ہی مقام ہے۔ ایک جنگل لق و دق میں

جسکے حدود کے تقرر کی کبھی کسی بادشاہ نے فکر نہ کی۔ایک چشمہ اُبل رہا ہے اور اُس کے پاس ایک مختصر سا باغیچہ لگا ہوا ہے۔جہاں کوئی کوئی درخت پھل کا ہے اور ایک دو کھیت ہرے بھرے لہلہا رہے ہیں۔اُسمیں ایک پھوس کا جھونپڑا پڑا ہے جسمیں صرف تین شخص بستے ہیں۔ایک شانتی باوا۔اور ایک اُن کے شاگرد آنند۔اور تیسرے داس ‌‌۔

شانتی باوا صرف صبح و شام اپنی کُٹیا سے نکلا کرتے تھے۔بقیہ وقت وہ سمادھی میں بسر کیا کرتے تھے۔واقعی وہی شخص آزاد ہے جس کے ضروریات کم ہیں۔اور جسکی زندگی نیچر کے احکام کے تابع ہے۔جتنی ضروریات کسی کے زیادہ اُسیقدر وہ شخص غلام ہوگا جس قدر ضروریات سادہ ہوں گے اُسی نسبت سے وہ شخص آزاد ہوگا ۔

شانتی باوا کی کل جائداد دو قلمی کتابیں ایک کچکول اور ایک آسن تھا۔باوا جی کے سر کے بال گندھے ہوئے جیسے ہند کے سب سادھوؤں کے ہوتے ہیں۔بدن پر بھبوت اور تن پر صرف ایک مختصر سا انگوچھا۔یہ تو کچھ عجیب بات نہ تھی بلکہ معمولی صورت ایک ہندو سادھو کی ایسی ہوتی ہے۔اُسمیں نرالا پن اسبات کا تھا کہ انکو محنت جسمانی سے عار نہ تھا۔خود وہ صبح و شام چشمہ سے پانی بھر کر کھیت اور باغ کو شاداب کیا کرتے تھے کچھ حصہ سال کا پھلوں پر گزرتا تھا اور باقی سال بھر جو غلہ اُن کھیتوں سے پیدا ہوتا تھا وہی اُنکی غذا تھی۔اور زیادہ کیفیت یہ تھی کہ اپنے دونوں شاگردوں سے کوئی کام نہ لیتے تھے۔نہ کسی قسم کی سیوا کراتے تھے۔تین سال تک ایک شاگرد انکی خدمت میں رہتا۔بعدہٗ اُسے رخصت کر دیتے اور ہدایت کر دیتے کہ وہ اور شاگرد بھیجدے کسی شاگرد کو یہ حکم نہ تھا کہ وہ دنیا کے دھندے چھوڑے بلکہ اُنہوں نے خود گرہست آشرم ختم کرکے اس طرز زندگی کیجانب رجوع کیا تھا۔

آنند ایک نوجوان طالب العلم تھا اور داس ایک خدمتگار آنند کے ہمراہ آیا تھا۔آنند

پڑھا لکھا اور داس اَن پڑھ لیکن جویائے علم تھا۔ آنند کی خدمت کرتا۔ اوسپر لفظ جو شانتی باوا کہتے یاد رکھتا اور نوک زبان کر لیتا تھا۔ حسب معمول کھیتی اور باغ کی شادابی کے بعد باواجی صبح وشام آنند اور داس کو اُپدیش دیا کرتے تھے۔ اور یہ اجازت تھی کہ وہ دونوں جو سوال چاہیں کریں۔ اکثر اوقات اُن میں مباحثہ بھی ہو جاتا تھا۔ اپدیش مختصر ہوتا تھا۔ حوالہ یا سند کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ ایک اشلوک اُن کتابوں میں سے پڑھکر باواجی اپدیش دیا کرتے تھے۔ اب ذرا اُپدیش کا نمونہ سُنیئے ؂

آنند! آج کا اُپدیش سرشٹی پر ہوگا۔ یہ اُصول دھیان میں رکھو۔ اور جب تم اپنے گھر واپس جاؤ گے۔ اِن پر غور کرنا۔ تلاش کرنا۔ تحقیقات سے صحیح پائے جاوینگے

یہ صحیح نہیں کہ انسان صفحۂ ہستی پر آٹھ ہزار برس سے آیا۔ اِنسان کی پیدایش یا موجودہ شکل میں آنے کا سن وسال کسی کو معلوم نہیں۔ صرف ایک بات سے اندازہ کر لو ۱۸ ہزار کے چکر کے بعد سورج گرہن اُسی مقام۔ اُسیوقت اور اُتنی ہی دیر لگتا ہے۔ انسان کتنی صدیاں تجربے میں صرف کرے تو ایک سورج گرہن کا قاعدہ دریافت ہو۔ اِس سے اندازہ کر لو آیا سرشٹی سرچنے کے پہلے یہ دھرتی یعنی زمین کب پیدا ہوئی۔ اِس کا بھی پتہ نہیں۔ کروڑوں۔ اربوں برس کا زمانہ یعنی جگ چاہیئے۔ جیسی جیسی تحقیقات زمانہ حال میں بڑھتی جاتی ہے قدامت کرۂ ارض بڑھتی جاتی ہے۔ انجام کار تھک کر یہ کہنا لازم آوے گا کہ لاانتہا وقت سے یہ زمین موجود اور اسپر انسان کی آبادی ہے۔ آخر اِس بحث سے کیا حاصل کہ لاکھ برس سے آبادی ہوئی یا پچاس لاکھ برس سے ؂

پھر مسئلہ کہ آیا اِس کا سرچنے کا والا کون تھا اور کس طرح سے ظہور کائنات ہوا۔ اِسکی تحقیقات میں بھی صدیاں صرف ہوگئیں۔ ہندیوں۔ مصریوں۔ کلدانیوں۔ شامیوں ساسانیوں نے اپنے اپنے فکر اور شاعرانہ خیال سے ابتدائے آفرنیش بیان کی ہے حقیقت یہ ہے کہ کسیکو معلوم نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔ قیاس ہی قیاس دوڑائے ہوئے

ہیں بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اسقدر عظیم الشان کائنات بدون کسی قاعدے اور قانون کے چل نہیں سکتی۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ قاعدہ اور قانون بنانیوالا کون ہے یہ سوال ہی فضول ہے۔ بنانا کیا معنی۔ جو قاعدہ بنایا جاتا ہے وہ تعمیل کے لیئے بنایا جاتا ہے جسوقت ہم بیان کریں کہ آگ میں پانی ڈالدیجیئے آگ بجھ جائے گی۔ اِسکے معنی صرف یہ ہیں کہ یہ معاملہ اسطرح سے ہوتا ہے گویا ایک مشاہدہ کا اظہار ہے اور بس۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ انسانی ادراک سے باہر ہے +

آنند۔ ایشور کی بابت تو سب لوگ یقین کرتے ہیں کہ وہ بانی ہے +

باواجی۔ ہاں یقین اسطرح سے کرتے ہیں کہ یقین کرتے ہیں کہ ہمکو یقین ہے۔ ورنہ شبہہ سے بڑھکر کسیکا مستحکم یقین نہیں۔ البتہ جو انسان سوچ نہیں سکتا ہے۔ اُسکو جس طرح سے یقین دلادو وہ اس یقین میں مگن رہتا ہے لیکن عمل وہ بھی اس طریق سے کرتا ہے کہ فی الواقع اُسکو یقین واثق نہیں۔ اور یقین کس شئے پر کیجیئے +

وہ سب جگہ ہے اور کہیں محدود نہیں۔ وہ مانند انسان کے جذبات رکھتا ہے یا اُن جذبات سے معرا ہے۔ وہ ہر شئے میں موجود ہے یا ہر مخلوق سے جُدا ہے۔ وہ اوتار بنتا ہے یا اولاد رکھتا ہے۔ جسکو رحم و انصاف کی مطابقت کیلئے قربان کرتا ہے آیا وہ جابر ہے اور رحیم بھی ہے اور منصف بھی ہے۔ اُسکی میزان عدل کیا ہے اور کس طریق سے انصاف کیا جاتا ہے کائنات کی تکلیفات اور آسایش اُسی سے ہی ابتدا پاتی ہیں یا انسان خود مختار ذمہ دار ہے۔ حضرت انسان کے ساتھ اور جملہ دیگر مخلوق کے ساتھ اُسکا برتاؤ کس معیار پر ہے ؟

ہر ایک انسان کے لیئے چند فرائض ہیں جو اُنکو پورا کرتے ہیں۔ ہر ایک انسان اپنا فرض ادا کرکے رخصت ہوجاتا ہے۔ بہیئت مجموعی انسان ترقی کرتا جاتا ہے۔ اور روز بروز غلط خیال رفع ہوتے جاتے ہیں اور اسی کشمکش میں کئی مرتبہ غلط خیال پھر عود کرتے اور زور پلٹتے اور پھر مغلوب

ریویوز
المرأة المسلمہ

کچھ عرصہ ہوا مصر میں دو کتابیں شائع ہوئی تھیں جن کا منشا تھا کہ عورتوں کو مشرقی ممالک میں وہی آزادی دیدی جائے جو انہیں بلادِ مغرب میں حاصل ہے۔ یہ دونوں کتابیں قاسم امین بک نے تصنیف کیں پہلی کا نام تحریر المرأة یعنی "عورت کو آزاد کرنا" اور دوسری کا نام المرأة الجدید یا "نئی عورت" یعنی نئے زمانے کی عورت رکھا۔ لیکن چونکہ مصر میں بھی ہندوستان کی طرح ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو باوجود مغربی تعلیم کے اثرات کے پردہ کے حامی ہیں اور نہیں چاہتے کہ انکی مستورات نسوانِ فرنگ کیطرح بے پردہ پھریں۔ اِن دونوں کتابوں کے جواب میں متعدد رسالے لکھے گئے۔ اِن میں سے ایک رسالہ "المرأة المسلمہ" یعنی "مسلمان عورت" نامی حال میں اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ چونکہ "تحریر المرأة" پہلے ترجمہ ہوکر ہندوستان میں شائع ہوچکا ہے اسلیئے محض تقاضائے انصاف تھا کہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملک کے روبرو پیش کیا جائے۔ یہ کام وکیل ایجنسی امرتسر نے انجام دیا ہے۔ اور اِس دلچسپ کتاب کا اُردو میں بامحاورہ ترجمہ چھپوایا ہے۔ مترجم مولوی ابوالکلام صاحب آزاد دہلوی ہیں جنکے نام سے اخبارات اور رسالوں کے دیکھنے والے خوب واقف ہیں۔ اِس کتاب میں اِسکے قابل مصنف فرید وجدی نے دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ عورت کا فرض خاص قدرت نے یہ بنایا ہے کہ اِسکے ذریعے "نوعِ انسانی کی تکثیر اور اُسکی حفاظت و تربیت ہو" اور اِس فرض کو اچھی طرح ادا کرنیکے لیئے اِسے اُن اُمور سے اجتناب کرنا چاہیئے جو اسکی توجہ اِس فرض سے ہٹا کر اسے حصولِ معاش کی ناگوار کشمکش میں مبتلا کریں۔ تمام طبی دلائل جو پردہ کے خلاف پیش کیجاتی ہیں اُن کا جواب طبی دلائل سے اور جو استناد اقوال علمائے یورپ سے کیا جاتا ہے اُسکا جواب اقوال علمائے یورپ سے دیا گیا ہے۔ ہر شخص کو اِس معرکۃ الآرا مسئلہ پر کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اِن دونوں کتابوں کا بہ غور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ فرید وجدی کی کتاب دیکھکر فقط ایک مایوسی ہمیں ہوئی اور وہ یہ کہ مصر کے آجکل کے مصنفین بھی ہمارے ہاں کے اکثر لکھنے والوں کی طرح سطحی علم پر قناعت کرتے ہیں چنانچہ اکثر معلومات جنپر فرید وجدی نے اپنی بحث کی بنیاد رکھی ہے رسالہ ریویو آف ریویوز کی جلدوں سے اخذ کی گئی ہیں اور جا بجا اِس رسالہ کا اِسطرح حوالہ دیا ہے جیسے کوئی بڑی سند یا حجت ہو *

باب الحیات

حضرت بہاء اللہ اور حضرت باب کے حالات ایک ایرانی فاضل نے فارسی میں لکھے ہیں۔ اس رسالہ کا نام "مقالۂ سیاح" رکھا ہے۔ انجمن بہائیہ رنگون نے اسکا بامحاورہ اردو ترجمہ چھپوایا ہے اور اس ترجمہ کا نام "باب الحیات" رکھا ہے۔ یہ رسالہ لاہور میں زیر نگرانی جناب میرزا محمود صاحب ایرانی طبع ہوا ہے ۔

چند مہینے ہوئے جب ہم نے فرقہ بہائیہ کے مختصر حالات ان اوراق میں شائع کیے تھے۔ اور وہ حالات خاص دلچسپی سے پڑھے گئے تھے۔ رسالہ "باب الحیات" اُن سب لوگوں کے لیئے جو فرقہ بہائیہ کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں یقیناً دلچسپ ہوگا۔ مگر ان کے سوا عام شائقین کے لیئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ کیونکہ اسمیں ایسی بیش بہا نصیحتیں اور ہدایتیں درج ہیں جنسے ہر شخص بلا لحاظ ملت و مذہب فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ یہ رسالہ ۲۱۸ صفحہ کا ہے اور اسکی قیمت ۱۰ ر ہے اور انارکلی لاہور میں مرزا محمود صاحب ایرانی سے مل سکتا ہے ۔

مرزا صاحب موصوف نے ہمیں اجازت دی ہے کہ اسکی مفید نصائح کا ایک انتخاب کسیوقت ناظرین "مخزن" کی خدمت میں پیش کریں۔ اور ہم عنقریب اس اجازت سے فائدہ اُٹھائیں گے ۔

کرشن اوتار

خواجہ کمال الدین صاحب بی اے۔ وکیل چیف کورٹ پنجاب (لاہور) نے جو جناب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مرحوم و مغفور کے مریدوں میں درجہ امتیاز رکھتے ہیں ایک رسالہ بنام "کرشن اوتار" لکھکر شائع کیا اور مفت تقسیم کیا ہے۔ جو "پیام صلح"

مرزا صاحب نے اپنی وفات سے پیشتر لکھا تھا وہ اس سے پہلے چھپ کر تقسیم ہو چکا ہے یہ رسالہ گویا اسی سلسلہ کے جاری رکھنے کی کوشش ہے۔ مرزا صاحب مرحوم نے قرآن مجید کی اُس آیت سے استدلال کر کے جسمیں یہ لکھا ہے کہ دنیا میں "کوئی ایسی قوم نہیں جسمیں کوئی نبی نہیں آیا" یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ سری کرشن جی مہاراج کو ہندوستان کا نبی مانتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے بھی یہ رسالہ اسی عقیدہ پر مبنی کیا ہے۔ اور کرشن جی مہاراج کے ایک قول کی تشریح اسمیں کی ہے جسکا ترجمہ فیضی نے بالفاظ ذیل کیا ہے۔

چو بنیاد دین است گرد و بسے نمایم خود را بہ شکل کسے

یعنی جب دنیا میں اخلاقی روشنی مفقود ہو جاتی ہے تو رحمتِ خدا "اپنے نور کا مظہر کسی مقدس انسان کو بنایا کرتی ہے اور وہ نور دنیا میں آکر ظلمت اور اندھیرے کو دور کر دیا کرتا ہے"۔ آگے چلکر خواجہ صاحب نے اس سے استدلال کیا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ مذہبی حالت پھر ایک کرشن کے پیدا ہونے کی متقاضی تھی اور اسلیئے مرزا صاحب پیدا ہوئے +

یہ تو محتاج بیان نہیں کہ انکے اس عقیدہ سے بہت سے ہندو اور بہت سے مسلمان اختلاف کرینگے۔ لیکن وہ جس حیثیت سے لکھ رہے ہیں۔ اس حیثیت سے اُن کے لیئے اس عقیدہ کا اظہار بالکل ضروری تھا۔ بہر حال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے یہ رسالہ نیک نیتی سے لکھا ہے۔ اور حتی الوسع اسمیں ایسے الفاظ اور ایسی عبارات سے کام لیا ہے جو بجائے کسی کی دل آزاری کے تالیفِ قلوب کا باعث ہوں۔ اور اس کوشش کے لیئے اور تبلیغ مذہب میں سخت کلامی کی بجائے محبت اور ہمدردی سے کام لینے پر وہ مستحق مبارکباد ہیں +

جو صاحب اس رسالہ کو دیکھنا چاہیں وہ خواجہ صاحب کو دو پیسے کا ٹکٹ بھیجدیں اُنکے پاس یہ رسالہ مع رسالہ پیامِ صلح پہنچ جائے گا +

دھوپ اور چاندنی

آیا خطِ استوا پہ خورشید — شمعِ عالم ہے قابلِ دید
لیکن ایسا ہے نور اُس کا — آنکھیں ہوتی ہیں جس سے خیرا
با شان و شکوہ جلوہ گستر — ہے تختِ طلا پہ شاہِ خاور
وہ رعب جلال وہ غضب ہے — دیکھیں۔ اتنی مجال کب ہے
غائب ہیں ستارہ ہائے افلاک — چہرہ ہے شاہ کا غضبناک
آئیں نہ حضور میں وہ بیباک — اجرامِ فلک نہ جل کے ہوں خاک
شانِ قدرت ظہورِ خورشید — دریائے طلا ہے نورِ خورشید
مینار پہ دیکھو دھوپ پھیلی — یا ہے سونے کی اُس پہ قلعی
ہر چیز کا حُسن ہے دوبالا — کیسا یہ چمک رہا ہے ذرّا
ہے روئے صبح کا عجب رنگ — کیوں عقل نہ دیکھکر رہے دنگ
گورا گورا ہے رنگ اُس کا — اُس پر سُرخی ہے اور طرا
پڑتی اُس پر ہے دھوپ دیکھو — دیکھو چہرے کا روپ دیکھو
ظاہر نورِ سحر شفق میں — مہرِ گردوں کی ہیں شعاعیں
صانع کی نئی ہے یہ بھی صنعت — حیرت افزا ہے حُسن طلعت

گر غور کرو قمر کو دیکھو — اُسمیں شکل بشر کو دیکھو
پرتو افشاں یہیں قمر ہے — ہیرا ہے آب یہ مگر ہے
چہرہ اُترا ہوا ہے اُس کا — میلا میلا سفید کپڑا
غالب سورج کی روشنی پر — مہتاب کی روشنی دبی ہر
آیا مغرب میں شاہ خاور — اوڑھی گردوں نے شب کی چادر

چھائی عالم پہ ظلمتِ شب — عالم کچھ اور ہو گیا اب

نورِ خورشید ہے ندارد — دریا سونے کا بحرِ اسود

اوڑھا شب نے سیاہ کمل — کالا کالا ہو جیسے بادل

دیکھو دیکھو اُفق میں کیا ہے — دیکھو وہ کیسا نکل رہا ہے

نکلا رُک رُک کے بدرِ کامل — روشن جس سے ہے شب کی منزل

نکلے اختر چمک چمک کر — غالب نورِ قمر ہے اُن پر

شب کا فرماں روا قمر ہے — تختِ سیمیں پہ جلوہ گر ہے

دیکھو عالم یہ چاندنی کا — لہریں لیتا ہے کوئی دریا

کالا کالا لباس شب تھا — سایہ اُس نے سفید پہنا

گویا شب بھی کوئی دلہن ہے — پُر تاب سفید پیرہن ہے

پھولوں پر قطرہ ہائے شبنم — پڑتا عکسِ ماہ ہر دم

کیسے قدرت کے ہیں یہ موتی — قیمت اُن کی ادا نہ ہوگی

گرمی نہیں معتدل ہے سردی — ہلکی رفتار ہے ہوا کی

ٹھنڈی ہے روشنی مہتاب — ہالہ دریا میں جیسے گرداب

یہ نور خواص میں ہے کافور — کم ہے اسوقت سوزِ ناسور

حیرت افزا ہے سردی شب — جو آہ تھی گرم سرد ہے اب

ہو گرم کہ سرد آہ تو ہے — غم سے اسے رسم و راہ تو ہے

فرحت جتنی ہوئی ہے حاصل — ہے باعثِ اضطرابِ دل

آئی ہے جوش پر تمنا ق دل کا اس وقت ہے تقاضا

بیہوش ہیں جلد آئے معشوق — صورت اپنی دکھائے معشوق

یہ شب کا سماں یہ ماہ کامل — پھر بھی ہوتا نہیں ہے خوش دل

بیکار ہے بے مزا ہے بالکل — ہو جائے چراغ ماہ کا گل

جلدی یہ رات۔ روز ہو جائے — سردی جتنی ہی سوز ہو جائے

بے یار یہ چاندنی ہے ظلمت — ہمکو اس کی نہیں ضرورت

میری اِسمتھ سے کوئی کہدے — عالم یہ چاندنی کا دیکھے

میری۔ بیشک سڑک پہ ہوگی — دل سے مشتاق چاندنی کی

اُسکے چہرے پہ نور مہتاب — جیسے ہیرے پہ خوب ہو آب

افسوس مری نظر نہ پہنچے — لیکن مہتاب رُخ پہ چمکے

تجھ سے مہتاب بدگماں ہوں — بیشک تیرا عدوئے جاں ہیں

تو بھی دشمن ہے عاشقوں کا — کرتا ہے راز اُن کا افشا

شب کو چھپ چھپ کے ملنے والے — شاکی ہوتے ہیں ہم سے تیرے

تیری وہ روشنی بلا ہے — اُن کو ہر شخص بھانپتا ہے

عاشق معشوق جب بہم ہوں — اُن پر تیرے نہ یہ ستم ہوں

اُلفت بدنام ہو نہ جائے — عاشق ناکام ہو نہ جائے

نور مہتاب بے خطا ہے — عشق مخفی کی یہ سزا ہے

دامن قدرت کا گرد سے پاک — پڑتی ہے چاند پر کہیں خاک"

شمع قدرت کے دو ہیں پرتو — دیکھو تم دھوپ۔ چاندنی کو

پہلی ہے گرم دوسری سرد — اپنے اپنے اثر میں ہیں فرد

گر دھوپ نہ گرم ہو تو غلہ — کھیتوں میں ہو کبھی نہ پختہ

بیکار یہ چاندنی نہیں ہے — با کار ہر ایک قدرتی شے

سمجھو قدرت کے ہیں یہ اسرار — لیکن اسکو ہے عقل درکار

محمد ارتضیٰ علی شرر

ہلالِ عید

دیکھو! دیکھو!! وہ میں نے دیکھ لیا قُلّۂ کوہ سے ذرا اونچا!
چھپ گیا چھپ گیا کہیں دیکھو! پھر نظر آئے گا وہیں دیکھو!
وہ جو ہے سامنے شجر دیکھو! اس سے اوپر نظر اُٹھا دیکھو
اے لو! اے لو! وہیں نظر آیا
مژدہ اے دوستو! نظر آیا

مرحبا اے ہلالِ شامِ سعید لیکے آیا ہے تو بشارتِ عید
مخبرِ صبحِ عیش و عشرتِ عید! تجھ سے وابستہ ہے سعادتِ عید
مژدۂ عید ایک شب پہلے لائے گا۔ جانتے تھے سب پہلے
پر یہ تھی انتظار کی صورت کہ نہ دیکھی قرار کی صورت!
تھا تری جستجو میں پیکِ نظر دشتِ چرخِ بریں میں محوِ سفر
کہ یکایک کرم کیا تُو نے اپنا چہرہ دکھا دیا تُو نے!
تُو کفیلِ نشاطِ عالم ہے باعثِ انبساطِ عالم ہے
تو عجب شے ہے میکشوں کیلئے کشتیٔ مے ہے میکشوں کیلئے
دور سے یہ ترا اشارہ ہے
اوج پر عیش کا ستارہ ہے

واہ اے شاہدِ کماں ابرو! کس ادا سے تنا ہوا ہے تو
خود نمائی بھی ہے۔ ادا بھی ہے! اس پہ پھر کاہشِ حیا بھی ہے!
یہ ترا بانک پن۔ یہ رعنائی بزمِ بالا میں خلوت آرائی
ہے سزاوار تجکو نازِ غرور کھینچ بے شک تو اپنے آپکو دور

سارا عالم ہے تیرا شیدائی — سب کو دیکھا ترا تماشائی

تھی زمانے کو جستجو تیری — محفلوں میں تھی گفتگو تیری

چشم بد دُور کیا نزاکت ہے

تجھپہ بارِ نظر بھی آفت ہے

یُوں عیاں ہو شفق کے دامن میں — جیسے مہرو ہو کوئی گلشن میں

یا کوئی جیسے خنجرِ نازک — زینتِ دستِ دلبرِ نازک

خونِ عاشق سے سُرخرو ہو کر — ناز کرتا ہوا اپنی بُرِش پر

یا کوئی جیسے نقرئی کشتی — قُلزمِ سُرخ پر ہو تیر رہی

اِک جہاں اُس کا ہو تماشائی — کرتی جائے وہ بحر پیمائی

رفتہ رفتہ نظر سے غائب ہو — تکتے رہ جائیں لوگ سب اُسکو

لے لو سچ مچ وہ صورتِ زورق

ہو گیا گم میانِ شام و شفق

بیگم شیخ [illegible]

نوائے زنداں

تمام دردوں سے چھُٹ گئے ہم بھلا ہو اس دردِ بیدلی کا
کھُلا ہے عقدہ یہ مدتوں میں ہمارے دل کی بلاکشی کا

لگاؤ ہو یا کہ لاگ ہو کچھ مزا ہے دونوں کی شورشوں میں
غرض کہ دل میں ہو درد پیدا۔ یہ ایک منصب ہے آدمی کا

جنابِ زاہد سے کوئی کہدے کہ یاد رکھیے یہ پیر و مرشد
رماؤ من میں کسی کی دھُونی کہ گُر یہی ہے خدارسی کا

نہ برق بنکر کوئی چمکتا نہ طور جلتا نہ بھید کھُلتے
کھُلی ہیں آنکھیں سُنا ہے جب سے فسانہ موسیٰ کی بیخودی کا
رُلائیں مجکو نہ دوست میرے بیانِ مرگِ عدو سُنا کر
کہ دشمنوں ہی کی دشمنی سے مزا تھا کچھ اُن کی دوستی کا
اُدھر سے آؤ اِدھر سے چلدو۔ نہ ساتھ لاؤ نہ لیکے جاؤ
سمجھ میں آتا نہیں ہے آساں عجب معمّا ہے زندگی کا
صدائے پیرِ مُغاں عجب تھی کہ جس سے اُٹھی جہاں میں گونجی
جو ڈھونڈھتے تھے مئے مصفّا عجیب عالم تھا اُنکے جی کا
شرابِ توحیدِ حق نے عاقل بنا دیا دم میں غافلوں کو
اسی نے ٹھنڈا کیا کلیجہ طپش پرستانِ پارسی کا
نہ بادہ خواروں کو چھیڑ واعظ کہ اُنکو پروا نہیں کسی کی
وہ خوش ہیں پیرِ مُغاں سے اپنے سکھایا گر جسنے راستی کا
کبھی مذمت ہے دختِ رز کی کبھی ثناگو ہیں میکدہ کے
عجب طریقہ ہے میگُساروں سے شیخ صاحب کی دل لگی کا
خُمِ مُغاں[1] میں مئے معارف اُسی طرح سے چھلک رہی ہے
مگر یہ کھلتا نہیں کہ کیونکر دماغ بگڑا ہے مولوی کا
خلوص کی ہے بڑی ضرورت جو اِس سے غافل ہوں اُنسے کہدو
کھُلیگا آخر کو بھید اک دن لوں کے شوقِ نمائشی کا
حمید تعلیم و بندگی کو بناؤ ہر دم شعار اپنا
زباں پہ لانا نہ بھول کر بھی گلا کبھی اُن کی بے رخی کا

قاضی حمید الدین حمید

[1] مراد از قرآن پاک ۱۲

شکایتِ زمانہ

۱

نالہ و آہ و فغاں میں کچھ نمایاں ہو گئیں — دل میں کیا کیا حسرتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
آرزوئیں تھیں جو زیبِ خانہ آبادِ دل — یاسِ حرماں کی وہ پیشانی پر افشاں ہو گئیں
جو پڑا عقدہ گرہ بندِ قبا کی بن گیا — گتھیاں جو کھل گئیں زلفِ پریشاں ہو گئیں
تر نہ دامن ہوتا گر اشکوں میں ہوتا سوزِ دل — کیا ہوا اگر اپنی آنکھیں سیلِ طوفاں ہو گئیں
دل بتوں کا موم کرتیں گر خودی کو پھونکتیں — کیا ہوئیں گر اپنی آہیں آتش افشاں ہو گئیں
جو نہ کرنا تھا کیا۔ کرنا جو تھا وہ رہ گیا — مشکلیں اسطرح۔ ہاں سب اپنی آساں ہو گئیں

لالہ زارِ داغِ حرماں بن گیا گلزارِ دل
جاں بلب ہے اے مسیحا اب ترا بیمار دل

۲

باغ میں ہر اک گل و بلبل کی کیا بگڑی ہوئی — آجکل ہے سارے گلشن کی ہوا بگڑی ہوئی
چھوٹے منہ سے بات کرتی ہے بڑی۔ ہر اک کلی — اور مرغانِ چمن کی ہے نوا بگڑی ہوئی
آسماں پر سر ہے فوارے کا کم ظرفی سے گر — آبشاروں کی ہے تننے کی ادا بگڑی ہوئی
ہے زباں سوسن کی سنبل کی لٹوں سے بھی دراز — گل سے بلبل اور بو سے ہے صبا بگڑی ہوئی
نالۂ بلبل میں ہے شکوے کی بو ہائے نیاز — اسقدر ہے طرزِ اربابِ وفا بگڑی ہوئی
اسقدر ہے سرو کیوں اینٹھا۔ کھچا۔ اکڑا ہوا — اسکی بھی ہے قمریوں سے آج کیا بگڑی ہوئی

گل تو گل۔ لینے لگے ہیں نوک کی اب خار تک
سرکشی پر تل رہا ہے سبزۂ گلزار تک

۳

اسطرح بگڑا ہوا ہو جب یہاں رنگِ زمن — تو نہ پامالِ خزاں ہو کسطرح سے یہ چمن
ہو گئے ہیں خون سمین و سمن کے اب سفید — بن گئے ہیں سبزہ ساں بیگانہ سبزانِ چمن
سرو کی ہے راستی بھی سرکشی سے ہم ردیف — سرنگونی میں ہے فوارے کی بیجا بانکپن

جائے ہمدردی ہی خارِ رشک دلمیں پھول کے ... اسمیں شکوی کی بھرن ہی ہی جو بلبل نغمہ زن
کسطرح پودے چڑھیں پروان اس گلشن کے جب ... خام پارہ غنچے ہوں بادِ صبا پر خندہ زن

کیسے ہو بادِ خزاں سے اس چمن کو ایمنی
ہو صبا سے جبکہ جنگ اور باغباں سے دشمنی

ہی ہجومِ یاس کی کالی گھٹا چھائی ہوئی ۴ بیدلی کی اک بلا ہے ہند پر آئی ہوئی
ہی جو دل۔ رسمِ وفا سے ہی وہ برگشتہ ہوا ... جو طبیعت ہی۔ وہ الفت سے ہے اکتائی ہوئی
بوالہوس کے دل سے اٹھتی ہی قناعت جسطرح ... اسطرح دل سے ہوا اپنے شکیبائی ہوئی
ہی جو لب۔ اسکو جنوں ہی شکوہ و فریاد کا ... جو زباں ہی۔ وہ شکایت کی ہی سودائی ہوئی
جسکو دیکھو پیچ کھاتا اور ہے الجھا ہوا ... آجکل ہے ہم پہ سختی کی گرہ آئی ہوئی
منزلِ مقصود کے لگ بھگ بھی ہم پہنچے نہیں ... گو غلط راہی سے برسوں گام فرسائی ہوئی

جادۂ مہر و وفا سے لوگ ہیں یکسر پھرے
دل پھرا۔ آنکھیں پھریں۔ سر پھر گئے۔ تیور پھرے

یاری اندر کس نمی بینیم یاراں را چہ شد ۵ دوستی کے آخر آمد دوستداراں را چہ شد
آبِ حیواں تیرہ گوں شد خضرِ فرخ پے کجاست ... خوں چکید از شاخِ گل بادِ بہاراں را چہ شد
زہرہ سازِ خود نمیگیرد مگر عودش بسوخت ... کس ندارد شوقِ مستی میگساراں را چہ شد
گوئے توفیق و محبت درمیاں افگندہ اند ... کس بمیداں رو نمی آرد سواراں را چہ شد
کس نمیگوید کہ یارے داشت حق دوستی ... حق شناساں را چہ حال افتاد یاراں را چہ شد
حافظ اسرارِ الٰہی کس نمیداند خموش ... از کہ میپرسی کہ دورِ روزگاراں را چہ شد

سیدھے چلتے چلتے کیوں یہ الٹی رہ پر لگ گئی
شامت آئی چیونٹی کی اسکو جب پر لگ گئی

ہی شکایت۔ "اپنی قدر اپنے وطن میں کیوں نہیں" ۶ دخل بلبل کا بھلے پھولے چمن میں کیوں نہیں

بزم آرا کسلیئے اغیار ہیں ہر بزم میں ۔ انجمن والوں کا حصہ انجمن میں کیوں نہیں
کیوں نہیں وہ مانتے۔ کہتے ہیں جو معقول بات ۔ دلپذیری کا اثر اپنے سخن میں کیوں نہیں
دل محبوں کا وطن کے رنج سے صد چاک ہے ۔ اُسکی جا دلبر کی زلف پُرشکن میں کیوں نہیں
راہ میں حُبِّ وطن کی توتیا پس کر ہوئے ۔ اپنی جا پھر اُسکی چشم پُرفتن میں کیوں نہیں

کب تلک بیٹھے رہینگے وعدۂ فردا پہ ہم
اب تو ہے یہ ہاتھ اور دامن ہے تیرا اے صنم"

ہے گلہ "میٹھی نظر کیوں اُسکے چتون میں نہیں ۔ ۷ ۔ کیوں نگاہِ مہر اُسکی چشم پُرفن میں نہیں
روتے روتے ہوگئیں آنکھیں عزیزوں کی سفید ۔ گوہرِ مقصود اب تک اپنے دامن میں نہیں
گرچہ نالوں نے ہلا ڈالے زمین و آسماں ۔ نام تک کو بھی تو لرزہ اسکی چلمن میں نہیں
نالۂ دل کیوں نہیں ہوتے رسا؟ کیا بات ہے؟ ۔ کیوں اثر فریادیوں کے آہ و شیون میں نہیں
بن گیا کیوں اُسکا دل پتھر ہمارے واسطے ۔ جذب کیوں اِس اپنی آہِ شعلہ افگن میں نہیں

اسلیئے اب اعتدال و ضبط ہے بے فائدہ
ایسے سنگیں دل سے رکھنا ربط ہے بے فائدہ"

لیکن اِن شکووں سے کہیئے آپ چل پائینگے کیا ۔ ۸ ۔ توڑ کر رسمِ وفا عاشق کہلائیں گے کیا
ہم نے یہ مانا۔ وطن پر ہو دل و جاں سے نثار ۔ کام اُسکا اِس طرح کچھ کر کے دکھلائینگے کیا
بے نیازی بے وفائی یہ نہیں عاشق کی شان ۔ وصف یہ معشوق کے عاشق پہ پھب جائینگے کیا
اِس نصیحت کا یہ دیتے ہیں جواب اہلِ وطن ۔ "دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
"بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کبتلک ۔ ہم کہینگے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
"حضرتِ ناصح گر آئیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ ۔ کوئی ہمکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
"گر کیا ناصح نے ہمکو قید۔ اچھا یوں سہی ۔ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا
"خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ۔ ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا"

"دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا"
"دیکھکر طرزِ سلوکِ اہلِ دنیا جل گیا"

ہم نہیں کہتے حکومت کا ہی جو اسوقت ڈھنگ ۹ مہربانی اور محبت کا ہے یکسر اُسمیں رنگ
کون کہتا ہے کہ وہ تکمیل کا اوتار ہے کون کہتا ہے نہیں ہے داغدار اس مہ کا انگ
کون کہتا ہے نہیں اس پھول کے پہلو میں خار بے خمار و سکر ہی یہ کاسۂ خمرِ فرنگ
بے شبہہ تاریک پہلو بھی ہے اس تصویر کا ماننے میں اسکے کیا ہوگا کسیکو بھی درنگ
سب یہ مانا، پر یہاں تو نیل کا بگڑے ہے ماٹھ پڑگئی ہے ہر کنوئیں میں یاں۔ اس آلو کی بھنگ
آدمی کو نیک و بد اپنا پرکھنا چاہیئے
امتیازِ حاکم و محکوم رکھنا چاہیئے

سر پہ رکھے تاجِ ادب اور شورِ بیجا چھوڑ دے ۱۰ نفرت و بغض و حسد سے کیا بنے گا۔ چھوڑ دے
جلوہ فرما ہے اگر دلمیں ترے حبِّ وطن کھو خودی کو۔ اور یہ اپنا پرایا چھوڑ دے
ہے وطن کو دیکھنا اوجِ ترقی پر اگر جلد بازی اور مایوسی کا پیچھا چھوڑ دے
بارگاہِ شہ سے مُنہ مانگی ملے تجکو مراد گر تو یہ تخویف و بدامنی کا ڈھرا چھوڑ دے
تجکو آنکھوں پر بٹھائیں دوست دشمن سب کے سب رنگ گر تو اپنی بیر کج بحثیوں کا چھوڑ دے
یہ تو سچ ہے۔ دودھ ماں بھی مانگے بن دیتی نہیں
پر اکڑ کر باپ سے بیٹے نے کچھ پایا کہیں ؟

تو وطن کو اے خدا توفیقِ نیکو کار دے ۱۱ دل سے خود غرضی مٹا۔ ہر کام میں ایثار دے
ہے غلط کاری کا کھٹکا تیز رفتاری کے ساتھ یہ صدا اب چاہیئے ہر قافلہ سالار دے
ہیں جو سوشل گتھیاں سلجھائیں انکو ملکے سب مُصلحانِ قوم کو حق جرأتِ کردار دے
جہلِ نسواں اور تہِ بیوگانِ دل فگار اسپہ بھی اے کاش دل ہر ایک خوش اطوار دے
اقتصادی صنعتی تعلیمی حالت پر ہو غور جسکی سرسبزی وطن کو گرمیٔ بازار دے

دُکھ میں دیکھیں بھلائی کو تو آپ ہو جائیں دکھی — جذبِ ہمدردی کا یہ اے داورِ داد ارے

ذات میں اکثر کی ہیں اوصاف ہوں گر جا گزیں

تو حقوں کا شاہ سے ملنا کوئی مشکل نہیں

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

گلِ فردوس

خوشا! بہارِ بہشت خوشا! گلِ فردوس — پسند ہے مجھے تیری ادا گلِ فردوس

شمیم ناز سے تیری۔ خدا وہ دن تو کرے — مشامِ جاں ہو معطّر مرا گلِ فردوس

زمیں پہ لالۂ خونیں کفن۔ فلک پہ شفق — ترے شہید کا ہیں خونبہا گلِ فردوس

ترے سوا جو کسی اور پھول پر چہکوں — نہیں میں بلبلِ ہرزہ سرا گلِ فردوس

ریاضِ دہر کے پھولوں سے دل لگاؤں کیا — نہ ان میں رنگ۔ نہ بوئے وفا گلِ فردوس

ترے فراق میں خونابۂ جگر ہے مجھے — بہارِ لالۂ گلگوں قبا گلِ فردوس

فریب خوردۂ ہستی ہوں میں۔ جو تو دیکھے — دکھاؤں داغِ دلِ مبتلا گلِ فردوس

وہ سرخ سرخ تری پتیاں۔ وہ حسن قبول — نظر فریب وہ تیری فضا گلِ فردوس

وہ لطفِ صحبتِ مرغانِ قدس و لویلا! — وہ جوشِ نغمۂ رنگیں نوا گلِ فردوس

ہوئی نہ اب کے برس بھی بہارِ خلد نصیب — قفس میں لیکے نہ آئی صبا گلِ فردوس

خوشا! وہ دن کہ نشیمن بہشت میں تھا مرا — کنار جو تھا ترنم سرا گلِ فردوس

خوشا! وہ دن کہ پلاتی تھی بادۂ خلد مجھے — تری شرابِ محبت فزا گلِ فردوس

خوشا! وہ دن کہ تھا سرمست جامِ شوق ترا

نسیم دیتی تھی مجھکو پیام شوق ترا

خوشا! وہ دن غمِ دنیا گلے کا ہار نہ تھا
خلش فراق کوئی پہلو میں آہ! خار نہ تھا

خوشا! وہ دَور کہ مستِ الست تھا ساقی!
شراب دہر کا آنکھوں میں جب خمار نہ تھا

خوشا! وہ عہد کہ بُستاں سرائے ہستی میں
خیال لالہ و سرو و گل و چنار نہ تھا

فراق گل میں قفس میں نہ چیختا تھا نسیم!
رہینِ نالہ شبہائے انتظار نہ تھا۔

خوشا! وہ دن کہ گریبان شوقِ دست جنوں
برنگِ سبزۂ بیگانہ تار تار نہ تھا

خوشا! وہ دن کہ نہ تھا حسن و عشق سے آگاہ
حریفِ دیدہ و دل شوق تازہ کار نہ تھا

خوشا! وہ دن تری نکہت کو جب گل فردوس
مشامِ شوقِ مرا آہ! بیقرار نہ تھا

خوشا! وہ عہد کہ محوِ بہارِ خلد تھا میں
شہیدِ جلوۂ نیرنگ انتظار نہ تھا۔

میں اپنے کنج میں خوش تھا خوشا! وہ عہدِ نشاط
قلق خزاں کا غمِ رخصتِ بہار نہ تھا

سمجھ کے سوزِ دروں تو نے آہ! کیا پھونکا
دل شگفتہ تھا۔ گلغندۂ شرار نہ تھا

عجیب خواب تحیر فزا تھی سیر بہشت
کھُلی جو آنکھ مرا کُنج خوشگوار نہ تھا

اڑا کے خلد سے لائی ہوائے دہر کہاں
میں کیا کہوں مرے قابل یہ خارزار نہ تھا

قفس میں آہ! تڑپتا ہوں آشیاں کیلئے
زباں ملی ہے مجھے نالہ و فغاں کے لیے

سعید جہان آبادی

رباعی

عالم و با جبر ہیں مانا ہم نے
دیکھا بھالا بہت زمانا ہم نے

لیکن جو کچھ کہ ہم نے جانا اُس سے
اتنا جانا کہ کچھ نہ جانا ہم نے

رنجور

تازہ غزلیں

حسرت بھری نگاہ سے ہر بار دیکھنا — اس میرے دیکھنے کو ستمگار دیکھنا

یوں بے نقاب عارضِ دلدار دیکھنا — موٹی ہماری طاقت دیدار دیکھنا

کنجِ قفس میں خاطرِ صیاد ہی ضرور — سوئے چمن نہ مرغِ گرفتار دیکھنا

دشمن کو بھی نصیب نہ ہو ای مرے خدا — حاسد کو اپنے درد کا غمخوار دیکھنا

نیرنگِ روزگار سے بچتے نہیں حسیں — گل کو نصیب ہوتا ہی بازار دیکھنا

نالوں کی میرے طرز اڑائی اگر صبا — ترخوں میں عندلیب کی منقار دیکھنا

کرتا ہے قطع منزلِ ہستی کو آن میں — اس راہوارِ عمر کی رفتار دیکھنا

اپنا شریک حال عدو بھی ہی دلشکن — ہے میری طرح جان سے بیزار دیکھنا

یوں بار بار سبزۂ خط کو نہ یار دیکھ — پیدا کرے گا آئینہ زنگار دیکھنا

یہ خلد زارِ دہر نہیں لائقِ نگاہ — کسکو نصیب ہے گلِ بے خار دیکھنا

ہے اے نسیم اپنی نظر میں بہارِ عمر — ہر صبح یار کا گل رخسار دیکھنا

بیمارِ عشق ہم ہیں دل آزار جس طرح — تجکو بھی ہو نصیب یہ آزار دیکھنا

ایسا نہ ہو کہ رازِ دلِ زار ہو عیاں — ای چشم ہوشیار۔ خبردار۔ دیکھنا

اس جرم پر کہ تیری جفا پر کیا ہی صبر — میں کشتنی ہوا ہوں ستمگار دیکھنا

ناصح میں بیچ دونگا اسی کو ٹکے کے مول — کوئی سلے جو دل کا خریدار دیکھنا

کیا داومرگ ہی کہ کہیں غیر سے حضور — اک لاش ہی پڑی پسِ دیوار دیکھنا

یا وصل میں نصیب تھا آٹھوں پہر مجھے — ق — آئینہ دار عارضِ دلدار دیکھنا

یا اب فراق میں ہی نگاہِ الم کے ساتھ — گھر میں پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

صورت اثر کی آنکھوں میں پھرتی ہی ہو فدا — اسکا وہ تجکو یاس سے ہر بار دیکھنا

[illegible]

دل کی وحشت نہ گئی خاک میں ملجانیسے — آندھیاں اُٹھتی رہی ہیں مرے ویرانے سے

روز کرتا ہوں درستی شکستِ توبہ — ے کے ٹوٹے ہوئے ساغر ترے میخانے سے

اہلِ محفل کو تو اتنی بھی ہے کافی ساقی — گر پڑی ہے جو چھلک کر مرے پیمانے سے

میرے ہرجائی جو کعبہ میں پکاروں تجکو — آئے لبیک کی آواز صنم خانے سے

جام کے دورِ تسلسل سے ہے دنیا قائم — آسماں سیکھا ہی گردش مرے پیمانے سے

تابِ نظارہ کہاں دیکھوں جو ہنگامۂ حسن — میں نے تعلیمِ فنا پائی ہے پروانے سے

تیرہ بختی کا نہیں ہی کوئی دلسوز شریک — شمع سے مجکو شکایت ہی نہ پروانے سے

رونقِ حُسن بغیرِ مددِ عشق نہیں — زندگی شمع کی وابستہ ہی پروانے سے

پرِ پروانہ جو ہیں دفترِ سوزِ اُلفت — دو ورق پھاڑ لیے ہیں مرے افسانے سے

ل نہ جائے کوئی رستہ میں خدا کا بندہ — مُنہ لپیٹے ہوئے نکلا ہوں صنمخانے سے

ہوتی جاتی ہیں بہت وصل کی راتیں کوتاہ — آسماں دَور بدل لے مرے پیمانے سے

کیوں نہ رنگیں ہو بھلا قصہ خونِ ناحق — لی ہے فرہاد نے سُرخی مرے افسانے سے

پردۂ رازِ حقیقت جو اُٹھادوں احسن — شورِ تکبیر ہو پیدا ابھی بتخانے سے

مہدی حسن احسن لکھنوی

حرص دولت کی نہ عزّ و جاہ کی — ایک حسرت ہے دلِ آگاہ کی

دردِ دل کتنا پسند آیا اُسے — میں نے جب کی آہ اُسنے واہ کی

بس سلوک اُسکا ہی منزل اُسکی ہر — اُسکے دل تک جسے اپنی راہ کی

یاد آئی طاقِ بیت اللہ میں — بیت ابرو اُس بُتِ دلخواہ کی

راہ حق کی ہے طلب آسی اگر
تاکِسہ ہو مردِ حق آگاہ کی

آسی غازیپوری

چہرے کو بے نقاب کرتے ہو — یہ بڑا انقلاب کرتے ہو
جس کو تم انتخاب کرتے ہو — اُس کی مٹی خراب کرتے ہو
میں گنہگار تم سراپا رحم — پھر مرا کیا حساب کرتے ہو
اُسکو کھو دیتے ہو دو عالم سے — جسکو تم باریاب کرتے ہو
جسکو دیتے ہو اپنے دل میں جگہ — اُسکو خانہ خراب کرتے ہو
رہتے ہو سب کی آنکھوں میں دلمیں — پھر بھی سب سے حجاب کرتے ہو
ہم کو روزِ شمار سے کیا ڈر — لطف تم بے حساب کرتے ہو
قتل کے بعد غرق حیرت ہوں — کیوں تم آنکھیں پُر آب کرتے ہو
اور کرتے ہو شیفتہ اُسکو — جس سے تم اجتناب کرتے ہو
آنکھوں میں مردمک میں یا ہو تم — کس سے آخر حجاب کرتے ہو
ہم کو مطلوب بے حساب کرم — جرموں کا تم حساب کرتے ہو
ہائے اُن کا یہ ناز سے کہنا — نامِ اُلفت خراب کرتے ہو
مست آنکھوں سے مست کرکے مجھے — محوِ ذوقِ شراب کرتے ہو
مردم آسا ہماری آنکھوں میں — سیرِ چشمِ پُر آب کرتے ہو

سروِ نوخیز ہنستے ہیں شمشاد
تم جو ذکرِ شباب کرتے ہو

شمشاد لکھنوی۔ از غازیپور

ہے جان بلب دل بیتاب دلربا کیلئے — اِک آشنائی قضا ہے اِک آشنا کیلئے
عدو ہے۔ تم بھی ہو اور آسماں جفا کیلئے — بتاؤ کون ہے میرے سوا وفا کیلئے
لگاؤ شوق سے مرقد کو ٹھوکریں دو چار — ترس رہی ہے مری جان نقش پا کیلئے
عدم میں ہستی سے لائی کسی کی حسرت دید — فنا سے پہلے فنا ہو گئے بقا کیلئے

میں سر بکف ہوں ادھر اور ادھر وہ تیغ بکف
وہاں زخم ہے کیا دیر مرحبا کیلئے

نگاہ بھولے سے پڑتی نہیں خدا کی قسم
دل و جگر بھی لیے تو نظر چرا کے لیے

نہ دی زمانہ نے گردش سے ایکدم مہلت
ہر ایک سانس قدم ہے رہِ فنا کیلئے

ہے دلمیں عکس فگن بسکہ یار کا جلوہ
نہیں ہے آئینہ یہ زنگ ماسوا کیلئے

فلک پہ ہے مہِ نو کی جھکی ہوئی گردن
حیا کے ہوتے ہیں انداز مہ لقا کیلئے

جگر کو ہاتھوں سے تھاما ہے دلکو روکا ہے
اُٹھیں تو ہاتھ اُٹھیں کسطرح دعا کیلئے

مری خموشی سے مطلب کو تاڑ لیتے ہیں
زباں ہے اُنکی مرے عرض مدعا کیلئے

گماں ہے اُنکو کہ فریاد عاشقوں کی نہو
کہو یہ صور سے وہ چپ ہے خدا کیلئے

گناہگار تو رحمت کے مستحق ٹھیرے
الٰہی حشر میں زاہد ہیں کیا سزا کیلئے

کبھی ہے بزم عدو میں کبھی ہے پردہ میں
وہ بے وفا نہیں ملتا کبھی وفا کیلئے

محمد حبیب اللہ وفا

اثر اس جنبش مژگاں کا ہے گردونِ گرداں تک
اشارہ پر پھرا ہے اُلٹے پاؤں مہرِ تاباں تک

ترے رُخ کے تحیر کا تسلسل ہے جو رونے میں
بنا آئینہ ہر آنسو جو پہنچا چشم حیراں تک

مٹی سب آرزوئیں کوئی حسرت بھی نہیں باقی
مری اس بیکسی پر رو رہے ہیں یاس و حرماں تک

بنا طوقِ گلو ہر نالہ میرا جوشِ رقت میں
میں پہنچا اپنے دم سے خود لحد کے تیرہ زنداں تک

اڑائیں دھجیاں جیبِ گریباں کی تو کیا حاصل
نہ پہنچا آہ دستِ وحشتِ دل دامنِ جاناں تک

غبارِ عاشقِ جاں دادۂ وادیِ ناکامی
ہے بارِ خاطرِ دامانِ چشمِ یاس و حرماں تک

تسلسل آنسوؤں کا ہے یہ دورِ ساغرِ مے ہے
اثر عشقِ نگاہِ مست کا ہے چشمِ گریاں تک

کسی کے زلف کو چھیڑے میں قیدی چھوٹ جاتے ہیں
کھچے یہ سلسلہ یارب اسیرِ پا بجولاں تک

علی احمد خاں اسیر



مخزن

پُراسرار شرق

انگریزی میں اور دیگر یوروپین زبانوں میں مشرقی ممالک کے متعلق مختلف فقرے ایسے موجود ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ مشرقی دنیا پُراسرار ہے۔ اور اہل مغرب کے لیے اِسکی اصلی حالت جان لینا یا اُسکے اندرونی راز دریافت کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اور یہ خیال یہاں تک عام ہوا ہے کہ کتابوں اور رسالوں میں جہاں کہیں لفظ "مشرق" آتا ہے وہاں اُس کے ساتھ پُراسرار کی صفت لازم ملزوم ہوگئی ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ مغرب سے جو سیاح آتے ہیں۔ اور اپنے سفر کے حالات لکھتے ہیں۔ اُنہیں ہر مشرقی انسان اسرار کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا فرانس کے ایک نامور مصنف نے ایک کتاب لکھی جسکے فرانسیسی نام کا ترجمہ "الهند بغیر الانگلیس" ہے یعنی ہندوستان کا وہ حصہ جو انگریزوں سے خالی ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لائق مصنف نے ہندوستان کی بعض دیسی ریاستوں کی سیر کی ہے۔ اور اُنکے حالات لکھے ہیں۔ مگر جس شخص کا بیان دیکھو پُراسرار صفت برابر درج ہے۔ ہر ا[illegible] اُسکی پُراسرار پیشانی۔ قوال اور اُسکی پُراسرار آنکھیں۔ کنوئیں پر پانی بھرنے والی جوان [illegible] پُراسرار ابرو۔ بیچارے فرانسیسی کے لیے دکن کیا ہوا ایک طلسم خانہ بنگیا

یہی حال کم و بیش ہر یوروپین سیاح کا ہے۔ انہوں نے بچپن سے بلادِ شرق کے ایسے افسانے سُن رکھے ہیں۔ اور تصور نے اُنکے ذہن میں شرق کا ایک ایسا عجیب نقشہ کھینچ رکھا ہے کہ جب وہ ہمارے ملکوں میں آتے ہیں تو ہمیں اپنا خیالی چشمہ لگا کر دیکھتے ہیں اور جو کچھ اِس خیالی عینک سے نظر آتا ہے اُسی کو حقیقت سمجھتے ہیں۔ اسی سے ہمارے اور اُن کے درمیان ایک پردہ حائل ہو گیا ہے جسکا اُٹھنا تقریباً محال نظر آتا ہے۔ اور اسی پردے کی بدولت دونوں طرف یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ "شرق تو شرق ہے اور غرب غرب۔ اور دونوں کبھی نہیں ملیں گے"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا واقعی ہم اور ہمارے ملک پر اسرار ہیں؟ اور ایسے مخفی ہیں کہ یورپ والے کبھی انہیں سمجھ نہ سکیں؟ یا ہم معمولی انسانوں کے سے انسان ہیں! اور ہمارے ملک دوسروں ملکوں کے سے ملک:۔ میرے خیال میں اِس سوال کا جواب صرف ایک ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ نہ ہم پر اسرار ہیں نہ ہمارے ملک۔ بلکہ یہ صرف اُس خیالی عینک کا اثر ہے جو سیاحان یورپ لگا کر آتے ہیں کہ ہم اُنہیں ایسے نظر آئیں۔

ہماری زندگی کا فقط ایک حصہ ایسا ہے جسے وہ جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ پُر اسرار ہے۔ اور وہ بھی صرف اِسلیئے کہ اُسپر ایک پردہ واقعی پڑا ہوا ہے۔ یعنی ہمارے گھروں کی حالت۔ مجھسے ایک انگریز نے جو عرصہ دراز تک ہندوستان میں رہکر انگلستان واپس گیا۔ یہ کہا کہ میں اتنی مدت تمہارے ملک میں رہا۔ میں نے تمہاری کئی زبانیں سیکھیں اور مشرقی علوم سے خاصی واقفیت پیدا کی۔ اِسپر ہندوستانی شرفا کی وہ زندگی جو گھروں کے اندر بسر ہوتی ہے میرے لیے ایک سر بمہر کتاب رہی اور ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی ایسے ناول لکھیں جس سے زنانہ طرز بود و باش کا کچھ حال ہم اجنبیوں کو بھی معلوم ہو۔ میں نے اُنہیں جواب دیا کہ اب کئی لوگ ایسے ناول لکھنے لگے ہیں جنسے ہماری اندرونی زندگی آپ لوگوں کو کسیقدر معلوم ہو جائے۔ اور آپ کا یہ مدعا

ـــــــ

لہ کپلنگ کا مشہور قول ہے۔

جلد پورا ہونے والا ہے۔ آپ سمجھیں گے کہ رسم و رواج کے تھوڑے سے اختلاف
کو چھوڑ کر کسی ہندوستانی شریف بی بی کی زندگی معمولی انگریزی بی بی کی روزمرہ زندگی
سے بہت جدا نہیں ہے۔ وہ صبح اٹھتے ہی گھر کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر صبح کے
کھانے کی فکر میں لگتی ہے۔ اگر گھر میں خادمہ ہوئی تو اس سے کام لیتی ہے ورنہ خود
سب اہتمام کرتی ہے۔ کھانا تیار ہوا اور کھانا کھا کر میاں اپنے کام کاج کو اور بچے اپنے مدرسے
کو جا لیئے تو ذرا سستاتی ہے اور کچھ سینا پرونا لے بیٹھتی ہے یا اگر پڑھنے کا شوق
ہے تو کوئی کتاب پڑھتی ہے۔ دوپہر ڈھلتے ہی شام کے کھانے کی تیاری شروع ہوتی ہے
اور اسی طرح کم و بیش تغیر کے ساتھ روز کا معمول ہے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اپنے عزیزوں دوستوں میں سے کچھ عورتیں ملنے آ گئیں یا یہ کسی سے ملنے چلی
گئی تو اس سیدھے سادے روزمرہ میں کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ کسی شادی بیاہ کی
تقریب میں شامل ہوئی یا خود اپنے ہاں کوئی شادی رچی تو ذرا اور دل لگی اور چہل
پہل کا سامان ہو گیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے دنیا بھر میں اکثر عورتوں کی اسی قسم کی
زندگی ہے۔ خواہ وہ یورپ میں پردے سے باہر رہتی ہوں یا ایشیا میں پردہ کے اندر۔
آپ کو زیادہ راز جوئی صرف پردے کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ یہ خیال آتا ہے کہ خدا
جانے پس پردہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ مگر اس اتنی سی آڑ کی وجہ سے یہ فرض کر لینا
کہ پردے کے پیچھے ضرور بڑے بڑے اسرار ہیں۔ صحیح نہیں اور نہ اس سے یہ لازم
آتا ہے کہ سارے مشرق کو پر اسرار کہہ دیا جائے۔ کتنی قومیں ہیں جو مشرق
میں آباد ہیں لیکن پردے کی رسم سے بالکل ناآشنا ہیں مثلاً جنتی جاپانی چینی
وغیرہ وغیرہ انکی زندگی کیا مردوں کی کیا عورتوں کی تمام اغیار و اجانب کے پیش نظر ہے
اور اسمیں ہو بہو کوئی اسرار ہے نہ معما۔ اسکے علاوہ ہمارے ملک ہندوستان میں

بیشتر حصہ آبادی کا یا تو پردے سے بالکل بے تعلق ہے یا صرف برائے نام تعلق رکھتا ہے۔ مسلمان بھی جنمیں پردہ مروج ہے۔ سارے کے سارے پردہ دار نہیں اور غریب لوگ جنہیں محنت مزدوری سے روزی کمانی پڑتی ہے مجبور ہیں کہ وہ عورتوں کو بھی محنت میں شریک کریں۔ اور اُنکی عورتیں اکثر بے پردہ اقوام کی طرح گلی کوچوں میں آزادانہ پھرتی ہیں۔ پس جو کوئی نظر غور سے ہندوستان کی حالت کو دیکھے وہ اِسے صرف اس بنا پر کہ اسمیں فیصدی چند لوگ ایسے ہیں جو پردے کے پابند ہیں پُراسرار نہیں کہہ سکتا۔ پردے کا بھید اگر ہم اُسے بھید کہہ سکیں اپنے اثر میں بہت محدود ہے۔ اور اگر کبھی یہ بھید کُھل ہی گیا (جیساکہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کُھل جائے) تو ہم اُن حضرات کو جن کی نگاہیں پس پردہ بڑے بڑے اسرار دیکھنے کی منتظر ہیں۔ بہت وثوق سے یہ جتانا چاہتے ہیں کہ اُنہیں نہایت مایوسی کا سامنا ہوگا۔ اور کوئی ایسی نئی یا اچنبھے کی باتیں اُنہیں معلوم نہوں گی جیسی کہ وہ اِسوقت اپنے خیال میں تصور کیئے ہوئے ہیں۔ فطرت انسانی تمام عالم میں ایک ہی۔ ضروریات انسانی بھی ایک معقول حد تک ہر جگہ وہ ہی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو اچھی طرح سمجھنے میں قاصر رہے۔ صرف اس لیئے کہ ایک مشرق میں بستا ہے اور دوسرا مغرب میں۔ یا ایک کا رنگ گورا ہے ایک کا سانولا۔ محض کوشش کی کمی اور ہمت کا نقص ہے کہ ہم کہدیتے ہیں کہ انگریز عجیب لوگ ہیں۔ اور ہم اُنکے اصلی حالات اور خیالات سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے خواہ اُنسے کتنا ہی ملیں جُلیں۔ اور اُدھر انگریز یہ کہدیتے ہیں کہ ایشیائی لوگوں سے خواہ ساری عمر سابقہ رہے۔ اُن کی تہ کو پہنچنا دشوار ہے۔ اور اُنکے دلی جذبات سے کسی اہل یورپ کا ٹھیک ٹھیک آگاہ ہونا ناممکن ہے۔ حالانکہ اِس مغائرت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو انگریزوں سے اپنی صحت آسایش اور سیاسی مصلحت کے

لحاظ سے ہر مقام پر اپنے گھر شہر کی آبادی سے دور بنائے ہیں۔ اور دوسری طرف ہندوستانی اپنے غریبانہ گھروں میں حوادث کے ڈر سے منہ چھپائے پڑے ہیں۔ اور کچھ گھر گھسنے پن کی عادت سے اور کچھ افلاس اور بے بضاعتی کے سبب باہر کی دنیا سے الگ تھلگ ہیں *

یورپ کے سیاح جو چند روز کے لیے آتے ہیں۔ اُنکی فرودگاہ وہ ہوٹل ہوتے ہیں جو یوروپین آبادی کے قریب واقع ہیں۔ اور اُنہیں بسبب زبان کی عدم واقفیت کے اور اچھے ترجمانوں کے نہ ملنے سے کسی معقول ایشیائی سے بات چیت کرنیکا موقع نہیں ملتا۔ وہ زیادہ تر بڑی بڑی عمارتوں اور پرانے تاریخی کھنڈروں کو دیکھکر چلے جاتے ہیں۔ کوہ و دریا کے مناظر اور میدانوں کی وسعت کی تعریف کرجاتے ہیں۔ اور ان سب چلتی پھرتی تصویروں کو جو اُنہیں شہروں کے بازاروں میں خاموشی سے مصروف کاروبار نظر آتی ہیں پُراسرار قرار دے جاتے ہیں۔ میں نے ممالک یورپ کی سیر کے بعد اور وہاں بہت سے لوگوں سے گفتگو کرکے یہ نتیجہ نکالا کہ اہل مغرب کسی اجنبی کے روبرو اپنے اصلی خیالات کا اظہار کرنے میں بہت محتاط ہیں۔ ایک مشہور انگریز مدبر غالبًا لارڈ سالسبری کا یہ مقولہ ہے کہ انسان کو زبان اسلیے دی گئی ہے کہ وہ اپنے خیالات لفظوں کے پردے میں کامیابی کے ساتھ چھپا سکے۔ اور میں نے دیکھا کہ جدید تہذیب میں یہ بہت بڑا ہنر مانا گیا ہے کہ انسان میں خیالات کے چھپانے کی قابلیت خیالات کے اظہار سے زیادہ ہو۔ اور اقوام یورپ جسقدر تہذیب کے مدارج میں ایک دوسرے سے بڑھی ہوئی ہیں۔ اُسی نسبت سے اس فن میں زیادہ ماہر ہیں۔ گویا اس اعتبار سے مغرب کسیقدر مشرق سے زیادہ پُراسرار ہے۔ اور اُسکے بحر خیالات کا پانی زیادہ گہرا ہو۔ یوں سطحی نظر سے جو جسکا جی چاہے سمجھے اور جو جی میں آئے کہے حقیقت میں

یہ سب غلط فہمیاں ہیں اور جب اتفاق زمانہ سے اہل مشرق اور مغرب میں عام طور پر خلا ملا ہوگا اور اہل مشرق رفتہ رفتہ اہل مغرب کے رنگ میں اور اہل مغرب کسیقدر اہل مشرق کے رنگ میں رنگے جائینگے تو نہ باہم یہ حجاب رہیگا نہ مغایرت۔ دوستی اور دشمنی کا حال تو خدا کو معلوم کہ دونوں میں تعلقات دوستانہ ہونگے یا رقیبانہ لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا رازداں بنائینگے اور موجودہ غلط فہمیاں ایک دوسرے کے اقوال و افعال کے متعلق باقی نہیں رہینگی۔ اور دونوں ناواقفیت یا تعصب کی عینک اُتار کر ایک دوسرے پر نظر ڈالیں گے ایک دوسرے کو پہچان لینگے۔ اور مدت کے بچھڑے مل جائینگے۔ نہ مغرب ہمیں "پر اسرار مشرق" کہیگا نہ ہم اُسے "پر غرور مغرب"۔ ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے جب دونوں ایک تھے۔ یورپ کی آبادی کا حصہ کثیر اسوقت تک مشرقی آبا و اجداد کا خون اپنی رگوں میں لیئے ہوئے ہے۔ اور بہت سی مشرقی رسوم و عادات اب تک اس میں باقی ہیں خود وہ مذہب جسکے تقدس پر تمام عالم عیسوی کو ناز ہے مشرق سے انہیں ملا ہے۔ اتنے تعلقات اور رشتوں کے باوجود یہ جدائی اور یہ تجاہل جیسے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی۔ اگر اس ناآشنائی کو آشنائی سے مبدل کرنا ہو تو اسکی بہترین ترکیب یہ ہے کہ ایشیائی جو یورپ کو جائیں وہ اہل یورپ کی علوات اور خو بو سے واقفیت پیدا کرکے جائیں تاکہ انکو یورپ ایک شکل معمانہ نظر آئے اور اسیطرح اہل یورپ جو مشرق اور بالخصوص ہندوستان کی سیر کو آئیں یا یہاں قیام کریں وہ جامہ اجنبیت کو تھوڑی دیر کے لیئے الگ کردیں۔ اہل ملک کے خیالات انکی زبان اور انکے لٹریچر کے مطالعہ سے دریافت کریں۔ اور پھر اُنسے ملیں تو انہیں نظر آئے کہ ایشیائی انسانیت بھی بجائے خود کیسی صفات کی جامع ہے۔ عرفی کا یہ شعر ہزار رو سائر کو جو دوسرے ملکوں سے یہاں وارد ہو اس ملک کی طرف سے ایک پر مغز نصیحت کر رہا ہے جو آج بھی ایسی ہی سچی اور کارآمد ہے جیسی عرفی کی زندگی میں تھی ؎

توازملک عراقی وا نگوں کن عادتِ بنشیں — اگر خواہی کہ حُسنِ رونق ہندوستاں بینی۔

عبدالقادر

عادات

عادات خصوصاً بُری قسم کی آسانی سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو چیز آج معمولی نظر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ قوت پکڑ جاتی ہے۔ اور پھر تم پر آہنی زنجیر کی طاقت سے قابو پاتی ہے۔ یہ زنجیر تمہیں یاد ہوگا۔ ایک وقت ایک ایک تار لپیٹنے اور ملانے سے بنتی ہے۔ مگر سرکش سے سرکش جہاز اسکی طاقت کا لوہا مانتا ہے اور اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے ؂

ہر ایک طالب علم میں کسی نہ کسی قسم کی عادات تو ضرور پیدا ہونگی۔ اس کا ایک خاص رُخ یا میلان طبع ہوگا جس میں وہ اپنے اوقات بسر کرتا ہے جس میں عموماً اُسکے اشغال۔ خیالات اور جذبات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ نیک ہوں یا بد۔ یہ عادات بہت جلد انسان کا ایک جزو بلکہ طبیعت ثانی ہو جاتی ہیں۔ بھلا کون نہیں جانتا کہ وہ بوڑھا جو اپنے پُرانے گھر میں چُولھے کے ایک خاص کونہ میں ساٹھ سال تک برابر بیٹھتا چلا آیا ہے۔ اگر اُسکو وہاں سے ہٹایا جائے تو اُسکی زندگی تلخ ہو جائیگی کس نے بیسٹائل[1] کے بوڑھے قیدی کی رہائی کا حال نہیں پڑھا۔ جو منت وزاری کرنے لگا کہ برائے خدا مجکو میری اندھیری کوٹھری میں واپس بھیجا جاوے۔ کیونکہ میری جو عادات قیدخانہ میں بن چکی ہیں وہ اب اس درجہ راسخ ہو گئی ہیں کہ ان پر غالب آنے کی کوشش کروں تو اپنی رہی سہی زندگی بھی کھو بیٹھوں گا۔ چالیس سال کی عمر کا شاید ہی کوئی ایسا آدمی ملیگا جس میں چند ایک ایسی عادات نہ پائی جاتی ہوں جن پر وہ اظہار افسوس کرتا ہے۔ اور جو اُسکی زندگی کے زیادہ کارآمد ہونے میں بہت کچھ سدِ راہ ہو رہی ہیں۔ مگر یہ عادات اُسکے رگ و ریشہ میں ایسی سرایت کر گئی ہیں کہ وہ اُن کے

[1] پیرس میں ایک قیدخانہ کا نام ہے ۱۲

بدلنے میں اب عاجز ہے۔ مجھے یہ تو امید ہے کہ آپ بھی جلدی عادات سے کے لباس سے ملبس ہوں گے۔ مگر میری یہ آرزو ہے کہ آپ نیک عادات کے زیور سے آراستہ ہوں جو ہر گھڑی اور ہر روز آپ کی خوشی کو دوبالا کرے۔ اور آپ کو زیادہ مفید اور کارآمد بنائے۔ اگر آدمی سے کہا جائے کہ کلھاڑی جو اب وہ پسند کرتا ہے اُسے عمر بھر استعمال کرنی ہوگی تو وہ مناسب قدوقامت اور عمدہ قسم کی کلھاڑی پسند کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھیگا۔ یا اگر آدمی کو بتلا یا جاوے کہ تمام عمر اُسے کپڑوں کے ایک ہی جوڑے پر گزارہ کرنا ہوگا۔ تو پسند کرتے وقت وہ کپڑے کی پائیداری اور صفت کا خاص لحاظ رکھے گا۔ مگر ان سب کے مقابلہ میں ایسی عادات کی پسندیدگی کا سوال جس میں روح کو رہنا اور کام کرنا ہے۔ کہیں بڑھکر اہم اور ضروری مسئلہ ہے جیسا کہ جسم کو تنگ جامہ پہنا کر یہ توقع رکھنا بے سود ہے کہ وہ اپنے مختلف فرائض چستی و چالاکی اور آرام سے بجالائیگا۔ ویسا ہی روح کو دوسرے اشخاص کی عادات کا جامہ پہنا کر یہ امید رکھنا کہ وہ کوئی بڑا کام کر دکھائے۔ محال اور بعید از قیاس ہے +

(ترجمہ) فتح الدین۔

شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد جن کی تصویر آج مخزن کے ساتھ شائع کیجاتی ہے۔ جدید اُردو محسنوں کی صف اول میں رتبہ عالی رکھتے ہیں۔ انکو جو تعلق دیر تک پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج سے رہا۔ اُسکی وجہ سے اور نیز اُنکی بعض تصانیف کی وجہ سے جو نصاب تعلیم میں داخل ہیں پنجاب میں ہر کہ و مہ جانتا ہے مگر اُنکی شہرت ہندوستان بھر میں عالمگیر ہے۔ یہ تصویر ایک فوٹو سے نقل کیگئی ہے جو ہمیں جناب ممدوح کے فرزند ارجمند آغا محمد ابراہیم صاحب نے عنایت کیا تھا +

الگزنڈر ہیڈرلی

شعرار اردو کی فہرست میں اگرچہ الگزنڈر ہیڈرلی کا نام کسیقدر اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اُسکے دیوان کے تمام وکمال مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ اس بات کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ باوجود یورپ نژاد ہونیکے اُسے اُردو پر کسقدر دسترس حاصل تھی۔ اور اپنی اعلیٰ درجہ کی علمی استعداد اور شاعرانہ قابلیت کی بدولت وہ زمرہ اساتذہ میں شمار کیے جانے کا کہاں تک مستحق ہو سکتا ہے*

الگزنڈر ہیڈرلی کا مطبوعہ دیوان مجھے اپنے ماموں منشی سید محمد یوسف صاحب کے کتب خانہ سے جسکو چند بیش بہا کتابوں کا مختصر ذخیرہ سمجھنا چاہیئے دستیاب ہوا ہے اور ایک عرصہ تک وہ میرے زیر مطالعہ رہچکا ہے۔ اور اب بھی بسا اوقات اُسکے سبب سے میری بیکاری کے گھنٹے نہایت دلچسپی سے گزرتے رہتے ہیں۔ یہ دیوان مطبع احمدی آگرہ سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ لیکن اب اسقدر کمیاب ہے کہ شاید ہی کسی خوش نصیب کے پاس اُسکا کوئی نسخہ موجود ہو*

آجکل اکثر یہ شکایت کیجاتی ہے اور میری رائے ناقص میں یہ شکایت بجا ہے کہ انگریزوں کو اُردو سے یا تو تنفر ہے یا اُنھیں اس زبان پر بدرجہ کمال دستگاہ حاصل کرنا قریباً ناممکن ہے۔ لیکن الگزنڈر ہیڈرلی نے عملی طور پر اس الزام کی تردید کر دی ہے آپ اس اینگلو انڈین شاعر کے کلام کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے اور کہیں نہ پتہ چلیگا کہ یہ کسی غیر ملک کے باشندہ کی سعی افکار کا نتیجہ ہے۔ سچ پوچھیے تو الگزنڈر ہیڈرلی ایسے قادر الکلام اور پُرگو شاعر اردو میں بہت کم گزرے ہیں سب سے قابل تعریف بات یہ ہے کہ ہیڈرلی کے دیوان میں آپ کسی جگہ فحش رمز و کنایہ اور

عیاشانہ استعارات کا نام بھی نہ پائیے گا۔ جن باتوں سے آجکل کی ایشیائی شاعری بدنام ہے اُن سے ہیڈرلی نے قطعاً احتراز کیا ہے۔ اور یہ اُسکی بالغ نظری اور روشن خیالی کا بین ثبوت ہے۔ افسوس ہے کہ اب اِس قسم کے شاعر ناپید ہوتے جاتے ہیں۔ اور قدیم طرز کی اُردو شاعری سنے تشاعروں کی بدولت روز بروز ذلیل ہوتی جا رہی ہے +

الگزنڈر ہیڈرلی کا نام باوجود استحقاق شہرت کے آجتک صرف تذکرہ شعراء کے صفحوں تک محدود ہے۔ اور اردو زبان میں بیشتر شاعر ایسے گزرے ہیں جنکے علمی کارنامے زمانہ کب کا بھلا چکا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ ملک کے ان سچے بہی خواہوں نے اپنی زبان کی بھلائی کے لیئے کیا کیا جدوجہد کی ہے۔ مشاہیر پرستی کی اعلیٰ صفت ہم لوگوں میں مفقود ہے ورنہ ممکن تھا کہ "ویسٹ منسٹر ایبے"[1] کا جواب ہندوستان میں بھی موجود ہوتا۔ اور آنے والی نسلیں اپنی ملکی زبان کے محسنوں کی مفید عام خدمات کی قدر کرتیں اور اُن کی بیش قیمت دماغی کوششوں کی معترف ہوتیں +

میں نے اکثر تذکروں میں الگزنڈر ہیڈرلی کے مفصل حالات کی تفتیش کی لیکن تفصیلی واقعات کا مطلق پتہ نہ چلا۔ دیوان میں دو دیباچے شامل ہیں۔ ایک فارسی دوسرا اردو۔ اول الذکر منشی شوکت علی صاحب مرحوم متوطن شاہپور ضلع فتحپور کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے اور اردو کی مختصر سی تمہید مصنف دیوان کے بڑے بھائی مسٹر طامس ہیڈرلی کی لکھی ہوئی ہے جو ریاست بھرتپور میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اُسے علوم مشرقی اور خصوصاً

[1] لنڈن کا مشہور قبرستان جس میں ولایت کے بڑے بڑے امراء کبراء شعراء وغیرہ مدفون ہیں جہاں دفن ہونا قوم انگریزی کے کسی فرد کے لیئے اعلیٰ سے اعلیٰ عزت سمجھی جاتی ہے +

اُردو زبان میں کافی دخل تھا۔ اُسکے دیباچہ سے اُسکی بے ساختہ طرز بیان اور شُستگی زبان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ منشی شوکت علی مرحوم راقم الحروف کے ایک قریبی بزرگ تھے۔ فنِ انشا پردازی اور خطاطی میں اُنہیں کمال حاصل تھا اور اِس جوار میں اسوقت تک اُن کا نام فارسی و عربی کے ایک جیّد عالم و دستند سے بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ لیاجاتا ہے۔ منشی صاحب سے الگزنڈر ہیڈلی کا بہت یارانہ تھا۔ اور ایک عرصہ تک یہ دونوں ایک جگہ رہ چکے ہیں بلکہ ایک حد تک ہیڈلی کو منشی صاحب سے تلمذ بھی تھا۔ میں نے اپنے بعض بزرگوں سے سُنا ہے اور قیاس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے فارسی و اردو منشی صاحب سے سیکھی تھی۔ اِسی فارسی دیباچہ میں منشی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں ؛

"بیشتر تصانیف نتایج افکار خویش بہ نظرم درمی آورد و بمزید مہر و محبت خاطرم را عزیز داشتے و ہمت بر خوشدلی و کامرانیم گماشتے۔ اگر روزے اتفاق رفتنم بصحبتش نمی فتاد خود بمسکنم رسیدہ بہ دیدار فرحت بار مسرورم میفرمود۔ و انواع التفات می نمود۔ چندانکہ مرا پروانہ جمال جہان افروز خود کرد۔ ہر روز بتماشاے ابکار افکار خویش محو نظارہ ام میساخت و مرا یکدم از دست نگزاشتے کہ بارے است طبعاں سر داشتے"

اس عبارت سے معلوم ہوسکتا ہے کہ منشی شوکت علی صاحب مرحوم اور الگزنڈر ہیڈلی کا باہمی ارتباط کسقدر بڑھا ہوا تھا۔ لہذا منشی صاحب نے جو حالات دیباچہ میں لکھے ہیں وہ اُن بیانات سے کہیں زیادہ وسیع ہیں جو معمولی تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ میں ذیل میں اُسیکی مدد سے الگزنڈر ہیڈلی کے سوانح بہت اختصار کے ساتھ قلمبند کرتا ہوں۔ اِس جگہ مجھے اپنے غائبانہ کرمفرما مولوی سید فضل الحسن بی اے ایڈیٹر اُردوے معلّٰی کی عنایات کا اعتراف ضروری ہے کہ اُنھوں نے

عبد الغفور خاں نساخ کے تذکرہ سخن شعراسے چند مفید مطلب اور ضروری نوٹ اخذ کرکے مجھے بھیجے۔ یہ مضمون اردوے معلیٰ میں نکلنے والا تھا۔ لیکن اب اردوے معلیٰ کی اشاعت ایک غیر معلوم مدت کیلئے موقوف ہی۔ ایسی حالت میں مینے مناسب جہا کہ اس مضمون کو زیادہ عرصہ تک معرض تعویق میں رکھکر مخزن کے ذریعہ شائع کردوں +

الگزنڈر ہیڈرلی کے باپ کا نام جیمس ہیڈرلی تھا۔ اُسکے خاندانی حالات پردہ خفا میں اسطرح مستور ہیں کہ باوجود سخت تلاش کے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ لوگ ہندوستان میں کب اور کس طرح آئے۔ اور آیا اس خاندان کی یادگار ہندوستان میں اسوقت کوئی موجود ہے یا نہیں۔ قصائد مشمولہ دیوان کے عنوان پڑھنے سے شبہہ بلکہ یقین ہوتا ہے کہ شاید الگزنڈر کے خاندان کو مسلمانوں سے بسلسلہ مناکحت کوئی خاص تعلق تھا۔ ایک قصیدے کا عنوان ہے "قصیدہ در مدح خانصاحب محمد حیات خاں صاحب ماموں صاحب خود"۔ ایک دوسرے قصیدہ کا عنوان ہے "قصیدہ در مدح نظام الدین خاں برادر خود"۔ اس بارے میں اپنی جانب سے میں کوئی رائے زنی نہیں کرنا چاہتا +

خاندانی حالات کی طرح الگزنڈر ہیڈرلی کے بچپن اور نوجوانی کے حالات بھی کمیاب ہیں۔ البتہ اسقدر پتہ چلتا ہے کہ یہ کچھ عرصہ تک ریاست الور میں بعہدہ کپتانی ممتاز رہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اسکا تعلق ریاست جھجر (پنجاب) سے تھا میرا خیال ہے کہ جھجر ہی میں منشی شوکت علی مرحوم سے اسکی شناسائی ہوئی۔ ریاست جھجر میں راقم الحروف کے جد امجد محمد اعظم کرنیل تھے۔ اور انکی بدولت میرے بہت سے ہموطن بزرگوں کو اس ریاست کی نمک خواری و اطاعت شعاری کا فخر حاصل تھا۔ اور منشی شوکت علی مرحوم بھی انہیں کے توسل سے وہاں ایک معزز فوجی عہدہ پر

مقرر تھے۔ اسطرح منشی صاحب اور الگزنڈر ہیڈرلی ایک زمانہ تک یکجا رہے۔ موخر
الذکر کے قیام جھجھر کا ثبوت وہ قصیدہ بھی ہے جو اُسنے آخری حکمرانِ ریاست
نواب عبدالرحمٰن خاں مرحوم کی شان میں نظم کیا ہے اور اُسکے دیوان میں درج ہے
اسکے علاوہ ایک غزل میں وہ کہتا ہے ؎

"پوچھنے کو نہیں میسر ہیں کہ پینے کو شراب بخت سے آزاد جھجھر بھی مدینہ بن گیا"

لیکن کچھ دنوں بعد ان دونوں کا تعلق ریاست سے قائم نہ رہا۔ منشی صاحب اپنے
وطن چلے آئے۔ اور الگزنڈر ہیڈرلی الور میں جا کر ملازم ہو گیا۔ چنانچہ منشی صاحب
لکھتے ہیں "مراتفاق رفتن بدیار مشرق بتقریبے ناگزیر افتاد و او را در سرکار
فرمانروائے الور عہدہ کپتانی توپخانہ متعہد شد"

ایک قصیدہ مہاراجہ سندھیا کی مدح میں ہے۔ شاید کسیوقت الگزنڈر ہیڈرلی
کو ریاست گوالیار سے بھی کوئی تعلق رہا ہو۔ لیکن اسکا ثبوت کہیں نہیں ملا نہ اس
بارے میں کوئی اشارہ منشی شوکت علی نے کیا ہے۔

ریاست الور کی ملازمت کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہا۔ کیونکہ
سال بھر کے اندر ہی اُسنے عین عالم شباب میں اس دنیا کو خیرباد کہا۔ تاریخ وفات
۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء ہے۔ ۳۲ برس کی عمر پائی اس حساب سے اسکا سن ولادت ۱۸۲۹ء
سمجھنا چاہیئے۔

الگزنڈر ہیڈرلی بلحاظ اپنے ذاتی خصائل و اوصاف کے ایک قابل قدر شخص
تھا۔ شاعری کے علاوہ اُسے فن طبابت میں بھی پوری مہارت تھی اور امراض مزمنہ کے
علاج میں اُسے کافی ملکہ تھا۔ اپنی فطری اولوالعزمی سے ہر قسم کی دوائیں خواہ وہ معمولی
ہوں یا بیش قیمت مریضوں کو مفت تقسیم کیا کرتا تھا۔ اس کے ماسوا محتاج اشخاص
کی امداد بھی اُس کا خاص شیوہ تھا۔ مختصر یہ کہ وہ بڑا ذی ہمت۔ بامروت اور علم دوست

آدمی تھا۔ اور اُسکا سلوک بلا امتیاز مذہب و ملت سب سے یکساں تھا +

ابھی الگزنڈر ہیڈرلی کی شاعری پر مختصر ضروری بحث باقی ہے۔ الگزنڈر کا تخلص آزاد تھا اور بعض مقطعوں میں بجائے آزاد کے الک رجو الگزینڈر کا مخفف ہے) بھی استعمال کیا ہے مثلاً ؎

کہوے جو کوئی اے الک ساتھ ہو کیونکہ گلستاں
سینہ داغدار تو اپنا اُسے دکھا کہ یوں

آزاد کو اوائل عمر ہی سے شعر و سخن کا شوق تھا ۱۔ا سال کے سن میں وہ اساتذہ اُردو کے دواوین مطالعہ کیا کرتا۔ اور چونکہ فطرت سے اُسے ذوقِ سلیم کا کافی حصہ ملا تھا اسلیئے شاعری سے بہت جلد اُسکی طبیعت کو مناسبت پیدا ہو گئی۔ نواب زین العابدین خاں عارف دہلوی سے اُسکو تلمذ تھا۔ منشی شوکت علی کا بیان ہے کہ حضرت غالب بھی بذریعہ مراسلات و مکاتبات اُسکے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو۔ لیکن آزاد کے بھائی طامس ہیڈرلی اور نساخ دونوں نے صرف عارف کو اُستاد قرار دیا ہے +

دیوان کے غائر مطالعہ سے مصنف کی پُرگوئی اور دقیقہ شناسی ظاہر ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ایک حمدیہ قصیدہ ہے۔ پھر ایک مسدس ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کی شان میں نظم ہوا ہے اُسمیں آزاد نے اپنے مذہبی نقطۂ خیال سے حضرت عیسےٰ کی تعریف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ایک بند یہ ہے ؎

تجکو شاہا نور اپنا کہہ چکا ربِ قدیر کوئی غیر از حق نہیں کونین میں تیرا نظیر
تیرے رتبہ کو کوئی کیا پہنچے انسانِ حقیر اہلِ عالم خاک کے ذرّے ہیں تو مہرِ منیر
تُو ہے فرزندِ خدا فرزند پیارا جان سے
ذاتِ حق ہر آئینہ ظاہر ہے تیری شان سے

اِن کے علاوہ نو قصیدے اور ہیں جو مختلف رئیسوں اور عزیزوں کے لیئے موزوں کیے گئے ہیں۔ اِن میں اگرچہ سودا اور ذوق کا چربہ نہیں اُتر سکا لیکن شکوہ الفاظ و دبدبہ مضمون کے لحاظ سے بہت کچھ قابل توصیف ہیں قصائد میں تشبیب اور گریز دو نہایت دشوار گزار گھاٹیاں ہیں لیکن آزاد نے اپنی ہمہ گیر فکر کی بدولت یہ دونوں منزلیں بہ آسانی بہ خوش اسلوبی طے کی ہیں بعض سخت طرحوں پر اُسنے قصیدے کہے ہیں اور خوب خوب دادِ سخنوری دی ہے۔ ایک قصیدے کی تمہید یہ ہے ؎

ہو کے خاک عالم میں تیرے کشتگان پھرنے لگے — مصر میں جیسے غبار کارواں پھرنے لگے
ہم ازل سے ہیں کسی کے آستاں کے جبہ سا — ڈر نہیں ہم سے اگر اب آسماں پھرنے لگے
جس زمیں پر ہو ہماری ہرزہ گردی کا اثر — وہاں مکاں بنتے ہی شکلِ آسماں پھرنے لگے

اِسی قصیدے میں ذیل کے مدحیہ اشعار قابلِ غور ہیں ؎

گر ترے در سے نگاہِ آسماں پھرنے لگے — کاسہ گردانی کرے بے آب و ناں پھرنے لگے
تیری بینش منشیٔ گردوں کا بستہ چھین لے — گر تری آئین سے ای نکتہ داں پھرنے لگے
گر تجھے منظور ہو اربابِ وحشت کا علاج — ماہ بھی خود پہن کر کیشِ کتاں پھرنے لگے
ایک دم میں آسماں کے گرد سو چکر کرے — بادپا تیرا جو بہرِ امتحاں پھرنے لگے
گر تری شمشیر میں بُرّش کی ہو کچھ احتیاج — آسماں بنکر وہیں سنگِ فساں پھرنے لگے

ایک اور قصیدہ ہے دیکھئے اِسقدر مشکل ردیف و قافیہ میں آزاد کی طبعِ وقاد نے کیسے پُرلطف مضامین نکالے ہیں ؎

پھر سینہ تپِ غم میں ہی مجمر سے زیادہ — جو لخت ہی دل کا سو ہے اخگر سے زیادہ
کیا خاک چھُٹے مرحلہ بینی کہ زمانہ — ہے پائے نگہ کو مرے چکر سے زیادہ
عالم کا تو کیا ذکر کہ خود ہوتی ہے نفرت — مجھکو مری اوقاتِ محقّر سے زیادہ

کیا مرغِ نگہ ہمتِ پرواز سے پہنچے | ایواں ہے ترا گنبدِ اخضر سے زیادہ

دُہرانا تری مدحتِ شیریں کا زباں پر | دیتا ہے مزا قندِ مکرر سے زیادہ

اعجاز نگہ میں لبِ جاں بخش سے دُونا | بُو خلق میں گیسوئے معنبر سے زیادہ

جیا جی راؤ سندھیا کی شان میں کہا ہے ؎

کس لیے ہی تجکو اے دل انتظارِ فصلِ گل | ہے مہاراجہ کی محفل میں بہارِ فصلِ گل

گر جمالِ عالم آرا سے ترے محرم ہو | پھونکدے گلشن کو آہِ پر شرارِ فصلِ گل

نکہتِ جاں بخش وہ ہے ہر گلِ قالین میں | سونگھ کر ہو منفعل مدحت نگارِ فصلِ گل

بوئے تُندِ راوقِ عشرت سے تیری رات دن | مست لایعقل رہا کرے نگارِ فصلِ گل

ان شعروں کو دیکھکر ناظرین خیال فرما سکتے ہیں کہ آزاد اپنے جذبات کے اظہار پر کہاں تک قادر تھا۔ مضامین کی لطافت۔ الفاظ کی بندش۔ محاورات کی ترکیب۔ غرض ہر لحاظ سے اسکے قصائد مکمل اور اُسکے ایک پختہ کار شاعر ہونیکے ضامن ہیں۔ روانی بیان کو دیکھئے تو آمد کا پتہ چلتا ہے۔ آورد نام کو نہیں۔ گویا ایک دریا اُبلتا چلا آرہا ہے جسکی سطح مصفا خس و خاشاک سے بالکل پاک ہے۔

ختم قصائد پر صفحہ ۶۴ سے صفحہ ۱۵۶ تک غزلیات کا سلسلہ ہے۔ اسکے بعد صفحہ ۱۷۶ تک منظوم خطوط۔ تاریخی قطعات اور تضمینیں ہیں۔ غزلوں کی بیشتر سنگلاخ زمینوں میں وہ اس طرح پھلا پھولا ہے کہ باید و شاید۔ سلاست زبان۔ محاورات کی برجستگی۔ بے ساختہ پن۔ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہونے پایا۔ غزلیات میں اگرچہ کوئی مابہ الامتیاز خصوصیت نہیں پائی جاتی تاہم اُس نے اپنے رنگ کو شروع سے آخر تک نباہا ہے اور اسی ایک بات سے اسکی واقفیت اور وسعت نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہمارے اس خیال کو محض حسن ظن کا اقتضا نہ سمجھا جاوے تو ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ دیوان آزاد کے مطالعہ سے ایک خاص سرور دل میں پیدا

ہوتا ہے جسکا اندازہ صرف ذوقِ سلیم پر منحصر ہے۔
معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کی طبیعت ضرورت سے زیادہ جدت پسند تھی کیونکہ
اُسکی بعض تشبیہیں اور استعارے بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ قصیدہ کا ایک
شعر ہے ؎

چاند کو بالفرض اک چپراس گر دیجے قرار — چرخ چپراسی بنے تیر ادواں پھرنے لگے

ایک غزل کا مطلع ہے ؎

بارے خدا کے ہاں بھی تکلف قبول ہے — بیلِ فلک پہ ڈالی ستاروں کی جھول ہے

بعض اشعار میں غالب مرحوم کی طرز مدنظر رہی ہے مثلاً

شورشِ ہنگامۂ ذوقِ طپیدن دیکھئے — زلزلہ کو نیں میں اپنے دلِ بسمل سے ہے
دام گیسو میں پھنسے گا پے یک دانۂ خال — مرغِ دل تونے اُدھر گر ہوس کی پرواز
پانی کے بدلے پیتا ہوں تو رابہ سرشک — کھانا پسند غیر جراحت نہیں مجھے
پھرتا ہوں تنگنائے جہاں میں چھپا چھپا — طالع سے رستخیز کی طاقت نہیں مجھے
کیا خاک اشتہا ہو کہ جینے سے سیر ہوں — بے وجہ ترکِ فکرِ معیشت نہیں مجھے

آزاد کی زبان بالکل صاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی پورلنے شاعر کا یہ کلام ہی
نہیں۔ اس سے زیادہ صاف زبان اور کیا ہوگی ؎

بس دیکھنے ہی کے ہیں گرانمایگان دہر — پانی کا فیض کب ہے دُرِ آبدار میں
شراب ہووے جو تند ساقی نہ بے مزہ کر ملا کے پانی
پلا وہ ساغر کہ جس میں ہووے شراب آدھی گلاب آدھا
دلِ مجنوں پہ آبلہ لیلے — اک نمونہ ہے تیرے محمل کا
کل کی باتیں بھی یاد ہیں کہ نہیں — ہمسے صاحب کو ننگ و عار ہے آج
محفل سے تری اُٹھائیں گے ہم — یوں غیر کا دل بٹھائیں گے ہم

نہ دہن تم کو میسّر نہ کمر ہے پیدا ۔ تم سے محتاج سی پھر کیا کوئی سائل ہوگا

اِن شعروں میں مضمون کا بیساختہ پن ملاحظہ ہو ؎

کب دیکھ کے ڈرتے ہیں تری زلف دوتاہم ۔ گر ایک بلا وہ ہے تو ہیں ایک بلا ہم
تقدیر پہ شاکر ہے راضی برضا ہم ۔ اب کس کی شکایت کریں اور کسکا گلا ہم
وہ اُن سے بلا میں ہے تو ہم اُس سے غضب میں ۔ آنکھوں سے گلہ دل کے اور دل سے گلا ہم

متروک الفاظ آزاد کے کلام میں بہت کم ہیں۔ خال خال ایسے الفاظ ہیں جنکا استعمال فصحائے حال کے یہاں نہیں رہا۔ مثلاً کیونکہ (کیونکر) لیک (لیکن) دیکھ (دیکھکر) حضرتِ شیخ شروع ہی سے شاعروں کے آماجگاہ ہوئے ہیں۔ آزاد نے بھی اِن کی مزاج پرسی کی ہے۔ لیکن ظرافت کے ساتھ۔ متانت اور تہذیب ہاتھ سے نہیں جانے پائی۔ دیکھئے کہتا ہے ؎

یہ بزم بزمِ مغاں ہے ادب سے بیٹھ اے شیخ ۔ جو ناچنا ہے تو جا کر کسی مزار پہ ناچ
نماز کا ہے وہاں کیف جس جگہ واعظ ۔ شراب پانی کے بدلے ملے وضو کیلئے

آزاد کو تاریخ گوئی میں بھی بدرجۂ اتم مہارت تھی۔ اپنے بھتیجے وسیم کی پیدایش کی تاریخ کہی ہے۔ "ماہ لقا مشتری خصال"۔ ایک دوست کے غسل صحت پر یہ مادہ نکالا ہے۔ "برج آبی میں ہے تاباں آفتاب"۔ اپنے استاد عارف کے انتقال پر ایک پرزور مرثیہ لکھا ہے اور "عارف پسند رحمت حق ہو چکا ہے آج" سے تاریخ وفات نکالی ہے اور سرِ پاس سے تخرجہ کیا ہے۔ مرثیہ کے چند اشعار بغرض دلچسپی درج ذیل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرثیہ لکھتے وقت آزاد کو حضرت غالب کی روح سے فیضان پہنچ رہا تھا ؎

اے اہلِ دید دیکھیے تو آنکھ سے کیا ہے آج ۔ میں کیا کہوں کہ دہر میں کیا ہو گیا ہے آج
اے بیکسی کٹے گی مری عمر کس طرح ۔ جو مہرباں نواز تھا سو مر گیا ہے آج

ہم جسکے پاس بیٹھکے کرتے تھے غم غلط — اُسکا ہی یا نصیب جنازہ اُٹھا ہے آج

اے جذبِ اتحاد یہی ہے مدد کا وقت — وہ غم میں مجکو چھوڑکے تنہا چلا ہے آج

اے جانِ زار جانہیں یہ دیر حیف حیف — کچھ بھی ہے سر وفا تجھے اے بیوفا ہے آج

ناظرین کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آزاد کو ہر صنفِ کلام پر قدرت تھی اُسکی ہمہ دانی کا ہمیں اُسوقت اَور بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ باوجود اجنبی اور غیر زبان ہونے کے اُردو شاعری میں اُسے اسقدر مداخلت تھی کہ بہت سے ہندوستانیوں کو اُسپر رشک آئے۔ آخر میں اب ہم اُسکی غزلیات کا انتخاب مختصرًا ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ تاکہ پڑھنے والا آزاد کی قابلیت کا اندازہ بجائے خود کرسکے +

انتخاب اشعار

زہے وحدت وہی دیر و حرم میں جلوہ آرا ہے — ازل سے محو ہوں جسکے جمالِ حیرت افزا کا

دو عالم ہے یہاں تیرے گلِ رخسار کی قیمت — چمن میں غنچہ لیکر مشت زر نکلا تو کیا نکلا

جس قدر روتے گئے دونا ہوا سوزِ جگر — آب اشکِ چشم گریاں اُسپہ روغن ہوگیا

میری صورت سب کہے دیتی ہے میرا رازِ دل — میرے تیور دیکھکر وہ مجھ سے بدظن ہوگیا

جوش وحشت ہی کہیں زیرِ زمیں بھی یارب — خاک سے گل جو ہر اک چاکِ گریباں نکلا

ہوا ہے سوکھ کے ایسا ہی کچھ تنِ مجنوں — سمجھ کے کھائیو کانٹوں کو ناقۂ لیلا

کم تھی نہ مری زردیٔ رخ کاہ رُبا سے — ق — اندوہ جدائی میں بلا اَور بھی چمکا

ان شعلہ رخوں نے مجھے ازبسکہ تپایا — تو رنگ مرا مثلِ طلا اَور بھی چمکا

ملتا نہیں پھل عشق میں ان سروقدوں کے — سب حسن ہیں پر عیب ہے اک بے ثمری کا

اے سیمبرو ہم سے کھٹا پا نہ کرو تم — چاندی ہو مگر سر کوئی طالب ہے کھری کا

پلکوں پہ مرے لختِ جگر آئے ہیں کیا کیا — بے برگ درختوں میں ثمر آئے ہیں کیا کیا

جب مصیبت آپڑی جز صبر بن آتا نہیں — تو گرفتارِ قفس پھڑکا پھڑک کر رہ گیا

سوزشِ دل نے الٰہی کونسی کی تھی کمی — جو جلانے کو مرے داغِ جگر پیدا ہوا

تمام عمر رہا میں سبھوں سے بیگانہ — رہا میں آپ بھی غربت میں گو وطن میں رہا

حریصِ مایۂ ہستی تھا کس قدر آزاد — تمام عمر تلاشِ مئے کہن میں رہا

وہاں وہ آہ سے میری سدا خطر میں رہا — یہاں میں خفتِ معدومیٔ اثر میں رہا

صبح تک سب جاگتے ہیں شب کو سو سکتا ہے کون — نالہ پر شور سے ہی میرے گھر گھر رت جگا

بزم میں اُٹھتے ہی اُنکے روئے روشن سے نقاب — جامِ مے سورج بنا مہتاب مینا بن گیا

جب کہ جوش اٹھا خمِ دل میں شرابِ عشق کا — آبلہ دل کا ابھر کر آبگینہ بن گیا

سبوئے بادہ لگا دے منہ سے یہ کیسی کرتا ہے چہل ساقی

غضب ہے مجھ جیسے بادہ کش کو دیا ہے جامِ شراب آدھا

رکھ سکے وہ نازنیں کیا میری آنکھوں پر قدم — باعثِ ایذا ہے مژگاں مثلِ سوزن زیرِ پا

منتظر وہ ہوں چمن میں رات دن صیاد کا — جزوِ اعضا ہو گئی شاخِ نشیمن زیرِ پا

میکشی میں سخت مشکل ہے چھپانا راز کا — رنگ شاہد ہے شکستِ توبہ کی آواز کا

میری شامت تھی جو زلفوں میں کسی کی پھنستا

آ پڑی ہیں یہ بلائیں مرے سر آپ سے آپ

سرِ شوریدہ کس سے ٹکراویں — دشت سے عزم کوہسار ہے آج

جل چکے آنکھوں فلک یہاں اب آگے عرش ہے — اب سنبھل کر آہ کر اور کھینچ نالہ دیکھ کر

جب سے پایا دشمنوں نے پاؤں کا میرے سراغ — سر کے بل جاتا ہوں تب سے کوئے جاناں کی طرف

گر نہاں کفر و دیں ہے ہم سے آزاد عالم میں — نہ پہنچی ہاتھ تک تسبیح اور زنار گردن تک

آتا ہے نظر خانۂ صیاد گلستاں — جائینگا کہاں قصد کریں گے رہا ہم

ہنگامِ سحر بادہ گساری کا مزا ہے — اوقات کریں اپنی تلف بہرِ دعا ہم؟

زنار کو نہ توڑ کہ تسبیح بن گئی — لکڑی کے دانے ڈال دیئے جبکہ تار میں

بھولے نہیں ہیں تنگیٔ کاشانہ یاد ہے
کرتے ہیں شکر لیٹ کے کنجِ مزار میں

کیا لطف ہے بے لطف ہو گر عیش تمہارا
محفل میں اگر مجھسے نہ شرماؤ تو آؤں

کیا گھر میں تمہارے در و دیوار کو دیکھوں
تم اپنی جو صورت بھے مجھے دکھلاؤ تو آؤں

آج دشمن اگر خراب نہیں
کیا زمانے میں انقلاب نہیں

عالمِ مستی میں مجکو جب نظر آئے حباب
میں یہ سمجھا ساقیا واژوں ہیں ساغر آب میں

گرمیٔ رفتار کی آتش اگر باندھے ہوا
خاک اُڑ جائے چلے گر تو فسونگر آب میں

عقل سے باہر ہے میری تیرہ بختی کا بیاں
سنگ موسیٰ ہو اگر رُوں سنگ مرمر ہاتھ میں

تیرے دیوانے کے پیچھے کیا ہے لڑکوں کا ہجوم
کچھ ہیں پتھر جھولیوں میں کچھ ہیں پتھر ہاتھ میں

میں وہ ہوں راہ روِ وادیٔ وحشت مجنوں
راہ پر لاؤں تجھے راہ بتاؤں تجکو

از بسکہ خوفناک ہوں جورِ فلک سے میں
ڈرتا ہوں آسمان سمجھکر حباب کو

میں نہ کہتا تھا کہ دیگا صاف یہ مُنہ پر جواب
دیکھنا تم دیکھنا مست انجمن میں آئینہ

غالب ہے نازاُن کا ہمارے نیاز پر
سو گالیاں ہمیشہ سُنیں اِک دعا کے ساتھ

یا اُس کے در پہ شور نہ غصہ میں آئیے
یا خیر چاہیئے تو یہ درباں نکالیئے

ویران کرکے گھر کوئی صحرا بنایئے
باہر قدم نہ سوئے بیاباں نکالیئے

عیاں ہے سب میں کہاں ہے مخفی کب اُسکا جلوہ نقاب میں ہے
قصور اپنی نگاہ کا ہے وگرنہ کب وہ حجاب میں ہے

گر پڑے بننے سے پہلے ہو گئیں وہ خانہ خراب
میں کروں کاشانہ گر تعمیر اپنے ہاتھ سے

مجنوں سے یہ بھی ناقۂ لیلےٰ کا ہے سلوک
چھوڑا نہ خار دشت میں دامن کیواسطے

اغیار تیرے گھر میں اور ہم بہم نہ ہونگے
یا آج وہ نہوں گے یا آج ہم نہوں گے

لیلےٰ پہ تم یہ طرہ مجنوں سے ہم ہیں بہتر
تم کم نہیں ہو اُس سے ہم اُس سے کم نہوں گے

نہ دے جو بوسۂ گیسو نہ دے جواب تو دے
بلا سے جو تجھے دینا ہو وے شتاب تو دے

شراب روز تو ہم مانگتے نہیں ساقی
کوئی پیالہ دم ریزش سحاب تو دے

جب سے وہ خواری نہیں ہے تب سے وہ عزت نہیں
آبروئے عاشق دلگیر آدھی رہگئی

اُسنے اس طرح یکایک جو بگاڑی ہمسے
کچھ نہ کچھ بات رقیبوں نے بنائی ہوگی

پاؤں وحشت نے مری ایسے نکالے یک بیک
دیکھکر حیرت میں چشم حلقہ زنجیر ہے

میں تو وحشی ہوں مگر ان میں ہے خاصیت حبیب
جو چھٹے جاتے ہیں مجھسے مری صحبت والے

یہ مزا دیکھئے ہر زخم میں سو زخم ہوئے
ہر لب زخم نے بوسے وہ نمکداں کیلئے

مسجد و دیر میں پھرتے ہیں بھٹکتے آزاد
دل مرا کیوں نہ جلے گبر و مسلماں کیلئے

قرص نان سے فلک ناحق دکھاتا ہے مجھے
میں ہوں دیوانہ مرے کھانے کو پتھر چاہیے

وہ مکدر ہوا ہے دل اُسکا
کوئی صورت نہیں صفائی کی

ڈوب جانے میں کیا رہا باقی
آپ سے جبکہ آشنائی کی

وہ رشک کا عالم ہے کہ غیروں کا تو کیا ذکر
ہم وصل کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے

خیال زلف میں پیتا ہوں خون دل آزاد
دوآتشہ ہے یہ صہبائے مشکبوں کی

سید محمد فاروق - شاہ پوری

رباعی

جب قابل عفو ہی نہیں ہے یہ گناہ
یعنی - کہ کیا میں نے محبت کا نباہ
آخر - پھر انتظار کس بات کا ہے؟
حاضر ہے چھری اور گلا - بسم اللہ

(رنجور)

فرعون کی لاش

مولوی غلام نبی صاحب امرتسری نے شاید کوئی تین سوا تین برس کا عرصہ ہوا کہ ایک مسیحی بزرگ کو بڑے اخلاقی جوش کے ساتھ سورۂ یونس کی ایک آیت دکھلا کے کہا کہ فالیوم ننجیك ببدنك لمن خلفك آیۃ کے الفاظ صاف صاف بول رہے ہیں کہ پروردگار عالم و عالمیان نے ہمارے لیئے یا ہم سے بعد میں آنیوالوں کے لیئے خاص نشان قائم کرنے کیواسطے فرعون کی لاش اب تک سڑنے نہیں دی۔ بلکہ قائم رکھی ہے۔ اور عجب نہیں جس طرح "در و دیوار شکستہ" کے "نقش و نگار" سے "آثارِ قدیمہ" کا پتہ لگایا جاتا ہے یا جس طرح مصر کے کھنڈرات سے اکثر مشہور اشخاص کی مصالحہ بھری لاشیں ملتی ہیں اور سائنس کے جاننے والے اپنی قوت استدلالیہ کے مطابق کچھ اس قسم کے صغرے کبرے قائم کرتے ہیں کہ صحیح نتیجہ دریافت ہونے میں غلطی نہیں ہوتی اور اس شخص کی خاص لاش کا پتہ ملجاتا ہے جسکی فی الحقیقت وہ لاش ہوتی ہے اور جسکی نسبت اگر ابتدا میں کسی قسم کا شبہہ ہوتا بھی ہے تو وہ یقین سے بدل جاتا ہے۔ اسیطرح ممکن ہے کہ اس خدائی کا دعوے کرنے والے فرعون کی لاش بھی ملجائے تاکہ قرآن کی دی ہوئی خبر کے مطابق لوگوں کو پورا سبق مل سکے ،، تلاش سے مختلف علمی رسالوں سے مختلف باتوں کا پتہ چلا ہے جو تاریخی دلچسپی سے مملو ہیں +

ایک میں لکھا تھا " مسٹر بوٹا (فرانسیسی کونسل) اور ایک انگریز نوجوان مسمّے لیارڈ نے تل نمرود ایسا ڈھونڈ ھ کر نکالا ہے۔ جس سے قدیم اسیریا اور سلطنت نینوا کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ اسیریا (شام) کے بادشاہ آسور بنی پال کا ہ

کتب خانہ دریافت کیا جسمیں کتابوں کی بجائے اینٹیں رکھی تھیں۔ اور ایک ایک اینٹ بجائے خود ایک ایک زریں صحیفہ تھا کسی پر نجوم و رمل کے کرشمے تھے۔ اور کسی پر پیریوں کے عقائد و وظائف۔ کلدانیہ کی قدیم لغات کا مخزن بھی یہی تھیں۔ اور صرف و نحو کی کلید بھی۔ یہی رزمیہ نظموں کا خزانہ تھیں اور اخلاقی مضامین کا البم۔ خط پیکان میں عجیب عجیب تیر و نشتر رکھے تھے۔" دوسرے نے بعد چندے لکھا۔ "ڈی سارزک نے کلدانیہ کا وہ مشہور عالم کتب خانہ دریافت کیا ہے جسکو سرغولہ کہتے ہیں۔ اسمیں پہلے "کتب خانہ" کی نسبت یہ بات زیادہ تھی۔ کہ اینٹوں کے سوا بہت سے ایسے بت بھی دستیاب ہوئے جن کا مذکور سورۃ نوح کے دوسرے رکوع میں ہے کہ وَدّ۔ سُواع۔ یغوث۔ یعوق۔ اور نسر مصریوں کے خاص معبود ہیں۔ اسکے علاوہ بعض علمی مضامین نگاروں کی تحریروں نے ثابت کردیا کہ اب وہ زمانہ آگیا ہے جسمیں مصر کے قدیم بادشاہوں کی لاشیں برآمد ہو رہی ہیں اور آخر کار حال میں یہ پتہ لگا کہ فرعون کی لاش بھی مل گئی" اس قسم کے مضامین مولویصاحب کے دوستوں کے حلقہ میں بڑی دلبستگی کا باعث تھے۔ مگر اس آخری مضمون سے مولویصاحب کے دوستوں کو جس قدر خوشی ہوئی اُسکا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ مولویصاحب نے اسکے متعلق ایک مختصر سا خط (۱۸ - مارچ ۱۹۰۸ء کے وکیل میں) اور مسٹر صوفی نے ایک نوٹ (ابزرور لاہور میں) عوام الناس کی اطلاع کے لیئے مشتہر کیا۔ "آج کی سائنس نے ایک اور شہادت بھی دی یعنی فرعون کی لاش مصر کے کھنڈروں سے برآمد ہوئی تھی ہنوط سے بھر کر پھر رکھدی گئی"۔

لنڈن کے مشہور رسالہ سٹرینڈ میگزین کے فروری ۱۹۰۸ء کے نمبر میں ایک مضمون میری نظر سے گزرا میں نے مندرجہ ذیل معلومات کا وہ حصہ جو لاش فرعون کے متعلق ہے اُس سے اخذ کیا ہے۔

لفظ فرعون جو آجکل مروج ہے ایک عجیب لفظ ہے۔ فلالوجسٹ (ماہران علم اللسان) نے

بڑی جدوجہد کے بعد اسکی نسبت یہ فیصلہ دیا ہے "۔ فرعون مصری زبان کا لفظ ہے جسکا صحیح تلفظ زمانہ قدیم میں فارع تھا اور اسکے معنی آفتاب کے ہیں (تاریخ عالم صفحہ ۱۱) مصریوں کے نزدیک جس طرح آسمان کا حاکم فرعون (آفتاب) ہے۔ اسیطرح زمین کا فرماں روا شہی فرعون (بادشاہ) ہے مرور زمانہ کے بعد یہ لفظ بادنی تغیر عبرانی کی وساطت سے عرب میں پہنچا فرعون کسی خاص شخص کا نام نہیں البتہ ایک خاص خطاب ہے جو شاہان مصر نے اپنے لیے اسی طرح انتخاب کر رکھا تھا جیسا کہ آجکل سلطان خدیو۔ امیر۔ شریف تینہ وغیرہ۔ انجیل کے اس تاریخی حصہ میں (جسکا نام عہد عتیق ہے) یہی لفظ بغیر کسی خاص تمیز کے آٹھ یا دس بادشاہوں کے نام کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ ریوین صاحب کی رائے میں (کشنری آف بائبل) کچھ شبہ نہیں کہ انجیل کے پڑھنے والوں کو اس سے ایک گونہ مغالطہ ہوتا ہو کیونکہ جو فرعون جناب یوسفؑ کے زمانہ میں تھا وہ جناب موسیٰؑ کا ہمعصر نہ تھا۔ اگر اتنے ناموں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی اصلی نام مذکور ہوتا تو یہی غلطی کسی نہ ہوجاتی۔ سلطنت مصر جب فراعنہ کے ہاتھ سے چلی گئی تو جو خاندان انکے بعد فرماں روا ہوا اُسنے فرعون کی بجائے ایک ایسا لفظ نکالا جو عربی لفظ راعی (چرواہا) کا ہم معنی ہے۔ ابو القاسم بخاری نے اپنے نعتیہ قصیدہ کی ایک بیت میں اودھر ہی اشارہ کیا ہے ؎

باعیت آنچناں مری رعایت داشتہ ساختہ راعی شبانش را لقب مصرایں

قدیم زمانہ میں بزرگوں کی عظمت ۔ وقعت اور محبت لوگوں میں اسقدر رہتی تھی کہ انکے مرنے پر چین و جاپان والے اُنکی تصویریں بناتے ۔ بت تراشتے ۔ ماتھا ٹیکتے مقدس مقامات پر رکھکر پوجا کرتے ۔ ہاتھ جوڑتے ۔ سہرے چڑھاتے اور انکو معبود حقیقی کے برابر سمجھتے تھے۔ مصریوں میں بھی اکابر کی عزت کا خاص خیال تھا۔ وہ انکے بت تو بناتے نہ تھے مگر انکا پیٹ چاک کرکے آنتیں وغیرہ نکالکر ایک خاص قسم کے ہنوط

بھر کر اوپر سے سی ڈالتے تھے۔ کہتے ہیں یہ حنوط موم۔ تیل۔ سرشیس۔ مچھلی کی چربی اور دو ایک اور چیزوں کے ملانے سے بنایا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہوتا اُن کے ہاں اِس مصالحہ بھرنے کا یا مصالحہ بھری لاش کا کیا نام تھا۔ مگر آجکل انگریزی میں اِسکے واسطے لفظ ممی (بروزن میم اول مفتوح ووم مشدد مکسور) استعمال کرتے ہیں حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو پایا جاتا ہے کہ ممی دراصل موی ہے۔

جن کثیر التعداد صاحب اقتدار بزرگوں کے ہاتھ مصر کی عنانِ حکومت رہ چکی ہے اُن میں سے شاید ہی کسی اور شخص کا نام زبان زدِ خلائق ہو۔ جتنا کہ اس شخص کا جسکے ہاتھوں سے اہلِ وطن کو قید غلامی سے آزاد کرنیکے لیے جناب موسیٰ کو اکثر دست بدست لڑائی کی تکلیف دیگئی۔ چند سال اُدھر تک اِس بادشاہ کے حالات بالکل تاریکی میں تھے حال ہیں بعض ایسے محقق پیدا ہوگئے ہیں جنکے استدلالی طور پر توڑ جوڑ کرنیسے آخر بایہ ثبوت کو پہنچ ہی گیا کہ جس فرعون کے ساتھ جناب موسیٰ کو سابقہ پڑا تھا وہ منفتح بن ریمزیز ہے جسکی مصالح بھری لاش حال ہیں ایک بھرے مجمع میں کھولی جائے گی۔ (اِس لاش کے سر کا فوٹو رسالہ ہیں دیکے راقم مضمون ناظرین کو مخاطب کرکے کہتے ہیں) دیکھنا اِس وقت آپکے سامنے ایک بے سروسامانی میں وہ اولوالعزم شاہنشاہ ہے جسکو آج سے کئی ہزار برس اُدھر جناب موسیٰ کی آنکھیں دیکھ چکی ہیں۔

یہ لاش ڈاکٹر۔ ایم لورٹ نے عمن ہوتپ ثانی کے گورستان واقع باب الملوک (تھیبیز) سے پائی تھی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں قاہرہ کے عجائب خانہ میں پہنچائی گئی۔ اور تھوڑے عرصہ بعد اُسکی مختصر کیفیت دنیا کے مشہور آثار الصنادید کی مشتاق آنکھوں کیواسطے کئی بار اعلان پا چکنے کے بعد یہ قطعی فیصلہ دیا گیا کہ لاش مذکورہ کا صندوق جولائی سنہ ۱۹۰۷ء کے پہلے ہفتہ میں کھولا جائے گا۔ اِس خبر کو سنتے ہی دنیا بھر کے شوقین چاروں طرف سے دوڑے۔ پروفیسر ایلیٹ سمتھ (رائل سوسائٹی کے فیلو) کہتے ہیں۔ بمقررہ تاریخ سے

پیشتر ہی یورپ کی جملہ سلطنتوں کے قائم مقام سب سے پہلے قاہرہ پہنچے ہر ایک نے اپنی گزشتہ معلومات کو تازہ کرکے اور واقعات گزشتہ کو موجودہ حالات کے ساتھ مطابقت دیکے ایک نیا نتیجہ حاصل کرنے کی غرض سے شاہان مصر کی اُن شنوخت کردہ لاشوں کی رپورٹوں کو ایک دفعہ پھر دُہرایا جو ۷۔ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء سے پہلے تک تیار ہو چکی تھیں ؀

جب ۸۔ جولائی کا سورج افق مشرق سے برآمد ہوا تو سائنس والوں کی عجیب عجیب متحرک صورتیں قاہرہ کے عجائب خانہ میں ایک دوسرے سے بکمال خندہ پیشانی ملیں اشتیاق اور انتظار سے ایک ایک منٹ شاق تھا اُس چیز کے متعلق قسم قسم کی باتیں ہونے لگیں۔ جب وہ سربستہ صندوق سامنے آیا تو دور دور سے آنے والوں کی بے صبری اور بھی بے اختیار کر رہی تھی قبل اسکے صندوق کا ڈھکنا کُھلتا۔ حاضرین نے اُسکی صورت اور ساخت کو دیکھکر بے ساختہ یہی فیصلہ دیا "ہو بہو یہ صندوق بھی کسی اُسی قسم کے گنج خوبی کا مخزن ہے جو اس سے پہلے کے چند ایک صندوق ظاہر کر چکے ہیں۔ مزید برآں یہ صندوق ضرور اسی خاندان کے ساتھ خاص تعلق رکھتا ہے جن میں سے ریمزیز ثانی۔ سپ تاہ اور سیتی ہو چکے ہیں۔ تھوڑے سے اور غور کے بعد ہمہ تن سب کے سب ایک زبان ہو کے کہنے لگے "اسمیں کچھ شک نہیں کہ یہ لاش جو اسوقت ہمارے سامنے موجود ہے ایک ایسے شخص کی ہو جسکی حکومت کا زمانہ ریمزیز ثانی اور سیتی اول کے دو حکومت کے درمیان ہو۔ اگر یہ ٹھیک ثابت ہو جائے تو یہی سمجھو کہ جس فرعون کی لاش دستیاب ہوئی ہے۔ اُسکے متعلق جسقدر شک تھے سب جاتے رہے ؀

ناظرین ادھر جتنے عرصہ میں ڈاکٹر سمتھ صاحب صندوق کے اوپر کا تختہ الگ کرواتے ہیں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی حالات کو زیادہ دلچسپ بنانیکے

یئے کسیقدر اصلی واقعات تاریخ سے دیئے جائیں تاکہ اس سلسلہ میں کچھ اور بھی لُطف پیدا ہو ؛

جس خاندان کے بادشاہوں کا لقب فرعون تھا اُسکے بانی کو رامیزیا اعظم کہتے تھے۔ اس کے عہد میں سلطنت مصر کی حد وادی حلفہ تک تھی جو اُسکے بیٹے سیتی اول کے وقت میں شام تک بڑھی۔ ریمز ثانی (بن سیتی اول) کے زمانہ میں مملکت کا حلقہ بہت ہی وسیع ہو گیا تھا۔ یہ جوانمرد اکثر خود میدان جنگ میں جاتا۔ اور حریف سے کلہ بکلہ لڑتا۔ اسکا قول تھا "جو فائدہ دو بادشاہوں کی دست بدست لڑائی سے حاصل ہوتا ہے وہ فوجوں کو لڑانے اور کٹانے سے حاصل نہیں ہوتا۔" اُسکے وقت میں بہت سے غیر مفتوحہ اعلیٰ پایہ کے شہر بھی مقبوضات خاص میں شامل ہو گئے تھے سیتی اول اور ریمز ثانی کے مذاق میں بڑا فرق تھا۔ باپ کو تعمیرات کا شوق تھا اور بیٹے کو محاربات کا ذوق۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ دونوں میں باکمالوں کی قدر کا خاص جوہر تھا۔ سیتی اول کے بعد منفتح ہوا اسکی آرام پسند امن دوست طبیعت نے صیغۂ جنگ کیطرف اس قسم کی بے اعتنائی کی جسکا خمیازہ اُسکے بیٹے سیتی ثانی کو بھگتنا پڑا جسکے ساتھ فراعنہ کے خاندان کا دفتر بھی لپیٹا گیا"؛

اخاہ! پروفیسروں کی تجسس نگاہیں کس مزے میں اب اس صندوق کے اندر زرد ساٹن کے اوپر ایک مستطیل شکل دیکھ رہی ہیں جسمیں کوئی بھی تو ایسی چیز خصوصیت کیساتھ دکھلائی نہیں دیتی جو اُس لاش کو دوسری لاشوں سے تمیز کراسکے نہیں نہیں۔ سینے کے قریب ایک ہلکی سی سیاہی کی تحریر ہے گویا یہی اُس باجبروت سلطنت پناہ کی بچی کھچی پونجی ہے جسکی قلمرو کے نیچے کسیوقت مصر کی عالیشان سلطنت کے دونوں حصے تھے۔ دیکھو! لفافہ کے پُر ساٹن کے بند بھی کھولدیئے گئے جسوقت سینہ دکھلائی دینے لگا تو حاضرین میں سے ایک زندہ دل بول اُٹھے

یہی تو اس کا رہا سہا سرمایہ ہے۔ اب کیا اس سے بھی محروم کرنے کا ارادہ ہے؟

لانبی لانبی باہوں کے بعد کچھ کھلی کچھ بند مٹھیاں دیکھنے میں آئیں۔ اگرچہ اسوقت ان میں وہ سونے کا عصا نہ تھا جو کسی وقت میں فراعنہ کے اقتدار حکومت کا سچا نشان بن کے آخری دم تک ان کے ہاتھوں سے جدا نہیں ہوتا تھا مگر پھر بھی یہی معلوم دیتا تھا کہ خود بدولت اسکو تھامنے کیلئے ہمہ تن تیار ہیں کیونکہ اسکے نقل و حرکت کو انکی انگلیاں خوب جانتی تھیں۔ ہاتھوں کے بعد مشتاق نگاہوں کو اس پر جلال با رعب ذی وجاہت چہرے کی سوجھی۔ لفافہ جو سر کا تو قیافہ شناسوں نے ایک عجیب صورت دیکھی۔ ایک بھی چیز ایسی باقی نہ تھی جس سے وہ دیکھنے والے اسکے رنگ روپ چال ڈھال۔ یا چہرہ مہرہ کا اندازہ کر سکتے۔ منڈا ہوا سر۔ کتابی چہرہ۔ اونچی محراب دار ناک تو موجود۔ مگر آنکھوں کے نشان "گرد پس کارواں" سے بھی زیادہ معدوم۔

جب کتاب خروج والے فرعون کی لاش عجائب خانہ قاہرہ کی بڑی میز پر اس طریق سے کھولی گئی تو یہی معلوم دیتا تھا کہ تین ساڑھے تین ہزار کی طولانی مدت نے اسکی ذات پر بھی کچھ اثر نہیں کیا۔ البتہ وہ بات جسکی کمی فطرتاً اسکی زندگی ہی میں موجود تھی اسوقت بھی پائی جاتی تھی۔ یعنی چاند پر کوئی بال نہ تھا۔ پروفیسروں کی جماعت کے لئے اصول قیافہ شناسی کے مطابق کسی اور بات کا نکالنا مشکل نہ تھا۔ موجودہ حالت سے انہوں نے فوراً نتیجہ نکال لیا۔

(متوفی کا جسم فربہ۔ قد متوسط۔ معیار سے کسیقدر بڑھا ہوا۔ کالا رنگ۔ سر گنجا۔ چاند کے گرد جھالر کیطرح سر کے بال۔ صرف اوپر کا ایک دانت باقی۔ جسنے ٹھوڑی پر ناک کو گرنے سے روکا تھا)

گو یہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکا کہ اسکی موت کس طریق سے ہوئی ہے مگر قرائن اور فلسفہ استدلالیہ نے ثابت کر دیا کہ اسکے آخری دن کچھ اچھے نہ گزرے تھے

جلد کا ڈھیلا پڑ جانا صاف کہے دیتا تھا کہ غریب ایک ایسے مرض میں مبتلا ہوا تھا جسکی وجہ سے اُسکی آنتیں انجماد پذیر ہوگئی تھیں۔ اور دانتوں کے نہونے سے یہی کہہ سکتے ہیں کہ مرنیسے پہلے اِس صاحب اقتدار بادشاہ کو نعمائے دنیا سے ایک گونہ مایوسی تھی +

روما کے مشہور جادو بیان کیتھو نے اپنے ایک لکچر میں بڑھاپے کی عظمت بیان کی ہے اگر وہ منفتح کی اِس لاکش کو دیکھ لیتا تو سب سے پہلے اپنے اُس مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانیکے لیے اُس کے حالات سے نئی نئی باتیں نکالتا +

سٹرینڈ میگزین کے فاضل مضمون نگار پروفیسر بڈو صاحب نہایت ہی افسوس سے رقمطراز ہیں "جناب موسیٰؑ کی زندگی کے حالات جس تفصیل کے ساتھ عہد عتیق میں دیے گئے ہیں۔ گو وہ مجمل ہیں مگر پھر بھی اِس اجمال میں اسقدر تفصیل سے کام لیا گیا ہے کہ اُنکو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں جناب موسیٰؑ کے حریف فرعون کے حالات" بالکل ندارد ہیں"۔ خدا جانے پن ٹی اک (پنجگنج موسوی) کے مصنف نے کیوں اِسقدر اختصار سے کام لیا ہے کہ اجمالی حالات۔ ذاتی صفات اور خصائل سے درگزر کر اُسکا نام تک بھی نہیں دیا۔ حالانکہ فرمانروایان مصر میں سے جتنے شہرۂ آفاق ہو گزرے ہیں اُن میں سے جناب موسیٰؑ کے ہمعصر فرعون کے حالات زیادہ دلچسپی کا باعث تھے کیونکہ اُسکے دست تعدی کے باعث خدا کے پاک بندوں کو بھوسہ ملانیکے بغیر مٹی کی اینٹیں بنانے کی سخت تاکید کیجاتی تھی" اور زیادہ تر افسوس کی بات یہ ہے کہ عہد عتیق کی پہلی پانچ کتابوں کے لکھنے والے کی اختصار پسند طبیعت نے خود بنی اسرائیل کی غلامی کے زمانہ کے حالات نہایت ہی مختصر دیئے ہیں۔ وہی نہیں بلکہ اُنکے معاصرین کا بھی یہی حال تھا۔ اگر ایبی نو فی ام کے کھنڈرات میں سے ۱۸۵۶ء کو مسٹر پٹری ایک پتھر کی تحریر سے آگاہ نہ کرتے تو یہ بھی دریافت کرنا

شکل تھا کہ بنی اسرائیل کو اسقدر تکالیف کا شکار کرنیکے بعد وہ بہت ہی خوش ہوا تھا

پروفیسر بڈو کہتے ہیں "اُس زمانہ کے دستور کے مطابق سگی بہن سے بیاہ ناجائز نہ تھا۔ منفتح کی ماں اُسکی پھوپھی بھی تھی۔ اُسکے باپکے ایک سو گیارہ بچے تھے جنمیں یہ تیرھویں نمبر پر تھا۔ اِسکی ماں کا نام آئی سانوفرٹ تھا جسنے جناب موسیٰ کو اُسوقت دریا سے نکالکر سینہ سے لگایا تھا جبکہ فرعون کے چنگیزی حکم کے باعث صدہا ننھے ننھے بچے قبل اِسکے کہ بازار گیتی کی سیر کو اپنے پاؤں سے نکلتے "مہد لحد" میں لٹائے جاتے تھے۔ مگر انکی بھی مفصل کیفیت انجیل سے نہیں ملتی +

اِسکے علاوہ فرعون کے وہ حالات جو اُسکے عالم شباب کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں معدوم ہیں ساٹھ برس کی عمر میں باپ کی جگہ تخت نشین ہوا تھا اگر باپکے زمانہ میں ملک شام کے اندر انکو ہاتھ نہ دکھلاتا تو جنگجو بہادروں کو بڑے زور سے یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ فتوحات کا خانہ خالی ہے۔ آخری وقت میں اُسنے ملک میں کچھ مینار بنوائے تھے جب انکی کسی نے وجہ دریافت کی تو کہا "زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ آنیوالی نسلوں کے لیئے کچھ تو شاہی عظمت کا نشان ہے" +

اُسکے اعتقاد کی نسبت بعض آدمیوں نے اُس پروفیسروں کے مجمع کیساتھ اتفاق نہیں کیا۔ پروفیسر ڈیوڈ انکو مخاطب کرکے کہتے ہیں "آپ لاکھ اُسے ہٹ دھرم یا متعصب کہیں مگر خود ہی انصاف سے کہیئے اُس زمانہ میں جبکہ جادو اور شعبدوں کے باعث معجزات کو باسانی تسلیم کرنا عقل سلیم کا کام نہ تھا۔ تو کیا ملک کے فرمانفرما کو ایسا ضعیف الاعتقاد ہونا چاہیے تھا کہ ذرا سی بات پر پھسل پڑتا۔ معتقدات کے باعث لوگ چاہے اُسے کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔ مگر غور تو کیجیے وہ آدمی جسکے سامنے ایک شخص صغر سنی کے عالم میں دریا کے کنارے پر کی ریت سے مٹھیاں بھر بھر کر کھیلتا رہا ہو تھوڑے عرصہ کے بعد ایک ایسے خدا کے سہارے پر جسکا نام تکبھی پہلے سُننے میں نہ آیا ہو اچھا لاکھ

آدمی کی رہائی کے لیے دفعۃً آموجود ہو وہ اُسے ایک شعبدہ باز کے سوا اور کیا ہی کیا سکتا ہے +

فرعون کی موت کا سبب جو عام طور سے مشہور ہے بے بنیاد ہے کیونکہ نہ تو وہ (منفتح) اور نہ درجن بھر فراعنہ میں سے کوئی ایک بھی بحیرہ قلزم میں غرق نہیں ہوا۔ اور اس مصالحہ بھری لاش کے ملنے سے تو رہا سہا شک بھی جاتا رہا۔ گو ایک مدت مدید سے صوفیائے کرام بخار نوبتی کے تعویذ میں لکھتے چلے آتے ہیں کہ "لشکر فرعون غرق شد" مگر عوام الناس یہی کہے جاتے ہیں کہ لشکر کے ساتھ فرعون بھی! +

فرعون کے لشکر وغیرہ کے غرق ہونے کا ذکر کتاب خروج میں دو جگہ ہے۔

(۱) بنی اسرائیل کے تعاقب میں جسقدر سوار اور لشکر جا رہے تھے پانی نے جوش میں آکے ان سب کو ایسا ڈھانپا کہ ایک بھی نہ بچا (باب ۱۴ ورس ۲۸)

(۲) لشکر اور وہ لوگ جو فرعون نے بنی اسرائیل کے تعاقب کے لیے سمندر میں چھوڑ رکھے تھے چیدہ چیدہ افسروں سمیت سب غرق ہو گئے (باب ۱۵ ورس ۴)

مگر ان دونوں آیتوں سے یہ نہیں پایا جاتا کہ فرعون بھی غرق ہوا ہے یا نہیں اگر ایسا ہوتا تو بنی اسرائیل کچھ اُس سے ایسے ناواقف نہ تھے کہ اُس کا نام تک بھی نہ دیتے۔ پروفیسر بڈو صاحب لکھتے ہیں "اس واقعہ کو جس وضاحت کے ساتھ قرآن مجید نے لکھا ہے۔ انجیل مقدس میں نہیں۔ چنانچہ سورۂ یونس میں ہے۔

وَجَاوَزْنَا بِبَنِيْ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ

(ترجمہ) اور ہم نے فرزندان یعقوب کو دریائے قلزم سے نکالا اور جب اُن کے عقب میں ایک جو فرعون ازرہ مخالفت سے بھرا ہوا فرعون اور اسکا لشکر آیا اور غرق ہونے لگا تو کہا میں اس بات پر ایمان لایا کہ کوئی خدا نہیں سوائے اُس معبود کے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی مسلمانوں میں ہوں کیا اب تو ایمان لاتا ہے

قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝	اور اس سے پہلے تو مفسدوں میں سے تھا۔ باوجود
فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ	تیری ان سب باتوں کے (اے فرعون) اب ہم تیرے
لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ	بدن کو نجات دیتے ہیں تاکہ (تیرا جسم) ان لوگوں کے لیے جو
النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝	تجھ سے بعد میں آنے والے ہیں نشانی ہو۔ کیونکہ بہت
(یونس)	آدمی (ابھی) ہمارے نشانات سے ناواقف ہیں +

اس عبارت میں خط کشیدہ حصہ اس قدر صاف ہے کہ ایسکے لیے کسی شرح و کشاف کی ضرورت نہیں۔ البتہ جو کچھ مفہوم ہے بالصراحت ہے یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جبکہ فرعون اپنی موت مرا ہو +

بعض کا یہ بھی خیال ہو سکتا ہے کہ لشکر کیساتھ فرعون بھی غرق ہوا ہو۔ اور بنی اسرائیل کو اُس کے غرق ہونیکا شبہہ ہوا ہو۔ اور اُسوقت پروردگار نے دریا کو یہ حکم دیا ہو کہ فرعون کی لاش سمندر کی تھاہ کے پانی کی سطح پر نکال دے۔ اور پھر اُس کے دستیاب ہونے پر کسی نے اُس لاش کو حنوط وغیرہ خوشبو سے بھر کے مومی لاشوں کے ساتھ رکھدیا ہو۔ مگر راقم مضمون خود ہی اسکا جواب دیتے ہیں کہ اس بات کے ماننے میں ہمیں ذرہ بھر بھی کلام نہوتا بشرطیکہ وہ ڈاکٹروں کا مجمع جو صرف منفتح کی لاش کا تماشا دیکھنے کی غرض سے ہزاروں میل کا سفر طے کرکے قاہرہ میں آیا تھا یہ تصدیق کردیتا کہ "مصالحہ بھرنے سے پہلے یہ لاش ڈوب چکی تھی" +

اللہ اللہ! اس وقت جبکہ ممفس کی عظمت مٹ چکی تھی۔ تھیبیز کا جاہ جلال جو آج سے تین ہزار برس اُدھر تاریخی اوراق میں تھا مفقود ہے۔ مصر کی سلطنت ہزارہا قسم کے انقلاب دیکھ چکی ہے اپنے عہد کے صناعوں کی بدولت ایک فرعون بے سامان موجود ہے۔ اور اِسی حالت میں اُسوقت تک رہیگا جبکہ مصر کا تحریر اور فلسفہ کا دیوتا تاثت اُسکے دل کو اپنے میزان عدل میں پر کے ساتھ تول کے

دیکھیگا کہ وہ مصریوں کے سولزیشن کے دیوتا اوسیرس کے دربار میں حاضر ہونے
کے قابل ہیں یا نہیں۔ کیونکہ فرعون کے زمانہ کے بت پرستوں کا یہ عام عقیدہ
تھا کہ مرنیکے بعد بھلے آدمی تو آسمان پر فرشتوں کے ساتھ خدا کے تعریفی گیت
گاتے اور مناجاتیں پڑھتے ہیں) باوجودیکہ مصریوں کے دیو مالا کے سب واقع
اب بکھر چکے ہیں۔ وہ شخص جو بھی ارادتمندی کی دُھن میں اپنے دیوتاؤں کیواسطے
جان تک فدا کرنیکے لیے تیار رہے اپنے جسم کے باعث ابدالآباد تک سائنس کے
دلدادوں کو خدا کی خدائی کا ثبوت دیکر قائل کرکے رہیگا۔

میر کرامت اللہ۔ از امرت سر

غزل

چوں غبارِ من صبا بر دوشِ جاں خواہد کشید
سُرمہ از خاکم بچشمِ مہوشاں خواہد کشید

با دلم ہستند اندوہ و تمنا در فراق
تا کجا اُمّید ناز ہمرہاں خواہد کشید

جاں بلب مشتاقِ دیدار است ای بیدادگر
انتظارِ وعدۂ فردا چساں خواہد کشید

ساقیا خونِ تمنائے رنداں بر سرت
تیغِ ابرویت چو شمشیر از میاں خواہد کشید

شوخیِ جوشِ شبابِ تو بہ شبہائے وصال
پردۂ شرم و حیا را از میاں خواہد کشید

آرزو دارم کہ بینم روئے زیبایت شود
چوں ز جسمِ من اجل روحِ رواں خواہد کشید

دُودِ آہِ سینہ سوزانِ من وصف کُوں
آسمانِ نو بزیرِ آسماں خواہد کشید

محمد عبدالرزاق وصف سابق تخلص بیکس جبلپوری

آہ! یہ نظریں!

(ایک ہندوستانی مغنیہ کو)

تھکی ہوئی تمام شبہائے عشق کی بقیہ مسرتِ مخمور سے تھکی ہوئی نظریں تیری آنکھوں سے جو سرمست دشیدا و پُرلطف دقیقے دینے کے وعدے کرتی ہیں، ان آنکھوں سے نکلنے والی ہلکی نظریں!

ان سیاہ آنکھوں کی سوزان ظلمتوں میں، میں ایک ایسا مبہم اشارہ دعوت پاتا ہوں کہ میری روح ان نیوتوں کو دیکھ دیکھ کے حرص سے لرزنے لگتی ہے۔

جب تک کہ تیرا لطف خریدا جاتا ہے، تو چاہے جتنی اونچی ہو، جتنی چاہے اونچی بن، عسیر الحصول نظر آ، میں بھی لک پوری رات، ایک لمبی رات تیرے بے کینہ سینے میں گزارنا چاہتا تھا، مگر میرے شوق میری آتش اشتیاق کو جو تیرا کل جز و روح چاہتی ہے، تیری بے حیائی، تیری بے حراستی! تیری بے معنی زائل کرتی ہے، بجھا دیتی ہے۔

تیرے چاہنے والے جو تیرے دل تک ذرا نہیں پہنچ سکتے، جو پیسے بکر تجھ تک پہنچتے ہیں، اُنکے لیے تیرے نشے کسقدر بارد، تیرا اظہارِ شوق کسقدر جھوٹا اور تیرا گلے ملنا کسقدر بے سنکراہ، تیرے بوسے کسقدر تھکے ہوئے کور ست ہیں۔

یہ جانتا ہوں مگر پھر بھی! یہ آنکھیں، یہ سیاہ آتش سے بھڑکنے والی سیاہ آنکھیں، اور انکی متلاشی ظلمتیں جو تجسس معلوم ہوتی ہیں۔ یہ خانماں سوز

متانت میں۔ لیکن تپش میں جب میں اپنے تئیں پاتا ہوں تو میں بھی یہ چاہنے لگتا ہوں کہ چاہے کچھ ہو میں بھی ان آنکھوں کی ظلمتوں میں ڈوب جاؤں، میں بھی اِس آتش سے اپنے تئیں جلالوں، اک رات تو ان آنکھوں سے مسرتِ آلام ہوں +

اور اگر کہیں تو عملی محبت کرے، اُف! کہیں تو اک ذرا چاہے۔ اُس وقت دیکھتی ہو، اُسوقت کو سوچ کے اور اپنے پر نظر ڈال کے، اپنی روح کو دیکھ کے میں اِس طرح ڈرنے لگتا ہوں جس طرح اک پُر طوفان رات کی پر شور تاریکی سے کوئی ڈرے +

نہیں، نہیں، جا، جا، میں نہیں چاہتا۔ اور اپنے ساتھ اپنی اُس آواز کو بھی لیجا جو میری روح کو زیر وزبر کر رہی ہے، اور اُس بھٹکے ہوئے نغمے کو بھی ساتھ لیجا جو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی محترص بغلگیری سے حاصل ہوا ہے +

اتنی دور چلی جا کہ تیری آواز کو، تیرے گانے کو نہ سن سکوں، تجھے نہ دیکھ سکوں اور تو بھی چلے موسیقی، آہ! اے موسیقی، تو بھی چپ ہو جا۔ وہ غزل نہ گا، وہ راگ نہ گا، جو مجھے زندگی کی سب سے بہتر اک رات کی یاد دلاتا ہے۔ اُن حرارتوں کو اُن شعروں کو جو میری روح میں مستور ہیں، بحران و ہیجان نہ دے +

کیونکہ میں خود اپنے سے، اپنی طاقتِ تحمل سے مشتبہ کرنے لگا ہوں، کیونکہ میں ڈرنے لگا ہوں کہ میں اِس عورت کیلئے سب کچھ کر گزروں گا۔ میں ڈرتا ہوں کہ میں اپنی متانت کھو بیٹھوں گا، اپنی سلامتی، اپنی انسانیت جسے میں اب تک قائم رکھ سکا ہوں، ہاتھ سے دے بیٹھوں گا +

چپ رہ، دیکھ میں کانپ رہا ہوں، دیکھ میں مرا جا رہا ہوں +

یلدرم

انگریزوں کا کیرکٹر

امریکا کے مشہور نثر نگار ایمرسن کے اُس مضمون کا جس میں اُسنے قوم انگریزی کے کیرکٹر یعنی مجموعہ خصائل سے بحث کی ہے ترجمہ کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ ایمرسن کی نثر ویسے ہی مشکل سے ترجمہ ہوتی ہے لیکن اس مضمون کے بعض حصوں میں غیر معمولی دشواریاں تھیں۔ ہمارے لائق دوست مسٹر نذر محمد صاحب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس کی محنت قابل داد ہے کہ انھوں نے اِس مضمون کو اردو کا لباس پہنایا ٭

انگریزوں کی قوم زندہ دلی میں ازبس مشہور ہے لیکن میرے خیال میں شمالی مقامات کے پاس کی قوموں کی بہ نسبت انکے چہروں پر کچھ زیادہ ملال کے آثار نہیں پائے جاتے۔ بمقابلہ اُن اقوام کے جن میں گانے بجانے کا زیادہ رواج ہے انگریز تفکر کے عادی ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ بہت زیادہ مغموم رہتے ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ جلد بازی سے نفرت کرتے ہیں اور متانت سے کام لیتے ہیں۔ اور گھر میں بیٹھے ہی ذریعہ فرحت تلاش کر لیتے ہیں۔ انکو اس بات کا بھی یقین ہے کہ جہاں زندگی کا لطف نہ ہو وہاں قال میں یا حال میں نہ تو زور ہوتا ہے نہ سلیقہ۔ وہ جانتے ہیں کہ خوشدل آدمی دن بھر چل سکتا ہے۔ اور غم آلود ایک کوس میں ہی تھکن محسوس کرتا ہے۔ فرانسیسی سیاحوں نے اپنے تذکروں میں انگریزوں کی خصلت کو افسردگی سے تعبیر کیا ہے۔ فراسٹے سارٹ[۵۱]۔ والٹیر[۵۲]۔ لاساج[۵۳]۔ مرابو[۵۴] سے لیکر اخبار نویسوں تک اپنی ظرافت اس بات میں صرف کرتے رہے ہیں کہ اپنے ہمسایوں (یعنی انگریزوں) کی سنجیدگی پر پھبتیاں کہیں۔ بقول اہل فرانس انگریزوں کے ملک میں

---

۵۱ فرانسیسی مورخ اور شاعر [illegible] سے [illegible] تک ۵۲ فرانس کا نامور ادیب [illegible] سے [illegible] تک ۵۳ فرانس کا مشہور افسانہ نویس اور ناٹک لکھنے والا [illegible] سے [illegible] تک ۵۴ فرانس کے زمانہ انقلاب کا ایک عظیم رکن

وہ گفتگو ہی نہیں ہوتی جسمیں زندہ دلی پائی جائے۔ انگریزوں کو سوچ بچار کے سوا کسی چیز سے سروکار نہیں۔ جب وہ دل بہلانا چاہتے ہیں کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اُن میں خوش مزاجی کا وجود ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کسی کو بخار کا مرض لاحق ہو جائے مذہبی امور۔ ناچ گھر۔ اپنی ملک کی کتابوں کا مطالعہ سب کے سب انکے طبعی ملال کے ازدیاد کا موجب ہوتے ہیں۔ پولیس کو کافہ انام کی تفریحات سے کیا مطلب؟ لیکن اس بے تسکین قوم کو جو خوشیاں یا تفریحات گاہ گاہ نصیب ہوتی ہیں۔ اُنکی پولیس بھی قدردان ہے (یعنی اُنکی تفریحات بھی مقبوض یا زیر حراست ہوتی ہیں) اور یہ جو انگریزوں کی بہادری مشہور ہے۔ اُسکی وجہ صرف یہی ہے کہ اُنکو جان کی کچھ پروا نہیں ہوتی۔

میرا قیاس یہ ہے کہ اُنکے متین رویہ اور کم گوئی سے اُنکو یہ شہرت حاصل ہوئی ہے میرے خیال میں اطالیان امریکا کے مقابلہ میں وہ خوش طبع اور زندہ دل ہیں۔ اس ملک امریکا میں نوجوان انگریزوں سے زیادہ اندوہگین رہتے ہیں۔ انگریزوں کے چہرے سے ملائمت برستی ہے۔ اور اُنکی آواز میں ایک گونہ خوش طبعی کی گونج ہوتی ہے۔ وہ فراخ دل ہوتے ہیں۔ اور جنوبی ملکوں کے باشندوں کی طرح اُنکے دل آسانی نہیں بہل سکتے۔ ہم لوگ اُنکے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے بچے بزرگوں کے سامنے فضول تماشوں کی بجائے انگریزوں کو کیا مطلب ہے؟ یا جنگ ہو یا تجارت یا تعمیرات یا علوم۔ وہ متفکر اور عزلت پسند ہوتے ہیں۔ اگر باغ میں بھی سیر کرنے جائیں تو تنہائی کو ہی مرغوب سمجھتے ہیں۔ فرانسے سارٹ کہتا ہے کہ اُن کے تماشوں میں بھی حزن مضمر تھا میرے خیال میں کسی قوم نے اپنے آپ کو اسقدر کثیف دیواروں میں جکڑ بند نہیں کیا۔ نہ کسی قوم کے باغوں کی چار دیواری کی بلندی اسقدر تھی (یعنی کوئی قوم اسقدر گوشہ نشین نہ تھی) نہ اُن پر شراب کا اثر ہوتا ہے نہ گوشت کا۔

طعام کا آغاز ہو یا انجام۔ وہ بدستور بے جوش، خموش اور مجتمع خاطر رہتے ہیں +

انگریزوں کی کم گوئی چھ سات سو برس سے شہرہ آفاق ہے۔ ہوس آف کامنس (انگلستان کے طبقہ عوام) میں جو ناقص تقریریں ہوتی ہیں۔ اُن پر ایک گونہ فخر کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل انگلستان یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کی حیات کا مدار زبان پر نہیں۔ یا یہ خیال کرتے ہیں کہ جب وہ جنٹلمینوں (شرفا) کا لب لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ بخوبی تقریر کر سکتے ہیں۔ جہاں مختلف قسم کے آدمی شریک محفل ہوں وہ سکوت اختیار کرتے ہیں۔ یارک شائر کے ایک کارخانہ کے مالک نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ میں نے لنڈن سے لیڈز تک کئی مرتبہ اوّل درجہ کی ریل گاڑی میں سفر کیا ہے۔ اور ہمیشہ دیکھے بھالے اشخاص سے سابقہ پڑتا تھا لیکن ہمکلام ہونے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میل جول کو زیادہ کرنے کے واسطے کلب گھر (محافلِ تفریح) بنائے گئے ہیں۔ لیکن شاذ ہی ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ دو شخص سے زیادہ مِلکر کھاتے ہوں۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ اکیلا آدمی کھانا کھاتا ہے۔ بریں حالات کیا متعین سوئیڈن برگ[1] کو ظرافت کی چوٹ سوجھی تھی یا بے درد منطق کا خیال آیا تھا کہ اُسنے انگریزوں کا قومی خاصہ یہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کو بہشت خیال کرتے ہیں +

ایک پہلو سے تو اُن کو ترشرو۔ زود رنج اور ضدی (کج بحث) خیال کیا جاتا ہے۔ دوسرے پہلو سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نرم مزاج۔ شیریں مقال۔ اور

---

[1] سوئیڈن برگ۔ اٹھارویں صدی کا مشہور فیلسوف تھا۔ علم طبعی میں اسکا کمال مشہور تھا لیکن اُسکی زیادہ تر اسکی شہرت نقہ نویسی کے باعث ہے۔ سٹاک ہالم میں ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوا۔ آپسالا کی یونیورسٹی میں (ڈاکٹر آف فلاسفی) ہوا۔ اسکی تصانیف کثیر ہیں۔ علم طب میں اسکو دخل تھا۔ اسکی کئی کتابوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو چکا ہے عالم ارواح کے علم سے بھی ماہر تھا۔ اسکی طرز تحریر زبردست ہے ہمیشہ اپنے خاص ہو پر ... کا شہرہ کیا ہو۔ ۱۷۷۲ء لندن میں ۱۷۷۲ء میں فوت ہوا +

ذی شعور ہیں - حق تو یہ ہے کہ انکے خصائل کا دائرہ نہایت وسیع اور بو قلمون ہے - مختلف طبقوں کے لوگ غیر ملکوں میں بغرض تجارت جاتے ہیں - مغلوب الغضب اہل ویلز - پُرجوش اہل سکاٹ لینڈ - شرق الہند یا غرب الہند کے صفرادی مزاج باشندے ایک تعلیم یافتہ اور خاندانی ممتاز کے باکمال خصائل سے کوسوں دور ہیں - ایسا ہی بٹے کٹے کسانوں کا حال ہے - دیہاتی امرا کو بھی اس زمرہ میں سمجھو - انکی تنگ خیالی اور جاہلانہ زندگی کا کیا ٹھکانا ہے: ہوٹلوں میں ایک تجارتی کمرہ ہوتا ہے - اسمیں وہ لوگ اکثر فروکش ہوتے ہیں جو اپنے پاس کسی کارخانہ کے نمونے ایک تھیلے میں رکھتے ہیں - اور کسی شخص کو کوئی نمونہ پسند آجائے تو اسکے لیے کارخانہ سے وہی چیز منگانے کا انتظام کرتے ہیں - یہ لوگ بھی سیلاح کہلاتے ہیں: ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ غیر ملکوں کے لوگ باسانی اس قسم کے لوگوں کے ذخیرہ سے اہالیان انگلستان کے خصائل کا مقیاس تصور کر لیتے ہیں - کیونکہ یہ لوگ انکو کیا راستہ میں اور کیا شراب خانوں میں ملجاتے ہیں - حالانکہ شرفا کا یہ دستور ہے کہ اول تو وہ میخوانوں سے احترازکرتے ہیں - اور اگر ان میں جائیں بھی تو خلوت میں رہتے ہیں +

دراصل یہی لوگ انگلستان کے ٹھیٹھ باشندے کہلاتے ہیں اور قومی خاصہ حقیقت میں انہی سے معلوم ہوتا ہے - کیونکہ انپر ابھی فنون اور تعلیم کا اثر پڑا ہوا نہیں ہوتا - وہ محبت کرتے ہیں تو بڑھکر - نفرت کرتے ہیں تو ازحد - کسی کی تعریف میں جلدی نہیں کرتے - اور کرتے بھی ہیں تو کچ بحثی کو ہاتھ سے نہیں دیتے - خلاصہ یہ کہ انکے مزاج کو اِس قسم کا رنگ چڑھا ہوا ہوتا ہے جیسے کوئی گہری نیند میں سوتا ہو - اور بیدار ہونیکے نام سے بھی ناآشنا ہو - انکی عادات اور میلان طبع فطرت کے موافق ہوتے ہیں - انکو کسی جگہ سے خاص محبت نہیں ہوتی -

زمین ہو یا سمندر جہاں سے منفعت نظر آئی وہیں کے ہو رہے۔ انکی طاقت بھی
ناتراشیدہ سی ہوتی ہے۔ اور ورزش بھی اکھڑپن سے کرتے ہیں۔ بدن دیکھو تو قصّاب
کے بکرے سے کم نہیں۔ سوتے ہیں تو بلا کے۔ زندگی کے طرزِ عمل کا کوئی اشارہ یا
کوئی شاعرانہ کنایہ جس سے اس قسم کی سیدھی زندگانی پر حرف آتا ہو۔ انکو ایسا معلوم
ہوتا ہے جیسے کوئی انکی چوٹی کاٹ کر غذا کی بہم رسانی بند کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی
شخص اشتہا سے کھانا نہ کھائے تو اسکی خامیٔ عقل پر محمول کرتے ہیں۔ اور اگر انکو
معلوم ہو کہ وہ بالخصوص پاکدامن ہے تو رونے سے سر ہلاتے ہیں۔ انکی اصلیت دیکھو
تو معلوم ہوگا کہ عام انگریزوں میں مجنونانہ لاپروائی پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات اکھڑپن
اور بدمزاجی بھی نظر آتی ہے۔ انکی دلی آرزو ہوتی ہے کہ اقتدار زیادہ ہو۔ ہر وقت لڑائی
چھنی رہے۔ اور بقول شاعر "خشم آلود نا تھمبر لیسنڈ کے لیئے اگر مرصد ہو اور دشمن کے
حسد سے زحمت ایام آجائیں تو انکا مقابلہ کریں"۔

وہ بڑے ضدی ہوتے ہیں اور اپنی رائے کا انہیں بہت پاس ہوتا ہے
جس بات کا خبط ہو جائے اسپر ایسے جم جاتے ہیں کہ اپنی ہٹ سے باز نہیں آتے
ہینری کیلی ووارڈ نے کتاب "خدا کی مناجات" کے برخلاف ایک کتاب لکھدی تھی اور کچھ
تعجب نہیں کہ برٹن[1] (جسنے ایک کتاب متعلم تشریح غم لکھی تھی) اسنے علم نجوم سے اپنی
موت کا وقت معلوم کر کے خود ہی گلے میں رسی ڈال لی ہو تاکہ اسکا زائچہ غلط نہ ثابت ہو

ان کے بشرہ سے اسقدر مضبوطی مترشح ہوتی ہے کہ کوئی انپر غالب نہیں
آسکتا۔ ان کو میدان سے بھاگ جانا نہایت ہی دشوار ہے۔ وہ میدان میں کٹ کر
مر جاتے ہیں۔ فوج لائف گارڈز کے بانکے جوانوں کے بارہ میں جن کی پرورش

[1] ۱۵۷۶ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۰ء میں فوت ہوا۔ انگریزی فقیہ تھا۔ اسکی کتاب "تشریح اندوہ" نہایت
دلچسپ فلسفیانہ اور معقولیت سے پر ہے۔ مگر آج کے زمانہ کے طرز بیان کے سخت مخالف ہے۔

پڑے ناز و نعمت سے ہوئی تھی۔ "ویلنگٹن" نے کہا تھا کہ "کتے کے پلے خوب لڑتے ہیں"۔ نیلسن نے اپنے جہازرانوں کی نسبت کہا تھا کہ حقیقت میں انکو چھرہ کی کچھ پرواہ نہیں یہ سمجھتے ہیں کہ سر کے واسطے ہیں"۔ بضبوطی میں تو قطعی طور پر کسی قوم میں ایسے افراد نہیں مل سکتے۔ قلعوں پر بلا کرنے میں جنگی جہازوں میں بزور گھس جانے میں تیزی دم تک لڑتے رہتے ہیں۔ یا اور کسی جان توڑ کر کرنے والے کام میں جسمیں روز و رتن کی طرح صفائی اور عزت افزائی ہو وہ فرد ہیں۔ لیکن میرے خیال میں نہ تو وہ شکنجے کے عذاب کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ نہ وہ مجہول طور پر منقاد ہونا پسند کرتے ہیں مثلاً کسی مطلق العنان بادشاہ کے حکم سے وہ کوٹھے پر سے کود کر ناگوارا نہیں کرتے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ چونکہ انکے رگ و ریشہ کا نظام مکمل ہوتا ہے وہ تکلیف کو بہت جلد محسوس کرتے ہیں۔ اور اپنی زیرکی کے باعث معاملات کا عقلی اور شاندار پہلو معلوم کر لیتے ہیں +

انکی طبیعت میں ضرورت سے بھی زیادہ زور ودیعت کیا گیا ہے۔ اس فاضل مادہ کے ذریعہ سے وہ کسی کام کو ختم کرنے میں دلیری۔ فن شعر میں ذہن رسا۔ علم جو تحقیق میں جدت طرازی۔ تجارت میں اولوالعزمی۔ دولت میں چہل پہل۔ سوسائٹی میں کروفر جوانی میں تیزی اور منصوبہ بندی ظاہر کرتے ہیں۔ نوجوانوں کو ایسی تنومندی حاصل ہوتی ہے کہ اس سے اخلاط فاسدہ پیدا ہوتی ہیں۔ وہ شراب کو پانی کی طرح پی جاتے ہیں۔ اپنی فاضلہ طاقت کو سواری۔ شکار۔ شناوری اور پٹہ بازی میں صرف نہیں کر سکتے۔ بلکہ ایسی بیہودہ شوخیاں کرتے ہیں جیسے کوئی غضب[1] کا بھتنا بڑی سنجیدگی سے ستیاناس کر دیتا ہے +

نذر محمد بی اے

[1] یونانی فسانوں میں یومینیڈیز نیک مزاج دیویوں کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ بجائے ایرینیز غضب کی دیویوں کے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انکو اصلی نام سے پکارنا بدشگونی خیال کیجاتی تھی مقابلہ کرو ذات شریف

پیاری

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

آنند۔ سمادھی کی حقیقت بیان فرمائیے؟

باواجی۔ سمادھی بہت پرانی رسم ہے۔ خیال کی پریشانی اور پراگندگی اور سراسیمگی مشہور ہے۔ یہ چنچل سبھاؤ دماغی فعل ہر لحظہ مصروف رہتا ہے۔ کبھی کوئی خیال کبھی کوئی۔ متواتر آتے جاتے ہیں حتی کہ نیند کی حالت میں بھی قوت تخیلہ مصروف رہتی ہے۔ سمادھی سے مراد ہے ایک ہی خیال کو منضبط کرنا دوسرے خیال کو آنے نہ دینا۔ ایک ہی خیال کے مختلف پہلو سوچنا اور اُن پر غور کرنا۔ اِسی مشق میں انسان اپنی ترقی کرتا ہے کہ شادی مرگ کا فلسفہ اِس پر روشن ہو جاتا ہے اور اُسکی طبیعت سکون پاتی ہے۔ اخلاقی اصول اُسکی طبیعت پر اثر پیدا کرتے ہیں اور ایسا ہی شخص ناواقفوں کو تعلیم دے سکتا ہے۔

داس۔ مہاراج! یورپ کے لوگ اِن سمادھیوں پر ہنسی کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ جنون ہے جو ایشیائی ملکوں میں صدیوں سے جاری ہے۔ بقول اُن کے ملکی ترقی کرنی چاہیئے تاکہ تہذیب کی ترقی ہو۔ ہندوؤں کو تو وہ بالخصوص روحانی مزاج کہتے ہیں اور یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ خبطی ہیں۔ دولت کا اکتساب یورپ کے

باواجی۔ یہ امر صحیح نہیں کہ ہندو محض روحانی مزاج ہیں۔ دنیوی ترقی سے ہندو کبھی غافل نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیوی ترقی کے ہر ایک صیغہ میں ہندوؤں نے اعلیٰ ترقی کی ہے۔ اُسکے ساتھ ساتھ روحانی ترقی بھی کمال کے نقطہ تک پہنچ گئی تھی۔ جہاں لباس کے لیئے کمخواب و طلمہ ستارہ سونے چاندی کے لچکے بنے۔ جہاں ذائقہ خوراک کے لیئے صدہا قسم کے مربہ و آچار اور بیشمار خوشبودار

مصلے استعمال ہوئے۔ جہاں سواری کے لئے ہاتھیوں اور گھوڑوں کو دلہن کی مانند سجایا گیا۔ جہاں جواہرات کی اتنی فراہمی ہوئی۔ جہاں علوم و فنون نفیسہ کی ترقی ہندوؤں کے راگ اور سازوں اور عمارات و نقاشی سے ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں خوشبوؤں کی انتہا نہ رہے ایسے لوگوں کو محض روحانی کس طرح کہہ سکتے ہیں یوں کہو کہ انکی دولت اور حشمت دیکھکر یورپ کی رال ٹپکنے لگی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہندوؤں نے معیشت کے سامان کی اعلیٰ درجہ کی ترقی کی تھی۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ روحانی صیغہ سے وہ غافل رہے۔ روحانی معاملات میں بھی ایسی ترقی ہوئی کہ نظر کھا گئی۔ پہلو بہ پہلو علوم دنیوی و روحانی دونوں کی ترقی رہی۔ فرق اتنا ہے کہ روحانی مزاج لوگ دنیوی لوگوں کو دنیوی اشیا میں ہمہ تن مصروف ہونے اور انہیں میں گرویدہ ہونے سے روکتے رہے اور ہر شخص کو حکم تھا کہ ایک خاص وقت پر وہ ہوس دنیا سے دست بردار ہو جائے اور بحالت ثروت بھی وہ روحانی ترقی سے غافل نہ رہے بلکہ دولت وحشمت کے استعمال میں چند اصول مد نظر رکھے۔ اسکی مفصل بحث کی ضرورت نہیں۔ اتنا سمجھانا کافی ہے کہ ہر ایک بانی مذہب نے اپنے خیالات کے مطابق اور ہر ایک فلاسفر نے اپنی قوت دماغی کی حد تک مختلف طرزوں سے ایشر کی ذات بیان کی ہے۔ یہ اختلاف ثبوت اس بات کا ہے کہ ایشر کی ذات اور صفات بیان کرنے میں واقعات کا سلسلہ اور مشاہدہ ایسا صاف نہیں کہ اطمینان سے یہ کہا جا سکے کہ فلاں شخص کا بیان کردہ ایشر ضرور ایشر ہو گا۔ اسی تلاش اور مباحثہ میں انسانوں کا قیمتی وقت بہت صرف ہو چکا ہے۔ تم اس میں وقت صرف نہ کرنا۔

آنند۔ تو مہاراج! آپ کس لئے سادھو بنتے ہو؟

باواجی اس کا ذکر بھی تم کو سناؤنگا۔ پہلے یہ سمجھاتا ہے کہ دھرم کیا چیز ہے

سو دھرم کے معنی ہیں فرض - جو اپنے فرض سے چوکا وہ دھرم سے تجاوز کر گیا اور مبتلائے مصیبت ہو گیا - چلن کا سدھارنا اور ایک بے ضرر رستہ پر چلنا اور اپنی طبیعت کا سدھارنا یہی دھرم ہے - یہ سوال مت کرو کہ کیوں فرض پر کیوں بھیجے گئے اور آخر کہاں جانا ہے بھیجنے والے نے اس راز کو سربستہ رکھا ہو تا کہ مبادا رستہ چلنے والا منزل نہ پوری کرے اور سارا انتظام خراب ہو جائے ‎۔

آنند - تو اس سے مراد ہے کہ ہر ایک شخص ناستک بنا رہے ‎۔

باوا جی - ناستک کے معنی منکر ہے - منکر ہونا چاہیے کیونکہ نفی کا بار ثبوت بھی بہت بھاری ہے - لیکن جاننا چاہیے کہ جاہل مفرد سے جاہل مرکب اچھا نہیں ہو سکتا جاہل مفرد سے مراد وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں - اور جاہل مرکب وہ شخص ہے جو در اصل نہ جانتا ہو اور کہے کہ میں جانتا ہوں - عدالت میں بھی وہ گواہ سچا گواہ ہے جو یہ کہے کہ فلاں واقعہ میں نے نہیں دیکھا - اور وہ گواہ جھوٹا سمجھا جاتا ہے کہ جس نے واقعہ نہ دیکھا ہووے اور وہ کہے کہ میں نے دیکھا ہے - اور جب سوال کیے جاویں تو اُس کا جھوٹ نکل آوے - جو ایشر کی بابت لوگ بیان کرتے ہیں ان سے اگر مفصل پوچھا جاوے تو اُن سے یہی کہتے بنتی ہے کہ وہ ذات گمان و فکر سے بالاتر ہے - تم نے جبر و مقابلہ دیکھا ہوگا - اس میں بعض شکلیں ایسی آتی ہیں کہ اعداد بے شمار کہیں ضرب اور کہیں تفریق کہیں تقسیم کھاتے ہیں اور جب ان کو حل میں ڈالا جاتا ہے تو نتیجہ صفر نکلتا ہے ‎۔

داس - تو مہاراج کیا سب مذہب جھوٹے ہیں - اور آدمیوں نے دھوکے کی ٹٹی بنا رکھی ہیں ‎۔

باوا جی - نہیں یہ بات صحیح نہیں - جتنے مذہبوں کے بانی گزرے ہیں وہ جھوٹے نہ تھے جو کچھ سمجھ میں آئی انہوں نے کہہ دیا - جس ملک میں بہت بیہودہ پن

کسی اچھے دل کے آدمی نے دیکھا اُس نے حسب اقتدارفہم کو استعمال کیا۔ اور اس
ملک کے لوگوں کی اصلاح کی۔ لیکن تعلیم اخلاق تقریباً اُن کی بھی وہی ہے جو خدائی
محکمہ میں افسر اور ماتحت کا دبدبہ دار ایک محکمہ قائم کرتے ہیں اور اُنکی بھی وہی ہے جو
خدا کے تین حصے پیوستہ سمجھتے ہیں اور اُنکی بھی وہی ہے جو وحدہٗ لاشریک کہتے ہیں
اور اُنکی بھی وہی ہے جو اِس مسئلے پر بحث نہیں کرتے۔ خلاصہ کلام سب کا اخلاق ایک ہی
ہے۔ ہادیان دین اخلاق تقریباً ایک ساں بیان کرتے ہیں اور اِس بارے میں سب
متفق ہیں کہ محض یقین کچھ فائدہ نہیں دیتا عمل ضروری ہے۔ گویا چلن کا سدھارنا
سب سے مقدم امر ہے +

اِسکا نتیجہ یہ تھا کہ دولت کے استعمال کے طریقے یورپین نفس پروری سے اُنکی
موجودہ خود غرضی سے قدرے مختلف تھے۔ اور ہوسِ دنیوی کو روحانی تعلیم معتدل
کرتی رہتی تھی۔ یورپ والے صرف ایک ہی دُھن میں ہیں۔ روحانی تعلیم اُنکے ہاں
برائے نام ہے۔ ممکن ہے وہ کسی دن سمجھیں گے۔ کہ جس رفتار سے وہ چل رہے ہیں
کہیں ایسے مقام پر ٹکر کھائیں گے کہ پھر ہندوؤں کا اصول اعتدال اُنہیں یاد آئیگا
علیٰ ہذا مسلمانوں کے علماے دین بھی بے ثباتی عالم کا سبق دیتے رہے اور دنیا پر
عقبےٰ کو ترجیح دیتے رہے۔ اِس کا اثر بھی اہلِ دول پر اصلاحی اور استغنائی رہا ہے
اب میرا وہی حال ہے کہ گھرست آشرم چھوڑکر اِس جنگل میں بیٹھا ہوں۔ تم کو یہ بتاتا
ہوں کہ جب تم یہاں سے واپس جاؤگے۔ دولت کے اکتساب میں کمی نہ کرنا۔ اور
اُسکے استعمال میں نفسانیت خود غرضی کام میں نہ لانا۔ بلکہ اُن کاموں میں جو میں تمکو
وقتاً فوقتاً سمجھاتا رہوں کام میں لانا۔ لیکن کوئی لحظہ روحانی ترقی سے غافل نہ رہنا
روحانی ترقی کسکو کہتے ہیں۔ وہ تم کو میں سمجھاتا ہوں۔ اُسکی مختصر حقیقت یہ ہے کہ انسان
میں کوئی شے امانت ہی جو کسی نامعلوم طاقت کی بخشی ہوئی ہے۔ اِسکو برے کاموں سے

گندہ نہ کرنا۔ تاکہ اُسے ویسی پاکیزگی کی حالت میں واپس دو جس طرح سے وہ آئی ہے

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ یکایک خلخال کی چھنکار آئی۔ اور ایک نازنین سراپا حسن و جوانی زیورات و جواہرات میں لدی ہوئی۔ وہاں آگئی۔ اور باواجی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ نمسکار کیا اور کہا کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ باواجی نے کہا کہ اس کٹیا کے جانب شرق ایک چبوترہ ہے وہاں بیٹھ جاؤ۔ تھوڑی دیر میں میں وہاں آتا ہوں تب تمھاری گفتگو سنوں گا۔

باب ششم

(پیاری اور آنند)

اس مقابلہ پر غور فرمایئے۔ مثل مشہور ہے۔ "بن مانگے موتی ملے اور مانگے ملے نہ بھیک" کجا پیاری کے خواستگار بے انتہا۔ اور اسکی غایت درجہ کی بے اعتنائی اور عدم توجہی۔ کجا خود پیاری ایک جوگی کے سامنے ملتجی اور اُدھر سے سرد مہری۔

وہ نورانی چہرہ وہ فرشتہ صورت وہ صفائے قلب کی مورت وہ یاد الٰہی کا مجسم پیکر۔ وہ سادگی کا نمونہ۔ وہ الفت وانس انسانی کا پتلا۔ وہ روحانی ریاض کی تصویر یعنی شانتی باوا پیاری کے دل پر کام کر گیا۔ پیاری کی چنچل مزاج متلون طبع شانتی باوا کے سامنے حبس معلوم ہوتا تھا۔ باواجی کا یہ عالم کہ ؎

دولت تھی اگرچہ اختیاری پامردی سے اُس پہ لات ماری

لفظ معشوق بھی ایک نسبتی اصطلاح ہے۔ فی الواقعہ کوئی معشوق نہیں جو بجائے خود عاشق نہیں۔ یہ بھی ایک سلسلہ ہے۔ پیاری کے دل میں اس امر کا اُبال اُٹھتا تھا کہ میری کشش مقناطیسی اس جوگی کو گرویدہ کرے۔ اور جوگی کی یہ خواہش کہ اس نازنین کو آنند کے ساتھ منسوب کروں اور ایسی ہدایت کروں کہ پیاری بجائے

گناہوں کے بانی ہونے کے ثوابوں کا وسیلہ بن سکے۔ آخر ان میں گفتگو
شروع ہو گئی +

پیاری۔ باواجی آپ نے یہ کیا زندگی اختیار کی ہے۔ کس بے معنی دُھن
میں آپ پڑے ہوئے ہیں آپ جیسے شخص کو چاہیئے تھا کہ محل کے گاؤ تکیے ہوتے
دو اسپہ سواریاں ہوتیں۔ ایوان عالیشان ہوتے۔ چاندی سونے کے برتن ہوتے
نوکروں کی قطار ہوتی۔ مے ناب کے جام سامنے ہوتے۔ نازنین سیم تن بغل میں ہوتی
خزانوں پر حکم ہوتا۔ جواہرات زیب تن ہوتے۔ محفل رقص و سرود ہوتی۔ شعرا قصیدہ گو
شعر گوئی کرتے۔ پھولوں سے سیجیں مزین ہوتیں۔ عطریات سے مکان مہکتے ہوتے
کس تخیل میں آپ پڑے ہو۔ اور کس کی تلاش ہے۔ روح ایک بچوں کا کھیل عقبےٰ ایک
شعبدہ۔ خدا ایک شئی موہوم۔ پیر پیغمبر سب بے سود۔ اخلاق محض ڈھکوسلا۔ سب یہ
فضول باتیں ہیں۔ جو کچھ دنیا میں ہے وہ دولت و حشمت ہے وہی خدا وہی
روح وہی اخلاق وہی عقبےٰ غرض جو کچھ ہے زر کا ظہور ہے۔ عمر خیام نے سچ کہا
ہے کہ کل دنیا اسی کے حصول و فراہمی میں مصروف ہے +

گفتم اہل زمانہ در چہ فن اند ۔۔۔ گفت در بند جمع مالے چند

دیکھو یورپ نے اس مسئلہ کو طے کر دیا۔ ایشیا اسی پرانی دیوانگی میں مبتلا ہے اگر
مجھے اجازت ہو تو میں اس کٹیا کو ایک لحظہ میں غیرت فردوس بنا دوں ایک
چشم زدن میں بہشت کا رنگ کھلا دوں۔ میں نے مانا کہ بت شکنوں نے لکڑی
اور پتھر کے بت توڑ دیئے۔ لیکن دولت جو خون و گوشت کے انسانی جسم رکھتے
ہیں کونسی طاقت انہیں توڑ سکتی ہے۔ مجھے اجازت دیجئے کہ اس جنگل کو گلزار
ارم بنا دوں بعد آپ اسمیں عیش کریں اور میں آپکے عشق کا دم بھروں +

شانتی باوا۔ اے لسان چڑیا۔ تیری کترنی سی زبان محض تضیع اوقات کر رہی ہے

ایک اصول یاد رکھ کہ جب خاوند کمزور ہوتا ہے۔ بیوی اُسپر حکم کرتی ہے۔ اگر خاوند
طاقتور ہوتا ہے تو وہ بیوی کو جس رستے پر چاہتا ہے چلاتا ہے۔ جب انسان
طاقتور ہے تو وہ دولت کو مناسب استعمال میں لا سکتا ہے۔ جب وہ کمزور ہے تو
دولت جس رستے چلاے وہ چلتا ہے۔ انسان کو خاوند تصور کرو اور دولت کو
اُسکی بیوی۔ عارضی طور پر جسے ہم کامیابی سمجھتے ہیں وہ دراصل تخریب کی بنیاد
ہوتی ہے اور در پردہ اثر کرتی ہے۔ جو تصویر تو نے مجھے دکھلائی ہے وہ اُن
لوگوں کی ہے جو عیش و عشرت کو اپنی کامیابی تصور کر کے مگن ہو جاتے ہیں۔
انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہی سامان اُنکی بربادی کا باعث ہونگے جس بے غیرتی
سے تو نے مذہبی اور روحانی طریقوں پر حملہ کیا ہے وہ ایسے ہی وقت میں برداشت
ہوتا ہے۔ جبکہ دولت کے خواستگار بہت ہیں اور مستغنی کم۔ ورنہ اگر طاقتور
لوگ ہوتے تو جیسے غلام سے کام لیا جاتا ہے اُسی طرح سے دولت سے کام لیتے
اور وہ چون و چرا نہ کر سکتی۔ تو وہ چمکیلے پتھر مجھے دکھا رہی ہے جسے جواہرات
کہتے ہیں وہ خاک کے ریزے دکھا رہی ہے۔ جسے سیم و طلا کہتے ہیں جب ایشیا
اپنے عروج پر تھا تو دولت ایک کنیز تھی۔ اور روحانیت اصلی بیوی تھی۔ اب اصلی
بیوی تو متروک ہے اور خواجہ بجائے حکم کرنیکے بندہ کے ناز اٹھا رہا ہے
یورپ کی ہوس فداسٹنے دو۔ عیش کے تجربے کرنے دو آخر وہ اسی نقطہ پر آوینگے
مجھ غریب پر جو تو نے اپنا اثر ڈالنا چاہا ہے تو یاد رکھ کہ پانی کے پیالہ میں دیا سلائی
کی تیلی لگا رہی ہے۔ چہ جائے کہ وہ پانی کو جلائے خود ٹھنڈی ہو جائے گی بیشک
میری کُٹیا میں رہو۔ لیکن یہاں رہکر حکم نہ کر سکو گی۔ محکوم رہنا ہوگا۔ دغاباز۔ ڈاکو
چور۔ ملک فروش۔ ایمان فروش۔ اور اِس قسم کے اشخاص جنہیں لوگ کامیاب کہتے ہیں
اُن کا گزر اِس کُٹیا میں نہوگا۔ اور نہ ایسے اشخاص سے تیرا سلسلہ یا رابطہ نہ رہیگا۔ نفس [illegible]

ایک حیوانی خواہش ہے۔ اور جسوقت نفس پر قابو ہوجائے تو دولت کی پروا نہیں رہتی۔ اور اگر وہ کسی کے پاس ہو تو اور کاموں میں کام آتی ہے۔ یہاں رہکر تجھے نفس کش لوگ ملیں گے +

پیاری کے جوش پر نہایت ہی سرد اثر پڑا۔ وہ سمجھتی تھی کہ دنیا میں کوئی شخص نہیں جو اُس کا مفتون نہیں۔ اُسے وہ پاک روح کے الفاظ یاد آئے "دنیا ایسے انسانوں سے خالی نہیں کہ وہ تجھے مردود سمجھیں" +

اُسکو معلوم ہوا کہ کوئی ایسی بھی بالاتر زندگی ہے جسکے لذات اِس قسم کی کیفیت رکھتی ہیں کہ انسان عیش و عشرت کے سامانوں کو اُنکے مقابلہ میں ہیچ سمجھتا ہے۔ جیسے جیسے باواجی کی زبان سے الفاظ نکلتے تھے ویسے ویسے پیاری کا غرور ٹوٹتا جاتا تھا۔ وہ اپنی حیثیت کو جانتی جاتی تھی۔ وہ غرور وہ زعم جس سے وہ شروع ہوئی تھی ایسا کافور ہوتا گیا کہ تاب جواب نہ رکھتی تھی۔ جیسے کوئی مفتوح ہوتے ہوتے سسکیاں لیتا ہے۔ وہی پیاری کا عالم تھا۔ لیکن ہنوز دم خم بالکل نہ ٹوٹا تھا۔ ایک سعی اور کی اور یوں بولی +

پیاری۔ باواجی۔ تو بقول آپکے دولت قابل نفرت چیز ہے۔ اور اُسکے حصول کیلئے انسان کو مطلق کوشاں نہونا چاہیئے۔ اور میرے حسن و جوانی کا تو آپنے کچھ ذکر نہ فرمایا۔ بہشت کی حوریں اور سُرگ کے اپسرمن میرے حُسن کے سامنے ماند ہیں +

باواجی۔ تم نے عمر خیام کا ایک شعر پڑھا تھا۔ ایک دوسرا شعر سنو +

گفتم این نفس کے شود رام — گفتا چوں یافت گوشمالے چند

زندگی کی فتح اور زیست کی معراج نفس پر فتح پانا ہے۔ اور نفس کو گوشمالی کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ بے لگام ہوکر انسان کو ایسے ایسے کاموں کیجانب راغب کرتا ہے

کہ ناگفتہ بہ۔ دولت کے معنی کیا ہیں۔ وہ خود کوئی مقصود نہیں بلکہ وسیلہ مقصود ہے۔ سکہ ضرب چہرہ شاہی سونے اور چاندی کی اشیا رجواہرات وغیرہ وغیرہ محض انسانی محنت کے خریدنے کے معیار ہیں۔ اور محنت انسانی انسانی خدمت میں استعمال ہونی چاہیے۔ رہا حسن۔ یہ ایک خیالی چیز ہے۔ اصلی قابل قدر جنس سیرت ہو۔ ازدواج ایک روحانی تعلق ہے۔ ابتدائی شوق اور چوچلے جلد ختم ہوجاتے ہیں۔ اور فرائض کا دفتر بہت جلد شروع ہوجاتا ہے۔ بقول خیام ؎

گفتمش چیست کہ خدائی گفت ہفتہ عیش عصہ سالے چند

میں تم کو مشورہ دیتا ہوں کہ ان دنوں میرے ہاں ایک شاگرد ٹکا ہوا ہے اسکا نام آنند ہے۔ تو اُسکے ساتھ منسلک ہوجا۔ وہاں توخوش رہے گی اور وہ تجھ سے خوش رہے گا۔ دونوں کی خوب گزرے گی۔ پیاری کی رہی سہی امید ٹوٹ گئی۔ باواجی کا جادو بھرا کلام اُسپر اثر کر گیا۔ وہ خود نہ سمجھتی تھی کہ اُسپر جادو اپنا کام کر گیا واقعی باواجی جیسے انسانوں کا کلام جو صفائی دل سے نکلتا ہے بہت ہی اثر کرتا ہے۔ پیاری کا تلون مبدل بہ سکون ہوگیا۔ اُسکا غرور مبدل بہ حلم ہوگیا باواجی کی مثال تو وہ ہوئی ؎

بروایں دام برمرغ دگر نہ کہ عنقا را بلند ہست آشیانہ

اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ یا تو وہ مانند سابق قتل عشاق کرتی رہے اور کسی کے دام میں نہ پھنسے۔ یا ایسی ایک شخص سے منسلک ہوجائے اور دونوں ملکر خلق خدا کی خدمت کریں۔ اور اُسکے عوض میں خدمت کے مستحق بنیں۔

باواجی نے آنند کو بلایا۔ اور وہ حاضر ہوگیا۔ اُس سے ذکر کیا۔ وہ تعمیل ارشاد سے گریز نہ کر سکتا تھا۔ باواجی نے دونوں کے ہاتھ ملادیئے۔ اور یہ اُپدیش دیا:۔ سنو آنند! تم کو ایسی مالدار اور حسین بیوی آج ہاتھ آئی ہے کہ شاید تم نہایت

خوش ہو گئے ہو گے۔ لیکن یاد رکھو کہ اسمیں نہ خوشی نہ غمی کی کوئی بات ہی۔ بلکہ ایک بوجھ نہیں دو بوجھ تمھارے سر پر ہیں۔ اس رشتہ پاک کو جو تم کو میاں بیوی کا حاصل ہوا ہے۔ اسکو عشق عاشقی نہ سمجھنا۔ نہایت ذمہ داری کا کام ہے جو دولت تمہیں ملی ہے وہ اُس سے زیادہ ذمہ داری کی ودیعت ہی۔ اسکا استعمال تم کو انسانی بہبودی میں کرنا ہے۔ یہ دونوں کام نہایت مشکل ہیں +

اے نازنین! تجھے یہ کہتا ہوں کہ ایشیائی بیوی بننا۔ صرف آئینہ و شانہ کی مصروفیت نہ رکھنا۔ بلکہ اپنے خاوند کی سیوا کو ہی عبادت سمجھنا۔ اور تیرا مال زر آئندہ تجھے عیش نہ دے گا۔ بلکہ ضرورتمند انسانوں کے مصرف میں آوے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تجھکو قلق گزرے گا۔ لیکن سمجھ کہ بعد چند سالوں کے تجھے وہ روحانی خوشی ہوگی کہ تو اسی دنیا میں بہشت بھوگے گی +

شیو نرائن۔ شمیم

غزل

مے پلا ساقی ارے فصلِ بہار ایسے میں ہے
آبِ حیواں سے حیاتِ مستعار ایسے میں ہے

سچ ہے اے ناصح کہ یہ ہنگام مے نوشی نہیں
مجکو جلدی ہے کہ دستِ اختیار ایسے میں ہے

پھر نہ یہ عمر ملیگی ذکرِ حق کے واسطے
آنسوؤں کا پنجۂ مژگاں میں تار ایسے میں ہے

وقت ہی صیدِ رمیدہ جا کے آنے کا نہیں
وار کرنا ہو تو کر زد پر شکار ایسے میں ہے

بعد اسکے پھر گلے سے بھی ملا قاتل تو کیا
پھیر دے اگر چھری دل بیقرار ایسے میں ہے

خاک اڑاتی ہے رقیبوں نے تمھارے واسطے
چھپ کے آجاؤ یہاں گرد و غبار ایسے میں ہے

دیکھ تو حیدر کوئی تیرا ہی سب پر بیاں حال
چند ساعت اور بھی رفد شمار ایسے میں ہے

سید علی حیدر المتخلص بہ نظم و حیدر

اُردو سبھا

معاصرین کی رائیں

دسمبر کے مخزن میں جو تجویز اردو سبھا کے متعلق پیش کیگئی تھی۔ اُسکی نسبت بہت سے معزز ہمعصروں نے اپنے اپنے اخباروں اور رسالوں میں اظہار پسندیدگی کیا ہی جنمیں سے بعض کی رایوں کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ دکن ریویو کے فاضل اڈیٹر مولوی ظفر علیخاں صاحب بی اے نے ایک قابل وقعت نوٹ اپنی ایک اشاعت میں اِس سبھا کے متعلق لکھا ہے جسپر کسیقدر مفصل بحث کی ضرورت ہی جو کسی آیندہ پرچے میں کی جائے گی۔ جن معاصرین نے اب تک اِس ضروری مضمون پر اپنی رائے ظاہر نہیں کی اُنسے درخواست ہی کہ وہ اُسکے اظہار سے ہمیں مستفیض فرمائیں ؛

وکیل امرتسر ۲۰ فروری سنہ ۱۹۰۹ء

یہ دیکھنا موجب مسرت ہی کہ شیخ عبدالقادر صاحب بی اے بیرسٹرایٹ لا دہلی نے کچھ عرصہ قبل "اردو سبھا" کے عنوان سے جو مضمون رسالۂ مخزن میں چھپوایا تھا۔ اور جو وکیل کی اشاعت گزشتہ میں بجنسہ درج کیا جا چکا ہی۔ اُسپر اکثر اردو و انگریزی معاصرین اور ملکی اہل آرا کی توجہ منعطف ہوئی ہی۔ اور قریب قریب تمام اصحاب نے تجاویز مندرجہ مضمون کے عمل میں لائے جانے کی ضرورت پورے طور پر تسلیم کی ہی۔ مگر قابل غور پوائنٹ اِسکے متعلق یہ ہے کہ کہاں تک شعبہ انجمن ترقی اردو سے اِس باب میں عملی کوششوں کی امید لگائی جاسکتی ہی اور ایک ہی مقصد کیلیے دو انجمنوں کا قیام کس حد تک قرین مصلحت قرار پا سکتا ہے۔ گو ہمیں انجمن ترقی اردو کی حالت موجودہ سے کار آمد نتائج کی کوئی قوی توقع نہیں تاہم ہمارا خیال ہی کہ ایک جداگانہ آزاد انجمن کے قیام کی بجائے موجودہ انسٹیٹیوشن کی اصلاح و ترقی زیادہ ارزاں و سہل العمل ہوگی ؛

وطن لاہور ۱۲ فروری سنہ ۱۹۰۹ء

ہم رسالۂ مخزن دہلی کے اڈیٹر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا کا مضمون اردو سبھا نقل کرتے ہیں۔ اور ہمیں امید ہی کہ تمام اہل ملک

اسکو غور کے ساتھ مطالعہ فرما کر اسکے متعلق رائے دینے اور کوشش کرنے کی طرف توجہ فرمائینگے

انسٹیٹیوٹ گزٹ علیگڈھ ہم اس تجویز کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ گو کہ ہمارے نزدیک اسکے عمل پذیر ہونے میں بہت سی مشکلات پیش آئینگی۔ اس تجویز کے مفید ہونے اور ضروری ہونے سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اسلیے ہماری تمنا ہے کہ شیخ صاحب اپنی اس تجویز میں کامیاب ہوں۔

نیر اعظم مراد آباد ہمارے عنایت فرما کا یہ خیال نہایت با موقع اور خوش آئیند ہے ہم دل و جان سے اسکی معاونت کیلیے تیار ہیں۔ پہلے بس عام جلسے کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ اسکی اینوٹیشن ہر شہر کے لوکل اسلامی اخبارات کے ذریعہ سے تقسیم ہونی چاہئیں۔ اس طرح معقول تعداد میں لوگ شریک ہو سکیں گے۔ اور علم دوست اصحاب کی تلاش میں کم دقت پیش آئے گی۔ ہمارے نزدیک اسلامی اخبارات کا یہ فرض ہے کہ اس کام میں حتی الوسع شیخ عبدالقادر صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔ ایک بات اور بھی ہمارے نزدیک اول ہی سے مد نظر رکھی جائے۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے ہر بڑے شہر میں ایک لوکل کمیٹی تیار کیجائے اور اسکے ذریعے سے اردو کانفرنس میں ڈیلیگیٹ بلائے جائیں۔ یہ سب سے زیادہ مؤثر اور آسان طریقہ ہو سکتا ہے۔

اس انجمن کے متعلق جو سب سے اہم معاملہ ہے اور جسکو یقیناً ہمارے دوست پہلے سے سمجھ چکے ہیں وہ ایک اردو فنڈ کا قائم کرنا ہے۔ جبتک ایک طاقتور کمیٹی کے ہاتھ میں ایک عمدہ فنڈ نہ جمع ہوگا اس کام کا شروع ہونا بہت دشوار ہے۔ ہمارے نزدیک کانفرنس کے انعقاد سے پہلے اسکا انتظام بہت ضروری ہے۔ اس کام میں ہماری رائے میں اسلامی اخباروں کی شمولیت ضروری ہے۔ اور یہ اس طرح ممکن ہے کہ اردو فنڈ کیلیے رسید بہیاں تیار کر کے ہر مسلمان اڈیٹر کے پاس بھیجی جائیں اور اُنسے درخواست کیجائے کہ وہ فراہمی چندہ میں کوشش کریں۔ اگر فرض کیا جائے کہ ہر اخبار کے تین تین سو خریدار چار چار آنے چندہ بھیجدیں تو اگر ۵۰-۶۰ اخباروں سے اس قسم کا چندہ وصول ہو جائے۔ تب بھی تین ہزار سے زیادہ رقم بہت قلیل عرصہ میں فراہم ہو سکتی ہے جو کم سے کم اُردو سبہا کے سنگ بنیاد رکھنے میں بے انتہا مدد دیگی +

ذوالقرنین بدایوں - ۱۶ فروری ۱۹۰۹ء

ہمارے خیال میں اس مبارک تجویز سے کسیکو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ بعض دوسرے اہم کاموں کی طرح یہ تجویز بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے۔ اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ ہندو و مسلمانوں کے اتفاق سے اس انجمن کی بنیاد اٹھانا چاہتے ہیں اور یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔ اگرچہ اردو کا حق اس قوم پر بھی ہے لیکن ناحق شناس بھلا غیر اُردو کی حمایت کے کام میں کیوں شرکت کریں گے۔

سفیر برار، امراوتی

ہمیں شیخ صاحب کی تجویز سے پوری ہمدردی ہے اور اس کی تائید میں ہم اپنی خدمات پیش کرنیکے لیے ہر طرح تیار ہیں۔ برار کے مسلمانوں کی مادری زبان اگرچہ اُردو ہے مگر افسوس ہے کہ یہاں کی مروجہ زبان اُردو کہلانے کے ہرگز مستحق نہیں۔ خدا کرے کہ شیخ صاحب کی کوشش بار آور ہو۔ اور اس کا نتیجہ اردو کے حق میں مستقل طور پر مفید ثابت ہو۔

دکن ریویو - فروری ۱۹۰۹ء

ہمارے عزیز دوست شیخ عبدالقادر صاحب بی اے اڈیٹر مخزن نے اس لیڈر میں جسکا عنوان "اُردو سبھا" ہے ایک مہتم بالشان تجویز ملک کے سامنے پیش کی ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ زبان اُردو کو ایک علمی اور قومی زبان کی حد تک ترقی دینے کیلئے ایک مجلس ایسے اشخاص کی قائم کیجائے جنہوں نے اردو کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہو۔ تجویز کے دلپذیر اور اہم ہونے میں شک نہیں۔ اور کوئی شخص جسے اردو زبان سے محبت ہے ایسا نہ ہوگا جسے اس سے اختلاف ہو۔ لیکن وہ لوگ جو انجمن ترقی اردو علیگڈھ اور انجمن اردو حیدرآباد کے کارناموں سے واقف ہیں اور اس جوش کی ماہیت سے بھی بے خبر نہیں جو ہر ایسی دلکش تجویز کے متعلق ابتدا ابتدا میں مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ لیکن فوراً ہی جھاگ کی طرح بیٹھ بھی جاتا ہے وہ اگر اس تحریک کی کامیابی کو زیادہ وثوق کی نظر سے نہ دیکھیں تو غیر حق بجانب نہیں سمجھے جاسکتے۔ اسمیں شک نہیں کہ اگر ہمارے ہندو بھائی اردو کو اپنی قومی و وطنی زبان سمجھکر اسکی توسیع و ترقی میں ہمارا ہاتھ بٹائیں تو کامیابی یقینی ہے لیکن اردو زبان کا مسئلہ جس سے زیادہ اہم پولیٹکل مسئلہ آجکل ہماری رائے ناقص میں اور کوئی نہیں۔ برادران ہنود کے عام قومی پروگرام میں کہیں نظر نہیں آتا۔ پنجاب اور ممالک متحدہ میں مسلمانوں کی طرف سے باوجود

اُنکی پولیٹیکل کمزوری ہے جس کے لحاظ سے اغیار و اجانب اور خود اُنہیں کے قوم کے بعض اکابر اُنہیں ہدفِ سہام ملامت بنایا کرتے ہیں مختلف اوقات میں اردو کی حمایت نہایت شد و مد سے ہوئی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے سر انٹونی میکڈانل تک کی شان جلال کی کچھ پروا نہ کی۔ ان دونوں صوبوں میں تو خیر اردو زبان عام طور سے مروج تھی لیکن مشرقی بنگال میں بھی جہاں کی عام بولی بنگالی ہے مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اُن کی قومی زبان اردو ہوگی۔ اور یہی حال ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کا ہے لیکن آج تک ہم اس خبر کو ترستے ہی رہے کہ ہمارے ہندو بھائیوں نے بھی اردو کی حمایت یا اُسکے اغراض و مقاصد کی تکمیل و اشاعت کے لیئے کوئی جلسہ کیا ہو۔

بہرحال نشو و نما کی اُس حیرت انگیز اور سریع السیر قابلیت کے بھروسہ پر جو خود اردو زبان کے ہر رگ و ریشہ میں ودیعت کی گئی ہے ہمیں ناامید ہوئے بغیر اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیئے۔ کچھ تو اس خیال سے اور کچھ یہ سوچکر کہ شیخ عبد القادر صاحب اور ڈاکٹر محمد اقبال صاحب جیسے مستعد اور لائق اور ذی اثر افراد قوم کی متفقہ مساعی ضرور بارآور ہوں گی۔ ہم اس تجویز کا نہایت خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور شیخ صاحب کی مجوزہ فہرست کی ترتیب میں جس حد تک کہ اُسے دکن سے تعلق ہے بہ سرگرمی تمام حصہ لینے کو تیار ہیں۔ لیکن اسقدر عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مناسب ہوگا کہ "اردو سبھا" کے بجائے جسپر بادی النظر میں "اندر سبھا" کا دھوکہ ہوتا ہے کوئی اور موزوں نام اس انجمن کے لیئے تجویز کیا جائے۔

فصیح الملک ماہرہ

جنوری ۱۹۰۹ء

دسمبر ۱۹۰۸ء کے مخزن میں اردو سبھا کے عنوان سے جو مضمون مکرمی شیخ عبد القادر صاحب اڈیٹر مخزن نے لکھا ہے۔ اسے دیکھکر سچی مسرت ہوئی زیادہ حصہ لینے کا استحقاق اسلیے ہے کہ خود ہمارے دل میں آج سے پہلے یہی خیال اسی عنوان سے پیدا ہوا تھا اور ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے ہم خیالوں کو جمع کر کے عملی کارروائی شروع کر دی جائے مگر جس خیال نے ایسی کارروائی سے باز رکھا وہ اپنی کم لیاقتی و بے مایگی اور قلت شہرت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر الحمد للہ علی احسانہ کہ اس فرض کفایہ کے پورا کرنے کا بیڑا ایسے باہمت نے اُٹھایا ہے جو زندہ دلانِ اردو کو لالوں کا لال بنا کر چھوڑے گا۔

نیازمند احسن اس مبارک تجویز کا موافق بنکر ہر قسم کی معاونت و خدمت کیلیے تیار ہے۔ فی الحال جو نقشہ مخزن میں دکھایا گیا ہے ضرورت ہے کہ وہ پبلک میں شائع ہوئے۔ اُسکے بعد اُسکے عملی اصول و فروع پر نظر ڈالی جائے۔ مجھے اسکی تو بالکل امید نہیں کہ اس مفید تجویز سے کوئی عقلمند اختلاف کرے۔ البتہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کیلیئے بہت کم ہاتھ ایسے نظر آتے ہیں جو قطع و برید کی تکلیف گوارا کریں۔ قابل مجوز کی اس تجویز سے مجھے ابھی ایک حد تک اتفاق نہیں کہ "اس کانفرنس کو ہر سال منعقد کرنے اور ملک و قوم کے بوجھ میں ایک نیا اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں" بلکہ میں کم از کم اُس وقت تک کیلیئے ہر سال ایسے جلسہ کا قائم رہنا ضروری اور اشد ضروری سمجھتا ہوں جبتک کہ غافل ہمدردانِ اردو عموماً اور کاہل شاعرانِ اردو خصوصاً اردو سبھا کے راجہ اندر اور لال دیو نہ بن جائیں۔ اس تجویز میں ہر بات سے زیادہ اسکا نام پسند آنے کے قابل ہے اور خصوصاً جو بلاغت اسمیں مضمر ہے

مذہب کا انگارا

خدا جانے کہا کس نے یہ کس دن عقلِ مسلم سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا

گئی دنیا تو پھر ہم دین کو اب کیوں لگا رکھیں
بڑا معلوم ہوتا ہے مسائل کا یہ پشتارا

مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکستہ ہوں
مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارا

وہ چھینٹے دیجیے ان کو حکیمانہ طریقوں سے
کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا

چلے متعرض تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے
کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

عمل جاتا رہے بالکل فقط الفاظ رہ جائیں
انہیں بھی پست کر دے مغربی حکمت کا نقارا

ترقی پائیگی قوم آپ کی پھر دورِ گردوں میں
عجب کیا ہے کہ پھر بہنے لگے اقبال کا دھارا

قیامت کر گئی قومی ترقی گوشِ مسلم میں
لگا کہنے نہ ہو نعمت اگر حاصل شود مارا

اگر آں شاہدِ مغرب بدست آرد دلِ مارا
بچشمِ مستِ او بخشیم تسبیح و مصلیٰ را

تعلی کو غنیمت کر کے اٹھا عابدِ مشرق
جو طاقت آ گئی تھی دل میں اس طاقت سے للکارا

ادھر تحریر ادھر تہییج ادھر سازش ادھر بندش
لیے خنجر کا اسے ڈالتا ہے گا نٹھا اس نے مارا

تلون پہ منظر کب مردِ عاشق تن کی ہوتی ہے
وہ سمجھے میں نئی اک قوم کا بن جاؤں گا دارا

ہوں رخنہ پالیسی نے اس طرف سے تقویت دی کی
ادھر بجنے لگا نغمہ فتح و ظفر کا پھر تو نقارا

دمِ عدے تبسم شور سے دعدے نے گیسو
وہ گیسو جس سے پھیلی بوئے مستِ عنبر سارا

حواسِ ظاہری کے دام سے بچنا ہوا مشکل
کہاں موہوم حوریں اور کہاں یہ دلکش نظارا

وہ ٹوٹے بت کہ وہ پھسلے یہ چت آغوش آیا
نہ ایماں ہی رہا ہی طاقت نہ دل میں ضبط کا یارا

حریفانِ طرب افگن نے چھیڑا سازِ عشرت کو
بجایا سب نے مضراب ہوس سے دار و دارا

تمس کے عشق میں پڑی چلنے تھی عقل پر پتھر
مسول بلکہ بے تکلف چڑھ گیا ہر قلب پر ملا

غریبوں و مشغول کیسوں کے دل کی کیا ہستی
وہ حالت پیش آئی ہے کہ جس سے موم ہو خارا

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانہ نے — نہ اکبر کی ظرافت سے رُکے یارانِ خود آرا

زبانِ حال سے فریاد تھی یہ اہلِ تمکیں کی — کہ اے نظمِ جہاں را حافظ و اے عرش را دارا

فغاں زیں سحر زن دلکش مسانِ آفتِ ایماں — چناں بُردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

ہوا اب کو تعجب کیوں ہوئیں یہ حالتیں پیدا — نہ تھا یہ مطلبِ سید کہ اُس رُخ پر چلے دھارا

وہ پردے کے بڑے حامی تھے طاعت کے موید تھے — وہ خواہاں تھے کہ چمکے اوج پر اسلام کا تارا

حباب آسا جو آسانی سے ٹوٹا گنبدِ مذہب — تو کیا اقبال و عزت کا اُدھر بہنے لگا دھارا

مناسب کچھ مگر دیکھا جو بالآخر تو کیا دیکھا — وہی اینٹیں وہی پتھر وہی چونا وہی گارا

ادھر شیرازۂ قومی کو ہم ہیں توڑتے جاتے — اُدھر بازی حریفوں کی ہے ہاتھ انکے ہی پو بارا

نتیجے ہم نے خود آنکھوں سے دیکھے روزِ روشن میں — فلک نے سرکشوں کو خاکِ ناکامی پہ دے مارا

کہیں تحقیرِ مذہب کی کوئی تعظیم کرتا ہے — بجھا کر نورِ دل کو کب ہے چمکا بخت کا تارا

بہت ہے غفلتِ ترکِ عمل دنیا میں یہ مانا — عقیدہ اصل ہے لیکن وہ ہونا چاہیے پیارا

مدارِ خیر خواہی ترکِ مذہب پر نہیں ہرگز — ہر اک نے دل سے انگلش کی ہے لائیلٹی کا دم مارا

نہ تھا یہ مطلب سارہ کہ اسمعیل کافر ہو — حریفانہ نہ ہو انداز یہ مطلب تھا یہی سارا

جب اپنی ہسٹری ہم بھول جائینگے تو کیا ہوگا — خدارا اک نظر اُس سین کا کرتے تو نظارا

صلوۃ بے وضو سے رو رہی ہے اس طرف مسجد — اِدھر قرآن بے مذہب ہے دل مذہب کا سیپارا

مشینیں چل رہی ہیں اور کسی کی کچھ نہیں چلتی — اِدھر ہیں بے پھلے کندے اُدھر ہے تیشہ و آرا

خود اپنی قوم کی تحقیر کرنا اسکے کیا معنی — یہ کس جادو نے بچوں کو کیا خود بین خود آرا

کہیں اطفالِ ناداں ہیں کہیں پیرانِ بے طاقت — یہ غوطے کھاتے ہیں فقرے میں آتا ہے وقفہ بیچارا

یہ اخلاقی یہ روحانی بنائیں ٹوٹتی کیوں ہیں — یہ نفسِ مطمئنہ پر ہوا کیوں غالب امّارا

یہ کس کل کے بھٹکے جو کھو کر اپنی ملت کو — مگر ہاں اپنے بیلوں میں ملّا کے کوئی بنجارا

ہمارے حاکم اِن تو چرچ میں سرگرمِ طاعت ہوں — تو ہم بند بھریں کیوں دشتِ بیدینی میں آوارا

عمل مطلوب ہے بیشک مگر فور اپنا کیوں کھوئیں — زمانہ کو ہی گردش ہم نہیں ثابت ہے سیارا
ہو الاوّل ہو الآخر یہ شہد روح پرور ہے — پھر آزاد ہو کر یہ ہے باہو کا شکر پارا
بڑھایا کیوں نہیں جاتا یہ قشر جاں فزا دل ؟ — کہ روحانی ترقی میں ہو لڑکا عرش کا تارا
بہت فکر اسکی ہے دن رات گو قومی بزرگوں کو — مگر کمزوریہ موجیں اُدھر غفلت کا ہے دھلا
میں یہ پیچیدہ بحثیں پیش کرنیکو تھا آمادہ — کہ اتنے میں جناب حضرت حافظ نے للکارا

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

میرا وطن

ہمارے مکرم میر نذیر حسین صاحب بی اے متخلص بہ ناشاد اس نظم میں اپنے تخلص کا حق ادا کر رہے ہیں یعنی وطن کو ناخوشی کی عینک لگا کر دیکھ رہے ہیں مگر جو برائیاں ہندوستان کی وہ بیان کرتے ہیں۔ اُن سے بھی ہمدردی ٹپکتی ہے گویا جلے دل کے پھپھولے اس پیرائے میں پھوڑ رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خوش قسمتی سے اس وقت اہل وطن کا عام میلان مایوسی کا نہیں بلکہ امید کا ہے۔ لیکن پھر بھی اِس خیال کے لوگوں کو جو ملک کی حالت کو مایوسانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اپنے خیالات کے اظہار کا ویسا ہی حق ہے جیسا باغ امید کے ہوا کھانے والوں کو پر امید خیالات کے اظہار کا۔ یہ نظم جہاں بہ اعتبار رائے اور خیالات کے کمقدر انوکھی ہے وہاں با عتبار چستی نظم و ندرت بیان غیر معمولی لطف رکھتی ہے ✦

دلربا لالہ ہو فضا تیری — مجھکو بھائی نہ اک ادا تیری
لطف سے بڑھ کے ہے جفا تیری — دل ہوئے ہندوستاں وفا تیری
میں نہ مانوں کبھی ترا کہنا — میں نہ بخشوں کبھی خطا تیری

برتر از خار ہے ترا گلشن — زہر سے کم نہیں ہوا تیری

خالی از کیفیت تری ہر چیز — بات ہر ایک بے مزا تیری

درد دل میں تڑپ کے مر جاؤں — میں نہ ڈھونڈوں کبھی شفا تیری

کون سی بات تیری لطف آمیز — کون سی چیز دل کشا تیری

تجھکو جنت نشان کہتے ہیں

ہم جہنم کی جان کہتے ہیں

تجھکو کس بات پر ہے ناز۔ بتا — کیا نہیں اور ملک تیرے سوا

تیری آب و ہوا لطیف سہی — تجھ سے بڑھکر ہے سپین کا خطہ

تجھکو اپنی زمین کا ہے گھمنڈ — تجھ سے افضل کہیں ہے امریکہ

حسن پر اپنے ناز ہے تجھ کو — حسن تجھ سے سوا اطالیہ کا

تجھکو گنگا کا اپنی دھوکا ہے — تو نے دیکھا نہیں ہے سین کو جا

موسقی پر تجھے ہے ناز بہت — اسمیں جز درد و غم دھرا ہی کیا

فلسفہ تیرا گئے وقتوں کا — فلسفہ دیکھ جا کے یورپ کا

تجھ میں پھر آن کیا رہی باقی

تیری محفل نہ کچھ نہ کچھ ساقی

ہاں مروت کا تجھ میں نام نہیں — ہاں اخوت کا تجھ میں نام نہیں

تجھ سے بدنام عشق سا استاد — اور محبت کا تجھ میں نام نہیں

آشتی سیکھے تجھ سے آ کے کوئی — ہاں خصومت کا تجھ میں نام نہیں

تیری ہر بات میں صفائی ہے — اور کدورت کا تجھ میں نام نہیں

تجھکو اور حریت سے کیا نسبت — اور ضرورت کا تجھ میں نام نہیں

شاد ہیں تیرے اپنے بیگانے — اور شکایت کا تجھ میں نام نہیں

تیری تہذیب تجکو موجب فخر ہاں جہالت کا تجھ میں نام نہیں

بات دنیا سے ہے جدا تیری

واہ رے ہندوستاں ادا تیری

تیرے رسم رواج نے مارا اس مرض کے علاج نے مارا

تیری غیرت نے کر دیا برباد خاندانوں کی لاج نے مارا

کیا کریں ہر گھڑی یہی ہے فکر رزق کی احتیاج نے مارا

آئے دن کال کا ہے ذکر انکا اک ذرا سے اناج نے مارا

اور سب پر وبا کا اک طرہ اس انوکھے خراج نے مارا

بخت برگشتہ آرزوئیں بہت ہوس سیم و عاج نے مارا

نہ کریں کام کچھ۔ تو کھائیں کیا روز کے کام کاج نے مارا

تو تو رہنے کا کچھ مقام نہیں

تجھ میں انسانیت کا نام نہیں

قید تو نے کیا حسینوں کو مہ جبینوں کو نازنینوں کو

زیور علم سے رکھا عاری تو نے قدرت کے ان نگینوں کو

اختیار نہ پسند کی اے ہند کیا ضرورت نہ تھی حسینوں کو

خوب پہچانی تو نے قدر انکی خوب سمجھا تو ان حزینوں کو

کنوئیں جھنکوائے نازنینوں سے زہر کھلوایا مہ جبینوں کو

ڈوبے جاتے ہیں۔ کون آکے بچائے بحر ہستی کے ان سفینوں کو

تو مکاں تھا۔ مکان ہوکے دیا خوب آرام ان مکینوں کو

تجھ پہ تہذیب طعن کرتی ہے

تجھ پہ الزام خلق دھرتی ہے

آرزو ہے تجھے حکومت کی | جاہ و ثروت کی شان و شوکت کی
کیوں نہ ہو تجھ میں ہمتِ عالی | دھوم ہر سو ہے تیری جرأت کی
تو نے کسبِ فنونِ جنگ کیا | سب میں شہرت ہے تیری قوت کی
قسمیں کھاتے ہیں لوگ دنیا میں | تیری ملت - تری اخوت کی
ملک داری میں ملک گیری میں | واہ کیا پیدا قابلیت کی
تو تو اُستاد سے بھی بڑھ نکلا | حیرت انگیز تو نے محنت کی
آپ عالم میں تو ہے اپنی مثال | آدمیت کی اور شجاعت کی

ہمسری کی کسیکو تاب نہیں
ترا آفاق میں جواب نہیں

داغ دل کے کسے دکھائیں ہم | ایسا مشفق کہاں سے لائیں ہم
دلمیں ہے اپنے ہمنشیں اک روز | آپ رو کر تجھے رلائیں ہم
اس طبیعت کو کس طرح بہلایا | دل کو کس چیز سے لگائیں ہم
کب تلک روز کے سہیں صدمے | کب تلک آفتیں اُٹھائیں ہم
زہر کیوں اے فلک نہ ہم کھالیں | جی سے اپنے گزر نہ جائیں ہم
جو شکایت ہو کیوں نہ لب پر آئے | ایک دُکھ ہو اُسے چھپائیں ہم
اے تمدن کے راحت و آرام | ملے کس طرح تمکو پائیں ہم

لوگ اُٹھاتے ہیں زندگی کے مزے
ہم اُٹھاتے ہیں ناخوشی کے مزے

سید مظفر حسین - ناشاد

انقلاب

زمانے کی ہوا بدلی اُدھر رنگِ چمن بدلا
گلوں نے جب روش بدلی عنادل نے وطن بدلا

طریقہ آشنائی کا کبھی ایسا نہ بدلا تھا
کہ چال عشاق نے بدلی حسینوں نے چلن بدلا

بدلتے آئے ہیں یوں تو ہمیشہ دورِ گردوں کے
نہ ایسا بھی کہ ہم بدلے ہمارا کل جتن بدلا

مقاصد مذہب و ملت کے بدلے دورِ عالم نے
صحائف کی شرح بدلی کتابوں کا متن بدلا

بدل ڈالا ہے ایسا مغربی تہذیب نے ہم کو
مذاقِ خوانِ نعمت اور طرزِ پیراہن بدلا

پُرانی چال بیڈھنگی ہماری دیکھیں کب بدلے
ابھی تک جگ ہی بدلے تھے غضب ہے یہ قرن بدلا

نہ بدلا پر نہ بدلا ہائے طرزِ معشرتِ قومی
اگرچہ ساری دنیا کا ہنر اور علم و فن بدلا

نظامِ شاعری میں ہائے آیا انقلاب ایسا
کہ شانِ نظم بدلی اور اندازِ سخن بدلا

سلیقہ انتقادِ جنسِ حرفت کا نہیں ہمکو
زرِ خالص سے ابریشم نما یورپ نے سن بدلا

نہ بدلا ہے نہ بدلیگا فقط قانونِ اسلامی
قمر جب تک کہ قدرت نے نہ یہ چرخِ کُہن بدلا

ابو المظفر سید تسلیم حیدر۔ قمر

فغانِ درویش

آنکھ کھل جاتی ہے آتے ہی تری درگاہ میں
تھی یہی جاں پروری نارِ کلیم اللہ میں

برقِ موسیٰ گرچہ چمکی تھی فرازِ طور پر
بھر گئی آکر مگر تیرے دلِ آگاہ میں

تجکو محبوبِ الٰہی کا نہ کیوں ملتا خطاب
شانِ محبوبی کے جلوے ہیں تری درگاہ میں

آکے باغِ چشت میں دیکھا جو نخلِ لاالٰہ
کھل گئے وہ راز جو مخفی تھے الا اللہ میں

نغمۂ توحیدِ حق کیسا پرِ پروانہ تھا
اڑ گئیں روحیں سب اولین فنا فی اللہ میں

اُس رسولِ ہاشمی کا ہے یہ احسان کہاں　　وہ لٹیں دیں جنسے لکھکر نقش الا اللہ میں

ہے خدا کی معرفت انعام ہر ذی ہوش کا　　جسکی کانیں ہیں نہاں صنعت و صفا کی راہ میں

چشمِ بینا ہو تو ہر ذرہ جہاں کا نور ہے　　کوہ کے منظر نہاں ہیں ایک برگِ کاہ میں

میں بھی ہوں اک کشتۂ تیغِ ادائے نازِ دوست　　دیکھتا رہتا ہوں کچھ ہر جلوۂ ناگاہ میں

سُن کے آوازِ مغاں دل کی تڑپ جاتا ہوں میں　　شور ہے سیتار رکھا کس نے اسکی آہ میں

جلوۂ دولت سرائے تو ہمہ عشق انگیز شد

آتش پنہاں دل از آب اشکم تیز شد

دلکو ملتی ہے یہ دولت عشق کی سرکار سے　　راحتیں پاتے ہیں عاشق لذتِ آزار سے

عاشقانِ تفتہ دل کی ایک آہِ درد خیز　　بے گماں بہتر ہے کوری وردِ استغفار سے

زاہدا کر دل میں پیدا صدق بہرِ وصلِ یار　　ہو یہ بہتر فکر تجری تحت فی الانہار سے

پڑھ ذرا دانش سے کچھ پیرِ مغاں کی داستاں　　پوچھ اسرارِ حقیقت کو کسی ہشیار سے

دیکھ ان پیٹے ہوئے مستانِ عالم خیز کو　　کام توپوں کے لئے توحید کی تلوار سے

جا کہیں سے سیکھ تو بھی شیوۂ آدابِ عشق　　کچھ نہیں ہو نیکا اس دستار چکری دار سے

تھام دستِ ہوش ہے دامانِ دل اس بزم میں　　بیغرض ہو کر تو مل مفلس و زردار سے

تھا یہی سندوں کا مشرب اور یہی انکا تھا کیش　　جا بجا پھیلے جو اٹھکر یار کے دربار سے

ایک آیا یہاں تو پہنچا دوسرا اجمیر میں

پھنس رہا ہے تو مگر اک ریوڑی کے پھیر میں

اے نظام الدین بگڑا دینِ قدسی کا نظام　　ہو گئیں دنیا و دیں کی نعمتیں ہم پر حرام

زاہدوں نے کر دیا اب ہم کو دنیا سے جدا　　اور کیا ایجاد واعظ نے نیا علم کلام

یعنی بے محنت ملیں بیٹھے بٹھائے روٹیاں　　اور دروازوں پہ اُنکے ہو ہجوم خاص و عام

غسلِ میت یا خطابِ کفر کی دھن کے سوا　　عمر بھر انکو نہ کچھ کرنا پڑے یہاں اور کام

آہ خودکامی نے سکھلائیں ہزاروں ترکیبیں — شیخ نے اپنی پرستش کا بچھا رکھا ہے دام
سیکڑوں ایسے ہیں ہم میں جنکو آتا ہے وجد — جب کہیں کوئی مشقت کا اُنہیں دکھلاؤ کام
یہ طریقہ یہ چلن یہ زہد ظاہر یہ خیال — ہر جگہ رندانِ دیں پرور نے سمجھا تھا حرام
اُن کو محنت اور مشقت سے نہ کوئی عار تھی — کر گئے ہیں نام دنیا میں وہ پاکان انام
کر رہے ہیں آہ درویشی کو اب نادان خراب — یاد کر لی ہیں انہوں نے چند باتیں خشک و خام
ورنہ ہے اسلام خود درویشی تو درویشی ہے دیں — ہے مگر اب اَور کچھ زاہد کا موضوع کلام
اب تصوف رہ گیا ہے نام اس مقصود کا — یعنی صوفی کے لیئے لازم ہے بیکاری مدام
آہ ہو جس قوم میں عُجب و جہالت کا یہ حال — کس طرح دنیا و دیں کے دھن میں ہوگی شادکام
ایک ذرہ بھی نہیں فارغ یہاں پر کام سے — خالقِ علام نے قائم کیا ہے یہ نظام
عالمِ اجسام میں گر ہر اک انسان کو — کرنا پڑتا ہے وہی جو کر گئیں قومیں تمام
یعنی پڑھکر علم وہ پائے خدا کی دولتیں — اور جیئے آفاق میں وہ با اُصول و انتظام
پھینکدے تیغ خرد سے بحر و بر کو چیر کر — تا کہ ہو شانِ خلافت کی وہ اک حجت تمام
آسمانوں اور زمینوں میں ہیں جتنی نعمتیں — ہوشمندوں کے لیئے پیدا ہوئیں بالاہتمام
ہے خدا کی معرفت بھی نام علم و ہوش کا — پا گئے یہ راز پاکر عارف اپنا احترام
دیکھیے لیکن اب اپنے نام لیواؤں کا حال — ہے گدائی پر اُنھیں اب خواہش ناموس و نام

ہے نحوست کچھ عجب اس قوم پر چھائی ہوئی
شامتِ اعمال سے آفت ہے اک آئی ہوئی

اے شناسائے حقیقت اے چراغِ بزمِ راز — چیر کر دل کس کو دکھلاؤں میں یہ سوز و گداز
ہو گئی ہیں مُدتیں دل کے غمِ جاں سوز میں — فی الحقیقت میں نہیں ہوں قائلِ عشقِ مجاز
ایک ہی برقِ تجلی پر رہی میری نظر — دل کو جسنے خود سکھائے ہیں یہ سارے سوز و ساز
ہے روانِ پاک کا کعبہ زیارت گاہِ دل — پڑھتا رہتا ہوں کسی کے ذوق میں دائم نماز

کھینچکر لایا ہے جذبِ دل یہاں تک بھی مجھے — خوش ہوا ہوں دیکھکر اس گھر کو ای کیش نواز

رنج ہے لیکن یہی یاروں کی حالت اور ہے — ہائے مجلس میں ہماری نفس بد ہے فتنہ باز

ناز ہے واعظ کو اپنی شہرت بے سود پر — آہ دکھلائے کوئی آکر اسے راہِ نیاز

سو طرح سے لٹنے والے دینداروں میں فتور — خود پرستی نے کرلئے اس سے ساری ساز باز

کیوں نہیں آتی سمجھ میں اب وہ تعلیم رسول — یعنی خیر اندیشیٔ عالم میں ہے راحت کا راز

خود غرض بن کر کوئی آرام پا سکتا نہیں — گرچہ پڑھتا ہو وہ شب کو اٹھکے سو رکعت نماز

ہے صفا و صدق میں آسائش روح و رواں — دوستو محمود بن کر دیکھنا شکل ایاز

جی بھر آتا ہے نظر پڑتی ہے جب اس قوم پر — لےگیا ہے چھین کر کون اس سے ہمدردی کا راز

خودستائی کے نشہ میں دل ہزاروں چور ہیں — جس جگہ تھی مہر و الفت اب وہاں ہے حرص و آز

داستانِ غم ہماری غفلتوں سے بڑھ گئی — ورنہ یہ قصہ حقیقت میں نہ تھا اتنا دراز

ہائے وہ باتیں جو ناجائز ہیں ہر اک طور سے — ڈھونڈتے پھرتے ہیں مفتی انکی تدبیر جواز

رہنماؤں میں کئی بندے بنے ہیں راہزن — سوئے تبت ہمکو دکھلاتے ہیں وہ راہ حجاز

جہل اور افلاس نے سکھلائیں یہ گمراہیاں — چھا گیا ہے ہمپہ گویا خودسری کا خواب ناز

بات جو سچی کہے کہتے ہیں یہ اسکو برا — اصل میں ہے نفس ہم میں کی یہ سیاسی ترکتاز

آہ دل خوں ہو گیا یاروں کے ظلم و جور سے

دوستو سمجھو کتابِ پاک کو کچھ غور سے

اے رسولِ ہاشمی کے خادمِ ایوان نشیں — دینداروں سے کوئی کاوش مجھے لکھو نہیں

یاد ہے مجھکو بھی کچھ رندانِ بے پرواکا حال — جسطرح سے وہ بنے کوئی بنے ایسا کہیں

بیغرض ہو کر انہوں نے حق پہ باندھی تھی کمر — ایک جوشِ ہمدمی پہنچے عرب سے تا بچیں

جب ملے وہ کچھ تو بس سارا زمانہ رل گیا — جس جگہ بیٹھے تو کردی بات اپنی دلنشیں

سب کا مقصد ایک تھا سب کی تمنائیں تھیں ایک — یعنی ہو ظاہر جلال ربِ عالم آفریں

وہ نہ مرتے تھے کبھی اپنی فضیلت کیلئے — اُنکے دلمیں دلنشیں تھی شانِ ربّ العلمیں
کانپ اُٹھتے تھے وہ جب سنتے تھے اپنی خوبیاں — صاف کہدیتے تھے بس بھائی کہ ہم ایسے نہیں
اُنکو تھا معلوم ہے بیٹھا ہوا اپنے ہی ساتھ — اک حریف و دشمنِ جاں رواں با عہد مکیں
ہے بزرگی ہر بشر کی دانش و اخلاق میں — بوالہوس ہے وہ جو ڈھونڈھے اپنی عزت ہر کہیں
آسمانِ معرفت کا رنگ لیکن اب ہے اور — اور بنالی ہے نئی ہر شیخ نے اپنی زمیں
حضرتِ اقدس کے مُنہ سے جو نکل جائے کبھی — ق — ہے یہی شانِ خردمندی کہ سب کرلیں یقیں
خشک ہو یا تر ہو یا پختہ ہو یا ہو خام وہ — شک کی گنجایش مگر اسمیں کہیں مطلق نہیں
کردیا اُن قوتوں کو سُست اس تعلیم نے — جو دماغوں میں برائے دانش و تحقیق تھیں
مرگئے موجد مسلمانوں میں سب اس وہم سے — یعنی وہ جز حکمِ مرشد کچھ بھی کرسکتے نہیں
فرض ہے یہ ہر طرح سے جن کے ہر خادم پر آج — گر کرے دعوت تو ہوں چپاتیاں نہایت ہی مہیں
جو کی روٹی جو کہ کھائی تھی رسول اللہ صلعم نے — معرفت کے زور میں وہ شیخ کو بھاتی نہیں
یہ بھی ہے لازم کہ نیچہ سے نہ نذرانہ ہو کم — ورنہ اُس نادان کو عرفاں نہ ہوگا دل نشیں
یہ طریقت اب جو ہے پیرانِ تن پرور کے پاس — اسکو دینِ پاک سے دنیا میں کچھ نسبت نہیں
کیا سناؤں دردِ دل میں اے شہِ صدق و سلوک — سُن کے حق اب شیخ بھی ہوتا ہے کچھ چیں بر جبیں

نام اپنا کیا بتاؤں میں کہ اک بدنام ہوں
ہاں مگر اِس بزم میں میخوارِ دُرد آشام ہوں

ہوں اُسی پیرِ مغاں کا خادمِ حلقہ بگوش — جسنے اک ساغر میں بھر کر دیئے سب گنجِ ہوش
شمعِ دانش ہر جگہ پر سُست اور بے نور تھی — جل اُٹھی وہ جب اُٹھا وہ نابغۂ سادہ پوش
ہائے اُسکا یہ سخن ہر رند کو تڑپا گیا — "دو جہاں بہرِ صفا با ہمتِ مردانہ کوش"
شور سا اُٹھے ہوئے تھے راہب و احبار سب — اُٹھ کے للکارا صداقت نے کہا سب کو خموش
مان لو توحیدِ مطلق دولتیں پاجاؤ گے — بیگماں چھپتے نہیں ہیں شرک کے بیکار جوش

نعمتیں اللہ کی ہیں حق پرستوں کیلئے
گر کروگے غور کچھ تم سب کو آجائیگا ہوش

سُن کے اِسکو چونک اُٹھے تھے جو کچھ بیدار بخت
ہوگئے کشور کشا جو لوگ تھے خانہ بدوش

آلگیں قدموں سے اُنکے دولتیں دارین کی
ہائے کیسی مَے پلاتا تھا وہ پیرِ میفروش

پاگئے مفلس خزانے۔ پاکے توحیدِ خدا
رکھدیئے پیرِ مغاں نے اِک جگہ برنا و نوش

اے رسولِ پاک تیرے مست سب ہشیار تھے
دل بھی تھا مصروف اُنکا ہاتھ بھی باکار تھے

تیری باتوں کے سوا باتیں کہاں تھیں دلپسند
پر ستم یہ ہے کہ اُن پر ہم نہیں اب کاربند

دُھن ہے واعظ کو کہ ہر جا نام ہو میرا بلند
شیخ کو سودا ہے یہ سمجھیں مجھے سب ہوشمند

اِک طرف ضربیں لگاتا ہے کوئی شب زندہ دار ق
کر رہا ہے ہاؤ ہو اُٹھ کر بآوازِ بلند

جسکا مطلب ہے فقط یہ۔ لوگ سُن لیں یہ صدا
اور اُسکے بھی پجاری ہوں میں زردار چند

کچھ نہیں سمجھا ہے لیکن اِسنے رازِ دین کو
ورنہ خاموشی سے کرتا کام سب یہ ارجمند

سر گھٹائے پھر رہا ہے بیٹوا اِک چار سو
لے رہا ہے وہ بھی اپنے روپ سے کارِ کمند

ڈھونڈتے ہیں بزمِ عشرت لوٹتے پھرتے ہیں مال
رہ گئے ہیں آج یہ دیں ہائے کے حق پسند

بوالہوس ہیں یہ سبھی ہیں نگاہِ حرص و آز
اِنکی باتوں پر کوئی عاقل ہو کیسے کاربند

خود ستائی بند ہے اِنکی ہر اک آواز میں
خود فروشی کا ڈھل ہوتا ہے انکا وعظ و پند

پھیر دوں جھاڑو یہ اُسکے گھر میں اپنے فضل سے
سامنے اِن کے کوئی بیٹھے جو ہیں کر مستمند

سچ کہا ہے دردِ دل سے جوش میں اِک رند نے
"چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر میکنند"

آہ درویشی سکھاتی ہو کہاں یہ نخوتیں
جنکی دلدل میں پھنسے بیٹھے ہیں یہ سب ارجمند

کچھ نہیں آتا سمجھ میں یہ مقدس لوگ سب
اِک جگہ پر کیوں ملا کر رکھتے ہیں زہر و قند

اے علمبردارِ دانش آہ یہ خواہانِ مال
زنگیِ بدخواہ را کافور نامے مینہند

بات کچھ لمبی ہوئی جاتی ہے اے عرفاں شناس
ورنہ لکھتا اور بھی اِس نظم کے دو چار بند

ایکدن اک شیخ کو میں نے سنایا تھا یہ حال ہو گیا چپ وہ دکھا کر اک ادائے زہر خند

لیکن آمد این ندا سوئے من از قسام ہوش
گوش نامحرم نباشد بہر آواز سروش

قاضی حمید الدین حمید

تضمین غزل اکبر

جناب اکبر کی ایک غزل جو دسمبر ۱۹۰۸ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ اُسپر کئی حضرات نے تضمین کی ہے۔ افسوس ہے کہ قلتِ گنجایش کی وجہ سے نہ ہم ساری تضمینیں درج کر سکتے ہیں نہ ہر تضمین کو مکمل۔ اس مرتبہ ہم اپنے کرم فرما مولوی سید محمد فضل رب صاحب کی تضمین کے چند بند ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اور اسکے بعد کسی موقع پر شمس العلما مولوی محمد یوسف صاحب رنجور کی تضمین ہدیہ ناظرین کرینگے۔

مسلمانوں میں پابند شریعت حیف کم ہونگے نہیں کُنے طریقت میں کسیکے بھی قدم ہونگے
غضب یہ ہے کہ اسلامی عقائد پر ستم ہونگے یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

کسی معشوق کو الفت نہ ہوگی اپنے مفتوں سے نہ لیلےٰ کا سُنیگا نام کوئی اُسکے مجنوں سے
نہ چارہ گر کرے گا دل ہی کی بات محزوں سے بدل جائیگا انداز طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہونگے

نہ دلچسپی کسیکو ہوگی کچھ حج و زیارت سے مسلمانوں کو ہوجائیگی نفرت زہد و طاعت سے
نہ کچھ باقی رہے گا واسطہ اُنکو عبادت سے عقائد پر قیامت آئیگی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پُتلے صنم ہونگے

نہ ہندی اور اُردو کی یہ بحثِ ناروا ہوگی نہ عربی کی زبانِ نغز کی پرسش ذرا ہوگی

مذمت فارسی کی بھی برابر جا بجا ہوگی ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے

نہ چہرے پر شکن ہوگی نہ کچھ رنج و الم ہوگا حوادث سے زمانے کے کسی کا سر نہ خم ہوگا
بڑھا تھا عزم میں جتنا نہ اس سے کچھ بھی کم ہوگا کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

پریشاں رات دن بغاؤ رہتے ہو کیوں اکثر کیا کرتے ہو اپنا حال ناحق دمبدم ابتر
خدا کے فضل پر رکھنا بھروسہ سب سے ہے بہتر تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے ای اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

سید محمد فضل رب الہ آبادی ڈپٹی کلکٹر ممالک
متحدہ۔ الحال مہتمم بندوبست بھوپال

خطِ منظوم

شمس العلما مولانا شبلی اپنے ایک غیر زباندان دوست کے خط کی داد جسکی اردو صحیح اور بامحاورہ تھی ذیل کی نظم میں دیتے ہیں

دی یکے گفت کہ در ریختہ انشائے سخن شیوہ ہست کہ مخصوص زباندان باشد
گفتم البتہ چنیں است کہ گفتی، امّا نیست کارے کہ بروں از حدِ امکاں باشد
مردِ دانا بتواند کہ بہ تحصیل و بہ سعی باعرب حرف زند گرچہ زایراں باشد
ما دریں حرف کہ پیکے برسانید بہ من نامہ را کہ گراں مایہ تر از جاں باشد
نامہ آوردم و بازش بسپردم کہ ببیں ایں چنیں حرفِ دلی و نیز آساں باشد
نامہ را خواند و بفرمود کہ شک نیست دریں کایں چنیں حرف زدن کارِ زباندان باشد
کہ بود صاحبِ ایں نامہ و اصلش ز کجاست؟ اعتبارِ گہر از فرخیِ کاں باشد
گفتمش ریختۂ خامہ...... ہست ایں کز دکن ہست و مرا ہمچو عزیزاں باشد
یارب آں دست و قلم در کنفِ حفظ تو باد تا جہاں باشد و تا گنبدِ گرداں باشد

(شبلی)

تازہ غزلیں

رہِ ملکِ عدم کا نام سُنکر دم نکلتا ہی — یہ وہ رستہ ہی جس میں ہر مسافر مر کے چلتا ہے
غم اُسکا کیا خرامِ ناز ہی جو دلکو ملتا ہی — کلیجہ کیا کوئی نالہ ہے جو منہ سے نکلتا ہی
نظر باز اُنکے گھر سے ہو کے متوالا نکلتا ہی — وہ جادو آنکھ کا مانندِ دورِ بادہ چلتا ہی
بسانِ شمع سوزِ غم میں کیا اخفائے گریہ ہو — گلے کا ہار بن جاتا ہے جو آنسو نکلتا ہی
رہا کرتا ہے جھُرمٹ اُنکے قدموں پر نگاہوں کا — تنِ شفاف پر ہائے نظر آسی پھسلتا ہی

(آسی)

لطف بھی جور میں شامل ستم ایجاد رہے — کچھ تو تسکینِ دلِ عاشقِ ناشاد رہے
جھوٹ سچ وعدے یونہیں گر ستم ایجاد رہے — ہم کبھی شاد رہینگے نہ کبھی شاد رہے
یاد پر اُنکے ہی موقوف ملاقات اپنی — بات اتنی سی ہی اللہ کرے یاد رہے
وصل میں ہجر کے شکوے نہ فراموش ہوئے — بھول جانیکے جو قصے تھے وہی یاد رہے
وہ مرا چپکے سے کچھ کان میں اُنکے کہنا — اُن کا وہ جھیپ کے کہنا کہ ذرا یاد رہے
کان تک اُنکے گئے اور نہ دلمیں اُترے — اوپر اوپر ہی مرے نالہ و فریاد رہے
میں وہ ہوں صید مری ٹوہ میں پیچھے پیچھے — ہاتھ میں دام لیے گھات میں صیاد رہے
آپکے دل سے اُتر جائیں گرے نظروں سے — آپکے سامنے غیروں پہ یہ اُفتاد رہے
عشق میں ایک کے پابند رہے ہیں ایسا — ہم گرفتار ہوئے اور پھر آزاد رہے
تو گرفتارِ قفس ہوں میں ابھی وحشت ہی — کچھ دنوں سامنے میرے مرا صیاد رہے
یہ نیا پیچ ہے تقدیر کے چکر کا عزیز — جسکو ہم چاہیں وہی برسرِ بیداد رہے

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز۔ دکن

جہاں میں پھیلے ہیں جتنے مذہب ہر اک میں آخر کلام نکلا — نہ کشف سے مدعا بر آیا نہ کچھ دلیلوں سے کام نکلا

امانتِ غم کے سونپنے کو قضا نے جب آکے فال کھولی
جو سب سے عاجز تھے اُس گلی میں انھیں غریبوں کا نام نکلا

جِلو میں پیرِ مغاں سا رہبر بغل میں ساقی سا فیض گستر
بڑے تکلف سے آیا ساغر بڑے تجمل سے جام نکلا

جو دل بھر آیا تو خوب روئے فراق میں اپنے چاند ہم
فلک پہ جب جب بصد تجمل چمک کے ماہ تمام نکلا

کبھی نہ ہم واعظوں سے اُلجھے نہ اپنے ناصح کے دل کو توڑا
نہ سخت باتیں زباں پہ آئیں نہ تلخ منہ سے کلام نکلا

صفائے دل کی لگا کے عینک کبھی جو کھولی کتاب ہم نے
حرام جو تھا حلال نکلا حلال جو تھا حرام نکلا

سمجھ گئے آئینہ مصفا جھکے تھے دانا جس آستاں پر
کرید کر خاک اُس جگہ کی ہٹا کے دیکھا تو دام نکلا

ابھی تو محشر کا حال سنکر دلوں کو کچھ کچھ تو ہے سہارا
کہاں غریبوں کا پھر ٹھکانا جو وہ بھی شورِ عوام نکلا

ہمیں تو نالہ کی آرہی ہے کہ مفت بیگار میں پھنسایا
سُنیگا عالم میں کون ایسی جو لیکے دل کا پیام نکلا

اُٹھے کبھی مست ہو کے میکش جھکے کبھی جا کے پائے خم پر
جو آئے مسجد سے میکدہ میں یہی سجود و قیام نکلا

بڑا تعجب تو شاد یہ ہے وہ شاد سب کو جانتے ہیں
اُسی کو سمجھے تھی لااُبالی وہ شیخ بیت الحرام نکلا

(شاد عظیم آبادی)

سرو قدِ حشر اُٹھا قامتِ دلجو ہو کر
فتنے بیدار ہوئے نرگسِ جادو ہو کر

صبح ہو اے شبِ عشرت ترے صدقے جاؤں
ڈھانکئے چہرۂ خورشید کو گیسو ہو کر

لب پہ ہے قفل خموشی کا مگر آنکھوں سے
حسرتِ دید ٹپک پڑتی ہے آنسو ہو کر

رفتہ رفتہ ترے غم نے کیا رسوا مجکو
شوق سے دردِ جگر درد سے آنسو ہو کر

حسرتیں دل کی نہ نکلیں مرے لیکن نکلیں
کبھی آہیں کبھی نالے کبھی آنسو ہو کر

دل نہ دنیا سے لگایا کہ ہیں آزادہ روش
چمنستاں میں بسے بھی تو بسے بو ہو کر

ہے اگر سبزۂ مینا کی طراوت دلکش
ابر کہسار سے آجائیگا آہو ہو کر

دل اگر ایک طرف ہے تو جگر ایک طرف
تولتی ہے نگہِ ناز ترازو ہو کر

نام جو بادۂ کوثر کا زباں پر آیا
مل گیا دستِ دعا ہونٹ سے چلو ہو کر

مجلسِ پیرِ مغاں سے نہ اُٹھینگے ہرگز
پاؤں اب توڑ کے بیٹھے ہیں دو زانو ہو کر

قدرِ اِنظم کسی نے بھی نہ جانی میری
دامنِ دشت میں مہکا گلِ خودرو ہو کر

([illegible])


میر مہدی مجروح
منشی امیر اللہ تسلیم

مخزن

ہندوستان کا اثر انگلستان پر

انگلستان نے جو اثر ہندوستان پر ڈالا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہم روز قدم قدم پر اپنے گرد وپیش اُسکی شہادتیں موجود پاتے ہیں۔ کوئی گھر ایسا ہوگا جس میں کچھ نہ کچھ نشانات انگریزی تہذیب کی تقلید کے نہ پائے جائیں۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے پُرانی وضع کے گھرانوں میں بھی لڑکیوں کے جہیز تک میں ایک حصہ انگریزی سامان کا آنے لگا ہے میز کرسی انگریزی وضع کا آئینہ چار کا سٹ وغیرہ چیزیں تو معمولی ہوگئیں اور ہر کہ ومہ انکی ضرورت سمجھنے لگا ہے۔ جو ذرا اور متمول ہیں وہ نہایت شوق سے گھروں کو انگریزی فرنیچر سے سجاتے ہیں۔ کمروں کے نام انگریزی رکھتے ہیں کھانا انگریزی طریق سے کھانے لگے ہیں۔ پوشاک انگریزی پہنتے ہیں اور اُن کے دیکھا دیکھی اور لوگوں کے سر میں بھی یہی سودا سماتا جاتا ہے۔ ادہر تو اور زبان تک کو انگریزی اثر نے بدلدیا ہے۔ سیکڑوں انگریزی لفظ تو روزمرہ کی بول چال میں شامل ہو کر جزو زبان بن گئے ہیں۔ اور عالم وجاہل سب اُنہیں استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ اُنکے لیئے ہماری زبان میں نہایت وسیع اور نہایت آسان اور نہایت مختصر لفظ موجود ہیں۔ اسپر بھی انگریزی کے رواج کی کثرت کے سبب سے لوگ عام طور پر اپنے لفظوں کی جگہ انگریزی لفظوں ہی کو زیادہ کام میں لاتے ہیں۔ میز کو ٹیبل کہنا وقت پوچھنا ہو تو ٹائیم پوچھنا ایسی مثالیں ہیں کہ ہر شخص کو مستحضر ہونگی۔ اور اسلیئے زیادہ مثالیں

دینے کی ضرورت نہیں ٭

اِس عام میلان کے تین بڑے سبب ہیں۔ سب سے اوّل یہ کہ صاحب حکومت کا اثر محکوم جماعت پر بہت زبردست ہوتا ہی۔ رعایا کا تخیّل اکثر اپنے حکمرانوں کی عادات درسوم کے متعلق یہ ہوتا ہی کہ یہ عادات و رسوم حکومت کا جزو ہیں اور اُنکے اختیار کرنے سے گویا ہم عزت کے مدارج میں سے چند درجے طے کرتے ہیں۔ موجودہ حکمرانان ہندوستان کا عالمگیر اقبال اور بڑھا ہوا اقتدار اِس خیال کو اور بھی مضبوط کرتا ہے "ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است" ایک بہت پُرانا مقولہ ہی۔ مگر اسوقت بھی ایسا ہی سچا ہی جیسا کہ اُسوقت تھا جب یہ زبان زد خاص و عام ہُوا۔ اور اِسی سبب سے ہر انگریزی چیز آجکل پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہی جو بُری بھی ہے وہ ہماری نگاہوں میں اچھی اور جو اچھی ہی وہ تو بہتر اور برتر نظر آتی ہی۔ دوسرا سبب ان چیزوں کی جدّت ہی۔ ہر نئی چیز زیادہ دلچسپ اور دلپسند معلوم ہوتی ہی۔ اور اِس اُصول کے موافق اگر انگریزی حکومت ہندوستان میں نہ بھی ہوتی تو بھی یہ چیزیں کم و بیش رواج پا جاتیں۔ اور اِسیوجہ سے اُن ایشیائی ملکوں میں جہاں ابھی ایشیائی حکومت باقی ہی انگلستان اور دیگر ممالک یورپ کا مال بکثرت جاتا اور بکتا ہی۔ تیسرا سبب وہ حُسن ظاہری اور چمک ہے جو یورپ کی صنائع کا خاصہ ہی۔ ذراسی چیز کو چاہے اُسے کوڑیوں کے مول بیچنا ہو یورپ کے تاجر اپنی کلوں کے ذریعہ ایسی جلا دیتے ہیں کہ دیکھنے والا ایک دفعہ تو پھڑک جاتا ہے۔ اور ایسی چیزیں بھی خرید لیتا ہی جن کی اُسے زیادہ ضرورت نہیں ہوتی ٭

ہم پر مذکورہ بالا اسباب سے یورپ کا جسقدر اثر ہو کم ہے۔ یہ بھی جو آہستہ آہستہ اثر ہوا اِس وجہ سے تھا کہ ہم لوگ بالطّبع قدامت پرست ہیں۔ اور اپنی پُرانی چیزوں کو عزیز رکھتے ہیں۔ تغیّر اور تبدّل سے ہمکو ایک قسم کی نفرت ہی۔ باوجودیکہ

پشتہاپشت سے یہ دریافت کر چکے ہیں کہ زمانہ انقلاب پسند ہے اور آئے دن تبدیلیاں کرتا رہتا ہے۔ اسپر بھی بجائے اسکے کہ خود زمانہ کی ہوا کے ساتھ چلیں صدیوں سے زمانہ کو کوستے چلے آتے ہیں اور یہ تماشا ہو رہا ہے کہ نہ وہ اپنی خو بدلتا ہے نہ ہم اپنی خو بدلتے ہیں۔ غرض ہم تو اس طرح بحیثیت محکوم ہونے کے اثر پذیر اور بحیثیت قدامت پسند ہونیکے تاثر سے خالی چلے جاتے ہیں۔ اور اس کشمکش میں ہماری زندگی بسر ہو رہی ہے۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ انگلستان بھی ہم سے کچھ اثرات لیئے بغیر نہیں رہ سکا۔

قوانین قدرت کے اسرار بھی عجیب ہیں۔ اور قومیں اُنکے آگے ایسی ہی مجبور ہیں جیسے افراد انسانی۔ فرض کیجئے۔ دو شخص کچھ عرصہ تک باہم ملیں جنمیں ایک زبردست ہو ایک کمزور۔ ایک کا دل و دماغ قوی ہو ایک کا ضعیف۔ تو بھی یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جہاں زبردست کا اثر کمزور پر پڑا وہیں تھوڑا بہت کمزور نے بھی اپنے رفیق کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ اسیطرح اقوام کی حالت ہے۔ ممکن نہیں کہ کسی قوم کا سابقہ کسی دوسری قوم سے پڑے اور وہ اُس سے متاثر ہونیسے بالکل بچ جائے انگریزوں نے اس قانونِ قدرت کو مدنظر رکھ کے اور اُنسے پہلے جن قوموں کو ہندوستان سے سابقہ پڑا اُن کی حالت صفحاتِ تاریخ سے مطالعہ کر کے یہ تہیہ کر لیا کہ ہم قانونِ قدرت کی اس زد سے بچیں۔ اور بہت کچھ بچے بھی۔ یہاں آکر رہنے اور ہندوستان کو اپنا گھر بنانے کا قصد تو انکی قوم کے کسی فرد نے آجتک کیا ہی نہیں۔ افریقہ امریکہ اور اسٹریلیا سب جگہ جا کر رہتے ہیں اور آباد ہو جاتے ہیں۔ مگر ترک لازم ہے تو ہندوستان کا۔ جو معدودے چند ضروریاتِ ملکداری یا کاروبار کی وجہ سے برسوں کے لیئے یہاں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ بھی شہروں سے دور جنگل میں منگل مناتے ہیں۔ موسم گرما میں پہاڑوں پر انگلستان کی طرزِ معاشرت کا نمونہ پیدا کرتے ہیں۔ اور اس پہ

قناعت نہ کرکے ہر دوسرے تیسرے برس انگلستان کو دوڑ جاتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے ملک کی یاد اور وہاں کی عادات کا اثر تازہ رکھتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کوشش ہوتی ہے کہ انگلستان کے تازہ ترین فیشن یہاں رواج پائیں اور وہ یہاں بیٹھکر وہی زندگی بسر کریں جو اُن کے ہموطن انگلستان میں کر رہے ہیں بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی یہ ہی اہتمام کیا جاتا ہے اور کوئی معزز اور متمول انگریز گوارا نہیں کرتا کہ اُسکے بچے ہندوستان میں تعلیم پائیں۔ چھوٹی سی عمر میں انہیں انگلستان بھیجدیا جاتا ہے۔ اُنکی جدائی منظور کی جاتی ہے۔ مگر یہ نہیں پسند کیا جاتا کہ وہ یہاں کی خو بو سیکھیں۔ مگر ان سب احتیاطوں پر کچھ تھوڑا سا اثر ہمارا ابھی انگلستان تک پہنچ گیا ہے۔ اور رفتہ رفتہ منتقل ہوتا جاتا ہے۔ اِسے کم نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ وہ اسی اُصول کا جسکا اوپر ذکر کیا گیا ہے ایک بین ثبوت ہے۔ اور صاف ظاہر کرتا ہے کہ کوئی دو قومیں جو آپس میں ملیں ایک دوسری پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتیں ؂

کیا ہی ایک دست آرزو نے وار دو جانب زلیخا کے جگر تک چاک ہی یوسف کے داماں کا

غور کرنے والے کو جو چیز آجکل انگلستان میں غیر معمولی نظر آتی ہے وہ مختلف رنگوں کا شوق ہے۔ جن لوگوں نے آج سے بیس ۲۰ برس پہلے انگلستان کو دیکھا، اور اب دوبارہ وہاں گئے ہیں۔ مجھے اُن سے معلوم ہوا کہ وہاں پہلے مرد تو مرد عورتیں بھی شوخ رنگ کپڑا نہیں پہنتی تھیں۔ اول تو سیاہ رنگ کے سوا کسی رنگ کا کپڑا وہاں مقبول ہی نہیں اور ہر موقع پر خواہ شادی ہو خواہ غمی۔ اِس رنگ سے زیادہ تر کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی رنگ کا شوق کرے بھی تو اکثر صوفیانہ رنگ پسند کیے جاتے تھے نتیجہ اِسکا یہ تھا کہ کسی مجمع میں سوا سیاہ پوشی کی کثرت کے کچھ نظر نہیں آتا تھا اور وہ انگریز اور میمیں جو ہندوستان کو دیکھتے تھے اور یہاں کے گلی کوچوں اور

بازاروں میں اور میلوں کے موقعوں پر لوگوں کو زنگار رنگ کے لباسوں میں ملبوس
پاتے تھے ہمارے اس شوق کی بہت تعریف کرتے تھے۔ اور اسی بنا پر بلاد شرقی
کو شاندار خوش رنگ اور چمکیلا بیان کرتے تھے۔ مگر اب انگلستان میں بھی موسم
بہار میں کسی گروہ پر نظر ڈالی جائے جو دن کے وقت ساحل بحر (کنارِ دریا) یا کسی اور
مقامِ تفریح پر جمع ہو تو لباسوں کی رنگینی کے اعتبار سے وہ کسی مشرقی گروہ سے
بہت پیچھے نہیں رہیگا۔ عورتیں تو رنگ کی انتہا سے زیادہ شائق ہوتی جاتی ہیں
اودا اور بنفشی رنگ نہایت مرغوب ہے۔ بلاؤس[1] بنفشی۔ گون[2] بنفشی۔ ٹوپی ہمرنگ ٹوپی
پر پھول بنفشی۔ چہرے پر ہلکی جالی کی نقاب اُسکا بھی بنفشی رنگ۔ اور دھوپ کے
بچاؤ کے لیئے اگر سن شیڈ[3] ہاتھ میں ہے تو وہ بھی بنفشی ریشم کا۔ اسکے سوائے اور
بھی طرح طرح کے رنگ عورتوں میں مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ پیازی آسمانی سبز
اور بعض جگہ سُرخ۔ یہ میلان روز بروز ترقی پر ہے۔ یہاں تک کہ مرد جو نسبتاً
سادہ وضع کے پابند ہیں رفتہ رفتہ رنگینی کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔ فوق البھڑک
صدری پہننا اب ایک معمولی بات ہوگئی ہے۔ اور ٹائی شوخ رنگ کی تو اب بڑے
بڑے متین آدمی بھی پہننے لگے ہیں۔ دکانوں کی آئینہ دار کھڑکیاں آجکل رنگین کپڑوں
سے مزین ہیں۔ اور کئی جگہ اُن میں جاپانی ریشم کے چوغے جنپر زنگار رنگ کے نقش و نگار
ہیں لٹک رہے ہیں۔ اکثر صاحبان ان چوغوں سے ڈریسنگ گون[4] کا کام لیتے
ہیں یعنی رنگین کپڑے پہننے کا شوق جو طبیعتوں میں پیدا ہوگیا ہے اُسے گھر
کی چار دیواری کے اندر پورا کرتے ہیں اور باہر اپنی معتاد ملکی وضع کی پابندی قائم رکھتے ہیں
زنانہ لباس میں ایک چیز کچھ عرصہ سے رواج پا چلی ہے جو قطعی ہندوستانی ہے

[1] زنانہ کرتہ [2] سایہ [3] ہلکی ریشمی چھتری جو صرف آفتاب کی شعاعوں سے بچاؤ کے لیئے لگائی جاتی ہے۔
[4] وہ کھلا چوغہ جو انگلستان میں صبح شام معمولی کپڑے اتارنے کیوقت پہنا جاتا ہے اور جسکے نیچے رخت خواب پہنا جاتا ہے

یعنی دوپٹہ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لیڈیاں یہاں کی طرح اُسے اوڑھتی نہیں بلکہ کندھوں پر ڈال لیتی ہیں۔ اِس طرح سے کہ اُسکے دونوں پلّے آگے لٹکتے رہتے ہیں۔ نفیس بنارسی ململ کے۔ طرح طرح کے بیل بوٹے دار اور کاڑھے ہوئے دوپٹے عام ہوتے جاتے ہیں اور موسم گرما کے لباس کا ایک جزو بن چلے ہیں۔ بعض خاص موقعوں پر دوپٹے اوڑھے بھی جانے لگے ہیں۔ ایک دفعہ مُکتی فوج کا ایک نہایت عالیشان جلسہ لندن میں ہُوا جسمیں عام حاضرین کے علاوہ چھ ہزار زن و مرد فوج کی مختلف شاخوں کی طرف سے دور دور سے آکر شریک ہوئے۔ اُس جلسہ میں جنرل بوتھ نے جو اِس مذہبی فوج کا بانی اور سپہ سالار ہے۔ اپنی فوج کی عورتوں کو جن کی تعداد کوئی تین ہزار کے قریب ہوگی باریک ململ کے رنگے ہوئے دوپٹوں سے سجایا تھا۔ ہر نشست پر ایک رنگا ہوا دوپٹہ پہلے سے رکھدیا گیا تھا۔ اور یہ عورتیں آتے ہی اپنی ٹوپی اُتار کر کرسی کے نیچے رکھ دیتی تھیں اور دوپٹہ اوڑھ لیتی تھیں۔ اُن کے گورے رنگوں پر سبز اور بسنتی دوپٹے عجب بہار دیتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنرل بوتھ نے اپنے جلسہ کا منظر کسی آسمانی دنیا میں منتقل کر لیا ہے۔ اور جو نیک عورتیں وہاں جمع ہیں وہ اُس دنیا کے فرشتے یا حوریں ہیں۔ بوڑھے جرنیل کی جہاندیدہ نگاہ نے جو اِس جلسہ کی شان بڑھانے کے واسطے دنیا بھر کے لباسوں سے اِس ہندوستانی وضع کو انتخاب کیا۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات نہیں بلکہ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہماری بعض چیزیں بتدریج انگلستان کے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہیں خواہ ہم خود اُن سے کتنے ہی نفور ہوتے جائیں۔

انگلستان کے مذاق میں جو تغیر تدریجًا پیدا ہو رہا ہے۔ وہ کچھ لباس تک ہی محدود نہیں۔ کھانے کی چیزوں میں بھی اُسکا اثر نظر آتا ہے۔ حلیہ جسے انگریز

کر ہی سکتے ہیں۔ اب انگلستان کے ہوٹلوں میں اکثر تیار ہونے لگا ہے اور بہت سے گھروں میں بھی رواج پا گیا ہے۔ اور یہ گھر نہ صرف اُن انگریزوں کے گھر ہیں جو ہندوستان میں رہ چکے ہیں بلکہ ایسے گھرانے بھی جنھیں کبھی یہاں آنے کا اتفاق نہیں اس غذا کا شوق کرنے لگے ہیں۔ اِسکے پکانے کا مصالحہ ٹین کے ڈبوں میں بند ہوکر مہنگے داموں بکتا ہے۔ حالانکہ اُسمیں بڑا جزو فقط ہمارے ہاں کی پسی ہوئی ہلدی ہے۔ اِسکے علاوہ بہت سے انگریزی مطبخ پلاؤ سے آشنا ہو گئے ہیں۔ اور کباب سے بھی ناواقف نہیں رہے۔ ہندوستانی مٹھائیاں بھی کہیں کہیں پہنچنے لگی ہیں۔ اور ہندوستان کا مشہور میوہ آم بھی ہاں اپنا سکہ جماتا جاتا ہے آم کی چٹنی اور آم کا مربہ تو بآسانی دکانوں میں مل سکتے ہیں۔ مگر اب کہیں کہیں آم کا اچار بھی پسند ہونے لگا ہے +

یہ اثرات جن کا ذکر مثالاً کیا گیا ہے۔ انگلستان کی مجموعی قومی زندگی اور اُسکی مستقل رفتار کے مقابلہ میں گو خفیف نظر آئیں۔ تاہم باعتبار آیندہ تغیرات کے نشانوں کے خفیف ہیں۔ خصوصاً جب یہ دیکھا جائے کہ خیالات تک بھی ہندوستان کا اثر پہنچ رہا ہے۔ آزادی۔ مساوات اور حقوق کے خیالات جو صدیوں سے اہل انگلستان کی گھٹی میں پڑے ہیں ضرور اب تک باقی ہیں۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اکثر اُمرا اور مدبرین پر حکومت پسندی کا مذاق غالب آتا جاتا ہے۔ اور شوقِ جہانبانی جسے سیاسی اصطلاح میں **امپیریلزم** سے تعبیر کرتے ہیں۔ دماغوں میں سما کر آزادی اور مساوات کے تخیل کو مغلوب کرتا جاتا ہے۔ یہ خاص اثر ہمارے نزدیک قابلِ ستایش نہیں۔ لیکن یہاں ہمیں اچھائی یا بُرائی سے بحث نہیں۔ بلکہ اُس سے غرض یہ ہے کہ امر واقع کیا ہے۔ اب تک جو اثر ہندوستان نے انگلستان پر ڈالا۔ اُس میں ہماری

ہمت یا کوشش کو کوئی دخل نہیں۔ اگر ہم اُن بے شمار مواقع سے پُورا فائدہ اُٹھائیں جو انگلستان پر اثر ڈالنے کیلئے ہمیں حاصل ہیں تو ان اثرات کی رفتار زیادہ تیز ہو سکتی ہے اور نتائج کی اہمیت بھی اُسی نسبت سے بڑھ سکتی ہے +

عبد القادر

غزل

پائے کوباں چوں ترنم بر در میخانہ ہا
عکس یارم مے فتد ہر لحظہ در پیمانہ ہا

عدل و انصافِ چنیں باید ببیں اے محتسب
گشت یک جا آب و آتش کاندریں خمخانہ ہا

گر نویسم شمۂ از احوالِ دردِ خویشتن
کم شود نزدِ مبصر قدر ایں افسانہ ہا

در حریم کعبہ رفتن حاجتم زنہار نیست
چوں ادا کردم بہ پیش ابروت شکرانہ ہا

چوں نہ گنجی بر زمین آسماں در حیرتم
اندریں سینہ ام کردی چساں کاشانہ ہا

از کجا آموختی اے ترک ایں جادو گری
صید شد مرغِ دلم در دامِ تو بیدانہ ہا

ہمچو مجنوں پیش تو رفتند صدہا عاشقاں
تو نئی تنہا مظفر مرد ریں ویرانہ ہا

احقر مظفر

روح کی بیداری

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

اَصل کا حیّ کے جزیرہ میں آنا

اَصل اُس جزیرہ کے حالات سُن چکا جسمیں مشہور روایت کے مطابق حیّ نے پرورش پائی تھی۔ اُسکی شادابی، زرخیزی، اعتدالِ آب و ہوا، اور سامانِ آسایش سے واقف تھا اس سے بہتر امن و عافیت کی جگہ اُسے کہاں نصیب ہوسکتی تھی۔ اسلیئے اس جزیرہ کو ہجرت کرنے اور باقی زندگی تنہائی اور تجرد میں بسر کرنیکا اُس نے مصمم ارادہ کرلیا۔ سب مال و اسباب جمع کرکے جتنا یہاں سے جزیرہ مذکور تک کرایہ جہاز کے لیئے ضروری تھا اُتنا علیحدہ کرلیا اور باقی فقیروں اور محتاجوں کو بانٹ دیا۔ بعدازاں اپنے دوست سلمان سے رخصت ہوکر بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا کہتا ہوا جہاز پر سوار ہوگیا۔ جہازرانوں نے مع الخیر جزیرۂ مذکور کے کنارہ پر اُتار کر اپنی راہ لی۔

یہاں آتے ہی خداوند ذوالجلال کی طاعت اور اُسکے ناموں اور صفتوں پر غور کرنے میں مشغول ہوگیا۔ نہ کوئی خلل انداز تھا نہ توجہ ہٹانے والا۔ بھوک لگتی تھی تو پھل یا شکار کا گوشت بقدرِ ضرورت کھا لیتا تھا اور پھر یادِ الٰہی میں مصروف ہوجاتا تھا کچھ عرصہ تک اسیطرح عبادت اور مناجات میں نہایت راحت اور اطمینان سے بسر کرتا تھا۔ ہر روز پروردگار کی عنایتوں اور بخششوں کا نیا تجربہ ہوتا تھا یہانتک کہ وہ کل چیزیں جن کی اُسے حاجت تھی اور زندگی کے لیئے ضروری تھیں آسانی سے دستیاب ہوگئیں۔ یہ روزانہ نوازشیں دیکھکر اُسکا ایمان اور توکل اور بھی قوی ہوگیا حیّ کی اِس زمانہ میں یہ حالت تھی کہ سراپا اپنی بلند فکروں میں ڈوبا ہوا تھا

کے گنبد میں رہتا تھا اور بہت ہی کم غار سے باہر نکلتا تھا۔ یعنی ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ غذا کی تلاش میں باہر آتا تھا۔ اور جو کچھ بلا وقت ہاتھ کے وا نو ملتا لیکر پھر فوراً غار میں داخل ہوجاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک اَصل کی اور اُسکی مڈبھیڑ نہ ہوئی تھی۔ اَصل نے تمام جزیرے کو چھان ڈالا تھا۔ اور کناروں پر بھی گشت لگا چکا تھا۔ مگر نہ کوئی انسان اُسے کہیں ملا تھا نہ انسان کا نقش پا نظر آیا تھا جس سے وہ اپنے دلمیں بہت ہی خوش تھا کہ یہاں میری تنہائی و تجرد میں خلل ڈالنے والا کوئی نہیں ہے*

اَصل اور حی کا دوچار ہونا

آخر ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ اَصل سیر گشت لگاتا ہوا حی کے غار کے پاس پہنچا ہی تھا کہ وہ بھی برآمد ہوا اور ایک کی دوسرے پر نظر پڑی۔ اَصل کو تو فوراً یقین ہو گیا کہ یہ بھی میری طرح کوئی خلوت پسند عابد ہے جس نے تنہائی کے خیال سے اس جزیرہ کی سکونت اختیار کی ہے۔ دلمیں سوچنے لگا کہ اسکے پاس جاؤں یا نہ جاؤں کہیں ایسا نہو میری وجہ سے اسکے ذکر و فکر میں حرج واقع ہو*

رہا حی ابن یقظان وہ بالکل سمجھ ہی نہ سکا کہ میں یہ کیا چیز دیکھ رہا ہوں کیونکہ اب تک جتنے جانور اُس نے دیکھے تھے اُن میں اور اِس میں کوئی مناسبت و مشابہت نہ معلوم ہوتی تھی۔ اَصل اسوقت صوف کی سیاہ عبا جسکو وہ نہایت معمولی لباس خیال کرتا تھا پہنے ہوئے تھا لیکن حی کو اِس سے ایسا تعجب ہوا کہ دیر تک حیرت میں غرق کھڑا دیکھا کیا۔ اَصل سمجھا یہ استغراق کیحالت میں ہے۔ ایسا نہو میرے سبب سے اسکی توجہ بٹے اور محویت میں فرق آئے۔ یہ خیال کرکے وہ مڑا اور بھاگا۔ حی کی طبیعت میں جو تحقیق کا قدرتی شوق تھا اُس نے ایسا مجبور کیا کہ یہ بھی ہمزاد کی طرح اُس کے پیچھے ہولیا مگر جب دیکھا کہ وہ نہایت قوت اور تیزی کے ساتھ بھاگا ہی چلا جاتا ہے تو تعاقب چھوڑ کر اور مغالطہ دینے کی غرض سے تھوڑی دور پیچھے ہٹ کر ایک جگہ

چھپ کر بیٹھ رہا۔ یہ دیکھکر اصل کی ذرا جان میں جان آئی اور حواس بجا ہوئے۔ کیونکہ
جب سے حی کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا وہ درحقیقت جان کے خوف سے بھاگ رہا
تھا۔ خیال ہوا کہ دشمن نے نومید ہو کر میرا پیچھا چھوڑ دیا۔ اور اپنے مسکن کو واپس گیا
اسلیئے اطمینان کے ساتھ اپنی عادت کیموافق دعا اور مناجات میں مشغول ہوا۔ اور
ایسا محو ہوا کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی ۔

حی کا اصل کو پکڑنا

اس اثنا میں حی اسکی نظر سے اوجھل آہستہ آہستہ دبے پاؤں قریب آتا گیا اور
آخر اتنا نزدیک آگیا کہ دعا و مناجات کی آواز کان میں آنے لگی۔ یہ آواز نہایت دلکش
معلوم ہوئی کیونکہ اول تو کسی جاندار کی ایسی آواز اب تک گوش زد ہی نہ ہوئی تھی۔
دوسرے چونکہ الگ الگ اور متمیز لفظوں سے مرکب تھی اُسکا اُتار چڑھاؤ اور وقفے اور
بھی دل کھینچے لیتے تھے۔ چھپے ہی چھپے عبادت کرنیوالے کے چہرے اور خط و خال کو
غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ جسکی تلاش میں تمام جزیرہ کی خاک چھان چکا ہوں وہی
گوہر مراد یعنی ہم صورت ہے۔ اب تو اطمینان ہو گیا کہ جو سیاہ چیز وہ پہنے ہوئے ہے
قدرتی کھال نہیں ہے بلکہ میری اپنی پوشش کیطرح مصنوعی لباس ہے۔ وہ جس
خوبصورتی اور شائستگی سے معبود کے سامنے عجز و زاری میں محو تھا اسپر جب نظر کی
تو یقین ہو گیا کہ یہ بھی ضرور اُنہیں نفوس میں سے ہے جن کو موجود حقیقی کا علم حاصل
ہو چکا ہے ۔

اس خیال کا آنا تھا کہ ملاقات۔ اور دریافت حالات کے شوق نے بیحد بیتاب
کر دیا اور ارادہ مصمم ہو گیا کہ ہر چہ بادا باد ظاہر ہو کر اور قریب چل کر دریافت کرنا چاہیے
کہ یہ کیا حالت ہے اور اس خاکساری اور گریہ و زاری کا کیا باعث ہے۔ مگر جونہیں اصل کی
اس عجیب الخلقت پر نظر پڑی کہ یہ نماز کیسی دعا کہاں کی۔ سب چھوڑ چھاڑ پھر فرار ہوا

لیکن حی ابن یقظان نے جسکو خدا نے علم اور جسم دونوں کی قوت عطا فرمائی تھی اب کے مرتبہ اپنی پوری طاقت سے پیچھا کیا، تھوڑی ہی دور چلکر جا لیا اور ایسا مضبوط پکڑا کہ اُسنے ہرچند کوشش کی مگر کسیطرح اس حبس بیجا سے گلوخلاصی میسر نہ ہوئی ؀

ایک دوسرے کو تھپکنا اور دلاسا دینا

جب اصل نے قریب سے دیکھا کہ حریف جانوروں کی کھالیں مع بالوں کے پہنے ہوئے ہے اور اپنے جسم کے بال بھی اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ نصف جسم کو ڈھانک لیا ہے طاقت و زوردستی اور چالاکی کا وہ عالم ہے جو ابھی مشاہدہ ہوا تو ڈر کے بارے دم فنا ہونے لگا۔ اور چاپلوسی سے میٹھی میٹھی باتیں بنا کر اور پچکار کر اُسکو خوش کرنا چاہا۔ مگر حی ایک لفظ بلکہ ایک حرف بھی نہ سمجھا۔ صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ میرے قیدی پر خوف بہت چھایا ہوا ہے۔ اس لیئے جو جو بولیاں جانوروں سے سیکھی تھیں اُن کے ذریعہ سے تسلی دینے لگا۔ نہایت نرمی سے اُسکے سر اور گردن پر ہاتھ پھیرا اور جہاں تک ممکن تھا مہربانی اور خوشنودی کا اظہار کیا۔ یہانتک کہ اصل کا خوف ذرا کم ہوا اور سمجھا کہ اس کا ارادہ مجھے ضرر پہنچانے کا نہیں ہے

گفتگو کی کوشش

اصل کو چونکہ علم کا بیحد شوق تھا۔ لہذا وہ بہت سی زبانوں میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اسوقت اُسکو فخر کے ساتھ اپنے علم کی قدر ہوئی۔ کیونکہ خیال ہوا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی زبان تو میرا وحشی آشنا جانتا ہوگا۔ چنانچہ ہر زبان میں جس سے خود واقف تھا حی سے اُسکی حالت کی نسبت سوال کرنے شروع کیئے اور اُسکے مشاغل اور بود و باش کے طریقے دریافت کرنے چاہے۔ ہاتھ، سر اور آنکھ وغیرہ کے اشاروں سے بھی حتی الوسع مطلب سمجھانے کی کوشش کی مگر اُسکی

یہ حالت تھی کہ ٹکر ٹکر دیدم دم نکشیدم تصویر حیرت بنا کھڑا تھا اور ہر چند ذہن رسا پر زور ڈالتا تھا لیکن خاک سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان آوازوں اور حرکتوں کا کیا مطلب ہے۔ صرف اتنا معلوم ہوتا تھا کہ سب دوستی اور خیر خواہی کی علامتیں ہیں غرض بہت دیر تک دونوں اسطرح حیرت میں ڈوبے ایک دوسرے کا منہ تکا کیے **شعر**

من از تمکین تو از حیرت نہ ایمائے نہ تقریرے بداں ماند کہ ہم بزم ہست تصویرے بہ تصویرے

صلاے خاص

ابسل جو زاد راہ اپنے جزیرہ سے ہمراہ لایا تھا۔ اسمیں سے تھوڑا سا اب بھی بچا ہوا اُسکے پاس موجود تھا۔ دوستانہ بڑھانے کی غرض سے حی کی تواضع کیا مگر وہ مطلق نہ سمجھا کہ یہ ہے کیا بلا۔ کیونکہ اُس نے کبھی کوئی ایسی چیز دیکھی ہی نہ تھی۔ یہ دیکھکر ابسل نے پہلے خود کھا کر بتایا اور پھر صلا کی۔ اب وہ مطلب تو سمجھ گیا مگر فوراً ان قاعدوں کا خیال آیا جو کھانے کے متعلق اُسنے اپنے اوپر لازمی کر رکھے تھے۔ اور دلمیں سوچنے لگا کہ جو چیزیں میرے سامنے پیش کیگئی ہیں خدا جانے کس قسم کی ہیں۔ ان کا کھانا میرے قواعد مقررہ کے مطابق جائز ہے یا ناجائز۔ اسلئے اُس نے اب بھی کھانے میں تامل کیا مگر ابسل کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔

کھانا اور پچھتانا

ادھر حی کو خود اُس سے تعارف کا بڑا اشتیاق تھا اور اصرار پر انکار اور انکار پر اصرار کرنے میں خوف تھا کہ مبادا ان وقتوں کے بعد جو الفت و انس پیدا ہوا ہے کہیں دفعۃً غتربود نہ ہو جائے۔ اسلئے آخر میزبان کے پاس خاطر سے کھانا گوارا کیا۔ مگر ایک لقمہ ہی لیا تھا کہ غذا غیر ملائم معلوم ہوئی تو کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور دل میں کہنے لگا کہ جس بات کا اندیشہ تھا آخر وہی پیش آئی۔ میں نے تو محض ایک اجنبی کی دوستی کی خیال سے اپنے دل سے کھانیکے متعلق جو عہد و پیمان کر رکھے تھے انکو

توڑ ڈالا۔ اپنی اِس حرکت سے اُسکو ایسی ندامت ہوئی کہ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ
اصل سے جو اس عہد شکنی کا باعث تھا بغیر نوٹس دیئے کوسوں بھاگ جائے اور
کبھی صورت نہ دیکھے اور مجاہدہ اور مراقبہ کے ذریعہ سے اپنی گزشتہ حالت پر آجائے

تعلیم

مگر جب دیکھا کہ خواہش کے ساتھ ہی جیسا معمول ہوگیا تھا روحانی عالم کی سیر میسر
نہوئی تو خیال ہوا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا اب تو تھوڑے عرصہ تک اُسکے ساتھ عالم
اجسام ہی میں رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ اُسکے حالات دریافت کرنے کا
جو شوق ہے پورا ہو جائے۔ تو اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ حالت سابقہ کیطرف
رجوع کروں۔ اُدھر اصل نے جب دیکھا کہ میرا وحشی دوست بالکل بول ہی نہیں سکتا
تو اُسکو بھی اطمینان ہوگیا کہ اِسکی صحبت سے میرے مذہبی خیالات پر کوئی بُرا اثر
نہیں پڑ سکتا۔ علاوہ ازیں اُسکو یہ بھی خیال ہوا کہ شاید میں کسیوقت زبان، علم اور
مذہب سکھا کر اِس حیوان مطلق کو حیوان ناطق بنا سکوں جو یقیناً بڑے ثواب کا
کام اور درگاہ الٰہی میں تقرب کا باعث ہوگا +

بہت غور و فکر کے بعد اُس نے طریقہ تعلیم وہی اختیار کیا جو آجکل بھی
ابتدائی مدارس میں بچوں کی تعلیم کے لیئے نہایت مناسب خیال کیا جاتا ہے
یعنی کوئی چیز لیکر اُسکو دکھاتا اور خود اُسکا نام لیتا۔ اور وہاں تک تکرار کرتا کہ شاگرد
سے اُس کا تلفظ کرا لیتا۔ شاگرد کو چونکہ غیر معمولی ذہانت عطا ہوئی تھی اور عقل کے
آئینہ کو پہلے ہی صیقل ہو چکی تھی وہ بہت جلد اِن آوازوں کی مثل دوسری آوازوں
کے نقل کرنے لگا۔ جو سبق پڑھا دیا جاتا تھا۔ پتھر کی لکیر ہو جاتا تھا۔ تھوڑے
ہی عرصہ میں تمام نام سیکھ گیا۔ اور خاصی گفتگو کرنے لگا +

---

۵ اس طریق تعلیم کا خیال بھی مصنف کو شاید بعض اور خیالات کے حضرت آدم کے قصہ سے ہوا ہے۔ جب فرشتوں کو
معلوم ہوا کہ خدا آدم کو اپنا خلیفہ بناکر زمین پر بھیجنے والا ہے تو انہوں نے کہا کہ خدایا کیا تو ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنانے گا

حی کا اپنے عجیب حالات سے اصل کو آگاہ کرنا

اب اصل نے پھر اُس کی حالت کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ تم یہاں کس طرح اور کہاں سے آئے تو اُس نے جواب دیا کہ اپنی اصل اور ماں باپ کے حالات سے تو میں بالکل واقف نہیں نہ یہ معلوم کہ میری پیدایش اسی جزیرہ میں ہوئی یا اور کہیں سے آیا ہوں۔ ہوش سنبھالا تو یہ دیکھا کہ اسی جزیرہ میں ایک ہرنی میری پرورش کرتی ہے +

اسکے بعد اپنی مفصل حالت، بود و باش کا طریقہ شروع سے آخر تک اور علمی ترقی کا حال مع روحانی عالم کی دلچسپ داستان کے بیان کیا۔ ضمن میں حقیقت کے سیکڑوں بھید ظاہر کر دیا ان نفوس کا ذکر کیا جو عالم اجسام سے بالکل آزاد ہیں اور جن کو موجود حقیقی کی معرفت حاصل ہو چکی ہے۔ قادر ذوالجلال کی ذات و صفات کی مخاطب کی سمجھ کے مطابق تھوڑی سی تشریح کی۔ اور جہاں تک ممکن ہوا واصلین کے سکھ اور مہجورین کے دکھ کی مفصل کیفیت جو دیکھی تھی بیان کی +

اصل اس تمام داستان کو نہایت استعجاب سے سنتا رہا۔ اور جب شاگرد رشید بلکہ اُستاد کامل نے اپنا قصہ ختم کیا تو اُسکو ذرا بھی شبہہ باقی نہ رہا کہ مذہب میں خدا کے حکموں، اُسکے فرشتوں، آسمانی کتابوں، پیغمبروں، روز قیامت جنت و دوزخ کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب حی ابن یقظان کے سچے خواب کی تعبیر ہے۔ یہ دیکھکر کہ جو کچھ حی نے عقل یا روح کے ذریعہ سے دریافت کیا ہے اور جو کچھ مجھے بذریعہ مذہب پہنچا ہے اصل و نقل دونوں آپس میں بالکل مطابق ہیں۔ دل کی آنکھیں کھل گئیں اور دماغ نورانی ہو گیا۔ صوفیانہ تاویلیں اب بالکل سیدھی سادی معلوم ہونے لگیں۔ اور مذہب کے تمام حکموں اور ہدایتوں میں ذرا بھی اُلجھاؤ اور گھمپن باقی نہ رہا +

غرض کہ حی کا فسانہ سُنکر اُسکے ایمان کو نہایت قوت اور دلکو پورا اطمینان ہوگیا شاگرد مجازی اور اُستاد حقیقی سے صرف محبت ہی نہین پیدا ہوئی بلکہ بیحد اُسکی تعظیم وتکریم کرنے لگا اور یقین ہوگیا کہ یہ اُنہیں لوگوں میں سے ہے جنکی نسبت ارشاد ہوا ہے (الآ اِنّ اَولیاءَ اللہ لاخوفٌ علیہم ولاہم یحزنون) (خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہوتا ہے نہ وہ رنجیدہ ہوتے ہیں) لہذا مصمم ارادہ کرلیا کہ اُسکی خدمت میں رہے اور کل مذہبی باتوں میں اُسکی ہدایت کے موافق عمل کرے ؛

(باقی آیندہ) فداعلیخاں۔ ایم اے

زندگی کی آب وتاب خصائل کی عمدگی وصلاحیت سے ہی۔ دنیا کی عام نگاہ میں عہدہ وعزت۔ سرتاجی وسربلندی ضرور ایک حد تک قابل فخر ہے۔ لیکن بغیر خصائل کی خوبی کے یہ سب دو کوڑی کی چیزیں ہیں خصائل انسانی فطرت کا نام ہے یہ ایک اخلاقی قانون ہے جو براہ راست افراد پر جاری ہے خصلت کے باصول ومضبوط صرف سوسائٹی کے ارکین نہیں ہیں بلکہ اُس سوسائٹی کی قوت روحانی کے محرک ہیں۔ اور یہی روحانی قوتیں ہیں جو دنیا کو مسخر ومطیع کرکے فرمانروائی وحکمرانی کرتی ہیں۔ نپولین کہا کرتا تھا کہ روحانی قوت بمقابلہ جسمانی قوت کے ہر شخص میں دس میں سو حصے موجود ہے۔ ملک کی قوت افراد کی محنت وتہذیب کے خصائل پر مبنی ہے قانون رسم ورواج سب اسکی فروعات ہیں۔ فطرت کی انصافانہ ترازو میں افراد قوم ٹھیک اُسیقدر حصہ دار ہونگے جتنے کہ وہ مستحق ہیں۔ اگر کسی شخص میں ذاتی قابلیتوں یا علم ودولت کیطرف سے بے نصیبی ہے اور اُسکے خصائل وزنی اور بھاری بھرکم ہیں تو وہ ہمیشہ باثر ہونا چاہیے۔ وہ دکاندار ہو یا مزدور۔ کاریگر ہو یا میر مجلس ؛

مترجمہ شفیع الدین خاں

اُصولِ صوت

امریکہ کا نام نئی دنیا بھی خوب کسی نے چھانٹ کے رکھا ہے وہ وہ چیزیں ایجاد ہوتی ہیں کہ یہاں تو کسیکے خواب وخیال میں بھی نہیں آتیں۔ دانایانِ فرنگ قائل ہوئے ہیں تو امریکہ کے۔ ایجاد کا فخر امریکہ ہی کو ہے۔ اگرچہ ہماری ولایت والے کچھ اُسمیں پھول پتے لگاکے نقل کو اصل سے بڑھا دیتے ہیں یا یہ کہ جرمنی والے اصل میں سے بھی کاٹ چھانٹ کرکے کوڑیوں کے مول کر دیتے ہیں۔ پچیس تیس برس کا عرصہ ہوا فونوگراف کے نام سے ایک باجا نکلا تھا۔ پہلے پہلے ہزار بارہ سو کو بکا۔ پھر چار پانسو ہوگئے۔ اور ڈھائی تین سو کو اب تک آتا تھا چار پانچ برس ہوئے۔ اُسی اُصول پر دوسرا باجا گراموفون نکلا۔ اُسکے بعد زکلوفون اور اب تو بیسیوں فون ہیں قیمت بھی ہزار بارہ سو سے دس بارہ پر آرہی واقع میں عجب چیز ہے۔ گانا بجانا لکچر اسپیچ ہنسی مذاق سبھی کچھ تو اُترا ہوا ہے سچ پوچھو تو فقط جان ڈالنی باقی رہ گئی ہ۔

لوگوں کا خیال تھا کہ گانے بجانے والوں کی روزی قطعی ماریگئی۔ مگر ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جس کام کی مشین نکلتی ہے وہ اور گراں ہوجاتا ہے۔ پہلے اکہری اچکن ایک روپیہ میں خاصی اچھی سِل جاتی تھی۔ جب سے گھر گھر مشینیں ہوگئی ہیں دو روپیہ سے کم کوئی درزی بات نہیں کرتا۔ یہی کیفیت اِس مشین کی بھی ہے بازاری عورتیں مس ہوگئیں ڈوم ڈھاڑیوں کو پروفیسر کا خطاب ملگیا۔ غرض یہ کہ جن کا نام اپنے شہر والے بھی کم جانتے تھے۔ اِن باجوں کی بدولت دور دور مشہور ہوگئے۔ اُدھر باجوں کی بھی وہ لذانی ہوئی ہے کہ جس گھر میں ایک میز دو کرسیاں ہیں یہ تو تھا یہ بھی ضرور ہوگا۔ بڑے اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم پر

کہیں گتوں کے ٹکڑے پھوے کیساتھ جکڑے ہوئے کہیں بیگناہ صراحیوں کے گلے کھچیوں میں بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں اسٹیل ٹرنک تو ناریں بھی ضرور رکھا ہوتا ہے۔ حد ہے کہ بقایائے مالگزاری کی قرقی میں بھی تحصیل کے دروازے پر ایک آدھ باجا نظر آجاتا ہے۔ افسوس یہ ہوتا ہے کہ ایک وہ ملک ہے جہاں ایسی چیزیں ایجاد ہوتی ہیں۔ دوسرا وہ جہاں ایجاد پر ترقی ہوتی ہے تیسرا وہ ملک جہاں سے ارزانی ہوتی ہے۔ چوتھا ہمارا ہندوستان جنت نشان جہاں کے لوگ باوجود کثرت استعمال کے یہ بھی نہیں جانتے کہ آخر میں ہے کیا بلا جس سے طرح طرح کی آوازیں نکلتی ہیں۔ یہاں تو یہ جانتے ہیں کہ کچھ اپنے پاس سے ملا یا کچھ قرض لیا بازار سے ایک باجا مول لے آئے۔ اور گھر میں آتے ہی کھسنا جو شروع کیا تو نہ رات کی خبر نہ دن کی آٹھ دس روز میں محلے والوں تک کا جی بیزار کردیا۔ کچھ روز زبردستی پکڑ پکڑ کے لوگوں کو سنایا۔ اسکے بعد کہیں کونے میں ڈالدیا تو خاک کے اٹم لگ گئے۔ یہ تو کھاتے پیتوں کی بات تھی۔ جن بیچاروں کو اتنی توفیق نہیں وہ دوسروں کے باجوں پر اسطرح گرتے ہیں جیسے مٹھاس پر مکھی بس نہیں کہ بونگل کے اندر گھس جائیں۔ لاکھ سمجھاؤ کہ اسکی آواز دور سے اور اچھی معلوم ہوتی ہے مگر وہ سر ہی پہ سوار رہیں گے۔ دو چار دفعہ کے کہنے سے اگر کچھ اثر بھی ہوا تو یہ کہ خفا ہو کے گھر کی سیدھ باندھی آئندہ شادی غمی میں بھی شریک ہونے کا ارادہ نہیں۔

ایسے جلسوں میں ایک آدھ لال بجھکڑ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ان حضرت کا کام یہ ہے کہ جب تک کسی نامی گوئیے کا رکارڈ بجتا رہے۔ یہ اُسکے راگ راگنی کی باریکیاں بیان کریں۔ اور کہیں کہیں کچھ نقص بھی بتاتے جائیں۔ جب رکارڈ ختم ہوا اور گویا اپنا نام بتائے تو یہ اُسکے حسب و نسب شکل و شمائل سن و سال کا اضافہ کریں اور کچھ واقعات

چشم دید بھی بیان کریں۔ خاتمے پر دو چار آدمی اپنے ڈھب کے ملگئے تو باجے کے کل پرزوں
اور اصول کا بیان بھی ضرور ہے۔ باتیں اللہ کے فضل سے سب ایسی ہونگی جیسے
دادا لال بجھکڑ نے ہاتھی کے پاؤں کا نشان دیکھکر فرمایا تھا ع پاؤں میں چاکی باندھ
کے ہرنا نہ کودا ہوئے۔ مجکو جو کسی زمانے کا کچھ پڑھا پڑھایا یاد ہے وہ لکھتا ہوں
اگر اس وقت بھی سائنس کے کانٹے میں پورا اُتر گیا تو سبحان اللہ ورنہ سوا لال بجھکڑوں
کا ایک لال بجھکڑ میں بھی سہی +

حکمائے یونان نے خاک باد آب آتش کو جو عنصر مانا ہے اُس کے یہ معنی نہیں
کہ یہ چاروں چیزیں مفرد و ناقابل تجزیہ ہیں بلکہ یہ مراد ہے کہ ہر شئے کا وجود ان ہی
چار چیزوں پر منحصر ہے۔ چنانچہ آواز کی علت ہوا کو قرار دیا ہے۔ طبیعیات جدید
کا بھی اسپر اتفاق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دو چیزوں کے آپسمیں لڑنے یا رگڑنے سے
آواز پیدا ہوتی ہے۔ خواہ ایک ہی جنس کی ہوں یا مختلف۔ تالی بجانے سے بھی آواز
پیدا ہوتی ہے۔ پانی میں پتھر پھینکنے سے بھی۔ خالی چابک پھرانے سے بھی آواز نکلتی
ہے گو بظاہر کسیکے لگتا نہیں۔ ہم اپنی بول چال میں خالی کہتے ہیں لیکن دراصل خالی
کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ جہاں کچھ نہیں ہوتا وہاں ہوا ہوتی ہے۔ بہتیری زبانوں میں
تو خالی پھرانے کو ہوا میں پھرانا کہتے ہیں۔ اس اُصول کو سائنس کے طریقے پر اس طرح
کہا جاتا ہے کہ چیزوں کے آپسمیں ملنے اور چھوٹنے سے ان کے اجزا میں حرکت
پیدا ہوتی ہے۔ اُس حرکت سے ہوا کے وہ اجزا جنبش کرتے ہیں جو اُن اشیاء
سے متصل ہیں یہ جنبش بتدریج کان کے پردے پر اثر کرتی ہے تو آواز معلوم
ہوتی ہے۔ جن چیزوں میں لچک اور لرز زیادہ ہوتی ہے اُتنے آواز بھی زیادہ نکلتی
ہے جیسے ستارہ کا تار۔ طبلے کی تال۔ گھڑیال وغیرہ۔ سبب یہ ہے کہ لرز سے ہوا
کے اجزا کو متواتر حرکت ہوتی ہے اور دیر تک قائم رہتی ہے۔ چیزیں متفرق

مادے اور مختلف ساخت کی ہوا کرتی ہیں۔ اس سبب سے اُنکے اتصال و انفصال
سے ہوا کو مختلف قسم کی حرکت ہوتی ہے اور طرح طرح کی آوازیں پیدا ہوتی ہیں
بات کرنے میں زبان[ل] کبھی دانتوں سے ملتی ہے کبھی تالو سے کبھی آگے بڑھتی
ہے کبھی پیچھے ہٹتی ہے ہونٹ کبھی بند ہوتے ہیں۔ کبھی کھلتے ہیں۔ گلے کی حرکت
بھی طرح طرح کی ہوتی ہے۔ ان مختلف ذریعوں سے انواع و اقسام کی آوازیں اور
حروف پیدا ہوتے ہیں۔ قدرت کے کاموں میں غلطی اور اتفاق کو دخل نہیں
ایک خاص قسم کی حرکت سے جو آواز ایک دفعہ نکلتی ہے وہی ہر دفعہ اور ایک خاص
آواز جس حرکت ہوائی سے ایک دفعہ پیدا ہوتی ہے وہ جب پیدا ہوگی اُسی قسم کی
حرکت سے خواہ وہ حرکت کسی ذریعہ سے ہو +

اچھا اب کچھ حال ان باجوں کے پرزوں کا بیان ہونا چاہیئے تاکہ اُنکا اصول
سمجھ میں آجائے اور ہوا کا فعل بھی عملاً ثابت ہوجائے ھارن سب سے بیڈول
یہی چیز ہے۔ سفر میں بھی دقت۔ گھر پر بھی رکھنے ڈھکنے کی مصیبت۔ آواز سے صرف
اتنا تعلق ہے کہ ہوا کی حرکت منتشر ہو کے کمزور نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ پھیلے ہوئے
منہ کی طرف سے داخل ہو کے تنگ سرے کی طرف جانے میں سمٹ کر زیادہ تیز اور
قوی ہوجاتی ہے جیسے بندوق کی گولی اور پچکاری کا پانی۔ جن لوگوں کو ثقل سماعت
کا عارضہ ہوتا ہے وہ اکثر اسی شکل کا آلہ استعمال کرتے ہیں۔ ثقل سمع یعنی اونچا
سننے کا سبب بیشتر یہ ہوتا ہے کہ کان کا پردہ موٹا اور سخت ہوجاتا ہے۔ ہوا کی خفیف
حرکت سے متحرک نہیں ہوتا) پتلی طرف سے منہ کی طرف آنے میں آواز رفتہ رفتہ
پھیلتی ہے اور اپنی گونج سے مل ملا کے بھاری اور اونچی ہوجاتی ہے۔ بند ھکے

[ل] گونگوں کی زبان اوّل تو ہوتی ہی نہیں اور ہوتی بھی ہے تو اتنی چھوٹی کہ نہ دانتوں تک پہنچ سکے نہ تالو
تک نہ ہوا کو حرکت دے سکے۔ حرف کیونکر پیدا ہوں +

جو نکلتی ہے تو جاتی بھی دور تک ہی جس طرح زور کا دریا سمندر میں ملتا ہی تو کوسوں تک سمندر کے اندر بہتا چلا جاتا ہے۔ یہی اصول فوجی بگل۔ ترئی۔ شہنائی وغیرہ کا ہے؛

سوئنڈ بکس۔ اب تو کچھ بچوں کا بھی مذاق بدل گیا۔ تیر کمان۔ ٹیٹری مینڈک کے بدلے شروع ہی سے کرکٹ فٹ بال کی نقل ہونے لگتی ہے ٹوٹے پھوٹے میلوں میں کہیں پرانی وضع کے کھلونے نظر آجاتے ہیں۔ ان میں ایک چیز ہوتی ہے جسکو مینڈک یا کوا بھی کہتے ہیں۔ اسکی ترکیب یہ ہو کہ مٹی کی سکوری ذرا گہری سی بنائی اور جھلی یا کاغذ ہی سے منڈھ لیا۔ دو چار بال گھوڑے کی دم کے بالشت سوا بالشت لمبے لیکر ایک سرے میں پھندا سا بنایا اور بانس کی تیلی یا سرے میں پھنسا دیا دوسرے سرے میں چھوٹا سا تنکا باندھ کے جھلی میں مہین سا چھید کرکے اندر اُتار دیا۔ پھر وہ تنکا آڑا ہوکے باہر نہیں نکل سکتا۔ تیلی کو پھرانے سے منڈھی ہوئی سکوری بالوں کے ذریعہ اُسکے گرد پھرتی ہے۔ اور مینڈک کی سی آواز نکلتی ہے اس سبب سے کہ تیلی کی رگڑ سے بالوں میں لرز پیدا ہوتی ہے بالوں سے جھلی میں جھلی میں لچک اور لرز زیادہ ہے۔ اسوجہ سے ہوا کو جنبش زیادہ ہوتی ہے۔ اور وہی رگڑ کی آواز موٹی اور بڑی ہوکے مینڈک کی سی ہوجاتی ہے۔ یہی کرامت سوئنڈ بکس میں ہے۔ سکوری کی جگہ لوہے کی ڈبیا۔ جھلی کے بدلے پتلا ورق سا شیشہ بالوں کے عوض فولادی کمانی جسکا ایک سرا شیشہ میں لگا ہوتا ہے اور دوسرا سرا اُس سوراخ تک ہوتا ہے جس میں سوئی لگائی جاتی ہے۔ سوئی لگاکے کس دی جاتی ہے تو کمانی اور سوئی ایک ہوجاتی ہے۔ سوئی رکارڈ پر ٹکی ہوتی ہے اور رکارڈ کے چکر کھانیسے رگڑ پیدا ہوتی ہے؛

ٹیوب۔ سوئنڈ بکس اور ہارن کے بیچ میں ایک نلی آواز کی آمدورفت کیواسطے

ہوتی ہے۔ اسکی ضرورت یہ ہے کہ سوئونڈ بکس آزاد رہے۔ اور آسانی سے حرکت کر سکے ؛

مشینری۔ بکس کے اندر ایک یا دو گھنٹے کے سے فنر ہوتے ہیں۔ تین چار پہیے دو ایک اور پرزے۔ بس۔ ان سب سے غرض فقط اتنی ہوتی ہے کہ رکارڈ رکھنے کی پلیٹ برابر رفتار سے پھرتی رہے ؛

رکارڈ۔ ہارن کے پھیلے ہوئے مُنہ کے پاس جو آواز ہوتی ہے خواہ گانے کی ہو یا پڑھنے کی۔ ہنسنے کی ہو یا بولنے کی وہ پتلے سرے کی طرف سے تیز اور قوی ہو کر نلی کے رستے سے سوئونڈ بکس میں پہنچتی ہے۔ اُس سے شیشے کو لرزش پیدا ہوتی ہے۔ شیشے کی لرزے فولادی کمانی اور سوئی لرزتی ہے۔ اگر سوئی کی نوک صابن یا موم جیسی نرم چیز پر ٹکادی جائے تو ضرور ہے کہ سوئی کی لرزے کچھ باریک باریک نشان اُس چیز پر پڑ جائیں۔ چونکہ ہر آواز اور ہر حرف سے ایک شکل کی حرکت ہوا میں پیدا ہوتی ہے۔ لہذا سوئی کی حرکت اور نشان کی صورت بھی مختلف ہو گی۔ اب اگر نشان قبول کرنے والی شے ساکن ہے تو نشان کے اوپر نشان بنتے چلے جائینگے۔ لیکن اگر ٹائپ رائیٹر کے کاغذ کیطرح نشان قبول کرنیوالی شے سرکتی جاتی ہے تو نشانات علیحدہ علیحدہ اور مسلسل ہوں گے۔ یہی اصول رکارڈ بھرنے کا ہے یعنی گانے والا شخص ہارن کے مُنہ کے پاس بیٹھ کے گاتا ہے اُسکی آواز سے سوئی کو حرکت ہوتی ہے۔ سوئی کی نوک سادے رکارڈ پر رکھ دیجاتی ہے جو اُس وقت بہت نرم ہوتا ہے۔ رکارڈ چکر کھاتا ہے۔ اور مہین مہین نشان سوئی کی نوک سے بنتے جاتے ہیں۔ بعد میں مصالحوں سے رکارڈ اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ سوئی کے نشان چاقو سے بھی نہیں مٹ سکتے ؛

یہ اصول رکارڈ بھرنے کا ہوا۔ بجنے کا اصول بھی یہی ہے۔ لیکن عمل معکوس ہے

یعنی سوئی اُن ہی نشانوں میں سے گزرتی ہے جو بھرتے وقت بنے تھے پس
ضرور ہے کہ سوئی کو بجنسہ وہی حرکت ہو جو پہلے آواز کے ذریعہ سے ہوئی تھی
تیز فولادی کمانی اور شیشے میں بھی ویسے ہی لرزہ پیدا ہو۔ پس لازم ہے کہ وہی آواز
پیدا ہو جو بھری گئی تھی، وہی آواز۔ وہی لفظ وہی سب باتیں +

اشرف حسین

اُف ری جوانی ہائے زمانے

دل میں ہیں میرے تیری محبت اُف ری جوانی ہائے زمانے
آنکھوں میں تیری پھرتی ہے صورت اُف ری جوانی ہائے زمانے

تیرا وہ غمزہ فتنۂ محشر تیرا وہ عشوہ نشتر و خنجر
تیری وہ شوخی اور شرارت اُف ری جوانی ہائے زمانے

کیا ہی مزے کی وہ بھی تھیں راتیں کیا ہی مزے کی وہ بھی تھیں باتیں
عیش کہاں وہ اور وہ عشرت اُف ری جوانی ہائے زمانے

شیفتہ تم پر ہم بھی کبھی تھے ہم بھی شہید ناز تھے تیرے
رکھتے تھے ہم بھی تجھسے محبت اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہم کبھی تجھسے شاد رہے ہیں اب تو مزے وہ یاد رہے ہیں
تیری وہ اُلفت تیری وہ صحبت اُف ری جوانی ہائے زمانے

ناز تھا ہمکو حسن پہ اپنے نور پہ نخوت کرتے تھے ہم بھی
پیری وصد عیب اب ہے یہ صورت اُف ری جوانی ہائے زمانے

کون ہو مونس کسکو دکھائیں کون سنیگا کسکو سنائیں
اپنی یہ صورت اپنی یہ حالت اُف ری جوانی ہائے زمانے

موت ہے اب تو اپنے کمیں میں ہمکو لئے جاتی ہے زمیں میں
تیری جدائی تیری یہ فرقت اُف ری جوانی ہائے زمانے

کیوں نہ تجھے ہم نعمت سمجھیں کیوں نہ تجھے ہم دولت جانیں
تیری ہے کیسی عزت و عظمت اُف ری جوانی ہائے زمانے

شیوہ ترا بس جور و جفا ہے حیف نہ تجھ میں رسم وفا ہے
تجھ میں نہیں افسوس مروت اُف ری جوانی ہائے زمانے

سعدی خستہ سعدی محزوں تیری ادا پر تھا کبھی مفتوں
اب تو ہوئی ہے اُس کی یہ حالت اُف ری جوانی ہائے زمانے

ابو البرکات محمد عبد الحی۔ سعدی

اگلے لوگ

اگلے وقتوں کے بچے کھچے بڈھے ٹھڈے جو صبح شام کی ہوا کھا رہے ہیں اُن کا ذکر نہیں۔ بحث تو اُن اچھی بھلی صحیح تندرست صورتوں سے ہے جو رفتارِ زمانہ کے پہیئے دونوں ہاتھوں سے دھکیل رہی ہیں! تھوڑا بہت کر لیا اور بہت کچھ کرنا ہے۔ منصف مزاج دوستو! آخر وہ موقع آ گیا جسکا مدت سے ارمان تھا اور وہ وقت آ پہنچا جسکے واسطے برسوں سے آنکھیں ترس رہی تھیں! آج وہ دن ہے کہ کوئی محلہ ہو یا ٹوٹا سا گھر۔ بڑا بھاری شہر ہو یا چھوٹا سا گاؤں۔ دیوار و در سے ترقی کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ گوشے گوشے اور چپے چپے غرض کونے کھدرے تک تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں! معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ملکہ مغرب کی سواری اپنے وطن سے روانہ ہو کر دریائی مسافت طے کر رہی ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ شرقی حدود میں داخلہ ہو! ذرا اس دُلہن کا اقبال تو دیکھو۔ مرد تو مرد عورتیں تک سارے جھگڑے بھول بھال اور گھر کے دھندے چھوڑ چھاڑ مہمان کے استقبال کی تیاریاں کر رہی ہیں! مزا یہ ہے کہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے اُدھر امیر اپنے گرد و نشست کو مختلف تصاویر سے مزین کر رہا ہے تو اِدھر فقیر اپنے کچے دھابے پر لال قندیل لپیٹ رہا ہے کہ کسی طرح حقِ مہمان نوازی ادا کروں! کچھ عجیب طلسم کا سا سماں ہے جدھر نظر جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی کینچلی بدلے فلاح و بہبودی کے گلدستے ہاتھوں میں لیئے موجودہ طرزِ معاشرت پر لعن طعن کرتا ترقی کی صدائیں لگا رہا ہے۔

کھڑے کھڑے پاؤں شل ہو گئے دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ سوچتے سوچتے دماغ چکرا گیا۔ مگر ابھی اُس سیمتن کا نظارہ نصیب نہیں ہوا جسکے انتظار میں بیسیوں راتیں سحر اور مہینوں دن بسر کیئے ہیں!

میدان ترقی کے بہادرو! تمھارا اشتیاق سر آنکھوں پر تمھاری سرگرمی چشم ما روشن دل ماشاد۔ مگر عقل سلیم اتفاق کلی میں متامل ہے۔ جس طرز معاشرت کو جہالت سے تعبیر کرتے ہو ذرا اُس پر غور کی نظر تو ڈالو! شاہجہاں آباد یعنی دلّی بستے کا وقت ہے یہ ہی چراغ سحری جو اب ایک آدھ جھونکے کے مہمان ہیں اپنی روشنی سے محلہ بھر کو منوّر کر رہے ہیں! چشم تامل سے دیکھنا! کیسی کیسی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں!

کچا پکا گارے مٹی کا گھر ہے مگر لپا پتا یا چندن سا! شرم و حیا کی گٹھریاں حسن و جمال کی دیبیاں جھاڑو بہارو سے فراغت پا پکا رندھا کھانے سے پہلے کھلانے بیٹھیں۔ باسی کوسی مٹی کُتی جو میسر ہے پڑوس کے اندھے دھندوں کو بھیجا کنبہ کے غریب محتاجوں کو دیا! بچا کھچا اچھا بُرا آپ کھایا۔ ذرا انصاف کی نظر سے دیکھنا انکے زیور عفت و عصمت میں ہمدردی کا جھومر کس آب و تاب سے چمک رہا ہے!

ان کو خاوندوں کے ساتھ برابری کا دعوےٰ نہیں۔ اپنی راحت اپنا عیش اپنا سکھ اپنا چین انکی خوشی پر قربان کر چکیں۔ طوق غلامی سمجھو یا اطاعت فرماں برداری کا چندن ہار انکے گلے میں کچھ ہے تو سہی! ان کے دروازوں پر گھنٹوں کھڑے رہو انکی ڈیوڑھیوں پر گھڑیوں کان لگا کر سنو مجال ان کی آوازیں کچی دیواروں سے باہر نہ آئے گی!

خدا معلوم ان جاہلوں کی طبیعت میں قدرت ہی نے کوئی مادہ ودیعت کیا ہے یا صحبت کا اثر اور تربیت کا فیض ہے! بہنیں بھائیوں پر پروانہ بھائی بہنوں پر جاں نثار! لڑکیاں اطاعت گزار لڑکے فرماں بردار! بڑوں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ تعظیم۔ شرم حیا تمیز انکی گھٹی میں ہے!

یہ سفید داڑھیاں۔ یہ متبرک صورتیں جو عنقریب صفحہ ہستی سے ناپید ہو جائینگی آج تمھارے راج میں بیوقوف سہی۔ جاہل سہی۔ لکیر کی فقیر سہی۔ مگر ان کی عمر کے

پچھلے ورق تو اُلٹ کر دیکھو! زمانہ کا رُخ بدلجائے۔ ہوا کے جھکڑ چلجائیں۔ ان کے
کارنامے مٹنے والے نہیں! ان پتھروں سے مروت اور محبت کے ایسے چشمے پھوٹے
کہ رستہ چلتے مسافر مگن ہوگئے۔ ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا مُنڈا ہوا سر
پھٹی جوتی کھدی ململ کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ ہاتھوں میں دونے بغلوں میں پوٹلیاں
سر پر گُڑ کی بھیلی۔ کندھوں پر ترکاری کی پوٹ لندے پھندے لُڑھکتے پڑھکتے
چلے آرہے ہیں! ان پر ہنسو۔ قہقہے لگاؤ ٹھٹھے اُڑاؤ مگر انکی کیفیت بھی تو سُن لو
مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی۔ پڑوس کی پردہ نشین رانڈیں جنکے ہاں گھر لگانے
کو مرد کا نام نہیں کبھی کی بیٹھی راہ تک رہی تھیں اُنکے گھروں پر گئے۔ پیسے لیے
سودے پوچھے اپنا کاروبار کے محنت مزدوری چھوڑ بازار گئے! یہ انہیں کھیاریوں کا
بوجھ ہے!

زمانہ کے نبض شناسو! عالم بنو فاضل بنو۔ لائق ہو فائق ہو کچھ ہی بن جاؤ
اور کچھ ہی ہوجاؤ مگر پچھوا اعصاف بتا رہی ہے کہ اب یہ انداز رخصت ہوئے۔ البتہ آنے
والی نسلیں سُن لیں گی کہ ہم اُن بزرگوں کی اولاد ہیں جن کے قدموں میں خلق و تہذیب
کے دریا لوٹتے تھے۔ زمانہ ان واقعات کو فسانہ بنادے گا۔ مگر یہ کہانیاں بہت روز
تک باقی رہیں گی۔

ذرا زمانہ جاہلیت کے بہن بھائی دیکھنا۔ محبت کی سرسبز و شاداب ٹہنی پر کیسے
خوشرنگ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہے تو رچہ گیری مگر جوش محبت کی پوری تصویر ہے
بھائی کے ہاں بچہ ہوا۔ پردیسن بہن یہ سُنکر پھولی نہیں سماتی بھتیجے کے لیے
ہنسلی کرنے بھاوج کے لیے جوڑا لیکر بھائی سے نیگ لینے آئی کس محبت سے
کہتی ہے۔

بیرن بھیا میں تیری واری جائی　　ہولر سُنکر بدھاوا لیکر آئی

چھاتی ڈھلائی کٹوری لُوں گی تو لٹ ڈھلائی روپیہ
پاؤں ڈھلائی چیری لوں گی تو شو کے چڑھن کو گھوڑا

بھائی کی خوشی میں شریک ہو کر نیگ لینے کے حقوق کیسے مزے سے جتا رہی ہے بھائی سے اتنا خطاب کر چکی تو اب بھاوج سے دو دو باتیں ہیں۔

یہ نہ سمجھیو بھاوج سوری نند ھینی نہیں آئی
تیرے للہ کو ہنسلی اور کڑوے تجکو جوڑا لائی

بھائی پر تو وہ کچھ زور تھا۔ مگر اس خیال سے کہ بھاوج کو بار خاطر نہوں یوں کہتی ہے حقیر نہ سمجھیو کہ تیرے دروازے پر لینے آئی۔ بڑوں کی مثل "بھائی مس لیجئے بھتیجا مس دیجئے" جو اپنا حق ہے وہ مانگ رہی ہوں جو مجھپر ہے وہ یہ موجود ہے۔

یہ تمام قصہ طے ہو جانیکے بعد آخری بات جو بہن کے منہ سے نکلتی ہے وہ ایک پیٹ میں پاؤں پھیلانے کا سچا اثر ایک گود میں دودھ پینے کا پورا جوش اور خالص محبت کا پکا ثبوت ہی جس دل سے یہ الفاظ نکلے ہیں اُسکی حالت قابل غور ہے کیسی سچی اور اچھی دعا ہے +

باگن میں جیسے آم پھلے رے ایسے پھلے میرا بھائی

الہ العالمین جسطرح باغوں میں مور آکر آم پھلتا ہے۔ اُسیطرح میرا بھائی پھلے پھولے بیٹے ہوں پوتے ہوں۔ اِسکے کھیڑے بسیں۔ اور میرے باپ دادا کا نام روشن ہو

ملکۂ مغرب کے مشتاقو! یہ جلسہ ختم ہوا اور صحبتیں رخصت ہوئیں جن چراغوں کی روشنی در و دیوار تک پھیلی تھی کبھی کے بجھ گئے صحبت شب کی شریک ایک آدھ شمع اِدھر اُدھر ٹمٹما رہی ہے جو نسیم کے دو ایک جھونکوں کی محتاج ہے! جن مقدس صورتوں کی برکت تھی وہ سب خاک میں ملگئیں ؛؛

عزیزو! دوستو! ایک وقت آئیگا اور ضرور آئیگا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھو گے

اور سر پر ہاتھ رکھکر رؤوگے اور یہ ریزۂ جواہر زیر زمیں ہوں گے ۔ ڈھونڈھوگے
مگر بے سود ۔ پرکھوگے لیکن بیوقت ؎

بہارِ مشرق کے باغبانو! گو آج سنسان جنگل میں پڑے آرام کر رہے ہو
مگر چمنستان حیات میں ایسے پھول لگا گئے کہ قیامت تک نہ مرجھائینگے ۔ بھانت
بھانت کے پکھیرو اور رنگ برنگ کی بلبلیں بیٹھکر چہکیں گی اور انکی مہکار شرق
سے غرب تک پھیلے گی! خزاں دنیا بھر کو تاراج اور مسمار کردے مگر تمھاری مبارک
ہاتھوں کی گلکاری صفحۂ ہستی سے مٹنوالی نہیں ؎

راشد الخیری ۔

تصویر تسلیم و احسان جو اس رسالہ کے ساتھ شائع ہوتی ہے ایک عجیب
اتفاق سے مل گئی ہے ۔ یہ دونوں بزرگ ہماری پرانی شاعری کے آخری دور کی نشانیوں
میں مغتنمات سے ہیں جیسا کہ انکی وضع سے ظاہر ہے ۔ یہ اگلے وقتوں کے لوگ فوٹو
اور تصویر سے کب سروکار رکھتے ہیں ۔ مگر ایک مرتبہ چند سال ہوئے علیگڈھ میں ایک
قابل یادگار مشاعرہ مولوی فضل الحسن صاحب حسرت موہانی کی کوشش سے ہوا تھا جس
میں میر مہدی مجروح تلمیذ حضرت غالب مرحوم منشی امیر اللہ صاحب تسلیم یادگار نسیم
دہلوی حضرت احسان شاہجہانپوری اور حضرت آسی مدراسی وغیرہم بڑے بڑے صاحب
کمال موجود تھے وہاں ایک گروپ لیا گیا جسمیں یہ بزرگ بھی آگئے ورنہ کل نگاہیں انکے
دیدار کو ترستیں اور انکے خدوخال تک کا تصور نہ کرسکتیں ۔ یہ تصویر اسی گروپ میں سے نکالی
گئی ہے ۔ درمیان میں مرحوم میر مہدی مجروح اور منشی امیر اللہ تسلیم بیٹھے ہیں میر صاحب کے بائیں ہاتھ
پر حضرت آسی مدراسی اور منشی صاحب کے دائیں طرف حضرت احسان ہیں ۔ میر صاحب کی تصویر
اس سے پہلے بھی شائع ہو چکی ہے باقی صاحبان کی تصویر انکے کمال کے معترفین کیلیے خاص لطف

اساطیر

انسان سے دنیا میں جو جودتِ طبع ظاہر ہوئی اُسکے سب سے پہلے نمونے اساطیر یعنی قصص و حکایات ہیں۔ اور اب بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ تہذیب یافتہ قوموں نے ہر زمانہ اور ہر ملک میں قصہ کہانی کو ایسا ہی عزیز رکھا ہے جیساکہ وحشی قوموں نے۔ ہندوستان کے زمانۂ قدیم میں والمیک اور کالیداس جیسے سحر آفرین اور یونان کی بالکل ابتدائی تاریخ میں الیسوپ جیسے داستان سرا موجود ہیں۔ رومۃ الکبرے کی سلطنت جمہوری کے ریعانِ آغاز میں ایک مرتبہ عایا میں شعلۂ بغاوت مشتعل ہوا اور اِس جوش و خروش کے ساتھ کہ شاید آبِ شمشیر کے بُجھائے بھی نہ بُجھتا۔ بلکہ ملک کے فصیح ترین واعظ بھی اِس موقع پر بغاوت سے باز رہنے کی تلقین اگر کرتے تو غالبًا رعایا کی پُر غضب تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے۔ لیکن جو کام کسی سے نہ ہو سکتا تھا۔ وہ ایک فرضی قصہ نے کیا۔ بھیڑیے اور بچہ کی ایک کہانی حسبِ حال گھڑھ کر مشتہر کر دیگئی۔ اور اُسکا یہ حیرت فزا اثر عامۂ ناس کے طبائع مختلفہ پر ہوا کہ بغاوت فرد ہوگئی۔

اصلاح قوم اور پند و نصائح کا قصے کہانی ہمیشہ مؤثر اور کامیاب ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ شاعروں نے تو بیچارے پندگو اور ناصح مشفق کی حد سے زیادہ مذمت کی ہے۔ لیکن اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ پند حقیقت میں تلخ شئے ہے جو کسی کو خوش نہیں آتی۔ کیسی ہی شدید ضرورت کیوں نہو مگر نصیحت کا نام بُرا لگتا ہے۔ اِدھر کسی نے نصیحت شروع کی اُدھر ہمیں معلوم ہونے لگا کہ ہماری توہین کر رہا ہے۔ ہماری عقل کو حقیر ہمارے چال چلن کو ذلیل اور ہمیں احمق سمجھتا ہے۔ اب اگر نصیحت گر سر دھن کر مرجائے تو متاثر نہوں۔ کیسے ہی خلوص و ہمدردی سے نصیحت کرے

مگر اُسکی باتیں انتہا کی ناگوار اور گستاخانہ معلوم ہونگی۔ اُسکی ہر بات کا اُلٹا اثر پڑے گا اصل یہ ہے کہ نصیحت کرنیمیں ایک نوع کی فضیلت ناصح کی نکلتی ہے اور ہماری فضیلت خاک میں ملجاتی ہے۔ ناصح ہمکو اپنے سے کم سمجھ اور اپنے مقابل میں خفیف الحرکات سمجھتا ہے تب تو نصیحت کرتا ہے۔ بس یہی وجہ اسکا سخن شاق گزرنے کی ہے۔ قدما اور متاخرین نے اس وجہ کو خوب سمجھا۔ اسیوجہسے نصیحت کو مطبوع اور خوش کرنیکے بہت سے طریقے ایجاد کیے۔ لیکن ہمارے خیال میں نصیحت کا سب سے مستحسن طریقہ قصص حکایات ہیں +

قصہ پڑھنے میں یہ خیال کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی ہمکو نصیحت کر رہا ہے۔ ہم قصہ کو قصے کی خاطر پڑھتے ہیں نصیحت کی خاطر نہیں پڑھتے۔ اور اسطرح قصے کے پردے میں نادانستہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ انسان کسی شے سے ایسا خوش نہیں ہوتا جیسا اپنی بزرگی کے خیال سے۔ اپنی قابلیت کا خیال جو مسرت دلکو بخشتا ہے وہ شاید کسی دوسری شئے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اپنی قابلیت کے اس یقین کو قصہ پڑھنے سے بہت تقویت ہوتی ہے۔ اور طبیعت کا اندرونی غرور راحت پاتا ہے۔ قصہ پڑھنے والا داستان کے متصل نشیب و فراز سے انواع واقسام کے نتائج مرتب کرتا ہے۔ اور دلمیں سمجھتا ہے کہ ہر نتیجہ خود میں نے ہی مرتب کیا ہے۔ قصہ میں جن اشخاص کا ذکر ہوتا ہے۔ اُن سے مختلف چال چلنوں کے معائب و محاسن اور اُنکی سرگزشتوں کے حسن و قبیح اور اُنکی کارروائیوں کی ناکامی و کامیابی اور اُن کے اسباب کو فہم کرکے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور ہر فائدے کو اپنی نتیجہ خیز طبیعت کا پیدا کیا ہوا سمجھتا ہے۔ قصے سے جو نصیحتیں نکلتی ہیں اُنہیں اپنی فراست و طباعی کا ثمرہ یقین کرکے قابل مصنف کی تلخ ترین نصیحتیں بطیب خاطر فقط سن ہی نہیں لیتا بلکہ اُن سے متاثر بھی ہوتا ہے +

ایسے نصیحت خیز قصص کی بہترین قسم تاریخ ہے جو اقوام عالم کی ترقی اور تنزل کے عبرت خیز جزر و مد کی نہایت ہی دلکش کہانی ہے عقلمندی اور بیوقوفی کے مفاد و مضار اور فطرۃ بشری کی بیشمار کمزوریوں اور قوتوں اور انکے نتائج ناگزیر کی جیسی سچی اور دل فریب داستان تاریخ ہے۔ فرضی داستانیں ایسی نہیں ہوسکتیں۔ قوت متخیلہ کی انتہائی بلند پروازیاں بھی ایسی خرد افروز داستانیں نہیں تراش سکتیں۔ اور کیونکر تراش سکیں۔ عام داستانوں کے مصنف آدمی ہوتے ہیں مگر داستان تاریخ کے مصنف قوانین فطرت ہیں مصنفین کی تکمیل و قوائے میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے وہی تصانیف کی شان سے نمایاں ہے۔

جن کتب کو سماوی ہونیکا دعوے ہے۔ اُن میں ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو قصے کہانی سے خالی ہو۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کتب مقدسہ میں جسقدر قصص ہیں سب کے سب تاریخی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اور یہی شاید دنیا کے سب سے پرانے قصے ہیں لیکن ازبسکہ علم و تہذیب کے بالکل ابتدائی زمانہ میں قصہ کہانی عالم وجود میں آئے ہیں۔ اسلیئے انکی ترقی و تکمیل کے لیے کوئی زمانہ اسقدر مناسب نہیں ہوسکتا جس قدر وہ زمانہ جسمیں کہ علم و تہذیب کی ترقی و تکمیل ہوئی۔ وجہ ہے کہ بلا استثنا دنیا کی تمام مہذب قوموں کے علم ادب میں قصے کہانی نہایت ہی ممتاز جگہ گھیرے ہوئے ہیں۔ اور بڑے بڑے طباع نکتہ سراؤں کے حسن تخیل کا سرمایۂ ناز رہے ہیں۔ ہندوستان کے نہایت ہی نادر القوے اُستادوں کی قابلیتیں ان پر صرف ہوئیں۔ عربی میں الف لیلہ۔ منطق الطیر۔ یقظۃ الروح جیسے عدیم المثال قصے لکھے گئے۔ فردوسی۔ جامی۔ سعدی۔ رفیع باذل۔ واعظ سے سحر طرازوں نے اپنی جدت طبع کے آب حیات سے اس چمن کو سینچا۔ رومتہ الکبرے کے عین زمانہ اقتدار میں ہورس سے آدمیوں نے اسمیں گلکاریاں کیں۔ بوکیو اور شکسپیر جو یورپ

کی تاریخ میں نہایت ہی کامل معنی میں شاعر کہلائے جانے کے مستحق ہیں قصہ نویس ہی تھے۔ لافونٹین[1] کی شہرت کو قصہ نویسی سے جو فیض پہنچا وہ شاید کسی دوسرے مصنف کو تصوف سے حاصل نہیں ہوا جرمنی میں گوئٹے سا گہرا فلسفی قصہ نویسوں کی فہرست میں نظر آتا۔

قصص کی بہت اقسام ہیں بعض قصے از اول تا آخر سچے ہوتے ہیں مگر نہایت دلچسپ۔ بعض جھوٹے ہوتے ہیں مگر نہایت نتیجہ خیز۔ اکثر قصص میں حیوانات و نباتات کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ گویا وہ آدمیوں کی طرح ہنستے بولتے مغموم و شاد ہوتے ہیں۔ اس قسم کے قصص کی لطیف ترین نوع وہ داستانیں ہیں جنہیں آدمی کے مختلف جذبات و خصائل و خصائص کو مرد و عورت فرض کر کے داستان کے پیرائے میں چلتے پھرتے۔ کام کرتے۔ کامیاب و ناکام ہوتے دکھایا ہے۔ قدما سے بعض مشہور تنقید لکھنے والوں کی رائے ہے کہ ہومر کا اوڈیسی اسی قسم کی داستان ہے رومتہ الکبرے کے اکثر بہترین مصنفین نے اسی قسم کے قصص پر طبع آزمایاں کی ہیں مسٹر سپینسر کی فیری کوئین از اول تا آخر اسی قسم کی کہانی ہے۔ قدما میں اعلے درجے کے نثر لکھنے والوں پر نظر ڈالیے تو مسٹر ونزیومن۔ افلاطون اسی نوع کے قصہ لکھنے والوں میں ہیں۔ یورپ میں سب سے اول جس نے اس قسم کے قصہ لکھنے کی بنیاد ڈالی وہ غالباً پروڈیکس تھا جو سقراط سے قبل اور علم و فلسفہ کے عین ابتدائی زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ ہندوستان کو اس اوصاف خاص میں ید طولے رہ چکا ہے۔ اہل ہنود کی مذہبی کتابیں ایسے پاکیزہ قصص سے بھری پڑی ہیں جنمیں فقط فطرۃ انسانی ہی کو بیان نہیں کیا بلکہ قوانین قدرت کی مختلف بنانے اور بگاڑنے والی یا آرام دہ و تکلیف رساں قوتوں کو راکشسوں اور دیوتاؤں کے نام سے موسوم کر کے قوانین فطرۃ کے طرق عمل کو ان دیوتاؤں اور راکشسوں کی دلچسپ سرگزشت بنا دیا ہے۔

[1] ایک مشہور فرانسیسی مصنف ۱۲

میرا ناچیز حافظہ جسقدر مصالحہ اسوقت بہم پہنچا سکا اُسکی امداد سے یہ مختصر تمہید عرض کرنیکے بعد میں آخرالذکر قسم کا ایک چھوٹا سا قصہ ہدیۂ ناظرین کیا چاہتا ہوں مگر پہلے چند لفظوں میں اُسکا محل نگارش بیان کروں۔

افلاطون سقراط کی موت کے حالات میں لکھتا ہے کہ جس روز سزائے موت ملنے والی تھی حسب دستور سقراط کے پاؤں سے بیڑیاں کاٹ دی گئیں اُس وقت سقراط اپنے شاگردوں کے مجمع میں پاؤں پر پاؤں دھرے بے پروایانہ انداز سے بیٹھا تھا۔ بیڑی سے جو سیاہ نشان پاؤں پر پڑ گیا تھا اُسے اپنے ہاتھ سے ملا اور معمولی فلسفیانہ انداز سے خیال کرنے لگا کہ پاؤں کے جس حصے کو ابھی ابھی بیڑی سے جسقدر تکلیف تھی اُسی حصے کو ملنے سے اب راحت ہوتی ہے۔ اِس مضمون نے اُسکے خیالات عام تکلیف و راحت کی نوعیت پر منعطف کر دیئے اور اُس نے کہا کہ تکلیف و راحت ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ اگر کوئی معقول سمجھدار مصنف راحت و تکلیف کو آدمی قرار دیکر قصہ لکھے تو ان متضاد کیفیتوں میں ایسا اتحاد دکھانا پڑے گا کہ ایک لمحے کیلئے بھی ایک کو دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہوگا جہاں اور جس مقام پر ایک کا گزر ہوگا وہیں دوسری کیفیت بھی بے اختیار موجود ہو جائیگی۔

افلاطون اپنے اُستاد کے لیے بے تعلق خیالات کو جو اُس قیامت خیز دن کے افسوسناک کاروبار سے علاقہ نہ رکھتے تھے۔ اگر بڑھانا مناسب سمجھتا تو نکتہ مجوزہ پر ضرور کوئی نہایت ہی نادر قصہ لکھتا۔ لیکن ازبسکہ نہیں لکھا ہم سے ہیچمدانوں کو موقع ملا ہم اِس جلیل القدر حکیم اور زندہ جاوید مصنف (افلاطون) کے تتبع میں اُس کے اُستاد کے نکتۂ لطیفہ پر ذیل کی کہانی پیش کرتے ہیں۔

دو خاندان ہمیشہ سے آباد چلے آتے تھے اور ابتدا ہی سے ایک دوسرے کی ایسی ضد تھے جیسا اندھیرا اجالے کی پستی بلندی کی۔ ان میں ایک خاندان جنت میں

رہا کرتا تھا دوسرا جہنم میں۔ مسبوق الذکر دوو ماں کے سب سے کم سن وارث کا نام تھا مسرت خاتون یہ بی راحت کے بطن سے اور بی راحت نیکی کی لڑکی اور نیکی فرشتوں کی نسل سے تھی۔ اور جیسا کہ بیان ہوا یہ سب جنت میں آباد تھے ؂

مخالف خاندان کا سب سے نوعمر وارث تھا میاں غم۔ یہ مصیبت کا بیٹا اور مصیبت گناہ کی بیٹی اور گناہ شیاطین کی اولاد سے تھا اور یہ سب جہنم میں رہا کرتے تھے۔ ان دونوں انتہائی دوریوں یعنی جنت اور جہنم کا جو مقام عین وسط تھا اُسکا نام زمین تھا یہاں بھی خدا کی مخلوق آباد تھی مگر نہ اہل جنت کی طرح نیک نہ اہل جہنم کی طرح بد۔ اس مخلوق میں اہل جنت و اہل جہنم دونوں کے نیک و بد آثار یکساں موجود تھے ؂

ذاتِ ذو الجلال کو خیال ہوا کہ زمین پر رہنے والی مخلوق جو آدمی کے نام سے مشہور ہے اس قدر پر معاصی نہیں کہ تکلیف ہی تکلیف اور رنج ہی رنج میں رکھی جائے نہ اتنی نیک ہے کہ بالکل مسرت و راحت ہی میں رہ سکے۔ پس نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی غرض سے حکم فرمایا کہ مذکورہ خاندانوں کے سب سے نوعمر ورثا مسرت خاتون جو راحت کی بیٹی ہے اور میاں غم جو مصیبت کا فرزند ہے فضائے قدرت کے اس درمیانی حصہ پر کہ اُن کی دوریوں کا وسط ہے۔ آکر باہم ملاقی ہوں اور باہمی رضامندی سے نوعِ انسان کو اپنے درمیان تقسیم کر لیں ؂

چنانچہ مسرت خاتون اور میاں غم جہنم اور جنت سے چلکر زمین پر ملاقی ہوئے اور ملتے ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ اس مخلوق میں جو ہماری سپرد کی گئی ہے جسقدر نیک ہیں اُنپر مسرت خاتون اپنا عمل کرے۔ اور جسقدر بد ہیں اُنہیں میاں غم اپنے قبضہ میں لائیں۔ اب جو قبضہ کرنے کی غرض سے نیکوں اور بدوں میں امتیاز کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ برخلاف جنت و جہنم کے یہاں کی مخلوق نہ محض نیک ہے نہ محض بد ہے بد شخص بھی کوئی ایسا نہ تھا جسمیں نیکی مطلق نہو۔ اسی طرح کوئی نیک سے نیک ایسا نہ تھا

جس میں ذرا سی بھی بدی نہو - جو انتہا درجہ کے نیک تھے۔ اُنپر بھی کچھ کچھ اثر غم کا
اور جو انتہا درجہ کے بد تھے اُنپر کچھ کچھ حق مسرت کا پہنچتا تھا۔ لہذا ہر شخص پر دونوں
کو حکومت کرنیکا مجاز حاصل تھا۔ خیال کیا گیا کہ معاملات کی اگر یہی شکل رہی اور مسرت
و غم نے ہر شخص پر اپنا عمل دخل کرنے کی جداگانہ کوشش کی تو دونوں میں لاتعداد جھگڑے
اُٹھ کھڑے ہوں گے اور سلجھائے نہ سلجھیں گے۔ آخر بہت تعمق و تفحص کے بعد قرار
پایا کہ مسرت خاتون اور میاں غم کا باہم عقد کردیا جائے تاکہ شوہر و زوجہ بنکر اہل
زمین پر حکومت مشترکہ بصلح و آشتی کرسکیں - چنانچہ دونوں کی باہم شادی ہوگئی
اور پیار و محبت سے رہنے لگے ۔

یہی سبب ہے کہ دنیا میں مسرت و غم۔ تکلیف و راحت کا چولی دامن کا ساتھ ہے
جہاں جاتے ہیں ساتھ ساتھ جاتے ہیں اگر کہیں ایک ذرا پہلے جا نکلا تو دوسرا بھی
فوراً اُسکے پیچھے پیچھے آموجود ہوتا ہے۔ جسے غم نصیب ہو سمجھ لو کہ اُسے خوشی بھی
ہونیوالی ہے اسیطرح جسے شادی ہو یاد رکھو کہ عنقریب غم اُٹھانیوالا ہے۔ یہاں
ہر تکلیف کے بعد راحت اور ہر راحت کے بعد تکلیف ضرور ہے۔ غم و نشاط - مسرت
و رنج لازم و ملزوم ہیں +

لیکن یہ مناکحت مسرت خاتون اور میاں غم کے ذاتی معاملات کے لیے ہرچند
کہ آسانی و درستی کا سبب ہوئی تاہم خالق نے جس مطلب کے لیے مسرت و غم کو
زمین پر نازل کیا تھا وہ پورا نہوا - یعنی اہل زمین میں رنج و خوشی مخلوط ہی رہی نمایاں
فرق نہ ہوا۔ پس نمایاں فرق کرنے کی غرض سے شوہر و زوجہ نے متفق ہوکر ایک
عہدنامہ لکھا جسپر دونوں خاندانوں کے دستخط اور مُہریں ثبت ہوئیں مضمون
عہدنامہ کا یہ تھا۔ کہ زندگی میں مسرت و غم کی حکومت سب پر اگرچہ مشترکہ رہے گی
لیکن بعد اس زندگی کے یہ اشتراک حکومت میں باقی نہ رہے گا مرنے پر جس

شخص میں بدی کی ایک خاص مقدار پائی جائے گی وہ بذریعہ میاں غم کے پاسپورٹ کے جہنم روانہ کیا جائے گا۔ تاکہ وہاں مصیبت اور گناہ اور شیاطین کے ساتھ بسر کرے۔ برخلاف اسکے جس شخص میں نیکی کی ایک تعدادِ معین ہوگی وہ بذریعہ مسرت خاتون کے پاسپورٹ کے روانہ جنت ہوگا تاکہ وہاں راحت اور نیکی اور فرشتوں میں رہے +

سید محمود حسین جعفری

قیدِ حیات غم سے۔ تیر آج یہ قیدی چھوٹ گیا
پھوڑا تھا اک دل کے اندر رات وہ پھوڑا ٹوٹ گیا

ظلم و ستم کی تجکو عادت ضعف سے اپنے میں لاچار
مجھ میں رکھا تھا ہی کیا اک تارِ نفس تھا ٹوٹ گیا

ناز نے آفت ڈھائی تھی ہی غمزے نے سفاکی کی
مایۂ صبر و شکیب و راحت یہ تو سبھی کچھ لوٹ گیا

میرے جھک کے ملنے پر تم اور بھی کچھ کھنچتے ہی گئے
رشتۂ الفت نازک تھا اس کھینچ کھنچاؤ میں ٹوٹ گیا

صدمۂ فرقت ضعف کی حالت۔ دل سے آہ نکل ہی گئی
دامنِ صبر اس کمزوری میں آخر ہاتھ سے چھوٹ گیا

انساں یوں ہی جو چاہے سمجھے ورنہ حقیقت ہے کیا اسکی
پانی کا اک بلبلا سمجھو۔ اٹھا۔ اٹھکر ٹوٹ گیا

ہم نے فہیم اس الفت میں کچھ ایسے صدمے اٹھائے ہیں
حسن فروش بازاری سے چھوٹ گیا دل چھوٹ گیا ہا

فہیم الدین احمد فہیم

کلیاتؔ اکبر

نظم اردو کے شایقین بالعموم اور کلام اکبر کے شیدائی بالخصوص یہ معلوم کرکے بہت خوش ہونگے کہ جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب کے فرزند ارجمند سید عشرت حسین صاحب بی اے نے جو تھوڑا عرصہ ہوا کیمبرج سے فارغ التحصیل ہوکر واپس تشریف لائے ہیں اپنے والد ماجد کے کلام کا مجموعہ ترتیب دے کے شایع کرادیا ہے۔ اُنھوں نے اس اشاعت سے نہ صرف اپنا ایک اہم فرض ادا کیا ہے بلکہ اردو علم ادب کی ایک معقول خدمت کی۔ اور وہ ہمارے دلی شکر کے مستحق ہیں۔ یہ کتاب کئی حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں حال کی غزلیں درج ہیں جنھیں دورِ سوم کی غزلیں کہا گیا ہے۔ دوسرے میں بیس پچیس سال قبل کا کلام ہے۔ اور اس حصہ کا نام دورِ دوم رکھا گیا ہے تیسرے حصہ میں اس سے بھی پیشتر کا کلام ہے جسے جناب اکبر کی طبع رسا کی مشق اول کہنا چاہیے اور اسی لیے اُسکا نام دورِ اول رکھا گیا ہے۔ انکے علاوہ رباعیات و قطعات و متفرقات ہیں جن میں اکثر ظرافت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ یوں تو ہر حصہ دلچسپ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف کی طبیعت کا اصلی رنگ دورِ سوم ہی میں نظر آتا ہے گویا شاعر کا بڑھاپا اُسکے کلام کا شباب ہے کہ وہ سارے جوہر جو ازل سے اُسکی طبیعت میں ودیعت کیے گئے تھے اور جو دورِ اول میں بھی تغزل کے زمانہ میں اپنی جھلک دکھا جاتے تھے اور دورِ دوم میں رفتہ رفتہ ترقی پا رہے تھے۔ آخرکار جناب اکبر کی

لہ مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ قیمت فی جلد علاوہ محصول ڈاک عمار ملنے کا پتہ۔ جناب سید عشرت حسین صاحب بی اے ڈپٹی کلکٹر سیتاپور۔ یا جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج الہ آباد۔

شاعری کا جزو اعظم بن گئے۔ اس زمانہ کا کوئی سیاسی مذہبی تمدنی اور اخلاقی مسئلہ ایسا مشکل سے ہوگا جسپر اکبر نے رائے زنی نہیں کی اور وہ بھی ایسے لطیف پیرائے میں کہ جس فریق کی رائے سے موافقت کی وہ یہ نہ سمجھہ سکے کہ اُسکی خوشامد کی جا رہی ہے۔ اور جس سے مخالفت ہو اُسے شکایت کا موقع نہ ملے ہنستے ہوئے لطیفہ کہتے زلف و سنبل سے قطعی گریز کیے بغیر اور بندش کی خوبیوں اور چستی کا لحاظ رکھکر اس عہد کا یہ بینظیر سخنور اپنا مطلب کہہ جاتا ہے اور ملک و ملت کی حمایت کا فرض ادا کر جاتا ہے۔ ان ہی خصوصیتوں کی بنا پر میں نے رباعیات اکبر کا دیباچہ لکھتے وقت اپنے ایک دوست کا یہ قول نقل کر دیا تھا کہ اکبر کو لسان العصر کہیں تو بجا ہے۔ مجھے یہ دیکھکر بہت مسرت ہوئی کہ یہ لقب عام طور پر موزوں قرار دیا گیا۔ اور مقبول ہوا۔ اور اب کلیات اکبر کے سرورق پر موجود ہے۔ میں چند اشعار نقل کرتا ہوں جنسے اس لقب کی یہ موزونی اور مناسبت واضح ہو جائے گی:-

بتوں کے پہلے بندے تھے مسوں کے اب ہوئے خادم

ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے باخدا ہونا

طریق مغربی کیا یہ ہی روشنضمیری ہے

خدا کو بھول جانا اور محو ما سوا ہونا

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا ‏ ‏ نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا

خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا ‏ ‏ جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات

یہاں تخت ہے تو پھر کیا وہاں منبر ہے تو پھر کیا ‏ ‏ جیسی جسے ضرورت ویسی ہی اُسکی چیزیں

گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا ‏ ‏ کیسی ہی سلطنت ہو سب خوش نہ رہ سکینگے

اب ہر شعر نظر غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک بجائے خود ایک مضمون کا مسالہ ہے

پہلے شعر میں آجکل کی ایک خاص دقت کا جسے بسا اوقات اکثر لوگ محسوس کرتے ہیں بیان ہے یعنی اس ملک میں مسلمانوں کو ایک طرف ہندو تمدن اور دوسری طرف انگریزی تہذیب سے سروکار ہے کبھی ایک کے زیر اثر کبھی دوسرے کے تابع فرمان ہیں۔ اور انہیں اپنے اصلی رنگ پر قائم رہنے اور اپنے فرائض کا حقہ ادا کرنے میں طرح طرح کی دشواریاں ہیں۔ اس مطلب کو بت اور مس کے استعارے میں ادا کرنا انتہاے بلاغت ہے۔ اور یہ استعارات جناب اکبر ہی نے اپنے لیے ایجاد کیے ہیں جیسے حافظ ساقی و مے سے طرح طرح کے معانی پیدا کرتا ہے جنھیں ارباب نظر سیاق کلام سے سمجھ جاتے ہیں اسیطرح کلام اکبر میں بت اور مس کئی معنی رکھتے ہیں۔ کہیں بت سے مراد ہندو اور مس سے مراد انگریز ہے۔ مثلاً ان دو شعروں میں جو اردو ناگری کے ناگوار جھگڑے کے دنوں میں کہے گئے تھے *

بتوں نے کہدیا چل ہٹ تجھے ہندی نہیں آتی

مسوں نے کہدیا جا تجکو انگریزی نہیں آتی

مگر اکبر کہ اب تک مر رہا ہے ان حسینوں پر

قیامت ہے کہ بیغیرت کو شرم اب بھی نہیں آتی

کہیں بت سے مراد ہندی عورتیں اور مس سے مراد انگریزی عورتیں لیجاتی ہے اور شاعر جدید تحریکوں میں سب سے زبردست تحریک یعنی سودیشی کیطرف اشارہ کرکے ہندی نوجوانوں کو اپنے ملک کی عورتوں کی قدردانی کی ترغیب دیتا ہے جیسے اس شعر میں *

بتونکو چھوڑکر کیوں جاؤں میں اس مس کی پیشی میں

متاع حسن بھی داخل ہے تحریک سودیشی میں

اور کہیں لفظ بت ہندو تمدن کا اور لفظ مس انگریزی تمدن کا قائم مقام ہوتا ہے جسکی

مثال خود یہ ہی شعر ہے جو سب سے پہلے نقل کیا گیا اسکے ساتھ کے دوسرے شعر میں مغربی طریق تعلیم پر مذہب سے بیگانہ ہونے کا اعتراض نہایت زور سے ظاہر کیا گیا ہے اور ایک معنی میں اسی اُصول پر زور دینا کہ نئی تعلیم بغیر مذہبی تعلیم کے مفید نہیں۔ جناب اکبر کے کلام کا خاص مقصد اور موضوع ہے۔ مدتیں ہوئیں جب سر سید احمد خاں مرحوم نے علیگڈھ میں علوم جدیدہ اور زبانِ انگریزی کی ترویج کا جھنڈا گاڑا اور اُنکے مداح اور دوست اُنکے ہمخیال ہوکر انکی تائید میں کھڑے ہوئے تو خان بہادر اکبر حسین صاحب نے اس تحریک کی بعض کمزوریوں کی طرف اپنے شاعرانہ اور ظریفانہ پیرائے میں قوم کو متوجہ کرنا شروع کیا اور سید صاحب کو اس طرح اپنا مخاطب بنایا۔ جیسے پرانے شعرا واعظ اور زاہد سے خطاب کرکر کے اپنے اشعار کو دلچسپ بناتے تھے۔ گویا سید صاحب کی ذات سے خطاب کرنیکے علاوہ اس نئی تعلیم اور انگریزیت کا قائم مقام اُنہیں ٹھیرایا۔ اب اس میں کہیں کہیں ایسی تیزی سے نکتہ چینی کی کہ بعض لوگوں نے اکبر کو سید مرحوم کا مخالف اور اُن کے کام کا دشمن جانا۔ لیکن آخر ان دونوں بزرگوں کے تعلقات باہمی اور خود جناب اکبر کے طرز عمل نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ انگریزی تعلیم پاکر نوجوان اپنے مذہب سے بالکل غافل اور بیخبر نہو جائیں اور اسپر اصرار کرتے ہیں کہ اول اور مقدم ضرورت مسلمانوں کا باخدا رہنا ہے۔ اور باقی سب خوبیاں اُسی صورت میں خوبیاں ہیں کہ جب یہ صنعت ان میں موجود ہو۔ اُس زمانے میں تعلیم جدید کے نئے نئے جوش کے سبب سے کسی نے اس آواز پر کان نہ دھرا۔ مگر آج جب افسران محکمہ تعلیم حکام انگریز اور دیگر اہل الرائے کیا ہندو کیا مسلمان مذہبی تعلیم کی ضرورت کے مقر ہیں اور اُن خراب نتائج کا احساس کر رہے ہیں جو تعلیم یافتہ جماعت میں مذہب سے الگ رہ کر پیدا ہوئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ

اکبر کی نصیحت گو تلخ معلوم ہوتی تھی کسقدر حق بجانب تھی اور کتنی دوراندیشی پر مبنی تھی۔ شاید کوئی یہ کہے کہ سید صاحب نے خود اس ضرورت کو محسوس کر کے کالج میں مذہبی تعلیم کو رواج دے دیا تھا۔ پھر اکبر کی تاکید مزید کی کیا ضرورت تھی۔ اسکا جواب اِن شعروں میں سے جو آغاز مضمون میں نقل کیئے گئے ہیں تیسرے شعر میں موجود ہے۔ یعنی مذہب صرف کتابوں سے اور کالج سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ نور ایمان انسان کے قلب کو بزرگانِ باعمل کی نظر سے میسّر ہوتا ہے۔ اُنکی پاکیزہ زندگی اور اُنکی عمدہ مثال آدمی کو انسان بنادیتی ہے۔ اور اکبر کو یہ شکایت تھی کہ جدید تعلیم لوگوں کو اس رستہ سے ہٹائے لیئے جاتی ہے اور عالمان باعمل دن بدن کم ہوتے جاتے ہیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شکایت بیجا تھی ؛

اکبر نے جیسے مشرق و مغرب کے باہمی تعلقات اور مغربی تعلیم کی کمزوریوں میں نہایت معقول رائے دی ہے۔ اسیطرح بہت سے اہم پولیٹیکل مسائل پر اُسکے خیالات نہایت غور کے قابل ہیں۔ اُن کا یہ کہنا کہ جو خیر خواہی ڈر سے پیدا ہو وہ خیر خواہی نہیں ہے۔ اِس ملک میں حکام وقت کے لیئے ایک انمول نصیحت ہے مگر افسوس ہے کہ بہت کم حاکم ایسے ہوں گے جو بغیر ضمانہ خیر خواہی اور غرضمندانہ وفاداری میں فرق کر سکیں۔ اسیطرح یہ اصول کہ کوئی سلطنت سب کو خوش نہیں رکھ سکتی ایک بالکل سچا اصول ہے جو ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے اور اس اُصول کو بیان کرتے ہوئے اکبر کا یہ کہہ جانا کہ "گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا" ایک نہایت پر لطف نکتہ ہے جسکی خوبی محتاج بیان نہیں ؛

مذہبی اور پولیٹیکل امور کے بعد سوشل امور کا درجہ ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی اشیاء کا استعمال کس سرعت کے ساتھ ہمارے گھروں میں بڑھ

رہا ہے اور کس طرح لوگ دیوانہ وار یہ سمجھتے ہیں کہ لباسوں میں لباس ہے تو انگریزی۔ گھر میں فرنیچر اگر انگریزی ہے تو گھر ہے ورنہ خانۂ بے در اور جو آرام اور آسایش ہے تو انگریزی طرز بود و باش میں ہے۔ اور ہمارا طریق ماند و بود بے لطف و بے آرام ہے تو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابنائے ملک کو جتا دیا جائے کہ وہ اس قسم کی یک طرفہ رائے قائم کر کے بہت غلط رستے پر جا رہے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ ہماری ضروریات ہمارے ملک کی حالت اور اُسکی آب ہوا کے لحاظ سے بہ حیثیت مجموعی ہماری اپنی چیزیں زیادہ موزوں اور آرام دہ ہیں اور اندھا دُھند ہمارا شوق سامان مغربی ہمیں بے شمار مشکلات میں ڈال رہا ہے اور ڈالنے والا ہے۔ چنانچہ "یاں تخت ہی تو پھر کیا وہاں میز ہے تو پھر کیا" میں کس سلیس اور عام فہم طریق سے اور کسقدر اختصار کے ساتھ یہ بسیط اور ضروری مضمون ادا ہو گیا ہے ٭

یہ چند اشعار جو میں نے نمونتہً پیش کیے۔ ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کہ اکبر کے ہر قسم کے خیالات اِنسے معلوم ہو گئے۔ اسمیں شک نہیں کہ کچھ موٹی موٹی باتیں جو اُن کے کلام میں اکثر آتی ہیں ان شعروں کو پڑھ کر سمجھ میں آسکتی ہیں۔ لیکن کلیات اکبر مضامین رنگا رنگ کا ایک دریا ہے جسکی غوطہ زنی کیے بدون معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس خوش فکر شخص نے اپنے کلام میں کیا کیا موتی پروئے ہیں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونیکے اکبر نے اپنی نصائح کا مخاطب بیشتر اپنے ہمقوموں کو بنایا ہے۔ لیکن بہت سی دل آویز نصیحتیں ایسی ملینگی جنسے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر گو ایک غیور مسلمان ہے تاہم تنگ خیالی سے بری ہے اور اُسکے دلمیں اپنے مذہب کی محبت کے بعد اپنے ملک کی محبت کا بھی گھر ہے اسی سبب سے وہ جا بجا نہایت وسیع خیالی سے اپنے ہندو بھائیوں کو بھی کار آمد

مشورے دیتا ہے چنانچہ کہتا ہے :-

شعر میں اکبر یہی مضمون تو ہر بار باندھ اے مسلماں سبحہ لے اے برہمن زنّار باندھ

یعنی جیسے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ تسبیح ہاتھ سے نہ چھوڑیں اِسیطرح ہندوؤں کو یہ رائے دیتا ہے کہ وہ زنّار کو باندھے رہیں اور اپنے مذہب سے نہ ہٹیں۔ اور ان دونوں مشوروں کو ایسا ضروری سمجھتا ہے کہ انہیں بار بار لکھنا عیب میں داخل نہیں سمجھتا بلکہ اپنا فرض قرار دیتا ہے :-

ہندوستان کی آجکل کی زندگی میں شاید انگریزوں اور ہندوستانیوں کے میل جول کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور اِسپر اخبارات میں سیکڑوں کالم اور رسالوں میں سیکڑوں اوراق سیاہ ہو چکے ہیں۔ اکبر اِسکے متعلق ایسا خیال ظاہر کرتا ہے جو ہندو مسلمان ہر طبقۂ رعایا کے دلمیں موجود ہے اور جسے انگریزوں میں بہت تھوڑے لوگ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

یہ فقط نہیں ہی کافی کہ مرا مزاج پوچھیں میرے درد دل کو سمجھیں مری احتیاج پوچھیں

اہلِ مغرب نے مشرقی ممالک پر تسلّط حاصل کرنیکے لیئے جو باریک طریقے ایجاد کیئے ہیں اُسکی توضیح کے لیئے یہ شعر قابل ملاحظہ ہے :-

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچلا دیتے ہیں مغربی اُسکی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اِسی مضمون کو جو اِس شعر میں مختصراً بیان ہوا زیادہ شرح کیساتھ ایک غزل میں بیان کیا ہے جسکے تین چار شعر ذیل میں درج کیئے جاتے ہیں :-

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر آگیا تارِ امید و بیم انکے ہاتھ میں

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اہلِ قلب قوم اُنکے ہاتھ میں "تعلیم اُنکے ہاتھ میں"

جج بنا کر چھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل ہیں نہایت خوشنما دو جیم اُنکے ہاتھ میں

مغرب ایسا ہی رہا اور ہے اگر مشرق یہی ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم اُنکے ہاتھ میں

اب تک ہم نے اکبر کی ظرافت کے کوئی نمونے پیش نہیں کیئے۔ مگر ظریفانہ اشعار کے بغیر اُنکے کلام کی تنقید نامکمل رہجائے گی۔ کیونکہ ظرافت ایسی چیز ہے کہ تشریح سے اُسکا لطف جاتا رہتا ہے۔ اسلیئے یہ اشعار بغیر کسی حاشیہ چڑھانے کے نقل کیئے جاتے ہیں۔ البتہ یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ اِن اشعار میں بھی اِس زمانے کا ہر ضروری مسئلہ بڑی خوبی سے حل کیا گیا ہے۔

حیراں ہیں اِس زمانہ میں ہم جی کے کیا کریں ۔۔۔ جائز سہی شراب مگر پی کے کیا کریں
تعلیم اونچے درجہ کی ہوتی نہیں نصیب ۔۔۔ پھر گھر میں بیٹھکو بجز اے بی کے کیا کریں

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں ۔۔۔ اور تیرے بیاں کی دل آویزی میں
شیطاں عربی سے منہ چھپائے ہے بخوف ۔۔۔ لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

وضع مغرب دیکھکر دیکھا تو یہ کافور تھی ۔۔۔ اب میں سمجھا واقعی ڈاڑھی خدا کا نور تھا

اُردو کے تئیں بیع کے ملک میں جو ہنود ۔۔۔ پھر کیا سبب جو اس سے اُنہیں انحراف ہے
یعنی اُردو ہے چیز اُنہیں کے مذاق کی ۔۔۔ اُردو کے تئیں جزو یہ ہی صاف صاف ہیں

اے شیخ جب بخیل نہیں دست قوم میں ۔۔۔ پھر کیا خوشی جو اونٹ ترے ریل ہو گیٔے

اضافہ ہو گئی مجھسے گندم پہ مے ۔۔۔ یہ پوتے سہی بھی اِک خطا ہو گئی

رہی رات ایشیا غفلت میں سوتی ۔۔۔ نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے کہہ دیتی ہے تاریکی ہوا کی

ظریفانہ اشعار کے متعلق کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ انجن کی تھوڑی سی شرح کر دیجائے۔ کلام اکبر میں لفظ انجن بُت اور مِس کیطرح اصطلاح کا رتبہ رکھتا ہے۔ آجکل کی مادی ترقی کا مجسم قائم مقام ہے اور اسپر جو پھبتی کہی جائے وہ مادی ترقی پر اعتراض ہوتا ہے۔ شعر مندرجہ بالا میں جو ہوا کی تاریکی کیطرف اشارہ کیا گیا ہے اُسمیں گو یہ ظاہری لطف بھی موجود ہے کہ انجن جدھر سے نکل جائے ہوا تاریک ہو جاتی ہے، مگر یہ باطنی اعتراض بھی صحیح ہے کہ مشینوں اور کلوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی تاریکی اکثر ممالک میں داخل ہوتی جاتی ہے +

ظرافت اسمیں شک نہیں کہ ہمیشہ مہذب نہیں ہوتی۔ گو ہم نے جو اشعار انتخاب کر کے پیش کیئے ہیں وہ جوہر تہذیب سے آراستہ ہیں۔ تاہم کلیات کے حصۂ ظرافت میں بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جو ہمارے نزدیک صفحۂ کاغذ پر نہ اُترنے چاہئیں تھے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اکبر جیسا طبّاع شخص اگر اُسکو کوئی لطیفہ سوجھے تو اُسکے کہنے سے رُکجاتا۔ مگر اس صورت میں کہ وہ مہذب ظرافت کے دائرہ سے خارج ہو اُسکو چھپوانا مناسب نہیں کیونکہ چھپی ہوئی چیز ہر کر دمہ زن و مرد پیر و جواں کے ہاتھ میں جا سکتی ہے۔ اور اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ نو عمر طبائع پر ایسی ظرافت کا اثر کیا پڑ سکتا ہے۔ ایسے لطیفے بے تکلف صحبتوں کی تفریح کے لیئے زبانی بیان ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کتاب میں اُنکا آجانا کتاب کی عام وقعت میں کسیقدر خلل انداز ہوگا اور ہمارا خیال ہے کہ جب اسکے دوبارہ طبع ہونے کی نوبت آئے تو اس پہلو سے نظر ثانی نہایت مفید ہوگی +

ایک اور اعتراض قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ گو انگریزی الفاظ کے استعمال میں جناب اکبر کو ایک مہارت خاص حاصل ہے اور وہ اُنھیں اکثر جگہ اردو میں نہایت خوبصورتی سے کھپاتے ہیں پھر بھی کہیں کہیں یہ استعمال حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے جو نامناسب معلوم ہوتا ہے اور اس بارے میں کسیقدر احتیاط سے کام لینا کلام اکبر کی بیشمار خوبیوں کو بڑھادے گا۔ جن اشعار میں انگریزی لفظ بے تکلف بندھے ہیں اور لطف دے رہے ہیں یا ناگزیر تھے اُن کے نمونے ہم پیش کرتے ہیں اور اُسکے بعد کچھ ایسے اشعار نقل کرینگے جن میں وہ تکلف سے لائے گئے ہیں یا ضرورت سے زیادہ بھرتی کیئے گئے ہیں۔ اور اس مقابلہ سے اس اعتراض کی توضیح ہوجائے گی۔

کہتے ہیں حرج کیا ہی جو باریک ہی وہ پل　　بائیسکل پہ گزرینگے ہم پل صراط سے

ایسی پری اور مجکو پیار لکھے　　القاب میں دیکھیئے ڈیر کلو ہے

حکمتوں سے ہوئی ہی جزو شکم　　روح بھی اب تو کورس جیتی ہے

کرکٹ جمناسٹک ٹریننگ کالج　　مولانا سیکھتے ہیں بالفعل نٹ

اجل آئی اکبر گیا وقت بحث　　اب اِف کیجیے اور نہ بٹ کیجیے

ممکن نہیں اے مس تیرا نوش نہ لیا جائے　　گال ایسے پریزاد ہوں اور کس نہ لیا جائے

جب میں کہتا ہوں کہ گومی کس ڈیر　　سر جھکا کر کہتے یو مے ٹیک ہیر

مناسب انگریزی الفاظ

نامناسب انگریزی الفاظ

زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ ان انگریزی الفاظ اور فقرات کے ساتھ اُن کے اردو معنی بھی درج نہیں کر دیئے گئے اور اس وجہ سے جو لوگ انگریزی سے بالکل ناآشنا ہیں وہ اُنکے معنی سمجھنے سے بالکل قاصر رہیں گے ◆

آخر میں ہم بہ حیثیت مجموعی اس لاجواب کتاب کی دل سے داد دیتے ہوئے اتنی بات اور کہہ دینی ضروری سمجھتے ہیں کہ ترتیب کے لحاظ سے اگر دَور اول کو پہلے اور دَورِ سوم کو بعد میں رکھا جاتا تو اُس سے علاوہ قدرتی تناسب ترتیب کے یہ فائدہ حاصل ہوتا کہ کلام کے ناظرین کو جناب اکبر کی شاعری کی رفتار کی تدریج نظر آجاتی کہ کس طرح شروع ہوئی اور کہاں تک بڑھی اُسکے ابتدائی دَور میں کونسی چیز تھی جو اس کمال ترقی کا پتہ دیتی جو آخر اُن کے کلام نے حاصل کیا ہے اور جسکی بدولت وہ جدید ادب اُردو کے اُن اساتذہ میں آ گئے جنکا نام اُسوقت تک زندہ رہیگا جب تک یہ زبان اور اسکا علم ادب زندہ ہے ◆

عبدالقادر

گورنمنٹ کی قدردانی ۔ ناظرین مخزن یہ سن کر یقیناً خوش ہونگے کہ اس رسالہ اور اس پریس کی کتابوں کے ذریعہ سے جو خدمات ادب اردو کی ہو رہی ہیں اُنکا اعتراف گورنمنٹ کی طرف سے ہوا ہے ۔ جناب جے ۔ سی گاڈلے صاحب بہادر ایم اے ڈائرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب نے بحیثیت سکرٹری صیغہ تعلیم مندرجہ ذیل چٹھی مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۹ء بنام شیخ عبدالقادر ارسال فرمائی ہے ۔ "مجھے ہدایت کیگئی ہے کہ میں آپ کو اطلاع دوں کہ ہز آنر نواب لفٹننٹ گورنر بہادر نے منظور فرمایا ہے کہ دو سو ۲۰۰ روپیہ کا یہ چک آپ کو بھیجا جائے ۔ بلحاظ اُن خدمات کے جو آپنے اُردو علم ادب کی ترقی کیلئے کی ہیں" ◆ ہم ہز آنر کا اور ڈائرکٹر صاحب بہادر کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُنھوں نے قدردانی کے اظہار سے ہماری حوصلہ افزائی کی ◆

انقلاب

(۱)

سوتیلی ماں

کلیجہ تھام لو گے جب سنو گے نہ سنوائے خدا شیون کسی کا

"میری امّاں! میری پیاری امّاں! تم کہاں ہو؟ خدا کے لیئے تم اپنی شکل تو دکھا دو۔ دیکھو تو سہی، تمھاری پیاری کی کِس کی؟ جسکو تم جگر کا ٹکڑا، کلیجہ کی ٹھنڈک کہتی تھیں، اُسکی۔ اُسکی جسے تم رات رات بھر اپنے سینے پر لٹائے رہتی تھیں۔ جسے تم جان سے زیادہ پیارا سمجھتی تھیں، پیاری امّاں اُسکی جسے تم بسم اللہ کے گنبد میں پالتی تھیں، اب کیا حالت ہی؟ تم تو خبر ہی نہیں لیتیں۔ خدا جانے تم کہاں ہو؟ میرے سارے بدن میں درد ہو رہا ہے! دُلہن امّاں آج میری کی قمچی لیکر اس طرح پلیں کہ ساری کھال روئی کی طرح دُھن ڈالی۔ دیکھو تو! بدھیاں پڑ گئی ہیں، ساری چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں (کروٹ لیکر) اوں کمر میں بھی تو درد ہو رہا ہے، تم تو جواب ہی نہیں دیتیں۔ کیا مجھ سے خفا ہو گئی ہو؟ نہیں تو پھر آ کیوں نہیں جاتیں۔ اچھی میری امّاں میں اب نہیں رونے کی میں جانتی ہوں تم کہا کرتی تھیں کہ میں تیرے رونے پر خفا ہو جاؤنگی۔ بس تم اُسی پر خفا ہو گئی ہو۔ دُلہن امّاں کہتی ہیں کہ تم مر گئیں۔ خبر نہیں مر کر کہاں جاتے ہیں؟ اُستانی جی بھی تو وہاں کا رستہ نہیں جانتیں۔ خدا جانے کتی (کتنی) دور گئی ہو؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کے پیسے ڈولی پر ہو۔ نہیں تو میں آپ ہی چلی جاتی۔ سب کہتے ہیں کہ تم مر گئیں، مگر میں خوب جانتی ہوں تم مجھ سے خفا ہو گئی ہو۔

جب ہی تو خالہ اماں بھی جسدن سے بلانے گئیں پلٹ کر ہی نہ آئیں۔ کیا تم نے انکو بھی روک لیا؟ پیاری اماں! میں تو اکیلی ہی رہ گئی۔ تم تو ایک لمحے (لمحہ) کے لیئے بھی مجھے آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھیں۔ اب خدا جانے کیا ہو گیا ہے کہ تم خبر ہی نہیں لیتیں، سُنتیں ہی نہیں۔" (تھوڑی دیر چپ رہکر)

"ابا میاں بھی اب تو پیار نہیں کرتے، جب تم نئی نئی گئی ہوئی تھیں، تو وہ مجھے ہر وقت گود میں لیئے لیئے پھرتے تھے۔ بزار (بازار) بھی لیجاتے تھے اور مُنّے مُنّے کھلونے بھی دلاتے تھے۔ کیا خبر کیا بات تھی۔ کہ جہاں اُنھوں نے مجھے دیکھا اور رونے لگے: مگر اماں بی! سچ کہتی ہوں، جسدن سے وہ دُلھن اماں کو لائے ہیں اور میری خالہ اماں تمھارے پاس گئی ہیں۔ بس اُسیدن سے وہ بھی مجھسے خفا ہو گئے ہیں، نہ مجھے گود میں لیتے ہیں نہ کوئی چیز لاکر دیتے ہیں۔ ابھی ابھی ختیجہ (خدیجہ) نے اپنی گڑیا کی شادی کی تھی تو ابا میاں نے ایسے ننھے مُنّے برتن اور ایسے چمکتے جھم جھماتے کپڑے اُسے لاکر دیئے تھے کہ بس میرا جی لوٹ گیا! اور میں اپنی گڈّے کے لیئے کہتے کہتے تھک گئی، مُنہ سوکھ گیا، مگر اُس نگوڑی کے لیئے ایک دوپٹہ بھی نہیں لادیتے۔ اپنے آپ ہی برتن پونچھنے اور ڈبیاں صاف کرنیکے چیتھڑے اکٹھے کرتی ہوں، دھوتی ہوں، اور اُستانی جی کے ہاں جاکر اُس نگوڑی اللہ ماری گڑیا کے کپڑے سیتی ہوں۔ ابا میاں خبر ہی نہیں ہوتے۔ اور تو اور جب سے تم سدھاری ہو، کئی عیدیں نکل گئیں، اُنھوں نے ختیجہ کو تو کھلونے بھی لاکر دیئے، بزار سے بیوڑیاں اور سوتی پاک بھی لادیا۔ عیدی بھی دی۔ اور مجھے تو کچھ بھی نہ دیا۔ نہ ابا میاں نے عیدی کی دوانّی دی نہ دُلھن اماں نے۔ کھلونے تو الگ رہے، اماں بی! مجھے تو کبھی سے دودھ سوئیاں بھی نہ دیں۔ اب تو میری طبیعت (طبیعت) بہت گھبراتی ہے، خدا کے لیئے تم کہیں آچکو، اور آؤ تو میرے لیئے

خوب اچھے اچھے کپڑے اور لال سبز دیا سلائیوں کے بکس ضرور لانا، اور میری اُستانی جی کے لیئے بھی چمکتی چمکتی جوتیاں لانا۔ جب تم گئی تھیں تو میں آم (عم) کا سپارا (سیپارہ) پڑھتی تھی، اب تو میں تبارک الذی بھی ختم کر نیکو ہوں۔ تم آؤ گی تو میرے قرآن ختم کرنے کی شادی کرو گی۔ میرے لیئے کپڑے بناؤ گی میں خوب بہار کے کپڑے پہنونگی۔ کیوں اماں! خوب بہار کے کپڑے بناؤ گی نا؟ اُب تو میرا بہت جی چاہتا ہے۔ ابا میاں تو عید کے عید کپڑے بناتے ہیں، اور بیچ میں جو کپڑا آتا ہے اسمیں سے دُلہن اماں مجھے دیتی ہی نہیں، دیکھو تو! میرے پیجامے (پائجامہ) کا سارا گھٹنہ پھٹ گیا ہے، اُستانی جی نے پیوند لگا دیا ہے کوئی مجھے پوچھتا ہی نہیں۔ میری روٹی کی بھی خبر نہیں لیتے جب ابا میاں گھر میں نہیں ہوتے تو دُلہن اماں سارا کام مجھسے لیتی ہیں۔ برتن میں دھوتی ہوں، جھاڑو میں دیتی ہوں، اُگالدان میں مانجھتی ہوں اور ختیجہ کو ساری دو پہر (دوپہر) پنکھا میں جھلتی ہوں۔ اماں پھر بھی تو دُلہن اماں مجھے کبھی پیار نہیں کرتیں۔ ختیجہ کو اپنے ساتھ لیکر سوتی ہیں، اور مجھے ایک چھوٹی سی کھٹولی پر جو جھلنگا ہو گئی ہے الگ سلا دیتی ہیں۔ اماں! میں رات کو بُرے بُرے خواب دیکھتی ہوں اڑ جاتی ہوں، میری آنکھ کھل جاتی ہے، اور میرا کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔ میں روتی ہوں مگر کوئی نہیں اُٹھتا۔ پھر کانپتی کانپتی آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتی ہوں۔ اور زیادہ ڈر لگا تو پٹی سے چمٹ جاتی ہوں، تکیہ میں مُنہ گھسیڑ دیتی ہوں، پھر سو گئی تو سو گئی، نہیں تو ساری رات یوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی ہے اور کوئی آنکھ نہیں کھولتا۔ یہ تو دیکھو! ختیجہ کو تو دُلہن اماں اپنے ساتھ کھلاتی ہیں اور مجھے الگ دیتی ہیں۔ اگر میرا پیٹ نہیں بھرتا تو اور نہیں دیتیں۔ آج ہی رات کو جب سارا گھر کھا چکا تو دُلہن اماں نے ایک باسی روٹی اور دو

آلو کے قتلے جو ختیجہ کے آگے سے بچ رہے تھے مجھے دیئے۔ میں نے کھائے،
مگر میرا پیٹ نہیں بھرا، میں سچ کہتی ہوں، امّاں! مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی،
میں نے پھر جو دوسری دفعہ مانگا تو جھڑک کر بولیں "چل دور ہو! ختیجہ کی بندوڑا،
تجھے بھی دن لگے، امّاں کو تو کھا گئی اب کیا مجھے کھائیگی؟" میں چپکی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
اللہ کی قسم، امّاں! اب اسوقت ایسی بھوک لگ رہی ہے کہ میرا کلیجہ کھنچا جاتا ہے۔
اور ہاں، امّاں! کیا تم مجھے بندوڑ بنا گئی ہو؟ کیا میں ختیجہ کی بندوڑ ہوں؟ پیاری
امّاں! تمھیں اللہ میاں کی قسم، بتاؤ تو سہی کیا تم اپنی پیاری زبیدہ کو بندوڑ بنا گئی
ہو؟ اچھی! اب تو تم آجاؤ! کام کرتے کرتے میرے ہاتھ دکھنے لگے، پیوند لگاتے
لگاتے میں گھبرا گئی، اور بھوکے رہتے رہتے میرے دم پر بنی جاتی ہے۔ خدا کے
لیئے آجاؤ، امّاں! پیاری امّاں! جلدی آؤ۔ امّاں جان! امّاں جانی!! اچھی تم
نہیں آتی ہو تو اپنی پیاری زبیدہ کو ہی اپنے پاس بلالو۔"

یہ جگر خراش الفاظ، اور یہ تڑپا دینے والے جملے، ایک دوشیزہ کمسن اور
بھولی لڑکی کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں، جو ایک مکان میں ٹوٹی سی کھٹولی پر
پڑی اپنی مردہ ماں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی ہے، اس ستم نصیب بچّی کو
ابھی دنیا کی گرم و سرد ہوا کھاتے کسیطرح نو دس سال سے زیادہ نہیں گزرے۔
مرحوم ماں اپنی غریب بچّی کو آج خدا جھوٹ نہ بلوائے تو، چار برس کا عرصہ ہوا کہ غافل
اور بے پروا باپ کے سپرد کرکے کنج لحد میں آرام سے جا سوئی۔ ایک سال بعد زبیدہ کے
والد میاں محمود نے دوسری شادی کرلی جس سے ایک اور لڑکی خدیجہ پیدا ہوئی
شادی کی تو اچھا کیا، اور لڑکی پیدا ہوئی تو مبارک ہو، مگر زبیدہ! ستم نصیب زبیدہ!!
اُس ماں کی بچّی جسپر میاں محمود جان چھڑکتے تھے، اس ظلم اور بے پروائی کے
لائق نہ تھی۔ آپنے ابھی دیکھا! اُسکے ننھے نازک ہاتھ پر اور نرم پتلی اور دُبلی بانہہ پر

کیسے نیل پڑرہے ہیں! آپ نے سُنا وہ کیا کہہ رہی تھی؟

دس برس کی جان! اور یہ کچھ ظلم! اے آسمان! بس! اے تفرقہ پرداز بس۔ اے دنیا کے فانی کارخانے! تیری نیرنگیاں بھی کچھ غضب ہیں۔ اور لے تقدیر کے لکھے! تیرا بُرا ہو تُو بھی عجیب چیز ہے۔ مگر نہیں۔ کارخانۂ قدرت پر الزام رکھنے والو! تقدیر کے سر نہ تھوپو۔ تقدیر اَن مٹ سہی! آسمان تفرقہ پرداز سہی! مگر اے بے پرواہ انسانوں! اسکا جواب دہ کَون ہے؟ تم اور صرف تم۔ اے آنکھیں بند کرکے دنیا کے نشیب و فراز پر سفر کرنے والو! ہوشیار! اے غافل اور غیر مستقل مزاج والو! خبردار! یہ مان لیا کہ خدیجہ کی ماں زبیدہ کی سوتیلی ماں ہے مگر اے عقل کی آنکھوں سے کور! محمود۔ کیا تمھیں زبیدہ سے وہی تعلق نہیں جو خدیجہ سے ہے؟ ہے اور بیشک ہے: کیا تمھیں یاد نہیں کہ مرحوم حمیدہ کے جیتے جی! زبیدہ سے تمھیں کسقدر اُنس تھا؟ مگر اب کیا ہوا۔ کیا زبیدہ صرف حمیدہ کی وجہ سے قابلِ محبت تھی؟ کیا یہ معصوم بچی ماں کے مرتے ہی تمھارے سینے سے جیتے جی مرگئی؟ اے عقل کے دشمن! بس کر بس۔ آخر اس تغافل کی کوئی حد بھی ہے! اے کمزور مخلوق پر نام رکھنے والے سنگدلو! کیا عورتوں میں بھی کبھی ایسی اعتنائی دیکھی؟ اگر کوئی باپ مرگیا ہے تو کیا اُس بیوہ ماں نے بھی اپنی اولاد کو یوں ہی پالا پوسا ہے، جسطرح تم کرتے ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ رحم اُنکی گھٹی میں ہوتا ہے۔ اور محبت اُنکی عصمت اور پاکبازی کا زیور ہے۔ وہ یسیر بچوں کو پالتی ہیں اور کچھ عجب طرح پالتی ہیں۔ وہ بچوں ہی کی محبت نہیں کرتیں، بلکہ مرحوم شوہر کی یاد میں ساری عمر خونِ جگر آنکھوں کے رستے بہاتی ہیں، اور اُس بچے کو دیکھتے ہی، اکثر اوقات اُن کا کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے۔ مگر ہاں اے سرکش گروہ! اے ہوا و ہوس کے بندو! اگر ظالم ہو تو تم۔ تمھاری مُنہ دیکھے کی محبت پانی کا بلبلا ہے۔ تم استقلال اور

محبت کے میدان میں نہ باوفا بنے اور نہ بنو۔ شرم! اے بھولی اور نیک عورتوں پر حکومت کرنے والو! شرم!! سوتیلے پن کی بیہودہ عادتیں، نند بھاوجوں کے جھگڑے، اور ساس بہوؤں کے ذلیل تنازعات کی جڑ اگر غور سے دیکھا جائے تو تم ہو۔ بے شک تم ہو۔ اے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر غور نہ کرنے والو! اسکی پاداش تمھیں بھگتنی ہوگی۔ کیا تم اپنی لڑکیوں کو جاہل نہیں رکھتے؟ کیا تم جہالت کی وجہ سے یہ وحشیانہ خیال اُن میں پیدا نہیں کرتے؟ کرتے ہو اور ضرور کرتے ہو عورتوں کی بدمزاجی، اُن کی خودرائی، اُنکی جہالت اور اُنکی ناجائز حمایت کا باعث، تم اور محض تم +

زمین کا کرہ آفتاب کے گرد یوں ہی چکر کاٹے گیا، اور آفتاب یوں ہی اپنے نقطے پر لٹو بنا رہا۔ گرمی آئی، برسات آئی، جاڑا آیا اور زمین پھر وہیں آگئی! موسم بدلے رُتیں پلٹیں، دن گزرے، اور سالہا سال کا زمانہ دیکھتے ہی دیکھتے ہَوا ہوگیا۔ ماں باپ کی لاڈلی خدیجہ، اور ستم نصیب زبیدہ بڑھیں، جوان ہوئیں اور پروان چڑھیں مگر محمود کی حالت نہ پلٹنی تھی اور نہ پلٹی۔ خدیجہ اگر زیادہ تر اپنے گھر رہتی تھی، تو زبیدہ اپنی لائق اور خداترس اُستانی کے ہاں۔ ان دونوں کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک ماں باپ کی لاڈلی، تنک مزاج، زود رنج، ضدن، سست، کاہل وجود، اپنے ہاتھ سے پکی پھلی نہ پھوڑنے والی، اور سب سے زیادہ یہ کہ چٹوری اور خراچ تھی: دن بھر میں خدا جھوٹ نہ بُلائے تو چار چار آنے کا چھنوں اور میٹھے پوری والیوں کی نذر کردینے، اُسکی معمولی بات تھی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑتی، اور ایسی بگڑتی کہ آؤ دیکھتی نہ تاؤ، سات پشتیں پُن ڈالتی، مردوں جیتوں کو گھسیٹ پھینکتی۔ اور دوسری مصیبت زدہ، جفاکش، نرم گفتار، شیریں کلام، صابر، اور نہایت باسلیقہ تھی، چھوٹے سے لگا بڑے تک، ہر ایک کے طعن و تشنیع

کا نشانہ بنتے بنتے، اُسمیں برداشت کی عادت بیحد ہوگئی تھی، کوڑی کوڑی جوڑنا، اور پھر اس سے اپنے لیئے خود ہی کچھ نہ کچھ سینا، بچپن سے اُسے کرنا پڑا تھا۔ وہ بے قصور دھمکائی جاتی تھی، اُسے پیٹ بھر روٹی نہ ملتی، وہ۔ماں توماں، خدیجہ کی سخت سُست سُنتی، مگر خدا اِسکا اجر دے۔ کیا مجال جو زبیدہ دم بھی مارتی ہو، اُف بھی کرتی ہو+

بیری کا درخت جہاں ہوگا پتھر ضرور آئینگے۔ اِن دونوں کے جوان ہوتے ہی، اِدھر اُدھر سے پیغام بھی آنے لگے۔ میاں محمود ایک عرصۂ دراز تک یوں ہی ٹلتے رہے۔ مگر آخر یہ دونوں بیٹیاں بنجُنی تو تھیں۔ ایک ساتھ دونوں کی نسبت ہوگئی زبیدہ کی جس سے بات ٹھیری وہ ایک قاضی صاحب کے صاحبزادے تھے، رشید اِن کا نام تھا اور انٹرنس کی سند بھی حاصل کر چکے تھے۔ مگر چونکہ قاضی صاحب کے ہاں، انکے اور انکی بہن کے سوائے۔ اولاد کا نام، اللہ کا نام تھا: اسلیئے رشید لاڈلے بھی تھے۔ اور تیز مزاج بھی، فضول خرچ بھی تھے اور زبان دراز بھی، ہاں البتہ خانصاحب کے فرزند ارجمند شیر علیخاں۔ جنسے خدیجہ کی منگنی ہوئی تھی، نہایت ہوشیار، عقلمند، دور اندیش، اور بفضلہ گریجوئٹ تھے، یہ خانصاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ تین بھائی اور ایک بہن اور اِن سے بڑے تھے۔+

ایک برس تک یہ نسبت ناتا، لینا دینا، تیج تہوار، ہوتا رہا۔ کہ عین رجب کے مہینے میں ایک ہفتہ کے تفاوت سے۔ پہلے خدیجہ اور پھر زبیدہ کا نکاح اور رخصت ہوگئی۔ مہر دونوں کا پانچ پانچ ہزار تھا، نان نفقہ کا کا غذ دونوں کے ہاں لکھا گیا، مگر ہاں فرق۔ اور بہت بڑا فرق۔ اگر تھا تو یہ ہی کہ خدیجہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی: اور زبیدہ کی شربت کے پیالہ پر، خدیجہ کو ماں باپ نے جوڑے، کپڑے، برتن بھانڈے بکس صندوق، چھپر کھٹ سب ہی کچھ دیا۔ مگر زبیدہ کو سوائے روزمرہ کے کپڑوں اور

"کھنڈرات مارٹنڈ"

ناظرین تاریخ ہند کے ابتدائی زمانے کی جنگ عظیم کو جو کہ پانڈوں اور کوروں کے درمیان ہوئی تھی بھولے نہونگے جسمیں پانڈوں نے فتح پائی۔ اور چند یوم کے بعد کشمیر کی طرف چلے گئے۔ اُنہوں نے یہاں پر بہت سے عالیشان مکانات تعمیر کیے۔ چنانچہ اُنمیں سے ایک مارٹنڈ بھی ہے جو افسوس اسوقت سوائے کھنڈرات اور پتھروں کے ڈھیر کے کچھ بھی نہیں ہے۔ تاہم یہ کھنڈرات ایک تاریخی عظمت رکھتے ہیں جنکو دیکھکر اُن مٹنے والوں کی شان و شوکت کا پتہ لگتا ہے۔ ٹوٹے پھوٹے مکانوں کے گرداگرد قریباً آٹھ سو گز کے محیط پر بڑے بڑے پتھروں کی نقش و نگار کی ہوئی دیوار کھڑی ہے جسکی چھت بھی بڑے بڑے جید پتھروں سے پٹی ہے جو اندر کی طرف اونچے اور بیل بوٹوں سے مزین ستونوں پر کھڑی ہے۔ یہ شکستہ مکان اب بھی ایک عالیشان عمارت ہے جس کی موجودہ اونچائی تقریباً ۵۰ فٹ ہے۔ بڑے بڑے پتھر لگے ہوئے ہیں۔ اور انسان اُنکی نفاست۔ چمک۔ صفائی۔ حجم اور بیل بوٹوں اور تصویروں کو دیکھکر عش عش کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ کون دیوزاد تھے جنہوں نے ایسے بڑے بڑے پتھروں کو اوپر چڑھایا۔ اور وہ کون مانی و بہزاد تھے جنہوں نے ایسی کاریگری سے تصویر اور بیل بوٹے تراشے ہیں۔ بعضوں پر چاند سورج کی تصویریں ہیں۔ بعضوں پر اوتاروں اور گائے بیل کی مورتیں کندہ ہیں۔ آگے چلکر تین کمرے ہیں جنکی دیواروں پر عجیب کاریگری سے نقش و نگار بنے ہیں۔ کہیں گلاب کے شگفتہ و ناشگفتہ پھول ہیں۔ کہ انسان کا دل بے اختیار توڑ کر سونگھنے کو چاہتا ہے کہیں نرگس ہے جسے دیکھکر انسان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رہجاتا ہے۔ اور کہیں یاسمن جسکو دیکھکر جی بے اختیار ہو جاتا ہے۔ غرض اس مٹی گارے کو دیکھکر

سیرِ گلشن کا سین آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ پاس ہی جانبِ شرق ایک پہاڑی ہے۔ جس میں ایک ایسا غار ہے جس کی انتہا آجتک کسی کو معلوم نہیں ہوئی۔ اگر کسی نے جرأت کی تو دس بارہ قدم چلا گیا۔ سُنا ہے کہ ایک دفعہ ایک سنیاسی اسمیں چلا گیا تھا جو پھر واپس نہیں نکلا۔ اسلیئے نہ معلوم کیا حشر ہوا ۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں ایک یوروپین سیاح ایم۔ روبرٹ پانچ آدمی اور ایک ہفتہ کی خوراک اور بہت سا تیل اور مشعلیں ساتھ لیکر اُسکی تحقیقات کو اندر گیا۔ تین یوم کے بعد واپس نکلا اور بیان کیا کہ قریبًا بیس میل آگے چلکر ایک بہت بڑا دریا حائل ہے جسکے پار جانا محال ہے ۔

ایک طالب علم ۔ از کشمیر

اصلاح رسوم :۔ بابو خورشید مرزا صاحب دہلوی نے اِس ناول میں اُن نقائص کو دکھایا ہے جو اولاد کی بلا رضامندی شادی کر دینے سے پیدا ہوتے ہیں ضمنًا یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بازاری کتابوں یعنی ناول وغیرہ کا مطالعہ لڑکیوں کے واسطے نہایت مضر ہے۔ مصنف نے اپنے مطالب بلحاظ شستگی زبان و پلاٹ نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیے ہیں لیکن ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر مرزا صاحب ایسے عمدہ اور نتیجہ خیز مضامین کو بجائے عشقیہ قصے کے کسی اور طریقے سے بیان کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ہمکو یہ بھی افسوس ہو کہ مصنف نے لکھائی چھپائی کی طرف توجہ نہ کی۔ بہرحال ہم خورشید مرزا صاحب کو اُنکی ابتدائی مشق پر مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی آیندہ تصنیف کے وقت ہماری صلاح پر بھی غور فرمائیں گے ضخامت ۸۴ صفحہ قیمت ۶ مصنف سے کھاری باولی دہلی کے پتہ پر ملتی ہے ۔

بلادِ اسلامیہ

سرزمیں دلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اِس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اِس خاک میں خیرالامم کے تاجدار نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار
دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہاں آباد بھی اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز لالۂ صحرائے یثرب یعنی تہذیبِ حجاز
خاک اُس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوشِ ارم جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبرؐ کے قدم
جس کے غنچے تھے چمن ساماں وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما اُن کا مدفن ہے یہی

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملّتِ بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
دورِ گردوں میں نمونے سیکڑوں تہذیب کے پل کے نکلے مادرِ ایّام کی آغوش سے
قبر اُس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نم ناک ہے

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار مہدیِ[1] امّت کی سطوت کا نشانِ پائدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گُل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوب[2] انصاری سے آتی ہے صدا

[1] محمد دوم فاتح قسطنطنیہ۔ جناب سرورِ کائنات کی ایک پیشین گوئی کے مطابق اِس عظیم الشان شہنشاہ کو مہدی کہنا چاہیے ۱۲ [2] قسطنطنیہ میں مدفون ہیں ۱۲

کشورِ اسلام کا ای مسلمو دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کی کشتِ خوں کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفی — دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں — اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی — جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
خشک لب انساں کو جسنے آبِ جاں پرور دیا — عقل کو آزادِ زنجیرِ توہم کر دیا
جسنے عہدِ وصل باندھا مدتِ دوراں کے ساتھ — جسنے پوری منصفی کی فطرتِ انساں کے ساتھ
جسکے ڈر سے وہم کا قصرِ کہن آئیں گرا — گردنِ انساں سے طوقِ رہبِ خود بیں گرا
نام لیوا جسکے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے — جانشیں قیصر کے وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام — ہند ہی بنیاد ہے اسکی نہ فارس ہے نہ شام
آہ! یثرب دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو — نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

گو مٹاتا بستیوں کا ہے شعارِ روزگار — عظمتِ ملت کی باقی یادگاریں ہیں ہزار
یہ ہویدا ہے کہیں مٹتے ہوئے آثار ہیں — یا نمایاں ہے کسی گرتی ہوئی دیواریں
اُجڑے گورستاں کی خاموشی سے ہم آغوش ہے — شانِ پیشیں اشکِ خونِ قوم سے گلپوش ہے
نالہ کرتی ہے کہیں خاموش سوتی ہے کہیں — اہلِ ملت کی فراموشی کو روتی ہے کہیں

جلوہ گاہیں اسکی ہیں اپنی زیارت کیلئے
اشکباری کے لیئے غم کی حکایت کیلئے

اقبال

ارمغانِ ناظر

ہمارے دیرینہ عنایت فرما چودھری خوشی محمد خاں صاحب (ناظر) بی اے مہتمم بندوبست وزیر لداخ نے مندرجہ ذیل نظم بھیجکر ہمیں ممنون فرمایا۔ ان کے کلام کے شائقین کی آنکھیں مدت سے منتظر تھیں کہ انکی نظم پھر مخزن میں نظر آئے۔ اپنے فرائض منصبی کی مصروفیت کیوجہ سے اُنہوں نے ایک عرصہ سے کوئی چیز نہیں لکھی تھی۔ حال میں وہ لداخ سے سرینگر آئے اور اپنے آقائے نامدار ہز ہائنس مہاراجہ صاحب بہادر والی جموں و کشمیر کے دربار میں حاضر ہوئے تو مہاراجہ صاحب نے فرمایا کہ آپ نذر منظوم پیش کیجئے۔ چودھری صاحب نے بھی رستہ میں اسکی فکر کی تھی چنانچہ نظم کے پڑھے جانیکے لیے ایک دربار خاص منعقد ہوا اور اسمیں اسکی بہت داد ملی۔ ایک یازدہ پارچہ کا خلعت فاخرہ بھی عطا ہوا۔ گو یہ صلہ ذات سرحد کی خدمات کا سمجھنا چاہیئے۔ تاہم قصیدے کے پیش ہونے پر اسکا عطا ہونا ایک گونہ انکی سخنوری کا بھی اعتراف ہے۔ نام کو تو یہ نظم قصیدہ ہے مگر حقیقت میں قدرتی جذبات کا فوٹو ہے اور مبالغہ و اغراق سے مبرا ہے جو مناظر رستہ میں نظر سے گزرے اور جن جذبات کا دل پر اثر ہوا اُنکو نظم میں ادا کرنے کی کوشش کیگئی ہے+

اے سارباں اُٹھائے۔ کب تک مہار دیکھیں ہم ہجر کے ستائے پھر کوئے یار دیکھیں

یہ دشت و سنگ دیکھا۔ اور گربہ تھنگ[1] دیکھا پھر لالہ زار دیکھیں۔ اور شالامار دیکھیں

پتھر کے دیکھنے سے پتھرا گئی ہیں آنکھیں اب آبشار دیکھیں۔ اور سبزہ زار دیکھیں

وہ ساعدِ حنائی۔ وہ شانِ دلربائی برگ چنار دیکھیں۔ یا دستِ یار دیکھیں

طاسِ زمرّدیں میں۔ الماس ہوں پریشاں پتّوں پہ ڈل[2] کے موتی جب آبدار دیکھیں

[1] تحصیل کرگل میں موضع کرگل کے متصل ایک وسیع لق ودق میدان کا نام گربہ تھنگ ہے ۱۲

[2] کشمیر جنت نظیر کی عدیم المثال جھیل کا نام ہے ۱۲

وہ راگ کی گھٹا سی - صحنِ چمن میں برسے | سرو و چنار ملکر - گاتے ملار دیکھیں

باغِ نشاط میں ہو - بزمِ نشاط برپا | ہر سمت چاریاری - زیرِ چنار دیکھیں

وہ حُسن کے نظارے وہ عشق کے شرارے | وہ برقرار دیکھیں - یہ بیقرار دیکھیں

انہار ہوں لبن کی - اقطار یاسمن کی | بو باس ہو چمن کی - گرگشت زار دیکھیں

چاندی اُچھالتی ہوں - نہریں اُچھل اُچھلکر | شاخ و شجر سے اُنپر - زر کا نثار دیکھیں

ہو جوگیا ہوا میں - اور بھیرویں فضا میں | وقتِ سحر نوا میں - دراج و سار دیکھیں

وہ وادیوں کا منظر - ہو غیرتِ تھیئٹر | نہروں کا ناچ مجرا - سرو و چنار دیکھیں

دریا کنار اُتریں - جنگل کی سبز پریاں | اور کالے دیو بنکر - سب یُوار دیکھیں

القصہ خشک و تر میں - ہر سنگ میں حجر میں | ہر برگ میں شجر میں - حسنِ نگار دیکھیں

ہر گل کے پیرہن میں - نسریں میں نسترن میں | ریحاں میں یاسمن میں - تصویرِ یار دیکھیں

وہ زوجیلے[1] کی چوٹی - ہے اپنا طور ناظر | سرکار کی تجلّی - واں آشکار دیکھیں

ہو برقِ لمعہ[2] افگن - روشن ہوں کوہ و برزن | جب شعلہ بار بام - واں نور و نار دیکھیں

دریا میں ہوں شکارے[3] - جیسے فلک پہ تارے | اِک آفتاب منزل - دریا کنار دیکھیں

موجوں کا تھم کے چلنا - سر سنگِ در پہ ملنا | پابوسِ آستان - شاہِ دیار دیکھیں

ماوائے داد خواہاں - ملجائے بے پناہاں | اِک قصر و بارگاہ - گردوں وقار دیکھیں

ہو تختِ خسروی پر - وہ شاہ جلوہ گستر | چہر نور سے اُسکے روشن - شہر و دیار دیکھیں

عاقل وزیر اُسکے - فاضل مشیر اُس کے | دانا دبیر اُسکے - مصرفِ کار دیکھیں

دستِ یمیں پہ اُسکے مسند پہ جلوہ فرما | سر راجہ معظم - دولت مدار دیکھیں

درشن کو تیرے شاہا آنکھیں ترس رہی ہیں | پرتاب تیرے رخ کا - اب لاکھ بار دیکھیں

---

[1] ایک سلسلہ کوہ جو وادی کشمیر کو ضلع لداخ سے جدا کرتا ہے ۱۲ [2] محلات شاہی لعدان کے قریب جو آ کی برقی روشنی کیطرف اشارہ ہے ۱۲ [3] چھوٹی کشتیاں ۱۲

ہو جنکو شوقِ جنت - یا آرزوے رضواں — اگر یہ شہر دیکھیں - یہ شہر یار دیکھیں

بیٹھے ہیں انجمن میں - پر ماتما ہی من میں — دستے بکار دیکھیں - اور دل بیار دیکھیں

پائیں گے کب جہاں میں - ایسا دلوں کا والی — گر دیکھے آج مشعل - شہر و دیار دیکھیں

ہے باغِ علم خنداں - کشتِ ہنر ہے سرسبز — ابر کرم کی تیرے - ہر سو بہار دیکھیں

علم و ہنر کی شاہا - ہر سو بہا سبیلیں — تا آنے والی نسلیں - یہ یادگار دیکھیں

دریاے بھی شکم سے - سلٹ[عله] نکل رہا ہے — اترے گا کوئی دن میں - اسکا بخار دیکھیں

امواجِ[عله] سمگیں کو - وہ ناچ ہے نچایا — فرمان شہ سے ہونگی - اب سیار دیکھیں

تو بزمِ قیصری کا - ہے کوکبِ درخشاں — کیونکر نہ تیرا پرتو - سب تاجدار دیکھیں

شاہنشہِ معظم - ہوں میہمان تیرے — فرزند شاہ تیرا - دارالقرار دیکھیں

یہ شعر روح پرور - ہیں کانِ دل کے گوہر — ہے طرفہ نذرِ ناظر - سب اہلکار دیکھیں

چرنوں سے تیرے شاہا - دوری ہوئی گو ضرور — ناظر کو دل سے حاضر - لیل و نہار دیکھیں

واپس چلے ہیں بن کو - صحرا نورد ناظر — پھر بزمِ خسروی کو - یا کردگار دیکھیں

قائم رہے الٰہی - یہ تاج و تختِ شاہی — یہ فرِّ بارگاہی - لیل و نہار دیکھیں

خوشی محمد ناظر - سٹلمنٹ افیسر وزیر[illegible]

تربتِ جاناں

(از داغ)

(شیخ محمد نصیب صاحب بیرسٹرایٹ لا کی خاص فرمائش سے)

ہوائیں ہو گئیں خاموش - وقت شام آ پہنچا — اندھیرا چھا گیا ہر سمت عالم ہے خموشی کا

نہیں پائے صبا تک کی ذرا آہٹ گلستاں میں — اسی عالم میں آ نکلا ہوں میں شہر خموشاں میں

[عله] بذریعہ ڈرجنگ مشین کے دریائے جہلم کو بارہ مولہ کے نیچے عمیق کیا جا رہا ہے تاکہ دریا کا بہاؤ صاف ہو جائے اور سیلاب کے سالانہ حملوں کا اندیشہ نہ رہے۔ [عله] کارخانہ طاقت برقی کی طرف اشارہ ہے جو رام پور میں کھولا گیا ہے۔

دلِ مہجور میں ایک لالۂ زارِ داغ لایا ہوں
میں اپنے گُل کی تربت پر چڑھانے پھول آیا ہوں

اب آرامیدہ ہے اس تنگ کاشانے میں وُہ ہستی
شعاعِ زندگی کل جسکے ذرّوں سے چمکتی تھی
غضب ہے ایسے حسن و ناز کا صیدِ قضا ہونا!
بایں اوصافِ محبوبی تہِ تیغِ فنا ہونا!

قضا اُس گلبدن پر رحم کھا کر کاش ٹلجاتی!
خدا کے حکم سے تحریرِ قسمت کی بدل جاتی!
تو گورستاں میں یُوں دُکھڑے نہ روتا میں حزیں ہو کر
نہ کہتا مرثیہ یوں آج میں اندوہگیں ہو کر

مگر رونے سے کیا حاصل؟ وہ روحِ نور تو یاں سے
گئی اُڑ کر کہیں اونچی مہ و مہرِ درخشاں سے
ملائک لیگئے باچشمِ گریاں اُسکو جنت میں
جہاں نیکوں کی روحیں تا ابد رہتی ہیں راحت میں

یہ جرأت کس طرح سے ہو سکے انسانِ فانی کو
کرے الزام خالق کے نظامِ جاودانی کو
سرِ تسلیم رکھوں گا سدا خاکِ اطاعت پر
سدا راضی رہوں گا اپنے مالک کی مشیت پر

مگر دل کو برابر دُھن ہے اُس گل کے محاسن کی
رہیگی یاد اُسکے حسنِ ظاہر حسنِ باطن کی
اُسی کی یاد میں اشکِ محبت میں بہاتا ہوں
تصور کو اُسکے تختِ دلپر میں بٹھاتا ہوں

(ماخوذ)

نیرنگ

آسمان

اے رفیع الدہر۔ عالی مرتبت۔ رفعت نشاں
عرش پر کیونکر نہ ہو تیرا دماغ اے آسماں
کچھ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں بالا ہے تو
عالمِ اسباب میں ہر ایک سے اعلیٰ ہے تو

معتبر لوگوں سے سنتے آئے ہیں پکھا نہیں تیرے ہی طبقات میں ہیں جنت خلد بریں
تجھ سے بڑھکر اور کس کی ہوگی شان محترم خالق کونین نے خود کھائی ہی تیری قسم
کیوں نہ برتر ہوکہ تو پیدا ہو کس کے لیے
شان میں لولاک فرمایا گیا جس کے لیے

عنصر پنجم[1] ہے موجودات کا تیرا وجود ذات ارفع سے ہی تیری بزم ہستی کی نمود
بسکہ قدرت کو ضروری خلقت افلاک تھی گر نہوتی ۔ تو زمیں اپنے لیے چہ خاک تھی
نور افشاں تیرا خورشید جہاں افروز ہے اے فلک ! یہ مہربانی تیری ہمیر روز ہے
نونہالان گلستاں گلبن رنگیں ادا سایۂ شفقت میں تیری پاتے ہیں نشو نما
ہاں ! تجھی پر ناز کرتا اُٹھتا ہے ابر بہار تیرے ہی پہلو میں مرتی ہی برق بیقرار
تیری فیاضی کا شہرہ شبنم تر نے کیا موتیوں سے دامن گلزار وصحرا بھر دیا
تیرے ہی دم سے بہار گلشن ایجاد ہے
تیری ہستی پر سراے دہر کی بنیاد ہے

تجھ سے ملنے کی ہر اک دل میں ہی پنہاں آرزو ای فلک ! اہل زمیں کی آنکھ کا تارا ہی تو
کوہ اٹھے ہیں مگر تجھسے رسائی کے لیے بحر کو بھی جزر و مد ہے آشنائی کے لیے
شعلہ تیری آرزو میں اُڑ گیا بنکر دھواں اس ہوا میں خاک ہی بن جائے خاک آستاں
تیرے چھونے کو بڑھائے بیشتر شاخوں نے ہاتھ دل لیے افسوس وحسرت سی مگر شاخوں نے ہاتھ
بام رفعت تک پہنچتے ہی نہیں اُڑکر طیور جسقدر بڑھتے ہیں وہ ۔ تو اور ہوجاتا ہی دور
تیرا طرز انکساری کیوں نہو عالم پسند
جھک کے ملتا ہے زمیں سے ہوکر اتنا سربلند

[1] ہندو فلسفہ میں بجاے اربعہ عناصر کے پانچ تتو مانے گئے ہیں مٹی ۔ پانی ۔ ہوا ۔ آگ ۔ اکاس یعنی خلا اور حواس خمسہ کی تطبیق انہیں پانچوں پر کیگئی ہے ۔

نت نئے دلچسپ منظر سامنے لاتا ہے تو　　طرفہ نیرنگِ طلسمِ دہر دکھلاتا ہے تو
صبحِ خنداں دیکھکر ہوتا ہے تجکو بھی سرور　　تیری کالی کالی صورت پر چمک اُٹھتا ہی نور
سانولی ہے پیاری پیاری شام تیری ای فلک　　شورافزا ہی غضب ہ حُسنِ ملیحی کا نمک
شوخیٔ رنگِ شفق کی دلفریبی کیا کہوں　　اس دلِ پرخوں کی اُس پر ناشکیبی کیا کہوں
تو نظر آتا ہی شب کو خیمۂ لیلائے شب　　اور تو ہر شب ہوا کرتا ہی بزم آرائی شب
سامنے ہی چاند سی اک دلربا صورت اگر　　اُسطرف پہلو میں اک زہرہ جبیں ہی جلوہ گر
آہ کیا عقدِ ثریا کا ہے طرزِ دلستاں　　محوِ نظارہ ادھر کرتا ہے حُسنِ کہکشاں
بحر و بر رکھتی ہے روشن تیری شمعِ ماہتاب　　جسکا جلوہ ہی نظر افروزِ چشمِ شیخ و شاب

وہ سماں حسرت فزا ہوتا ہے تیرا صبحدم
اہلِ محفل جبکہ رخصت ہونے لگتے ہیں بہم

آفت دوراں سُنی جاتی ہے ناسازی تری　　حشر کرتی ہے بپا فتنہ پردازی تری
یہ بھی شہرت ہی کہ تو اک بانیٔ بیداد ہے　　مہ جبینانِ ستم ایجاد کا اُستاد ہے
دہر میں غمدیدہ اکثر تیرے شاکی پائے ہیں　　تیری بیدردی کے افسانے زباں پر لائے ہیں
تیری گردش نے مٹائی سیکڑوں نام و نشاں　　کردیا برباد تو نے گلشنِ ہندوستاں
علم و فن میں اسکو اگلی سی فضیلت ہی نہیں　　بلکہ انسانوں میں باقی آدمیت بھی نہیں
تیری ناسازی سے دل ہر ایک کا باہم جدا　　تو موافق ہو زمینِ ہند سے بہرِ خدا

اوج و پستی تجھ سی ہیں تجھسے ہی نرم و سخت ہیں
تیرے سیارے فلک! اپنے نجومِ بخت ہیں

شرر۔ سہارنپوری

تصویری پوسٹ کارڈ کے جواب میں

مہربانانِ دوستانِ قدیم — لیجے صحرا نشیں کی بھی تسلیم

قُلّۂ کوہ پر براجیں آپ — دونوں ایسے کہ جیسے بھرت ملاپ

دوستانِ قدیم کا مجمع ق — ہمجلیسِ ندیم کا مجمع

ایک نعمت ہی ایک راحت ہی! — مجھ سے پوچھو تو یہی جنت ہی

ہمکو لیکن کہاں بھلا یہ نصیب — آدمی دور جانور ہیں قریب

اب تو بن باسی ہو گئے ہیں ہم — ہم ہیں اور مار و خرس اور ضیغم

یاد احباب اور صحرا ہے — زندگی کا عجیب نقشا ہے

کبھی آہو سے اور کبھی آہیں — کبھی روئیں کبھی تنسکار کریں

زندگی ایک آہ سے محدود — گر کرے کچھ تو موت ہی محدود

یہ تو جھگڑے سے چلے ہی جاتے ہیں — تازہ قصہ تمھیں سناتے ہیں

کارڈ وہ تم نے ہم کو بھیجا تھا (تصویری پوسٹ کارڈ) — جسمیں عاشق مراد پاتا تھا

تھا مئے وصل یار سے سرشار — لے کے بہلے شوق اور رخ یار!

یہ جو تصویر شوق افزا تھی — ٹھنڈے دل میں بھی آگ بھڑکاتی

اور فقرے تمھارے آتش بار — جو کہ کافور کو بنائیں شرار

دل کہ وہ ہو گیا تھا مخزنِ یاس — ہوئی آخر اسے ہوس کی پیاس

وہ بھی آخر بگفتۂ اقبال[1] ق — عقل کو چھوڑ کرکے دل کا خیال

لکھنؤ کی طرف روانہ ہوا — ہر ج اک سمت کا روانہ ہوا

[1] اقبال "اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل ۔ لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے"

پہنچا اُس جا کہ جو ہے معدنِ عیش | زن ہے لیلےٰ تو مرد مجنوں کیش
تم نے دی جو صلاح۔ کی تکمیل | امر ہائے شمار است تعمیل
بس وہاں زندگی گزاری ہے | اب تو پھر موت ہی کی باری ہے
وہی خیمہ ہے اور وہی میں ہوں | وہی ڈھوں ڈھال ہے اور وہی روں روں

صحرائی

کوئل

خوش خبر! طائرِ نو وارد و زیبا کوئل! | تُو نے بچپن سے مجھے "کوکو" سنایا کوئل!
تجکو طائر کہے اے میری دل آرا کوئل؟ | یا کہ "آوازِ پریشاں" تراشیدا کوئل!

گھاس سے فرش پہ جب بیٹھتا تھا میں جاکر | دل پہ کرتا تھا ترنم ترا جادو کا اثر
کیا ترنم تھا کہ باسرعتِ برقِ مضطر | کوہ و میداں میں ہوا جاتا تھا جلوہ گستر

میں نے مانا کہ تجھے وادیٔ گل ہے بھاتی | عشق کی بو ترے نغموں سے ہے پیہم آتی
کوک تیری ہے مری یاد میں لیکن لاتی | میری طفلی جو نہیں خواب میں بھی اب آتی

خیر مقدم ترا اے قاصدِ ایامِ بہار! | گوش شنوا کو سنا معنیٔ پیغامِ بہار
تو پرندہ نہیں اے طائرِ ہنگامِ بہار! | بلکہ پوشیدہ کوئی ہستی سربامِ بہار
(جو مغنی بھی ہے مطرب بھی گویا بھی ہے | جو ہے معشوق بھی اور عاشق شیدا بھی ہے)

تو مغنی ہے وہی ہائے تو مطرب ہے وہی | عہدِ مکتب میں صدا بھاتی تھی مجکو جسکی

تو گویا ہے وہی جسکی طلب جب ہوتی کوششیں ہوتی تھیں ناکام ہزاروں میری

میں نے ڈھونڈا تجھے ہرچند نہ پایا کوئل! سبزہ زاروں کو کیا گو تہ و بالا کوئل!
تو وہ امید ہے از بسکہ مری دل آرا کوئل! جسکا دیکھا نہ کسی شخص نے چہرا کوئل!
تو وہ معشوق ہے معشوق ہو جتنا کوئل! جستجو کر نہ سکی جسکا نظارا کوئل!

گرچہ طفلی نے کیا اب مجھے کنارا کوئل! تیرا نغمہ ہے مرا اب بھی سہارا کوئل!
ہائے زرین زمانہ وہ پیارا کوئل! پھر بھی پا سکتا ہوں تیرا تو خدا را کوئل!

ہو مبارک تجھے اس ہستی کا نقشا کوئل! حسب منشا ہی مگر تیرے یہ طبقہ کوئل!
ہم تو کہتے ہیں خیالی ہی یہ دنیا کوئل! تو "خیالی" کی پرستار ہی شیدا کوئل!
ہاں خیالی کو خیالی یہ محل جانے دو خوب گزرے گی جو مل بیٹھینگے دیوانے دو

(ورڈز ورتھ) شیخ غلام محمد طور بی اے کلاس

کوزۂ قند

حضرت بیان یزدانی مرحوم کے برادر خورد جناب سید حسین صاحب جو صوبجات متحدہ کی سروس میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز ہیں نہایت مہربانی سے حضرت بیان کا یہ قطعہ مندرجہ ذیل تمہید کے ساتھ ارسال فرماتے ہیں:-

غالب مرحوم ایک روز ایک جلسہ میں بمقام کلکتہ شریک تھے کسی ایک دوست نے نوی کرم حسین نے ایک چکنی ڈلی اپنے کف دست پر رکھکر غالب مرحوم سے کہا اسکی کچھ تشبیہات نظم کیجئے غالب نے وہیں بیٹھے بیٹھے وہ مشہور قطعہ نظم کیا جس کا پہلا

شعر یہ ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی + زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے

اسی طرح ایک مرتبہ میرے ماموں سید مہدی علی صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر جب کہ وہ کالپی ضلع جالون میں تحصیلدار تھے چند کوزہ ہائے قندِ کالپی برادر مرحوم سید محمد مرتضیٰ صاحب بیانؔ ویزدانی کو بھیجے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ قندِ کالپی اپنی عمدگی کے لیئے مشہور ہے اور کوزے کی شکل نصف دائرہ کی ہوتی ہے۔ برادر مرحوم نے اسی ردیف اور قافیہ اور بحر میں جسمیں غالب مرحوم نے قطعہ لکھا تھا۔ ایک قطعہ اسکی تشابیہہ میں لکھا جو ہدیۂ ناظرین ہے +

میرے محسن نے جو بھیجا ہی مجھے کوزۂ قند　　　بستہ اس کوزے میں احسان کا دریا کہیئے
سر فرو بردہ تفکر کہ اسے کیا لکھیے　　　لب فرو بستہ تکلم کہ اسے کیا کہیئے
سیر خمیازہ صد گونہ تمنا کیجے　　　کسی محبوب کا شیرین دہن وا کہیئے
معنی جوہرِ شفاف تماشا کیجے　　　صورتِ یوسفِ مصری کا ہیولا کہیئے
بصفا آئینۂ دستِ سکندر لکھیے　　　بضیا آئینہ دارِ کفِ موسیٰ کہیئے
قالبِ صنعتِ رخسارۂ سلماں لکھیے　　　ثار بیدانۂ پستانِ زلیخا کہیئے
نو گلِ کوزۂ گلزارِ ارم کیجے رقم　　　ساغرِ فضۂ فردوسِ مطرا کہیئے
خیمۂ گوہرِ حورانِ بہشتی لکھیے　　　کونگرہ بارگہ قیصر و کسرےٰ کہیئے
سینہ بندِ صنمِ پردہ نشیں کیجے فرض　　　کلۂ تازہ جوانانِ خود آرا کہیئے
گوے دستنبوے ہمائے طرب کیجے یقیں　　　جامِ سیماب اسے اربابِ عمل کا کہیئے
سیمگوں پلۂ میزانِ طبرزد لکھیے　　　نقرئی حقۂ پر لولوے لالا کہیئے
سپرِ تلخیٔ ایامِ مصیبت لکھیے　　　خودِ شمشیرِ سمِ آلودۂ ایذا کہیئے
جسمِ بیضۂ ماہی بس نگاریں لکھیے　　　غنچۂ آذوقۂ مرغانِ شکر خا کہیئے
منجلی پیکرِ ماہ شبِ ہفتم لکھیے　　　طرفہ قندیل درِ کعبۂ والا کہیئے
سُمِ سیمیں فرسِ چابک شیریں لکھیے　　　سرِ پرویزِ خیالِ شکر آما کہیئے

سنگ قالینِ سلاطینِ مظفر لکھیے | ساتگینِ طربِ سنجر و دارا کہیے
کیوں اِسے کیسۂ فلاک سے دیجے تشبیہ | کیوں اِسے بوتۂ سیماک سرِمانا کہیے
کیوں اِسے ساغرِ بلور سے بہتر لکھیے | کیوں اِسے کاسۂ فغفور سے بالا کہیے
کیوں اِسے تازہ حبابِ لبِ کوثر لکھیے | کیوں اِسے آمۂ شیرینیِ معنی کہیے
طبقِ سیم کو عرشِ صمدی کیجے فرض | اور اِسے قمقمۂ عرشِ معلّٰے کہیے

سید حسین

فعلِ حکیم

دوستوں میں ایکدن اِک فیلسوفِ دہر نے | باتیں کرتے کرتے اپنی یہ تمنا کی بیاں
کاش مجکو دے خدا اپنی خدائی اِک ذرا | کاش کردے میرے ذمہ عہدۂ خلقِ جہاں
سُن کے یہ پوچھا کسی نے اُس سے ہاں یہ تو کہو | ایسا ہو جائے تو پھر تم کیا کرو اے مہرباں
سر جُھکا کر دیر تک سوچا کیا مردِ حکیم | پھر مخاطب ہو کے سائل سے کیا اُس نے بیاں
میں نے کی ذرات موجودات کی اسوقت سیر | پھر گئے چشمِ تصور میں سب اسبابِ جہاں
میں نے دیکھا کوئی فعل اُس خالقِ افلاک کا | خالی از حکمت نہیں ہر شئے میں حکمت ہے نہاں
میں خدائی لیکے کر سکتا نہیں اُسکے خلاف | اُسکے ہر اِک فعل سے حکمت کی خوبی ہے عیاں
میں بھی ویسا ہی کرونگا جس طرح اُس نے کیا | وہ اگر دیدے مرے قبضہ میں قدرت کی عناں
اُس کی موقع پر عطا ہے اُس کا موقع پر کرم | اُسکی رحمت ہے بلا زحمت بلاشک بیگماں
ہے غضب اُسکا ادب آموزِ انساں کے لیئے | ہے امید عفو اُسسے موجبِ امن و اماں

کوئی فعل اس کا نہیں حکمت سے خالی اے ذہین
اُسکی حکمت ہی سے ہے نظمِ زمین و آسماں

سید غلام مصطفےٰ ذہین

تازہ غزلیں

وارفتہ تیری چال قیامت سے کم نہیں　　چلتی ہوئی ہے حشر کی آفت سے کم نہیں
ہیبت وہی ہے ہول وہی سختیاں وہی　　شامِ فراق صبحِ قیامت سے کم نہیں
ہنس ہنس کے چٹکیاں دلِ بیتاب میں نہ لے　　ظالم یہ اختلاط عداوت سے کم نہیں
اِسمیں بھری ہوئی ہیں سراپا کدورتیں　　دل بھی ہمارا شیشۂ ساعت سے کم نہیں
ہیں چاک چاک دامن و جیبِ قبائے گل　　دستِ صبا بھی پنجۂ وحشت سے کم نہیں
ہوتا ہے کیوں لہو مژۂ تر کا اپنی خشک　　خونِ جگر خدا کی عنایت سے کم نہیں
پھونکا ہے اسقدر نفسِ شعلہ بار نے　　دوزخ بھی تو مرے لیے جنت سے کم نہیں
تصویر گو ہے پیشِ نظر اُسکے ہجر میں　　دل کی تپش مگر کسی صورت سے کم نہیں
اے شوق ایسی رنجشِ بیجا کا کیا علاج　　شکرِ جفا بھی اُن کو شکایت سے کم نہیں

(شوق)

کیا کہنے ہیں بسمل کے سب کچھ اُسے حاصل ہے　　اک چاند ہے پہلو میں اک چاند مقابل ہے
پاکیزہ تمنائیں شائستہ مداراتیں　　اُس بت کی متانت سے سب کچھ مجھے حاصل ہے
بھرپور جوانی ہے اک دھوم ہے اُس بت کی　　دو چار نہیں شیدا عالم ہی کہ گھائل ہے
کیوں کہتے ہو ناحق منہ لگتے ہو کیوں اُسکے　　بسمل جسے کہتے ہیں دیوانہ سا سائل ہے
بیکار ندامت ہی بے وجہ ملامت ہے　　اب دل سے نکالو بھی کیا فائدہ حاصل ہے
اک کاش وہ کچھ سمجھیں اک کاش وہ کچھ پوچھیں　　بیٹھو دلِ بسمل اُن آنکھوں پہ مائل ہے
محفل کی ملاقاتیں اب ڈھونڈتی ہیں خلوت　　الفت ہی امنگوں پر اب چھپنے کے قابل ہے
ہنس بول کے یوں خالی دن گزرے تو کیا گزرے　　کچھ وصل کے سامان ہوں چاہت کا جو حاصل ہے
مرتا ہوں فصاحت پر اس جانِ لیاقت کے　　مطلع ہی سن کر وہ کہتا ہے کہ بسمل ہے

(بسمل)

سوئے گلشن جاتے ہیں ابرِ بہار ساتھ ہے — آج اک ہنگامۂ محشر ہمارے ساتھ ہے

بندہ پرور اب تو عذرِ قتل سے کیجیے معاف — لیجیے یہ تیغ یہ خنجر ہمارے ساتھ ہے

ہوشیار اے شہرِ خاموشاں کے لوگو ہوشیار — دفن ہوتے ہیں دلِ مضطر ہمارے ساتھ ہے

ہو رہی ہے آئینہ بندی میانِ بزمِ دوست — کوئی شے شیشہ سے بھی بہتر ہمارے ساتھ ہے

جستجو سے چارہ گر ہیں ہم کیوں برباد ہو — درد دل میں اور دلِ مضطر ہمارے ساتھ ہے

مصلحت اندیشیِ ناصح پتھر یہاں جا سیئے — کیا کہوں کیوں شیشہ و ساغر ہمارے ساتھ ہے

روکنا دل کا محبت میں ہے کچھ جذبات خاص — یہ نہ پوچھو آج تک کیونکر ہمارے ساتھ ہے

خیر تیرا حکم بھی جائے جہنم کی طرف — دیکھا جائے گا کہ چشمِ تر ہمارے ساتھ ہے

سانس لینا ہے گویا و شور اللہ رے کشمکش — یہ رگِ دل ہے کہ اک نشتر ہمارے ساتھ ہے

عشق کی دیوانگی سے بچ تنہائی مٹا — جس طرف جاتے ہیں ہم دنیا ہمارے ساتھ ہے

جانے دیتا ہی نہیں دربان بزمِ دوست میں — کوئی تو فتنہ گر محشر ہمارے ساتھ ہے

(اشتر)

شکوۂ ترکِ ملاقات نہ نکلے منہ سے — دم نکل جائے مگر بات نہ نکلے منہ سے

سو سنا کر وہ مجھے ایک سبیتے کی سن لیں — بات اس پر بھی کہ پھر بات نہ نکلے منہ سے

ایسی کچھ مجھکو پلا دے کہ خبر ہی نہ رہے — حال اپنا کسی سے پیرِ خرابات نہ نکلے منہ سے

ضبطِ غم کا یہ تقاضا ہے کہ دم گھٹتا ہو — کوئی سی بات بھی دن رات نہ نکلے منہ سے

خوش ہوں دل یہ حسرت ہو کہ وہ جان مانگیں — کوئی تحفہ کوئی سوغات نہ نکلے منہ سے

بے اثر بھی گر ہو جاتا تھا دل تو ہلکا — آہ اب اتنی بھی ہیہات نہ نکلے منہ سے

دن کہیں وہ تو ہے دن رات ہے گر رات کہیں — کوئی جی ہاں کے سوا بات نہ نکلے منہ سے

بزمِ دشمن میں مخاطب تو ہوئے ہیں وہ مگر — سخن پرسشِ حالات نہ نکلے منہ سے

ہمنشیں پوچھ نہ کچھ قصۂ رسمِ دشمن — کیا کہوں ناک کہ جو بات نہ نکلے منہ سے

جفا کی قدر گھٹتی ہے وفا ہی سے اُترتی ہے
ہمارے ساتھ دنیا سے محبت کوچ کرتی ہے

عدو کے ہو لیے جب تم ہمارا حال کیوں پوچھو
اب اسکا ذکر کیا جو کچھ گزرتی ہے گزرتی ہے

سلیقہ شرط ہے رسمِ محبت کے برتنے کا
اِسی سے نام ہوتا ہے یہی بدنام کرتی ہے

چھڑایا جام مینوشوں کا ساتھ اپنی نفاست نے
یہاں کب ایسی ویسی حلق کے نیچے اترتی ہے

دکھاتا ہے طلسمِ طرفہ اُن زلفوں کا بھی عالم
بگڑنے پر جو بنتی ہے بکھرنے پر سنورتی ہے

بہت دشوار ہے نو دولتوں کا آپ میں رہنا
چڑھی کچے گھڑے کی جب تو مشکل سے اترتی ہے

سنایا ہے مجھے یہ بارہا آئینے پر رکھکر
ارے دیدار کے بھوکے تری نیت بھی بھرتی ہے

ٹپکتی ہے بناوٹ اُنکی ہر تحریر سے پھر بھی
کوئی دم خط کے آئینے سے طبیعت تو ٹھہرتی ہے

حفیظ اللہ پر چھوڑو دوائے دردِ دل کب تک
سُنا ہے خود طبیعت بھی مرض کو دفع کرتی ہے

جام لا ساقی کہ کارِ عاشقی آساں نہیں
اے خوشا وہ دل کہ جس دل میں کوئی ارماں نہیں

جلوہ فرمائے۔ ادائے پرفن پنہاں نہیں
سرنگونِ شوق ہوں شرمندۂ احساں نہیں

انتظارِ حشر بھی ہے اک حجابِ آرزو
ورنہ جور پردہ داری شیوۂ جاناں نہیں

اس سراپا لطف سے کیوں نے نیازی کے گلے
جذبِ دل پنہاں بجوشِ دیدۂ گریاں نہیں

اضطرابِ عاشقی صرفِ تمنا ہو چکا
مدتیں گزریں کہ وہ بیتابیِ ہجراں نہیں

اک ذرا اس مستِ صہبا کو خدارا دیکھیو
وہ لبِ خنداں نہیں وہ شوخیِ مژگاں نہیں

بے تکلف ہوں کہ ہوں بیگانۂ رسمِ ریا
کافرِ عشق بتاں ہوں بندۂ ایماں نہیں

آمد آمد ہے اُسی نورِ قیامت خیز کی
آفتابِ حشر غیر از دیدۂ حیراں نہیں

غیرِ حرماں کچھ نہیں آغازِ انجامِ وفا
ہاں سرانجامِ وفا جز تلخیِ حرماں نہیں

کیوں زمانے نے کیا وقفِ پریشانی مجھے
گیسوئے جاناں نہیں میں نکہتِ بستاں نہیں

اے ترا نقشِ کفِ پا سجدہ گاہِ آرزو
کون سر ہے جو ترا سنگِ درِ ایواں نہیں

اے ترا عکسِ تصور سرمۂ چشمِ خیال
کون دل ہے جستجو میں تری حیراں نہیں



ہز امپیریل مجسٹی عبدالحمید خاں سلطان ٹرکی

مخزن

سلطان عبدالحمید کی معزولی

زمانہ حال کی تاریخ میں کوئی ایک واقعہ شاید اہمیت میں سلطان عبدالحمید کی معزولی سے بڑھکر نہوگا۔ سارا جہان انگشت بدنداں ہے کہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا۔ مانا کہ وہ جماعت جو "اتحاد و ترقی" کے نام سے قائم ہے زور پکڑ گئی تھی اور فوج کا ایک معقول حصہ اُسکے ساتھ تھا۔ مگر اس طرح ایک چشم زدن میں تینتیس سال کے تسلط کا خاتمہ کردینا باہمہ زور و قوت۔ اُن کے بس کا کام نہ تھا۔ اگر خود سلطان عبدالحمید ہی رضا بہ قضا تخت و تاج کو چھوڑنا منظور نہ کرلیتا۔ چند مہینوں کے اندر اندر عثمانیوں نے دو مرتبہ مہذب دنیا کو متحیر کردیا ہے۔ اول جب اُنھوں نے سلطان سے دستوری حکومت مانگی۔ اور بے کشت و خون کے حاصل کرلی۔ اور دوسرے جب سلطان کے اقتدار کو دستوری حکومت کی پہلی قربانی بنایا۔ یہ دونوں واقعات تاریخی اعتبار سے اہم تو ہر حال میں ہوتے۔ مگر انہیں عجیب سلطان عبدالحمید ہی نے بنایا۔ اُس کی دور اندیشی۔ اُسکے تدبر۔ اُسکی وطن پرستی نے اُسے مجبور کیا کہ وہ فریق انقلاب پسند کے مُنہ سے آئین کا نام سنتے ہی آئینی حکومت جس کا آغاز اُسکے سنہ جلوس سے

ہوا تھا۔ اور جو اُس نے بعد ازاں قبل از وقت سمجھ کر چھین لی تھی بحال کر دے۔ اُس نے جب دیکھا کہ لوگوں کا میلان اس طرزِ حکومت کی طرف عام ہے۔ اسکے حامیوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور انکی طاقت بھی معقول ہو گئی ہے۔ اب زیادہ دیر ان کو اس مدعا کے حصول سے باز رکھنا سخت خانہ جنگی اور خونریزی کا باعث ہوگا۔ تو نہایت فیاضانہ دانشمندی سے دستور و آئین کو رواج دے دیا۔ ورنہ اگر وہ اَڑ جاتا اور اتحاد و ترقی کی کمیٹی کو بزور اپنا مقصد حاصل کرنا پڑتا تو کمیٹی کو بے انتہا مشکلات پیش آتیں۔ اور دیر تک جانیں لڑانے کے بعد اور ملک کو طرح طرح کے خطرات میں ڈالنے کے بعد بھی انکی کامیابی یقینی نہ تھی۔ ممکن تھا کہ جیت اُن کی رہتی لیکن عبدالحمید جیسے زبردست سلطان کے مقابلے میں ہار بھی ناممکن نہ تھی۔ سلطان کی ایک "ہاں" نے ملک کو اور اہلِ ملک کو اس آفت سے بچا لیا۔ بلکہ یورپ بھر میں ترکوں کی حُسنِ تدبیر اور خوش فہمی کی دھاک بیٹھ گئی۔ ٹرکی کے قریب ترین شورہ پشت ہمسایوں کے سوا جو پرانی شکستوں کی خلش سینوں میں لئے بیٹھے تھے اور موقع پا کر خودمختار بن گئے۔ تمام دول یورپ نے متفق اللفظ ہو کر سلطان اور اسکی رعایا دونوں کو مرحبا کہا اور مخالفت یا بے پروائی کی بجائے ٹرکی کی موافقت اور ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے۔۔ اس طرح سلطان نے بغیر کشت و خون کے معزولی گوارا کر لینے سے دوبارہ دنیا کو دنگ کر دیا ہے اور اپنی جبلی بڑائی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ یقینی طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ قسطنطنیہ میں اس معزولی سے تھوڑے دن پہلے جو فساد ہوا تھا۔ اور فوج کے ایک حصہ نے بغاوت کر کے وزارت بزور بدلوائی تھی۔ اسمیں سلطان کا ایما تھا۔ مگر اسمیں شک نہیں کہ "ترقی و اتحاد" کی کمیٹی کو ضرور سلطان پر یہ شبہ ہوا اور اسی وجہ سے اُنہوں نے دستوری حکومت کی حفاظت کے لئے سلطان کو تخت سے اُترنے پر مجبور کیا۔ علمائے فتوے کا جو بہانہ کیا گیا ہے وہ ایک ایسی چال ہے

کہ اسے معمولی سے معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ یہ شبہ بالکل بے جا نہ تھا تو بھی یہ کہنا پڑے گا کہ سلطان نے اس موقع پر خونریزی کے روکنے سے ملک اور اہل ملک پر ایسا احسان کیا ہے جو کسی ایسے قصور کی جو اس شبہہ پر مبنی ہو تلافی کرتا ہے۔ عبد الحمید اُترنے کو تو تخت سے اُتر گیا۔ مگر اس اُترنے سے بھی صفحہ تاریخ پر ایک ایسا گہرا نقش چھوڑ گیا ہے۔ جو دیر تک قائم رہیگا۔

سلطان عبد الحمید کے دور حکومت اور ذاتی خصائل کے متعلق ایک مختصر رائے میں نے اپنی کتاب "مقام خلافت" میں لکھی تھی۔ چونکہ اب بھی میری رائے وہی ہے اسلیئے یہاں اُسکا نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:۔

"بہ حیثیت مجموعی سلطان عبد الحمید خاں ایک نہایت قابل تعظیم سلطان ہیں جن کے ساتھ اُنکے اکثر ابنائے زمان ناانصافی کرتے ہیں۔ وہ اپنی عادات اور طریق بود و باش میں نہایت سادہ اور بہت سے شاہان سلف کا نمونہ ہیں۔ اُنکے مزاج میں غرور بالکل نہیں۔ نہایت رقیق القلب اور فیاض طبع ہیں۔ اسلام سے سچی محبت رکھتے ہیں۔ اور اسکے ساتھ غیر مسلم رعایا کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ امور خارجیہ میں اُنکی طبیعت خوب لڑتی ہے اور اسی لیئے عملاً وہ اپنے وزیر خارجیہ آپ ہیں۔ اور اگر یہ خیال ملحوظ رہے کہ جب وہ تخت پر بیٹھے ترکی کے اکثر شاہزادوں کی طرح باقاعدہ اور اعلے تعلیم سے محروم تھے تو اُنکی لیاقت کی اور بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ اُنکے بعد امور خارجیہ کا ایسا سمجھنے والا ترکی کو پھر نصیب نہیں ہوگا۔ خود علوم جدیدہ سے واقف نہ ہونیکے باوجود ملک میں تعلیم کو رواج دینا اور خزانہ سلطنت سے ایک بیش قرار رقم ہر سال اخراجات تعلیم کے لیئے جدا کر دینا بھی ایک ایسا کام ہے جسکی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ اس سلسلہ تعلیم کے ذریعے جو دور حمیدیہ میں بہ نسبت سابق بہت ترقی پا گیا

ہزاروں آدمی کاروبار ملکی میں حصہ لینے کے لیئے تیار ہوگئے"۔

عجیب بات ہے کہ سلطان عبدالحمید کی شکل و شباہت کے متعلق بھی دنیا میں ایسے ہی مختلف بیانات مروج رہے ہیں۔ جیسے انکی لیاقت اور طرز حکومت کے متعلق۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انہیں تصویر کھنچوانے سے ایک طبعی نفرت تھی اور وہ نہ چاہتے تھے کہ ہماری تصویریں اخبارات میں شائع ہوں۔ اسلیئے انکی کوئی صحیح تصویر دستیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ سلاملق کے موقع پر جب وہ نماز جمعہ کے لیئے محل سے برآمد ہوتے تھے تو اہلکار نہایت احتیاط سے اس بات کی نگرانی کرتے تھے کہ کوئی تماشائی اپنے ساتھ فوٹو کا سامان یا فوری فوٹو لینے کا چھوٹا کیمرہ نہ اٹھا لایا ہو۔ بارہا ایسا ہوا کہ یورپ کے صاحبان اخبار نے اپنے خاص آدمی اس غرض کے لیئے بھیجے کہ وہ کسی طرح سلطان عبدالحمید کی صحیح تصویر لے آئیں مگر وہ اسمیں کامیاب نہیں ہوئے کوئی برس ڈیڑھ برس ہوا ایک تصویر انگلستان کے ایک ماہوار رسالے میں شائع ہوئی تھی جسکی بابت یہ دعوٰے کیا گیا تھا کہ یہ درست ہے اور خاص اہتمام سے بصرف زر کثیر حاصل کیگئی ہے۔ مگر میں نے اس تصویر کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ بالکل جھوٹا دعوٰے ہے۔ اور مدعی نے نہ صرف عوام کو دھوکا دیا ہے بلکہ خود صاحب رسالہ کو ناحق لوٹ لیا ہے۔ میں جب انگلستان سے بہ عزم سفر ٹرکی روانہ ہونے کو تھا تو مجھے وہاں کے ایک اخبار نویس دوست نے کہا کہ اگر تم وہاں سے سلطان کی صحیح تصویر لا سکو تو جو دام مانگوگے دلا دیں گے۔ میں نے کہا کوشش کروں گا۔ استانبول جانے پر معلوم ہوا کہ کوئی تصویر موجود نہیں اور میسر نہیں آسکتی۔ میں نے اپنے دوست سے آکر کہہ دیا کہ تصویر تو نہیں ملی۔ مگر اتفاق کی بات ہے کہ میں نے ایک فرانسیسی کتاب کے سرورق پر سلطان کی تصویر دیکھی ہے جسے میں مطابق اصل کہہ سکتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کسی استاد فن نے سلطان کو کئی بار دیکھکر ہاتھ سے بنائی ہے۔ اور پھر اسکی نقلیں چھاپی گئی ہیں

میرے اخبار نویس دوست نے کہا کہ اس کتاب کا پتہ بتا دو اور یہ بیان لکھوا دو کہ تم سلطان کو اچھی طرح دیکھ چکے ہو اور یہ وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ یہ تصویر ان سے شباہت رکھتی ہے تو اتنی بات کے لیے بھی پانچ دس اشرفیاں تمہیں دلا دوں گا۔ میں نے کہا کہ مجھے یہ منظور نہیں کیونکہ استانبول میں سلطان نے مجھے نشان عثمانی دیکر یہ اظہار عنایت کیا۔ میرے لیے زیبا نہیں کہ میں انکی مرضی کے خلاف انکی تصویر کی اشاعت کا باعث ہوں۔ اور اسی لیے میں نے "مقام خلافت" میں اسکے چھپوانے کا خیال چھوڑ دیا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ غلط تصویریں درست بھی جاری ہیں۔ تب خیال ہوا کہ جسکو میں درست جانتا ہوں وہ چھپوا دینی چاہیے۔ اسکی پلیٹ بنوانیکے لیے کلکتہ کے ایک کارخانہ کو لکھا اور تصویر ساتھ بھیجی۔ سوء اتفاق سے وہ تصویر صاحب کارخانہ نے کھودی۔ اب اسکی ایک اور نقل تلاش کی ہے۔ اور وہ اس سالے کے ساتھ شائع کیجاتی ہے۔ حال میں دستوری حکومت کے اعلان کے بعد چند اور تصویریں بھی شائع ہوئی ہیں جو درست کہی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ غالباً ان آخری دنوں میں سلاطین کے موقع پر وہ روک تھام نہیں رہی ہو گی جو پہلے تھی +

عبد القادر

جب سٹیفنسن کو بہادران کلونہ نے گرفتار کر لیا تو اس سے سب نے متفق ہوکر پوچھا کہ اس وقت وہ قلعہ جسپر تجکو گھمنڈ تھا کیا ہوا؟ سٹیفنسن نے بہادروں کی طرف حقارت سے دیکھا اور دلیرانہ جوش سے دل پہ ہاتھ رکھکر جواب دیا وہ قلعہ یہ موجود ہے" +

ملکۂ محبت

آفتاب و ماہتاب کچھ کے کچھ ہو جائیں۔ زمانہ کی رفتار میلوں اور کوسوں آگے بڑھ جائے آسمان کروڑوں برس گردش میں رہے اور زمین چکروں پر چکر کاٹے مگر قانون قدرت کے سنگلاخ پہاڑ اپنی جگہ سے سرکنے والے نہیں۔ چاند کی آب و تاب تاروں کی چمک دمک سورج کی طلوع غروب کی سمتیں جو آج سے ہزار برس پہلے تھیں وہی آج ہیں اور اُس وقت تک اسی طرح رہیں گی جبتک کسی ستارہ کی ٹکر یا صانع حقیقی کا حکم ان تمام اسباب کا خاتمہ نہ کردے۔

کائنات دہر کے متضاد نتائج حیات انسانی کی مختلف حالتیں انواع و اقسام کے تماشے رنگ برنگ کی کیفیتیں پیش خیمہ ہیں اُس انقلاب کا جو عمر کے باقی حصہ میں ہونیوالا ہے اور خبریں ہیں اُس وقت کی جب جسد خاکی ان تغیرات سے بے تعلق ہوگا

یہ واقعات اگر صنعت تسلیم کر لیئے جائیں تو لاجرم اسکا صانع ماننا پڑے گا؛ وہ نیچر ہو یا خدا۔ مگر اس استادی کے قائل ہیں کہ باعتبار ضرورت پارس بنا کر بھیجا اور کندن بنا کر چھوڑا! کچھ ایسا دلچسپی کے سانچے میں ڈھالا کہ اس حیات ناپائدار پر کیسی ہی تکلیفیں اور کتنی ہی پریشانیاں کیوں نہ گزریں آفتوں پر آفتیں آئیں مصیبتوں پر مصیبتیں ٹوٹیں چاہو کہ اس پیرزال کی نیرنگیوں سے دل اکتا جائے ممکن نہیں۔

اسی نظرگاہ راحت و عیش میں جہاں بلب گاجے کے غل غپاڑے سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ وہاں شہر سے باہر ایک کونہ میں چھوٹا سا قبرستان بھی ہے جسمیں ٹوٹی پھوٹی پرانی قبریں ان خوشیوں کی بے ثباتی کا پتہ دے رہی ہیں؛ یہ مٹی ہوئی صورتیں جو آج اس سنسان میدان اور ہو کے عالم میں بیخبر پڑی ہیں کل اسی نظرگاہ میں شاداں و فرحاں پھر رہی تھیں۔ فارغ البالی کے چنور اُن کے سروں پر سایہ کیے تھے اور حیات مستعار ان پر راحت و اطمینان کے پھول برسا رہی تھی

عزیزو! تعلقات کا اثر جیسا تم پر ہے ایسا ہی انپر بھی تھا جس طرح تمہارے دلوں میں ارمان ہیں انکے بھی تھے! بادِ صبا کی اٹکھیلیاں جسطرح تمہارے ساتھ ہیں اسیطرح انکے ساتھ بھی تھیں۔ یہ ہی چاند تارے جو آج تمہارے سامنے ہیں انکے سروں پر بھی تھے! قدرت کی تمام دلچسپیاں جوں کی توں ہیں مگر اسکی بہار دیکھنے والے بدل گئے! یہ نیند کے متوالے جن کے ڈھیر پیشِ نظر ہیں۔ اس فراق ابدی سے خوش نہ تھے! جاگ سکیں تو انکو اُٹھاؤ اور ان سے پوچھو۔ کس واں سے گئے اور کس حال میں ہے! بڑی طاقتور تھی وہ چیز جو ان غریبوں کو ایسی چہل پہل سے اُٹھا لائی۔ اور اس جنگل بیابان میں لا بسایا۔ فاختہ کی کوکو نے ان نو وارد مہمانوں کو لوری دی املی اور نیم کی پتیاں انکو تھپکنے لگیں! گو یہ پیاری صورتیں ہمیشہ کو چھوٹ گئیں انکے شکوے شکایت سب ختم ہوئے۔ اور اب ہمیں انسے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں مگر نہیں! کبھی تو انکی بھی خاطر منظور تھی! زندوں کی ملاقات کا لطف تو بہت اُٹھایا۔ آؤ آج ان مُردوں کی صحبت میں بھی شریک ہوں +

کیسی با رونق محفل جمی ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے بڈھے جوان ایک لباس ایک وضع ایک قطع ننگے سر ننگے پاؤں اپنے اپنے کارناموں پر فخر کر رہے ہیں! بہت سے خلق و محبت کے بندے ہیں جو اپنی بیش بہا زندگی دوسروں پر نثار کر گئے۔ گو خالی ہاتھ رہے اور خالی ہاتھ آئے مگر ایسے خزانے اپنے ساتھ لائے جو کبھی ختم ہونیوالے نہیں۔ کیسے مستقل مزاج لوگ تھے مصیبتیں جھیلیں آفتیں بھگتیں مفلس بنے قلاش مرے مگر خلوص کے لہلہاتے پھول جو ماں کے پیٹ سے لائے تھے۔ اُنہیں نہ مرجھانے دیا! دیکھو اہل نظر غور سے دیکھو! زندگی کا سہرا نہیں کے سر ہے جیتے جی تو انکی کچھ وقعت نہ تھی مگر آج انکی صورتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ بڑے بڑے عبادتگزاروں کی ٹکٹکی انکے چہروں پر بندھی ہوئی ہے اور یہ

آنکھ اُٹھاکر بھی نہیں دیکھتے! حاصل عمر دوسروں کی نذر کر دیا۔ عزت کے خواہاں رہے نہ دولت کے طالب۔ انکی آرزو۔ انکے ارمان۔ انکی خواہشیں انکی اُمنگیں جو کچھ تھیں یہ تھیں کہ دوستوں کا دم بھرتے پیاروں کا نام لیتے دنیا سے رخصت ہوجائیں! خوش نصیب تھے یہ آپ اور غنیمت تھی انکی زندگی!

جنگل بسانے والو! گو ہم سے رخصت ہوگئے اور ایسے رخصت ہوئے کہ اب نظر نہ آوٗگے۔ مگر زیست تھی تو تمھاری۔ اور انسان تھے تو تم۔ یہ چوتھی کی دلہن یہ حسین ملکہ جو آج سنہری کٹہرے میں تمہارے پاس آرام کر رہی ہے تمہارے ہی قابل تھی۔ اب اسکے قدردان کہاں اور پوچھنے والے کدھر۔ خدا جانے کس صورت شکل کی عورت ہوگی جسکی قبر پر یہ کچھ نور برس رہا ہے۔ دو رویہ گھملوں کی قطاریں رنگ برنگ کے پھول مقناطیسی اثر دکھا رہے ہیں۔ سرھانے سنگ مرمر کا ایک پتھر ہے جسپر کندہ ہے "**ملکہ محبت کی آرامگاہ**"+

راشد الخیری

غزل

آنکھ بھی سونے نہیں دیتی ہے کمخوابی مری
راہ پر آخر لگا لائی ہے بیتابی مری

ایک بوسے سے شگفتہ ہوگیا عاشق کا دل
رنگ روئے یار کا پرتو ہے شادابی مری

مضطرب ڈھونڈھوگے لیکن میں ملونگا کب تمہیں
رنگ لائیگی صف محشر میں نایابی مری

میں نہ تڑپا زیر خنجر دست قاتل رہگیا
منفعل کرتی ہے انکو حسن آدابی مری

گریہ بیتاب سے میرے گئے وہ بھی کھٹک
مجکو بھی رسوا کریگی یہ تنک آبی مری

بیقرار سی ہے مری انکے تلون کی شبیہ
ہے حریف خاطر دلدار سیمابی مری

میں نے بسمل سیکڑوں رندوں کو ساقی کردیا
ہو مسلم آجتک رندوں میں نوابی مری

امین الحسن رضوی بسمل

پُرانی چاشنی

دیکھئے بی البیلی شوخ اور وضعدار بی آجکل کی اُردو بیگم اپنی بزرگ نمدرستے پیٹے کی سادی اردو خانم کی کیسی آؤ بھگت کرتی ہیں! مُنہ بھی لگاتی ہیں یا نہیں بھلا اپنی وضعداری اور طمطراق کے آگے اُنکی سادگی اور ہلکی ہلکی سُلجھی سُلجھی باتیں کیا بھلی معلوم ہونگی۔ اُس وقت کا چٹپٹا پن اب تو کچھ پھیکا سیٹھا ہی سمجھا جائے گا سرکہ کی چٹنی کے آگے سونٹھ پانی کو کون پوچھے۔

مگر اسمیں کلام نہیں کہ پُرانی اردو نثر بہت ہی دلچسپ ہے۔ اُسکی سادگی بہت شاندار اور اُسکی بناوٹ میں بھی سادگی ہے۔ وہ لمبی گدہ ہیں گو اضافی ترکیبوں، بکثرت عربی اور فارسی لفظوں کے بغیر بھی ایک معقول حدتک اعلیٰ اور جدید خیالات کی متحمل ہوسکتی ہے۔ اور ایسے افکار کو ادا کرسکتی ہے۔ وہ مقفیات سے جنکو رسکن "لفظوں کی وحشیانہ جھنکار" سے تعبیر کرتا ہے اور اُس سے بھی زیادہ بُرے بلکہ ذلیل، اُس طرزِ کلام سے مبرا ہے جسکو اُسکے اہل صنعت کے نام سے فخریہ یاد کرتے ہیں۔ اور جسکو صحیح مذاق والے بچوں کی سی باتیں سمجھتے ہیں یعنی ذومعنی الفاظ اور فقرے۔ جس مضمون کے لیئے یہ سطریں مقدمہ کا کام دیتی ہیں وہ پُرانی اردو کا ایک دل لُبھانے والا نمونہ ہے۔ سیدھے سیدھے متداول اور عام فہم الفاظ جملوں کی سادہ ساخت کا "کے" "کی" اور "نیچ" کے سادے پیارے پیارے آویزے پڑے ہوئے، پُرانی بندشوں میں عبارت کی روانی، اور روانی کے ساتھ مجموعی حیثیت اور شان، کلام کا پورا اثر، ایسا کہ مُنہ سے نکلے اور دل میں اُترے اور تاثر کرے۔ اور پھر محض پھیکی سادگی ہی نہیں بلکہ وہ سادگی جسمیں کسیقدر چٹپٹے پن

کی بھی چاشنی، جس میں پرانی وضع کی شوخی سموئی ہوئی ہو۔ یہ اس مضمون اور عبارت
کی خوبی ہے۔ مخزن میں جو ہر مہینے حدیث اردو اور اسکی ہی کئی وضع کی جھلک دکھاتا ہے
ساتھ کے ساتھ اس پرانی جھلک کا ہویدا ہونا اس مضمون کی دلچسپی کو دوبالا کرے گا۔
ایک یہ بات بھی نظر آسکی کہ گویا اس مضمون کی اردو اور آجکل کی اردو میں دو دور کا
فرق ہے پہلا دور وہ ہے جس وقت تک "ایک مدرسہ ان زبانوں کی میں فاصلوں
بعید"۔ "رئیسوں ہندوستان" وغیرہ جملوں کی سی ترکیب ہے۔ یہ ترکیب اب نہ کہیں سنی
جاتی ہے اور نہ دکھائی دیتی ہے۔ میرے نزدیک آج سے تیس۳۰ چالیس۴۰ سال پیشتر
اس ترکیب کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی دور کے زمانہ کا لفظ فرنگی ہے۔ مگر اتنا فرق ہے
کہ کبھی کبھی اب بھی گو صرف عورتوں کی زبان سے "فرنگی" سنا جاتا ہے۔ دوسرا دور
ایسی ترکیبوں کا ہے جیسے "اس طرف دریائے ستلج کے" "کس واسطے کہ" "اگر باشندے
اس ملک کے" "ممتاز کیا جاویں" وغیرہ۔ اس دور کے خاتمہ کو بہت عرصہ گزرا نہیں
معلوم ہوتا۔ میں نے اپنی یاد میں بعض خطوں میں اور بعض آدمیوں کے منہ سے ایسے
جملے مستعمل دیکھے اور سنے ہیں۔

مگر اس مضمون کی بعض خوبیاں اور بھی قابل ذکر ہیں۔ مثلاً یہ کہ مبالغہ آمیز کلمات کا
بہت ہی کم ہونا تنقید اور اصلاح کی تحریک کا بغیر اسکے کہ سخت یا جلے کٹے لفظوں
میں ہو وسیع اور مؤثر ہونا اعداد کا استعمال آج اس وقت سے ساٹھ برس بعد
عام طور پر اردو اخباروں میں یہ خوبی مفقود یا بہت کم موجود ہے۔ حالانکہ اس توقع
کا حق ہے کہ فن اخبار نویسی اس عرصہ میں ترقی کر گیا ہوگا پھر یہ کہ قومی تعلیم کے
دائرے کو جیسا اس میں وسیع کیا گیا ہے اب نہیں کیا جاتا اردو کی حمایت کس خوبی
سے کی ہے سر سید مرحوم کی کتاب آثار الصنادید تقریباً اسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہے
جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اُنیس سو ایک ۱۹۰۱ یاد و ٹھیک یاد نہیں، مگر اسی زمانہ میں تی میں ایک مجلد تھوڑی سی دیر کیلئے میرے ہاتھ لگ گیا تھا صرف یہی ایک مضمون نقل کر سکا۔ مگر چونکہ اردو ناگری کا جھگڑا اُس وقت درپیش تھا اس کا چھپوانا مناسب نہ معلوم ہوا۔ اسکے بعد سے اب تک یونہی بکس میں دبا پڑا رہا۔ یہ مضمون دہلی کے رسالہ خیر خواہ ہند میں جو دہلی کیا سارے ہندوستان میں سب سے پہلا اردو کا رسالہ تھا اکتوبر ۱۸۴۳ء میں شائع ہوا تھا۔ گویا آج سے باسٹھ ۶۲ برس پہلے۔ میرا اُس وقت کا علم یہ تھا کہ یہ مضمون مولوی محمد حسین آزاد کے والد کا ہے۔ مگر اس وقت مطلق یاد نہیں کہ کس سے سُنا تھا۔ شمس العلما خاں بہادر مولوی ذکاءاللہ صاحب کی زبانی یہ ہے اور اُن کی رائے جو وہ ذاتی علم و یقین کی طرح بیان کرتے ہیں وثوق کے لائق ہے کہ خیر خواہ ہند پہلا رسالہ ہی جو اردو زبان میں پروفیسر رامچندر نے نکالا تھا۔ وہی اس مضمون کے مصنف تھے۔ اُن کی عادت تھی وہ خود کوئی مضمون اپنے قلم سے نہیں لکھتے تھے۔ مگر اُنکے طلبا۔ جو عربی کی اول جماعت کے تھے وہ جو کہتے جاتے اُس کو لکھتے جاتے۔ اس رسالہ میں اکثر مضامین اُنکے اس طرح لکھوائے ہوئے ہیں۔ یہ مضمون اُنہی کا ہے۔ تو گویا اب یہ ثابت ہو کہ یہ مضمون پروفیسر رامچندر کا ہے جو دہلی کے ایک مشہور عالم سمجھے گئے ہیں اُنکے کمالات کا دلچسپ نمونہ ہے۔

(محبوب عالم)

تربیت اہل ہند کے بیان میں

اول جلد اس رسالہ میں کچھ حال طریقہ تربیت کا جو ہندوستان میں قدیم سے آجتک جاری ہے بیان کیا ہے۔ اب ہم وہ طریقہ تربیت کا جو انگریزوں نے واسطے فائدہ خلق ہند کے جاری کیا ہے، بیان کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ جب انگریزوں نے حکومت ہندوستان کی حاصل کی اور یہ دریافت کر کہ اب ہم صرف سوداگر نہیں رہے بلکہ

اُس رسالہ کا پہلا نام خیر خواہ ہند تھا پھر اس کا نام بدلکر محب ہند رکھا گیا۔ پہلی جلد اس رسالہ کی ماہ ستمبر ۱۸۴۳ء

مخزن مئی ۱۹۰۴ء ۱۲

حکام ولایت ہند بن گئے ہیں تو اُنھوں نے شیوع علوم مفیدہ کیواسطے ہند میں تجویز کی۔ اُنھوں نے اوّل اوّل فارسی اور عربی اور شاستری زبان کے مدرسے کلکتہ اور بنارس اور دہلی اور اور بڑے بڑے شہروں میں مقرر کیئے اور جب دیکھا کہ مدرسے اِن زبانوں کی ہیں وہ علوم اور فنون جنسے عقل تیز ہوتی ہے اور واقفیت امور مفیدہ سے حاصل ہوتی ہے حاصل نہیں ہے۔ اُنہوں نے مدرسے انگریزی بھی بنانے شروع کیئے اور بوساطت اِس زبان کے وہ علوم جو اہل فرنگ کو معلوم ہیں یہاں کے لوگوں کو سکھائے۔ ایک زمانہ تھا کہ تحریر اقلیدس جو ایک کتاب علم ہندسہ میں ہے لوگ نہایت مشکل تصور کرتے تھے اور بڑے بڑے مولوی اُسکے جاننے سے اپنی نہایت بزرگی خیال کرتے تھے۔ اب اُس کتاب کو چھوٹے چھوٹے لڑکے انگریزی زبان میں تحصیل کرتے ہیں اور اپنے بُڈھے بُڈھے بزرگوں کو اپنی علمیت سے شرمندہ کرتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں علم جغرافیہ یعنی حال کرہ زمین کا اور تاریخ روم و انگلستان اور بلکہ ہندوستان اور علم ہیئت وغیرہ سے بہت کم آدمی واقفیت رکھتے تھے اور اب بوساطت زبان انگریزی کے ذرا ذرا سے لڑکے اِن مضامین کی تکرار کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ وہ علوم جن کے نام سے بھی پہلے یہاں کے اکثر لوگ آگاہ نہ تھے۔ اب بوساطت زبان انگریزی کے اِس قدر شیوع ہوئے ہیں کہ کوچہ کوچہ اِن کا ذکر سُننے میں آتا ہے۔ لیکن یہاں ذرا یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں کروڑہا آدمی ہیں۔ اُن میں سے کسقدر خلقت نے زبان انگریزی کو تحصیل کیا ہے۔ اِس کا جواب یہ ہو کہ ایسے آدمی بہت کم ہیں کہ اُنھوں نے زبان انگریزی کو حاصل کیا ہے اور باعث اِسکا عیاں ہے جو آگے ارقام کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ زبانِ انگریزی ایک بالکل بیگانی زبان ہے اور اسیواسطے اُس کا تحصیل کرنا نسبت فارسی کے مشکل تر ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے لوگ بباعث فکرِ معاش وغیرہ کے

اُسکی تحصیل میں مصروف نہیں ہو سکتے ہیں۔ سوائے اِس کے بعض آدمی ایسے
بھی ہیں کہ وہ اِس زبان کو بسبب تعصب دین کے تحصیل کرنا اُسکا بُرا سمجھتے ہیں
واضح ہو کہ قریب ایک چوتھائی خلقت کے ہندوستان میں مسلمان ہونگے۔ اِن میں
دیکھنا چاہیئے کہ کسقدر اہل اسلام زبان انگریزی کو مدرسوں سرکاری میں تحصیل کرتے
ہیں۔ اگر رپورٹوں مدرسوں کو ملاحظہ کریں تو دریافت ہوگا کہ نسبت ہنود کے
مسلمان بہت کم انگریزی تحصیل کرتے ہیں۔ مثلاً رپورٹ مدارس انگریزی اضلاع شمال
غربی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ضلاع کے مدارس انگریزی میں بیچ ۱۸۴۴ء کے
ایک ہزار ایک سو چھیالیس (۱۱۴۶) ہندو اور صرف ایک سو چوالیس (۱۴۴) مسلمان
زبان انگریزی تحصیل کرتے ہیں پس یہاں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بسبب
تعصب مذہبی کے انگریزی زبان کو نہیں پڑھتے۔ اور اِس باعث سے وہ علوم مفید
جو زبان انگریزی میں ہیں حاصل نہیں کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوؤں میں سے بھی
ایسے آدمی کم ہیں جنہوں نے زبان انگریزی اچھی طرح سے تحصیل کر کے اُس میں جو
علوم مفیدہ ہیں آگاہی حاصل کی ہو۔ بہت ایسے آدمی بھی ہیں جو ذرا واقفیت زبان
انگریزی سے حاصل کر کے اور حروف انگریزی لکھنا جان کر نقل نویس دفتر انگریزی میں
ہو جاتے ہیں۔ پس اُن میں اور ناخواندوں میں کچھ تھوڑا سا فرق ہے۔ غرض یہ کہ زبان
انگریزی کے ذریعے سے اسقدر شیوع علوم مفیدہ کا نہیں ہو سکتا ہے جسقدر کہ ضرور ہے
تاکہ ہندوستان کے آدمی وہ لیاقت اور عقل حاصل کریں جو بالفعل اہل فرنگ کو
حاصل ہے۔ اب جو اُمید ہے کہ ایک دن اہل ہند عاقل اور عالی حوصلہ مثل فرنگیوں
کے ہو جائیں اِس باعث سے ہوتی ہے کہ علوم و فنون کی کتابیں زبانِ اُردو میں
ترجمہ کیجائیں اور اُسکی وساطت سے ہند کے آدمی حاصل کریں۔ واضح ہو کہ زبان
اُردو ایسی ہے کہ بہت دُور سمجھی جاتی ہے گو اُسکے بولنے میں اختلاف ہو۔ یعنی

اگرچہ باشندے پنجاب کے اردو زبان دہلی کی بول نہیں سکتے ہیں پھر بھی اُسے بآسانی سمجھ سکتے ہیں (اور سمجھتے ہیں۔ ناقل) اور ظاہر تو کہ یہی زبان بآسانی تحصیل ہو سکتی ہے جسکے سمجھنے میں چنداں مشکل نہو۔ اب اگر غور سے دیکھو تو دریافت ہوگا کہ حیدرآباد دکن سے لگا کر سرحد نیپال اور اٹک دریا تک اور شہر سورت سے شہر پٹنہ تک زبان اُردو یعنی وہ زبان جو دہلی میں لوگ بولتے ہیں سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ ہر جا اُسکا استعمال نہیں ہے۔ اگر باشندے اس مُلک کے ذرا بھی کوشش تحصیل زبان اردو میں کریں تو اُنہیں یہ زبان بآسانی حاصل ہو سکتی ہے۔ سوائے زبان اردو کے کوئی ایسی زبان ہندوستان میں نہیں ہے جسکا اسقدر زیادتی سے رواج ہو۔ مثلاً بنگالی زبان سوائے ملک بنگالہ کے اور کہیں نہیں سمجھی جاتی کشمیری زبان سوائے ضلع کشمیر کے اور کہیں نہیں سمجھی جاتی ہے۔ اور مرہٹی زبان کو سوائے چند مقاموں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اُردو زبان بہت جگہ سمجھی جاتی ہے۔ حیدرآباد اور ناگپور اور لکھنؤ اور پٹنہ اور لاہور اور بہاولپور میں جو مختلف اضلاع ہندوستان میں فاصلوں بعید پر واقع ہیں زبان اردو سمجھی جاتی ہے۔ پس اگر اس زبان کی وساطت سے علوم شیوع ہوں اور رواج پائیں تو حقیقت میں خلقت ہند کو بہت فائدہ ہو۔ جو کتاب کوئی شخص دہلی میں تصنیف کرے وہ حیدرآباد میں رواج پا سکتی ہے۔ اگرچہ حیدرآباد دہلی سے قریب ہزار کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ خلاف اِسکے وہ کتاب جو بنگالہ کے کسی شہر میں مثل کلکتہ میں بیچ زبان بنگالی کے تصنیف کی جائے اُسکو ایک یا دو سو کوس کے فاصلہ تک بھی رواج نہیں ہو سکتا ہے۔ اُسکو خلقت پٹنہ کی بالکل نہیں سمجھ سکتی ہے اور خلقت دہلی کا تو کیا ذکر ہے۔ اکثر صاحبان انگریز یہ خیال کرتے ہیں کہ راجپوتانہ میں اردو زبان کوئی نہیں بولتا ہے اُن کی زبان بالکل مختلف ہے

اور وہاں اردو زبان کا رواج نہیں ہو سکتا ہے اور اسیواسطے اخبارات اور کتب اردو
سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا ہے۔ انکی رائے غلط معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسواسطے کہ گو
یہ بات سچ ہے کہ راجپوتانہ کے آدمی زبان اردو نہیں بولتے ہیں پھر بھی وہ اس زبان کو
سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس باعث سے اگر وہ ذرا بھی کوشش اس زبان کے تحصیل کرنے
میں کریں تو انہیں وہ باسانی حاصل ہو سکتی ہے۔ صاحبان انگریز مذکور کو یاد رکھنا چاہیے
کہ کچھ فرق زبان اہل آئرلینڈ و انگلینڈ کی میں ہے۔ پھر بھی دونوں ملک کے آدمی ایک ہی
زبان میں علوم تحصیل کرتے ہیں۔ اور باعث اس کا یہ ہے کہ دونوں زبانوں میں اسقدر
فرق نہیں ہے کہ باشندے آئرلینڈ کے زبان انگریزی نہ سمجھ سکیں۔ پس جب معلوم
ہوا کہ اردو زبان آدھی سے زیادہ ملک ہندوستان میں سمجھی جا سکتی ہے تو واسطے
پھیلانے اور رواج دینے علوم اور فنون کے اس زبان کی وساطت سے کتب
علوم مختلفہ کی ترجمہ کرنی چاہئیں اور ہندوستان کے لوگوں کو سکھانی اور ترقی
کرنی چاہئیں۔ اب دیکھنا چاہیے کہ ہمارے حکام نے کسقدر کوشش واسطے شیوع علوم
کے بوساطت زبان اردو کے کی ہے۔ واضح ہو کہ صاحبان انگریز مدت سے خواہاں
اس بات کے ہیں کہ کسیطور سے ہندوستان میں اسیقدر زبان اردو کا رواج ہو جاوے
جسقدر زبان انگریزی کا انگلستان میں اور فارسی کا فارس میں اور ترکی کا ترکستان میں
اور علی ہذا القیاس۔ چنانچہ انہوں نے دفتر بھی اردو کر دیا اور فارسی کو سب محکموں سے
رخصت کر دیا۔ اور بعض کتابوں انگریزی اور فارسی اور عربی وغیرہ کا زبان اردو میں ترجمہ
کروایا ہے۔ اور علاوہ سوائے گورنمنٹ کے چند سال سے چند صاحبان انگریز اور
بعض رئیسان ہندوستانی نے کئی ہزار روپیہ بطور چندہ کے جمع کر کے اس روپیہ
میں سے کتابوں علوم اور فنون کو زبان انگریزی و فارسی میں سے ترجمہ کرائی ہیں خلقت
ہندوستان کی کو ان صاحبان کا بہت احسان ماننا چاہیے۔ کیونکہ ان عالی حوصلہ

مردوں کی سعی سے کئی ہزار جلدیں مختلف علوم اور فنون مفیدہ کی اکثر تو زبان انگریزی میں سے اور بعض زبان فارسی وغیرہ میں سے ترجمہ ہو گئی ہیں۔ اور باشندے یہاں کے اپنی خاص زبان میں وہ کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔ جو پہلے نہایت نایاب تھیں ان صاحبوں کا جنھوں نے کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی ہیں ایک مجمع ہے اور سکرٹری یعنی مہتمم اُس مجمع کے کاروبار کے جناب ڈاکٹر سپرنگر صاحب بہادر ہیں جو بالفعل پرنسپل مدرسہ دہلی کے ہیں۔ مساحت اور حساب اور علم ہیئت اور جبر و مقابلہ اور تاریخ ہند اور روم اور انگلستان اور یونان اور علم طبعی اور جغرافیہ اور تاریخ ایران اور انتظام مدن اور اصول قوانین اور بہت سے علوم مفید اور فنون غریب کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں۔ اب واضح ہو کہ ان کتابوں کے تیار ہونے میں سرکار سے اسقدر مدد نہیں ہوئی جسقدر چاہیئے اور اُنکی مدد نہیں بھی ہو سکتی ہے۔ کس واسطے کہ اب یہ کتابیں یہاں مروّج نہیں اور اسیواسطے اُن کا صرف ہونا محال ہے اور باعث اسکا یہ بھی ہے کہ اکثر مدارس سرکاری ایسے ہیں کہ جنمیں زبان انگریزی و فارسی و عربی و شاستری سکھائی جاتی ہیں۔ اور اُردو تو ایک نہایت بے حقیقت شئے ان مدارس میں تصور کیجاتی ہے۔ پس اِس صورت میں کتابیں انگریزی و عربی وغیرہ زیادہ صرف ہوتی ہیں بہ نسبت کتابوں اُردو کے۔ غرض اگر صاحبان عالیشان کے یہ مدنظر ہے کہ کسی طور سے زبان اُردو اُس قدر ہندوستان میں رواج پا جائے جسقدر کہ زبان انگریزی کا انگلستان میں ہے۔ تو اُنہیں بہت ہی مدد زبان اُردو کے شیوع کرنے میں لازم ہے۔ یقین ہے کہ قریب دس ہزار روپیہ ماہواری کے خرچ اضلاع شمال غربی کے مدرسوں انگریزی اور فارسی اور عربی اور شاستری میں ہوتا ہے۔ اب ذرا غور کرنا چاہیئے کہ اُس روپیہ میں سے اردو کی وساطت سے علوم کو رواج دینے میں بہت ہی کم صرف ہوگا یہ سچ ہے کہ ہر مدرسہ میں ایک دو مدرس اُردو کے مقرر ہیں۔ لیکن یہ سوائے چند کتابوں

قصہ اور نظم وغیرہ کے کچھ نہیں سکھاتے ہیں اور سرکار کی بھی یہ غرض نہیں ہے کہ بہت
زیادہ سکھا دیں۔ انہیں صرف یہ غرض ہے کہ طالب علم کچھ واقفیت اپنی زبان سے بھی
حاصل کریں اور یہ کہ علوم کو بوساطت زبان اردو کے حاصل کریں۔ یہ تو جب ہوتا ہے
کہ وہ زبان انگریزی کو تحصیل کرتے ہیں۔ پس اسصورت میں زبان اردو نسبت زبان
انگریزی اور فارسی اور عربی وغیرہ کے حقیر ہی حقیقت میں دیکھو تو کوئی مدرسہ اردو کا
ہندوستان میں نہیں ہے یہ زبان فقط اور زبانوں کے ضمن میں سیکھائی جاتی ہے
مثلاً دہلی میں چار مدرسے انگریزی اور فارسی اور عربی اور شاستری کے ہیں۔ لیکن کوئی مدرسہ
اردو کا نہیں۔ علی ہذا القیاس آگرہ میں اور مدارس میں بھی یہی حال ہے۔ صاحبان
گورنمنٹ کو چاہیے کہ زبان اردو کو اپنی دستگیری سے وہ بزرگی بخشیں جو اور زبانوں کو
حاصل ہے۔ بالفعل زبان اردو میں ہر فن اور ہر علم کی کتابیں موجود ہیں اور موجود ہو سکتی ہیں
لیکن ان کا صرف اور رواج نہیں۔ پس اسصورت میں کسکو غرض ہے کہ ناحق محنت اٹھائے
اور علوم کی کتابیں زبان انگریزی سے یا عربی میں سے ترجمہ کرے صاحبان گورنمنٹ کو
لازم ہے کہ جیسے کہ مدرسہ انگریزی اور عربی وغیرہ ہیں۔ اسی طور سے ایک یا دو مدرسہ بڑے
بڑے شہروں میں اردو کے مقرر کریں اور وہاں زبان اردو سیکھائی جائے اور اسی کی
وساطت سے ہر علم خواہ حساب خواہ تاریخ خواہ ہندسہ خواہ ہیئت سیکھائی جاویں
اور یقین ہے کہ اگر علم اور عقل زبان انگریزی کے تحصیل سے چھ (۶) برس میں آتے ہیں تو وہ
سب عقل اور علم اردو کے طالب علموں کو دو (۲) برس میں آجائے گی۔ سوائے اس کے
خرچ اردو مدرسہ کا اسقدر نہیں ہو سکتا ہے جسقدر کہ انگریزی مدرسہ کا ہے۔ اگر صاحبان انگریز
حقیقت میں زبان اردو کو سرفراز اور ممتاز کیا چاہیں تو انہیں لازم ہے کہ بڑے بڑے
مدرسہ مثل مدرسوں انگریزی آگرہ و دہلی کے بڑے بڑے شہروں مثل حیدرآباد دکن اور ناگپور
گوالیار اور جےپور اور لاہور اور لکھنؤ اور راندور اور کوٹہ اور بھوپال اور جودھپور وغیرہ میں

ادیٹر یہ مقامات اُس زمانے میں جب یہ مسودہ چھپا ہے یعنی ۱۸۳۷ء میں ریاستیں تھیں ۱۲ حقی

جہاں رئیس ہندوستانی رہتے ہیں مقرر کریں۔ اور اُن میں زبانِ اردو اور اسکی وساطت سے سب علوم تاریخ جغرافیہ ریاضی اور ہیئت وغیرہ کے سکھائے جائیں۔ واضح ہو کہ اکثر رئیس لوگ ہندوستان کے ایسے ہیں کہ دو یا تین ہزار روپیہ مہینہ انکو دینا کچھ بات نہیں ہے۔ پس اگر اُن رئیسوں سے خرچ مدرسوں کا جو اُن کے ملک میں بنائے جائیں لیا جائے تو بہت خوب بات ہو۔ کیونکہ ان تین ہزار روپیوں سے اُن رئیسوں کی رعایا میں علوم اور فنون کا رواج ہو جائے گا۔ اور اکثر لوگ علوم اور عقل سے بہرہ مند ہوں گے۔ سرکار انگریزی بہت سے خرچ رئیسوں ہندوستان پر کہیں فوج کنٹنجنٹ اور کہیں تیاری سڑک وغیرہ کا مقرر کرتی ہے۔ لیکن ان سب سے مفید خرچ مدرسوں کا ہے اگر رئیس لوگ اور انکی رعایا علم حاصل کریں تو وہ بے انتظامی جو انکی ریاستوں میں شروع ہیں آتی ہیں کیوں عمل میں آویں۔ مثلاً جیسے اب لاہور میں انگریز دخل رکھتے ہیں اور موافق شرائط عہد نامہ کے اُن کا دخل لاہور میں قریب آٹھ برس تک ہیگا۔ اب غور کرنا چاہیئے کہ جب انگریز بعد آٹھ برس کے اپنی فوج کو اس طرف دریائے ستلج کے اتار لیں گے اور جسوقت اپنا دخل لاہور میں سے اٹھالیں گے تو پھر وہاں وہی بے انتظامیاں نمودار ہونگی جو اب بالفعل لکھنؤ میں دکھائی دیتی ہیں باعث اسکا صرف جہالت علوم سے ہے پس اب علاج اس بات کا کہ انگریز اپنا دخل لاہور میں سے نکال لیں پھر بھی وہاں انتظام رہے یہ ہے کہ اس آٹھ برس کے عرصہ میں وہاں کے لوگ وہ کوشش واسطے شیوع علوم وفنون کے پنجاب میں کریں کہ وہاں کے اکثر امیر وغریب قواعد ریاست اور دانائی اہل فرنگ سے واقف ہو کر اپنے ملک میں انتظام اچھی طرح سے کرنے لگیں اور وہاں کی خلقت بھی یہ سمجھے کہ ناحق آپس میں لڑنا اور تنازع رکھنا موجب بربادی ریاست کا ہوتا ہے۔ اگر یہ باتیں صاحبان گورمنٹ ملک پنجاب عمل میں لاسکیں تو خلقت پنجاب کو زیادہ فائدہ ہوگا۔ بہ نسبت اسکے کہ رزیڈنٹ اور اور افسر اور فوج انگریزی

لاہور میں رہا کریں اور جو جو فتنہ وہاں اٹھا کریں انہیں وہ فرو کرتے رہیں اور وہاں کے راجہ کو اپنے محل میں عیش کرنے کی فرصت نہ دیں۔ بذریعہ اخبار وں کے سنتے ہیں کہ رزیڈنٹ صاحب بہادر اور صاحبان گورنمنٹ کی صلاح سے فلانے فلانے سردار کے واسطے اس اس قدر تنخواہ وغیرہ مقرر ہوئیں لیکن یہ نہ سنا کہ اس قدر روپیہ واسطے مقرری ایک مدرسے کے شہر لاہور میں مقرر ہوا ہے شاید وہ صاحب جو بڑے بڑے معاملوں ملکی میں مصروف ہیں مدرسہ وغیرہ کے مقدمہ کو نہایت خفیف سمجھتے ہوں لیکن حقیقت میں اثر تربیت کا بہت بڑا ہوتا ہے۔ القصہ جبکہ سرکاری عنایت سے انگریزی مدرسہ ہندوستان میں مقرر ہوئے ہیں۔ ویسے ہی مثل انکے اردو مدرسہ بھی مقرر ہوں۔ اور اردو زبان کے ذریعے سے بہت علوم جن کا نام ذکر آتے ہیں سکھائے جائیں تاکہ خلقت بہت جلد علم وعقل سے بہرہ مند ہو کر سرکار کو دعا دیتی ہے فقط

حقی دہلوی

لارڈ کالینگ ووڈ نے ایک نوعمر شخص کو کیا اچھی نصیحت کی ہو کہ پچیس برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے اپنی تمام عادات وخصائل کو سیدھے رستے پر لے آو۔ کیونکہ یہ ہی ایک چیز ہے جو دم آخر تک تمہارا ساتھ دیگی*

جب کسی خوبصورت عورت سے کوئی حماقت سرزد ہو جاتی ہے اور اس کو بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ مرد افشائے راز کر دیتے ہیں تو کوئی جادو اسکی اداسی کو دور نہیں کر سکتا اور نہ کوئی حکمت اسکے جرم کو دھو سکتی ہے۔ اپنے جرم کو چھپانے اپنی بدنامی کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنے اپنے عاشق کو پشیمان کرنے اور اسکے دلکو افسوس ڈالنے کے لیئے صرف یہ ہی علاج ہے کہ وہ مرجائے*

گولڈسمتھ

روح کی بیداری

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

اصل کا اپنے جزیرہ کے حالات سے حی کو مطلع کرنا

جب حی اپنی داستان بیان کر چکا تو اصل سے کہا اب یہ فرمایئے کہ آپ کہاں سے تشریف لائے اور یہاں بسر اوقات کی کیا صورت ہے۔ اصل نے اول تو جہاں سے آیا تھا اُس جزیرہ کا اور وہاں کے باشندوں کا حال پھر اپنے علیحدہ ہونے اور یہاں آنے کی پوری کہانی کہہ سنائی۔ اثنائے داستان میں عقبیٰ، جنت، دوزخ، قیامت، اعمالناموں کی پیشی، میزان کے قائم ہونے، اور پلصراط سے گزرنے کا بھی اپنے مذہب کے مطابق ذکر کیا +

یہ سب باتیں نہایت آسانی سے حی کی سمجھ میں آگئیں کیونکہ ان میں سے کوئی بات بھی اُس مشاہدے کے خلاف نہ تھی جو عالم محویت میں اُسے اکثر نصیب ہو چکا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہ بھید چاہے کسی شخص نے بھی ظاہر کیے ہوں مگر اسمیں تو شک نہیں کہ اُس نے اپنی طرف سے ذرا بھی کمی بیشی نہیں کی۔ بے کم و کاست سچے سچے حالات بیان کر دیئے ہیں۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد اس صادق اور امین شخص کی سچی اور پاکیزہ تعلیم ہی نے یقین دلا دیا کہ اصل کا خیال اس برگزیدہ شخص کی نسبت بالکل ٹھیک ہے بے شبہ وہ خدا کا ایلچی تھا۔ غرض کہ وہ اس پیغمبر پر ایمان لایا۔ ان تمام باتوں کے سچا ہونے کا اقرار کیا اور اسکی نبوت کی گواہی دی +

اِسکے بعد اُس نے دریافت کیا کہ اس پیغمبر نے اخلاق اور عبادات کی نسبت کیا

ہدایتیں کی ہیں۔ چنانچہ اصل نے نماز، روزہ، زکوۃ وغیرہ کے مسئلے اور عزیزوں یتیموں اور مسکینوں وغیرہ کے ساتھ سلوک کرنے کی نسبت جو ہدایتیں اُسکے مذہب میں تھیں سب بتائیں۔ چونکہ ان حکموں کے پہنچانے والے کی نسبت اُسکو پہلے ہی صادق اور امین ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔ اِن سب باتوں کو خدا کے حکم سمجھکر قبول کیا اور اُسیوقت سے اُنپر عمل کرنا شروع کر دیا۔ مگر باوجود اِسکے دو باتیں اِس پیغمبر کی عجیب معلوم ہوتی تھیں۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اِن میں کیا مصلحت ہے۔ اول تو یہ کہ اِس پیغمبر نے جہاں خدا اور عالم آخرت کا ذکر کیا ہے تو تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے اور اِسکی وجہ سے جیسا اصل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ اِس غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ لفظوں کے ظاہری اور لغوی معنی پر خیال کر کے خدا کو جسمانی سمجھنے لگے۔ حالانکہ وہ ذات پاک اِس سے بالکل منزہ ہے۔ اِسیطرح آخرت کے عذاب و ثواب کی نسبت بھی یہی غلط فہمی عام ہو گئی ٭

دوسرے یہ کہ اتنے تھوڑے سے حکموں کے بتانے پر کیوں قناعت کی مثلاً لوگوں کو دولت کی تلاش اور جمع کرنیسے کیوں نہیں روکا۔ اور کھانے پینے کے بارہ میں کیوں آزاد کر دیا۔ کہ جو چاہیں کھائیں پئیں اور چین منائیں جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر کوتاہ بین نا و نوش میں پڑکر حق سے غافل ہو گئے۔ اُسکا خیال تھا کہ کھانے پینے کا جو اندازہ دانائے شیراز نے مقرر کر دیا ہے۔ یعنی خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است۔ اُس سے ایک ذرہ بھی کسیکو زیادہ نہ ملنا چاہیئے اور مال و دولت کو تو وہ بالکل ہی فضول سمجھتا تھا ٭

مذہب نے دولت کے صرف یعنی زکوۃ، خیرات، تجارت، سود، کفارہ، اور جرمانہ وغیرہ کی نسبت جو قواعد مقرر کیے ہیں وہ بھی سب بے محل، بے تکے اور بے ضرورت معلوم ہوتے تھے کیونکہ اُس نے اپنے دلمیں خیال کیا کہ اگر مذہب لوگوں کو حق بینی

حق شناس بنا دیتا تو وہ خود ہی اُس متاع غرور سے پرہیز کرتے اور حق کی طلب میں مصروف رہتے اور اِس صورت میں ظاہر ہے کہ یہ سب قاعدے فضول ہیں نہ کسی شخص کو دولت کا مالک ہونے کا دعوے ہوتا۔ نہ زبردستی اور خلاف مرضی اُس سے خیرات کرانے' سرقہ کے جرم میں ہاتھ کاٹنے' اور لُوٹ مار میں جانوں کے ضائع ہونے کی ضرورت ہوتی +

بنی نوع کے ساتھ ہمدردی

مگر یہ تمام خیالات ایک غلطی پر مبنی تھے جسکا منشا صرف ناتجربہ کاری تھی یعنی سب انسانوں کو اپنی طرح سمجھدار' ذہین اور مستقل مزاج تصور کیے ہوئے تھا۔ بیچارے معصوم کو کیا خبر تھی کہ جنکو میں اتنا اچھا سمجھتا ہوں وہ درحقیقت ایسے بے سمجھ' کودن' اور جاہل ہیں کہ بہائم کی طرح بلکہ اُن سے بھی زیادہ بہکنے اور بھٹکنے والے ہیں[1] +

غرضکہ اُسکا رقیق دل ان خیالات سے ایسا متاثر ہوا اور بنی نوع کے حال زار پر ایسا ترس آیا کہ قطعی ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو ان لوگوں سے ملنا اور وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے اُنکی نجات کا وسیلہ بننا چاہیئے۔ چنانچہ اصل کو اپنے منشا سے مطلع کر کے پوچھا کہ انسانوں تک پہنچنے کی بھی کوئی صورت ہے +

اصل کی ترغیب

اصل نے اول تو اُن لوگوں کی مفصل حالت بیان کر کے سمجھایا کہ وہ لوگ بالکل بے تمیز ہیں اور

---

[1] اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ سَبِیْلاً (وہ مثل ڈھوروں کے ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں) اِس آیت کریمہ سے اقتباس کیا ہے ۱۲

خدا کے حکموں کی اطاعت تو در کنار ایسے ذکر سے بھی گھبراتے ہیں مگر جب دیکھا کہ وہ ان مشکلوں کو ذرا بھی خیال میں نہیں لاتا اپنے ارادہ پر برابر جما ہوا ہے تو اصل کو بھی لالچ ہوا کہ شاید اسی کے ذریعہ سے میرے چند دوست جن کے دل اوروں کی نسبت نرم ہیں اور اسقدر خود سر اور رستی ست دو نہیں ہیں راہ راست پر آجائیں۔ چنانچہ وہ حی کا ساتھ دینے اور اُسکی مدد کرنے کو تیار ہو گیا ؛

اصل کا مع حی کے اپنے جزیرہ کو واپس آنا

مشورہ کے بعد دونوں نے تجویز کی کہ سمندر کے کنارہ جھونپڑی ڈالنی چاہیئے اور جب تک اسکو پار کرنے کی کوئی صورت نہ نکلے دن رات وہیں رہنا چاہیئے۔ یعنی اگر ایک کو بضرورت کہیں جانا پڑے تو دوسرا موجود رہے۔ غرض خدا کے فضل پر بھروسہ کر کے دونوں نے سمندر کے کنارہ ڈیرے ڈال دیئے اور لطیفہ غیبی کے انتظار میں اوقات گزارنے لگے۔ ہر وقت رحمت الٰہی کی تصویر یعنی ناپید اکنار سمندر آنکھوں کے سامنے تھا۔ آنکھیں اُسکے نظارہ میں مشغول تھیں اور دل یاد خدا اور دعا میں مصروف کہ کارساز جلد اس کار خیر میں رہنمائی فرما۔ اور آئینہ مراد میں شکل مقصود دکھا ؛

آخر حکیم بحر و بر کے حکم سے ایک روز موجیں ایک جہاز کو جو رستہ بھٹک گیا تھا کشاں کشاں جزیرہ کے کنارہ لے آئیں۔ جب خشکی بہت قریب رہ گئی اور جہاز والوں نے دیکھا کہ دو انسان ساحل پر بیٹھے اسطرح ٹکٹکی باندھے جہاز کو دیکھ رہے ہیں کہ گویا ہمارے ہی منتظر اور شوق بغلگیری میں بے قرار ہیں تو اُنہوں نے بھی اُسیطرف کھینا شروع کر دیا۔ جہاز کنارہ پر آلگا تو اصل نے اُن لوگوں سے بات چیت کر کے اپنا منشا ظاہر کیا اور درخواست کی کہ ہمکو بھی ہمراہی کی اجازت

دیجئے تو بڑی نوازش ہو۔ وہ بہت خوشی سے رضامند ہو گئے اور دونوں کو جہاز میں بٹھا لیا۔ چونکہ خدا کی عنایت شامل حال تھی ہوا موافق چلنے لگی اور جلد منزل مقصود پر یعنی اصل کے جزیرہ میں پہنچگئے۔ دونوں رفیق اہل جہاز کا شکریہ ادا کرکے اُترے اور شہر میں داخل ہوئے۔

اصل کو اتنے زمانہ کے بعد خلاف اُمید دیکھکر اُسکے دوست آشناؤں نے گھیر لیا۔ حی کی ہیئت کذائی دیکھ دیکھکر ان لوگوں کو بے اختیار ہنسی آتی تھی مگر کچھ متانت اور زیادہ تر اصل کے لحاظ سے چُپ تھے۔ آخر بعض حضرات سے نہ رہا گیا اور تمسخر اور حقارت کے لہجہ میں دبی زبان سے پوچھ ہی بیٹھے کہ "آپ کی تعریف تو کیجئے"۔ مگر جب اصل نے اِن سے حی کا تعارف کرایا اور اُس کے عجیب حالات بیان کئے تو یہ کیفیت ہوئی کہ عجائب پرست لوگ چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور تعظیم و تکریم کا مینہ برسا دیا۔ اب اصل نے حی سے کہا کہ یہ لوگ جو آپکے گرد جمع ہیں اس جزیرے کے خواص میں سے ہیں اور سب سے زیادہ عقلمند اور ہوشیار ہیں۔ اگر ان کے دلوں پر آپ راستی کا نقش نہ بٹھا سکے تو سمجھ لیجیگا کہ عوام کی اصلاح ناممکن ہے۔

وعظ و نصیحت

اس جزیرہ کا بادشاہ وہی اصل کا دوست سلمان تھا جسکا ذکر اوپر آچکا ہے کہ انسانوں میں مل جلکر رہنے کو برائیوں سے بچنے کا سب سے اچھا ذریعہ سمجھتا تھا اور گوشہ نشینی و تنہائی کو ناپسند کرتا تھا۔ حی کے حالات سُن کر اُسکو بھی ملاقات کا اشتیاق ہوا اور ملکر نہایت خوش ہوا۔ کیونکہ اصل کیطرح اُسے بھی خفیف سی امید ہوئی کہ شاید یہ روشن ضمیر واعظ ان لوگوں کو گمراہی سے بچائے۔ سلمان کی درخواست سے حی نے وعظ شروع کیا۔ جبتک سیدھی سادی اور بدیہی باتیں بیان کرتا رہا۔ چاروں طرف سے ماشاءاللہ

اور سبحان اللہ کی آوازیں آتی رہیں مگر جوں ہی کہ بھیڑیا چال چھوڑ کر آزادی سے گفتگو کرنی شروع کی اور تحقیق کے میدان میں قدم رکھا۔ لوگوں نے کان کھڑے کیے اپنے موروثی اعتقادوں کی جو دلوں میں اُسیطرح بیٹھ گئے۔ جس طرح لوہے میں زنگ۔ یوں مٹی خراب ہوتے دیکھکر سب کو ملال ہوا۔ دلمیں تو جلے بھُنے جاتے تھے مگر ظاہر میں کچھ مہمان ہونے کی رعایت سے کچھ اصل کے خیال سے زبانی تعریف کرتے رہے *

اصلاح سے نا امیدی

حق نے اِن لوگوں کی کشیدگی اور کبیدگی کو تاڑ کر رات دن دلجوئی اور مدارات سے کام لینا شروع کیا۔ اور سچ کی کڑوی گولیاں شکر ملا کر طرح طرح کے مزے دار خول چڑھا کر اور سونے کے ورق منڈھ کر نگلانے کی کوشش کی مگر یہ تقلید کے مریض نادان بچوں کیطرح زیادہ ہی مچلتے اور پچھاڑیں کھاتے گئے۔ نگلنا تو کیسا مُنہ تک آنے بھی نہ دیں۔ اور ہاتھ مار مار کر گرا دیں۔ بلکہ دوا تو دوا خود طبیب سے وہ نفرت بڑھی کہ صورت دیکھکر بھاگنے لگے۔ گو یہ لوگ سرسری طور پر نیکی اور سچ کے پسند کرنے والوں میں شمار ہو سکتے تھے۔ مگر ڈگر وہی اختیار کیا تھا جسپر عوام چلتے تھے کامل یقین تھا کہ اس سے اِدھر اُدھر قدم پڑا نہیں کہ کھڑے دوزخ میں پہنچے **شعر**

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی   کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستانست

آخر ناصح مشفق کو اِن لوگوں کی ہدایت اور اصلاح حالت سے جو اُن کو خود کسی طرح منظور نہ تھی۔ بالکل نا امیدی ہو گئی۔ کیونکہ اُس نے دیکھا کہ میں جس طریق سے بھی سمجھاؤں ان چکنے گھڑوں پر مطلق اثر نہیں ہوتا *   (باقی آئندہ)

فدا علیخاں۔ ایم اے۔ از بڑودہ

زبان کی تمیز اور اُس کا فرق

زبان تو وہی ایک گوشت کی بوٹی ہے جو دانتوں کی چار دیواری میں تالو کی چھت کے نیچے بل کھاتی پھرتی ہے۔ کبھی تو ہونٹوں کے پھاٹک میں درّانہ آ کھڑی ہوتی ہے کبھی گردن نکالکر اِدھر اُدھر کچھوے کی طرح جھانکنے لگتی ہے۔ کبھی میٹھی چیز کا مزا لیتی ہے۔ کبھی کھٹے اور کڑوے سے مُنہ بناتی ہے۔ کوئی اُسے لسان کہتا ہے۔ کوئی جیب۔ کوئی تیل کہتا ہے۔ کوئی ٹنگ کسی نے لالہ کہہ لیا کسی نے رسنا۔

ہماری مراد اِس جگہ روزمرہ کی بول چال یا ہر ملک کی بھاکا سے ہے۔ اِسمیں خواہ عورتوں کی بولی ہو خواہ مردوں کی گنواروں کی گفتگو ہو یا شہر والوں کی۔ لکھنؤ کی لغت تراشی اور متانت ہو۔ یا دہلی کی سادگی اور سلاست۔ قلعہ معلّی کی معاملہ بندی ہو۔ یا ثقات کی لطیفہ گوئی۔ شہدوں کا پھکّڑ ہو۔ یا آزادوں کی بدلگامی۔ پیشہ وروں کی اصطلاحیں ہوں یا دلّالوں کی رمزیں۔ بچّوں کا اُوں اُوں و ہُم ہُم کرنا ہو یا بیگموں کا نِت نِت اور جم جم کہنا یہ ساری باتیں ہماری اُس زبان میں داخل ہیں جسکا ہمیں بیان کرنا منظور ہے ؀

عام زبان کسی خاص قوم یا خاص شہر پر مخصوص نہیں ہے۔ یہی زبان ہے کہ جانوروں کے مُنہ میں ہے اور یہی زبان ہے کہ آدمیوں کے دہن میں۔ اگر **بلبل** اپنے چہکنے سے خوش ہے تو **کوّا** بھی اپنی کائیں کائیں میں مگن ہے **کوئل** کوک کو اچھا جانتی ہے تو **مور** جھنکارنے کو عمدہ سمجھتا ہے **مینڈک** ٹرانے میں مست ہے تو **جھینگر** جھیں جھیں میں۔ **پپیہا** پی پی سے دل بہلاتا ہے تو **فاختہ** کو کو سے جی خوش کرتی ہے۔ **کتّا** بھونکنے کو بھلا سمجھتا ہے تو **شیر**

دھاڑنے کو پسند کرتا ہے۔ **اونٹ** کو بڑانا بھاتا ہے تو **بجار** کو ڈکارنا پسند ہے
غرض ایک دوسرے کی زبان اور لہجہ کو بحیثیت عمومی ہم برا نہیں کہہ سکتے کس لئے
کہ ہر ایک کی زبان بجائے خود عمدہ اور بہتر ہے۔ جو فصیح تو اپنی زبان سے کام
لیتے ہیں وہی غیر فصیح اور چلنو بھی کام نکال جاتے ہیں +

زبان کیا ہے منشائے دل کے اظہار کرنے کا آلہ ہے۔ ایک زمانہ ہوگا کہ
ہم لوگ آنکھوں یا ہاتھوں کے اشارے سے کام لیتے ہونگے۔ پھر ایک زمانہ وہ ہوگا
کہ ہم نے صرف اسموں سے کام نکالا ہوگا۔ اب ایک زمانہ یہ ہے کہ ہم نے اسما، افعال
روابط وغیرہ کو ملا جلا کر ایک عمدہ تسلسل پیدا کر لیا۔ اور اپنے مفہوم کو اس طرح ادا کرنے
لگے کہ سامع کو کسی طرح کی دقت نہ رہی +

اب اگر ہم طاقتور، تندرست، زور والے، کسی جنگل یا پہاڑ کے محنت کش باشندے
ہونگے تو ہمارا ایک ایک لفظ اور ایک ایک کلمہ جرأت۔ طاقت، سختی، اکھڑپن، غضب
خشونت کا جامہ پہنے ہوئے ہوگا حلق سے بھی بولیں گے تو اکڑ کر ہی بولیں گے۔ اخلاص کی
بات بھی کریں گے تو ایسی جیسے پتھر کھینچ مارا۔ ہمیں بھی اگر **بانگر** میں ہماری بود و باش
ہوگی تو ہم سب سے زیادہ کرخت لفظ زبان سے نکالیں گے۔ اور جو **کھادر** میں تو اس سے
دوسرے درجہ پر ہمارے الفاظ ہوں گے۔ اور جو ہم دال چپاتی کے کھانیوالے
نازپروردہ عیش منانیوالے ہوں گے۔ اور کبھی ریاضت کے پاس نہ پھٹکے ہونگے
تو ہماری بات بات سے مسکینی، غربت، عاجزی، سستی، کاہلی ٹپکے گی +

اوپر کی بحث سے ثابت ہوا کہ کوئی ملک اور کوئی ولایت کیوں نہ ہو اسمیں
دو طرح کی زبان اور دو طرح کے الفاظ ہونگے بعض الفاظ میں صرف **لہجہ** کا فرق
ہوگا۔ بعض میں **اصلیت** کا۔ اسمیں سے ایک زبان **اکھڑ** اور سخت کے نام سے
جسے گنواری یا جفاکش لوگوں کی بولی کہہ سکتے ہیں۔ مشہور ہوگی۔ دوسری **ملائم**

اور نرم جسے شہری زبان کے نام سے موسوم کرنا بیجا نہوگا تعبیر کیجائے گی۔

تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بارہ بارہ کوس فاصلے پر زبان بدل جاتی ہے مگر خاص شہر میں بھی دو طرح کی زبان ہوتی ہے۔ ایک عام لوگوں کی جسے متعصب لوگ زبانِ **جہلا** یا ادنے آدمیوں کی بولی کہتے ہیں۔ دوسری خاص لوگوں کی جسے زبانِ **شعرا** یا **فصحا** کہتے ہیں۔ شعرا کی زبان میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی عام محاورے پسند کرتا ہے کوئی خاص جیسے استاد **ذوق** اور حضرت **غالب** اب ان شہروں میں بھی فرق ہے۔ جو شہر کسی **بادشاہ** کا مدت تک دار الخلافہ رہا ہوگا اُسکی زبان اور شہروں کی نسبت عمدہ اور زیادہ شائستہ خیال کیجائے گی۔

باعتبارِ زبان تو ہر ایک زبان کا مرتبہ ایک ہی ہے مگر اس لحاظ سے کہ دار السلطنت میں آکر ہر ایک لفظ سانچے میں ڈھلتا اور خیراد[1] چڑھتا ہے۔ اُسے سب پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ اس بات کے ثبوت میں ہزاروں دلیلیں موجود ہیں۔ اگر کوئی کشمیر زا ہندوستان کی زبان کو بُرا بتائے یا کوئی ہندی نژاد صفہان کی زبان کو ٹکسال باہر ٹھیرائے تو کوئی عقلمند تسلیم کرے گا؟

اب رہی یہ بات کہ زبان کی عمدگی کن باتوں پر منحصر ہے۔ سو یہ ہم کیا تمام عالم کھلے خزانے کہہ رہا ہے کہ زبان کی خوبی اُسکی سلاست۔ عام فہمی ستوفی چھوٹے چھوٹے الفاظ بڑے بڑے معنی پر موقوف ہے جو لفظ جہاں چسپاں ہو وہیں نگینہ کیطرح جڑا ہو۔ بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کی سمجھ میں آجائے سو یہ بات زیادہ تر عورتوں کی زبان میں پائی جاتی ہے یا اُن لوگوں کی بول چال میں جنہوں نے اپنے ماں باپ کی روزمرہ کو معیوب نہ سمجھکر اُسکے چھوڑ دینے پر کمر نہ باندھی ہو اپنی اصل پر خود بھی قائم رہے ہوں۔ اور زبان کو بھی جو[کل] توں بنا رکھا ہو۔ اگرچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اوروں کی زبان کی حرف گیری

[1] خیرآد زبان فارسی ہے۔ خیر آباد زبان عربی ہے مگر روزمرہ بول چال میں خیرا د آتا ہے ۱۲

کرتے ہیں - وہ بھی گھر میں جا کر اپنے بال بچوں کے ساتھ وہ گفتگو نہیں کرتے جو باہر لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں - اُن کی تحریر میں بھی وہ لفاظی سجع بندی قافیہ پیمائی - خودرائی پائی جاتی ہے کہ جسے سُن کر خواہ مخواہ آدمی کی طبیعت اُلجھے یہی جہ ہے کہ اُنکی کوئی بات بناوٹ - اور آورد سے خالی نہیں ہوتی - اور اُن کا کلام محض بے لطف اور بے اثر ہوتا ہے - خواہ مخواہ عربی فارسی کے غیر مستعمل لُغت ٹھونس ٹھونس کر بھر دیتے ہیں - اگر کوئی عبارت لکھنے بیٹھے تو دس بیس لغت کی کتابیں آگے رکھ لیں - اور اپنی بے معنی علمیت جتانے کو بڑے بڑے لفظ چُن کر اُس عبارت میں داخل کرتے چلے گئے اور اُسکا نام زبان علمی رکھ لیا - عربی لفظوں کو اس طرح بھرا کہ ایک ایک بات کے چار چار مترادف ٹھیرا کر لکھ دیئے - اُنکی بلا سے کوئی اُس سے فائدہ اُٹھائے یا نہ اُٹھائے - کسی نے اِس عبارت کو مجذوب کی بڑ جانا اور کسی نے بلائے جان سمجھا اگر وہ اخبار ہے تو پڑیاں بندھیں - اور اگر کتاب ہے تو لڑکوں نے پٹاخے بنائے +

جس طرح زبان کی خوبی سلاست پر موقوف ہے - اسیطرح اسکی تکمیل ہر قسم کے الفاظ کی دستیابی اور کسی طرح کی روک نہ ہونے پر منحصر ہے - اگر ہم اپنے ملک کے سخت الفاظ سے پرہیز کریں اور اُنکو اپنی زبان پر نہ آنے دیں تو سخت کاموں کے واسطے کہاں سے لفظ لائینگے - اور سخت آلات کا نام کن کن لفظوں سے دھرینگے ایسے لفظوں سے پرہیز کرنا - زبان کو آیندہ ترقی سے باز رکھنا ہے - ہاں غیر زبان کے اُن لفظوں کا استعمال کرنا جو بالکل ہمارے کانوں سے جدا زبان سے ناآشنا ہوں کسی طرح کارآمد نہوگا - بلکہ اگر وہ لفظ ہمارے قواعد اور لہجہ کے موافق ڈھالے جائیں گے تو بھی پورا پورا مطلب نکالنے پر قادر نہونگے - مگر پچھلی صورت جبتک اپنی زبان سے کوئی لفظ بنایا جائے - اور اُسکی کامل ترقی ہو کام نکلنے کیلئے

اچھی ہے پہلی صورت کے مصداق ہمارے ہندوستان میں اُس شہر کے لوگ ہیں۔ جہاں کے نوکر چاکر تک جنکو آٹھ پہر اُن لوگوں سے کام پڑتا ہے۔ اپنے آقا کی بولی نہیں سمجھ سکتے۔ انکی زبان پر عربی فارسی کے وہ لفظ چڑھے ہوئے ہیں جو شاید امیروں کے سوا اَور لوگ لکھنے میں بھی مستعمل نہ کرتے ہوں گے۔ اور وہ بھی لکھتے ہونگے تو لغت کی سامنے رکھکر ؛

پُرانی زبان کو جو تنزل ہوا ہے۔ اُس کا بڑا سبب یہی ہے کہ غیر مانوس الفاظ کا رواج پانا دوسرے ملک کے ایسے لفظوں کو جن کا ثانی اپنے ملک میں موجود ہو داخل زبان کرنا۔ سخت سخت مخارج کے لفظوں کو فخریہ اپنی زبان پر چڑھانا عام لوگوں کی زبان کو پایہ اعتبار سے گرانا۔ سہل المخرج لفظوں کو خیال میں نہ لانا۔ علی ہذا القیاس۔ اور بھی ایسے ہی باعث ہوئے ہیں کہ جہاں کوئی کرخت اور سخت لفظ لوگوں کی زبان سے نہ نکلا یا تو اُسکو بالکل ترک کر دیا یا کچھ سے کچھ کر لیا۔ اور زبان کے آسان لفظ دیکھکر اپنی زبان میں ملا لیے۔ سخت زبان صرف کتاب ہی میں دھری رہ گئی +

ایک زمانہ ہوگا کہ تمام ہندوستان میں سنسکرت پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اُس سے ملتی جلتی ایک اور زبان بولی جانے لگی۔ اُسکے بعد پراکرت کا جھنڈا قائم ہوا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بھاکا اور پھر اردو زبان کا رواج ہو گیا۔ اور قدیمی زبان ایسی گم ہو گئی جیسے عنقا۔ البتہ سنسکرت کے وہ الفاظ جو ہماری زبان سے آسانی کے ساتھ نکل سکتے تھے۔ آجتک جوں کے توں قائم ہیں۔ اور جو الفاظ اس زمانے میں پنڈتوں کے سوا اور لوگوں کی زبان سے صاف ادا نہیں ہو سکتے تھے یا تو وہ صرف کتاب میں ہیں یا اُنھوں نے کوئی اور صورت قبول کر لی ہے یعنی کہیں کوئی حرف گرا دیا کہیں کسی حرف کو کسی حرف سے بدل دیا۔ اور اپنا مطلب نکال لیا۔

ایک ہی ملک میں ایک زبان کے ہوتے جو دوسری زبان کا رواج ہو جاتا ہے۔ اُس کا سبب بھی یہی ہوتا ہے کہ پہلے زبان اپنی سختی کے باعث ناگوار گزرنے لگتی ہے۔ دیکھو سنسکرت کے زمانے میں **پالی** اور **پراکرت** نے اپنا جھنڈا گاڑ ہی دیا۔ **ژند و پاژند** کے وقت میں **دری** کا نقشہ جم ہی گیا۔ عبرانی کے وقت میں عربی نکل ہی آئی۔ اسیطرح ہر ایک ملک میں ہوتا آیا ہے۔ اور اکثر سخت زبانوں کا یہی حال ہوتا ہے +

سید احمد دہلوی۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ

غزل

زینت میں ہر اک اپنی ادا دیکھتے رہنا
آنکھوں سے مری شانِ خدا دیکھتے رہنا

اے دیدۂ پُرنم تمہیں قاتل کی قسم ہے
خنجر کی روانی کو ذرا دیکھتے رہنا

دل دے دیا بے عذر مگر غرض ہے اتنی
فرصت ہو تو اندازِ وفا دیکھتے رہنا

کیوں ہوگی نظر وقت ستم میری وفا پر
بہتر تو یہ ہے اپنی جفا دیکھتے رہنا

تاکید دل و شوق یہ مجھسے ہے شب وصل
شکوہ نہ بڑھے حد سے سوا دیکھتے رہنا

احباب سے ہے نزع میں اتنی مری خواہش
وہ آتے ہیں پہلے کہ قضا دیکھتے رہنا

محفل میں جو دیکھا مجھے دربانوں سے بولے
ہم نے نہ کہا تھا کہ ذرا دیکھتے رہنا

بگڑے وہ شب وصل تو یوں شوق پکارا
دشوار ہے دلبر کی ادا دیکھتے رہنا

دل لیکے تم اس بزم میں جاتے تو ہو محشر
لیکن طرفِ زلف رسا دیکھتے رہنا

(محشر)

آہ وہ نظریں!

ماں کی محبت بھری آنکھوں کی

میری زندگی کا سب سے پہلا دن نہیں گھنٹہ بلکہ منٹ آہ وہ منٹ کیا مبارک تھا جس میں مجھ پر میری ماں کی محبت بھری نظر پہلی بار پڑی۔ یوں تو میری پیدائش کے وقت سب نے ہی محبت و پیار سے مجکو دیکھا جو اُسوقت میرے گرد و پیش تھے لیکن اُس نگاہ قابل قدر کے برابر کوئی نگاہ نہ تھی۔ گو میری ماں سے زیادہ خوشی و محبت کا اظہار کرنے والے اور بہت موجود تھے۔ لیکن میری سمجھ میں اُسیوقت آگیا تھا کہ اِن بیسیوں آنکھوں میں سے جو اُسوقت پیار سے مجھے دیکھ رہی ہیں وہ آنکھیں جو اپنی نظروں میں نہیں پتلی میں مجھے رکھنا چاہتی ہیں وہ میری ماں کی ہیں۔ اُس دن کے بعد سے اُنھیں نظروں کی حفاظت میں مجھے رکھا گیا۔ گو میری آنکھیں نہ پہچان سکتی تھیں کہ وہ کون ہے جس کی نظروں میں میرے لیے کوٹ کوٹ کر محبت بھری ہے۔ کیونکہ اکثر اوقات دایہ کی گود خالہ نانی پھوپی کی گودی میں رہنا پڑتا تھا۔ اور سب کے چہرے یکساں نظر آتے تھے لیکن اُس زمانہ بے سمجھی میں بھی وہی آنکھیں سب سے زیادہ اچھی معلوم ہوتی تھیں حالانکہ اِسکا سبب جاننا میری طاقت سے باہر تھا۔ ایسی بے سمجھی کا عالم کچھ ہی دنوں رہا۔ میری عمر کے اُس زمانہ میں جسکو چھٹی چِلّہ کہا جاتا ہے۔ مجھ میں مادہ تمیز پیدا ہونے لگا۔ زیادہ تو نہیں لیکن اچھی طرح یاد ہے اتنا آرام کسی گودی میں نہ آتا تھا۔ جتنا اُس آرامگاہ میں۔ نہ معلوم کیوں؟ سب ہی مجھے آرام دیتے تھے میرے نیچے نرم سے نرم گدّے بچھائے جاتے تھپک تھپک کر خوشامد پسند

دایہ لوریاں دیتی لیکن ایک بے چینی تھی کہ برابر محسوس ہورہی تھی جسکا سبب خود مجھے معلوم نہ تھا۔

رفتہ رفتہ میری عمر میں زیادتی ہوتی گئی اور وہ دن آپہنچا جس دن میں نے اچھی طرح دیگر محبت کرنیوالیوں اور اپنی پیاری ماں میں تمیز کرلی۔ اور دماغ میں جما لیا کہ سب سے زیادہ چاہنے والی سب سے زیادہ شفیق یہی میری ماں ہے۔ ماں کے مفہوم کو سمجھنا ابھی میری سمجھ سے باہر تھا میں نے اپنے لیے اُسکو سب سے زیادہ شفیق نعمت غیر مترقبہ اور نعمت عظمیٰ سمجھا تھا۔ لیکن اِسوقت ماں ہی کہنا مناسب ہے۔ کیونکہ وہ دراصل ماں تھی۔ گو میرے لیے اُسوقت اِس رشتہ کا سمجھنا بہت مشکل تھا۔ ہاں تو کس طرح تمیز ہوئی۔ میں پہلا دن بیان کروں۔ یوں تو اکثر اوقات "رات میں" بالکل تنہائی میں سوتے میں۔ جاگتے میں مجھے بیحد محبت کرنی مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھنا مجھے دیوانہ وار چومنا اِس سے کچھ کچھ سمجھ میں آگیا تھا کہ سب سے زیادہ چاہنے والی یہی ہے۔ کیونکہ اور جو مجھے پیار کرتے تھے سب کے سامنے مجمع میں بکھیڑے میں جس سے میرا دل گھبراجاتا تھا طبیعت اُکتا جاتی تھی۔ اور یہ خالص محبت کرنے والی مجھے ہمیشہ تنہائی میں اور مجمع میں ایک نظر سے دیکھتی تھی ـــ چونکہ اِسکی طرف سے مجھے پیار کا حصہ زیادہ ملتا تھا۔ میرا ننھا دل بھی اسی کو زیادہ چاہتا تھا۔ ہاں تو جسدن مجھے یقین ہوا کہ میری ماں یہی ہے۔ وہ میری عمر کا چھٹا مہینہ تھا۔ میں نے تو پہلے بھی سمجھ لیا تھا۔ لیکن لوگوں کو جسدن یقین ہوا کہ اِسنے اپنی ماں کو پہچانا ہے وہ چھٹا مہینہ تھا۔ یوں ہوا کہ مجھے میری ماں کی گودی سے کسی نے لے لیا کچھ دیر تو میں نے خاموشی اور گھبراہٹ میں گزاردی۔ پھر رونا شروع کیا۔ اب کیا تھا۔ ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا مجھے لینے لگا۔ میرا دل تھا

جسکو کسی گود میں قرار نہ تھا۔ میری آنکھیں کچھ کھلی کچھ بند انہیں آنکھوں کو
ڈھونڈھ رہی تھیں کسی نے بھوکا سمجھکر دودھ دیا۔ کسی نے جھنجھنا بجاکر بہلانا
چاہا۔ میرا سنبھلنا مشکل تھا۔ آخر اسی محبت بھری گود میں مجھے پہنچایا۔ وہاں پہنچا
تھا کہ آنکھیں کھل گئیں۔ اُس دن کے بعد سے مجھے وہی گود دی مرغوب رہی اس
میں سب سے زیادہ آرام پایا۔ اس زندگی کا بہت سا حصہ انّا کی گود میں گزرا
جو دکھلاوے کو مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ لیکن میرے دلمیں اُسکی محبت
اتنی نہ تھی جتنی ماں کی۔ سبب یہ کہ انا کی نظریں مجھپر وہ محبت پاشی نہ کرتی
تھیں۔ جو میری ماں کی۔ ایک دن کھیلتے ہوئے مجھے چوٹ لگی۔ دوسری میری
ہمعمر نے مجھے گرادیا۔ انا نے چوطرفہ دیکھا۔ جب میری ماں نظر نہ پڑی تو آہستہ
سے اپنے کپڑے سنبھالتی ہوئی مجھ تک آئی۔ اور اُٹھایا۔ پیار بھی کیا لیکن اس
پیار سے مجھے ذرا آرام نہ ملا۔ ذرا اثر نہ ہوا۔ کیونکہ اُسکی نظریں مجھے ایسی نہ لگتی
تھیں جیسی میری ماں کی۔ اتفاقاً ایک دفعہ کھیلتے میں کسی نے اُلٹ کر مجھے
گرادیا۔ میری ماں مجھسے فاصلہ پر تھی جونہیں گرنے کی آواز گئی بے حواس
دوڑی آئی۔ نہایت تیزی سے مجھے اُٹھایا۔ سہلا سہلا کر چومنا شروع کیا۔ مجھے
اسوقت اس پیار کی اتنی خوشی نہ ہوئی اُن شفقت بھرے ہاتھوں کے سہلانے
سے اتنا آرام نہ ملا جتنا کہ اُن محبت بھری نظروں نے مجھے تسکین دی اور چوٹ پر
مرہم کا کام دیا۔ اوف۔ مجھسے بیان نہیں ہوسکتا۔ میری ماں نے کس کس طرح
میرے ہاتھ پیروں کو دیکھا کہ کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔ میرا گھٹنا چھل گیا تھا
کیسے ہاتھوں سے اُسجگہ کو دھویا جو روئی کے گالے سے زیادہ نرم تھے مگر جس
چیز نے میری دکھتی جگہ کو آرام دیا۔ وہ وہی محبت بھری نظریں تھیں جو بیتابی
کے ساتھ میرے چوٹ زدہ مقام پر پڑ رہی تھیں۔ اِسکے بعد میری عمر میں زیادتی

ہو تی گئی - میری تعلیم کا زمانہ آ پہنچا - میری ابتدائی تعلیم اُسی محبت بھری گود ہی میں پوری ہوئی - تربیت کے ساتھ ساتھ میری - کتابی تعلیم کی ضرورت ہوئی - کس چاؤ سے میری بسم اللہ کیگئی - کس محبت سے میری ماں نے قاعدہ پڑھایا وہ وقت کبھی نہ بھولے گا! جب میری عمر کا پانچواں سال تھا - اور صبح کے وقت میری پیاری ماں مجھسے سبق سنا کرتی تھی - کبھی پیار سے میریطرف دیکھنا کبھی کتاب کی طرف دیکھنا - اسکے بعد وہ زمانہ آیا کہ حصول علم کے لیئے مجھے ماں سے علیٰحدہ ہونا پڑا - زیادہ وقت سکول میں گزرتا تھا - شام کے قریب جب سکول سے واپسی کا وقت ہوتا - کیسی بیقرار نظروں سے میرا انتظار کرتی - مجھے آتا دیکھکر گود میں اُٹھا لیتی - گھر میں مجھے سب ہی پیار کرتے تھے - لیکن کسی نظر میں مَیں نے وہ کشش وہ محبت نہ پائی جو میری ماں کی نظروں قابل قدر نظروں میں تھی - میرے دلکو اطمینان تھا کہ یہی نظریں ہمیشہ میری حفاظت کرینگی - انہیں آنکھوں کے آگے میری تمام عمر گزر جائے گی - آہ - خبر نہ تھی کہ یہ نعمت چندروزہ ہے - پھر قیامت تک آنکھیں ترسیں گی اور یہ نظریں نہ پائیں گی - پیار محبت کرنیوالے میرے گھر میں بھی بہت تھے - ایک سے ایک زیادہ چاہتا تھا - لیکن جس چیز کی مجھے قدر تھی وہ محبت بھری نظریں تھیں جو اُن آنکھوں کے مٹ جانیکے بعد میں نے پھر نہ پائیں نہ پانے کی امید اور نہ پاؤں - آہ مجھے اُس منحوس دن کی خبر نہ تھی جسدن میری ماں کی وہ آنکھیں ہمیشہ کے لیئے بند ہونیوالی تھیں ہمیشہ بیمار رہا کرتی تھیں - میں نے سمجھا کہ اب بھی ایسا ہی ہوگا - یہ پیاری آنکھیں جو بیماری کی کمزوری سے تھکی ہوئی ہر وقت بند رہتی ہیں بہت جلد کھل جائینگی اور مجھپر وہی محبت پاشی کرنے لگیں گی - آہ اب ایسا نہونا تھا اور نہ ہوا - ایسی حالتِ بیماری میں بھی مجھپر وہی شفقت تھی - گھر کی خبر نہ تھی اور کسی چیز کا دھیان

نہ تھا۔ ذرا بھی افاقہ ہوتا تو مجھے پاس بٹھا کر دیر تک دیکھا کرتیں۔ اُسوقت ہیں مجھے اُن آنکھوں کی اور بھی قدر و محبت ہوگئی تھی۔ کیونکہ نہایت مشکل سے کھولکر مجھے دیکھا کرتی تھیں۔ آنکھیں نہایت کمزور تھکی ہوئی تھیں۔ طاقت بینائی کم ہوگئی تھی۔ کسی چیز کے دیکھنے کی خواہش نہ رہی تھی۔ لیکن ایک چیز تھی کہ اب بھی موجود تھی وہ کیا؟ وہی محبت آلود نظر جو میرے چہرے پر حسرت کے ساتھ پڑتی تھی۔ آہ اُن نظروں میں محبت کیساتھ ملی ہوئی ایک اور چیز بھی اب پائی جاتی تھی۔ وہ کیا؟ حسرت! گو میرا ناسمجھ دل اب بھی نہ سمجھ سکا اور اطمینان تھا کہ پھر بھی یہی نظریں اصلی حالت پر آجائینگی۔ لیکن محبت کیساتھ حسرت کے ملجانے سے اب وہ نظریں میرے دلمیں کھُبی جاتی تھیں۔ گو میری ماں نے نہ کہا تھا کہ اب یہ آخری نظر شفقت تم پر ہے۔ لیکن وہ دلمیں جانتی تھیں اور نہایت افسوس کی نظر سے مجھے دیکھتیں۔ آہ وہ وقت بھی کبھی نہ بھُولے گا جب میری ماں کی زندگی صرف چند منٹ باقی رہ گئی تھی جہاں وہ لیٹی تھیں۔ اُنکے سامنے میرے چھوٹے بہن بھائی کھیل رہے تھے۔ اُن میں سے ایک گر گیا اُس حالت میں جسکو نزع کہتے ہیں۔ اُس حالت میں جبکہ کسی چیز کے پہچاننے کی تمیز نہ تھی۔ اُس گرنے کی آواز پر گھبراہٹ سے باہر دیکھا۔ آنکھیں کھل نہ سکتی تھیں۔ لیکن پھاڑ کر دیکھا۔ آہ اُسوقت کی نظر دل کے پار ہوگئی کیسی نظر تھی بیان نہیں ہوسکتی۔ اسکے بعد آنکھیں بند کرلیں۔ ہائے بند کرلیں اور ہمیشہ کے لیئے کرلیں۔ اُسوقت معلوم ہوا کہ آج ہم سے وہ نعمت چھن گئی جو عمر بھر کسی طرح نہ پائینگے۔ اسکے بدل ہیں جان تک دیدینگے۔ تب بھی نہ پائینگے۔ آہ وہ نظریں۔ کیسی نظریں محبت بھری نظریں۔ کسکی؟ ماں کی۔ آہ اِس سے زیادہ دنیا میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ خوش قسمت ہیں جنپر پڑتی ہیں۔ زہے نصیب

اُن سے جو ماں کی آنکھوں سے آگے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ہر چیز کو کھو کر ہم پا سکتے ہیں نہیں پا سکتے تو ماں کی محبت۔ اگر قبر پر جائیں تو کیا خاک حاصل ہو۔ دنیا کے اور دلوں کی تو خبر نہیں۔ میرے دل میں تو جس قدر ماں کی محبت پاک شے نظر میں قابل قدر ہیں دوسری چیز نہیں۔ آہ اب میں محروم ہوں۔ اُن کا پانا مشکل یہ مشکل نہیں ناممکن۔ سب کچھ مل سکتا ہے اور نہیں مل سکتیں۔ تو آہ وہ نظر ہیں"۔

خاکسار۔ بنت نذر الباقر

غزل فارسی

نعرۂ حق در نیستاں میزنم | آتشے در خرمن جاں میزنم
میکنم خوش بادۂ گلگوں بجام | گوئے دوراں را بچوگاں میزنم
میشوم فارغ ز مرہم ہم علاج | در جگر پیکاں بہ پیکاں میزنم
عہد از اہد بہ تو بگزاشتم | حلقۂ در بت پرستاں میزنم
کعبہ یک جا با کلیسا مے نہم | طعنہ بر گبر و مسلماں میزنم
ہستی خود را خدا دانم ولے | نعرۂ توحید یزداں میزنم
نیست پیدا جز تلاطم سا حلے | دست و پا در بحر امکاں میزنم
در فراقِ روئے جاناں روز و شب | آب از دیدہ بداماں میزنم
میکنم سرمہ بچشم از خاکِ دل | خاک بر سر جائے افشاں میزنم
رہبرِ ظلمات دارم خضرِ دل | آتش اندر آب حیواں میزنم
خندہ بر اشعار من بسمل مکن | جملہ را القا وجداں میزنم

محمد یٰسین بسمل

انقلاب

(۲)

خدیجہ

گرہ جو پڑگئی رنجش کی وہ مشکل سے نکلیگی　　نہ اُنکے دل سے نکلیگی نہ میرے دل سے نکلیگی

آفتاب عالمتاب - اپنی سنہری کرنوں کا فرش، گوشۂ مشرق سے بچھانے لگا اور صبح کے گانے والے طیور - اپنے آشیانوں سے پر جھاڑ جھاڑ کر چہچہانے اور اِدھر اُدھر پھرنے نکل کھڑے ہوئے. نسیم سحری - کسی کے خرام ناز کا خاکہ اُڑانے، آہستہ آہستہ چلنے لگی، اور اذانوں وغیرہ کی آوازیں آئیں. اپنے اپنے مذہب کے پابند، عابد زاہد - قدم بڑھائے، عبادت خانوں کی طرف چلنے لگے، اور ننھے ننھے بچوں نے چارپائیوں پر کروٹیں بدلنی شروع کیں. خانصاحب کی بیوی، اور اُنکی تینوں بہوئیں، عرصہ ہوا کہ اُٹھ بیٹھیں، اور ضروریات سے فارغ ہو کر، وضو کرکے اور نماز پڑھنے میں مشغول ہوگئیں - اتائیں، مامائیں بھی ایک ایک کرکے اُٹھتی جاتی ہیں. اور جھاڑو بہارو کے سر ہوتی جاتی ہیں. ہاں سارے گھر میں چھوٹی دُلہن، میاں شیر علیخاں کی بیوی ہیں جو اب تک پلنگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی ہیں. شیر علیخاں - بذات خود اگرچہ گریجوئٹ، نئے زمانہ کے تہذیب یافتہ سہی - مگر پھر بھی مذہب کے ایک درجہ تک ضرور پابند ہیں - وہ بھی نماز کے وقت اُٹھے، اور نماز سے فارغ ہو کر باہر چلے گئے. البتہ اُنکی بیوی خدیجہ جن کی شادی ہوئے آج ڈیڑھ برس ہونے آیا کبھی ٹھوکر کھا کر بھی قبلہ کی طرف نہیں گرتیں ؛

دھوپ پھیلی، دن چڑھا، اور سودے والیوں نے خانصاحب کے دروازے پر آوازیں لگانی شروع کیں۔ خدیجہ نے جو اب تک کروٹ لیے لیٹی ہوئی تھیں ایک ملائی والی کو بلایا اور اُس سے کہا "بُوا! آدھ سیر ملائی تول دے۔" یہ عورت جو میلے کچیلے کپڑے پہنے تھی، زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور ایک پتے پر رکھکر ملائی تولنے لگی۔ خدیجہ کی ساس جو ابھی وظیفے سے فارغ ہوئی تھیں، آ کھڑی ہوئیں، اور ملائی والی سے پوچھنے لگیں "ملائی تول رہی ہے۔ چھوٹی دُلہن نے لی ہوگی؟ کتنے سیر دی؟"

ملائی والی۔ "بیوی! آٹھ آنے سیر دی ہے۔"

خدیجہ کی ساس۔ "اے ہے بُوا! کل ہی شام کو بڑی دُلہن نے منگائی ہو پانچ پیسے کی پاؤ سیر آئی تھی۔ تو۔ تو بڑی مہنگ ہوئی ہے۔"

ملائی والی (ملائی کا پتہ چھوٹی دلہن کے ہاتھ میں دیکر) "وہ ملائی نہ ہوگی، دودھ کے جھاگ ہونگے۔"

خدیجہ کی ساس۔ "کیا میں نے دیکھی نہیں تھی! یہ بھی وہی ہوئی کہ تو آنکھیں کھول میں خاک ڈالوں۔ واہ! تو تو عورت جوتیوں سمیت آنکھوں میں گھسی جاتی ہے۔ اور خوبی یہ کہ پتے میں ملائی دی ہے۔ کیا گھر کے سارے برتن اُجڑ گئے تھے۔"

خدیجہ کی ساس ابھی اپنا فقرہ ختم بھی نہ کر چکی تھیں کہ خدیجہ نے چونی تو ملائی والی کو دی۔ اور ملائی جو پتے پر رکھی ہوئی تھی، اُٹھا کر انگنائی میں پھینک دی۔ اِدھر تو ملائی والی سر پر پاؤں رکھکر بھاگی، اُدھر خدیجہ کی ساس اپنے آپ کو ضبط کیے خاموش اپنے کمرے میں چلی گئیں؛ شیر علیخاں کی مامتا، اور خدیجہ کا برتاؤ۔ یہ دو متضاد خیالات تھے، جو رہ رہ کر اُنکے دل میں آرہے تھے، اور وہ نہ معلوم کیا کچھ سوچتے سوچتے آبدیدہ ہوگئیں۔ انکی یہ ہی حالت تھی کہ اِنکے میاں، یعنی خاں صاحب

تشریف لائے اور سارا واقعہ معلوم کرکے اُلٹے قدموں باہر چلے گئے۔ مگر بی خدیجہ
اسیطرح مُنہ پر لپیٹے، اٹوائی کھٹوائی لیئے، پڑی ہیں اور تُسر تُسر رونے کیساتھ ہی
بڑبڑاتی بھی جاتی ہیں۔
دھوپ میں گرمی بڑھی، آفتاب بہت اونچا ہوگیا، اور گھنٹے کی چھوٹی سوئی
دس سے آگے سرک گئی۔ گرمی کا موسم۔ آسمان پر گرد، ہوا میں تلاطم، لُو کی پریشانی۔
میاں شیر علیخاں دیوانخانے کے بڑے کمرے میں کواڑ بند کیئے، آرام کرسی پر لیٹے
ٹنی سن کی ایک تصنیف سے اپنا دل بہلا رہے تھے، کہ کمرے کے کواڑ کھُلے، اور
ایک بُڈھا شخص جسنے گھستے ہی سلام کیا، اندر آیا اور ایک رقعہ دے کر واپس چلا گیا
شیر علیخاں نے کتاب کو بند کرکے کرسی کے بازو پر رکھدیا، اور رقعہ پڑھنے لگے۔ لکھا تھا
لخت جگر! نور بصر! خدا تمھیں خوش رکھے۔
میں جانتا ہوں کہ تم مجھے اور اپنی ضعیف والدہ کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہو، اور
ہر طرح اطاعت و دلجوئی کرتے ہو۔ مگر کمسن ہو، ناتجربہ کار ہو، دنیا کی گرم سرد ہوا ابھی تم نے
نہیں کھائی۔ تمہیں خیال ہوگا کہ جب تمھاری شادی ہوئے ایک مہینہ گزرا تھا،
تو میں نے تمہیں کچھ نصیحتیں کی تھیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ بیوی کی ناجائز حرکت
کا جواب دہ اُسکا شوہر ہوا کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ تم میری بات کی تہ کو نہ پہنچے،
اور گربہ کشتن روز اول، کا خیال تمہیں نہ رہا۔ تمھاری بیوی۔ خدیجہ بیگم۔ خدا اُن کو
نیک ہدایت دے۔ اچھے رستے پر نہیں چلتیں۔ برخوردار میری عادت چھوٹی
چھوٹی شکایتیں سُننے کی نہیں اور نہ سر بات میں بگڑ جانا میں اچھا سمجھتا ہوں۔
کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ تمھارے بھتیجے منیر کو اُنھوں نے بیخطا مارا، بڑی دلہن اور
منجھلی دُلہن کو سیکڑوں دفعہ بُرے الفاظ سے یاد کیا، اور منجھلی دُلہن بیچاری
کو تو ہر وقت بُرا بھلا کہتی رہتی ہیں۔ اِن سب باتوں کے علاوہ اُن کے اوقات و

معمولات خدا جانے کس قسم کے ہیں۔ ہماری تو سمجھ میں آتے نہیں، یا بقول ان کے واقعی ہم بڑھاپے میں مخبوط الحواس ہو گئے ہیں، ہم میں فضول نکتہ چینی اور خواہ مخواہ بک بک کی عادت پیدا ہو گئی ہے۔ ابھی کوئی دو مہینے ہوئے کہ اُنہوں نے صرف نمک زیادہ ہونے پر کھانا اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اطاعت و محبت تو چولھے میں گئی۔ وہ اب کسی سے سیدھے مُنہ بات بھی نہیں کرتیں۔ خیر وہ جانیں تم ضرور سمجھو گے کہ ہمیں اُنکی کسی قسم کی اطاعت کی ضرورت ہے، خدا حاضر و ناظر ہے کہ مجھے یا تمہاری والدہ کو کسی قسم کی ضرورت نہیں۔ اب تک بفضلہ میں کسی لڑکے کا شرمندہ نہیں ہوں اور نہ خدا آئندہ کرے۔ میرے ہاتھ پاؤں بھی ابھی، شکر ہے کہ چلتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ خدا اُنکی عمروں میں ترقی دے، میری تینوں بہوئیں میرا اور میری بیوی کا ہر طرح خیال رکھتی ہیں۔ اور ہر دم ایک اک روکھٹا کیسی ہتی ہیں۔ میاں شیر علی! میں نے تم سے پیشتر تین لڑکوں اور ایک لڑکی کی بھی شادی کی ہیں۔ اگر میری بہوؤں کی یہ حالت ہوتی۔ تو شاید میں آج زندگی سے بیزار ہوتا۔ اور تو اور، مجھے تو بفضلہ داماد بھی ایسا ملا ہے کہ بیٹے میں اور اُسمیں فرق نہیں۔ مگر افسوس اور سخت افسوس تمہاری بیوی کا ہے۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ مجھے یا تمہاری والدہ کو کچھ نہیں سمجھتیں، نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ دیکھئے اس مزاجی اور خود رائی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ برخوردار! ہم تو بڈھے ہو گئے، ہمارے ہوش حواس درست نہیں، عقل ٹھیک نہیں، بکتے ہیں اور فضول بکتے ہیں۔ اس قابل نہیں کہ خدیجہ بیگم کبھی بھولکر ہمیں سلام بھی کریں۔ مگر تم خود سمجھو کہ تمہاری بھاوجیں، تم سے بڑی ہیں وہ کسی طرح تمہاری بیوی کی ناجائز ترش روئی ہرگز نہ اُٹھائیں گی۔ تم بفضلہ جوان ہو، سمجھدار ہو، گریجوئٹ ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تمہارے تینوں بھائی جو انگریزی تعلیم یافتہ ہیں، کیوں

ایک ایک بات کا خیال رکھتے ہیں؟ اور کیوں اُنکی بیویاں اسقدر ہماری خدمت کرتی ہیں؟ عزیز از جان! تم نے سرکس میں دیکھا ہوگا کہ شیر اور چیتے، طوطے اور پرند کسطرح کام کرتے ہیں۔ آخر اسکی وجہ کیا؟ میری سمجھ میں تو یہ ہی آتا ہے، کہ صرف سدھانا اور سنبھالنا۔ بس یہ ہی حالت ایک نئی دُلہن کی ہوتی ہے، جو نئے گھر میں آتی ہے، نئی صورتیں دیکھتی ہے۔ اور نئی باتوں سے سابقہ پڑتا ہے! اُسے جسطرح سدھایا جائے، جس طرف لگایا جائے، وہ لگ جائیگی۔ برخوردار! تم میرا یا اپنی والدہ کا خیال نہ کرو، ہاں! اپنا خیال کرو، اور ضرور کرو، مجھے سب سے زیادہ تمھارا ڈر ہے فقط،" "تمھارا دیوانہ باپ ......!"

اس رقعہ میں خدا جانے بجلی کا اثر تھا یا مقناطیسی قوت تھی کہ آنکھیں حرفوں پر جمی کی جمی رہگئیں۔ شیر علیخاں نے اُسے پڑھا اور پھر پڑھا، کچھ سوچا اور تہ کرکے جیب میں رکھ لیا، کتاب اُٹھائی اور دیکھنے لگے۔ آنکھیں کتاب کی طرف تھیں اور نظریں الفاظ پر، مگر کچھ سوجھتا نہ تھا۔ دماغی خیالات کے اُلجھاوے نے کتاب کو بھلا کر خدیجہ کی تصویر پیش نظر کر رکھی تھی۔ یہ دیکھتے تھے، مگر کہتے کچھ نہ تھے؛ یہ پڑھتے تھے، مگر سمجھتے کچھ نہ تھے۔ اِن ہی دماغی گلتھیوں کو سُلجھاتے سُلجھاتے اِنھیں بہت دیر ہوگئی ...... اور کلاک نے جو دیوار میں نصب تھا۔ ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ گھنٹے کی آواز کے ساتھ ہی یہ اُٹھے اور کتاب کو میز پر رکھ، ٹوپی ہاتھ میں اُٹھا، سیدھے گھر میں چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی صبح کا نیا واقعہ بھی معلوم ہوا۔ یہ اپنے کمرے میں گھسے اور اُسوقت تک باہر نہ آئے جب تک کہ ظہر کی نماز کا آخری وقت نہ ہوگیا۔

شیر علیخاں، تعلیم یافتہ، مہذب، اور نہایت سمجھدار نوجوان تھے! اسکے ساتھ ہی خدیجہ سے اِنھیں دلی لگاؤ تھا۔ انھوں نے جو کچھ کہا۔ اور بہت کچھ کہا، مگر پیار کے

میں : سمجھایا۔ اور خوب سمجھایا۔ مگر نہایت ہوشیاری سے۔ لیکن " تربیت نااہل راچوں گردگان بر گنبد است " ۔ خدیجہ ٹھہری چکنا گھڑا۔ بوند پڑی اور پھسل گئی۔ اس کان سنی اُس کان اڑائی۔ اور اگر کچھ فرق بھی ہوا تو یہ پہلے گھر والوں سے کسیوقت ہنس لیتی تھی اب وہ بھی ندارد۔ دن بھر وہ اللہ کی بندی تھی اور چارپائی۔ نہ چلنا نہ پھرنا، نہ اٹھنا نہ بیٹھنا، موقع لگ گیا تو جھٹ اپنی ماما کے ہاتھ اپنی اماں کو کہلا بھیجا کہ اب مجھے بلالو۔ خدیجہ کی ماں خدیجہ سے جہالت میں کچھ کم نہ تھیں، ہر وقت سر ہوتے ہوتے انہوں نے محمود سے بلانے کا اقرار لے ہی لیا۔ مگر آمدن باراوت ورفتن بہ اجازت، محمود بیچارے کیا کرسکتے تھے : تیسرے چوتھے نہ آج جانے دیتے ہیں نہ کل، آدمی آتا ہے اور واپس جاتا ہے، ڈولی آتی ہے اور الٹی پھرتی ہے، مگر بی خدیجہ کیا ممکن ہے جو قدم بھی نکال سکیں۔

قیود اور روک ٹوک کا اثر، اونگھنے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ بی خدیجہ نے رو رو کر آنکھیں سوجالیں، بھوکی رہتے رہتے رنگت زرد کرلی، اور ہر وقت پڑے پڑے بخار چڑھالیا۔ خانصاحب بیچارے گھبرا گئے اور فوراً حکیم صاحب کو بلالیا۔ اب کیا تھا ؛ دن میں دو دو مرتبہ دوا دیجاتی ہے، خانصاحب کی بیوی اور اُنکی بہوئیں ہر وقت خدیجہ کا منہ اور آنکھ ہی دیکھتی رہتی ہیں۔ مگر خدیجہ کی حالت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔ سارے کا سارا گھر پریشان ہوگیا اور دو ایک دن کے بعد خدیجہ کی ماں، پھوپھی، خالہ، اور چھوٹا بھائی عزیز، سب ایک ایک کرکے آگئے۔

بیماری کا جنجال، کمزوری وفاقہ، اُدھیڑ بُن ہو حسد، تیز مزاجی اور جلا پا طبیعت سنبھلتی تو کیونکر؟ اور افاقہ ہوتا تو کس طرح؟ دن بھر میں دس دس مرتبہ تو، سر میں چکر، خدا جھوٹ نہ بلائے تو ہم گھنٹے میں آٹھ سات دفعہ دورہ ہوتا تھا۔ پھر دورہ کی شکل نعوذ باللہ من ذالک! گھبراہٹ، خفقان، تشنج، اور بے ہوشی۔ حکیم،

ڈاکٹر، ملّا نے سیانے، دوا ڈھونڈائی، گنڈا تعویذ، نقش دم، کچھ نہ اُٹھا رکھا۔ ایک خدیجہ تھیں اور دس بارہ بندے، سنبھالے نہ سنبھلتی تھیں: تمام دن ہائے ہائے کا شور وغل تیمارداروں کو گھبرائے دیتا تھا۔ کھانا پینا بند، نیند حرام، سب کے سب بیچارے ہر وقت ہاتھ پاؤں ہی سیلاتے رہتے۔ میاں شیر علی کے سارے منصوبے رفو چکر، تمام پیش بندیاں غارت، اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے: وہ بھی ہر وقت گھیرائے گھبرائے پھرتے اور ہر طرح خدیجہ بیگم کی خوشنودی مزاج سب کے مدِ نظر رہتی۔

باقی آیندہ

فرانڈی اور مارگیٹ کے جنگ کیوقت فرانسیسی شرفا میں صرف ایک شخص تھا جکی بابت کہا جاتا ہے کہ اُس نے اپنے قلعہ کے دروازے بے کھٹکے ہو کر کھُلے رہنے دیئے تھے۔ کیوں؟ صرف اپنی عادات و خصائل کے بھروسہ پر۔ سچ ہے خصلتیں جمعیت سے زیادہ محافظ اور امن و امان کے ذمہ دار ہیں۔ خصلت فی نفسہ ایسی قوت ہے جو علم و دولت کی قوت سے وسیع تر ہے۔ ارادہ بغیر دل کے، محنت بغیر چال چلن کے، عقل بغیر بھلائی کے اپنی اپنی جگہ قوتیں شمار کیجا سکتی ہیں لیکن کچھ شک نہیں کہ یہ قوتیں بغیر ان صفات کے نقصان رساں اور ارادہ ہونگی۔ سچائی۔ ایمانداری۔ نیکی یہ سب ایسی صفات ہیں جو انسان کے سامنے موجود رہتی ہیں جس میں یہ نعمتیں موجود ہیں وہ اپنے ساتھ ایسی قوتیں رکھتا ہے جن کی مزاحمت کی قدرت اس دنیا کے بڑے سے بڑے شخص میں نہیں ہے۔ وہ بھلائیوں کی اشاعت میں ایسا ہی زبردست ہے جسقدر برائیوں کے روکنے میں منضبط ہو۔ تکالیف و مصائب کے طوفان میں اسکے پائے استقلال کبھی نہ لڑکھڑائینگے۔

ترجمہ شفیع الدین خاں

چند شاعر عورتیں

بعض لوگوں کا خیال ہی کہ دنیا جوں جوں تہذیب میں ترقی کرتی جاتی ہی شاعری کی طرف کم توجہی ہوتی جاتی ہی یا بالفاظ دیگر شاعری زمانہ جہالت کا زیور ہی بہر حال یہ خیال صحیح ہو یا غلط مگر اسمیں شک نہیں کہ آجکل شاعری کا شوق پہلے کی نسبت کم ہی اور دن بدن کم ہوتا جاتا ہے. باوجودیکہ ایشیائی طریق معاشرت میں ذکور و اناث کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل ہی جو دونوں کی بود و باش و ذوق شوق میں ایک لازمی اختلاف پیدا کرتی ہی. تاہم یہ قاعدہ کی بات ہی کہ مردوں کے مذاق کا اثر عورتوں پر پڑے جس زمانے میں شجاعت و بہادری بہترین خوبیاں سمجھی جاتی تھیں - جنگ جدال کرنا شریفوں کا پیشہ تھا مردوں کی طرح عورتیں بھی اسپ تازی کرتی تھیں اور تلوار چلاتی تھیں اسیطرح جب مردوں کو شاعری کا شوق تھا تو عورتیں بھی اس فن میں اُنکی پیروی کرتی تھیں یہ بعض صورتوں میں مردوں کو نیچا دکھاتی تھیں مسلمانوں میں بہت سی مشہور معروف شاعرہ خواتین گزری ہیں - اسمیں شک نہیں کہ پہلے زمانہ میں دو ہی قسم کی عورتیں تعلیم حاصل کرتی تھیں یا امیر زادیاں جنکو مشاغل دنیا سے فراغت ہوتی تھی اور حصول علم کے ذرائع نصیب تھے یا ارباب نشاط جن کو امیر زادیوں سے کسی طرح کم فارغ البالی نہ تھی شعر کہنا نہ صرف ذہانت و فراست طبع کا ثبوت تھا بلکہ علمی قابلیت و دماغی وسعت کا بھی اُس سے ایک قسم کا اظہار ہوتا تھا. چنانچہ جو خواتین زیور علم سے مزین ہوتی تھیں وہ شعر گوئی اپنا فرض سمجھتی تھیں. نورجہاں اور زیب النساء تو خیر شہرۂ آفاق ہیں ہی مگر انکے علاوہ بھی بہت سی اور قابل و فاضل خواتین گزری ہیں جن کی شاعرانہ ذہانت کے متعلق مزے مزے کی دلچسپ روایتیں اور لطیفے مشہور ہیں چنانچہ جن اصحاب کو شطرنج کھیلنے کا شوق ہے اُنہوں نے " فیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشت

مات" کا نقشہ ضرور سیکھا ہوگا۔ اور اسکے متعلق جو روایت ہے وہ عورتوں کی شاعرانہ ذہانت کی نہایت لطیف مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ ایران کی چار بیویاں تہیں جو شاعرہ بھی تہیں۔ ایک کا تخلص جہان تھا۔ دوسری کا تخلص حیات تھا۔ تیسری کا تخلص فنا اور چوتھی کا دلارام۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ بادشاہ نے کسی شاطر سے شرط بدہ کے شطرنج کھیلی۔ اور شرط یہ تھی کہ اگر بادشاہ ہار گیا تو اپنی بیوی حریف کے مقابل نذر کرے گا۔ حسن اتفاق سے بادشاہ کی بازی دبنی شروع ہو گئی حتی کہ ایک چال ایسی سخت آپڑی کہ بادشاہ بالکل زچ ہو گیا اور بچنے کے لیئے کوئی گھر نہ رہا۔ جب بادشاہ نے یہ دیکھا کہ اگلی چال میں مات ہوتی ہے تو وہ بہت پریشان ہوا۔ بادشاہ نے پس پردہ اپنی چاروں بیویوں کو بلایا اور ان کو شطرنج کا نقشہ دکھایا اور کہا کہ اب اگلی چال میں مات ہی۔ اب بتاؤ تم میں سے کس کو جیتنے والے حریف کے نذر کروں۔ اسپر پہلی بیوی نے جس کا تخلص جہان تھا۔ فی البدیہ یہ شعر کہا جس سے اسکی نجات ہوئی

تو بادشاہ جہانی جہان ز دست مدہ ۔۔۔ کہ بادشاہ جہاں را جہاں بکار آید

یہ سنکر اور تینوں بیویاں بہت سٹ پٹائیں کہ اس نے تو خوب چھٹکارا پایا۔ خیر اب دوسری بیوی کی جسکا تخلص حیات تھا باری آئی اُس نے بھی فوراً یوں گہرافشانی کی

جہاں خوش است ولیکن حیات میباید ۔۔۔ اگر حیات نباشد جہاں چہ کار آید

اب تیسری بہت چکر میں ہوئی مگر اُسنے بھی اپنی طبیعت پر زور دیکر یہ جواب موزوں کیا

جہان و حیات ہمہ بے وفاست ۔۔۔ فنا را نگہدار آخر فناست

یہ تینوں تو ایک ایک شعر کہکر چھٹ گئیں۔ اب چوتھی بیوی کا نمبر آیا جو شاطرہ بھی تھی۔ جہان و حیات و فنا تو شعر بازی میں مشغول تھیں اور دلارام شطرنج کی بازی دیکھ رہی تھی۔ اب جو بادشاہ نے اُس سے استفسار کیا تو اُس نے جواب دیا +

شاہا دو رخ بدہ و دل آرام را مدہ ۔۔۔ فیل و پیادہ پیش کن و اسپ کشت مات

دلارام کے اور بھی شعر مشہور ہیں۔ یہ تو خیر بادشاہ بیگمیں تھیں۔ مگر اُس زمانہ کی بعض بعض لونڈیاں اور خواصیں بھی شعر گوئی میں ماہر ہوتی تھیں چنانچہ زیب النساء متخلص بہ مخفی کی ایک کنیز تھی جسکا نام یا تخلص آمانی تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بہار کا موسم تھا۔ اور صبح کا وقت تھا اور زیب النساء اپنی کنیز کو ساتھ لیے چمن میں ٹہل رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے اُسکی نظر جو کھلے ہوئے پھولوں پر پڑی تو از راہ استغسار ظریفانہ اپنی کنیز سے کہا ہ "اے امانی گل صد برگ چرا میخندد" امانی نے فوراً جواب دیا۔ "بر بقائے خود و بر غفلت ما میخندد" اسی آمانی کا ایک اور شعر یہ مشہور ہے ؎

آنقدر روز ازل تیرہ نصیبم کردند | تیرگی میطلبد شام غریبان از من

امانی کی مالکہ خود مشہور و معروف شاعرہ نازک خیال تھی زیب النساء کا تخلص مخفی تھا اور وہ سعید اشرف بن صالح مازندرانی صفہانی کی شاگرد تھی۔ اس کا سب سے مشہور شعر یہ ہے ؎

آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار ما | بس نازک است شیشۂ دل در کنار ما

یوں تو زیب النساء کے لطائف و ظرائف بہت ہی کچھ مشہور ہیں مگر عاقل خاں رازی سے جو اُسکے سوال و جواب ہوئے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں زیب النساء کا شعر ہے کہ

گرچہ من لیلیٰ اساسم دل چو مجنوں در ہواست | سر بصحرا می‌زنم لیکن حیا زنجیر پاست

اسپر کہتے ہیں کہ عاقل خاں رازی نے لکھا کہ

عشق تا خام است باشد بستۂ ناموس و ننگ | پختہ مغزان جنوں لے کے حیا زنجیر پاست

جسکے جواب میں وہ عندلیب ہزار داستان یوں دُر افشاں ہوئی ؎

پاک بازان محبت را حیا باشد مدام | چوں تو مرغ بے حیا را کے حیا زنجیر پاست

اس غزل کا مقطع جس میں زیب النساء کا پورا نام ہے یوں ہے ؎

دختر شاہم۔ و لیکن رو بفقر آوردہ ام | زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النساست

ایک جگہ اپنی تعریف میں اور فارسی شاعری کے رواج دینے کے متعلق لکھتی ہی

آفریں بر جگرم باد کہ در کشورِ ہند — سکۂ نقد سخن رائج ایران زدہ ام

اُسی کی رباعی ہے ؎

دل بصورت ندہم ناشدہ سیرت معلوم — بندۂ عشقم و ہفتاد و دو ملت معلوم

زاہدا ہول قیامت بدلِ ما مفگن — ہول ہجراں گزرانیدیم قیامت معلوم

زیب النساء کے بعد نور جہاں کا نمبر آتا ہے نور جہاں اگرچہ صاحب دیوان شاعرہ نہ تھی مگر حاضر جوابی میں طاق تھی۔ جہانگیر و نور جہاں کے چوچلوں کے بہت سے لطائف مشہور ہیں۔ ایک دفعہ جہانگیر نے عید کا چاند دیکھکر یہ مصرعہ موزوں کیا ع "ہلالِ عید بر اوجِ فلک ہویدا شد" ملکہ کیطرف دیکھا۔ نور جہاں نے اپنے مجازی خاوند کے حسب حال فوراً دوسرا مصرعہ لگا دیا ع "کلیدِ میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد" بادشاہ کے لباس کے تکموں کی تعریف میں ایک موقع پر نور جہاں نے یہ شعر فی البدیہ کہا تھا۔

ترا نہ تکمہ لعل ست بر لباس حریر — شدست قطرۂ خون منت گریباں گیر

یہ رباعی نور جہاں ہی کی ہے ؎

نو رم نا رم حدیقہ ام گلزارم — دیرم صنم برہمنم زنارم

نے نے غلطم آنچہ گفتیم نیم — بوے گلم و طبیعت گلزارم

سلطان رضیہ بیگم بھی فن شعر گوئی سے خالی نہ تھی۔ سلطان رضیہ کا تخلص کہتے ہیں شیریں تھا۔ یہ شعر اُسی کے کہے جاتے ہیں ؎

باز آ شیوں منہ در راہ الفت کام خویش — ہاں مگر نشنیدہ باشی قصۂ فرہاد را

مطلب من نو سُخ خورشید جز ایں چہ

بسمل شدۂ تیغ نگاہِ غضب ماست

از ماست کہ بر ماست چہ تقصیر دلِ زار
آں کشتۂ انداز غم بے سببِ ماست

کنم بہ برکت پا چرخ تختِ سلطانی دہم بہ بال ہما خدمت مگس رانی

یہ تو شاہزادیوں اور انکی خواص کے حالات ہیں۔ عام خواتین اور امیرزادیاں بھی اچھے اچھے شعر کہتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جہان خاتون عبید و سلمان کی ہمعصر تھی۔ سنا ہے کہ عبید اس سے شادی کا خواستگار تھا۔ مگر جب اس نے دوسرے کسی شخص سے شادی کر لی تو عبید نے اسکو ایک قطعہ لکھ بھیجا۔ جس کا آخری مصرعہ یہ ہے ع خدائے جہاں را جہاں تنگ نیست ٭ عبید نے اُس شاعرہ کی تعریف میں کہتے ہیں کہ یہ شعر لکھا تھا ے

گر غزلہائے جہاں خاتوں بہندوستاں فتد روح خسرو ہم بخود گوید کہ ایں کس گفتہ است

سُنا ہے کہ حافظ نے جو یہ شعر لکھا کہ

اعتمادے نیست بر کارِ جہاں بلکہ بر گردونِ گرداں نیز ہم

تو جہان خاتون سمجھی کہ اسپر چوٹ ہے۔ فوراً جواب لکھا کہ

حافظا ایں مے پرستی تا بہ کے مے ز تو بیزار و مستاں نیز ہم

اِسیطرح علی قلیخاں کی بھانجی جو سُنا ہے نہایت خوبصورت اور نازک اندام لڑکی تھی اور جسکی شادی عمادالملک سے ہوئی تھی۔ نزاکت کا یہ حال تھا کہ وزن میں کئی مرتبہ نوسو روپیہ بھر تُلی۔ پھولوں میں تُلنا جو سنتے آئے ہیں وہ ایسی ہی گل اندام خواتین کا واقعہ ہوگا۔ اس بیگم کی ایک رباعی مشہور ہے ے

فوارہ ز سر گوشہ شرارہ بر زد از تار ترشح گرہ گوہر زد
نے نے غلطم کہ در رگِ ریشۂ آب فصادِ ہوا ہزار جا نشتر زد

کہتے ہیں کہ جب اس بیگم کا ایک بچہ فوت ہو گیا تو اُس نے اپنے خاوند کو یہ شعر لکھ بھیجا ے

از حال ما مپرس کہ دل چاک کردہ ام   لخت جگر بریدہ تہ خاک کردہ ام

ایک شاعرہ تھیں جنہوں نے اپنے نکاح کا انحصار اس رباعی کے جواب پر رکھا تھا کہ جو شخص اس کا جواب دیگا اس سے شادی کروں گی ؎

ازمرد برہنہ روئے زری طلبم   از خانہ عنکبوت پرمے طلبم
من از دہن مار شکرے طلبم   از پشہ مادہ شیر نر میطلبم

اسپر کہتے ہیں کہ بعبارت سعد اللہ خاں نے جواب میں یہ رباعی لکھی ؎

علم ست برہنہ روکہ تحصیل زر است   تنخانہ عنکبوت دل بال و پر ست
زہر ست جفائے حلم معنی شکر ست   ہر پشہ کزو چشید آں شیر نر ست

چنانچہ دونوں کی شادی ہوگئی۔ ان بیگم کا تخلص نہانی تھا۔ اور یہ دلّی کی رہنے والی اور شاہ سلیمان کی والدہ کی جلیس تھیں۔ دو ایک گمنام پردہ نشین صاحب عصمت خواتین کی شاعری کے متعلق دلچسپ لطیفے مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کسی پردہ نشین کے پیچھے ایسا مفتون ہوا کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور باآواز دردناک یہ شعر پڑھتا اور روتا تھا ؎ درعشق تو انگشت نمائے زن و مردم ؛ ہر لحظہ فزون ست زسودائے تو دردم
کسی رحمدل نے ترس کھاکر پوچھا کہ بابا تجھپر آخر کیا مصیبت پڑی ہے۔ اور اس شعر کا کیا مطلب ہے؟ اس نے جواب دیا۔ اس کا مطلب جب معلوم ہوگا جب فلاں محلے میں فلاں مکان پر جاکر یہ رباعی پڑھ آوگے ؎

درعشق توام طاقت تنہائی نیست   در ہجر توام روئے شکیبائی نیست
تا وسع تواں بود تحمل کردم   دیگر چہ کنم۔ وسع توانائی نیست

کہتے ہیں کہ جب اُس شخص نے مکان مذکور پر جاکر یہ رباعی پڑھی تو اندر سے ایک بڑھیا عورت نکلی اور اُسنے کہا کہ اُس مجنون سے کہنا کہ تیری لیلےٰ نے یہ جواب دیا ہے ؎

درعشق کسی راکہ توانائی نیست   در ہجر تحمل و شکیبائی نیست ؎

اُردو سبھا

مارچ کے مخزن میں اردو سبھا کے متعلق بعض معاصرین کی آرا کا خلاصہ درج ہو چکا ہے۔ بعض اور رائیں ابھی قابل اندراج ہیں اور اُن پر مفصل بحث بھی ابھی باقی ہے۔ مگر اس مرتبہ اُن خطوط کا انتخاب شائع کرنا لازم ہے جو اطراف جوانب سے اردو سبھا کے قائم کرنے کی تائید میں آئے اور آرہے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فہمیدہ اور علم دوست حضرات اس ملکی اور قومی خدمت کی اہمیت کا پورا احساس کرتے ہیں۔ اور ہر طرح سے اعانت کو آمادہ ہیں۔ زیادہ مسرت اس بات سے ہوتی ہے کہ تائید کا اظہار صرف مسلمان شعرا و مصنفین کی طرف سے ہی نہیں ہوا بلکہ معقول پسند ہندو اور عیسائی صاحبان نے بھی اس تجویز سے موافقت ظاہر کی ہے۔ بعض حضرات کا خیال تھا کہ ہندو صاحبان کو اس تجویز سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ یہ خیال بے بنیاد نہ تھا۔ اُس کوتاہ اندیش تعصب پر نظر ڈالیں جو آئے دن اردو ہندی اور اردو پنجابی جیسے قضیوں کا باعث ہوتا ہے۔ اور دھڑے بندی کی بدترین صورتیں اختیار کرتا ہے تو ہندوؤں کا کسی ایسی تحریک سے جُدا رہنا جو مسلمانوں کی طرف سے شروع ہو۔ یا مسلمانوں کا کسی ایسی تحریک سے علیحدگی پسند کرنا جسکے بانی ہندو ہوں۔ ایک قدرتی بات ہے مگر باوجود ان حالات کے ہماری یہ خواہش بھی کہ کوئی ایک کام تو ایسا نکلے جسے ہندوستان کی مختلف قومیں اپنی متفقہ غرض سمجھیں اور ملکر کر سکیں۔ ایک قدرتی خواہش ہے جسکا پورا ہونا ملک کی آیندہ بھلائی کا ذریعہ ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اس آرزو کی راہ میں دشواریاں بیشمار ہیں لیکن استقلال اور نیک نیتی سے آخر کار کامیابی کی قوی امید ہے۔ نیک نیتی کے ثبوت کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ اوّل نیت کا اعلان صاف لفظوں میں دوسرے اسکے مطابق عمل۔ اعلان آج کیے دیتے ہیں۔ عمل دیکھنے والے بعد کو دیکھ لیں گے۔ ہر شخص

کیونکہ میں اُس خوشی کا اظہار کرنا چاہتا ہوں جو مجھے مخزن بابت ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء میں "اردو سبھا" کے متعلق آپکا اعلان پڑھکر ہوئی ۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اہل ہندوستان کو ایک نیشن بنانے کے واسطے اسی ایک چیز کی ضرورت سب سے زیادہ ہے میں آپکی تجویز کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں" +

(۲) مسٹر احمد شاہ صاحب مورخہ ۱۶ ۔ فروری سنہ ۱۹۰۹ء از کراچی

"میں نے آپکا اعلان اردو سبھا کی بابت پڑھا ہے ۔ اور اُسکے مطالعہ سے بہت خوش ہوا ہوں ۔ اپنے دوستوں کے حلقوں میں اسکا ذکر کیا گیا اور سبھوں نے اس تجویز کو نہایت پسند کیا ہے ۔ آیندہ جو عملی کاروائی ہوگی اُس سے مطلع کرونگا ۔ امید ہے آپ بھی اپنی طرف کے نشو و نماؤں سے کہ اس شجر کی شاخیں کہاں کہاں پھیلتی ہیں اور کس رنگ بو کے اُسمیں برگ و گل لگتے ہیں ضرور اطلاع دیتے رہیں گے ۔ اب یہ دیکھنا ہے اہل ملک آپکے بوئے ہوئے اس پیڑ کو کہاں تک پانی دیتے ہیں ، اور اسکی پرورش کی کس حد تک دیکھ بھال کرتے ہیں" +

(۳) لالہ پیارے لعل صاحب مارکٹ دیا ساگر بک ڈپو ۔ مورخہ ۲۵ ۔ جنوری سنہ ۱۹۰۹ء

"آپ کی اردو سبھا کا تذکرہ سُن کر اسکا ممبر ہونا پسند کرتا ہوں اور آپ کے آیندہ جلسہ میں شریک ہونے کی کوشش کرونگا" +

(۴) سردار اودھم سنگھ صاحب سردار ۔ ایم آر اے ۔ ایس ۔ مورخہ ۲۰ ۔ جنوری سنہ ۱۹۰۹ء ۔ از امرتسر

"میں آپ کی اس نادر اور بے بہا تجویز کی سچے دل سے تائید کرتا ہوں اگر تا ہوں مجھے بھی آپ اس امر میں اپنا خدمت گزار خیال فرماویں کسی قسم کی امداد سے جو امکان میں ہوگی کبھی دریغ نہیں کرونگا" +

(۵) مولوی محمد خلیل الرحمٰن خاں صاحب ۔ اتالیق ہز ہائنس مہاراجہ صاحب بہادر ریاست سرمور ۹ فروری سنہ ۱۹۰۹ء از ناہن سرمور + "میں آپ کی اُردو سبھا کی مفید تجویز سے اتفاق کرتا ہوں ۔ اور آپکی بیدار مغزی اور روشن دماغی کی داد دیتا ہوں ۔ کیونکہ اسمیں علاوہ اشاعت و حفاظت زباندانی اردو کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد اور وداد کی صورت کا پیدا ہو جانا ایک یقینی امر ہے جو نہایت ہی ضروری اور لابدی ہے" +

(۶) منشی محمد حلیم اللہ صاحب از بانمدی کوٹی ۔ مورخہ ۲۶ فروری سنہ ۱۹۰۹ء

خیال اردو سبھا مبارک ہے۔ مگر نام "بزم اردو" رکھیے"۔

(۷) مولوی سید احمد صاحب دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ نمبر۔ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۹ء از دہلی
"اگرچہ سبھا کا لفظ ارتباط و اتحاد کے خیال سے میل جول پیدا کرنیکے واسطے نہایت موزوں ہے مگر صلائے عام وغیرہ دو چار احباب نے چونکہ اس نام کو بے جوڑ یا غیر مانوس خیال فرمایا ہے اور چند نام بھی جیسے انجمن اردو۔ محفل اردو۔ مجلس اردو تجویز کیے ہیں۔ اگر آپ کو بھی تبدیل نام کیطرف توجہ ہو تو میرے نزدیک بزم اردو زیادہ موزوں اور پیارا نام ہے۔ میں اس تجویز کو جو آپ کو سوجھی نہایت مناسب اور زبان کے حق میں آب حیات سے کم نہیں سمجھتا"۔

(۸) خان عبد المجید خان صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۹ء از راولپنڈی
"واقعی بہت عمدہ اور مفید تجویز ہے اور یقین ہے کہ عام طور پر پسند کی جائے گی۔ میں دل و جان سے اس کام میں آپکا مددگار ہوں اور ہر ایک طرح کی امداد کے لیے تیار ہوں"۔

(۹) مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی از لکھنؤ۔ "اردو سبھا سے مجکو پوری ہمدردی ہے شاید اسمیں کوئی حصہ لے سکوں"۔

(۱۰) عبد الرحمٰن صاحب سہواروی۔ از کوئیٹہ۔ "عجب نہیں کہ اکیڈمی سو پچاس برس کے عرصہ میں وہ کام بھی کر دکھائے جسکی تکمیل میں ملک کی پولیٹکل اور تمدنی انجمنیں اب تک ناکام رہی ہیں اور خوف ہے کہ آیندہ بھی کامیاب نہ ہونگی۔ کیونکہ میری ناچیز رائے میں ہمارے ملک کی مختلف قوموں کو جو مذہب اور تواریخ میں ایک دوسرے سے جدا ہیں اب صرف ایک زبان ہی یکزبان کر سکتی ہے"۔

(۱۱) سید علی احسن صاحب احسن۔ از مارہرہ۔ "اس مبارک تجویز کے ساتھ اتفاق ظاہر کرتا ہوں۔ آپ خدا کا نام لیکر اس خیال کو عملی جامہ پہنائیے۔ اور مجھسے قلمے۔ قدمے۔ درمے جس طرح کی مدد ہو سکیگی اسکے لیے ہر وقت حاضر ہوں"۔

(۱۲) حامد حسن صاحب قادری۔ از رامپور۔ "میں نہایت اشتیاق سے اس دن کا منتظر ہوں جب مبارک اردو سبھا کی بنیاد رکھی جائے گی۔ اور جب ہزاروں آدمی ایک جلسہ میں ان تجاویز پر غور

کرنیکے واسطے جمع ہونگے اسوقت زبان حال سے کہیں گے ع "اردو زباں کے ہم ہیں اردو زباں ہماری" +

(۱۱۱) نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر از اجیگڈھ - سنٹرل انڈیا - مورخہ ۴ مارچ ۱۹۰۹ء

اُردو کی ترقی کے لیئے درحقیقت آپنے اردو سبھا کی بہت اچھی تجویز کی اور نام بھی ایسا جانچکر رکھا جو دونوں فریق (ہندو و مسلمان) کے دلوں کو راضی اور خوش رکھ سکتا ہے - بعض کوتاہ اندیش بجاے اُردو سبھا کے انجمن اردو وغیرہ نام قرار دینا پسند کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ لفظ سبھا سے کیا کیا باتیں نکلتی اور پیدا ہوتی ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اسی ناچاقی پھوٹ نے ہمارے ملک کو غارت کر دیا - خدا رحم فرمائے +

جسوقت یہ سبھا ہوگی اور میری زندگی نے وفا کی تو انشاءاللہ بسر و چشم حاضر ہوکر شریک ہونگا اور جو خدمت میرے لائق ہوگی تہ دل سے اُسکی تعمیل کرونگا +

میرے فہم ناقص میں ایک بات اور آئی ہے جسکا ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک فنڈ بھی "اردو فنڈ" کے نام سے قائم کر دیا جائے - اور جس سے جو ہوسکے وہ اپنی حیثیت کے موافق اسمیں چندہ دے - یہ روپیہ اُن لائق شخصوں کی تصنیف و تالیف یا کسی مفید اردو کتاب کا ترجمہ شائع کرنے میں کام دیگا جو بیچارے اپنی غریبی کی وجہ سے خود شائع نہیں کروا سکتے - جسکا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب اُنکی شمع حیات گل ہو جاتی ہے تو وہ سب کتابیں بھی ضائع جاتی ہیں اور پھر اُن کا تلاش کرنیسے بھی پتہ نہیں لگتا +

میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے کہ منشی انوار حسین صاحب تسلیم سہسوانی مرحوم نے دو صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے اور جو کہ خاص اُنہیں کی تصنیف و تالیف تھیں جلا کر خاک کر دیئے تھے اُن میں سے بعض بعض کتاب ایسی بےمثل و لاجواب تھی کہ جسکی تعریف نہیں ہوسکتی - ایک تو صرف و نحو کی اور دو لغت کی اگر یہ شائع ہو جاتیں تو ملک کو بہت فائدہ پہنچاتیں - میں نے اور پنڈت بنواری لال صاحب نے پوچھا بھی تھا کہ منشی صاحب اسکے واسطے ایسا کیا جاتا ہے - کہنے لگے کہ "ارے بھائی" اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں گا جو انہیں شائع کراؤں گا - افسوس! اس فنڈ کے روپیہ سے ہر لائق مصنف و مؤلف اور مترجم کا دل ہر طرح راضی اور خوش رکھا جاسکتا ہے - چاہے اُنکی کتاب شائع کیجیے چاہے صلہ دیجیے جسوقت

لگ چندہ دیتے گئے اگر اس وقت جمع ہو تو کتب مذکورہ ... نذر کر دوں گا +

(۱۴) عبد الغفور صاحب از علیگڑھ ۱۷ جنوری ۱۹۰۹ء

میں اس انجمن کے قیام و اجرا کا دل سے متمنی ہوں ..... اردو سبھا کا پہلا اجلاس دہلی میں ہونا چاہیے جس طرح ممکن ہو کم از کم پانچہزار اشخاص کو اردو سبھا کی ممبری میں تحریک کرکے ایک شخص سے ایک روپیہ سالانہ چندہ وصول کیجیے تو اس رقم سے کوئی عملی کام کیجیے "

(۱۵) چند مختصر خطوط اتفاق رائے کے آئے ہیں جن کی عبارتیں نقل کرنا باعث طوالت ہوگا صرف نویسندہ حضرات کے نام لکھ دینا کافی ہوگا۔ منشی عبد الواحد صاحب از ٹنڈکی۔ سید امیر حیدر صاحب نکہت از اکبرآباد۔ سید محمد عبد اللہ صاحب ٹونکی از ضلع پشاور۔ مولوی عبد الرؤف صاحب رئیس موائمہ از موائمہ ضلع الہ آباد۔ ڈاکٹر اشرف خان صاحب از علیگڑھ۔ منشی مہدی خان صاحب کوکب از حیدرآباد دکن۔ سید حسن علی صاحب جعفری از آگرہ۔

(۱۶) کارونیشن انجمن ریاست بنگن پلی۔ جنوبی ہند۔ "اراکین انجمن نے مضمون جو "اردو سبھا" پر رسالہ مخزن میں چھپا تھا بغور و خوشی ملاحظہ کیا۔ ہماری دعا اور خواہش ہے کہ آپ اپنی کوشش میں کامیاب ہوں۔ اسکے متعلق ہم اپنی خدمات پیش کرنیکے لیے ہر طرح تیار ہیں"۔

(۱۷) خطوط مذکورۂ بالا کے علاوہ بعض اور حوصلہ افزا پیام آئے ہیں۔ ہمارے غائبانہ کرم فرما جناب محمد نظر علی صاحب آزاد ایم۔ آر۔ اے۔ ایس جنکے تراجم شکسپیر شائع اور مقبول ہو چکے ہیں ایک طویل خط تحریر فرماتے ہیں جسکے ہر فقرے سے ہمدردی ٹپکتی ہے اس کے اقتباسات پھر کسی وقت درج ہونگے۔ جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبر پنشنر جج الہ آباد نے ایک خط میں ایسا عمدہ لکھا ہے کہ اس سے ہماری بہت ہمت بندھی۔ وہ فرماتے ہیں:۔ "آپ کی اردو سبھا کی تجویز اگر چل نکلی تو میری بقیہ عمر کے لیے بہترین اشغلہ ہوگا"۔ خدا انہیں تا دیر سلامت بکرامت رکھے اور اردو کو انکی بیش بہا خدمات سے مستفید کرے۔ گزشتہ جنوری میں جب میں کلکتہ اور پٹنہ گیا۔ اور پٹنہ میں جناب خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد کی ملاقات سے مشرف ہوا تو انہوں نے کہا کہ "ہم ہر طرح سے اس تجویز کی امداد کے لیے تیار ہیں"۔ اردو نظم و نثر کے ایسے مسلم اور مشہور استاد کا ایسا وعدہ نہایت قابل

تیار ہے۔ کلکتہ کے احباب میں مولوی ابو الکلام صاحب آزاد نے کہا کہ وہ اس تجویز کے واسطے اپنی خدمات کچھ عرصہ کیلئے مفت وقف کرنے اور اپنے صرف سے اسکی تائید کے لیئے دورہ کرنے کو آمادہ ہیں۔ میرے دوست ڈاکٹر عبد اللہ المامون سہروردی صاحب بیرسٹرایٹ لاء مرزا محمد عسکری صاحب بی اے اور مولوی خلیل احمد صاحب ایم اے نے جو کلکتہ کے ذی علم حضرات میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اس تجویز کے ساتھ اپنی پوری ہمدردی ظاہر کی۔ نواب سید محمد صاحب بہادر انسپکٹر جنرل محکمہ رجسٹری نے جو نہ صرف قوم کے سرکردہ اراکین میں ہیں بلکہ بحیثیت ادیب شہرت پائدار رکھتے ہیں۔ اس خیال کو پسند فرمایا۔ لکھنؤ میں میرے قدیم عنایت فرما سٹر حامد علیخاں صاحب بیرسٹرایٹ لا کے ہاں ایک صحبت میں مجھے یہ ذکر چھیڑنے کا موقع ملا تھا۔ گو اُس وقت یہ تجویز ابھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ وہاں اُنھوں نے اور جناب سید مہدی حسن صاحب احسن مصنف واقعات انیس نے نہایت گرمجوشی سے اس تجویز کی اعانت کا وعدہ کیا تھا۔ گزشتہ مارچ میں پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی مجھے دلی میں ملے۔ اور کوئی گھنٹہ بھر تک اسکے عملی پہلوؤں پر گفتگو کرکے ہر طرح سے اُسکو مدد دینے کا وعدہ کر گئے۔ اس حوصلہ افزائی کو دیکھکر اب زیادہ دیر تک مزید آرا کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ انداز معلوم ہو گیا۔ ارادہ ہے کہ عنقریب ایک ابتدائی جلسہ منعقد کیا جائے ان امور پر غور کرنیکے لیئے کہ نام کیا قرار دیا جائے۔ پہلا اجلاس کہاں ہو ممبری کے لیئے کیا شرائط ہوں وغیرہ وغیرہ*

چونکہ میں اب لاہور میں مقیم ہوں۔ جو احباب قریب رہتے ہیں اور آسانی سے شریک مشورہ ہو سکتے ہیں۔ سر دست صرف انہیں کو تکلیف دی جائے گی۔ اور اسکے بعد حسب ضرورت کوئی بڑا جلسہ کسی بڑے مرکز میں جو کثرت رائے سے طے ہو جائے قرار پائے گا*

عبد القادر

بوڑھے دنیا پرست کی موت

یا الٰہی۔ آج دل میرا بجھا جاتا ہے کیوں؟
اور کلیجہ میرا بے قابو ہوا جاتا ہے کیوں؟

کیوں بدلتے اینٹھتے ہیں آج میرے ہاتھ پاؤں؟
سنسنا کر کیوں ہوئے جاتے ہیں ٹھنڈے ہاتھ پاؤں؟

شمعیں روشن کیوں نظر مجکو نہیں آتی ہیں آج؟
ہائے کیوں آنکھیں مری دھندلی ہوئی جاتی ہیں آج؟

اب کہاں ہیں وہ تسلی دینے والے ڈاکٹر؟
اب کہاں تسکین کرنے والے میرے چارہ گر؟

جلد آئیں مجکو دیکھیں اور کریں تدبیر کچھ
لیتے آئیں ڈھونڈھ کر تریاق کچھ اکسیر کچھ

میرا یہ سن آیا اور اکثر ہوا بیمار میں
بلکہ اکثر ہو گیا بے حد نحیف و زار میں

لیکن اب جو حال ہے یہ حال تو میرا نہ تھا
ہمنشیں میں اس بری حالت کو تو پہنچا نہ تھا

آہ اب تو لڑکھڑائی جاتی ہے میری زباں
ہو گئے ہیں دیکھو پتھر میرے پائے ناتواں

نبض ہے چھوٹی ہوئی۔ دم ہی مرا اکھڑا ہوا
میں مرا جاتا ہوں چارہ گر یہ مجکو کیا ہوا

ہائے یہ تو موت کے آثار ہیں میں کیا کروں
ہے ضرورت ہی مجھے مرنیکی کیا میں کیوں مروں؟

یہ اجل کمبخت مجکو مارتی ہے بے گناہ
ہمنشینو۔ دیکھتے جاتے ہو۔ تم رہنا گواہ

میں ابھی اس سن میں مرنا چاہتا ہرگز نہیں
میں ابھی دنیا کو چھوڑا چاہتا ہرگز نہیں

مجکو کرنا ہے ابھی اپنا بہت قرضہ وصول
ہائے اس سن میں کروں میں کسطرح مرنا قبول

میرا سن کیا ہے ابھی تو سو برس کا بھی نہیں
میں نے دنیا کو ابھی جی بھر کے دیکھا بھی نہیں

گزرا بچپن کا زمانہ میرا سارا کھیلتے
نوجوانی میری گزری بس مصیبت جھیلتے

باپ کے مرنے پر البتہ مجھے راحت ملی
یعنی دادا جان کی اندوختہ دولت ملی

میں نے وہ دولت اڑائی خوب ناؤ نوش میں
پل پڑا اتنا ہی میں جتنا بھرا تھا جوش میں

خوب اڑائے میں نے پھر تو زندگانی کے مزے
اپنی اس اتری ہوئی ٹھنڈی جوانی کے مزے

آخرش میری جوانی دے گئی مجکو جواب
سست ہو کر ہو گئے میرے تمام اعضا خراب

پھر مجھے ہوش آیا اور پھر تو مری آنکھیں کھلیں | مالی حالت دیکھی تو اب عشر بھی ہلکا نہیں
بدحواسی میں نہ میں نے آؤ دیکھا اور نہ تاؤ | توبہ کی۔ توبہ نکرتا۔ تو میں کیا کرتا۔ بتاؤ؟
پھر تو میں نے مال و دولت کی یہانتک طمع کی | کوڑی کوڑی دانت سے اپنے پکڑ کر جمع کی
جھوٹ سے۔ سچ سے۔ خوشامد سے۔ ریا سے۔ مکر سے | میں اسی کوشش میں رہتا تھا مری دولت بڑھے
اور اس کوشش میں موقع جب کبھی پاتا تھا میں | قسمیں کھا کھا کر پرایا مال کھا جاتا تھا میں
لوگ تا میری دیانت پر نہ دل میں شک کریں | مار لیتا اُلٹی سیدھی وقت فرصت ٹکریں
خیر اور خیرات کا میرے یہاں کیا ذکر تھا | اک خیال عاقبت سو اُس سے میں بیفکر تھا
بھوک سے مرتا ہو کوئی میں کھڑا دیکھا کروں | خود نہ دوں اور دوسرا دیتا ہو تو دینے نہ دوں
قوم کی خدمت سے اپنے کو بچا جاتا تھا میں | ایسے چندوں میں ہمیشہ دُم دبا جاتا تھا میں
اس تمول پر ہوا مجھ سے نہ کوئی نیک کام | ہاں مگر بچپن کا یاد آتا ہے مجکو ایک کام
دل کڑھا تھا اک ضعیفہ کی مصیبت دیکھکر | کچھ دیا تھا اُسکی معذورانہ حالت دیکھکر
لیکن اُسکی لڑکی سے جو کچھ کیا میں نے سلوک | یاد کرنے سے کلیجہ میں مرے اُٹھتی ہے ہوک
پہلے اُس ناکتخدا سے آشنائی میں نے کی | اور پھر آخر میں کیسی بیوفائی میں نے کی
آہ اس صدمہ سے اسکو کوفت کچھ ایسی ہوئی | دل شکستہ ہو کے اور بیمار پڑ کے مر گئی
نامۂ اعمال میرا ہے سراسر پر گناہ | ہے خباثت سے مری فرد عمل بالکل سیاہ
آہ اب تو پیاس کے مارے مرا جاتا ہوں میں | ہے کلیجہ میں لگی آگ اور پھنکا جاتا ہوں میں
حلق میں کانٹے پڑے ہیں اور تالو خشک ہے | موت کا ڈر اسقدر ہے میرا لہو خشک ہے
ہائے میں دنیا میں کچھ کرنے نہ پایا کام نیک | تاکہ ہوتا آج اے ہمدم مرا انجام نیک
میرے ذاتی خرچ کا یہ حال تھا میں کیا کہوں | لڑکے روتے روتے مر جائیں مگر پیسہ نہ دوں
جب کبھی بچوں نے ضد کی میں نے انکو کیا دیا | بس یوں ہی باتوں ہی باتوں میں انہیں سمجھا دیا
مال و دولت سب یہ ہے بیٹا تمہارے واسطے | جوڑ کر رکھتا چلا جاتا ہوں کسکے واسطے

قبر میں یہ سب نہ لیجاؤنگا اپنے ساتھ میں
خالی ہاتھ آیا ہوں میں جاؤنگا خالی ہاتھ میں

سب تمہارا ہی اُڑانا خواہ تم رکھنا الگ
کون مالک ہوگا تو ہوگا حق اسکا کسے

اس طرح کرتے تھے میری موت کا وہ انتظار
گر رکھا تھا میں نے انکو آپ ہی امیدوار

آج دیکھو کسقدر خوش خوش نظر آتے ہیں وہ
رونا دھونا اک طرف ہنستے چلے جاتے ہیں وہ

دیکھو صورت پر کسی کی رنج و غم مطلق نہیں
اُنکا منہ اترا نہیں ہے۔ اُنکا چہرہ فق نہیں

ہائے یہ لوگ اب نظر آتے ہیں کیسے شادماں
کھنکھناتے پھرتے ہیں جیبوں میں میری کنجیاں

کوٹھری سے کیسی کھن کھن کی ابھی آئی صدا
ہائے میرا مال دولت۔ ہائے میرا روپیہ

میں جیونگا میں جیونگا۔ میں نہیں مرتا ابھی
[illegible]

اور اجل۔ او موت۔ کیوں ان سبکو کھا جاتی نہ ہے
مجھکو موت آئی تو آئی انکو کیوں موت آئی نہ

بیٹے نوکر میری بیوی میرے لڑکے پوتے
گھر میں یہ سارے آدمی ہیں جنکو چاہیے موت تھی

موت تو ان سب کو لے۔ مجھکو جینے دے ابھی
مجھکو کار خیر ان ہاتھوں سے کرنا ہے ابھی

چھوڑ کر گھر بار۔ دولت مال کیسے جاؤں میں
کیسے حقدار انکا کیا حق ہے کیوں نہیں دیجاؤں میں

کیوں میں بیواؤں غریبوں اور یتیموں کو نہ دوں
جنکا دنیا میں کے کام آئے ہیں ایسوں کو نہ دوں

پانی۔ پانی۔ ٹھنڈا پانی لاؤ۔ اب پرہیز کیا
اب تو میں مرتا ہوں مجھکو پند طعن آمیز کیا

آہ کیسے مجھپہ آوازے کھڑے کستے ہیں لوگ
رونے کی بجائے کہ میں مرتا ہوں اور ہنستے ہیں لوگ

ہائے کیسی حسرتیں دل میں لئے جاتا ہوں میں
ہائے کیسی کیسی چھوڑے ہوئے جاتا ہوں میں

کون آیا؟ ایک عورت۔ اک حسینہ نازنیں
یہ ضعیفہ کی وہی مرحوم دختر تو نہیں

آئی ہے جنت سے کیا مجھکو یہ لینے کیلئے
منتظر تھی عاقبت میں ساتھ دینے کیلئے

لیکن اسکی چتونیں کیوں اسقدر خونخوار ہیں
اسکی ہیبتناک آنکھیں برسر پیکار ہیں

ہائے کیا یہ بھی کلیجہ میرا کھانے آئی ہے
ایسے نازک وقت میں مجھکو ستانے آئی ہے

تو میں یہ دیکھتا ہوں کیسی کیسی صورتیں
کیسی ہیبتناک اور کیسی ڈراونی صورتیں

بھوت ہی بھوت آج میرے گھر میں آکر بھر گئے
کیا موئے گھر والے۔ کیا سب میرے مر گئے

آہ یہ بھوت۔ آہ یہ۔ یہ تو وہی مظلوم ہے
دس برس پہلے ہوا جو قتل میرے ہاتھ سے

ہاں مرے ہاتھوں سے پہنچا تھا ضرر اُسکو ضرور
لیکن او کمبخت میرے سامنے سے تو ہو دور

میں نہ دیکھوں گا۔ نہ دیکھوں گا۔ یہ شکل پُر گزند
لو میں اپنے ہاتھ سے آنکھیں کیے لیتا ہوں بند

بند ہیں آنکھیں۔ مگر پھر بھی نظر آتا ہے یہ
میری آنکھوں میں مرے دیدوں میں گھسا جاتا ہے یہ

ہائے پنجوں سے گلا یہ تو دباتا ہے مرا
پیٹ میں گھس کر کلیجہ کھائے جاتا ہے مرا

یوں نہ مرتا لیکن اب تو واقعی مر جاؤں گا
مر کے کیا ہونگا؟ کہاں جاؤں گا؟ کیونکر جاؤں گا؟

قبر میں افسوس اُسی کالی اندھیری قبر میں؟
آہ ان بھوتوں پریتوں کی ڈراونی قبر میں؟

ہائے پھر دوزخ میں سانپوں بچھوؤں کے غار میں
آگ کے شعلوں میں۔ کولوں میں عذاب النار میں

آہ ایسی موت مرنا۔ آہ ایسی سخت موت
چھوڑ دے۔ اُف چھوڑ دے۔ او موت۔ او کمبخت موت

کس قدر بے وقت ہے افسوس میرا انتقال
اے اجل۔ ٹھہر جا۔ جینے دے مجھے دو چار سال

ایک ہی سال۔ اک مہینہ چند ہفتے جینے دے
چند ہفتے۔ چند دن۔ بس چند گھنٹے جینے دے

اُف جلن۔ اُف آگ۔ اُف سینہ کی سوزش اُف پیاس
پانی۔ ٹھنڈا پانی۔ ٹھنڈا پانی۔ شربت کا گلاس

او اجل او موت بس۔ او موت بس۔ او موت بس
ہائے دنیا ہائے دنیا۔ ہائے دنیا کی ہوس

پھر ذرا دم لیکے اُس نے آہ کی اور کچھ نہ تھا
اک بھیانک چیخ کی آواز تھی اور کچھ نہ تھا

نادر علیخاں نادر کاکوروی لکھنوی

سہانی شام اور ایک مہجور

قریب مغرب ہے شاہ خاور
اُفق نے اوڑھی شفق کی چادر

نہیں ہے اب دھوپ میں وہ تیزی
ہوئی ہے رنگت بھی اُسکی پھیکی

یہ دھوپ ہے یا کوئی دوپٹا؟	رنگا ہوا زرد زرد ہلکا!
عجیب یہ قدرتی سماں ہے	عجیب یہ رنگ آسماں ہے
فلک پہ جوبن برس رہا ہے	جوان پیری میں ہو گیا ہے
ہوا میں آئی مزے کی خنکی	بڑھی ہے فرحت گھٹی ہے گرمی
ہوا کی رفتار ہو گئی کم	دم مسیحی نسیم کا دم
ہوا نے غنچوں کو کر دیا گل	ہوئی ہے منت گزار بلبل
چمن کو پھر باغباں نے سینچا	ہوا ہے شاداب بیل بوٹا
شجر نے کونپل ہری نکالی	ہے دست گلدستہ ایک ڈالی
عقیق تھے زرد جو خزاں میں	ہوئے زمرد ہیں بوستاں میں
حسین نکلے ہیں بن سنور کے	نہا نہا کے نکھر نکھر کے
ہجوم بازار میں ہے اُن کا	وہ خود تماشائی اور تماشا
اودھ میں یہ شام کا مزا ہے	نہان سرجو[1] پہ ہو رہا ہے
چراغ سرجو پہ چھوٹتے ہیں	مزے وہاں لوگ لوٹتے ہیں
وہ گھاگرا اور اسکی موجیں!	کبھی نہ بھولی ہیں اور نہ بھولیں!
حسین اللہ رے شریر کمسن	نئی جوانی اُبھار کے دن
قریب مغرب نہا رہے ہیں	عجب ادائیں دکھا رہے ہیں
ادا کرشمہ غضب ہی آفت	کرے جو بے چین وہ شرارت
کھڑے وہ پانی اچھالتے ہیں	نہ دیکھتے ہیں نہ بھالتے ہیں!
بلا کے ہیں ہاتھ وہ حنائی	ستم کی نازک ہیں گلائی
وہ ساریاں وہ لباس رنگیں	وہ اُنکی زینت وہ اُنکی تزئیں
عجب ہی نیرنگ حسن طلعت	کہ جس سے خود حسن کو بھی حیرت

[1] ۱۔ دریائے گھاگرا

غرض سہانی ہے شام دیکھو!! — یہ سب ہے نیچر کا کام دیکھو!!
ہوا ہے اب ختم کام دن کا — ہر ایک محنت سے اپنی چھوٹا
وہ آبلہ پا شکستہ خاطر! — جلے ہوئے دھوپ کے مسافر!
تھکے ہوئے ناتواں پریشاں — وہ بھوک کے پیاسے غریب حیراں
پہنچ گئے ہیں قریب منزل — ہوئی ہے آسان اُنکی مشکل
پرند سب چہچہاتے آ رہے ہیں — چرند بھی چر کے جا رہے ہیں!
غرض وہ آ پہنچے اپنے مسکن! — قریب آتا ہے وہ نشیمن!
ملیں گے بچھڑے ہوؤں سے جا کر — وہ شاد ہوں گے گلے لگا کر
مگر ہے ناشاد ایک عاشق — تباہ و برباد ایک عاشق
حبیب سے دور زار و نالاں — اُداس مغموم اور پریشاں
جھکا ہے سر آنکھ میں ہیں آنسو — ذرا طبیعت نہیں ہے یکسو
طپش ہے دل میں تو درد سر میں — لگی ہوئی آگ سی جگر میں
خیال ہاں ہاں خیال اُس کا — نشاط عالم ملال اُس کا
اگر سہانی ہے شام تو کیا — نہیں تماشے کی اُسکو پروا
کبھی جو بھولے سے اٹھ گیا سر — تو آہ کی اُس نے تلملا کر
یہ شام ہے بخت کی سیاہی! — شفق یہ رخسار کی ہے زردی!
یہ شام کالی بلا ہے سر پر — یہ داغ سوزاں ہے مہر انور!
بلا کی گرمی خنک ہوائیں — سیاہ لکیریں ہیں یہ شعاعیں!
نہیں ہے شاداب کچھ گلستاں — مگر ہے اک دشت ہو کا میداں
ہر ایک گل خار سے بھی بڑھکر — یہ پنکھڑی ہے کہ سخت پتھر
بفرض آباد ہے گلستاں — نہیں ہے محبوب تو ہے ویراں

چرند خوش ہیں تو کیا ہی مطلب | پرند خوش ہیں تو کیا ہی مطلب
نہیں ہے شام اودھ مزے کی | غرض نہیں کچھ جو ہے تو ہوگی
اگر ہے دریا پہ کچھ تماشا | ہوا کرے وہ تو پھر اُسے کیا
کہا ہے کیا خوب یہ کسی نے | یہ تجربہ کار آدمی نے
اگر نہ دل شاد ہو سکیگا | تو اُس کو بھاتا نہیں تماشا

محمد ارتضی علی شہ۔۔

انقلاب دہر

(تضمین بر غزل حضرت اکبر الہ آبادی)

بتوں کی جستجو میں دیر کے عازم نہ ہم ہونگے | کلیساؤں میں جاکر عاشق رشکِ صنم ہونگے
غلط ہی یہ کہ اگلی وضع کے پابند کم ہونگے | یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہونگے

نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نرالے ڈھب کے نکلینگے مضامینِ طبعِ موزوں سے | نئے انداز کے ٹپکینگے معنی طرزِ مضموں سے
ہویدا ہوگی از بس ہوشیاری شکلِ مجنوں سے | بدل جائیگا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے

نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہونگے

نہ دیوار وں پہ ہونگی وصلیاں چسپاں نئے تر ہیں | نہوگی اب کسی خوشخط کی جُنبش کی کہیں تحسیں
رہینگے محو ہوکر فنِ خطاطی کے سب آئیں | نہ پیدا ہوگی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں

نہ نستعلیق حرف اس طور سے زیبِ رقم ہونگے

تصاویرِ خواتیں زیب دہ اب ہونگی البم کی | جوابِ فینس یہ جو ہتی رہیں نہیں جھیگی قُم کی
غرض بیگم اُنکے ہر لب سے صدا نکلیگی ہیٹ مِز کی | خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی

کھلینگے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہونگے

زبانوں پر سنا جائیگا نام حق بھی قلت سے خدا ترسی نکل جائیگی لوگوں کی جبلت سے
مبدل بادۂ احمر کی حرمت ہوگی حلت سے عقائد پر قیامت آئیگی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے

بتائیں کیا کہ آئندہ زبان ہند کیا ہوگی؟ ہمارے روز مرے سے نئی اردو جدا ہوگی
نئی شان اسکی ہوگی اور نئی اسکی ادا ہوگی ہماری اصطلاحوں سے زبان ناآشنا ہوگی
لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے

تباہی اور بربادی میں ایسا لطف پائینگے بجائے نوحہ ماتم جلانے پہ اپنے گیت گائینگے
سلف کی یاد ہم یوں صفحۂ دل سے مٹائینگے گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نجائینگے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے

بتاؤ تو ۔ تمہاری آنکھ کیوں پرنم ہے اے اکبر تمہارے چہرے پر کیوں غم کا یہ عالم ہے اے اکبر
کہو ۔ تجھ سے تم ۔ کس کا یہ ماتم ہے؟ اے اکبر تمہیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

محمد یوسف رنجور

رباعیات متعلق بہ طوفان دکن

آواز بگاز ہر زن و شو آید افتادہ مکان نظر بہر سو آید
تعمیر دکن بشان سابق معلوم دیر یست کہ آب رفتہ در جو آید

فرط غم و ہم سے خود فراموش ہوں میں ہم رنگ چراغ مردہ خاموش ہوں میں
بے جائے قیام ۔ اور نہ کچھ تھل بیڑا مانند حباب خانہ بردوش ہوں میں

اے نور نظر! یہ چشم پوشی کیسی کچھ تجکو خبر ہے؟ پدر بیکس کی
ہے بے تحت الثریٰ میں کھکر مجکو اعظم! کیا خود ہی عرش اعظم پہ گئی

سیلاب[۵۱] میں جسمِ زار گویا خس تھا غرقاب محیطِ غم کسی ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد غیرت والے کو ایک چلو بس تھا

رونے دھونے کی کس گھڑی ھو تم نہیں کس وقت دل غمزدہ مغموم نہیں
قبرِ مادر[۵۲] تو خیر بن ہی نہ سکی بے ہے گورِ پدر بھی معلوم نہیں

امجد

تضمین بر مثنوی سعدیؒ

عشرت دروزہ سے ہے احتراز کان کے پردہ کو نہیں شوقِ ساز
نغمہ مطرب سے ہے دل بے نیاز ہیچ ہی کیا ہے جو نہیں نے نواز

گوش تواند کہ ہمہ عمر وے
نشنود آوازِ دف و چنگ و نے

سیر ہے گلزار کی از بس مفید باغ کا نظارہ ہے آنکھوں کو عید
گرچہ مفرح ہو گلستاں کی دید پر نہیں کچھ ایسی ضرورت شدید

دیدہ شکیبد ز تماشائے باغ
بے گل و نسریں بسر آرد دماغ

سیج نہیں پھولوں کی خاطر نشیں ہے نہ چھپر کھٹ کیلئے دل حزیں
گر نہیں بستر تو نہو غم نہیں کافی ہے اپنے لیے فرشِ زمیں

[۵۱] چونکہ اس طغیانی رود موسیٰ میں میں بہت دور تک ڈوبتا پیرتا چلا گیا آخر چند عورتوں کی رہنمائی سے لب ساحل پہنچا۔ اسلیئے یہ رباعی کہی گئی کہ امجد اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا۔ حالانکہ غیرت مند کو تو ایک چلو کافی ہوتا ہے"

[۵۲] قبر مادر تو اس لیئے نہیں بن سکی کہ وہ دریا برد ہو گئیں۔ اور باپ کی قبر اسلیئے معلوم نہیں کہ ان کا انتقال اس وقت ہوا جب کہ میں چالیس روز کا تھا۔ میرے چلہ کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ فالج دار العدحل بسے اور وہ پانی جو میرے نہلانیکے لیے گرم کیا گیا۔ جلدی میں اسی سے انکو نہلایا گیا۔ علاوہ بریں دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو مجھے میرے مرحوم والد کی قبر دکھائے۔ کیونکہ سب پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب قبر معلوم ہو تو کیونکر ۱۲

گر نبود بالشِ آگندہ پر
خواب تواں کرد حجر زیرِ سر

شیشے میں گر آج برانڈی نہیں　　پینے کو کیا خونِ جگر بھی نہیں
راضی ہوں قسمت پہ یہ شال کی نہیں　　خیر نہو بر میں جو ساقی نہیں

گر نبود دلبرِ ہمخوابہ پیش
دست تواں کرد در آغوشِ خویش

یوں تو بلاؤں میں گرفتار ہوں　　تیغِ حوادث سے دل افگار ہوں
سہنے کو ہر رنج میں تیار ہوں　　آہ - مگر پیٹ سے لاچار ہوں

ایں شکمِ بے ہنر پیچ پیچ
صبر ندارد کہ بسازد بہیچ

سید احمد حسین امجد۔

قصیدہ مسدس دعائیہ

پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی نے کچھ عرصہ ہوا ایک مسدس دعائیہ لکھا تھا جو آنریبل مسٹر پرتاب سنگھ بہادر سی ایس آئی کی شان میں تھا جو کپورتھلہ کے حکمران خاندان کے ایک رکن اور جالندھر کے سربرآوردہ رئیس اعظم ہیں کیفی صاحب نے ذوق مرحوم کے مشہور دعائیہ قصیدہ کی طرز کو اختیار کیا ہے اور التزام کے ساتھ کہ ہر بند دعائیہ ہو مگر اسکے استعارات جدا جدا ہوں اور تخیل بلند زبان میں بھی ہر بند میں کچھ جدت نظر آئے۔ انیس بند لکھے ہیں۔ افسوس ہے کہ بوجہ قلت گنجائش ہم سارا قصیدہ درج نہیں کر سکتے ۔ مگر اسکے چند بند بطور نمونہ پیش کرتے ہیں +

یہ ملکِ ہند جبتک انتخاب ہفت کشور ہو　　اور اسمیں برج[1] کا خطہ پریم اور عشق کا گھر ہو

[1] ساٹھ کوس کے قریب کا رقبہ جسمیں متھرا اور بندرابن واقع ہیں جہاں کرشن جی کی طفولیت کا زمانہ گذرا۔ کرشن جی کو منوہر بھی کہتے ہیں۔ انکی مرلی یا بانسری میں ایک عجیب جذب تھا۔

بسا جبتک کہ دل میں برجباسی کے منوہر ہو
سدا امرت کی مرہم جبتلک زخم جگر پر ہو

ترا نام مبارک خلق میں ہر اک زباں پر ہو
وہ الفت ہو تری دلمیں ہر انساں کے ترا گھر ہو

دل عشاق ہو دردِ محبت کا مقر جب تک
رہے گلزار داغوں سے عاشق کا جگر جب تک

گداز دل کا چمکے قلب بر میں شرر جبتک
رہے ہم پہلوئے دردِ جگر جذبِ اثر جب تک

چبھا ہر ایک سینے میں تری الفت کا نشتر ہو
ہمیشہ نقدِ دل پائے مبارک پر نچھاور ہو

نویدِ شادمانی لائے ساون کی گھٹا جبتک
چمن میں رشک پھونکے موسم گل کی ہوا جبتک

دلوں میں آگ بھڑکائے پپیہے کی صدا جب تک
کنول دل کا کھلائے موجِ بادِ صبا جبتک

نہالِ آرزو تیرا ہمیشہ بار آور ہو
پھلا پھولا تمناؤں کا تیری باغ یکسر ہو

یہ مہر و ماہ جبتک دیدۂ عالم کے ہوں تارے
رہیں گرمِ سفر آکاش میں جبتک یہ سیارے

ہوں زیبِ جشنِ مہتابی فلک پر جبتلک تارے
جبیں پر آپ کو قدرت کی جبتک کہکشاں دھارے

ہمیشہ نیرِ اقبال تیرا یاوری پر ہو
مساعد بخت ہو تیرا ستارہ تیرا یاور ہو

ہے جبتک سایۂ خورشید دیر و کعبہ پر یکساں
محل اور جھونپڑی پر ہے برابر بارشِ باراں

تعصب جبتلک ہے ایک ضعفِ ملت و ایماں
ہے جبتک خدمتِ حق خدمتِ مخلوق میں پنہاں

بلا تمیز شفقت تیری ہر انساں کے اوپر ہو
مسلماں اور ہندو تیری نظروں میں برابر ہو

رہیں رحم و عدالت غازۂ روئے شہی جب تک
ہو تدبیر اور سیاست سے نظامِ کشوری جب تک

عمائد سے رہے قائم نشانِ خسروی جب تک
رئیسوں امرا اراکیں سے ہو شانِ سروری جبتک

ہمیشہ مہرباں تجھپر یہ شاہنشاہ قیصر ہو

تازہ غزلیں

جب دلِ عاشق کو یارائے شکیبائی نہ تھا — حشر کا وعدہ کبھی طورِ دل آرائی نہ تھا

حسن پھر کس کام کا جب چاہنے والا نہ ہو — سچ ہی تجھسے دلربا کو لطفِ تنہائی نہ تھا

اب وہی دیکھیں دلِ شیدا میں کسکی شکل ہے — مبتلا کرنا مرا شایانِ یکتائی نہ تھا

آرزوئے وصل تو ہر وقت گھیرے رہتی ہے — اُنسے ملنے کیلئے امکانِ تنہائی نہ تھا

جو نہ بوجھ اُٹھا کسی سے وہ اُٹھایا کسطرح — ضعفِ خلقی میں اگر جوشِ توانائی نہ تھا

حد حیرت دیکھتا تھا اپنی آرائش کی شمع — آئینہ خانے میں وہ محوِ خود آرائی نہ تھا

روئے آسی پوچھتا تھا کب قیامت آئیگی — کسطرح کہیئے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

آسی

نہ نکلے عمر بھر شورِ جنوں دیوانے کے سر سے — مبادا ہو خجل چاکِ گریباں صبحِ محشر سے

زباں کو آشنا کر آج ذوقِ آتشِ تر سے — کہ لذت یاب ہونا ہے تجھے کل آبِ کوثر سے

مبارک ہو تجھے بزمِ نشاط و سیرِ گل لیکن — کبھی کچھ شرم بھی کر عاشقوں کے دیدۂ تر سے

بہشتِ عشق میں ہوں اک بہارِ ناز کا زخمی — جراحت کو مرے چشمک ہے ہی طاؤس کے پر سے

مری مایوسیوں نے دی مجھے تعلیمِ گستاخی — کہ بیٹھا رہگذر پر میں اُٹھایا جب مجھے در سے

ترے لب تشنگانِ شوق مر کر بھی رہے پیاسے — کوئی صورت کشادِ کار کی نکلی نہ خنجر سے

تو اُٹھ اے ساقیِ پاکیزہ طینت مہرباں میرے — مجھے مسرور کر اک پُر تکلف ساغرِ زر سے

گدائے میکدہ ہوں بوئے مے بس ہے تسلی کو — غرض ہے مجکو شیشے سے نہ مطلب مجکو ساغر سے

تمہارے ہاتھ میں رنگِ حنا ہے ہم نہ مانیں گے — یہ قطرے خون کے ٹپکے ہیں کسکے قلبِ مضطر سے

یہ حالِ اضطرابِ شوق تھا فصلِ بہاراں میں — کہ دل کے زخم کھجلاتے رہے ہم نوکِ نشتر سے

مگر جذبِ محبت نے اُنھیں توفیقِ پرسش کی — کھڑے ہیں دور وہ اپنے مریضِ غم کے بستر سے

ارادت ہے مجھے اُس ساقیِ خمخانہ دل سے
کیا جس نے تہ و بالا جہاں کو ایک ساغر سے

فراقِ جسم و جاں سہنے نہ پایا ہمکو حیرت ہے
ہوئے کیونکر جدا یارب خدایا اپنے دلبر سے

ہمارا شوق ہے شاہد ہماری تیزگامی کا
رہے راہِ فنا میں دو قدم آگے ہی رہبر سے

یہ کثرت تھی معاصی کی کہ ہم مایوس ہو جاتے
اگر شرمندگی ہوتی بھی اپنے دامنِ تر سے

نویدِ شوقِ قتل و مژدہ ای ذوقِ گرفتاری
دمِ پرواز بوئے خون نکلتی ہے مرے پر سے

بنے چشمِ چراغِ رہ نوردانِ بلا وحشت
کرے دشتِ جنوں گر کسبِ نورانی مرے گھر سے

رضا علی وحشت

مبارک ہے وہ دل جسمیں خیالِ یار ہو پیدا
خوشا وہ چشم جس میں حسرتِ دیدار ہو پیدا

فقط اپنا نہیں غم اک زمانے کا ہے اس دل کو
بہت مشکل ہے اپنا سا کوئی غمخوار ہو پیدا

نہ کی تقلید کیا کیا کبک نے رفتارِ جاناں کی
کہاں ممکن کہ اندازِ خرامِ یار ہو پیدا

ابھی پہچان لوں میں یار کو وہ کون ہے کیا ہے
شناسائی کی آنکھوں میں اگر معیار ہو پیدا

مجھے جو دیکھتا ہے اے فلک حسرت سے کہتا ہے
زمانے میں نہ ایسا بیکس و لاچار ہو پیدا

عدم سے جانیوالوں کو سہارا کچھ تو ملجائے
اگر اس قافلہ کا قافلہ سالار ہو پیدا

خلش سے کوئی جا خالی نہیں دشتِ محبت میں
قدم رکھیں جہاں اُس سرزمیں میں خار ہو پیدا

محبت اقتضائے فطرتِ انساں ہے ورنہ غلط
نہ مانیں گے کبھی ہم کوئی شے بیکار ہو پیدا

لحد پر اپنی لے امداد گر وہ گلبدن آئے
یقیں ہے زیرِ تربت نکہتِ گلزار ہو پیدا

سید عنایت حسین امداد

ہو گیا دل بُتِ بے پیر کا خواہاں کیسا
پھنس گیا دام میں کافر کے مسلماں کیسا

ہمتِ دشت نوردی سے یہ کہتے ہیں کہ اب
قیس کہتا ہے بیاباں میں بیاباں کیسا

کیا عداوت دلِ عاشق سے ہے کاکل کو ترے
بل بھر آکڑی ہے یہ زلفِ پریشاں کیسا

دل کو اک لطف سا آتا ہے بجائے کاوش
تم نے ناوک میں لگا رکھا ہے پیکاں کیسا

پھر بہار آئی ہوا جوش جنوں پھر مجھکو — قابلِ دید بنا چاکِ گریباں کیسا
دل ہی باقی نہ ہو پہلو میں تو حسرت کیسی — قطع جب ہو گئی امید پھر ارماں کیسا
غیر کا بھی ہے تصور میں ترے ساتھ گزر — آ گیا سینہ میں ناخواستہ مہماں کیسا
شمع بالیں مقابر نہ کوئی چادرِ گل — حال دکھایا ترا گورِ غریباں کیسا
سعد کا کچھ نہ ہوئی آپکی توقیر وہاں — ڈانٹنا تھا درِ دلدار پہ ارماں کیسا

نواب محمد عمر خاں - وفا

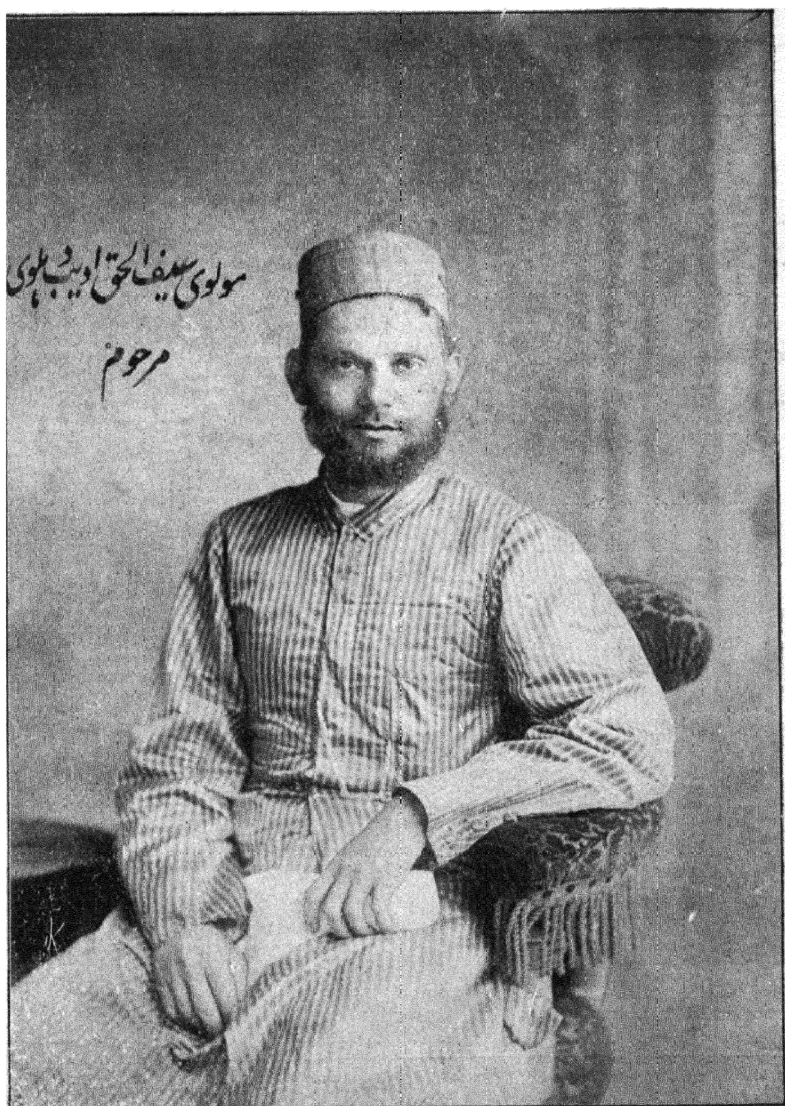
ہر اک دل بھی لیا مٹی بھی کی برباد ارماں کی — خدا جانے عنایت کیا ہوا اب اس آفتِ جاں کی
چبھن ہے پھانس کی دل میں نہ کانٹے کی خلش کوئی — مگر ہاں اک کھٹک سی ہے کسی کے تیرِ مژگاں کی
اکیلا چھوڑ کر لی شمع نے بھی راہ اب اپنی — نہ دلسوزی کسی سے ہو سکے اس خستہ جاں کی
اٹھاتا اپنے پلکوں سے لگاتا اپنی آنکھوں سے — ادھر بھی کاش آتی خاک اڑ کر کوئے جاناں کی
سراج اب اک یہی غمخوار و مونس اپنی باقی ہے — منائیں خیر دل سے کیوں نہ ہم شام غریباں کی

سید سراج الحسن سراج

دکھائے گی اثر آہِ سحر آہستہ آہستہ — کھلیگا غنچۂ خاطر مگر آہستہ آہستہ
مزا ملتا ہے جب رہ رہ کے یہ اٹھتا ہے پہلو میں — علاجِ دردِ دل کر چارہ گر آہستہ آہستہ
نہ لیتے نام الفت کا جو یہ معلوم ہو جاتا — کہ ہوتا ہے محبت میں ضرر آہستہ آہستہ
نہیں پروا جو راہِ عشق میں خطرے ہزاروں ہیں — چلے جاتے ہیں بے خوف و خطر آہستہ آہستہ
جھپکتے ہیں فروغِ حسن سے تیرے یہ باعث ہے — نکلتے ہیں جو یوں شمس و قمر آہستہ آہستہ
شکر رنجی ہے دو دن کی ملینگے دونوں پھر آکر — ہم ہو جائینگے شیر و شکر آہستہ آہستہ

نہ دشمن سے ڈرو رکھو بھروسہ فضلِ رب ہی پر
تمہیں ہو جائیگی فتح و ظفر آہستہ آہستہ

سید محمد فضل رب فضل


مولوی سیف الحق ادیب دہلوی
مرحوم

مخزن

جوان ترک

"جوان ترک" فریق کا نام پہلے بھی بارہا سننے میں آتا تھا۔ مگر حال میں اِس جماعت نے شہرت پایدار حاصل کی ہے۔ دولت ترکی کو اِس انقلاب خاموش سے جو دستوری حکومت کے قایم کرنے سے ہوا ہے۔ بالآخر نفع ہو یا نقصان سلطان عبدالحمید غازی کی معزولی ملک کے لیئے مفید ثابت ہو یا مضر لیکن "جوان ترک" گروہ کے یہ دونو کارنامے بُرائی سے یا بھلائی سے ترکوں کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ ہمارے اخبارات میں اِس گروہ کا ذکر چھپتا ہے تو ہمارے ابنائے وطن اکثر پوچھتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اِن کے اصول کیا ہیں۔ اور یہ کس طرح کامیاب ہوئے۔ بعض صاحبوں کا یہ خیال ہے کہ یہ پُرجوش نوجوانوں کی ایک جماعت ہے جو شوقِ تغیر کے نشہ میں سرشار ہے یہ خیال زیادہ تر اِس لیے بھی پھیلا ہے کہ اکثر اُردو تحریرات میں انگریزی اصطلاح "ینگ ٹرک" کا ترجمہ "نوجوان ترک" کیا گیا ہے۔ حالانکہ میرے نزدیک "ینگ" کا ترجمہ "جوان" ہونا چاہیئے۔ نوجوان کہنے سے ایک مغالطہ

پڑتا ہے۔ کیونکہ حقیقت میں اِس گروہ کی کثیر تعداد نوجوان تو کجا جوان بھی نہیں ہے بہت سے "جوان ترک" جہاندیدہ بوڑھے ہیں۔ جن کے بال سفید ہو چکے ہیں اور جن کی حالت پر لفظ "جوان" کا اطلاق اگر ہو تو اِس مصرعہ کے مطابق ہو سکتا ہے کہ ع۔ بہ ہمت جوان و بہ تدبیر پیر۔ اُن کی تدبیر کی پختگی پہلے واقعہ سے ظاہر ہے۔ کہ انہوں نے اچانک آئین طلب کیا اور پا لیا۔ اور اُن کی جواں ہمتی اُس مستعدی سے نمایاں ہے جس سے انہوں نے استانبول میں فوجی بغاوت کے اُٹھتے ہوئے شعلوں کو بجھا دیا۔ مجھے اِس وقت اُن کو بڑھانا یا عثمانیوں کے کسی اور گروہ کو گھٹانا منظور نہیں۔ نہ یہ منشا رہے کہ اُس جماعت کی تعریف کروں جس نے سلطان عبد الحمید کو تخت سے اتار دیا ہے کیونکہ میرے خیال میں اگر وہ سلطان عبد الحمید کو چند سال اور بٹھا دیتے۔ تو بہت سے ملکی مقاصد کے لئے شاید زیادہ مفید ہوتا۔ میں اِس موقعہ پر اِس امر واقعہ کا بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آلِ عثمان کے قابل ترین افراد اِس گروہ میں شامل ہیں جس زمانہ میں اُنہوں نے اِس جماعت کی بنیاد ڈالی اس وقت وہ جوان ہوں گے لیکن اب وہ معمر ہیں۔ سب کے سب یا تقریباً سب مغربی تعلیم پائے ہوئے ہیں جو اُنہوں نے فرانسیسی کے ذریعہ سے حاصل کی ہے۔ اور اکثر فرانسیسی بے تکلف بولتے ہیں۔ اِن میں جتنے سرگردہ رہنما ہیں وہ بالعموم برسوں یورپ میں جلاوطن رہے ہیں اور اِن کے زمانہ جلاوطنی میں پیرس اِن کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ احمد رضا بے جو آئینی حکومت کے آغاز میں شورائے دولت کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اور مجلس اتحاد و ترقی کے سرگروہ ہیں۔ پیرس میں بیٹھے مدتوں ریشہ دوانی کرتے رہے۔ ایک چھوٹا سا اخبار "مشورت" نامی وہاں سے نکالتے تھے جو خاصہ بااثر تھا۔ مجھے پیرس میں اِن سے ذاتی طور پر ملاقات

کرنے اور اُن کے خیالات سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک وضعدار آدمی ہیں جن کا سن بادی النظر میں کوئی پچاس کے قریب ہے۔ ڈاڑھی کے بال سفید ہیں طبیعت غور و فکر کی عادی معلوم ہوتی ہے۔ بات سوچ کر کرتے ہیں۔ لندن میں مجھے ایک دوست نے اُن کا پتہ بتایا تھا وہاں میں گیا تو معلوم ہوا۔ کہ کسی جلسہ میں لکچر دینے گئے ہیں۔ میں جلسے ہی میں جا پہنچا۔ دیکھا تو ایک بڑا مجمع معزز فرانسیسی اصحاب کا موجود تھا۔ اور احمد رضا بے مذہب اسلام کے متعلق ایک عالمانہ مضمون پڑھ رہے تھے جو بہت پسند کیا گیا۔ جلسہ کے ختم ہونے پر میں اُن سے ملا اور میں نے پوچھا کہ پھر کس وقت ملاقات ہو سکتی ہے۔ انہوں نے دوسرے دن شام کا وقت مقرر کیا اور ایک ریسٹوران کا پتہ بتایا جہاں ان کے ہم وطن دوست اکثر جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ میں دوسری شام کو وہاں گیا اور کچھ دیر تک اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔ اُنہوں نے اپنی تجاویز اصلاح سنائیں جن میں سب سے ضروری یہی تجویز تھی کہ پارلیمنٹ قایم کر کے رعایا کی سب طبقوں کو مساوی حقوق دیدیئے جائیں۔ اِس کے بعد اُن کے چند ہمراہیوں سے وہیں ملاقات ہوئی میں نے دیکھا کہ وہ احمد رضا بے کو نہ صرف باعتبار لیاقت بلکہ بلحاظ صداقت و راست روی کے نہایت تعظیم کے قابل سمجھتے تھے اور اُن کا بہت ادب کرتے تھے۔ اُن میں سے ایک نے یہ بھی کہا کہ احمد رضا وہ شخص ہے کہ اگر کبھی زمانہ ہمارے موافق ہوا اور ہم وطن میں بخیریت پہنچے تو رتبہ وزارت پائے گا۔ اِسی شخص سے یہ معلوم ہوا کہ سلطان عبد الحمید کے چھوٹے بھائی رشاد آفندی جو اب سلطان محمد خامس کے لقب سے ممتاز ہو کر تخت سلطنت پر بیٹھے ہیں۔ "جوان ترک" فریق کے معاون اور ہم خیال ہیں اور سنیر یوسف عز الدین آفندی جو سلطان عبد العزیز مرحوم کے

فرزند ہیں اور جن کی باری رشاد آفندی کے بعد ہے وہ بھی اسی آزادی پسند گروہ کے موافق ہیں۔ اس شخص کا بیان یہ تھا کہ رشاد آفندی سے بہ حیثیت سلطان کسی نمایاں کام کی امید نہیں ہو سکتی صرف اسی قدر ہے کہ وہ کام چلنے دیگا اور اس میں مشکلات نہ ڈالے گا مگر یوسف عزالدین سے زیادہ توقعات ہیں۔ "جوان ترک" جماعت کو جو کچھ کامیابی ہوئی وہ ناممکن ہوتی اگر خود ارکین دولت میں جو سلطان عبدالحمید کی زبردست حکومت کی ملازمت میں بیش قرار تنخواہیں پا رہے تھے بہت سے لوگ در پردہ "جوان ترک" نہ ہوتے۔ مجھے استانبول میں یہ معلوم ہوا تھا کہ ہر تعلیم یافتہ شخص در پردہ "جوان ترکوں" کے خیالات سے متاثر ہے یا اُن سے ہمدردی رکھتا ہے لیکن زبان یا قلم سے اس ہمدردی کا اظہار نہیں کر سکتا اسی لیے اُن دنوں گو بظاہر ہمیں دو مہینے میں ایک شخص بھی استانبول میں ایسا نہیں ملا جو منہ سے کہے یا کہنے کی جرأت کر سکے کہ وہ "جوان ترکوں" میں سے ہے۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اپنے پیارے وطن کو جو سچ مچ ایک بہشت کا نمونہ ہے خیرباد کہے لیکن یوں گفتگو میں بہت سے بڑے بڑے لوگوں کی زبان سے کوئی نہ کوئی فقرہ ایسا نکل جاتا تھا جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکیں کہ وہ سیاسی آزادی کے شوق کا "ثمر ممنوع" چکھ چکے ہیں پرانی وزارت کے جو ارکین اور عہدہ دار پہلے انقلاب کے بعد نئی وزارت میں جگہ پا گئے اُن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کم و بیش راسخ فرقۂ انقلاب پسند سے رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اُن کا پھر معزول ہو جانا صرف یہی ثابت کرتا ہے کہ وہ مجلس اتحاد و ترقی کا اعتماد حاصل نہیں کر سکے اور اُن کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ دو آقاؤں کو خوش رکھنا چاہتے ہیں ورنہ اگر وہ اصولاً اس مجلس کے موافق نہ ہوتے تو نہ انہیں کوئی مقرر کرتا اور نہ وہ اس انقلابی

حکومت کے ماتحت عہدہ قبول کر سکتے۔

باوجود ہر طرح کی دیکھ بھال اور محکمۂ جاسوسی کی گرماگرمی کے اس جماعت کا چپکے چپکے ترقی کرتے جانا اور قوت پکڑ جانا تعجب خیز تو ضرور ہے مگر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جو لوگ اصلاح کے مؤید ہونے کی وجہ سے مشتبہ سمجھے گئے۔ اور جلاوطن کئے گئے۔ وہ اصل میں تنہا نہ تھے۔ بہت سے ہم خیال دوست رکھتے تھے جنھیں وہ اپنے رنگ میں رنگ چکے تھے۔ انہوں نے جرأت سے کام لیا۔ اور اپنے خیالات ظاہر ہونے دیئے۔ انھیں نکلنا پڑا۔ ان کے دوستوں نے حیلہ و تدبیر کو بہتر سمجھا اور اصلی خیالات کو دل میں چھپا کر مقتضائے وقت کے مطابق کام کرتے رہے اور منتظر رہے کہ زمانہ کب بدلتا ہے۔ علاوہ بریں ڈاک اپنا کام کیا کی تحریرات اور مطبوعات آزادی کی تلقین لیے ہوئے انھیں برابر پہنچتی رہیں۔ ہرچند کہ عثمانی ڈاکخانہ نے اس شوق میں کہ ہر باغیانہ تحریر اور ہر سازشی خط وکتابت سے مطلع ہو کر سلطان کی خدمت میں خبر پہنچائی جائے ہزاروں خطوط کھولے اور اخبارات کے ہزاروں پرچے ردی میں پھینک دیئے مگر اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ ڈاکخانہ کا لاکھوں روپیہ کا نقصان ہو گیا۔ جو خطوط معمولی طور پر عثمانی ڈاکخانہ میں ڈالے جاتے اور ان کا محصول دولت عثمانیہ کو ملتا وہ انگلستان اور جرمنی اور روس کے ڈاکخانوں کے ذریعے روانہ کئے گئے وہاں کسی عثمانی افسر کا دخل نہ تھا نہ وہ کسی کے خطوط کھولنے یا دیکھنے کا مجاز تھا۔

تحریر میں جو تاثیر ہے محتاج بیان نہیں۔ میں نے استانبول میں بعض نہایت واقف کار اشخاص سے سنا کہ ایک عبدالحق حامد بے کی کتابوں نے ترکوں میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور گو حکومت کی طرف سے ملک میں ان کی اشاعت ممنوع ہے پھر بھی برابر پڑھی جاتی ہیں اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

اس لحاظ سے حامد بے کا شمار بھی درحقیقت جوان ترکوں میں ہونا چاہیے گو وہ دولت عثمانیہ کے دیرینہ اور تجربہ کار عہدہ داروں میں ہیں۔ حامد بے کی عمر اسوقت پچپن سال کے قریب ہوگی جب میں لندن میں تھا تو وہ سفارت خانۂ عثمانی کے چانسلر تھے اور اس کے بعد سنا ہے کہ ہسپانیہ میں سفیر مقرر رہے۔ مدت ہوئی بمبئی میں کونسل جنرل عثمانی کا عہدہ رکھتے تھے اُن کی قابلیت مسلمہ ہے اور اُن کی تصانیف نہ صرف ٹرکی میں مقبول ہیں بلکہ اُن کا شہرہ دیگر ممالک یورپ تک پہنچ گیا ہے۔ ان کی بعض کتابیں ترکی سے دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ کیمبرج کے ایک مستشرق پروفیسر گب نے عثمانی شاعری پر ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں حامد بے کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ ایک جدید انگریزی انسائیکلوپیڈیا میں ترکوں کے ادبیات کے بیان میں ترکی علم ادب کو پانچ دوروں پر تقسیم کیا گیا ہے اس میں دورِ پنجم کا حال لکھتے ہوئے یہ لکھا ہے:۔

"عبدالحق حامد بے نے سب سے پہلے یورپ کی طرز تحریر سے ترکی نظم میں کام لیا۔ بہت سی عمدہ نظمیں اور ڈرامے اسکی تصانیف میں ہیں اور یہ متفقہ رائے ہے کہ وہ ٹرکی کے موجودہ شعرا میں سب سے اول درجہ پر ہے اکرم بے جو اسوقت استانبول کے شعرا کے طبقۂ اعلےٰ میں داخل ہے۔ حامد بے کا مقلد ہے"

حامد بے کے ڈرامے آزادی کے خیالات ملک میں پھیلانے کا ایک زبردست ذریعہ ثابت ہوئے۔ فاضل مصنف نے بغیر حاکم وقت پر کوئی حملہ کرنے یا حکومت سے پرخاش کرنے کے آزادی کا شوق اصولی طور پر دلوں میں جاگزیں کر دیا۔ اس سے وہ معتوب ہوا اور گو بہ سبب اثر کے خدمت سے علیحدہ نہیں کیا گیا لیکن ترقی سے محروم رہا ورنہ یقیناً کسی بڑے مرکز میں سفیر یا خاص پایہ تخت میں وزیر ہو گیا ہوتا۔ حامد بے کا ضبط قابل تحسین ہے میں نے سوائے ایک مرتبہ کے کبھی کوئی ایسا کلمہ اُن کی زبان سے نہیں سنا جس سے معلوم ہو سکتا کہ وہ سلطان یا اُن کے

وزرا سے رنجیدہ یا فریق انقلاب پسند کے طرفدار ہیں ایسے ہی دور اندیش اور ضبط والے لوگوں کے دل و دماغ کی برسوں کی محنت سے وہ نتایج پیدا ہوئے ہیں جنھیں آج دنیا تعجب سے دیکھ رہی ہے۔ یہ علم خدا کو ہے کہ وہ نتائج ملک کی ترقی کے لیے کہانتک مفید ثابت ہوں لیکن اتنا تسلیم کرنا محض انصاف ہے کہ "جوان ترک" کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں بلکہ گزشتہ نصف صدی میں جو کچھہ علمی ترقی ٹرکی میں ہوئی ہے اس کے بہترین نمونے ہیں بعض لوگوں کو ان کے مذہبی عقائد سے بدظنی ہے۔ مگر یہ زیادہ تر بے بنیاد ہے اُن میں سے بیشتر نہایت درجہ عقیدت مذہب اسلام سے رکھتے ہیں البتہ سست عمل ضرور ہیں یعنی اُن کا وہی حال ہے جو بہت سے انگریزی پڑھے ہوئے مسلمانوں کا ہندوستان میں ہے کہیں کہیں اُنکے خاص خاص افراد پر بعض یوروپین نامہ نگاران اخبار نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ان میں کوئی فلاں قوم سے ہے اور کوئی فلاں نسل سے لیکن اس اعتراض کا کوئی اثر کسی ایسے شخص پر نہیں پڑ سکتا جو ٹرکی کے حالات سے آگاہ ہے۔ ٹرکی میں عام طور پر اور استانبول میں بالخصوص مختلف قومیں اس طرح مخلوط ہوئی ہیں کہ وہاں اب ان باتوں کی پروا نہیں کی جاتی ہر مسلمان یکساں حیثیت رکھتا ہے اور اسلامی دنیا اپنے مذہب کے اصول مسلمہ کے موافق مجبور ہے کہ اسکی رفعت اسکی لیاقت شرافت اور حریت کے معیار سے کرے۔ اور اسکی حسب و نسب سے زیادہ تعرض نہ کرے +

اس مضمون کے ختم کرنے سے پہلے شاید یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ "ینگ ٹرکی" غالباً اپنی قسم کی آخری جماعت یورپ میں ہے۔ اس سے پہلے دیگر ممالک یورپ میں بعض پولیٹکل جماعتیں اسی طرح کی قایم ہو چکی ہیں اسلیئے جب ترکوں نے بعض جدید تعلیم پائے ہوئے لوگوں کو سیاسی اصلاح کا خیال ہوا تو انہوں نے اپنے ہمسایہ قوموں کی تقلید کی اور اپنی جماعت کا نام بھی اسی قسم کی دوسری

جماعتوں کے نام پر رکھا۔ ۱۸۳۹ء میں انگلستان میں ایک پارٹی "ینگ انگلینڈ" کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ "ینگ جرمنی" نام کی ایک پارٹی جرمنی میں تھی جو ۱۸۴۸ء کے انقلاب کی ناکامی سے منتشر ہو گئی۔ اسی طرح ایک جماعت "ینگ اٹلی" کے نام سے مازینی نے قایم کی تھی۔ جسکی بنیاد مارسیلز علاقۂ فرانس میں رکھی گئی تھی۔ اور آئرلینڈ میں ایک پارٹی "ینگ آئرلینڈ" کے نام سے ۱۸۴۸ء میں قایم ہوئی تھی۔ انہی مثالوں کو دیکھ کر ترکوں کو "ینگ ٹرک" پارٹی قایم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور سالہا سال تک ایک گونہ گمنامی اور کس مپرسی کی زندگی کے بعد آخر اس کا دور دورا ہوا ہے جو دیکھیے کب تک رہے۔

عبد القادر

مولوی سیف الحق صاحب مرحوم ادیب جنکی تصویر زیب ورق اول ہے۔ دہلی کے ان باکمال شعرا میں سے ہیں جنپر ایشیائی شاعری ہمیشہ ناز کرے گی۔ ادیب مرحوم مولنا شیخ عبد الحق صاحب مغفور محدث دہلوی کی اولاد میں تھے شعر و سخن کا شوق بچپن سے طبیعت میں موجود تھا۔ ایک ایسے مشاعرہ میں جہاں غالب مرحوم بھی تشریف فرما تھے مولانائے مرحوم نے یہہ مطلع پڑھا ؎

لیجاؤ میرے سینہ سے ناوک نکال کے ‏ ‏ پر دل نکل نہ آئے کہیں دیکھ بھال کے

مطلع سنتے ہی مرزا صاحب نے اپنے پاس بلایا اور کہا ہمارے پاس آیا کرو۔ اسدن سے خوب بنا نا شروع کیا۔ ادیب جیسا شاگرد اور غالب جیسا استاد۔ اردو اور فارسی دونو کلام ایک سے ایک بہتر۔ نثر بھی فرماتے تھے اور خوب فرماتے تھے۔ تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ افسوس عمر ناپائدار نے وفا نہ کی۔ اور (۵۴) برس کی عمر میں رحلت فرمائی ٭

شیخ علی حزیں

حُسنِ اتفاق سے شیخ علی حزیں نے اپنی ایک مختصر سی سوانح عمری چھوڑی ہے جس سے بہتر آئینہ ان کے حالات کا ہمیں نظر نہیں آتا ہماری تحریر بیشتر اُسی سے ماخوذ ہے۔ گو متعدد کتب تواریخ کی ورق گردانی کی گئی ہے۔

شیخ کا نام محمدؐ علی ہے تخلص کا نام کے دوسرے جزو کے ساتھ ملا دینا گو عام طور پر دیکھنے میں نہیں آتا۔ لیکن مثالیں موجود ہیں چنانچہ ہمارے ہندوستان میں سراج الدین علی خاں "خانِ آرزو" کے نام سے مشہور ہیں۔

شیخ کی ولادت روز دوشنبہ ستائیسویں ربیع الثانی سنہ ۱۱۰۳ھ (۱۷- جنوری سنہ ۱۶۹۲ء) میں بمقام اصفہان جو اُس وقت دارالسلطنت تھا وقوع میں آئی۔ انکا سلسلۂ نسب شیخ زاہد گیلانی تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان علم و فضل و شرف میں ممتاز تھا۔ حزیں نے علوم متداولہ میں بہت معقول دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ اِن کے والد ابی طالب نے جو خود ایک عالم متبحر تھے اپنے ہونہار لڑکے کی تعلیم میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ چنانچہ جب شیخ کی عمر چار برس کی ہوئی۔ ملّا شاہ محمد شیرازی کے حلقۂ درس میں بٹھائے گئے۔ شیخ اپنی تاریخ احوال میں فرماتے ہیں کہ "پڑھنے لکھنے کا شوق مجھپر ایسا غالب تھا کہ کسی وقت کتاب سے فرصت

نہ تھی۔ اکثر کتابیں نظم و نثر کی اِس صغر سنی میں دیکھ ڈالیں۔ صرف و نحو و فقہ بھی اِس زمانے میں دیکھتا جاتا تھا۔ اور منطق کے بھی چند رسالے مطالع میں آئے تھے۔ استاد کو میرے ذہن و ذکا پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ میری تعریف کیا کرتے۔ اور میرا شوق بڑھتا جاتا۔ طبیعت کی موزونی چونکہ ازلی تھی شعر میں مجھے نہایت لذت ملتی تھی۔ اور سخنگوئی کی طرف دل کا میلان رہتا تھا۔ مگر اس شوق کو میں پوشیدہ رکھتا تھا۔ استاد کو کسی نہ کسی طرح اطلاع ہوگئی۔ اکثر ممانعت کرتے۔ اور والد تو ترک شعر میں بہت زیادہ مبالغہ کرتے تھے۔ اپنا یہ حال تھا کہ شعر کو یکقلم الوداع کہدینا طاقت سے باہر تھا۔ کچھ کچھ لکھا کرتا۔ اور مخفی رکھتا۔"

غرض شیخ نہایت قلیل عرصے میں منطق و ہیئت۔ حساب۔ و طبعیات وغیرہ علوم پر حاوی ہوگئے۔ تخلص حزیں انکو شیخ خلیل اللہ قدس اللہ روحہ سے ملا۔ یہ بزرگ بڑے صاحب باطن تھے اور شیخ حزیں کہتے ہیں کہ مجھپر بڑی عنایت کی نظر رکھتے تھے۔ اور بچپن میں جب مجھکو شعر کہنے کی اجازت نہ تھی چنداں منع نہ کرتے۔ بلکہ کبھی کبھی ارشاد فرماتے کہ کچھ اپنا کہا ہوا سنا۔ اُن کی ایک رباعی مشہور ہے ؎

رباعی

اے شوخ بیا در دلِ درویش نشیں — کان نمکی بر جگر ریش نشیں

در ہجر تو دانم گلستاں شدہ است — یکدم بکنار کشتۂ خویش نشیں

شیخ علی حزیں کو احادیث میں بھی بہت توغل تھا۔ اور اکثر کتب اخلاق نظر سے گذری تھیں۔ شوق کا یہ عالم تھا کہ مطالعے میں راتیں

گزار دیتے تھے۔ شیخ اپنے والد بزرگوار کے فیض صحبت سے بہت متمتع ہوئے۔
شاعری کا مادہ چونکہ ازل سے مبدا فیاض نے شیخ کی فطرت میں ودیعت کیا تھا۔ اور اس فن میں عالمگیر شہرت ان کے حصے میں آنے والی تھی۔ اس لیئے لڑکپن ہی سے طبیعت بیتاب رہتی تھی۔ چنانچہ اسی زمانے کا ذکر کرتے ہوئے شیخ فرماتے ہیں کہ "ایک دن والد علامہ کے ہاں مستعدان وقت کا ایک پُرشوکت مجمع تھا۔ اور میں بھی اس مجلس میں شریک تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے ملا محتشم کاشی کا یہ مطلع پڑھا ؎

اے قامت بلند فداں در کمند تو رعنائی آفریدۂ قد بلند تو

اکثر حاضرین مجلس نے شعر کی بڑی تعریفیں کیں۔ والد مرحوم نے فرمایا کہ دیوان محتشم میری نظر سے گزرا ہے۔ البتہ شاعری اسکا حق ہے۔ مگر کلام بے مزہ ہے اور اتنی حلاوت جو اس بے نمکی کی تلافی کر سکے موجود نہیں ہے۔ چنانچہ یہ مطلع قابل اعتراض ہے۔ مصرع ثانی تو بہت خوب واقع ہوا ہے۔ لیکن مصرع اول غیر مانوس ہے۔ کیونکہ قامت کو کمند میں کہنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اگر قامت کا لفظ نہ ہوتا اور کہا جاتا کہ بلند فداں در کمند تو اند تو یہ کلام پسندیدہ ہوتا۔ حاضرین نے والد کی رائے سے اتفاق کیا۔ پھر والد میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تو اب تک شعر کہنے سے باز نہیں آیا ہے۔ اگر کہہ سکتا ہے تو اس زمین میں کچھ کہہ۔ اسی وقت ایک مطلع میں نے موزوں کیا۔ اور جب انکی نظر پھر مجھ پر پڑی معلوم کر لیا کہ میں نے کچھ کہا ہے اور عرض کرنا چاہتا ہوں تو ارشاد کیا کہ پڑھ حجاب نہ کر۔ میں نے مطلع پڑھا ؎

صیدِ از حرم کشد خم جعدِ بلند تو فریاد از تطاولِ مشکیں کمند تو

حاضرین پھڑک گئے اور داد دینے لگے۔ ہنوز یہ لوگ مصروفِ تحسین تھے کہ ایک اور شعر موزوں ہو گیا۔ جسکو میں نے سنایا۔ ؎

شد رشک طور ز آمدنت کوئ عاشقاں بنشیں کہ باد خردہ جاں ہا سپند تو

اِس شعر کو سنکر خود والد علامہ سر دھننے لگے اور کہا کہ جس نمک کو میں کہتا تھا اِس میں موجود ہے۔ محتشم کے شعر میں نہیں ہے اسکے بعد میں نے دوسرا شعر پڑھا ؎

مشکل شد است کارِ دل از عشق و خوشدلم شاید رسد بخاطرِ مشکل پسند تو

اور تھوڑے تامل کے بعد غزل پوری کر دی۔ حاضرین نے یکزبان ہو کر کہا کہ اِس قسم کی بدیہہ گوئی آج کسی سے نہیں ہو سکتی۔ والد نے فرمایا کہ اب میں تجھکو شعر کہنے کی اجازت دیتا ہوں۔ مگر اتنی شعر گوئی نہ کر کہ وقت عزیز ضائع ہو۔ اور ایک قلمدان کہ موجود تھا اِس غزل کے لکھنے کے لئے بطور انعام مرحمت فرمایا"۔

گو شیخ حزیں نے یہ اشعار واقعی اچھے کہے ہیں اور بدیہہ گوئی کے جوہر دکھائے ہیں۔ مگر راقم سطور کو تسلیم نہیں کہ مُلا محتشم کا کلام بےنمک ہے اور مطلع پر جو اعتراض شیخ کے والد نے کیا ہے غالباً غلطی سے کیا ہے۔ کیونکہ قامت کا لفظ جسپر اعتراض ہے اور بجا اعتراض ہے ممکن ہے کہ محتشم نے نہ کہا ہو۔ میری نظر سے بھی محتشم کا دیوان گزرا ہے۔ اور اِس میں قامت کا لفظ موجود نہیں ہے۔ مطلع یوں ہے۔

اے گردنِ بلند قداں در کمندِ تو رعنائی آفریدۂ قدِ بلند تو

گردن کو کمند سے مناسبت تمام ہے اور جب شعر اصل میں یوں ہے

تو اعتراض باقی نہیں رہتا۔ اور محتشم کے کلام کو بے نمک کہدینا راقم کے خیال میں ظلم ہے۔ محتشم کی اس زمین میں دو غزلیں ہیں جن کے اکثر شعر بامزہ اور نمکین ہیں۔ دو چار شعر درج کرتا ہوں سلہ

اے گردن بلند فداں در کمند تو | رعنائی آفریدۂ قد بلند تو
چندم فتادہ بینی و گوئی کہ کیست این؟ | بیمار تو شکستۂ تو در دمند تو!
قتلش روا ست گر ہمہ صید حرم بود | ہر صید کاضطراب کند در کمند تو
اے مادر زمانہ ببیں کز خلاف عہد | بامن چہ میکند خلف ارجمند تو
تلخی مکن کہ خندہ نگہداشتن بزور | مے بارد از لب و دہن نوشخند تو

چوں محتشم بسے ز ندامت بسر زدم
دستیکہ میزدم بعنان سمند تو

یہ درست ہے کہ محتشم کی طبیعت زیادہ تر تصنع کیطرف مائل ہے مگر لطیف اور بامزہ اشعار بہت سے اسکے دیوان میں ملیں گے۔ مرثیہ سید الشہدا جیسا اسنے لکھا ہے کم کسی نے لکھا ہوگا۔ چنانچہ دوازدہ بند محتشم کاشی مشہور ہے۔ ایران میں سب محتشم کو استاد مانتے ہیں۔ حزیں کی شہرت زیادہ تر ہندوستان ہی میں ہے۔

شیخ کو تحصیل علم میں ایک بڑی خوش نصیبی تائید یہ ہوئی کہ اکثر علما و فضلا عصر کے حاشیۂ فیض میں ان کو جگہ ملتی رہی جس سے انکی معلومات میں بے انتہا ترقیاں ہوتی گئیں۔ اکثر علوم میں انھوں نے ید طولےٰ پیدا کیا۔ ایک بار فن طب کے حاصل کرنے کا شوق ہوا کتابوں کا

سلہ یہ مضمون ذوق کے ہاں بھی خوب بندھا ہے سہ

عبث تم اپنا بناوٹ سے مُنہ بناتے ہو | وہ لب پہ آئی ہنسی، دیکھو، مسکراتے ہو!

انبار لگائے ہوئے ایک دن مستغرق بیٹھے تھے کہ ان کے والد پہنچے
کہنے لگے کہ تم نے اپنی عمر کو کیا جاودانی تصور کر لیا ہے کہ نئی نئی
راہوں میں قدم رکھتے جاتے ہو۔ علوم بے شمار ہیں اور بے پایاں
کہاں تک حیات دوروزہ پر آدمی بھروسا کرے۔ تم نہیں جانتے
یہ تمھارا شوق تمھارے جسم کو گھلا دیگا۔ جسطرح شمشیر تیز نیام کو کھا جاتی ہی
شیخ کو شوق علم نے تاہل اختیار کرنے پر آمادہ نکیا۔ تجرد ان کو بہت
بھایا۔ جسکو آخر دم تک نبھایا۔

شیخ کے والد کا انتقال ۱۱۲۷ھ ہجری میں ہوا۔ اسوقت انکی عمر
چوبیس برس کی تھی۔ دو برس کے بعد ان کی والدہ بھی انتقال کر گئیں
اور تھوڑے ہی عرصے میں سارے گھر کا صفایا ہو گیا۔ اور شیخ تنہا
رہ گئے۔ اصفہان کو ترک کرنا ضرور ہوا۔ علاوہ بریں خرچ کی بھی تنگی
ہوتی تھی۔ کیونکہ لاہجان میں جو ان کے آبائی میراث کی جگہ تھی بسبب
کسی کارواں کے نرہنے کے تحصیلات میں خرابی پیدا ہوتی گئی
اور آمد قلیل ہوتے ہوتے معدوم ہو گئی۔ بلدۂ لاہجان گیلان میں واقع ہے
اور شیخ اسلیے لاہجی یا لاہجانی بھی مشہور ہیں۔ گو زیادہ تر اصفہانی کہلاتے
ہیں بعض انکو گیلانی بھی کہتے ہیں غرض اصفہان چھوڑ کر شیخ نے
اکثر بلاد ایران میں بطریق سیاحت سفر کیا۔ اور مشاہیر عصر کی صحبت سے
متمتع ہوئے۔ رفتہ رفتہ دار السلام بغداد کو پہنچے اور وہاں سے
کربلائے معلے میں اور پھر وہاں سے نجف اشرف میں جا کر قریب تین
سال تک اُس آستانِ مقدس میں قیام کیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے
مصحف شریف کی ایک نقل اپنے دست خاص سے کی جسکو وہیں چھوڑا

یہاں وقت انکا آسودگی اور اطمینان سے گزرتا تھا۔ اور مطالعہ کتب کے
لیئے خوب فرصت ملتی تھی۔ پھر سفر خراسان کا خیال دل میں آیا۔
اور نجف اشرف سے رخصت ہوئے۔ کرمان میں پہنچے تو تمام ایران
کو استیلائی رومیاں کے سبب پریشان پایا۔ کچھ عرصے تک ادھر
ادھر پھر کر شیخ بارادۂ سفر حجاز بندر سورت تک آئے اور وہاں
سے براہ دریا مکہ معظمہ پہنچے اور حج بیت الحرام سے شرف اندوز ہوئے

(باقی آئندہ) **رضا علی۔ وحشت**

شام غریباں

جنگل کی اداسی تو وہ اور شام کا ہونا — بچوں کا وہ کھانے کے لیئے بھوک میں رونا
پانی کی تمنا میں وہ منہ اشکوں سے دھونا — فاقوں میں کہاں نیند کہاں چین سے سونا
لو چلتی ہے جب خاک میں اٹ جاتے ہیں بچے
ماؤں سے اندھیرے میں لپٹ جاتے ہیں بچے

آتی تھی درندوں کی صدا گونجتے تھے شیر — سب فرش پہ آندھی سے خس و خاک کا تھا ڈھیر
گل ہونے میں شمعوں کے نہ لگتی تھی ذرا دیر — کرتی تھی اندھیری میں ہوا اور بھی اندھیر
جب اٹھتی تھیں چوبیں تو جھکا جاتا تھا خیمہ
بھرتی تھی ہوا جب تو اڑا جاتا تھا خیمہ

اجڑے ہوئے جنگل کی ڈرانی وہ صدائیں — تھراتا تھا کوئی کوئی پڑھتا تھا دعائیں
دھڑکا تھا کہ جانیں کہیں بچوں کی نہ جائیں — کس طرح اس آفت میں جگہ امن کی پائیں
یاں آن کے پانی سے چھٹے کھانے سے چھوٹے
ہو صبح تو جانیں کہ سیہ خانے سے چھوٹے

(انیس)

روح کی بیداری

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

اہل دنیا کی حالت کا ٹھیک اندازہ

ہر طبقہ، ہر فرقہ، ہر مرتبہ۔ اور ہر حالت کے لوگ اپنی اپنی حالت میں مگن[۵۱] ہیں۔ نفسانی خواہشات کے بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ دنیا کی ناپائیدار۔ اور خدا سے غافل کرنے والی چیزوں کی فراہمی میں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں یہانتک کہ اسی خواہش کی بھاری بیڑیاں پہنے ہوئے اور اسی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے قبر کے گڑھے میں موُنھ کے بل گر پڑتے ہیں نصیحت کا اُنپر مطلق اثر نہیں ہوتا۔ اور بحث کا صرف یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اِن کی ہٹ اور بڑھجاتی ہے۔ عقل کا ایک ذرہ بھی اِن کے حصّہ میں نہیں آیا۔ نہ اوس تک رسائی پہنچنے کا رستہ معلوم۔ خدا نے اِن کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگادی ہے، آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ایک بڑا عذاب اِن کے انتظار میں ہے۔[۵۲] عذاب کی دیگوں میں پڑے ہوئے ہیں اور سیاہ غلاف

---

۵۱ آیت قرآنی کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (ہر گروہ اوس سے خوش ہے۔ جو اوسکے پاس ہے) سے اقتباس کیا گیا۔

۵۲ ترجمہ ہے اِس آیۃ شریفہ کا خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَ عَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔

اوپر سے چڑھے ہوئے ہیں۔ معدودے چند کے سوا سب نے دین کو دنیا کی کھیتی بنا رکھا ہے۔ مذہبی احکام کو پیٹھ کے پیچھے ڈالدیا ہے اور مطلق اون کی پرواہ نہیں کرتے۔ تجارت اور کاروبار میں ایسے منہمک ہیں کہ خدا کو بالکل بھول گئے ہیں۔ یہ حالت دیکھکر اوس کی آنکھیں کھلیں اور سمجھا کہ کسی نصیحت کا اثر کارگر ہونا ناممکن اور ہر مذہب نے جو معیار مقرر کیا ہے اوسکی حد سے آگے بڑھکر کسی عمل کا اثر فرض کرنا سراسر خلاف مصلحت ہے۔ نیز یہ کہ مذہب جو فائدہ اِن لوگوں کو پہنچانا چاہتا ہے وہ اِسی زندگی کے متعلق ہے یعنی جبتک یہ اس دنیا میں رہیں قاعدہ اور انتظام سے زندگی بسر کریں اور کوئی شخص اُن چیزوں کی بابت جنکا وہ اپنے زعم میں مالک ہے دوسروں سے لڑنے جھگڑنے اور مارنے مرنے نہ پائے۔

ایں جہاں بر مثال مردار یست	کرگساں گرد او ہزار ہزار
آں مراین را ہمی زند مخلب[۵۱]	وین مرآں را ہمی زند منقار[۵۲]
آخر الامر بر پرند ہمہ	وزہمہ باز ماند ایں مردار[۵۳]

رہی آخرت کی آسودگی وہ تو اونہیں لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے "دُنیا کو دین کی کھیتی" بنایا ہے[۵۴]۔ سفر سے پہلے ہی کوچ اور مقام کی آسایش کا سامان روانہ کر چکے ہیں اور راستہ کے نشیب و فراز سے

۵۱ ناخن ۵۲ چونچ ۵۳ یہ اشعار اس حدیث کی شرح ہیں۔ اَلدُّنیَا جِیفَۃٌ وَ طَالِبُهَا کِلَابٌ (دنیا ایک مردار ہے اور اس کے طلبگار کتے ہیں۔ ۵۴ اَلدُّنیَا مَزرَعَۃُ الآخِرَۃِ۔ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے)

بھی بخوبی آگاہ ہیں یعنی نیک کردار اور طالب عقبیٰ رہیں۔ مگر جس نے خدا کے حکم سے تجاوز کیا اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اوسکی جائے پناہ جہنم ہے۔ [۱]

اِس سے بڑی مشقت اور اِس سے زیادہ مصیبت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان جب سے اوٹھے اور جبتک سوئے برابر مزدوری کرتا رہے۔ اِن لوگوں میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا۔ جو کوئی کام بغیر کسی نہ کسی دنیاوی اجر کی امید کے کرتا ہو۔ کوئی دولت کی تلاش میں تو کوئی عیش و عشرت کی جستجو میں ہے۔ کسیکو شہوت کی آگ نے بے قرار کر رکھا ہے اوسپر پانی چھڑکنے کی فکر میں ہے کسی کا سینہ انتقام اور غصہ کے دھکتے ہوئے کوئلوں سے بھک رہا ہے۔ دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ڈھونڈھتا ہے۔ کوئی حکومت کا خواستگار ہے کہ خود خوف سے چھوٹکر دوسروں پر قیامت ڈھائے۔ اگر شاذ و نادر کوئی کسی ظاہری حکم مذہب کی تعمیل بھی کرتا ہے تو مشیخت یا کسی دنیاوی مصیبت سے بچنے کے لیئے۔ اور یہہ سب تاریکی بالائے تاریکی ہے [۲]

غرض جب دیکھہ لیا کہ انسان عموماً ڈھور بلکہ اون سے بھی زیادہ گمراہ ہیں تو اطمینان ہو گیا۔ کہ پیغمبروں نے جو کچھہ فرمایا ہے۔ اور مذہب نے

---

[۱] اِس آیۂ شریفہ کا ترجمہ ہے۔ فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَ اٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ [۲] خدا کافروں کے اعمال افعال کی نسبت فرماتا ہو اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ یا مثل اُن تاریکیوں کے ہیں جو گہرے سمندر میں ہوتی ہیں جسپر موج ڈہکی ہوا اوس کے اوپر اور موج ہو اوس کے اوپر بادل ہو۔ تاریکیاں ایک دوسرے کے اوپر ۔ ۱۲

جو کچھ بتایا ہے عقلمندی، احتیاط اور کامیابی کا اوسی پر دار و مدار ہے اور کمی بیشی کی اوس میں بالکل گنجائش ہی نہیں ہے۔ ان لوگوں میں سے ہر شخص سے قدرت کو ایک خاص کام لینا ہے اور جو کام جس کے ذمہ ہے اوس کو اوسی کے لیے موزوں بنایا گیا ہے۔ شعر

ہر کسے را بہر کارے ساختند میل او اندر دلش انداختند

مذہب کا قانون ہر زمانہ میں یہی رہا ہے وہ کبھی بدلتا نہیں

وعظ و ہدایت سے ہاتھ اوٹھانا

اسکے بعد حجی سلمان اور اوس کے رفیقوں سے ملنے گیا اور ابتک جو وعظ و نصیحت میں اون کی اور اپنی تضیع اوقات کی تھی اوسکی معافی چاہی۔ کہنے لگا مینے جو آپ کے عقیدوں کے خلاف باتیں کیں اس تمام ہرزہ سرائی کا مطلب صرف اتنا تھا کہ دیکھوں آپ اپنے مذہب کے کتنے پکے ہیں۔ ورنہ درحقیقت میرے عقیدے خود وہی ہیں جو آپکے ہیں۔ الحمدللہ کہ آپ اس آزمائش میں پورے اوترے سیجئے اب آخری اور واقعی نصیحت کرنے آیا ہوں یعنے جسطرح میرے بہکانے سے نہیں ڈگمگائے۔ اسیطرح آیندہ بھی امید ہے کہ اپنے عقیدوں میں ثابت قدم رہیئے گا۔ اور کسی کے دہوکے میں نہ آئیگا۔ مذہبی رسموں اور ظاہری عبادتوں کی اسیطرح پابندی اور عزت کیجئگا۔ بے سرو پا باتوں میں پڑکر جن سے آپ کو کوئی سروکار نہیں خیالات کو ڈانواڈول نہ کرنا چاہیئے۔ جب

کسی بات میں شبہ ہو تو ہمیشہ قدیم رواج کی پیروی لازم ہے۔ مذہب کے معاملات میں نئے خیالات پاس نہ پھٹکنے پائیں۔ باپ دادا کی پیروی فرض ہے۔ بدعتوں سے سانپ بچھو سمجھکر بچنا چاہیئے۔ مگر عام لوگوں کی طرح مذہب سے بے پروائی ہر گز ٹھیک نہیں اور دنیا کی محبت کو کبھی دل میں جگہ نہ دینی چاہیئے۔

اِن مصلحت آمیز نصیحتوں کیو خطبہ ہے یعنی اب مثل اپنے دوست اصل کے اوسکو بھی یقین ہو گیا۔ تھا کہ اِن بودے، آسانی سے بہکنے والے، اور ادھورے انسانوں کے لیئے اِس کے سوا نجات کا کوئی اور ذریعہ ہی نہیں سکتا۔ اگر زبردستی دھکا دیکر ان کو غور و فکر کی بلندی پر چڑھا بھی دیا جائے تو اِن کی حالت اور بری ہو جائیگی دگدھا میں پڑے بھٹکتے رہیں سگے لیکن اگر مرتے دم تک اپنی اسی حالت میں رہے تو امید ہے کہ نجات ملے اور حشر کے روز سیدھے ہاتھ کی صف میں جگہ پائیں۱۔

حی کا مع اصل کے اپنے جزیرہ کو واپس آنا

اِس نصیحت بلکہ وصیت کے بعد اصل اور حی دونوں سلمان اور اوسکے ساتھیوں سے خیرباد کہکر رخصت ہوئے اور ایک جہاز میں سوار ہو کر مع الخیر پھر گوشۂ عافیت یعنی جزیرہ میں پہنچ گئے۔ حی نے دوبارہ کوشش کر کے پھر مراقبہ کے ذریعے سے استغراق اور محویت کی حالت

۱ یہ بھی قرآن شریف سے اقتباس ہے۔ کلام مجید میں نجات پانیوالوں کو کہیں جگہ اَصْحَابُ الْیَمِیْنِ اور اَصْحَابُ الْمَیْمَنَۃِ (یعنی سیدھے ہاتھ والوں کے لقب سے) ۱۲

حاصل کرلی۔ اور قدم بقدم چلتے چلتے اصل بھی اوس کے لگ بھگ آگیا دونوں رفیق بہت زمانہ تک اس طرح کشف و تحقیق اور عبادت حق میں مصروف رہے یہانتک کہ مسیحائے اجل نے جسم کے وبال سے چھڑا کر زندہ جاوید بنادیا۔

خاتمہ

اِس قصہ کی تحریر میں ہم نے لفظ وہ اختیار کیئے ہیں جو نہ کسی کتاب میں پائے جاتے ہیں نہ گنوار اور عامیانہ بول چال میں آتے ہیں اور خیالات اوس علم کے گنجِ مخفی سے لیئے گئے ہیں جو خدا کو جاننے والوں کے سوا کسی کو نہیں آتا۔ اور نجاننے والوں کے سوا ھر ایک کو آتا ہے۔ درحقیقت ہم نے وہ بات کی ہے جو ہمارے بزرگوں کی سنّت کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اونہوں نے ہمیشہ اِن موتیوں کو سینہ کے صندوق میں محفوظ رکھا۔ اور نظرِ نا آشنا سے بچایا۔ ہم جو اِن صندوقوں کا قفل توڑنے اور بکھاور کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں اوسکی وجہ خاص یہہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں بعض فلسفہ کے مدعیوں نے ایسی فاسد رائیں اور ایسے من گڑھت خیال مختلف مقامات میں پھیلائے ہیں کہ اونکا زہریلا اثر وبا کی طرح عام ہو گیا ہے اور اکثر کم سمجھ لوگ اِن واہی تباہی باتوں پر ایسے فریفتہ ہو گئے ہیں کہ پیغمبروں کی تعلیم کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ اسلیئے ہمیں خوف ہوا کہ کہیں یہہ بے سمجھ لوگ ایسا نہ خیال کر بیٹھیں کہ سچا فلسفہ ایک راز بستہ ہی جو قصداً ہم سے چھپایا جاتا ہے کیونکہ اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ

بما مُنِعَ ۔ الانسان کو جس چیز سے روکا جائے۔ اوسکی حرص ہوتی ہے اِس سے اِن کا اشتیاق اور بھی زیادہ ہو جائیگا۔ اور چونکہ خود راہِ طلب سے ناواقف ہیں اور خضرِ راہ کوئی ساتھ نہوگا۔ ضروری ہے کہ غولانِ بیابانی کے ہتھے چڑھیں اور ہلاک ہوں اِس لیے اِس سر الاسرار کا فاش کرنا فرض ہوا۔ شاید سیدھے راستہ سے نہ بھٹکیں اور گمراہی سے بچ جائیں +

تاہم جو راز اِن اوراقوں کے حوالہ کئے گئے ہیں اوپر ایک باریک نقاب پڑا ہوا ہے۔ عاشقان جانباز نہایت آسانی سے اِس کو ہٹا کر شاہد مراد کا نورانی چہرہ دیکھہ سکتے ہیں۔ مگر بوالہوس جسقدر حسنِ مستور کے دیکھنے کی ہوس کریں گے اوسیقدر یہہ نقاب موٹا اور گہرا ہو کر مانع دید ہوگا +

اب یہ نیاز مند ناظرین سے سمع خراشی کی معافی چاہتا ہے اور امید کرتا ہے کہ اِن نازک اور باریک باتوں کو ایسی بے تکلفی اور آزادی سے بیان کردینے پر ملامت نکرینگے۔ حضرات یقین جانئے کہ اگر خاکسار خود اوس مقام عالی تک جو نظر انسانی کی رسائی سے باہر ہے نہ پہنچ گیا ہوتا۔ اور جو کچھہ لکھا ہے آنکھوں سے نہ دیکھہ لیا ہوتا۔ تو ہرگز ایسی جرأت نکرتا۔ نفع عام کی غرض سے جہانتک ممکن تھا کوشش کیگئی ہے کہ قصہ عام فہم ہو جائے۔ خدا سے دعا ہے کہ لغزشوں کو معاف فرمائے اور ہم سب کو یقینی اور سچے علم کی توفیق عطا کرے آمین

اے برادرِ عزیز تجھے مژدہ ہو کہ تیری ترقی و فلاح کا حکم پیشگاہ قضا سے جاری ہو چکا ہے۔ کارساز تجھپر اپنا فضل و کرم فرمائے۔ وَ آخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

مترجمہ۔ فدا علیخان۔ ایم اے

حکیم طالیس

طالیس ملسطی پنتیسویں اولمپیاد کے سال اوّل یعنی قریب سنہ ۶۴۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اور بانوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔

یہ حکیم قورموس بن ادجنور باشندہ بلاد صور واقع ملک شام کی اولاد میں سے تھا۔ اس کا خاندان اپنے ملک کے بادشاہوں کے جور و ظلم سے تنگ آکر شام سے ملیطہ میں منتقل ہو آیا۔ کیوں کہ اون کے ظلم و تعدی سے نہ صلحا محفوظ رہتے تھے۔ نہ حکما۔ یہیں آکر یہ حکیم سنہ مذکورہ بالا میں پیدا ہوا +

یہ پہلا شخص ہے کہ جو لقب حکیم کا مستحق ہوا۔ بلکہ اون دنوں فلسفہ یونانی کا سب سے بڑا مصنف یہی حکیم ہوا ہے +

پہلے مدتوں منصب قضا و حکم پر سرفراز رہا۔ اور بوجہ احسن اصول مصلحت کے بموجب حکومت کی لیکن اسرار کائنات کے شوق علم نے اوسکو اس خدمت کے چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اور مصر چلا گیا۔ جو اوس زمانہ میں دار العلوم بنا ہوا تھا۔ ایک مدت وہاں رہکر وہاں کے مقتدایان مذہبی سے اون کے علوم دین سیکھے اور اوس کے بعد تمام علوم اور بالخصوص علم مدرسہ۔ و ہیئت۔ حاصل کیا۔ اس کے ذوق علمی نے ایک ہی علم پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ جب تک مصر میں رہا۔ تمام علما کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔ اپنے وفور عقل و تدبیر سے فلسفہ کے کہنات

معلوم کیے۔ اکثر فکر و غور کرتا۔ اور بہت کم بولتا۔ اپنی ذات خاص کی بہت کم پروا کرتا۔ بلکہ ہمیشہ عوام الناس کی اصلاح و تدبیر میں غرق رہتا چند مولفین نے لکھا ہے کہ بقول بعض حکمار کے انتقام لینے میں اوسکو تمام دنیاوی لذتوں سے زیادہ مزہ آتا تھا۔ لیکن اگر طالیس کی تعلیمات واقوال کو دیکھا جائے تو یہہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

طالیس مصر سے ملیطہ میں واپس آکر گوشہ نشین رہا۔ اور علوم علویہ و سماویہ یعنی نجوم و ہئیت وغیرہ کے سوا اپنا کوئی شغل نہ رکھا۔ محبت خلوت و حکمت نے اوسکو ایسا تنہائی پسند بنایا کہ تیئیس ۲۳ برس کی عمر تک شادی نہیں کی۔ جب اوسکی والدہ اقلوبولین نے شادی کرنے کے لیے کہا تو اوس نے جواب دیا کہ بچپن میں آدمی شادی کے قابل نہیں ہوتا اور بوڑھاپے میں شادی کے قابل نہیں رہتا۔ اِس کے درمیانی زمانے میں شادی کرنا مناسب نہیں۔ بعض کا قول ہے کہ آخر عمر میں اوس نے ایک مصری عورت سے شادی کی تہی جو خود صاحبۂ علم و معارف و تصانیف تھی۔

ملیطہ میں یہ دستور تھا کہ لوگ جزیرۂ قو (جو آج کل اسٹنکوئی کہلاتا ہی) میں چلے جاتے۔ شکاریوں سے اِس وعدہ پر جال ڈلواتے کہ اسمیں جو کچھہ نکلے اوسکو ہم اِس قدر قیمت پر خرید لیں گے۔ چنانچہ اسی طرح ایک شخص نے ماہی گیر سے جال ڈلوایا۔ تو اوس میں ایک کرسی کسیر کی پھنسی جس کے تین پائے تہے۔ کہتے ہیں کہ یہہ کرسی ہیانہ نام یونان شہر نرواہ سے لائی تھی۔ اور کسی کاہن کے کہنے پر اسکو دریا میں ڈلوا دیا تھا۔ غرض اِس کرسی کے متعلق آپس میں جھگڑا ہوا۔

یونان کے بعض لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ شدہ شدہ یہ فساد تمام ملک یونان میں پھیل گیا۔ قریب تھا کہ تلواریں نکل آئیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ اس معاملہ کو کسی کاہن کے الہام کے موافق طے کیا جائے۔ چنانچہ دلفیس کا کاہن بلاکر حکم سنایا گیا۔ اوس نے یہہ فیصلہ کیا کہ یہ کرسی کسی سب سے بڑے حکیم کے پاس بھیجدی جائے۔ چنانچہ اِس فیصلہ کے موافق یہہ طالیس کے پاس بھیجدی گئی۔ لیکن اس نے اُسے قبول نہیں کیا اور حکیم بیاس کے پاس بھیجدی۔ اور اوس نے کسی دوسرے حکیم کے پاس غرضکہ رفتہ رفتہ حکیم سولون کے پاس پہونچی۔ اوس نے دلفیس کا کاہن کے پاس بھیجدی۔ اس کاہن نے اوسکو بُت آفتاب کی نذر کر دیا

ملیطہ کے بعض لوگوں نے طالیس پر یہہ اعتراض کیا کہ اوس کو علم نے کوئی فائدہ نہیں پہونچایا۔ کیونکہ فقر و مسکنت سے اوسکو اب تک رہائی نہیں ہوئی۔ طالیس نے کہا کہ جن کو عقل ہوتی ہے وہ مال جمع نہیں کرتے۔ بلکہ متمولوں کو نظر حقارت سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر توجہ اکتساب علوم و معارف میں خرچ کر دیتے ہیں کہ جس سے کوئی نقصان پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اِس طعن کا طالیس کے دل پر اثر رہا۔ اتفاق سے اوسکو علوم نجوم کے ذریعہ سے معلوم ہوا۔ کہ سال آئندہ میں قحط پڑنے والا ہے۔ چنانچہ اوس نے ملیطہ کے تمام زیتون خرید کرلیے اور بہت بڑا نفع اوٹھایا۔ لیکن چونکہ طالیس کو طمع چھو نہیں گئی تھی اس نے اپنا تمام نفع ملیطہ کے سوداگروں پر تقسیم کر دیا۔

طالیس تین باتوں پر بہت ہی خدا کا شکر کیا کرتا تھا۔ اول یہ مجھے عاقل بنایا نہ کہ جانور۔ دویم یہ کہ مرد بنایا نہ کہ عورت۔ سویم یہ کہ مجھے

یونان میں پیدا کیا نہ کسی جنگل بیابان میں۔

حکیم طالیس کے نزدیک دنیا کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہر زمانہ میں دنیا اسی حالت میں تہی جیسی کہ اب ہے۔ سب سے پہلے حکیم طالیس نے ہی روح کو غیر فانی اور ازلی و ابدی بتلایا۔ ایک شخص نے آکر اوس سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے بعض بہید خدا تعالی پر بھی ظاہر نہوں۔ طالیس نے جواب دیا کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ کیونکہ کوئی بہید خدا علیم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

طالیس کا قول ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی چیزوں میں مکان ہے کہ کیونکہ اوسمیں تمام موجودات مشتمل ہے۔ حاجت سب سے قوی تریں چیز ہی کیونکہ انسان تمام باتوں سے قطع نظر کرکے اوسی کے پیچھے پڑجاتا ہی۔ اور تا وقتیکہ وہ پوری نہو جائے تمام مشقتیں اوٹھا لیتا ہے۔ تمام چیزوں میں سریع تریں عقل ہے کہ آدمی کو پلک مارنے میں تمام موجودات کی سیر کرا دیتی ہے۔ زمانہ سب سے بڑا حاکم ہے کہ تمام پوشیدہ امور کو ظاہر کرا دیتا ہے۔ لیکن ان سب سے بڑا اور لطیف تریں انسان کا عمل ہے کہ جو عقل کے موافق ہو۔

طالیس اکثر کہا کرتا تھا کہ بہت بولنا عقلاء کی شان کے خلاف ہے دوستوں کو اون کے سامنے یا پیچھے نیکی کے ساتھہ یاد کرو۔ انسان کو چاہیے کہ والدین کے ساتھہ نیکی سے پیش آئے اور اُن کی مدد کرے کہ بوڑہاپے میں اوس کے ساتھہ بھی وہی سلوک ہو۔ اور اوسکی اولاد ضعف قوا کے وقت جو سخت تریں وقت ہوتا ہے اور بھی اوسکی کمر نہ توڑے مصیبت کے وقت یہ خیال آدمی کو بہت ہی تقویت دیتا ہے کہ جس نے

ہمارے ساتھہ بُرائی کی ہے وہ ہم سے زیادہ شقی اور بدحال ہے کسی کا کوئی فعل اگر قابل ملامت دیکھو تو خود اوس کے مرتکب نہ ہو۔ سعادت حقیقی یہ ہے کہ آدمی عافیت سے فایدہ اٹھائے اوس کے پاس بقدر کفاف رزق موجود ہو اور اپنی عمر جہالت اور نامردی میں نہ ضائع کرے۔

طالیس کا قول ہے کہ انسان پر سخت ترین مصیبت یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کی حقیقت پر مطلع ہو۔ چنانچہ یہ حکمت عظیمہ اوس نے سونے کے پتروں پر کھدوا کر ہیکل آفتاب میں لٹکوادی تھی۔ کہ "اے عالم تو اپنے نفس کی حقیقت بھی جانتا ہے یا نہیں ؟"

طالیس کا خیال تھا کہ موت وحیات دونوں برابر ہیں کسی نے پوچھا کہ جب موت وحیات دونوں برابر ہیں تو پھر تم خودکشی ہی کیوں نہیں کرلیتے۔ طالیس نے جواب دیا کہ چونکہ دونوں صورتیں برابر ہیں اس لیے مجھے اسکی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ حیات کو موت پر سے قربان کردوں ؏

طالیس اکثر اوقات اشعار کہکر دل بہلایا کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ صنف شعر میں مسدس اُسیکی اختراع ہے۔

ایک بدچلن آدمی نے اوس سے آکر پوچھا کہ اگر کوئی شخص قسم کھا کر کوئی بات کہے تو اوسکو تسلیم کرلینا چاہیئے یا نہیں۔ طالیس نے جواب دیا کہ قسم کھانے کا گناہ زنا کے گناہ سے کہیں کم ہے۔

طالیس کا شاگرد رشید مندرینی البرینی اوس سے ملنے آیا۔ اور کہا کہ میں کیا تدبیر کروں کہ آپکے علوم و معارف سکھلانے اور نیکیاں کرنے کا معاوضہ ہو سکے۔ طالیس نے کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا فعل کیا جائے

الٰہی تو خوب جانتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے بلا اس خیال کے کیا ہے کہ اوس کا کسی سے معاوضہ لوں میرے نزدیک تیرا شکر یہی یوں ادا ہوتا ہے کہ جو کچھ مجھے آتا ہے میں دوسروں کو سکھلاؤں۔

یونانیوں میں سب سے پہلے وہی شخص تھا کہ جس نے علم طبیعی و ہیئت میں مہارت پیدا کی۔ اوس کا قول تھا کہ ہر چیز کی اصل پانی ہے۔ چنانچہ پانی نے جم کر زمین بنا دی۔ اور پانی ہی کے بخارات نے اوٹھکر ہوا پیدا کر دی۔ نیز یہ کہ تمام چیزیں ایک حال سے دوسرے حال میں بدلتی رہتی ہیں۔ اور بالآخر پانی ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں قوت احساس ہے۔ اور اون میں ایسی چیزیں ہیں جن تک رسائی نہیں ہوتی۔ ہر چیز متحرک ہے اور اوس میں روح موجود ہے نیز یہ کہ زمین اپنے مرکز اصلی پر حرکت کرتی ہے۔ یہ مرکز دریاؤں کے پانی پر قایم ہے۔ اسی لیئے اوسکو یہ اضطراب ہوتا ہے جو اوسکی حرکت کا باعث ہے نیز یہ کہ دنیا کی چیزوں سے جو عجیب و غریب باتیں صادر ہوتی ہیں۔ اور کہربا اور مقناطیس میں جو قوت متجاذبہ ہے یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس میں روح احساس نہ ہو۔

اوس کا قول تھا کہ دریا نیل کی طغیانی کا باعث وہ ہوائیں ہیں جو ہر سال اوقات معلومہ میں شمال سے جنوب کی طرف چلتی ہیں۔ یہی ہوائیں پانی میں جوش پیدا کرتی ہیں کہ تمام زمین سیراب کرا دیتی ہیں

حکیم طالیس ہی سب سے پہلا شخص تھا کہ جس نے چاند اور سورج گرہن کو قبل از وقوع بتلایا۔ اور ان دونوں سیاروں کی حرکت دیکھنے کی

کوشش کی۔ اوس کا قول ہے کہ آفتاب از خود روشن ہے اوس کا جرم چاند کے جسم سے بقدر ۱۲۰ درجہ کے زیادہ ہے۔ ماہتاب کا جسم غلیظ بے نور ہے۔ اور اوسکی سطح پر صرف ایک ہی سمت میں آفتاب کی شعاعیں پڑسکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماہتاب ایک ماہ میں چار صورتوں میں نظر آتا ہے یعنے ہلال۔ بدر۔ آخر نصف۔ اور محاق۔

سب سے پہلے اسی حکیم نے ہوا۔ آندھی۔ بجلی گرنے چمکنے۔ اور گرجنے کی تحقیقات کی اور ان کے اسباب معلوم کیئے۔ اوس سے پہلے کسیکو قلعوں۔ میناروں۔ وغیرہ کی بلندی سایہ کے ذریعہ سے ناپنی نہ آتی تھی ایک سال کے تین سو پینسٹھ دن اور ایک مہینہ کے تیس دن اسی کے مقرر کیئے ہوئے ہیں اسی نے فصلوں کے حدود قایم کی ہیں اسی نے ہر بارہ برس کے بعد سال میں پانچ دن لوند کے بڑھائے۔ یہ قاعدہ اسنے مصر کے علمار سے سیکھا تھا۔ اوسی نے بنات النعش کی حرکت و مقام کو معلوم کیا۔ کہ جسکی مدد سے مملکت صوریا کے ملاح اپنے جہاز اور کشتیاں چلاتے تھے۔

ایک روز طالیس رصد خانہ جارہا تھا کہ ایک گہرے گڑھے میں گرگیا۔ اتفاق سے اوس کے گھر کی ایک بوڑہی خدمتگار اودہر سے گزری اور اوسکو نکالکر کہنے لگی کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ اون باتونکی خبر دیتے ہیں کہ جو آسمان پر واقع ہونے والی ہیں۔ مگر تعجب ہے کہ آپکو اتنی خبر نہیں ہوتی۔ کہ آپکے پیروں کے نیچے گڑھا ہے یا کھائی۔

طالیس نے اپنی عمر نہایت عزت و جاہ سے گزاری۔ ہمیشہ مہمات امور میں مشورہ دیتا رہا۔ حتے کہ جب اکریوسس نے بلاد عجم پر لشکر کشی کی تو

اوسی کو بہت بڑی فوج کا سر لشکر بنایا تھا۔ چنانچہ یہہ اپنی فوج لے کر نہر ہالیس پر پہونچا۔ جو نہایت عمیق تھی۔ اور اسپر نہ پل تھا نہ کشتیاں۔ کہ جس سے لشکر پار اوتارا جا سکے۔ طالیس نے یہہ حکمت کی کہ ایک گہری خندق بشکل ہلال کھدواکر نہر کا پانی اوس میں کاٹ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نہر پایاب ہوگئی۔ اور تمام فوج نہایت آسانی سے عبور کر گئی۔

طالیس نے اپنے وطن کے معاملات میں بڑی کوشش کی اور آخر وقت میں اکریوس اہل ملیطہ سے کچہ معاہدے کرنا چاہتا تھا۔ مگر رعایا نہ مانتی تہی۔ یہی قصہ بالآخر اوس کے وطن کی خلاصی کا باعث ہوا۔ یعنی قیروس نے حملہ کیا۔ اور ملیطہ کو فتح کرکے وہاں کے باشندوں سے بعزت و احترام پیش آیا۔ اِس بادشاہ سے لوگوں نے معاہدہ کرلیا۔

طالیس اس واقعہ کے وقت بہت ہی بوڑہا تھا۔ لڑائی کی سیر دیکھنے کے لیئے اوس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے ایک اونچے ٹیلے پر چڑہا دو۔ تاکہ یہاں سے میں باطمینان جنگ کی سیر کرسکوں۔ چونکہ گرمی سخت تہی۔ اوسکو پیاس لگی۔ اور اِس شدت تشنگی میں تنہا جان دیدی۔

یہ واقعہ ۵۸ اولمپیاد میں ہوا۔ طالیس نے بانوے برس کی عمر پائی۔ اہل ملیطہ نے اوس کا بڑا جنازہ تیار کیا۔ اور نہایت عزت و احترام سے دفن کر دیا۔

محمد خلیل الرحمن

انقلاب

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

(۳)

زبیدہ

بے نیازی تری عادت ہی سہی ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

اے نیلے نیلے آسمان کے تخت پر اپنی زرنگار شعاعیں پھیلانے والے آفتاب! کیا تیری دبے پاؤں آنیوالی کرنیں، اپنے ساتھ کوئی چلتا ہوا تعویذ لاتی ہیں کہ جہاں کسی پر پڑیں اور پسینے کو کھینچ لیا، اُس کے بدن پر اثر کیا۔ اور وہ گرمی سے گھبرانے لگا؟ اور اے آہستہ آہستہ چلنے والی نسیم سحری! کیا تیرے خوشبودار جھونکے، اپنے ساتھ سحرِ بنگالہ لئے پھرتے ہیں، کہ جہاں محسوس ہوئی اور طبیعت بے چین ہوئی، دماغ کو فرحت ہوئی اور دل کو تسکین؟ مگر نہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، کس طرح آفتاب کے آگے پیچھے دوڑتے پھرتے ایک نہ ایک وقت اُسے اپنی آغوش میں لے ہی لیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں تو، آپ نے کوئیں کے من پر مشاہدہ کیا ہوگا کہ نرم اور پتلی رسی رگڑتے رگڑتے ایک زمانہ میں اُس کے پتھر جیسے دل پر اپنا نقش بٹھا ہی دیتی ہے آفتاب کی شعاعیں ہوں یا نسیم سحری کی اٹکھیلیاں، بادلوں کی چھیڑ چھاڑ ہو یا رسی کی رگڑ، ہر چیز یہ بتاتی ہے کہ استقلال اور خاموشی کے ساتھ کیے جانے والے کام کا اثر ہے، اور ضرور ہے، دنیا کی نیرنگیاں ہر ہر قدم پر

اپنی روش سے کبھی نہ کسی نتیجہ یا سبق کا نقش صفحۂ روزگار پر بناتی رہتی ہیں
مگر افسوس کہ بے پروائی اور غفلت کی ہوا، اُنکا اثر ہمارے دل سے بالکل اُڑا
دیتی ہے وہاں! دیکھنے والے دیکھتے ہیں، اور سمجھنے والے سمجھتے ہیں۔ ناچیز
چیونٹی کی لگاتار محنت، شہد کی مکھیوں کی جفاکشی، ہوا کا اثر، پانی کی کاٹ
بجلی کی کشش، اسٹیم کی طاقت، تلوار کی برش، ہر ہر سکینڈ ہیں بتاتی ہیں کہ
محنت اور صبر کا اثر کچھ عجیب ہے۔ چڑھ کر بولنے والا جادو ہے۔ انسان کیسا ہی
تندخو بدمزاج ہو۔ مگر اطاعت و خدمت ایک ایسی چیز ہے جو کسی نہ کسی دن ہمیشہ
کے لیئے اس کا ... لیتی ہے، اور وہ، روئی پر پڑنیوالی تلوار کی طرح
اپنی بدخوئی سے ہاتھ دہوتا ہے، اور بالکل دہو بیٹھتا ہے۔ دیکھئے نا! ستم دیدہ
نہیں نہیں بلکہ خوش نصیب زبیدہ نے کیا کچھ کر لیا۔؟ اس کی مسکینی کیا رنگ
لائی؟ اُس کی کم سخنی نے اُس کا وقار کس درجہ قایم کر دیا۔؟ اس کی محبت
اور اطاعت نے۔ اُس اطاعت نے جسکا اثر بے پرواہ باپ اور ناخدا ترس
سوتیلی ماں پر کچھ نہوا تھا۔ لایق اور سمجھدار ساس سسر کو کیسا اپنا دردمند
بنا لیا۔؟ اور اُس کی شیریں کلامی اور دلجوئی نے کیونکر نند تک کو اپنا
گرویدہ کر لیا؟۔ البتہ رشید، بدمزاج اور ناقدرشناس رشید، کے دل پر
ابھی کوئی کارگر نقش نہیں بٹھایا۔ تاہم زبیدہ۔ لایق اور عقلمند زبیدہ
اپنی اطاعت و شیریں کلامی کا جال، صبر و استقلال کیساتھ برابر بچھائی
ہوئے ہے۔ اور قاضی صاحب کے گھر میں وہ بہو نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ
قاضی صاحب تک فخریہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک ایسی لایق بیٹی دی
ہے جو بجائے کسی دوسرے کے گھر کا چراغ بننے کے ہمیشہ انہی کی
دہلیز پر تیر کرنیوالی ہے۔

رنج و راحت، غم و شادمانی، بیماری و تندرستی، زندگی کے ناہموار راستہ پر سفر کرنیوالوں کی مختلف منزلیں ہیں جو اثنائے راہ میں وقتاً فوقتاً ملتی ہیں اور ضرور ملتی ہیں۔ زبیدہ بھی پندرہ دن سے بیمار ہے۔ پہلے تو بخار روزانہ آتا تھا۔ مگر اب باری سے آتا ہے۔ یونانی علاج ناموافق سمجھکر ڈاکٹری شروع کیا ہے، مگر بارے کسی طرح نہیں ٹلتی۔ دو ہی ہفتوں میں گلاب سا چہرہ کمہلا گیا۔ بخار کی شدت، ہاضمہ میں فرق، کمزوری و نقاہت، پیاس کی زیادتی، بھوک ندارد، دیکھتے ہی دیکھتے گول گول ڈیل ڈول ڈھانچ رہ گیا۔ بھرے بھرے ہاتھ پانوں کھپچی بن گئے ہر وقت اعضا شکنی، ہر دم سر میں درد، طاقت نے جواب دیدیا۔ دو قدم چلی اور تھک گئی، اٹھی اور دو گھڑی لیٹی اور ہاتھ پانوں گر گئے! مگر زبیدہ سُنتی۔ اور جفاکش زبیدہ۔ پھر بھی نہ مانتی، تکلیف کو برداشت کرتی، دل کو بہلاتی، طبیعت کو سنبھالتی، اور جب نام چار کو بھی طاقت دیکھتی، فوراً ہمت باندھ اٹھ بیٹھتی، اور کسی نہ کسی کام میں ساس کا ہاتھ بٹانے لگتی۔ سسر ہیں کہ منع کرتے ہیں، ساس ہیں کہ خوشامد کرتی ہیں، مگر زبیدہ کہاں سنتی ہے، اور کچھ نہ ہوا تو میاں رشید کی قمیصیں ہی سینے بیٹھ گئی۔

لاڈ اور ناجائز محبت کو تربیت کے ساتھ وہی نسبت ہے جو آگ کو پھونس سے یا طوفان کو کشتی سے۔ ماں باپ کبھی یہ نہیں چاہتے کہ اُن کی اولاد خدانخواستہ بداطوار ہو، مگر اُن کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت جسے ناجائز ہی کہنا مناسب ہوگا۔ اولاد کی عادات اُس زمانہ سے بگاڑنی شروع کرتی ہے جبکہ نا سمجھ والدین اُس کی بُری سے بُری حرکت کو بھی بچپن کی نادانی سمجھ کر ٹال دیتے ہیں اور کچھ خیال نہیں کرتے۔ بزرگوں کا قول کہ "پانچ برس کی عادت پچاس برس تک نہیں جاتی"، صحیح اور نہایت صحیح ہے۔ اس زمانہ کا نامی گرامی فلاسفر

ہربرٹ اسپنسر بھی اپنی تصنیف "ایجوکیشن" میں لکھتا ہے، اور زور کے ساتھہ لکھتا ہے" کہ بچوں کی تربیت کا زمانہ یا ۵ سال کی عمر تک ہے...... بلکہ میرے خیال میں کوئی اچھی عادت جس کا اِس عمر تک مطلق نہ خیال کیا گیا ہو، بقیہ زندگی میں پیدا ہونی تقریباً ناممکن ہے"، رشید قاضی صاحب کے اکلوتے صاحبزادے تھے، جسقدر محبّت ہوتی کم تھی۔ قاضی صاحب اور اُن کی بیوی نے اِنھیں پالا، اور بڑی منّتوں مُرادوں سے پالا جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ لاڈلے رشید انٹرنس ہی پر اکتفا کر بیٹھے، اور کبھی ڈگری لینے کا خیال پیدا نہوا۔ تعلیم کا سلسلہ چھوٹا۔ طبیعت اُچاٹ ہوئی۔ کتب بینی بھی چھوڑ دی، اور سوائے فضولیات اور بیکاری کے بیہودہ مشاغل کے اور کوئی کام نہ رہا۔ جوانی کے دن، بیکاری اور آزادی، بُری صحبت اور شرمناک دلچسپیاں، پچاس روپے ماہوار جیب خرچ اور یار باشی، جو شوق لگا دن دُونا رات چوگنا ہی ہوتا گیا۔ ادھر شادی میں دیر تجرد کی زندگی، اُدھر روپیہ موجود صلاح کار بھی پاک ہی تھے۔ میاں رشید ایسے پیٹ بھر کر بگڑے کہ الاماں والحفیظ! میلوں کی سیر! باغوں کی چہل قدمی! کوٹھوں کی تاک جھانک، بھٹیڑوں کی حاضرباشی! لال پری کا شغل، اور چوری چُھپے عیاشی! کونسی جگہ تھی۔ جہاں وہ نہ گئے؟ اور کونسی حرکت تھی جو اُنھوں نے نہ کی؟ شادی ہوئی تو کچھہ دنوں بڑے چاؤ چونچلے رہے پھر رفتہ رفتہ سب کچھہ ندارد، اب تو میاں رشید پوچھتے بھی نہیں کہ زبیدہ مرتی ہے یا جیتی وہی پُرانی حرکتیں ہیں اور یہ ہیں صبح کے نکلے شام کو بھی گھسے تو بہت جلد آئے۔

آج غریب زبیدہ کی باری کا دن تھا۔ جاڑا دے کر چڑھتا تھا کپ کپی ٹھہر ٹھہر کر چھوٹتی تھی، ہڈی ہڈی، جوڑ جوڑ میں درد، بخار میں پھلا رہی تھی،

ساس سسر نند، سب کے سب جمع تھے، اور لحاف پر لحاف ڈالکر زبیدہ کو دبائے بیٹھے تھے، نوکر چاکر پریشان، اور گھبرائے گھبرائے پھرتے تھے مگر رشید، کا پتہ بھی نہ تھا۔ صبح سے دن ڈھلے تک، اُن کی غیر محدود دلچسپیاں، نہ ختم ہونی تھیں نہ ہوئیں چراغوں جلے، گھر میں گھسے تو عجب شان سے! آنکھیں سُرخ، سر جھاڑ منہ پہاڑ، گریبان چاک، بٹن کھُلے۔ ننگے سر، ٹوپی ہاتھ میں، جھٹکے کھاتے، لڑکھڑاتے، سیدھے اپنے کمرے میں جا، پلنگ پر گر پڑے؛ اور گرے تو ایسے گرے کہ تن بدن کا ہوش نہیں، ہاتھ پیر کی خبر نہیں، اچکن بھی نہ اُتاری! بوٹ بھی نہ کھولا! پہنے ہی پہنے ڈھیر ہو گئے۔

زبیدہ، بیمار اور قابل رحم زبیدہ، دن بھر تکلیف اُٹھاتی اُٹھاتی گھنٹہ دو گھنٹے سے غافل ہو گئی تھی، میاں رشید کے آنے کی سنتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ اور بخار میں جلتی، بھاپیں نکلتی، دیوار کے سہارے سہارے، ڈگمگاتی، ہچکولے کھاتی، کمرے میں پونہچی، اور پٹی کے نیچے دونوں ہاتھوں سے گرے جانے والے سر کو پکڑکر بیٹھ گئی۔ لایق رشید، غریب زبیدہ کو دیکھتے ہی بولے تو یہ بولے "بہت جلدی ائیں! آئے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے، مگر بیگم صاحبہ کا مزاج ہی ٹھیک نہیں ہوتا۔ پندرہاں دن ہونے آئے کمبخت نخرے ہی نہیں جاتے، ہر وقت ہائے ہائے! گھر کو ہسپتال بنا رکھا ہے!"

زبیدہ نے سوائے خاموشی کی کچھ جواب نہ دیا۔ اپنے ہاتھوں کو سر پر سے ہٹا لیا طبیعت کو سنبھالا، گرے جانے والے سر کو روکا، اور نہایت نرمی کے ساتھ پوچھنے لگی "تمھاری طبیعت کس طرح ہے؟ آج تو کچھ چہرہ بہت اُداس ہو رہا ہے"

رشید: "اداس ہو رہا ہے تو تمھاری بلا سے، اور جان پر بن رہی ہے تو تمھاری بیزار سے، تم تو اپنے بخار کو منائے پڑی رہو"

زبیدہ۔ جس وقت تم آئے ہو اسی وقت تو آگئی، ہاں اکیلی بیکار تھی ذرا لیٹ گئی تھی، اگر تم ناراض ہوتے ہو تو اب تمھارے پیچھے بھی نہیں لیٹا کرونگی تم بتاؤ تو سہی کہ مزاج کس طرح ہے۔؟"

رشید: "ہے کس طرح؟ تمھارے منہ پر آنکھیں ہوتیں تو تم دیکھ لیتیں۔ کہ میں نے بوٹ بھی نہیں اتارا۔ سر ہے کہ پھٹا جاتا ہے! اٹھا تک نہیں جاتا۔ مگر تم تو اپنی طرح ہر ایک کی حالت کو سمجھ لیتی ہو جیسے خود جھوٹ بنتی ہو ایسا ہی سمجھتی ہو"

زبیدہ۔ (بوٹ کھولتے ہوئے) "میں ابھی سر بائے دیتی ہوں، تم لیٹے رہو میں خود ہی بوٹ بھی اتار لونگی"

زبیدہ۔ فرشتہ صفت، نیک خصلت، پاک طینت، زبیدہ۔ جسے اسوقت بھی خدا جھوٹ نہ بلائے تو ۱۰۲ ڈگری کا بخار ہے، اور جس نے کھانے کے نام صبح سے قسم بھی نہیں کھائی ہے، نہایت استقلال کے ساتھ بوٹ اور جرابیں اتار کر وحشی رشید کا سر دبانے لگی۔ پاؤ گھنٹے کے بعد، میاں رشید تیوری پر بل ڈالکر بولے "رہنے دو، میرا سر نہ دباؤ! تمھارے ہاتھ تو دوزخ کا کندہ بن رہے ہیں، آرام آنے کے بدلے میرا سارا سر جل اٹھا"

زبیدہ۔ (نہایت منت و سماجت کے لہجے میں) اچھا تو میں اپنا ہاتھ ٹھنڈے پانی سے بھگو لوں۔؟

رشید: "جی نہیں معاف کیجئے! میرا پیچھا چھوڑیئے! بدتمیز کہیں کی!"

(باقی آیندہ)

جلال الدین اکبر

رسالہ زمانہ کے لائق اڈیٹر منشی دیا نرائن صاحب نگم بی-اے- ہمارے پرانے عنایت فرما ہیں۔ مخزن کے اولین مضمون نگاروں اور معاونوں میں ہیں جب سے انہوں نے زمانہ کی اڈیٹری کی ذمہ داری لی قدرتی طور پر اپنے رسالہ کی خدمت اُن کے لیے مقدم ہو گئی۔ تاہم حال میں انہوں نے یہ مضمون مخزن میں شائع ہونے کے لیے ہمیں عنایت کیا ہے۔ ہم اسے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں خصوصاً اس لیے کہ باوجود مصروفیت کے انہوں نے اپنے دیرینہ دوست مخزن کو فراموش نہیں کیا:-

شہنشاہانِ مغلیہ بلکہ سلاطینِ ماضیہ میں جلال الدین اکبر اُن چند اور چیدہ حکمرانوں میں گذرا ہے جن کی شہرت کا دامن قیامت کے دامن کے ساتھ وابستہ ہے۔ جنکا نام ہمیشہ نیکی اور منصفی۔ فراخدلی اور بے تعصبی۔ رعایا پروری اور ہمدردی کے لیے یادگار زمانہ رہیگا۔ جنکے نقش قدم پر چلنے سے موجودہ نسلیں اور آنیوالی قومیں اپنے اور دنیا کے لیے برکت اور مغفرت حاصل کر سکتی ہیں جن کی زندگی اور طرز عمل کو پیش نظر رکھ کے ہم لوگ ارتباط باہمی اور قومی زندگی کے مدارج طے کر کے ترقی کی شاہراہ پر قدم مار سکتے ہیں جنکے زندۂ جاوید خیال آجکل شورو شر اور حسد و نفاق کے زمانے اور زوال و پستی کی حالت میں ہماری رہنمائی کے لیے چراغ ہدایت کا کام دیتے ہیں۔ جن کی نیک مثال اس طوفانِ بے تمیزی میں قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کیلیے

ایک مینار ثابت ہوسکتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تین سو برس بعد بھی شہنشاہ اکبر کا نام ادب اور عزت۔ محبت اور تقدس کے ساتھہ لیا جاتا ہے اور اُس کے کارناموں کی یاد تازہ کرنا ملک کی بکھری ہوئی جمعیت کو اکٹھا کرنے کے لیئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ کارنامے زبانزد خاص و عام ہیں اور بجائے خود اکبر کی روشن ضمیری۔ دریا دلی۔ بلند حوصلگی۔ اور دور اندیشی کے بہترین نمونے ہیں۔ اور اُنھیں یاد کرکے اِس ترقی یافتہ دور میں بھی سب کو انکی تقلید کی ضرورت محسوس اور موجودہ حکمرانوں کو اُنپر کاربند دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ مگر مجھے اِن سب سے زیادہ دلچسپ۔ دلکش اور قابل قدر خود اکبر کی ذات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ انسانی صفات کا ایک بے نظیر مجموعہ اور کمالات دنیوی کا گنجینہ تھی۔ دنیا کی بیشمار خوبیاں اُس ذات واحد میں جمع ہوگئی تھیں اور بہ حیثیت مجموعی اکبر انسان کے بہترین طبقے میں شہ نشینی کا مستحق ہے۔ اور انھیں ذاتی خوبیوں کی بدولت اُسے یہ شہرت اور ہردلعزیزی حاصل ہوئی ہے۔ انھیں کی بدولت اُس کی حکومت کا سکّہ تمام رعایا کے دل پر بیٹھہ گیا۔ اور ابتک اُسکا اثر عام دلوں پر باقی ہے۔ انھیں کی بدولت اُس کے گرد اُس عہد کے تمام اہل کمال اور اہل ہنر جمع ہوگئے۔ اور اُسکے مقاصد کے ساتھہ ہمدردی پر ہمت اور استقلال کے ساتھہ آمادہ ہوگئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اُس کے بلند حوصلوں کی تکمیل اور اُس کے نیک ارادوں کی کامیابی کے لیے اپنے جان و مال۔ کوشش اور لیاقت کو صدق دل سے نثار کرنے لگے۔

دلوں کی تسخیر مشکل بات ہے۔ ایسی مشکل کہ سخت سے سخت مہم بھی اِس کے آگے کچھہ حقیقت نہیں رکھتی۔ اور اسی سے اُسے جج اکبر کا معزز خطاب دیا گیا

دنیا کی تمام فتوحات عارضی ہیں اور یہ دیرپا۔ اکبر کی یلغاروں۔کشورکشائیوں محاصروں اور اسکی شان وشوکت بلکہ عظیم الشان سلطنت کا آج نام نشان بھی باقی نہیں۔کہاں ہیں وہ ریاستیں جن کے مغرور سرداروں کو اس نے اپنی تلوار اور جان نثاروں کے بل پر ایک مرتبہ نیچا دکھا دیا تھا۔کہاں ہیں وہ صوبے جنھیں اس نے اپنے زیر حکومت اور زیر اقتدار کر لیا تھا۔اکبر پر کیا منحصر ہے؟ تمام شاہان سلف کی فتوحات کا کہیں نام ونشان تک باقی نہیں۔لیکن اکبر نے جسطرح اور جسقدر دلوں کو مسخر کر لیا تھا اس کے افسانے آج بھی ویسے ہی دلکش اور زندۂ جاوید ہیں اور عام دلوں پر اسوقت بھی اسکی حکومت اسیطرح قایم ہے۔

آخر وہ کیا بات تھی کہ برسوں کی کھوٹ دور ہوگئی۔باہمی رشک اور قومی عناد دلی نقص اور مذہبی تعصب سب یک لخت مٹ گئے۔اور ہندو می زند شمشیر اسلام کا معاند ہوگیا۔وہ اکبر کے جوہر ذاتی تھے جن اوصاف کا وہ مالک تھا وہ ایک ذات میں کم جمع ہوتے ہیں۔نیکی میں۔نیک نیتی میں۔دلاوری میں۔جوانمردی میں۔شان وشکوہ میں۔رعب وداب میں۔رحم وانصاف۔بے تعصبی اور فراخدلی۔فیاضی۔اور علم دوستی۔اور رعایا پروری میں اکبر کا پایہ بہت اعلیٰ ہے۔یوں تو۔دلی۔اور دماغی دونوں قسم کی قابلیتیں اسکی ذات میں موجود تھیں۔مگر دل کو دماغ پر فوقیت تھی۔دماغی قابلیتوں میں بیرونی مدد مل سکتی ہے۔لیکن دلی نقص کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔بچپن سے مرتے دم تک اکبر کی ایک ایک بات اس کے اہل دل اور اہل محبت ہونے کی شہادت دیتی ہے۔ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔کہتے ہیں کہ فتح کابل کے وقت اکبر کی عمر دو برس سوا دو مہینے کی تھی۔اور اسے اپنی ماں سے علیحدہ

ہوئے سال سوا سال کے قریب ہو گیا تھا۔ مگر جب بیگمات کی سواریاں محل میں پونہچیں اور اکبر سے ماں کے پاس جانے کو کہا گیا تو بھولے بھالے بچے نے پہلے کھڑے ہوکے ادہر اُدہر دیکھا اور پھر سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ برسوں کی بچھڑی ہوئی ماکے آنسو نکل پڑے۔ لوگ کچھہ ہی کیوں نہ کہیں مگر یہ چھوٹا سا واقعہ اکبر کی دلی محبت کی گواہی دیتا ہے۔

آگے چل کے اُس کے قلب کی کیفیت اور نمایاں ہوئی۔ شاہزادہ سلیم کی سرکشی اُسکی محبت پدری میں کوئی فرق نہ پیدا کرسکی۔ اُسکی سرتابی اور متواتر عدول حکمیوں کے باوجود اکبر شفقت اور ملائمت سے کام لیتا رہا۔

اکبر کو اسکی ہر بات کی خبر پہونچتی تھی۔ اُس کے عندیۂ بغاوت پر دربار میں ہل چل سی مچگئی۔ اُمرا بہت کچھہ کہتے تھے مگر خیر اندیش باپ نے محبت کو اپنا مشیر بنا رکھا تھا۔ برابر جاگیر پر جاگیر نامزد کرتا رہا۔ اور اُس کی تالیف قلب کے لیے کوئی ممکن تدبیر اُٹھا نہ رکھی۔ آخر میں جب بڑی کوششوں کے بعد سلیم آگرہ آیا اور مریم مکانی والدۂ اکبر کے محل میں اُترا تو اکبر خود چلا گیا۔ اور جیسے ہی بیگمات سلیم کو اکبر کے سامنے لائیں وہ بیٹے کو چھاتی سے لگا کر دیر تک روتا رہا۔ اور اپنی دستار اُس کے سر پر رکھدی۔ یہ باتیں تھیں جنہوں نے اکبر کا دامِ محبت دُور تک پھیلا رکھا تھا۔ بعض کوتاہ نظر ان باتوں کو رموز مملکت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اُنکی محرک مصلحت ملکی تھی۔ نہ کہ دلی محبت میں کہتا ہوں کہ ایک سلیم کو جانے دیجئے اکبر کے کوکہ کو لیجئے۔ کہ جب اُس کی شکایتیں بادشاہ تک پہونچیں تو اُسنے کہا کہ میرے اُس کے درمیان دودھ کا دریا بہتا ہے جسے میں عبور نہیں کرسکتا۔

یہاں پر ایک یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اِس محبت کا اظہار صرف

اسکی ذاتِ خاص تک محدود تھا۔ یعنی اِس جذبہ کا اثر اکبر نے محض ذات تک محدود رکھا تھا۔ اپنے خلاف عداوت یا بغاوت کے معاملوں میں اُسکا برتاؤ کہیں بر خلاف آئین محبت نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ طرح دیتا رہا۔ مگر جب کسی معاملے میں انصاف کا خون ہوتا تو اکبر اپنے دلی جذبات کو دبا کے اور طبیعت پر جبر کر کے انصاف ہی کو ترجیح دیتا تھا۔ اور بیجا پاسداری کو کبھی دخل نہیں دیتا تھا۔

اکبر اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی محبت اور صفا دلی سے پیش آتا تھا ہیموں کے خون سے اُسنے اپنا ہاتھ نہیں رنگا۔ ایک اور غنیم کو اُس نے اپنی چھاگل سے پانی پلایا تھا۔ اِن دو باتوں سے اُسکی دلی کیفیت اور محبت کی حقیقت آئینہ وار اور اُس کے برتاؤ کی سچائی بخوبی دلنشین ہوجاتی ہے۔ راجہ جے مل کہ اکبر کا جاں نثار اور مزاج شناس تھا کسی کار ضروری سے بنگالہ گیا تھا۔ اور راستے ہی میں انتقال کر گیا۔ اکبر نے یہ خبر سُن کے بہت افسوس کیا۔ جب محل میں آیا تو معلوم ہوا کہ اُسکا بیٹا اور چند راجپوت اُس کی رانی کو ستی ہونے پر مجبور کر رہے ہیں۔ بادشاہ کو راجوں کی جیسی کچھ خاطرداری دل سے منظور تھی وہ سب پر ظاہر ہے۔ ہندوؤں کی تالیف قلب کے لیے بادشاہ نے جس بلند نظری سے اُن کے رسوم اور آئین کو اختیار کر لیا تھا اُسکا حال بھی سب پر روشن ہے۔ مگر نہیں اُسکی محبت اندھی محبت نہ تھی۔ وہ اُسے حکمت عملی کے طور پر نہیں برتتا تھا۔ اور موقع پر کبھی نہیں چوکتا تھا۔ اسیواسطے یہاں پر صبر کی تاب نہ لاسکا۔ فوراً صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور محل واردات پر پہونچکر رانی کی جان بچائی۔ اور وہ بھی زبردستی نہیں بلکہ راجپوتوں کو قائل

کرکے اکبر کی تدبیریں ہمیشہ صلح وآشتی پر مبنی ہوتی تھیں۔ غصے کو وہ بہت کم راہ دیتا تھا اور اُسکی صدق دلی اُس کی کوششوں اور ارادوں کو کامیابی کا تاج پنہاتی تھی۔

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ دو جانباز راجپوت قدردانی کی امید پر حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے جھروکے سے ان لوگوں کا سلام لیا۔ اور فرمایا۔ ''کہ کیا چاہتے ہو اور کیا ہنر رکھتے ہو۔ جانباز راجپوتوں کے ہاتھ میں نیزے تھے۔ فوراً دونوں نے نیزے سیدھے کر لیئے اور ایک دوسرے پر اسطرح حملہ آور ہوئے کہ دونوں کی نوکِ سناں سینوں کے پار ہوگئی۔ اور وہیں جاں بحق ہوگئے۔ اکبر اِن جانبازی کو دیکھکر بیقرار اور بے قابو ہوگیا۔ چاہتا تھا کہ خود بھی اسیطرح جان دے۔ تلوار کو ایک دیوار میں گاڑ کے بار بار اُسپر اپنا سینہ ٹکراتا تھا۔ مگر ہوا خواہانِ دولت فوراً دوڑ پڑے اور بادشاہ کی کمر پکڑ لی۔ تاہم اسکا جوش بڑھتا گیا۔ لیکن ہوا خواہوں کی مستعدی اور ہمت کی داد دینا چاہیئے جنہوں نے اُس جوش کو اپنی حد تک نہیں پڑہنے دیا۔ گو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے مگر اُس سے قلب کی سچی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اکبر کا دل ایک صاف شفاف آئینہ تھا جسپر ہر چیز کا اثر پڑتا۔ اور اثر پذیر ہوتا تھا۔

اُس کی محبت اور بہادری وغیرہ کوئی بھی مصنوعی یا نمائشی نہ تھی۔ بلکہ سب میں سچائی کا رنگ جھلکتا تھا۔ وفاداروں کے ساتھ اُس کے محبت کے سلوک آگے چلکر بیان ہونگے۔ اکبر دشمنوں کے ساتھ بھی محبت اور فراخدلی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ تخت نشینی کے بعد ہی شاہ ابوالمعالی بغاوت کے جرم میں گرفتار ہوکے دربار میں لایا گیا۔ اور بیرم خاں نے اکبر سے اُسکے قتل کا اشارہ کیا۔ مگر اکبر نے منع کیا۔ اور بہ حیثیت بادشاہ یہ اسکا پہلا رحم تھا

مجروح ہیموں کو بھی گرفتار دیکھکر اکبر کو ایسا ہی ترس آیا تھا۔ یہ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ شیخ گدائی صدر الصدور دربار بولے کہ پہلا جہاد ہے۔ حضور دست مبارک سے تلوار ماریں کہ جہاد اکبر ہو" مگر نوجوان بادشاہ نے نہایت بلند حوصلگی سے جواب دیا کہ یہ تو آپ مرتا ہے اسکو کیا ماروں"

اکبر کی محبت ناطقہ انسان ہی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ اسکی ہمدردی بہت وسیع تھی۔ اسکی محبت کا دائرہ بتدریج بڑھتا گیا۔ اور آخر کار اسی وجہ سے اسکی طبیعت ترک حیوانات کیطرف مائل ہوئی۔ اور اس قسم کی دوسری باتیں بھی اسی کو دارصحیح کرتی ہیں۔ چنانچہ اکبر کی محبت عالمگیر تھی۔ اکبر کو بیجا تشدد۔ اور زیادتی کی برداشت نہو سکتی تھی۔ ہندوؤں کے تالیف قلب کی اس کے عہد میں اتفاق بڑی زبردست کوشش ہوئی۔ اور اسکا نتیجہ یہ ہوا جیسا کہ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ راجپوتوں نے بھی جاں نثاری کو حد سے گذار دیا۔ مگر اکبر کے دل سے اگر یہ ارتباط محض مصلحت ملکی تک محدود ہوتا تو ان کے یہاں کے قدیم اور مذموم رسموں کی اصلاح کیطرف اسکا خیال بھی نہ جاتا مگر نہیں۔ اکبر نے رسم ستی کے انسداد کی کوشش کے علاوہ صغرسنی کی شادی کے خلاف بھی حکم جاری کیا۔

اسی محبت کا ایک نتیجہ اکبر کی رعایا پروری ہے۔ ذاتی نفع کا خیال اس کے لیئے بہت معمولی بات تھی۔ حتے کہ جزیہ کی کثیر آمدنی کی مطلق پروانہ کی گئی۔ اکبر کو اپنی رعایا سے دلی انس تھا۔ وہ ہر وقت اسی کوشش میں رہتا تھا کہ رعایا کے حالات اور خیالات۔ ان کے مصائب اور مشکلات سے واقف ہو اور ان کی دادرسی کرے۔ اور اسمیں کوئی دقت بھی اسے دقت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ عدالتوں میں ہندو مسلمانوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی اہلیت معلوم ہوتے ہی اوسے

علمار کی مخالفت کی بالکل پروا نہوئی اور اُسنے اِس ضروری اصلاح کے متعلق ضروری احکام صادر کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔

اکبر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہے کہ باوجود بندۂ محبت ہونے کے اُسنے اپنے ذاتی جذبات کو کبھی انصاف اور عدالت گستری پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ اپنی دایہ اور اپنے کوکہ کے ساتھ اکبر کا جیسا برتاؤ تھا اُسکا ذکر اوپر آچکا ہے۔ مگر ایک بار اکبر کے ایک کوکہ نے رشک و حسد کی آگ سے مشتعل ہوکر وزیر اعظم کو عین دربار میں قتل کرڈالا۔ اور رعایت خسروانہ کے زعم میں درِ دولت پر جا کھڑا ہوا لیکن اکبر نے اُسے فوراً اپنی سزا کو پہونچایا۔

اکبر بڑا دلیر اور شجاع محنتی اور جفاکش۔ الوالعزم۔ اور بلند حوصلہ تھا۔ اکثر یلغاروں اور محاصروں میں وہ خود فوج کے ہمراہ ہوتا تھا۔ اور وہاں کارنمایاں کرتا تھا۔ اُسے ہمیشہ اپنی ذاتی مثال سے اپنے جان نثاروں اور ہواخواہوں کی دلداری اور حوصلہ افزائی مدنظر رہتی تھی۔ اکثر موقعوں پر بہت قلیل جمعیت کے ساتھ اُسنے محض اپنی ہمت، اور دلاوری اور مستعدی کی بدولت کثیر التعداد دشمنوں پر فتح حاصل کی۔ ایکبار دکن کی ایک مہم میں اکبر کے پاس صرف سنو سپاہی تھے۔ سامنے دریا تھا۔ اور دشمن کی تعداد بہت کثیر تھی یہ اکبر ہی کی ہمت تھی کہ فتح حاصل ہوئی۔

احمد آباد کی مہم میں پروفیسر آزاد لکھتے ہیں کہ وہ سفید بُراق گھوڑے پر سوار تھا۔ اور عام سپاہیوں کی طرح تلواریں مارتا پھرتا تھا۔ ایک موقع پر کسی دشمن نے اُس کے گھوڑے کے سر پر ایسی تلوار ماری کہ چراغ پا ہوگیا۔ اکبر نے بائیں ہاتھ سے اُسکے بال پکڑ کے سنبھالا۔ اور حریف کے ایسا برچھا مارا کہ زرہ توڑ کر پار ہوگیا۔ چاہتا تھا کہ پھر مارے مگر پھل ٹوٹ کر زخم میں رہگیا

اور بھگوڑا بھاگ نکلا۔ ایک نے آ کے ران پر تلوار کا وار کیا۔ ہاتھ اوچھا پڑا۔ تھا خالی گیا۔ اور بزدل گھوڑا نکل گیا۔ ایک نے آ کر نیزہ مارا جیتہ بڈگوجر نے برچھا پھینک کے اُسکا کام تمام کیا۔ غرض جہاں جاتا تھا اِسی قسم کی بہادریاں دکھاتا تھا۔

اور اسپر لطف یہ کہ بہادری اور سپہ گری کے آئین سے ایک قدم تجاوز نہیں کرتا تھا۔ اس کے دل کی نیکی نے اُسے دشمنوں کی زبردستی اور مجبوری سے کبھی بیجا فائدہ نہیں اُٹھانے دیا۔ مہم گجرات کے سر ہونے میں ذرا دیر لگی تھی کہ اکبر ایک روز علی الصباح صرف چند سپاہی ہمراہ لے کر چل دیا اور اِس دور و دراز فاصلے کو دن رات چل کے نو دن میں موقع جنگ پر پہونچ گیا۔ غنیم کو ۱۴ دن پیشتر کی خبر معلوم ہوئی تھی کہ اکبر دار السلطنت میں موجود ہے اُسے اُس کی موجودگی کا اعتبار نہ آتا تھا۔ اکبر چاہتا تو دھوکے سے فائدہ اُٹھا کر فوراً حملہ آور ہو سکتا تھا۔ مگر نہیں اُسنے باقاعدہ طور پر پہلے جنگی کرنا بجانیکا حکم دیا۔ غنیم اب بھی اُسے دھوکہ بازی سمجھے تھا۔ بالآخر جنگ ہوئی اور اقبال اکبری ہی فتحیاب ہؤا۔

اکبر کی بہادری فطرتی تھی۔ ۱۶ برس کی عمر تھی جب بغاوت سرکشی اور مخالفت کا چاروں طرف زور تھا۔ جب ہیموں نے دلّی و آگرہ پر قبضہ کر لیا تھا جب بڑے بڑے سورما سردار ہمت ہار بیٹھے تھے اور لشکر میں کھلبلی پڑ گئی تھی۔ جب ایک ایک کا منہ تک رہے تھے۔ اور کابل بھاگ چلنے کی رائے دے رہے تھے۔ اسوقت اگر ہمت نہ ٹوٹی تو بوڑھے خان خاناں اور نوعمر اکبر کی۔ خانخاناں نے دربار میں تمام اُمرا کو سمجھایا بجھایا۔ اور سب باتوں کے نشیب و فراز سمجھائے۔ اور کہا کہ جس ملک پر بزرگوں نے تلواریں مار کر اور ہزار طرح کی جان جوکھوں اُٹھا کر قبضہ پایا ہے اُسے مفت غنیم کے

حوالے کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ بھی غیرت دلائی کہ اگر جانیں لیکر نکل گئے تو منہ کس ملک میں دکھائیں گے۔ اور لوگ یہ نہ کہیں گے کہ بادشاہ تو بچہ تھا تم کہن سال سپاہیوں اور دیرینہ نمکخواروں کو کیا ہوا تھا۔ مار نہ سکتے تھے تو مر ہی گئے ہوتے۔

بلکہ جب اس مردانہ تقریر سے بھی گرمجوشی پیدا کرنے کے بجائے ایک خاموشی اور سکتے کا عالم طاری کر دیا۔ اور امرا سے دربار [illegible] چپ سادھے بیٹھے رہے تو اکبر نے کہا کہ [illegible] ہندوستان کے [illegible] اس دلیرانہ حملے نے [illegible] اور آخرکار فتحیاب ہوئے۔

اوپر کی مثال سے اکبر کی دماغی یکسوئی اور [illegible] کی کیفیت بھی واضح ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ بہادری کے متعلق اکبر میں کل ضروری اوصاف موجود تھے۔ اسکی فراخدلی کا حال بیان ہو چکا ہے مزاج میں عفو بہت تھا۔ مہم کشمیر کی ناکامیابی پر پہلے تو اپنے سرداروں سے ناراض رہا۔ مگر پھر جلد سبکو معاف کر دیا۔

مستعدی میں بہت کم لوگ اکبر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کام کے وقت کبھی اسے اپنے ذاتی آرام کا خیال نہوتا تھا۔ اکثر دفعتہً مہموں کی مدد پر چل دیتا تھا۔ اور دنوں کی راہ گھنٹوں میں طے کرتا تھا۔ ایک بار چوبیس گھنٹے برابر سفر کرتا رہا۔ اجمیر تک اکثر پیدل چلا جاتا تھا۔ بادشاہ ہوکر کون ایسی جفاکشی کا عادی ہے۔ وقت کو وہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ چتوڑ کے محاصرے میں یہ ایک پہاڑی سے جنگ کے حالات

دیکھہ رہا تھا۔ کہ راجپوتوں کا سردار فصیل قلعہ پر دکھائی دیا اسنے فوراً ہی اپنی بندوق سر کردی۔ اور وہ وہیں سسک کر رہ گیا۔

اکبر چشم بینا رکھتا تھا۔ دیکھہ بھال۔ غور و تامل اور معائنہ و مشاہدہ کی اُسمیں بہت عادت تھی۔ سیر و سفر کے زمانے میں اسکی نظر ہمیشہ گرد و پیش کے حالات پر رہتی تھی۔ جب اس نے اس وسیع سلطنت کے زیادہ تر حصے کو ویران پایا تو اسکی وجہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اور زمین کو ناکارہ یا رعایا کو کاہل اور کام چور قرار دیکر اپنی تسلی نہیں کی۔ فی زماننا حکام کی تمام قابلیت اس میں صرف ہوتی ہے کہ قحط اور طاعون وغیرہ کے لیے رعایا ہی کو متہم کریں مگر اکبر نے انتظام سلطنت پر غائر نظر ڈالکے اُسکی خامیاں دور کرنے کی فکر کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ عام ملک کی صوبہ بندی ہو کر نیک حاکم مقرر ہوئے اور مالگذاری میں بھی معقول تخفیف ہوئی۔

اکبر میں بہت سی اخلاقی خوبیاں تھیں جن کے مفصل بیان کے لیے یہہ چند اوراق کافی نہیں ہیں۔ وہ قول کا پکا اور بات کا دہنی تھا۔ ایکبار باغیوں میں سے ایک نے اس سے صلح کر لی۔ مگر بعد میں اُس کے اور رفتہ رفتہ اس عہد کو منسوخ کرنیکا ارادہ ظاہر کرنے لگے۔ اکبر اپنے افسروں کو برابر منع کرتا رہا۔ اور حتی المقدور عہد شکنی سے بچتا رہا۔ آخر جب باغیوں نے جنگجوئی میں پیشقدمی کی تو اُسے بھی مجبوراً انکے کیے کی سزا دینی پڑی۔

اکبر اگرچہ کتابی علم سے بے بہرہ تھا۔ مگر علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کا وہ علما سے بھی زیادہ شائق اور دلدادہ تھا۔ اسکی خداداد طبیعت میں ہر فن اور ہر علم کے جاننے کی صلاحیت تھی۔ کسب کمال اور تحصیل علم کے لیے وہ ایک سچے طالب علم اور جویائے حقیقت کی طرح کسی قسم کی محنت و تکلیف۔ اور

اور نفس کشی میں بند نہ تھا۔ اگلے زمانے کے ہندوؤں میں علم قومی حدود کے اندر مقید رہا۔ اور غیر قوم کو اسکی تعلیم ناواجب تھی۔ مگر اکبر سا متلاشی علم ان ممنوعات کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ اور اس لیئے علمائے ہنود کی دلجوئی ہر کسیطرح دریغ نکرتا تھا۔ آپ خوابگاہ میں کھڑکی کے پاس بیٹھتا تھا۔ اور وہاں ایک برہمن سے جو ایک کھٹولے میں بیٹھکر رسیوں کے ذریعے سے کھڑکی کے پاس پہونچتا تھا۔ ہندو مذہب کے متعلق تحقیقات کرتا تھا۔ شاہنشاہ وقت ہوکر علم کی خاطر اسقدر تکلیف گوارا کرنا اور تنگ خیال علمار کے اوہام کا اسقدر لحاظ رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ علمی ترقی کے لحاظ سے اکبر کا زمانہ تاریخ ہند کا بہترین زمانہ گذرا ہے۔ اکبر کا دربار علمار وقت کا مجموعہ تھا۔ ایک ایک تصنیف پر جوہر شناس بادشاہ لاکھوں روپے دیتا تھا۔ ترجمہ کا شعبہ علیحدہ قائم تھا۔ اور سنسکرت۔ یونانی۔ عربی کتابوں کے ترجمے کا جداگانہ انتظام تھا۔ سنسکرت کے بعض بہت مشہور علمی خزانے اسکی قدر شناسی کی بدولت فارسی میں منتقل ہوئے۔ سنگاسن بتیسی۔ اتھرون وید۔ راماین۔ راج ترنگی۔ مہابھارت نل دمینتی۔ لیلاوتی۔ کلیلہ دمنہ۔ تاجک۔ ہری بنس۔ جوتش سب اُسی کے عہد میں سنسکرت سے ترجمہ ہوکر فارسی میں آئیں۔

فنون لطیفہ سے بھی اُسے بیحد دلچسپی تھی۔ تصویر کشی وغیرہ سے اُسے بڑا شوق تھا۔ موسیقی میں بھی اُسے اچھا ملکہ تھا۔ سیر و شکار۔ چوگان بازی اور دیگر مردانہ اشغال کا بھی اُسے نہایت شوق تھا۔ اکبر طبع موزوں بھی رکھتا تھا۔ اور اکثر اشعار اُس کے یادگار ہیں۔ ایجاد کا مادہ بھی موجود تھا۔ آئین اکبری میں اُس کے ایجاد و اختراع کی مفصل کیفیت درج ہے۔

با اینہمہ اکبر مزاج کا بہت سادہ تھا۔ کھانا ہمیشہ دن میں ایکبار کھاتا تھا۔

اور وہ بھی بہت سادہ - خشک و تر میوہ جات اُس کے دستر خوان کا ضروری جزو ہوتے تھے - انکی کاشت کا بھی بڑا شوق تھا - ایران و توران کے باغبانوں کو آگرہ میں بلایا تھا - کابل - قندھار اور سمرقند کے میوہ جات آگرہ میں سہل الحصول تھے -

اکبر دیر تک جاگتا رہتا تھا - اسکی راتیں اکثر علمی مباحث - مذہبی تحقیقات اور علمار کی صحبت میں صرف ہوتی تھیں صبح ہوتے ہی یہ بیدار مغز بادشاہ غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر دربار میں جلوہ افروز ہوتا - اور وہاں سب کی عرض و معروض سنتا تھا - دوپہر تک دربار کرتا - اِس کے بعد کھانا کھاتا پھر ذرا دیر آرام کرتا - بعض اوقات صبح کے گھنٹے شکار وغیرہ کی نذر ہوتے تھے اور شام چوگان بازی میں صرف ہوتی تھی -

یہ ہیں ذاتی حالات اور اوصاف اُس عظیم الشان شاہنشاہ کے جسکا نام تاریخ ہند میں ہمیشہ آفتاب بن کے چمکے گا - جس پہلو سے چاہیئے دیکھئے اکبر بادشاہانِ ہند میں لاثانی نظر آئے گا - اصول مملکت اور طریق حکومت کو لیجئے - برسوں کی عداوتیں - تعصبات - اور خیالات میں کیسا انقلاب عظیم ہوگیا دوست دشمن ہر کس و ناکس کے ساتھ اوسکا برتاؤ کیسا دلفریب تھا - اور وزرا بھی اُسے کیسے باکمال - اہل ہنر - وفادار اور جاں نثار ملے تھے - آدمی جس قابل ہوتا ہے اُسیطرح کے دوست بھی بلجاتے ہیں - اِس برگزیدہ صفات اور جامع الکمالات بادشاہ کو ابوالفضل ایسے مدبر - فیضی ایسے مشیر - ٹوڈرمل سے وزیر - مان سنگھ سے جاں نثار - اور خانِ زماں سے بہادر اور جانباز مل گئے تھے - اور لطف یہ کہ سب کے سب وفاداری - عقیدتمندی - یکدلی جفاکشی - اطاعت - اور خیر خواہی - ایمانداری میں یکتائے روزگار - اور

ہمت و دلاوری میں عدیم النظیر تھے۔ عجیب بات ہے کہ جسطرح اکبر میں شجاعت اور ذہانت کے دونوں اوصاف یکجا ہوگئے تھے۔ اسیطرح اُس کے درباری تلوار اور قلم دونوں پر یکساں قادر تھے۔ سب بات کے دھنی۔ قول کے پورے۔ اور مالک کے نام پر جان تک قربان کرنے والے۔ سب اُس کے کام کو اپنی خوشی کا باعث بلکہ زندگی کا مقصد اور ماحصل سمجھنے والے۔ سب اُس کے اغراض کی تکمیل کو اپنا فرض منصبی بلکہ مذہبی جاننے والے اور اُن کے حصول کے لیے کیسے کیسے کارنمایاں کرتے تھے کہ ابتک آحسنت و مرحبا کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ فقط

دیانرائن۔ نگم

غزل

تختۂ گلہائے گلزارِ فنا کچھ بھی نہیں
یہ چمن ہوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ بھی نہیں

اُڑگیا تختِ سلیماں کٹ گئے پریونکے پر
گر کسی نے چار دن باندہی ہوا کچھ بھی نہیں

آبِ دانہ صورتِ شبنم ہے خود اٹھا ہوا
اے مسافر اُٹھ کہ یہ مہماں سرا کچھ بھی نہیں

اِس تہی گلزار سے تو کیا اوڑا لیجائیگی
یاں سوائے خاک و خاشاک اے صبا کچھ بھی نہیں

شب کو شمع بزم نے دیکھیں نہیں کیا کیا صحبتیں
صبحدم رو رو کے کہتی ہے کہ تھا کچھ بھی نہیں

محفلِ عیش و طرب گنجِ شہیداں بن گئی
ہائے خونِ آرزو کا خوں بہا کچھ بھی نہیں

کہتے ہیں دنیا میں ہوتا ہی ہر اک دکھ کا علاج
اے بیانؔ دردِ جدائی کی دوا کچھ بھی نہیں

"مجھے دیکھا کیوں"

(ایک ہندوستانی مغنّیہ کی طرف سے)

آہ! یہہ نظریں! بس لکھنے والے سے خدا ہی سمجھے۔ اِس سے تو میں اندھی ہوتی کہ نہ کوئی صاحب میری نگاہوں پر فریفتہ ہوتے اور نہ یوں جھگو جھگو کر لگاتے۔ شکوہ شکایت تو آگے چلکر ہوگی۔ جناب پہلے تو یہہ بتایئے کہ آپنے مجھے دیکھا کیوں۔ یہ وعظ و نصیحت منظور تھا تو آپنے اسطرف کارخ ہی کیوں کیا۔ پھر پوچھتی ہوں۔ منّت سے پوچھتی ہوں کہ آپنے مجھے دیکھا کیوں۔ کاش مجھے یہ اختیار حاصل ہوتا کہ پوچھتی آپ نے۔ مجھے۔ دیکھا۔ کیوں۔ شاید مجھے شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ آپنے میری آنکھوں کو دیکھا اور تعریف کی۔ مگر صدمہ تو اس بات کا ہے کہ آپنے میرا دل نہ دیکھا۔ اوس کے زخم نہ دیکھے اوس کا جنازہ نہ دیکھا۔ اوس کی بے نشاں قبر نہ دیکھی۔ اور تو اور اوس کے دوامی عرس کا جو زندہ اشتہار ان کالی کلوٹی آنکھوں میں تھا۔ اوسے بھی نہ دیکھا حیف! حیف!

جی ہاں! "شبہائے عشق کی بقیہ مسرت مخمور سے تھکی ہوئی نظریں" سبحان اللہ کسقدر اچھا کہا ہے! پھر فرمایئے گا؟ "مسرت مخمور" اِس خوشی کا نشہ کہ چند بیدرد نکتہ چین۔ آوارہ مزاج۔ خدائی خوار "زر میخورم" کی ضرورت سے۔ "آیئے" "بیٹھیے" "خوب" "بہت خوب"

"سُبحان اللہ۔" "واہ واہ" کہیں؟ مجھ بدنصیب کی خوشی؟ اور وہ بھی مخمور کردینے
والی خوشی کا اندازہ کسقدر صحیح کیا گیا ہے! بس مجھے کچھ اور کہنا نہیں
بھر پائے۔

"میری سیاہ آنکھوں کی سوزاں ظلمتوں میں ایک مبہم اشارہ دعوت
پایا" ٹھیک پایا۔ میں بلاتی تھی کہ کوئی آئے اور میری بیکسی کو دیکھے
میری بے بسی پر رحم کھائے۔ میرے زخم جگر پر مرہم لگائے۔ مجھے
اِس قعر بدنامی سے جو عورت کے لیے موت سے بدتر ہے نکالے
ذرا سا سہارا ہی دیدے۔

مگر میری تقدیر دیکھنے والے کی روح ہمدردی سے بیچین ہونے
کے بدلے "حرص سے لرزنے لگی" اور طرہ یہ کہ یہہ بھی میرا ہی قصور ہے
سچی بات آدھی لڑائی ہوتی ہے۔ میں بھی لڑتی۔ مگر چپ ہوں۔ اور
دلکو مار لیتی ہوں۔ کہ جی ہاں "میرا لطف خریدا جا سکتا ہے"۔ اور
اِسی سبب سے دیکھنے والے کا سارا شوق بجھ جاتا ہے۔ میری "بے ہیجانی
بے حرارتی۔ بے محبتی" اسے زایل کردیتی ہے۔ بجھا دیتی ہے"!

اسے بھی جانے دیجئے۔ غضب تو یہ ہے مجھے بالکل مردہ سمجھ لیا۔ میرا "اظہارِ
شوق جھوٹا" میرا "گلے ملنا پر استکراہ" "میرے بوسے تھکے ہوئے اور سست"
پیارے دیکھنے والے برائے خدا دو چار گالیاں اور دیدو۔ کوئی ارمان باقی نہ رہجائے
فرمایئے "تیرا مرنا شعبدہ روحانی۔ تیرا جنازہ ایک خالی مچاند۔ تیری قبر ہاتھی
پکڑنے کا گڑھا۔ تیرا حشر نشر۔ بہروپیے کا سانگ۔

افسوس! افسوس!! مدت بعد ایک شخص ملا۔ مگر راز دل سے ناآشنا!۔
لایق یلدرم بہت کچھ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر مایوسی کہتی ہے صبر کر

خاموش ہوجا" کیونکہ آپ اسقدر بیزار ہوئے کہ ذراسی دیر میں دور دور کرنے لگے۔ میں بھی مردود میری آواز بھی مردود۔ میرا تھکا ہوا نشہ بھی مردود۔ اور میرے ساتھ موسیقی اور شاعری سب مردود۔ بڑے سنگدل ہوا۔ شاید یلدرم کے معنے ہی سنگدل کے ہوں۔

اچھا اے گل یلدرم۔ (آج سے میں ہر سنگدل مرد کو یلدرم کہا کروں گی) سنو۔ گوشش ہوش سے سنو۔ کہ میں کون ہوں۔ میری حالت کیا ہے اور کس کس کی گردن پر میرا خون ہے۔ پہلا گناہ میں نے یہ کیا کہ عورت بنکر دنیا میں آئی۔ بدظنی کا آماجگاہ بنی۔ رقابتوں کا مرکز ٹھرائی گئی یہ سب میرا قصور ہے۔ مرد کا اس میں بالکل قصور نہیں ہے!

بدصورت ہوتی تو یہی نیک سیرت مرد۔ زندہ درگور کر دیتے۔

اب جو ذرا چار آدمیوں میں بیٹھنے کے قابل ہوں تو میری کیا کیا ہجو کی جاتی ہے۔ نظریں تو نظریں گلے ملنے اور بوس وکنار تک کے طعنے دیے جاتے ہیں۔ میں گانا نہ سیکھتی کہ نہ مغنیہ ہوتی اور نہ مردوں میں بلائی جاتی۔! مگر کیا مینے اپنے شوق سے ایسا کیا؟ کیا مردوں کے دلی جذبات کی طلب صادق نے مجھ میں یہ حس پیدا نہیں کی؟ اے اہل دل مردو کیا اسے بھی میں اپنا ہی قصور تسلیم کروں؟ او ہو مجھے اب اپنا اصلی قصور معلوم ہو گیا۔ عورت بھی ہوتی۔ خوبصورت بھی ہوتی گانا بھی سیکھتی۔ مردوں سے بھی ملتی۔ مگر اپنا دل نکالکر پھینکدیتی۔ مرد تو یہی سمجھتے ہیں!۔

ورنہ میری "بے حراستی"۔ "بے مخلتی" وغیرہ کی کیوں شکایت ہوتی بات یہ ہے کہ سب سے زیادہ ظلم عورت پر اور اوس کی غنائی ہستی پر

تقدس نما لوگوں کی طرف سے ہوا۔ انہوں نے خدا کا تو یقین کیا۔ مگر خدا کے بعد جیسا کہ حق تھا۔ عورت کا یقین نہ کیا۔ اکثروں کو بند کر کے اون کی زندگی سیاہ سُری کر دی۔ اور اون کے اور علم موسیقی کے درمیان ایک ایسا وزنی اور موٹا پردہ حائل کر دیا۔ جو نہ اٹھا سے سے اوٹھے نہ پھاڑ سے پھٹے۔ اسکا لازمی نتیجہ یہہ ہے کہ آج میں ہوں۔ اور میرا بدنام فرقہ ہے۔ ہمارے کلیجے ہیں اور یلدرموں کے تیر۔

ہم بھی انسان تھے۔ ہم بھی دل رکھتے تھے۔ ہمیں یوں "بارہ پتھر باہر" نہ کیا جاتا تو ہم بھی گھروں کی بستی ہوتے۔ مردوں کے غمگسار رہتے ہم میں بے قراری۔ اور بے محبتی نہ ہوتی۔ ہمارا اظہار شوق جھوٹا نہ ہوتا حیف اب ہمیں لوگ دیکھتے ہیں تو کس کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اوس وقت دیکھتے تو ضرور یوں دیکھتے ؎

دیکھنے کا تو مزہ یہ ہے سراپا دیکھے
دیکھکر پاؤں ترا موںہہ نہ کسیکا دیکھے

دیکھو مسٹر یلدرم۔ ایک نصیحت میری مانو کہ آج سے کسی مغنیہ کو نہ دیکھنا اور یہ سزا اس قصور کی ہے کہ آپنے مجھے دیکھا کیوں۔

بقلم "نسائی"

رباعی

دعویٰ باطل کہ مدعی نے مارا ۔۔۔ تہمت بیجا کہ خودکشی نے مارا
الزام فرشتوں پہ الٰہی توبہ ۔۔۔ جسنے پیدا کیا اوسینے مارا

ثاقب بدایونی

قصر یلدز

دل میں ہو درد اور عقل ہو سلیم غور کرنے کی دیر ہے چشم بینا صحیفہ عمر کے بعض ایسے اوراق کا مطالعہ کرے گی جنکا ایک ایک حرف عبرت کی جیتی جاگتی تصویر ہو کر سامنے آئیگا۔ اور تھوڑی کی لکیر بنکر کلیجہ پر بیٹھے گا۔ ایک دو نہیں بیسیوں واقعات اور مشاہدات ایسے نکلیں گے جن کے عروج میں زوال کی تہ بھی ہوئی ہے۔ تامل ہے شرط اور تحقیق ہے درکار۔ سنو اور دیکھو وہی سرزمین جسپر کل سرسبز و شاداب پودے لہلہا رہے تھے۔ خوشرنگ پھولوں نے دور دور تک ہوا کو معطر کر رکھا تھا۔ رنگ برنگ کی تیتریاں رس چوس رہی تھیں۔ طائران خوش نوا چہک رہے تھے آج وہاں خاک اُڑ رہی ہے۔ درخت سوکھ کر کھڑ نک ہو گئے۔ پھول کمہلا گئے تیتریاں اُڑیں پرند رخصت ہو گئے جہاں صبا کی اٹکھیلیاں تھیں اب وہاں سموم کے تھپیڑے ہیں۔ دی کوشک یلدز جسنے اپنی عمر کا بڑا حصہ اس شان سے گزارا کہ شہنشاہ تک اسمیں داخل ہو کر سر جھکاتے تھے جسکی عظمت و اقتدار کا سکہ بڑی بڑی سلطنتوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک چشم زدن میں کچھ سے کچھ ہو گیا! کیسی عبرت کا مقام ہے جس مکان کو یہ رونق اور عزت نصیب تھی کہ باعتبار حسن و نزاکت اچھی اچھی تعمیریں اور بلحاظ آبادی بڑے بڑے شہر قربان ہوں اسپر ایک وقت ایسا آ کر پڑا۔ کہ چاروں طرف ہو کا میدان تھا۔ وہ در و دیوار جنپر ہر وقت رونق برستی تھی۔ اور رات دن چہل پہل

رہتی تھی۔ ساکت کھڑے تھے ایک فوجی افسر کا بیان ہے کہ قصر یلدز کا ذرہ ذرہ اس وقت نیرنگی زمانہ کی عبرتناک تصویر تھا۔ کچھ عجیب قسم کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جسکو دیکھکر کلیجہ دھلتا تھا کوسوں تک کسی کے سانس لینے کی آواز نہ آتی تھی۔ جن پتھروں کی پچیس تیس برس تک قدوم سلطانی اپنی آنکھوں پر رکھے اسوقت عبد الحمید خاں کو ہمیشہ کے واسطے وداع کر رہے تھے۔ بے ثباتی دنیا کا ثبوت اس سے زیادہ آنکھیں کیا دیکھیں گی۔ اور کان کیا سنیں گے۔ کل ہی کا تو ذکر ہے کہ قصر یلدز چوتھی کی دلہن بنا کھڑا تھا جس کو دیکھہ دیکھہ کر بدنصیب سلطان کا خون چلوؤں بڑھتا ہوگا۔ بیگمات کی زرق برق پوشاک۔ جواہرات کی چمک دمک فرنیچر کی زیب وزینت اور درودیوار کی نزاکت عبد الحمید خاں کے قلب کو تر وتازہ کرتی ہوگی۔ اس منحوس گھڑی کا تو کبھی بھولکر بھی خیال نہ آتا ہوگا۔ کہ یہ تمام ساز وسامان طوطے کی طرح دیدے بدل جائے گا۔ یلدز کا تزک احتشام سب خاک میں ملجائیگا۔ اور مئی کی ایک رات ایسی کالی بلا سر پر لائے گی کہ زمین تو زمین پاؤں تلے کی چیونٹی بھی خون کی پیاسی ہوگی۔

حسن جعفری

رباعی

کچھہ ہوتا نہ کھانے کو تو پھر کیا کرتا   گر روزہ نہیں کہتا تو فاقہ کرتا
کھانے سے اگر روزونکے بھر جاتا پیٹ   میں بارہ مہینے روزے رکھا کرتا

فصیح دہلوی

کوہِ قاف کی پری

(ایک انگریزی نظم کا ترجمہ)

کاکیشیا کی ایک دوشیزہ پریجمال
ہے دلربا نمونۂ قدرت کی اک مثال

گلزارِ حُسن کا وہ طرحدار پھول ہے
ہاں سادگی کے باغ کا سردار پھول ہے

عشق اور عاشقی کی اسے کچھ خبر نہیں
اِس بھولے بھالے دل پہ ابھی کچھ اثر نہیں

زینت کو اسکے حسن کی زیور کوئی نہیں
پھر بھی تو اِس حسین سے بہتر کوئی نہیں

کمسن حسین ہے انجمن آرائے شوقِ دل
سچ ہے کہ سادگی ہے تمنائے شوقِ دل

یہ پیرزہ ہے جسپہ بناوٹ نثار ہے
اسکی خزاں بھی غیرتِ صد نوبہار ہے

زینت ہے اسکے بالوں کی جنگل کا ایک پھول
دنیا کا کوئی رنج اُسے کرتا نہیں ملول

گویا کہ ہے وہ دشتِ مسرت کا اک غزال
راحت کا غم ہے جسکو نہ ہے رنج کا خیال

تفسیرِ دو جہاں ہے گُل اسکی نگاہ میں
نقش و نگار دہر ہیں نقشِ گیاہ میں

آزاد ہے وہ غم سے گناہوں سے پاک ہے
ہے صاف دل ہے اور نگاہوں سے پاک ہے

پوشاک طرحدار کی پروا نہیں اسے
کچھ حسرتِ حصول تمنا نہیں اسے

گلزارِ حُسن کا وہ گلِ خوشگوار ہے
وہ رخصتِ بہار میں رشکِ بہار ہے

کُرتے سے اسکے ہوتا ہے گورا بدن عیاں
کرتی ہے جس سے بادِ صبا چھیڑ خانیاں

گورے بدن پہ پھول ہیں سارے چمک رہے
گویا ہیں چاندنی میں ستارے چمک رہے

صحرائی پھول زیبِ رخِ دلنواز ہے
اس کو ہے فخر اسپہ اسے اسپہ ناز ہے

اس سادگی پہ رشک ہے جنت کی حور کو
اور کوہ قاف بننے کی حسرت ہے طور کو

اُتری ہے وہ پہاڑ سے رفتار ناز سے — خود بچھ رہا ہے دامن صحرا نیاز سے
اپنے سفید پاؤں وہ تلوے میں دھوتی ہے — قدرت کے ہر نظارے پہ بیخود وہ ہوتی ہے
ہر چیز دشت کی اسے سامان ساز ہے — ہر شاخ گل میں مظہر قدرت کا راز ہے
اب خود بخود ہے لب پہ ہنسی اسکے آ رہی — گویا ہے کوئی چیز اسے گدگدا رہی
ہیں نیلی آنکھیں اسکی خوشی سے چمک رہی — پیشانی مثل ماہ ہے اسکی دمک رہی
لہریں ہیں اسکے پاؤں سے محو نیاز و ناز — وہ دیکھتی ہے شوق سے قدرت کے سارے راز

اے خوش نصیب لڑکی! تری قسمت اچھی ہے — باغ خزاں رسیدہ میں یہ صورت اچھی ہے
دنیا کا رنج و غم کوئی اصلا نہیں تجھے — چرخ ستم شعار کا کھٹکا نہیں تجھے
دام فریب دہر سے اب تک تو دور ہے — اے خوش نصیب رخ پہ ترے پاک نور ہے
اے مرکز دائرۂ حسن انتخاب — یہ سادگی ہے لاکھ بناوٹ کا اک جواب
حسن آفریں سہی پہ تو ناز آفریں نہیں — اے شمع حسن تجھ سا کوئی بھی حسیں نہیں
تو دلربا ہے تجھکو مگر کچھ پتا نہیں — تیرے جمال پاک کا شہرہ ہوا نہیں
دیکھی نہیں ہے تو نے مصیبت کی زندگی — دنیا کے درد و رنج کی فرقت کی زندگی
لیجائیں تجھکو لوگ نہ تیرے وطن سے دور — اے شمع حسن تو نہ ہوا انجمن سے دور
تیرے وصال کی نہ تمنا کرے کوئی — یونہی تری بہار کو دیکھا کرے کوئی
اے گل تجھے لگے نہ کبھی عشق کی ہوا — سادہ رہے ہمیشہ ترا حسن خوشنما

تا زیست برقرار تری سادگی رہے
صورت یہی رہے تری سیرت یہی رہے

محمد عبد العزیز شوق

زمزمۂ توحید

وسعت فلک کی اوپر نیچے فضا سہانی — اور اس میں نیلا نیلا یہ رنگ آسمانی

یہ نور کے ستارے یہ عالم درخشاں — کرتے ہیں مشتہر سب قدرت کا راز پنہاں

دن بھر چمک چمک کر تھک فلک کا مہرو — ڈالے ہے ہمیشہ تیری صنعتگری کا پرتو

اور کہہ رہا ہے اپنی نوری زباں سے ہر جا — ہے صنع دستِ قدرت عالم کا کارخانا

جونہی کہ سایۂ شب گردوں پہ پھیلتا ہے — دلکش فسانہ کن مہتاب چھیڑتا ہے

اور رات بھر فلک سے نگراں بسوئے ہستی — کہتا ہے چپکے چپکے رازِ نمودِ ہستی

ہیں قرب میں جتنے شعلہ فشاں ستارے — اور گھومتے ہیں جتنے سیارے آسماں کے

سب مل کے محوِ گردش کرتے ہیں بخودانہ — تا انتہائے عالم شائع ترا فسانہ

سنجیدہ خامشی سے گو سب کے سب درخشاں — ہیں تیرہ خاکداں کے پہن فضا میں رقصاں

اور گو کوئی صدا یا شورِ غزل سرائی — روشن فلک سے نیچے دیتا نہیں سنائی

پر گوش فہم میں سب دھومیں مچا رہے ہیں — توحید کے ترانے پیہم سنا رہے ہیں

اور محوِ زر فشانی گاتے ہیں باری باری — ہے کلکِ دستِ قدرت تمثال گر ہماری

(نواب الدین نیاز کمبوی)

خیالِ یار

خیالِ یار کی نیرنگیاں کیا کیا ہیں خلوت میں — نہیں لذت کسی نعمت میں جیسی ہے محبت میں

کبھی رہتی ہے خودداری کبھی ہے بیخودی طاری — مزے لیتے ہیں لیکن ہم برابر وصل و فرقت میں

کبھی ہے دلکشا غمزہ کبھی ہے عشوہ جانفرسا — نہیں ہے ایک سی حالت تلون ہے جو طینت میں

ہو جب زلف کا کھٹکا تو دل بھی چار سو بھٹکا — جو بدلا رنگ صورت کا تو آیا فرق سیرت میں

کبھی ہے گرمیِ رخسار سے دل نعل در آتش
خیال سرد مہری سے کبھی ہے جان آفت میں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا اگر سمجھوں تو کیا سمجھوں
مری جاں میرے قبضہ میں ہے یا ہے اسکی قدرت میں

تصور کی کبھی تصدیق ہوتی ہے کہ سچا ہے
کبھی وہم و گمان بیم و رجا کی ہم ہیں حالت میں

کبھی جو آنکھ پڑتی ہے گلے پر تیغ پھرتی ہے
کبھی ہیں جنبش ابرو سے گرداب مصیبت میں

کبھی سمجھاتے ہیں دل کو۔ کریگا رحم وہ ظالم
خیال اس کا کبھی۔ ہے جور و ظلم اوسکی طبیعت میں

تخیل سے کبھی قامت کے ہوتا ہے بپا محشر
کبھی تخئیل سے رفتار کی۔ پڑتے ہیں آفت میں

خودی سے جب گزر جاتے ہیں ملتی ہے ہمیں راحت
خودی میں جب تلک رہتے ہیں رہتے ہیں مصیبت میں

کبھی ہے سرمہ آواز چشم سرمگیں اوس کی
پھنساتا ہے کبھی حسن گلوسوز اوسکا آفت میں

کبھی رہتے پہ اوجِ کامرانی کے کھڑے ہیں ہم
حضیض نامرادی کے کبھی قعر مذلت میں

کبھی ہر ہر قدم پر پاؤں اپنے ڈگمگاتے ہیں
کبھی ہمت بڑھاتی ہے قدم میدان الفت میں

خیال وصل سے گاہے طبیعت شاد ہوتی ہے
بلائیں گھیر لیتی ہیں کبھی تخئیل فرقت میں

خیال آتا ہے گاہے عمر اب کیونکر بسر ہوگی
سمجھتے ہیں کبھی۔ آرام سے سوئینگے تربت میں

کبھی اپنی وفاداری پہ فخر و ناز ہوتا ہے
غم اس کا ہے کبھی ہے بے وفائی اسکی طینت میں

خیال اس کا جو آتا ہے۔ کجا مہر و کجا ذرہ
تو غوطے کھاتے ہیں از بسکہ دریائے خجالت میں

اُسے معلوم کب ہوا جو نہو درد آشنا سعدی
اٹھاتے رہتے ہیں جو لطف ہم درد محبت میں

ابوالبرکات محمد عبدالحی سعدی

نوحہ

(ترجمہ از نظم بائرن)

جاں بحق تسلیم تم اٹھتی جوانی میں ہوئیں
کسکا دل لائیں جو رکھیں سینہ پر سنگِ مزار

ہاں مگر شاخ گلاب و نرگسِ بیمارِ چشم
لہلہائینگے گیاہِ قبر پر اب سوگوار

سب سے پہلے فصل میں پھولے پھلینگے یہ شجر اور جو دروسر و جھومیگا سدا مستانہ وار
جانتا تھا کون نیرد یر حیاتِ مستعار

نیلگوں نہر رواں کے اس کنارے بارہا تیر خوردہ عشق کے آئینگے باقلب حزیں
غرق تیرے دھیان میں اور خوابہائے وصل میں حسرتِ ارماں بھرا پہلو میں دل اندوہگیں
نامراد آہستہ پھرتا ہی قدم ولیں ہی خوف پاؤں کی آہٹ سے یہ مدفون جاگ اٹھی نہیں
نیند سے پر موت کے غافل ذرا واقف نہیں

اب یہ سیل اشک اپنا ظاہرا بیکار ہے کب اجل سنتی ہے پرغم داستان بیکساں
کیا مگر اس سے کوئی فریاد کرنی بھول جائے آہ وزاری اس سے کم کرینگے یا نوحہ گراں
ناصحا مجھکو فراموشی تو سکھلائی مگر ہے تری خود چشم پرنم غم سے ہے چہرہ عیاں
قصۂ غم ہو چکا آگے قاصر ہے زباں

آصف۔ (از لندن)

اُردو عِلم ادب

دفتر اخبار صلح کا پیسہ اخبار لاہور میں جناب منشی دین محمد صاحب مالک و اڈیٹر اخبار مذکور کے اہتمام سے ہر مہینے کے آخیر ہفتہ کو ایک مشاعرہ ہوتا ہے جس میں طرحی و غیر طرحی غزلیں اور کسی خاص مضمون پر نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ ماہ اپریل ۱۹۰۹ء کے اخیر ہفتہ میں جو مشاعرہ ہوا۔ اس میں تین نظمیں اردو۔ زبان۔ اور علم ادب کے متعلق تھیں ان میں سے ایک نظم اس لیے خصوصیت سے قابل اشاعت ہے کہ وہ بہت دور سے آئی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ہوا خواہ جہاں کہیں ہیں اسکی خدمت کا خیال دل سے نہیں بھلاتے۔ اور یہی سچی وطن کی

دوستی ہے۔ سید احمد حسین صاحب شوقؔ جو لاہور کے گیلانی سادات کے مشہور خاندان سے ہیں - آج کل بخارا میں مقیم ہیں اور یہ نظم جو ذیل میں درج کیجاتی ہے - انہوں نے وہاں سے بھیجی ہے - اس میں مخزن و عصمت کی خدمات کا بھی اعتراف ہے - اور اس غائبانہ عنایت کے لیئے ہم اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں :-

آج اے اُردو ستارہ ہے ترا چمکا ہُوا — وہ ضیا ہے ہند سب آئینہ سیما ہُوا

کیا کہوں یہ حُسنِ عالمتاب کا جلوہ ہوا — جسنے دیکھا تجھکو ترا عاشق و شیدا ہوا

کرتے ہیں تیری زیارت لوگ قرب و دور سے — کر دیا معمور اس ظلمت کدے کو نور سے

اسقدر تیری ترقی کا نہ تھا ہم کو گماں — تُونے وہ دکھلا دیا جسکا نہ تھا کچھ بھی نشاں

ہاں مگر تُو نے ازل سے پائے ہیں کیا کیا جواں — جو تری صنعت میں ساعی رہتے ہیں باعز و شاں

چاہنے والوں کا تیرے ہے جو حلقہ بیشمار — ان میں شاعر ایک ایک ہے انتخابِ روزگار

اللہ اللہ تیرے مضمونوں کی ہیں وہ دلچسپیاں — کیا سلاست پانی ہے لیتی ہے چٹخارے زباں

چُلبلے شوخی بھرے وہ ہائے اندازِ بیاں — کہ ترقی اور اسے سرمایۂ ہندوستاں

کر دے مالامال اسکو تو گہر افشاں ہے — ہند گر بیجان قالب ہے تو اس کی جان ہے

دیکھتے ہی دیکھتے اب تیری رنگت اور ہے — حُسن کیا نکھرا ہوا ہے زیب و زینت اور ہے

کیوں نہ پھر لے علیہ جو غیرت سے صورت اور ہے — لطف و خوبی اور ہے حُسنِ نزاکت اور ہے

تیری آمد یاد ہے ہمکو فسانے کی طرح — رنگ کیا کیا تو نے بدلے ہیں زمانے کیطرح

نظم کا تیرے ولی کے سر پہ جب سہرا بندھا — حُسنِ صورت دیکھکر سب نے کہا صد مرحبا

خیر مقدم کوئی بولا کوئی یوں کہنے لگا — یہ نیا گلزار ہے یارب پھلے پھولے سدا

باغباں لاکھوں ہوں پیدا یہ چمن آباد ہو — اسکے گُل بوٹے جو دیکھے جی اسی کا شاد ہو

مدح خواں تیرے کہیں ہیں میر اور سودا کہیں — مصحفی - جرأت کہیں اور سید انشا کہیں

مرثیہ گوئی میں ہے تیرے انیس خوش بیاں
جلوہ گر ہیں انس مونس اور نفیس خوش بیاں

کیا مضامین اب تیری آتش کے پرکالے ہوئے
کیسے کیسے ہیں یہ شاعر تجھپہ دل والے ہوئے

غالب و مومن بھی تیرے چاہنے والے ہوئے
تاجدارِ آخری اور ذوق متوالے ہوئے

کوششوں سے اُن کی تیرا نام اعلیٰ ہوگیا
پہلے تھا اُردو اب اُردوئے مُعلّیٰ ہوگیا

تیری رنگینی کلامِ حضرت افضل میں ہے
شوخیٔ مضمون امیر کاملِ اکمل میں ہے

واہ کیا جلوہ جلال شاعرِ فاضل میں ہے
چٹکیاں لیتا کلامِ داغ بھی ہر دل میں ہے

تجھپہ مفتوں ہیں جلیل و اختر و شادِ دکن
ہے پسند شاہِ آصف حیدرآباد دکن

ناظم و ضیغم بھی ہیں کیا داد پانیکے لیے
آئے حالی قوم کا نوحہ سنانے کیلئے

فوق بھی ہیں نظم کو تیری جگانیکے لیے
انجمن قائم ہوئی تجھکو بڑھانیکے لیے

تجھ میں گو نکلے رسالے ہیں بہت سے جابجا
کیا ستارہ ہند میں چمکا پیام یار کا

دلگداز لکھنؤ کا مدتوں چرچا رہا
اب زمانہ بھی بدلکر رنگ کو ظاہر ہوا

چٹکیاں لینے لگے مضموں ہائے مخزنی
کیسی بھائی ہے زمانہ کو ہوائے مخزنی

کیوں معترف ہو ہر باشندۂ ہندوستان
نازِ مخزن پر ہے کرتی آج یہ اُردو زباں

ہر مضامین دلکش و دلچسپ ہے رنگیں بیاں
کیا اڈیٹر کا ہوا ہے اوج پر نام و نشاں

دوستو نمیں حضرت خاتم کے وہ خوش کام ہے
رہتے ہیں دلی میں عبدالقادر انکا نام ہے

ہر جگہ تیرا ہی اُردو بول بالا ہوگیا۔
طبقۂ نسواں میں بھی اب تیرا چرچا ہوگیا

دن بدن تجھ میں نیا سامان پیدا ہوگیا
پہلے تھا خاتون اب عصمت اضافہ ہوگیا

شکریہ کرتے ہیں اسکا خاص بھی اور عام بھی
مستحق اسکے ہیں اکرام اور مسز اکرام بھی

ہند میں ایسے رسالے بیشتر آئے نہیں
تیری رنگینی کے گلدستے تو کھلائے نہیں

لطف جو پائیں تجھ میں پہلے وہ آئے نہیں
شاعرانِ باکمال ایسے نظر آئے نہیں

شوق گیلانی ہی ان تیرے ثناخوانوں میں ہے
حالی جسکا آجکل غربت کے افسانوں میں ہے

عذر شکایت

اے دوست رسم و راہ تو ہے شرط دوستی
کیا کیجیے کہ دوست کی ہمت نہیں رہی

وہ انتظار کھینچنے کے دن نکل گئے
وہ دل میں ناز اٹھانے کی طاقت نہیں رہی

دل سرد ہو گیا ہے کچھ ایسا کہ یک قلم
وہ جستجوئے گرمی صحبت نہیں رہی

یخ بستہ ہاتھ پاؤں ہیں افسردہ جسم و جاں
رگ رگ میں جو بھری تھی حرارت نہیں رہی

رہتا ہوں اب چراغ کی صورت بجھا ہوا
اگلی سی وہ مزاج میں حدت نہیں رہی

اگلا وہ رنگ روپ تو خواب و خیال ہے
صورت کا حال یہ کہ وہ صورت نہیں رہی

سمجھائیے تو پھر دل میں سمجھو ایک آدھ بات
کچھ پوچھیے تو ذہن میں جودت نہیں رہی

چلائیے تو اب سنوں اور کیا کہوں
جینے میں لطف باتوں میں لذت نہیں رہی

اعضا جو بچپنے کے مرے تھے رفیق حال
اصلا کسی میں رفق و رفاقت نہیں رہی

پیری نے آ کے حال دگرگوں بنا دیا
خوں ہو گیا سفید وہ رنگت نہیں رہی

اب مختصر تو یہ ہے کہ وہ میں نہیں رہا
وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

شیریں ہو جس کے واسطے ہو شہد زندگی
میرے لیے تو اس میں حلاوت نہیں رہی

یہ سب سہی پر اب بھی وہی آہ آہ ہے
ایسا نہیں کہ دل میں محبت نہیں رہی

شاکی نہ ہو کوئی یہ خلاصہ ہے جس طرح
آزاد کو کسی سے شکایت نہیں رہی

آزاد عظیم آبادی

حضرت انسان

منشی صادق علیخاں صاحب کے نام نامی سے ناظرین مخزن اچھی طرح واقف ہیں منشی صاحب موصوف کو جو توجہ شروع سے اسوقت تک مخزن پر رہی اسکے اعادہ کی ضرورت نہیں یہ نظم منشی صاحب کے والد منشی حکیم حاکم علیخاں صاحب کنظیم کی لکھی ہوئی ہے جو منشی صاحب نے مخزن کو عنایت کی ہم اسکو نہایت خوشی سے درج کرتے ہیں :-

آدمی گاہے فرشتہ ہے کبھی انسان ہے — گاہے رہزن ہی یہ حضرت اور رہبر ہی کبھی

اسکی فطرت ہے انوکھی اور خلقت ہی عجیب — ہے زر خالص کبھی اور مس سے بدتر ہی کبھی

بسکہ انسانی صفات اس خاک کے پتلے میں ہیں — آدمی ہو کر بشر ہے صفات بے شر ہی کبھی

گہ سراسر نور ہے اور گہ سراسر نار ہے — مرہم کافور گاہے آب خنجر ہے کبھی

شیر مردم خوار گاہے اور گہے گربہ صفت — بھیڑ گاہے بھیڑیا ہے اور اژدر ہی کبھی

ہے مجسم رحم گاہے اور گاہے سنگدل — صورت آئینہ گاہے اور پتھر ہے کبھی

ہے سخاوت میں کبھی مشہور گاہے بخل میں — ہے اگر حاتم کبھی قارون سے بدتر ہی کبھی

گاہے یہ غدار ہے عیار ہے مکار ہے — بزدل و روباہ صفت مشہور کشور ہی کبھی

قوم کا محسن ہی گاہے حق پسند و دادگر — پھر شکم سیری سے اپنے نفس پرور ہی کبھی

جنگ جو ہے تند خو ہے اور گاہے صلح جو — حکمت عملی سے در پردہ ستمگر ہے کبھی

وقت نصرت ہے کمو فاداری میں گاہی یار غار — اور فضائل میں فرشتے بھی برتر ہی کبھی

ہے گل گلشن کبھی اور خار گلخن ہے کبھی — طفلک نو خیز گہ مرد معمر ہے کبھی

ہے کبھی معشوق گاہے عاشق خستہ جگر — ہوتا ہے دلدار گاہے اور دلبر ہے کبھی

راحتِ جاں ہے کبھی صورت آبِ حیات
ہے کبھی ظلمات سیرت خار بستر ہو کبھی

حضرتِ انسان بھی کیا مجموعۂ اضداد ہے
رحم دل ہوتا ہے گاہے اور ستمگر ہے کبھی

گہ ملایک کے صفات نیک سے ممتاز ہے
کرکے بداعمالیاں شیطاں سے بدتر ہے کبھی

ارتکابِ جرم سے دل تنگ ہوتا ہے کبھی
اور پڑتا اُس کے پیچھے ہاتھ دھوکر ہے کبھی

تارک الدنیا ہے گاہے اور کبھی دُنیا پرست
ہو کے یہ بے خانماں آوارہ در در ہے کبھی

گہ صلوات و صوم کا پابند ہو جاتا ہے یہ
کیا نماز و روزہ پھر حق سے بھی منکر ہے کبھی

شہر کا قاضی کبھی رندِ خراباتی کبھی
گاہے کمبلی بھی نہیں پشمینہ در بر ہے کبھی

گہ مسرت سے ہے دل خوش گاہ غم سے پایمال
ہے کبھی خنداں اگر با دیدۂ تر ہے کبھی

بے رواجی سے کبھی اپنے بہت دل تنگ ہے
اور رواج مدعی سے داغ دلبر ہے کبھی

ہے یہ گاہے مال مست اور یہ گاہے حال مست
ہے کبھی مفلس گداگر اور تونگر ہے کبھی

ناتوانی میں ہے اپنے مثل طفلِ شیرخوار
اور توانائی میں شیر نر سے بڑھکر ہے کبھی

اپنے تن من کی کبھی ہوتی نہیں اسکو خبر
نکتہ بین کہنہ اقوال پیمبر ہے کبھی

گاہ بستر سے غم فردا سے اُٹھ سکتا نہیں
عرش پر ہے گہ خیال اور اُس سے اوپر ہے کبھی

دام میں ہے یاس کے گاہے شکستہ بال و پر
سامنے امید کا جاں بخش منظر ہے کبھی

گاہ باد و گاہ خاک و گاہ آتش گاہ آب
سامنے آئینہ رکھکر یہ سکندر ہے کبھی

جزر و مد کا یہ نمونہ چھوٹے پیمانے پہ ہے
ہے کبھی قطرے کی صورت اور سمندر ہے کبھی

جس قدر سوچو گے طرفہ پاؤ گے اسکو نظیم
ہے کبھی نادر بشیرا - اور اکبر ہے کبھی -

بلبل اور میں

او چیخ کر قفس میں فریاد کرنے والے
او ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں راتوں کو بھرنیوالے

او حسرتِ چمن میں جی سے گذرنے والے
او عندلیبِ شیدا! پھولوں پہ مرنے والے

حسرت نصیب ہے تو - میں درد آشنا ہوں
پنجرے میں قید تو - میں زنداں میں مبتلا ہوں

نالے فراقِ گل میں تیری زبان پر ہیں
صدمے مفارقت کے ننھی سی جان پر ہیں

نغمے اسیرِ طفلی اور دہان پان پر ہیں
زنداں میں سو جفائیں مجھ ناتوان پر ہیں

پابند قید غم ہیں اک سلسلے میں دونوں
فریاد میں جرس کی اک قافلے ہیں دونوں

پتلا میں غم کا ہوں تو تصویر ہی محن کی
ارماں مجھے وطن کا حسرت تجھے چمن کی

حسرت بھری صدا ہی مجھ زار و خستہ تن کی
لے غم فزا ہی تیری فریاد جاں شکن کی

قیدِ جفا میں تو - میں زنداں میں میہماں ہوں
تو نالہ گوش ہی - میں منت کشِ فغاں ہوں

پنجرے میں آہ! تو ہے سرگرم نوحہ خوانی
جھڑتے شرر ہیں منہ سے اف رے تپِ نہانی

زنداں میں تلخ میری ہی! آہ زندگانی
زنجیر کی صدا ہی - اور غم کی ہے کہانی

مہجور آہ! تو ہے مرغانِ نغمہ خواں سے
اور میں بچھڑ گیا ہوں یارانِ خوش بیاں سے

محوِ خیالِ گل تو - میں محوِ دستاں ہوں
فرقت نصیب تو - میں بے یار و خانماں ہوں

تو مرغِ خستہ جاں ہے میں زار و ناتواں ہوں　　　تو آہ! مشت پر ہے میں مشت استخواں ہوں

بیچین کر رہی ہے خواہش تجھے چمن کی

اور خوں رُلا رہی ہے حسرت مجھے وطن کی

کب تک زباں پہ شکوے صیاد و آسماں کے　　　کب تک جگر پہ چرکے تیغِ غمِ نہاں کے

تپتے دل و جگر ہیں پہلو میں سوزِ جاں کے　　　شعلے بھڑک رہے ہیں آہِ شرر فشاں کے

دونوں کو پھونک دے اے! موجِ شرارِ ہستی

قیدِ جفا میں آخر کب تک فشارِ ہستی

زنداں میں آ بنی ہے دونوں کی آہ! جاں پر　　　خستہ ہیں بال میرے۔ اور تیرے ناتواں پر

فریاد شامِ غم میں دونوں کی ہے زباں پر　　　پھینکیں کمندِ نالہ آ! مل کے آسماں پر

زندانیوں پہ شاید کچھ لطف کی نظر ہو

حدّاد کو خبر ہو۔ صیّاد پر اثر ہو

حُبِ وطن کے نغمے گاؤں میں پھر وطن میں　　　چھیڑوں نئے ترانے یاروں کی انجمن میں

اِک عمر آہ! گزری قیدِ غم و محن میں　　　آزاد ہیں وطن میں تو شاد ہو چمن میں

محوِ نثارِ گل ہو تو شاخِ آشیاں پر

ہوں الفتِ وطن کے نغمے مری زباں پر

سرور۔ جہاں آبادی

تازہ غزلیں

عشق سے عشق محبت سے محبت مجھکو / اسقدر ذوق بلا شوق مصیبت مجھکو

تا بہ کے حسرتِ وصل اور غم فرقت مجھکو / اپنی ہستی سے کسیطرح ہو غفلت مجھکو

میں گنہگار مگر حسرتِ دیدار نہ پوچھ / جلوہ تیرا ہو تو دوزخ بھی ہے جنت مجھکو

وہ نہ بے باکیوں سے خوش نہ ہوسناکی سے / ہو گئے غیر کے اعمال نصیحت مجھکو

کوچۂ یار سے کوئی بھی نکلسکتا ہے / اپنے اوہام ہوئے وادیٔ غیرت مجھکو

کیا خبر تھی کہ انہیں کے ہیں کرشمے سارے / شکوۂ غیر کی ہے اسنے ندامت مجھکو

بے حجابی کبھی ممکن نہیں جبتک میں ہوں / خلل انداز ہوں کر دیجئے رخصت مجھکو

ابتو دیدار دکھا دیجئے تقصیر معاف / ہو گیا وعدۂ فردا ہی قیامت مجھکو

کیوں نہوں خاکِ درِ یار کہ پھر خاک نہو / آسی اپنی بھی نہیں خاک محبت مجھکو

آسی

ہو کسطرح فریبِ نظر ما سوا مجھے / دی ہے خدا نے چشم حقیقت نما مجھے

خوے ستم شعار سے آگاہ ہو گئے / دشمن بھی ابتو دینے لگے ہیں دعا مجھے

ظاہر ہیں گو بگاڑ بھی دل سے دوست ہے / منظور ہے محبت رنجش نما مجھے

میری ہی آنکھ نیچی ہے گویا کہ شرم سے / آتی ہے ذکر وصل عدو سے حیا مجھے

زلفیں سنوارتے ہوئے کیجئے معانقہ / لگجائے میری جان تمھاری بلا مجھے

گر سچ ہے یہ کہ غیر تھے تمکو بہت عزیز / تم غیر سے سوا ہو وہ تم سے سوا مجھے

جاتا ہوں ساتھ ساتھ مگر داغ داغ ہوں / لیجائے کوئے یار میں اب رہنما مجھے

گذرے گی کیونکہ چین سے اس عہد میں خدا — آتا نہیں ہے مکر و فریب و ریا مجھے

مشتاق درد قلب کا ہوتا ہے یاں علاج
محمود خاں[1] کی بزم ہے دار الشفا مجھے

مشتاق

ہمارے عنایت فرما سید حسن عابد صاحب جعفری یہ غزل عنایت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ "حسن اتفاق سے دیوان نشاط قلمی ہاتھ لگ گیا ہے۔ افسوس باوجود جستجو کے پورے حالات اس سخنور کے معلوم نہو سکے ارادہ ہے کہ دیوان موجودہ سے اقتباس کرکے ہدیۂ ناظرین کروں۔ بالفعل قسط اول میں ایک غزل کے چند اشعار ارسال ہیں۔"

ہم سید صاحب کی اس مہربانی کے ممنون ہیں۔ اور غزل کو شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں:-

یارب دعائے نیم شبی بے اثر نہ ہو — قصہ جو طول زلف کا ہے مختصر نہ ہو
یارب وہ دن ہو شام کا جسمیں اثر نہ ہو — اور رات وہ ہو پہلو میں جسکے سحر نہ ہو
افسانۂ درازی شبہائے اشتیاق — اتنا ہے طول جسکا کبھی مختصر نہ ہو
لڑتے ہیں دونوں دیدہ و دل فرط رشک سے — یارب کسیکی دونوں میں فتح و ظفر نہ ہو
ملک عدم میں اپنی رسائی محال ہے — جبتک کہ رہنما تری تاب کمر نہ ہو
کرتی ہے روح یہ نفس گرم سے صلاح — ایسے چلو یہاں سے کسیکو خبر نہ ہو
یہ خط شوق بال کبوتر میں باندھیو — رنگ پریدۂ رخ اگر نامہ بر نہ ہو
اے دل غریق رحمت رب قدیر ہو — ابر اشکبار ہو تری مژگاں بھی تر نہ ہو
غم ہے نشاط دہر میں منظور کیجئے — سم کھائیے نصیب جو تنگ شکر نہ ہو

---

[1] والد جد صاحب حکیم محمود خاں صاحب مرحوم کے جلیس تھے اور انہیں کے دیوانخانہ میں بیٹھا کرتے تھے

چند دلال

پرتو حسن تو در آئینہ تا افتادہ است | شور ما و من بہ بزم ما سوا افتادہ است

آئینہ در ورطہ از جوش صفا افتادہ است | طبع روشن ہر کہ میدارد ز پا افتادہ است

کوچۂ زلف و شب دیجور رہ تاریک و تار | دل بیفتاد و نمیدانم کجا افتادہ است

شکوہا دارم از انداز گران جانی خویش | ہست چوں سنگے کہ در راہ فنا افتادہ است

سایہ بر خورشید افتادہ است از زلف سیاہ | شعلہ در آئینہ از رنگ حنا افتادہ است

می دہد جام فنا بر کف صلا ضحاک دہر | دور جم آخر شد و نوبت بما افتادہ است

ناروائی ہست آذین دکان اہل فن | نقد معنی چوں متاع ناروا افتادہ است

کہکشاں با کج روی تا آسمانہا برکشید
بر زمیں چوں نظم خط استوا افتادہ است

سید علی حیدر نظم طباطبائی

دن رات بھگوئیں دامن کو اور اشکوں سے کیا ہونا ہے۔
ہر شام و سحر شبنم کی طرح بیکار ہمارا رونا ہے
سب چہچہے تھے وہ گلشن تک جب دن سے چمن چھوٹا ہمسے
سب نغمہ سرائی بھول گئے یاد ایک نفس کا کونا ہے
صرف آب وضو سے دلکی سیاہی دور نہ ہوگی اے زاہد
کچھ آنکھوں سے بھی اشک بہا یہ داغ جو تجھکو دھونا ہے
مجھسے کچھ احباب نہ پوچھیں حاصل اسکی محبت کا
یوں سمجھیں وہ اک شور زمیں میں تخم وفا کا بونا ہے
آجائے جہاں کچھ ذکر مرا کیوں وہ نہ وہاں سے اٹھ جائیں
کس طرح مخاطب ہو کے سنیں بدنام انھیں کیا ہونا ہے
یہ حسن و جوانی جب تک ہے مل اپنے چاہنے والے سے

نادان یہ ہے بہتا دریا تو دہو لے ہاتہہ جو دہونا ہے
کیا تم ہیں دھرا ہے جسکے لیئے سب اپنے پرائے چھوڑ دیں وہ
جو چاہتے تم ہو حفیظ کبھی ممکن نہیں ایسا ہونا ہے۔ (حفیظ)

درِ دلدار سے کیا خاک ای بادِ صبا لائی
ہمارے واسطے اکسیر لائی کیمیا لائی

میسر جب نہ کوئی کامرانی شادمانی ہے
ہمیں کسواسطے دنیا میں عمرِ بے وفا لائی

عدو سے آج وہ باتوں ہی باتوں میں لگ بیٹھی
یہ مژدہ کوچۂ دلدار سے بادِ صبا لائی

عدو کی گھر سے آکر بات سیدھے منہ نہیں کرتے
خدا جانے مری تقدیر تمکو کیا سکھا لائی

تعجب ہے تمہارے کان پر جوں بھی نہیں چلتی
مری جب آہ نکلی گور کے مردے جگا لائی

دلِ آشفتہ کو آشفتہ تر گیسو نے کر ڈالا
میری جانِ حزیں پر قہر چشمِ سرمہ سا لائی

تمہیں تشبیہ دینی حورِ جنت سے حماقت ہے
کہاں سے حورِ جنت یہ بہلا ناز و ادا لائی

بڑے آرام سے آج اسکو مرقد میں سلایا ہے
ترے بیمارِ الفت کی اجل خدمت بجا لائی

فراقِ بے نوا کو پا پیادہ شہر دہلی سے
نجف تک تیری امیدِ کرم شیرِ خدا لائی (فراق)

شہرے ترے عام ہو رہے ہیں
مر جانے کے کام ہو رہے ہیں

درباں کی خوشامدیں ہیں منظور
جھک جھک کے سلام ہو رہے ہیں

مت جاؤ کہ نزع کا ہے عالم
سب قصہ تمام ہو رہے ہیں

وہ غیر سے کر رہے ہیں باتیں
ہم ہیں کہ تمام ہو رہے ہیں

ہے رشکِ عدو سے زندگی ضیق
سب عیش حرام ہو رہے ہیں

مرنا تو ہمارا ہے یقینی
جینے میں کلام ہو رہے ہیں

آئے شبِ وعدہ اور افسوس
رخصت سرِ شام ہو رہے ہیں (افسوس)

مخزن

سیپ کا گھر

انگلستان کے ساحل بحر کے مشہور قابل سیر مقامات میں ایک مارگیٹ نامی ہے جسمیں یہ تہ خانہ واقع ہے جس کی سب دیواریں سیپ کے بنے ہوئے بیل بوٹوں سے آراستہ ہیں۔ اُن میں سے ایک دیوار کی تصویر بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ جس خوبی سے اس تہ خانہ کے غیر معلوم صناع نے دیوار و دالان پر سیپ اور گھونگے جوڑ جوڑ کر نقش و نگار پیدا کیے ہیں۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ نہ تصویر سے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے اور نہ الفاظ اس کا نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ اوائل سنہ ۱۹۰۶ء میں انگلستان سے رخصت ہونیسے پہلے مجھے اس تہ خانہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ صنعت کے اعتبار سے تو یہ سیپ کا گھر بہرحال دلچسپ ہوتا۔ مگر جو چیز مجھے خصوصیت سے دلچسپ معلوم ہوئی۔ وہ اس کی مشرقیت تھی۔ اِس کی بنا کی ابتدا کے متعلق

مختلف روایات ہیں۔ اور اُن سب کا مختصر ذکر میں کروں گا۔ لیکن مجھے اُن میں سے کوئی اطمینان دہ نہیں معلوم ہوتی۔ جن انگریزوں نے اِس تہ خانہ کے حالات لکھے ہیں وہ بھی اِس قدر تو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تہ خانہ اسرار سے خالی نہیں اور اس کی نسبت جو کچھ معلوم ہے اُس سے زیادہ ابھی دریافت کرنے کو باقی ہے۔ تاہم یہ کسی نے صاف طور پر نہیں لکھا کہ اسے دیکھکر یہ خیال غیر اغلب نہیں معلوم ہوتا کہ کسی زمانہ میں کسی ایشیائی دستکار کے ہاتھوں سے اِن دیواروں کی آرائش ہوئی ہو تو تعجب نہیں اور اِس قیاس کے صحیح ثابت ہونے سے ممکن ہے کہ اب سے چند صدی پیشتر کے تعلقاتِ انگلستان اور ایشیا کا کچھ پتہ چلے۔ سب سے بڑی خصوصیت اِس تہ خانہ کے گل بوٹوں کی جو اسے انگلستان کے اور تہ خانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ بلکہ یورپ کے بعض مشہور تہ خانوں سے بھی جدا رنگ میں دکھاتی ہے۔ وہ سورج مکھی پھول ہیں۔ جو جا بجا اِس کے در و دیوار کی زینت ہیں۔ اور سورج مکھی پھول کو جو تعلق ایشیائی تخیل سے اور ایشیائی مذاہب سے ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ اور یورپ کی اقوام قدیم و جدید کو وہ خصوصیت سورج مکھی سے حاصل نہیں۔

سیپ کے اِس عجیب و غریب گھر کی بنا کی بابت روایات مختلفہ بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں جو اور تہ خانہ تاریخی اعتبار سے کم و بیش شہرت رکھتے ہیں۔ اُن کا تھوڑا سا تذکرہ کر دیا جائے۔ ایک تہ خانہ مقام ٹوِکنہم کے قریب واقع ہے۔ جسے مشہور انگریزی شاعر الگزانڈر پوپ نے بنایا تھا۔ پوپ ایک نیا باغ بنا رہا تھا اور اسے اپنے پُرانے باغ سے ملانے کے لیے اس نے ایک زیر زمین

راستہ اور اسی کے ساتھ ایک تہ خانہ بنایا جس پر اسے بہت ناز تھا۔ اُس نے ۱۷۲۵ء میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں اپنے تہ خانہ کی تعریف لکھی۔ اور اسے یہ بتایا کہ میں نے اسے بہت سادہ وضع میں گھونگوں سے سجایا ہے۔ امتداد زمانہ سے پوپ کا یہ تہ خانہ بوسیدہ ہو گیا ہے۔ مگر اب تک موجود ہے اور لوگ اسے دیکھنے جاتے ہیں اٹھارھویں صدی کی ساخت کے دو اور تہ خانے ہیں جو پوپ کے تہ خانہ کے بعد بنے ہیں۔ ان میں سے ایک مقام وسے برج کے پاس ہے جو ایک وقت میں شاہی عیش گاہ تھا۔ اور رات کو بادشاہ وہاں جا کر دادِ عیش و تفریح دیا کرتے تھے۔ ڈیوک آف نیوکاسل نے اسے بنوایا تھا اور کہا جاتا ہے کہ چھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔

دوسرا او میلڈن ہوس کہلاتا ہے۔ گر وہ نہ اتنا بڑا ہے نہ خوبصورت

اس کے بعد ۱۷۶۳ء میں جان سکاٹ نامی شاعر نے اپنے باغ میں مقام ویر کے قریب ایک تہ خانہ بنایا جو اب تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کو بھی اس نے سیپ اور گھونگھے سے سجایا تھا اس میں سات کمرے ہیں۔ برسوں اپنے اوقات فرصت میں سفید پتھر کی چٹانوں کی خاراشگافی کیا کرتا تھا اور اس تہ خانہ کے لیے جگہ بناتا تھا ڈاکٹر جانسن جیسے شخص کو بھی جو عموماً خوبصورت چیزوں کی شناخت سے بے بہرہ تھا۔ یہ باغ اور تہ خانہ پسند آیا تھا اور اس نے ایک موقعہ پر یہ کہا کہ سوائے کسی شاعر کے کوئی ایسا باغ نہیں بنا سکتا تھا۔

مارگیٹ کا تہ خانہ ان سب تہ خانوں سے زیادہ خوبصورت اور پراسرار ہے۔ اسکی بنا کی ٹھیک تاریخ تو کسی کو معلوم نہیں۔ اس کے دریافت کا

ذکر ۱۸۳۸ء کے ایک اخبار مورخہ ۷ اگست میں مندرجہ ذیل الفاظ میں درج ہے :-

"مارگیٹ میں ایک وسیع تہ خانہ دریافت ہوا ہے۔ جو پہاڑی کے نیچے دور تک چلا گیا ہے۔ اس میں راستے بنے ہوئے ہیں اور راستوں کی دونوں طرفیں سیپ سے آراستہ ہیں جنہیں طرح طرح کی خوبصورت بیلیں بنی ہوئی ہیں۔ جو بلاشبہ بڑی محنت سے مشعل کی روشنی میں بنائی گئی ہیں۔ یہ جگہ اتفاقیہ طور پر دریافت ہوگئی ہے۔ جس زمین میں یہ تہ خانہ نکلا ہے اس کا مالک کسی ضرورت سے زمین کھدوا رہا تھا۔ کہ یہ تہ خانہ نظر آگیا"

یہی بیان مستند معلوم ہوتا ہے۔ باقی سب کہانیاں ہیں۔ کوئی تحقیق بات نہیں۔ تاہم جو روایات مروج ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ انگلستان کے قدیم باشندوں کا (جو ڈروئڈ کہلاتے تھے) ایک مندر تھا۔ یہ کسی پرانے زمانے کے بادشاہ کا مقبرہ تھا۔ رومن زمانہ کی یادگار ہے اور اہل روما نے اپنے عہد میں مردوں کے دفن کرنے کے لیے بنایا تھا۔ قدیم ایران کے ایک دیوتا کا مندر تھا۔ پرانے زمانے کے راہبوں کا مسکن تھا۔ ان روایات کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات اس کی نسبت عوام میں مشہور ہیں کوئی کہتا ہے کہ یہ چونے کا بھٹہ تھا جس میں کسی نے بعد کو سیپ جڑ لی۔ دوسرا بتاتا ہے کہ کسی قزاق کا گھر تھا جس میں وہ چھپا رہتا تھا۔ اسی طرح اس کے دریافت ہونے کے متعلق مختلف کہانیاں ہیں۔ بعض کہتے ہیں اتفاق سے ایک اوزار ایک سوراخ میں گرا

اور گم ہو گیا۔ اس کو تلاش کرتے کرتے یہ تہ خانہ مل گیا۔ کوئی کہتا ہے۔ کوئی بلی کسی راستے سے اس کے اندر گھس گئی تھی۔ جب اسے نکلنے کی راہ نہ ملی اور اس نے دردناک آواز سے میاؤں۔ میاؤں۔ شروع کی جس کا مدعا یہ تھا کہ کوئی اسے نکالے تو اس کی آواز سے اس تہ خانے کا پتہ چلا۔ اسی طرح اس کے بنانے والے کی بابت کئی روایتیں ہیں بعض کے نزدیک ایک سیاح نے اسے بنایا جو الحمرا کو دیکھ کر آیا تھا۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ اس نواح کے ایک مشہور معلم نے اسے بنوایا۔ اور وہ لڑکوں کو سزا کے طور پر اس کے اندر بند کر رکھتا تھا۔ یہ سب باتیں بناوٹی اور غیر محقق ہیں۔ وثوق سے جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ اسی قدر ہے کہ جس کسی نے بنایا ہے اس نے نہایت درجہ کی محنت اور نہایت درجہ کی کاریگری اس کے بنانے میں صرف کی ہے۔ ایسا سادہ مسالہ۔ اور اس پر ایسی خوبصورت گلکاری۔ اور ایسی حالت میں کہ کام زیر زمین اندھیرے میں صرف چراغ یا مشعل کی روشنی سے کرنا پڑے۔ صبر و تحمل قابل داد اور شوق قابل تحسین ہے۔

جس دن سے دریافت ہوا ہے۔ عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے اور جو لوگ مارگیٹ جاتے ہیں وہ اکثر اسے دیکھے بغیر نہیں آتے۔ دروازہ پر چھ پنس دے کر ایک ٹکٹ لینا ہوتا ہے۔ جسے دکھا کر اندر جاتے ہیں۔ دیکھنے والے جس راستے سے داخل ہوتے ہیں وہ کوئی چار فیٹ چوڑا ہے۔ گاس کے دھوئیں سے اور آمد و رفت کی کثرت سے اس راستہ کی چھت کالی اور دیواریں میلی ہو رہی ہیں۔ یہ راستہ کسی قدر پیچ کھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک محراب تک پہنچتے ہیں۔

اِس کے اندر قدم رکھتے ہی سیپ سے آراستہ در و دیوار کی ایک بھول بھلیاں سی پیش نظر ہوتی ہے۔ اور آدمی کو متحیر کر دیتی ہے محرابوں کی صورت چودہویں صدی عیسوی کی تعمیر پر دلالت کرتی ہے۔ سیپ جوڑ جوڑ کر سورج مکھی کے پھولوں کی صورت جا بجا پیدا کی گئی ہے۔ ایک آدھ جگہ کھجور کی شاخ بنی ہے جو اہل روما کے مقبروں میں نظر آتی ہے۔ ایک اور موقع پر ایک نہایت خوبصورت گل سوسن بنا ہے جو اوپر جاکر گل نیلوفر کی صورت بن گیا ہے۔ یہ گل سوسن اور گل نیلوفر کا ملاپ مشرق کے علوم باطنی کے ماہروں کے نزدیک خاص معانی رکھتا ہے جس سے اہل مغرب عموماً بے خبر ہیں۔ کبھی کوئی اِن پھولوں کے معانی جاننے والا وہاں پہنچے گا تو بتا سکے گا۔ کہ یہ نقش جن کی خوبصورتی کی تعریف ہر کہ و مہ کرتا ہے۔ محض خوبصورت ہی نہیں بلکہ خاص معانی رکھتے ہیں۔ بعض حصے بزنطینی نقش و نگار کے نمونہ پر ہیں۔ غرض جو کچھ بھی ہو اس کی دستکاری انگلستان کے باقی تہ خانوں کی دستکاری سے جدا ہے اور بہت سے قرائن مشرقی دستکاری ہونے کے اِس میں موجود ہیں۔ پھولوں کے علاوہ ستاروں کی شکلیں بھی اِس تہ خانہ کے در و دیوار پر بنی ہیں جس سے اِس خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے کہ کسی ایسی جماعت کی ساخت ہم دیکھ رہے ہیں جو نجوم قدیم سے واقف تھی اور اِس تعمیر میں اپنے عقائد کا اظہار کر رہی تھی۔ ایک اور بات اِس نقش و نگار میں قابل ذکر ہے۔ کہ سارے تہ خانے میں کہیں صلیب کا نشان نہیں ہے۔ جس سے اِس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کہ ممکن ہے

یہ تہ خانہ انگلستان میں عیسوی مذہب کے رواج پانے سے پہلے بنا ہو یا عیسوی عہد میں کسی ایسی قوم کے افراد نے بنایا ہو جو مذہب عیسوی کے معتقد نہ تھے ورنہ ایک آدہ نشان صلیب تبرکاً ہی موجود ہوتا +

اگر کبھی اِس تہ خانہ کی بنا کی اصلیت منکشف ہوئی اور یہ مضمون قیاسات کی حد سے نکل کر یقین کے درجہ کو پہنچا - تو امید کیجا سکتی ہے - کہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ سیپ کا خوبصورت گھر انگلستان میں اہل مشرق کی صنعت کی یادگار ہے اور قدیم زمانہ میں بھی مشرق و مغرب کے ممالک کے درمیان آمدورفت بہت کچھ جاری تھی -

عبدالقادر

فلاحتہ النخل یہ قابل قدر کتاب نواب عزیز جنگ بہادر کی اکیسویں تالیف ہے جسمیں درخت کھجور کے تاریخی حالات تحقیق کیمیائی امراض و علاج پر نہایت مفصل بحث کی ہے - امید ہے کہ لایق مولف کی یہ محنت ملک میں قدرو قعت سے دیکھی جائے گی - لکھائی چھپائی قابل اطمینان قیمت مجلد سے ؏ بلا جلد ؏ مؤلف سے عزیز باغ سلطان پورہ - حیدرآباد دکن سے مل سکتے ہے -

سیر شملہ پنڈت ٹھاکر دت صاحب شرما نے اس کتاب میں شملہ کے مفصل حالات اِس غرض سے تحریر فرمائے ہیں کہ نو وارد لوگوں کو سفر و زمانہ قیام میں بہت کچھ مدد دے - کتاب بحیثیت مجموعی خاصی ہے اور چند ہدایتیں جو درج ہیں مفید معلوم ہوتی ہیں قیمت ۲ عہ - مصنف سے وش ایکارڈ اوشد ہالیہ لاہور کے پتہ سے ملتی ہے

دلچسپ تحقیق

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جان عالم ہندوستان کے پہلے بادشاہ ہیں جنہوں نے شاعری میں کسی کی شاگردی قبول کرنا ننگ سمجھا لیکن میں نے مولوی سید علی حیدر صاحب نظم کی زبانی (جو دربار شاہی کے خاص ملازم اور شاہزادوں کے معلم رہ چکے ہیں) سنا ہے کہ بادشاہ فتح الدولہ برق کے شاگرد تھے۔ ناسخ کے طرفدار۔ آتش کی غزلوں کے جواب میں غزلیں کہا کرتے تھے کہا جاتا ہے کہ نواب معشوق محل۔ نشاط محل۔ اختر محل۔ شاعرہ تھیں۔ حالانکہ ان کا ایک شعر نہ سنا گیا۔ اور ان محلات کا نام نہ لیا گیا جو بے شک شاعرہ تھیں یعنی نواب محبوب و صدر محل جنہوں نے نظم کی لڑیوں میں موتی پروئے ہیں۔ اور ان کے دیوان طبع بھی ہو چکے ہیں انمیں سے اول الذکر منشی مظفر علی اسیر کی و ثانی الذکر گلشن الدولہ بہار کی شاگرد تھیں۔ اور ان بیگم صاحبہ نے تو اکثر کیا بہت اشعار بادشاہ کی مدح یا عشق میں کہے ہیں۔ نواب محبوب محل تو نوحے بھی کہتی تھیں۔ اور فن موسیقی سے بھی ماہر تھیں۔

نواب اختر محل شاعرہ تو نہ تھیں مگر فن شعر کا مذاق سلیم رکھتی تھیں ایکدن کا ذکر ہے کہ شہزادہ مرزا سلیمان جاہ انجم۔ (جنکا دیوان مطبع نولکشور میں طبع ہو چکا ہے اور مولوی نظم صاحب کے شاگرد تھے) ان کی نسبت مولوی صاحب یقینا فرماتے تھے کہ وقت اصلاح میں صرف اسقدر کا خیال رکھتا تھا کہ کوئی واضح غلطی نہ رہے) نواب اختر محل کے سلام کیلئے گئے۔ بیگم نے فرمائش کی کہ کوئی غزل کہی ہو تو گاؤ۔ شہزادے کے پاس اسوقت ہاں کی طرح۔ مہماں کی طرح کے قافیہ ردیف والی غزل موجود تھی جو انہوں نے تازہ کہی تھی۔ اسکو جیب سے نکال کر وہ گانے لگے جب اس شعر پر پہونچے

دم مرا نکلا ترے وعدے کے ساتھ تیری گھبرائی ہوئی ہاں کی طرح

تو بیگم نے سنکر فرمایا۔ کیا اس نے گھبرا کے کہا تھا کہ ہاں پھر فرمایا یوں پڑھیے (تیری شرمائی ہوئی ہاں کی طرح) مولانا نظم فرماتے تھے کہ اس کے بعد شاہزادے جب مجھ سے ملے تو کہنے لگے حضرت آپنے ہماری۔ ہاں کی طرح۔ والی غزل دیکھ لی تھی آج امّی جان کو میں نے وہ غزل سنائی تو انہوں نے اصلاح دیدی اور مجھے شرمندہ

شیخ علی حزین

گذشتہ اشاعت سے آگے

خونش بہ تیغ حسرت یارب حلال بادا — صیدے کہ از کمندت آزاد رفتہ باشد
شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی — گو مشتِ خاک جانم برباد رفتہ باشد

دوسرا شعر زبان زد عام ہے رشک کا مضمون شاید ہی کسی شاعر نے اس سے بہتر باندھا ہو۔

زبان گر مکنفیں خامش کنم دل می کند یادت — گر از یادت دمے غافل شوم از دل زبان بجہد

بیرحم ترست غمزہ امروز — گویا رحمش بجا لم آمد

نزاکت معنی ستائش طلب ہے۔

زبیقراری ہجراں رسد نوید وصالم — در امید بود دیدہ کہ خواب ندارد

مبادا رو کسے زان قبلۂ ابرو بگرداند — کہ کافر میشود از قبلہ ہر کس رو بگرداند

مطلع برجستگی قافیہ کی وجہ سے بہت دلنشین نظر آتا ہے۔ اسی زمین میں یا کسی اور شاعر کا ایک مطلع ہے وہ بھی خوب ہے ؎

نمی گویم کہ آتش رنگ یا گل بو بگرداند — الٰہی آن گلِ آتش طبیعت خو بگرداند

حزیں کا قافیہ "خو" کا ملاحظہ ہو ؎

بزعمِ عاشقاں تاکے کند یا بوالہوس گرمے | الٰہی خوی او را عشق آتش خو بگرداند
دریں وادی بحسرت مردم و چشم از صبا دارم | کہ گردم را بگرد کعبۂ آن کو بگرداند
حزیں افسردۂ آہنگ گلزار محبت کن | مزاج شعلہ را آب و ہوائے او بگرداند

مُزدِ تر دستئ فرہاد رسید آخر کار | بازوی تیشہ بفریاد رسید آخر کار

مضمون نازک ہے اور دوسرا مصرعہ خصوصاً بہت نفیس ہے۔ میرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمتہ کا ایک شعر اسی قبیل کا ہے ؎

ہنر در کار باید عشق را چوں پا بسنگ آمد | دریں رہ تیشہ باید کہ دست کوہکن گیرد

عشق آشنا شد شمع طبع[1] ہوا خواہش نگر | دارد سری با سوختن شکلش ببیں آہش نگر
زلف کد امیں مہ جبیں دارد گرفتارش چنیں | ہنیا بی شامش ببیں آہ سحر گاہش نگر

غالب کے دو شعر اس زمین میں ملاحظہ ہوں ؎

برتے کہ جاں ہا سوختی دل از جفایش بیں | شوخی کہ خوں ہا ریختی دست از حنا پاکش نگر
با خوبی چشم و دلش با گرمئ آب و گلش | چشم گہر بارش ببیں آہ شرر ناکش نگر

مولانا نظیری نیشاپوری کا مطلع قابلِ دید ہے۔ فرماتے ہیں ؎

چشمش پریشاں میرود مژگان نمناکش نگر | در سینہ دارد آتشی پیراہن چاکش نگر

چہ لذت بود از قاتل حزینِ نیم بسمل را | کہ در خوں می تپید و آفریں میگفت بر دستش

غالب کا شعر شیخ کے شعر سے دست و گریباں ہے ؎

---

[1] یعنی معشوق من ۱۲

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

بحل کردم اگر خونِ من از بیگانگی ریزی
کہ پاس آشنائی بر تو دشوار است میدانم

بانیک شیوہ دل آسلی نیتواں کردن
ترحم گر نخواہی کرد گوشے کن بفریادم

دل دادہ پیامے کہ زباں محرم آن نیست
خواہد بتو گفتن لب خاموش نگاہم

در بساطِ من دلدادہ دیدار پرست
دیدہ بود کہ بر روئے تو حیراں کردم
گبر دیرینہ عشقم چہ شد ار قدرم نیست
عمرہا خدمت آں آتش سوزاں کردم

عمر رفت و سفر عشق بآخر نرسید
گریہ آغاز بناکامی انجام کنیم

مولانا نظیری فرماتے ہیں ؎

فریاد کہ طے گشت رہ عمر نظیری
این جان الم دیدہ بجانان نرسیدہ

بسکہ سودیم در آزادی از افسوس بہم
ہست بالے کہ نثار قدمِ دام کنیم

دیروز حزیں از مئے وصلش دل و جاں سوخت
امروز ز محرومی دیدار خرابم

یعنی بالفاظ دیگر ؎

دوگونہ رنج و عذابست جانِ مجنوں را
بلائے صحبت لیلی و فرقت لیلے

بگزار ریزد آزادیش خون | صیدے کہ آموخت از دام جستن
در راہ عشقت کار حزین است | از خویش رفتن بیخود نشستن۔

چہ خوش است با خیال تو نہفتہ راز کردن | بزبان بیزبانی سر شکوہ باز کردن

یہ زمین بھی استادوں کی ہے۔ شانی تکلو کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

چہ خوش است با دو زلفت سر شکوہ باز کردن | گلہ ہائے روز ہجراں لشب دراز کردن

مولانا نظیری کا مطلع ہے ؎

چہ خوش است از دو یکدل سر حرف باز کردن | سخن گزشتہ گفتن گلہ را دراز کردن

غالب کا مطلع ہے ؎

تو اگر بجد گرفتی ز من احتراز کردن | نتواں گرفت از من بگزشتہ ناز کردن

شیخ فرماتے ہیں ؎

بنود بہار وشے را بر خار خشک فرقے | دم عیش اندانم ز غم امتیاز کردن

امتیاز کا قافیہ مولانا نظیری کا حصہ ہے۔ کہتے ہیں ؎

بجہان گرفتہ جا بمیان جان شیریں | کہ تواں ترا و جاں را ز ہم امتیاز کردن

اور مقطع نظیری کا تو مشہور ہے ؎

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری | بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

خسرو کا احتراز کا قافیہ بھی خوب بندھا ہے ؎

بجفات دل نہادم بکن انچہ میتوانی | چہ کنم نمے توانم ز تو احتراز کردن

تا چند حزیں بدشت گردی | اے خانہ خراب خانہ ات کو

کو قدر غم پروردگی کو مزد دیرین بندگی لطفے کہ با من کردہٴ باگبر و ترسا کردہٴ

ز عاشق شکوہٴ جز مہر ورزیدن نمی دانی! عبث رنجیدہٴ اسباب رنجیدن نمی دانی!

ہجر در دامن دل ریختہ خار عجبے گلبن حسرت ما کردہ بہار عجبے

ترسم رود ز یاد تو یکبارہ نام ما ازکین ما مکن دل نامہرباں تہی

کہتا ہے کہ مجھ سے تجھکو محبت تو کیسی کچھہ ہے ہاں تھوڑی سی عداوت ضرور ہے سو خدا کے واسطے اِس عداوت کو ترک نکر مجھکو اندیشہ ہے کہ میرا خیال بالکل تیرے دل سے نکل جائے گا۔ اِسی قبیل کا مضمون غالب کے ہاں بھی بندھا ہے۔ ؏

عرصہ بر الفت اغیار چہ تنگ آمدہ است خوش فرو رفتہ بطبع تو خوشا کینہٴ ما

یعنی خوش ہوں کہ تیرے دل میں میری طرف سے کینہ یہاں تک ہے کہ الفت اغیار کی بھی گنجائش نہیں رہی۔

حزیں ازمردم بیغم دل افسردہٴ دارم بقربان سرے گردم کہ دارد شور سودائے

نگذاشت مے بہوشم از نالہٴ رسائے بیگانہ ام ز خود کرد آواز آشنائے

مست کر دینے والا شعر ہے۔

دامن کشاں گزر کر دیار راز سر مزارم لئے نالہ ہائے ہوئے اے گریہ ہائے ہائے

میگر فتیم بجانان سر راہے گاہے — اُو ہم از لطف نہان داشت نگاہی گاہے

یہ شعر اُس غزل کا ہے جو غالباً شیخ نے ہند میں کہی تھی اور جسکا چرچا ہر طرف تھا۔ اکثر شعرائے ریختہ گو نے اُردو غزلیں اسی زمین میں کہی ہیں چنانچہ جرأت کا مطلع مشہور ہے ؎

سرسری اُنسے ملاقات ہے گاہی گاہے — بزم اغیار میں گاہے سر راہے گاہے

سخت آزردہ ام از خاطر افسردہ خزیں — کاش اگر عشق نبودے ہَوسے داشتمے

سر برہمن ندارد دل بیوفاش نازم — صنمے کہ از دلم بُرد ہوسِ خدا پرستی

مولانا نظیری فرماتے ہیں ؎

کمر در خدمت عمر لیست می بندم چہ شوق قدم — برہمن می شدم گرانیمہ زنار مے لستم

نمی آموزمت منع از نگاہ دشمناں کردن — خدا ناکردہ می ترسم کہ چشم از دوستان بندی

یہ شعر پُر شور عاشقانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور عرفی کے مشہور شعر کے انداز پر ہے گو مضمون جدا ہے۔ شعر عرفی ؎

ز دیدار تو دلشاد اند باہم دوستان تو — ترا ہم شادماں خواہم چو روے دوستان بینی

من سر گشتہ دو راز کوی جانان ما کہ در زم — دل آنجا دلبر آنجا مطلب آنجا مدعا آنجا

دامن فشاند و شمع مزارم بیاد داشت — گویا ہماں شکایت عاشق بیاد داشت

نوازش از غم جاناں ز من غالب تہی کردن چو صاحب خانہ آید بایدم منزل کنم خالی

(۳) زور کلام کے نمونے

شیخ کی غزل میں زیادہ تر سوز وگداز ہوتا ہے اور اُس قسم کا زور کلام جیساکہ ظہوری عرفی طالب۔ اور غالب کے ہاں کثرت سے ہے۔ کم نظر آتا ہے۔ مگر پھر بھی مثالیں دکھائی دیتی ہیں اور خود شیخ کا سوز وگداز ہی ایک قسم کا زور کلام میں پیدا کردیتا ہے۔

بسر گسترده دارد ظل عالی خیل نازش را مخلّا بادیارب سایہ مژگان درازش را

مخلّا باد یعنی مبارک باد۔ کہتا ہے کہ خدا اُسکی مژہ درازکی عمر دراز کرے کیونکہ وہ اُس کے خیل ناز یعنی چشم عشوہ ساز پر جو کرشمہ وانداز کے لیے مخصوص ہے سایہ کیے ہے۔

صباح وصل تو کوتاہ قیامت انگیزم بسینہ حشر کنم داغہائے پنہاں را

درعشق دل از کوثر و رضواں چہ کشاید از دوست تسلّی نتواں گشت بہ اینہا

میرزا غالب فرماتے ہیں ؎

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

نگاہ ناز اُو فہمید راز سینہ جوشے را رساند آخر بجائے عشق فریاد خموشے را

"فریاد خموشی" قابل توجہ ہے۔

زہم گر بگسلد شیرازۂ دفتر بہاراں را ورق گرداندن برگ خزاں ہم دیدنی دارد

یعنی خزاں بھی لطف سے خالی نہیں ہے۔ غالب کا شعر ملاحظہ ہو ؂

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

زہر غم ہجر تو بجان کارگر افتاد اُمید وصالِ تو بعمر دگر افتاد

شیخ کا یہ مطلع زور میں برجستگی میں درد میں حسنِ بیان میں جسمیں کہئے بے مثال ہے۔ کسی کی طاقت نہیں کہ ایسا مطلع پھر اس زمین میں نکال سکے۔ اِس شعر کی خوبی کی اس سے بڑھکر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ خاقانیٔ ہند ملک الشعرا میر تقی نے اُسکو قابل تضمین سمجھا۔ فرماتے ہیں ؂

دوری ہی میں طاقت نہ رہی بات کی آخر روز ہی نہوئی رات ملاقات کی آخر
زہر غم ہجر تو بجاں کارگر افتاد اُمید وصال تو بعمر دگر افتاد

غرور ناز با کوہِ تحمل بر نمے آید بخود داری من سیل تغافل بر نمے آید

مضمون یہ ہے کہ وہ ہزار غرور کرے یا تغافل برتے بندے کا پاؤں نہیں لڑکھڑاتا۔

تا بے بسر زلف ز دو طرہ بخم دار اسباب پریشانیٔ ما دست بہم داد

برجستگیٔ قافیہ نے اِس شعر کو پُر زور بنا دیا ہے۔ ؂

بناقص فطرتاں بخشیدہ ام دنیا و عقبیٰ را گدائے کوئے عشقم ہمتِ مردانہ ٔ دارم
زجاناں میگریزم شوخِ استغنا تماشا کن! بہجراں می ستیزم خوئے بیباکانہ دارم

اِن دو شعروں میں اپنی طبیعت کی آزادی۔ اور بے پروائی

دکھائی ہے۔

دلِ نامہربانت کینۂ عاشق چرا دارد اگر رسم وفا عیب است، از عالم براندازم

از چارہ سازی دلِ خود عاجزم حزیں کارِ مرا بخود بگزار دخدائے من!

دریں قحط الرجال آوازہ دارد خاکِ خاموشاں بجز سنگ مزار امروز نبود صاحب نامے
یعنے لوگ چلے گئے اب اگر کہیں صاحب نام ہیں تو اِن کے مزاروں کے تختے ہیں جنپر اِن کے نام کندہ ہیں۔

سپند آتش خویشم کسے دوا چہ کند بہ بیقراریٔ من صبر بنوا چہ کند
حزیں سوختہ دل میٔ دہد بحسرت جاں زمانہ عہد شکن، یار بیوفا، چہ کند؟

حزیں از ہمت مردانہ دارد شرمسار یہا اگر دریا و کان در دامنِ سائل کنم خالی
یعنے اسقدر دے دینے پر بھی حوصلۂ داد و دہش باقی رہجاتا ہے۔ اپنی بلند ہمتی کیطرف اشارہ ہے۔

---

(۴) رنگین کلامی کی مثالیں

تا بادِ صبا بوی ترا در چمن آورد برداشتہ ہر شاخ گلے دست دعا را

راقم نے ریختے میں اِس مضمون کو یوں باندھا ہے ؎

وہ آئے صبح گلشن میں بہارِ جانفزا ہو کر اُٹھی بیساختہ ہر شاخِ گل دستِ دعا ہو کر

صبا می کرد قسمت گر رسد کوئی تو در گلشن　　گل از من بیشتر وا کرد آغوشِ تمنا را!

تہی دستیم ساقی ہمتے در کارے باید　　ز برق بادہ روشن ساز شامِ مینوائی را

دوسرا مصرعہ کسقدر رنگین واقع ہوا ہے۔

شلائیں گردش مستِ شراب آلودہ را ماند　　نگاہِ نازِ او مژگانِ خواب آلودہ را ماند

کتانِ طاقتم را پردہ داری میکند حسنش　　خطش در شامِ خط ماہ سحاب آلودہ را ماند

اللہ اللہ کیا رنگین بیانی ہے۔ کہتا ہے کہ میری طاقت تو کب کی پرواز ہوگئی ہوتی جس طرح مہتاب کے آگے کتاں کا نقشہ ہو جاتا ہے لیکن خود تیرا حسن میری حفاظت کرتا رہتا ہے۔ یعنی رخ تو تیرا مہتاب ہے مگر خط مانندِ سحاب اِس کے ضو کو روکے ہوئے ہے ورنہ میری ذات جو کتاں کی صفت رکھتی ہے فنا ہو جاتی۔ اِسی مضمون کا ایک شعر غالب کے ہاں ہے ؎

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے　　لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

یعنی جب تو اپنا جمال آئینہ میں دیکھتا ہے تو جوہر آئینہ تیرے سبزۂ خط سے طراوت کسب کرتا ہے۔ ورنہ غریب آئینہ کی بساط ہی کیا؟ تیرا جمال تو وہ ہے کہ ایک دم میں اُسکو پھونک دے۔

گرہ از بسکہ در دل گریۂ طوفان نسب دارم　　نفس در سینہ ام سیلِ شتاب آلودہ را ماند

"گریۂ طوفان نسب" شیخ کی ترکیب خاص ہے۔

اے روئے ترا موجِ عرق آئینہ سازے　　آئینہ ز عکس تو پریخانۂ نازے

یعنی عرق تیرے رُخ کو آئینہ بنائے ہوئے ہے۔ اور یہ تشبیہ نہایت

خوبصورت ہے کیونکہ آئینہ تابِ نفس سے عرق آلودہ ہو جاتا ہے۔ پھر شیخ فرماتے ہیں کہ یہ عرق آلودہ رخ و جبیں لیکر (جو خود آئینہ کی صورت ہے) جب تو آئینہ سامنے رکھہ لیتا ہے تو آئینہ گویا پریخانہ ناز ہو جاتا ہے۔ سوداؔ کا شعر ہے ؎

آئینہ خانے میں وہ جسوقت آن بیٹھے پھر جسطرف کو دیکھا جلوہ تھا اُن پری کا

شیخ کا شعر لطافت معنی میں سوداؔ کے شعر سے کہیں بڑھا ہوا ہے

---

(۵) لطافت و نزاکتِ معنی و معنی آفرینی

چند شعر شیخ کے دیوان سے ایسے درج کیے جاتے ہیں جو لطافت و نزاکت معنی یا معنی آفرینی کے نمونے ہیں۔ جب تک معنی آفرینی کی کوشش نہو شاعری عبث ہے اور جب معنی میں لطافت و نزاکت نہو تو شعر شعر نہیں ہے۔ بہت کم شعرا اس بات کا خیال رکھتے ہیں اور یہ بات بھی ایسی ہے کہ کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اِس کے لیے نہایت نازک طبیعت درکار ہے ؎

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

مرزا غالب کے فروغ کا باعث اُن کی معنی آفرینی ہے اُن کے کلام میں ہمکو وہ بات ملتی ہے جو اور کہیں نظر نہیں آتی۔ عرفیؔ۔ ظہوریؔ طالبؔ اعلیٰ درجے کے معنی آفریں گزرے ہیں اور لطافت معنی اُنکے کلام میں بیشتر پائی جاتی ہے۔ اب حزیںؔ کی معنی پروری ملاحظہ ہو۔

باشد رگِ ہر برگِ چمن دامِ ہوسہا رشک است بآزادیِ مرغانِ قفس ہا

یعنی آزادی میں گرفتاری ہے اور گرفتاری میں آزادی۔ شاعر

استعارے میں ادا کرتا ہے کہ ہر برگ گل بلبل کے لیئے چمن میں دام ہوس ہے مطلب یہ ہے کہ ہر ہر قدم پر غریب گرفتار ہوتی ہے۔ رشک آتا ہے تو مرغ گرفتار پر آتا ہے جو قید ہو کر غم سے آزاد ہے۔ حکیم مومن خان دھلوی فرماتے ہیں ؎

کہاں وہ عیشِ اسیری کہاں وہ امنِ قفس ہے بیمِ برق بلا روز آشیاں کے لیئے

حیرت ہم از تحمل دیدار عاجز است العارض تو آئینہ چشم پُر آب داشت

یعنے تیرا جمال تو عالم ہوشیاری میں کون دیکھ سکتا ہے حیران ہو کر رہجائیے تو بھی کام نہیں چلتا۔ آئینہ گو حیرت کے ساتھ تیرا نگراں ہوا تھا پھر بھی دیدار کی تاب نہ لایا اور عاجزی سے اسکی آنکھیں پُر آب ہوگئیں آنکھیں پُر آب ہو جانے سے اشارہ ہے آئینے کا نفس سے عرق آلودہ ہو جانا۔

تو آمدی و من از خویش منفعل ماندم نثار راہ تو جاں داشتم حیا نگذاشت

یعنے ارادہ تو تھا کہ تجھپر جان فدا کروں مگر شرم آنے لگی کہ یہ جان بھلا کس قابل ہے کہ تجھپر فدا کی جائے۔

دوش از برم چو رفتی آگہ نگشتم۔ آرے عمری و رفتن تو آواز پا ندارد

کیا اچھی تشبیہ دی ہے۔ کہتا ہے کہ تو جو کل میرے پہلو سے کھسک کر چلدیا تو مجھہ حواس باختہ کو خبر نہوئی اور ہوتی بھی کیونکر جب تو میری عمر ہے اور عمر کی رفتار آواز نہیں کہتی۔ (باقی آیندہ) رضا علی وحشت۔

حکیم بیاس

قدیم حکمار کے دلچسپ اور نتیجہ خیز حالات کا یہ سلسلہ جسے مولوی محمد خلیل الرحمن صاحب نے شروع کیا ہے۔ اور جس میں حکیم طالیس اور حکیم بتیا قوس کا بیان شائع ہو چکا ہے۔ سید عبداللہ آفندی مصری کی تاریخ الفلاسفہ سے لیا گیا ہے۔ اور سید عبداللہ کی کتاب اصل میں فرانسیسی زبان کی ایک مشہور کتاب کا ترجمہ ہے۔ مولوی محمد خلیل الرحمن صاحب جنھوں نے عربی سے یہ ترجمہ کر کے ہمیں دیا ہے تالیف و ترجمہ میں مہارت خاص رکھتے ہیں۔ ان کے تراجم میں تاریخ الخلفار سیوطی اور تالیفات میں تذکرہ نسبت نامہ قابل ذکر ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مضامین مقبول ہوں گے اور بالآخر انہیں جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت پڑے گی۔

یہ حکیم بتیا قوس کا ہم عصر تھا شاہ یلیاطس اور اکرسیوس کا اس نے زمانہ پایا تھا ❖

حکیم بیاس ممالک کاریا کے ایک چھوٹے سے شہر موسومہ ابریت کا رہنے والا تھا۔ تمام ملک یونان میں اِس حکیم نے بڑی شہرت پائی تھی جو اسکے مرنے تک قایم رہی۔ اپنے وطن کے بڑے آدمیوں میں سے تھا۔ تمام علوم میں اوسکو دخل تھا۔ صاحب تدبیر و ادیب تھا۔ باوجود اِس کے کہ متمول آدمی تھا مگر نہایت تنگی کے ساتھ عمر بسر کی کیونکہ اپنا بیشتر مال محتاجین وغیرہ بار کی امداد میں خرچ کر دیتا تھا۔ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا

خطیب تھا۔ فقرا و مساکین کا بڑا حامی تھا اور ہمیشہ صرف اس لیئے کہ وطن کی ناموری و شہرت قایم رہے۔ تاوقتیکہ کسی امر کے حق ہونے کا اوسکو یقین نہو وہ اُس میں دخل نہیں دیتا تھا۔ اور اسمیں ضرب المثل ہوگیا تھا۔

شہر مسینہ کے پاس لٹیروں نے کشتیاں لوٹ لیں۔ اور چند لڑکیاں گرفتار کر کے فروخت کرنے کو نکلے۔ حکیم بیاس نے منہ مانگی قیمت دے کر اون لڑکیوں کو خریدلیا اور اپنی اولاد سے زیادہ اُن کی خاطر و مدارات کی اور پھر کچھ تحفہ تحائف دے کر اُن کو اُن کے والدین کے پاس بھیج دیا۔ اس واقعہ نے حکیم بیاس کی شہرت کو اور بھی چار چاند لگا دیے اور ممالک روم میں بھی وہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اور باتفاق رائے لوگوں نے اُسکو امیر الحکمار کا خطاب دیا۔

ایک مدت کے بعد یہ اتفاق ہوا کہ شہر مسینہ کے مچھیروں نے ایک مچھلی پکڑی۔ اُسکے پیٹ میں سے ایک سونے کا بنا ہوا برتن نکلا جس پر لکھا ہوا تھا کہ یہ امانت اعظم الحکمار کو دی جائے شہر کے تمام قاضیوں نے اسمیں مشورہ کیا۔ اور مقدم الذکر لڑکیوں نے اپنے والدین سے کہا اس وقت سوا بیاس کے اور کوئی شخص اعظم الحکمار نہیں ہوسکتا۔ اور یہ برتن اُسی کا حق ہے۔ تمام نے اس رائے سے اتفاق کیا اور وہ برتن حکیم بیاس کے پاس بھیج دیا گیا۔ حکیم مذکور نے اُس برتن اور اُسکی تحریر کو پڑھ کر کہا کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ بلکہ اس کا مستحق اوبولون یعنے بت آفتاب ہے۔ کیونکہ وہی اعظم الحکمار ہے۔ بعض کا گمان ہے کہ یہ برتن وہی تین پایوں کی کرسی ہے جسکا مذکور حکیم طالیس کے حالات میں آچکا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ حکایت ہی اختراعی ہے خواہ تین پایوں کی کرسی ہو۔ یا

یا سونے کا برتن -

شاہ ہلیاطس والی شہر لودیا نے تمام یونان کے شہر جو بلاد ایشیا میں واقع ہیں خراب کر کے شہر بریانہ کا محاصرہ کیا۔ حکیم بیاس اُس وقت شہر مذکور میں قاضی القضاۃ تھا۔ مدتوں وہ بادشاہ کا مقابلہ کرتا رہا۔ لیکن شاہ ہلیاطس بھی اپنا مقصود حاصل کرنے پر اس درجہ مصمم تھا کہ اُس نے اپنی تمام کوشش اس شہر کے فتح کرنے پر خرچ کر دی۔ اور اہل شہر بھی قحط کیوجہ سے پریشان ہو گئے۔ انہوں نے یہ حیلہ کیا کہ دو خچروں کو خوب کھلایا پلایا اور اُنکو موٹا تازہ کر کے محاصرین کے لشکر کی طرف ہانک دیا تاکہ وہ ان کو دیکھکر یہ خیال کریں کہ محصور آسانی سے مغلوب ہونیوالے نہیں ہیں۔ اور ابھی اُن کے پاس آذوقہ بہت ہے۔

جو آدمی کہ پوشیدہ طور پر ان خچروں کے پیچھے گیا تھا اُس کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ حیلہ کارگر ہوا۔ لیکن بیاس نے جو اس حیلہ کا بانی مبانی تھا یہ خیال کیا کہ شاہ ہلیاطس ضرور اس امر کی تصدیق کرے گا۔ اس لئے اس نے بڑے بڑے گڑھے کھدوا کر اُن کو مٹی سے بھروا دیا۔ اور اُن پر غلہ ڈلوا دیا۔ تاکہ جو جاسوس آئیں وہ دیکھ کر سمجھ لیں کہ ان گڑھوں (یا کھتوں) میں غلہ بھرا ہوا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہلیاطس کو محاصرہ اُٹھا لینا۔ اہل شہر سے صلح کر لینی اور معاہدہ کر لینا پڑا۔ شاہ ہلیاطس نے نہایت اشتیاق کے ساتھ حکیم بیاس کو بلوا کر اپنا لشکر دکھلانا چاہا۔ مگر بیاس نے کہلا بھیجا کہ "میں اس شہر سے باہر نہ نکلونگا۔ مگر تمھیں یہ وصیت کرتا ہوں کہ تم پیاز کھا کر غربا کی طرح اپنا گذر کرو۔ اور باقی عمر اس شہر کے فتح نہ کر سکنے کا تاسف کرو۔"

حکیم بیاس کو نظم سے نہایت ذوق تھا۔ اور ایک ہزار شعر کا قصیدہ نظم کیا تھا جس میں بہت سے اقوال حکمت بیان کیے تھے جو ہر شخص کے لیئے مفید تھے۔ اور جن پر عمل کرنے سے آرام کے ساتھ آدمی زندگی بسر کرسکتا تھا۔ اوسی میں ایسی تدبیریں تھیں جو ایام جنگ و صلح میں نہایت کارآمد ہوئیں۔

حکیم بیاس کے بعض اقوال مملو رحکمت یہ ہیں:-

اظہار تفاخر سے کبھی خیر نہیں ہوتی۔ دوستوں کی محبت قایم رکھو مگر اون سے ڈرتے رہو۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ تمھارے دشمن ہوجائیں گے۔ تمہیں اپنے دشمنوں سے بھی احتیاط لازمی ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ آخر کار تمھارے دوست ہوجاتے ہیں۔ اپنی مصاحبت کے لیئے ایسے لوگ انتخاب کرو کہ جو قابلیت مصاحبت رکھتے ہوں۔ ہر شخص کی قدر اُسکی درجہ کے موافق کرو۔ ایسے شخص کی پیرَی کرو کہ جسکی پیروی کرنا تمھارے لیئے باعث فخر ہو۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ دوستونکی نیکی اور صلاح تمھاری حسن شہرت کی مددگار ہوتی ہے۔ کلام میں جلدی نکرو۔ کیونکہ یہ فعل غصہ اور جنون پر دلالت کرتا ہے۔ لڑکپن میں علوم حاصل کرو تاکہ وہ تمھارے بڑھاپے میں کام آئیں۔ ایسی نیکی کرو کہ وہ آخر کار تمھارے فخر کا باعث ہوسکے۔ غصہ اور جلدی اطمینا نکے دشمن ہیں۔ اہل صلاح بہت کم ہیں۔ اور اشرار اور دیوانے دنیا میں بہت زیادہ ہیں۔ وعدہ کی ایفا میں کبھی قصور نکرنا اور اُسکو پورے طور پر نباہنا۔ خدا کا شکر اپنے مقدور بھر کرو اور اُسکی حمد ہر شخص پر واجب ہے۔ اپنے دوستونکو تکلیف میں نہ ڈالو۔ تمھارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم اُن کو مجبور کرکے

کچھ دو نہ یہ کہ مجبور کر کے اون سے کچھ لو۔ ان کو ایسی تکلیف نہ دو کہ وہ برداشت نہ کر سکیں جس کام کے کرنے کا ارادہ کرو اسپر اپنی تمام ہمت صرف کر دو۔ کسی شخص کو اوس کے تمول کی وجہ سے یاد نہ کرو بلکہ اس کے صفات حمیدہ کی وجہ سے یکھیں چاہیئے کہ ہر وقت اسپر یقین رکھو کہ موت سے کہیں پناہ نہیں ہے۔ اور زندگی ابدی کی کوئی سبیل نہیں ہے عافیت خدا تعالیٰ کی عطیہ نعمت ہے۔ تموّل ایک امر اتفاقی ہے۔ حکمت ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جو انسان کو اپنی ذات اور اپنے اہلِ وطن کے اصلاح پر قادر کرتی ہے۔ حیلہ یا فریب عقل کے مرضوں میں سے ایک مرض ہے کسی نے پوچھا کہ انسان کے لیے کیا چیز آسان ہے؟ کہا کہ اکتساب پوچھا کہ کون بوجھ ایسا ہے کہ جس کا نفس متحمل نہیں ہوتا؟ کہا کہ امیری کے بعد فقیری کا۔ کہا کرتا تھا کہ وہ شخص سب سے زیادہ فقیر و محتاج ہے کہ جسپر کوئی مصیبت پڑے اور وہ اوس پر صبر نہ کر سکے۔

ایک مرتبہ حکیم بیاس ایک کشتی میں تھا کہ جس میں بہت سے بُت پرست بھی سوار تھے۔ اتفاق سے طوفان آیا۔ اور کشتی قریب بغرق کے ہوگئی بُت پرست لگے اپنے بتوں سے دُعائیں مانگنے۔ حکیم بیاس نے کہا کہ ذرا چپ رہو۔؟ اگر کہیں تمھارے خداؤں کو معلوم ہو جائے کہ تم ایسی مخدوش حالت میں ہو تو وہ فوراً تمھاری کشتی کو غرق کر دیں گے اور ہم سب کے سب مر جائیں گے۔

ایک مشرک نے اُس سے سوال کیا کہ اسکی دلیل کیا ہے کہ انسان کو خدائے واحد کی عبادت کرنی چاہیئے؟ حکیم بیاس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس شخص نے سختی سے پوچھا کہ جواب کیوں نہیں دیتے؟ حکیم نے جواب

کہ تم ایسا سوال کرتے ہو کہ جس سے تمھیں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیئے تمھارے سوال کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔

حکیم بیاس کہا کرتا تھا کہ میں بہ نسبت اپنے دوستوں کے دشمنوں کے معاملات میں فیصلہ کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ جس دشمن کے موافق میں فیصلہ کرونگا۔ وہ مجھسے راضی ہوکر میرا دوست بن جائے گا۔ اور جس دوست کے موافق میں فیصلہ کرونگا اوس کا فریق مخالف (جو میرا دوست ہوگا) میرا دشمن بن جائے گا۔

ایک مرتبہ حکیم بیاس سخت مشکل میں گرفتار ہوگیا۔ کیونکہ اوس کے ایک نہایت عزیز دوست نے ایسا جرم کیا تھا کہ جسکی سزا قانوناً موت تھی۔ آخر جب حکم سنانے کا وقت آیا تو وہ رونے لگا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس گریہ و بکا کا کیا موقعہ ہے اسوقت یا تو اس شخص کے قتل کا حکم دو یا اوسکو رہا کر دو حکیم نے کہا کہ مجھے اس لئے رونا آتا ہے کہ جبلت تو اس کی مقتضی ہے کہ میں اُس شخص پر شفقت کروں جو گردش زمانہ میں گرفتار ہوگیا ہے۔ اور از روے قانون مجھپر یہ فرض ہے کہ میں طبیعت انسانی کے خلاف کام کروں۔

جو چیزیں کہ تمول کا باعث ہیں اُن کو حکیم بیاس اچھی چیزیں نہ سمجھا کرتا تہا۔ اس کا قول ہے کہ مال حفظ نفس کے لیئے ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ انسان اُس سے مستغنی ہو جائے۔ اور اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ زائل ہو جانے والی چیز ہے۔ وہ بلا خیال اِس امر کے کہ کوئی چھوٹا ہے یا بڑا ہمیشہ ایسی باتوں کی ہدایت کیا کرتا تہا کہ جو اُن کے لئے فائدہ مند ہوں۔

جن دنوں کہ شہر بریانہ کو شاہ ہلیاتس نے محصور کر رکھا تھا ہر شخص ایسی چیزوں کے اوٹھا لیجانے کی فکر میں تہا کہ جو اُن کو عزیز نہیں۔ یہانتک کہ

شہر بھر میں سوا حکیم بیاس کے کوئی بھی ایسا نہ تھا کہ جو سخت گھبراہٹ اور اپنے جان ومال کے بچاؤ کے فکر میں نہ گرفتار ہو۔ ایک حکیم تھا کہ اِس طرح بے فکر تھا کہ گویا کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہی نہیں۔ کسی نے اُس سے کہا کہ دوسروں کی طرح تم بھی اپنا فکر کرو۔ اس نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ کوئی چیز مرتے وقت میرے کام آنے والی نہیں ہے۔ اِس لئے مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں ہے۔ پھر فکر و اضطراب سے کیا حاصل؟

ایک واقعہ آخر عمر میں ایسا گزرا کہ جس نے اُسکے رشتۂ حیات کو کاٹ دیا۔ بیاس اِس وقت بہت ہی ضعیف العمر نشست و برخاست تک سے معذور تھا۔ کہ کسی دوست کی قضاء حاجت کے لیے لوگ اُسکو عدالت تک اوٹھا لے گئے حکیم بیاس وہاں اپنے ایک پوتے کے کندھو نپر ہاتھ رکھکر کھڑا ہو گیا۔ وکیل نے تقریر کی اور اُسکے ختم ہوتے ہی حاکم عدالت نے حکیم بیاس کے دوست کی رہائی کا حکم دیا۔ اِس حکم نے اوسپر یہ عجیب اثر ڈالا کہ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے جان دیدی۔ شہر بھر میں ایک غوغا پڑ گیا۔ تمام اہل شہر عدالت ہی میں جمع ہو گئے اور وہیں سے اوس کا بہت بڑا جنازہ تیار کیا اور سخت اظہار رنج کیا۔ آخر سپرد خاک کر دیا۔ اور اُسکی قبر پر یہ لکھدیا کہ حکیم بیاس کا وطن بریانہ تھا۔ وہ تمام ملک یونان کی زینت تھا۔ وہ حکماء فلاسفہ میں سب سے بڑا حکیم تھا۔"

شہر بریانہ والے اُسکی بہت عظمت کرتے تھے۔ یہانتک کہ اُنہوں نے اُس کے بعد اُس کے نام کی ایک ہیکل بنا دی۔

محمد خلیل الرحمٰن

اخبار نویسی پر لارڈ مارلے کی رائے

حال میں سلطنت برطانیہ کے ہر حصہ کے اخبار نویسوں کی ایک عالمگیر کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی تھی۔ اِس کے ایک اجلاس میں لارڈ مارلے وزیر ہند۔ صدر نشین تھے۔ اِس موقعہ پر انھوں نے جو تقریر کی وہ بعض وجوہ سے مستقل قدر کے لایق ہے۔ اور یہ حق رکھتی ہے۔ کہ اس کا ترجمہ اُردو داں اصحاب کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ تاکہ انھیں معلوم ہو۔ کہ لارڈ مارلے جو خود پہلے اخباری دنیا کے ایک رکن رکین تھے وہ اخبار نویسی کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں۔ اِس کے علاوہ لارڈ مارلے آجکل زبان انگریزی کے بہترین ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور اُنھوں نے اِس تقریر میں ادیب اور اخبار نویس میں فرق دکھایا ہے۔ جو قابل غور ہے۔ اخبار نویسی کے متعلق جو اُن کے مشورے ہیں وہ ایسے ہیں کہ اُن سے ہمارے ملک کے اخبار نویس بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اِس لئے ذیل میں اُن کی تقریر کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:-

آپ حضرات جو علم ادب کے متعلق بحث کرتے رہے ہیں۔ اسپر بعض اطراف سے اعتراض ہوا ہے کہ ادب پر بہت زیادہ وقت صرف نہ کرنا چاہئیے۔ مگر غور کیجئے تو یہ کوئی چھوٹا سا مضمون نہیں ہے۔ کہ اِس سے بے اعتنائی کیجائے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تو یہاں تک کہوں گا۔ کہ ادب اور سلطنت میں رشتہ ہے کیا ہماری شاندار انگریزی زبان ہماری سلطنت کا مایۂ ناز نہیں ہے؟ کیا یہ سب سے زیادہ مضبوط

اور سب سے زیادہ پائدار سلسلۂ اتحاد نہیں ہے؟[۱] بلکہ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایک معنی میں تمام سپاہیوں۔ تمام جہازرانوں۔ اور تمام مدبروں کے کارناموں سے۔ گو وہ کارنامے بجائے خود بہت عالیشان ہیں۔ یہ ایک کارنامہ کہ ہماری زبان اتنے مختلف ملکوں کو متحد بناتی ہے۔ بڑا کارنامہ اور زیادہ پائدار وسیلۂ اتفاق ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شکسپیر اور برنز۔ ٹینی سن اور سوفٹ۔ ہمارے معماران قصر سلطنت میں سب سے بڑے معمار نہیں؟ یہ بظاہر ایک پیش پا افتادہ بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر با ایں ہمہ اسقدر درست در واقعات پر مبنی ہے کہ اس کی عظمت سے چشم پوشی ناممکن ہے۔ میرے نزدیک کوئی واقعہ اس سے زبردست اِس سے اہم نہیں کہ یہ ہماری انگریزی زبان مغرب کے نئے جہانوں میں اور مشرق کے پُرانے جہانوں میں کروڑہا نفوس پر حاوی ہے۔ اس وجہ سے میری رائے ہے کہ جو جگہ آپ نے ادبیات کو اپنے مباحث میں دی ہے وہ بالکل حق بجانب ہے۔ مجھے فقط ایک استعجاب ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ نے سائنس کو اپنی فہرست مضامین میں داخل نہیں کیا۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ لوگوں کے خیالات اور دلچسپیاں زمانہ کے رنگ کے مطابق ہوتی ہیں۔ کوئی زمانہ مذہبی۔ کوئی سیاسی۔ کوئی ادبی ہوتا ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ جو ہمارا زمانہ ہے یہ سائنس کا زمانہ اور عملی علوم و فنون کا دور ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات بھی میری اس رائے سے متفق ہوں گے۔

آج کے جلسے میں ہمارا مقصد لٹریچر (ادب) اور جرنلزم (اخبار نویسی)

---

[۱] لارڈ مارلے کے اس پُر مغز جملہ پر اہل ہندوستان غور کریں اور اپنی ایک متحد زبان پیدا کرنے اور اس کے بڑھانے کی طرف متوجہ ہوں۔ ۱۲

گفتگو کرنا ہے۔ لٹریچر کیا چیز ہے ؟ پہلے ہم اس پر ایک پیشہ یا فن کی حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں۔ مینے اکسفورڈ ڈکشنری کو جو معلومات مفیدہ کی کان اور لغت میں ایک مستند کتاب ہے۔ اٹھایا کہ لٹریچر کی تعریف اس میں دیکھوں اتفاق کی بات ہے کہ صاحب لغات نے میری ہی ایک مقولہ کو اس لفظ کے نیچے نقل کر کے مجھے آیندہ نسلوں کی نظر میں اس کا جوابدہ بنا دیا ہے۔ وہ جملہ یہ تھا اور میں اسے پڑھ کر بہت گھبرایا :۔

"لٹریچر سب پیشوں میں زیادہ دلفریب۔ سب سے زیادہ دہوکا دینے والا اور سب سے بڑھکر خطرناک پیشہ ہے"

اصل بات یہ ہے کہ مدت ہوئی کہ مینے یہ رائے لٹریچر کے متعلق دی تھی جواب مجھے اسقدر گھبراہٹ میں ڈالتی ہے۔ اور میرا اس پیشہ میں مدتوں رہنے کے بعد اب تک صحیح و سلامت ہونا شاید اسبات کی دلیل ہے کہ کہ یہ فن اتنا خطرناک نہیں ہے۔ جو خیال اُسوقت میرے دل میں غالب ہوگا جب یہ الفاظ میرے قلم سے نکلے۔ وہ یہ ہے کہ استنے آدمی۔ زن و مرد اس پیشہ کیطرف دوڑ رہے ہیں۔ کہ کچھ انتہا نہیں۔ انمیں سے ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ میں اسکے لیے موزوں ہوں۔ حالانکہ بہت کم ایسے ہیں۔ جو فی الحقیقت موزوں ہیں۔ بعض تصنیف کے لیئے قلم اٹھانے کا استحقاق اتنا کم رکھتے ہیں جیسے میں نقاشی کے لیئے موقلم اٹھانے کا اسکا یہ نتیجہ ہے کہ ایسے اہل قلم کی تعداد جو درجۂ قبول عام حاصل کرتے ہیں بہت کم رہتی ہے رہا جرنلزم کا پیشہ یہ نہایت قابل عزت مگر نہایت مشکل اور محنت طلب پیشہ ہے۔ ہمارے نامور مصنف کارلائل نے اس پیشہ کی بابت بہت کم لکھا ہے۔ لیکن جہاں لکھا ہے چند لفظوں میں مضمون کو ختم

کر دیا ہے۔ اسکی دو رائیں میں نقل کرتا ہوں جس سے تصویر کے دونو رخ نظر آجائیں گے۔ ایک جگہ کہتا ہے:-

"گویا ہر قابل اڈیٹر دنیا کا فرمانروا نہیں ہوتا۔ جب وہ سارے جہان کو ترغیب دے کر اپنی راہ پر لے آتا ہے" ایک دوسرے موقعہ پر اخبار نویس کے کمزور پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے کارلائل نے کہا ہے۔ کہ "جرنلزم نالی کا پانی ہے" کبھی کبھی میری بھی رائے ہوتی ہے۔ کہ جرنلزم نالی کا پانی ہے۔ مگر انصاف یہ ہے کہ جیسے ادیبوں کے بیشمار طبقے ہیں اسی طرح اخبار نویسی کے طبقے بھی بیشمار ہیں۔ اعلے درجے کے عالی خیال مضمون نگاروں سے لیکر اس بھوکے اہل قلم تک جو تھوڑے سے معاوضہ کے لیئے چٹ پٹے نوٹ اور چٹخارے دار آرٹکل لکھتا ہے۔ سب اس جماعت میں شامل ہیں۔

سٹائل یا طرز تحریر کی بحث آج کے مقاصد سے خارج ہے اور سٹائل چیز بھی ایسی ہے کہ وہ کسی اظہار رائے یا کسی جلسہ میں رزولیوشن پیش کرنے یا رزولیوشن کی ترمیم سے حاصل نہیں ہوسکتی میں فقط ایک بات اس کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ گو ہم خوبی طرز تحریر میں ان بڑے بڑے اصحاب کے رتبہ کو نہ پاسکیں جو فصاحت کے دریا بہا گئے ہیں۔ لیکن ایک امر ہمارے اختیار میں ہے یعنے سادگی کو ملحوظ رکھیں اور جو کچھ کہیں اسطرح کہ فوراً تمہید اور غیر ضروری باتیں چھوڑ کر اصل مطلب سے شروع کریں۔ جہانتک ممکن ہو تصنع سے پرہیز کریں کیونکہ تصنع عادات اور اخلاق میں جس قدر مذموم ہے۔ ادبیات اور اخبار نویسی میں اس سے بھی زیادہ قابل نفرت ہے۔ اسی سے ہر شخص کو یہ مدنظر رکھنا چاہیئے

کہ اسکی تحریر سادہ اور پرمطلب ہو- اور یہ ایسی خوبی ہے کہ کوشش سے ہر کسی کو حاصل ہو سکتی ہے- اِس میں شک نہیں کہ اول شرط عمدہ سٹائل کے لئے یہ ہے کہ جس مضمون پر انسان کچھ لکھتا ہے اِس سے اچھی طرح واقف ہو- ورنہ سٹائل کی عمدگی کسی کام نہیں آسکتی- پلیٹ فارم پر تقریر کرنے والوں کی بابت کہا جاتا ہے کہ ایسی تقریر کی کامیابی تین چیزوں پر منحصر ہے- اول یہ کہ کہنے والا کون ہے- دوسرے یہ کہ وہ کس طرح کہتا ہے- اور تیسرے یہ کہ وہ کیا کہتا ہے- بلکہ بعض لوگ اِس مقولہ پر یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ تیسری چیز نسبتاً غیر ضروری ہے- مگر جرنلزم میں یہ صورت نہیں- جرنلزم میں یہ نہایت ضروری ہے کہ کہنے والا کیا کہتا ہے- اور اِس تفریق کا سبب یہ ہے- کہ تقریر کچھ عرصے کے بعد ہوا ہو جاتی ہے اور اخبار نویس کی تحریر قایم رہتی ہے اور نکتہ چین نگاہیں اسے فرصت میں دیکھتی ہیں-

اِس کانفرنس کے ایک ممبر نے چند روز ہوئے مجھ سے کہا کہ جرنلزم کیا ہے- لٹریچر ہے جو جلدی میں لکھا گیا ہو- مجھے اِس تعریف سے اتفاق نہیں ہے- جرنلزم اور جلدی لازم ملزوم ہیں- مگر لٹریچر جلدی کا کام نہیں لٹریچر کی حیثیت کم وبیش ایک جج کی حیثیت ہے- جرنلسٹ (اخبار نویس) تازہ معاملات پر بحث کرتے ہوئے قریب قریب وکیل کی حیثیت رکھتا ہے- لٹریچر کا کام ہے کہ اِس پر غور کرے کہ منتہائے خیال کیا ہونا چاہیئے- اخبار نویس چونکہ ایک عملی آدمی ہے اِس کا کام ہے کہ واقعات سے بحث رکھے- نیز اگر اخبار نویس عقلمند ہے تو وہ یہ بھی تسلیم کریگا کہ درحقیقت اِس کے واقعات بسا اوقات اتنا واقعی اثر نہیں رکھتے جتنا کہ

کسی بڑے ادیب کے الفاظ جو خیالی ہوتے ہیں۔ مثلاً کون انکار کرسکتا ہے
کہ برنز کی نظم کی چند سطروں نے بعض دفعہ ملک کی پولٹیکل زندگی پر زیادہ
اثر ڈالا ہے۔ بہ نسبت ہزاروں آرٹکلوں کے جو اخبارات میں نکلے۔ اور
یہی ادبی اثر ہے جو ادیب اور اخبار نویس میں ما بہ الامتیاز ہے۔ اگلے دن
ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اچھے جرنلسٹ کی تعریف کیجئے۔ میں نے اُن سے
کہا کہ پہلے آپ فرمائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ اچھے اخبار نویس کے لیئے
یہ صفات ضروری ہیں:۔

صاف گوئی۔ خُلق۔ آزادی رائے۔ اور خود داری۔ مگر یہ تعریف کافی
نہیں۔ کیونکہ یہ صفات نہ صرف ایک اچھے اخبار نویس کے لیئے بلکہ ہر قسم
کے اچھے آدمی کے لیے لازمی ہیں۔ مجھے کرامول کا ایک قول یاد آیا۔
اسنے ایک دفعہ پرسبیٹرین فرقہ کے پادریوں کے ایک وفد سے یہ کہا تھا
"صاحبو۔ میں تم سے بعجز اور حضرت مسیح کا واسطہ دیکر یہ کہتا ہوں کہ آپ
اِس پر غور کریں کہ کہیں آپ غلطی پر تو نہیں"۔ میرے نزدیک یہ الفاظ
ہر اڈیٹر کے دفتر میں سنہری حروف میں لکھکر لٹکائے جانے چاہئیں۔
اڈیٹر کا بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ہر رائے کے سننے اور اگر وہ درست
ہو تو قبول کرنے کے لیئے تیار رہے اور یہ نہ سمجھے کہ وہ ناقابل خطا
ہے۔ اپنے آپ کو ناقابل خطا اور اپنے فتوے کو اٹل سمجھنا بڑی غلطی ہے۔
جرنلزم میں ذرا گرم مزاجی کم ہونی چاہیئے۔ میں آپ لوگوں کی خوشامد
نہیں کرنا چاہتا۔ نہ مجھے کوئی اختیار دیا گیا ہے کہ میں خوشامد کروں
مگر یہ بلا تامل کہتا ہوں۔ کہ اِس زمانہ کے مقابلہ میں جب میں اِس فن
سے تعلق رکھتا تھا۔ برطانیہ کی اخبار نویسی نے بہت ترقی کی ہے۔ مجھے

سلطنت کے دوسرے حصوں کے اخبارات کا حال تو اچھی طرح معلوم نہیں مگر برطانیہ کی نسبت کہہ سکتا ہوں کہ تمام ضروری شعبوں میں اخبار نویسی کی ترقی بہت نمایاں ہے جس سے یہ امید بھی پیدا ہوتی ہے کہ یہ ترقی دور تک جائے گی۔ پچھلے زمانہ میں خیالات ہی اور تھے۔ جب میں اخبار نویسی کرتا تھا اس زمانہ میں ایک جوان سا لڑکا نوکری کی تلاش میں میرے ہاں آیا میں نے اس سے کہا۔ "خاص طور پر کسی چیز میں مہارت رکھتے ہو؟" اس نے کہا "برا بھلا کہنے میں"۔ میں نے کہا "اس کی بھی کوئی خاص صورت؟" اس نے جواب دیا نہیں "عام طور پر برا بھلا کہنے میں"۔ میرے کام کا تو وہ تھا نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس زمانہ میں ضرور کہیں نہ کہیں نوکر ہو گیا ہو گا۔

اخبارات کی حالت پر غور کرتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ آیا اخبار کتاب کا دشمن ہے؟ اور آیا لوگ انگلستان میں زیادہ کتابیں پڑھتے ہیں اور اچھی بری کتاب میں فرق اور ملکوں سے بہتر جانتے ہیں؟۔ میرے خیال میں اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ کتابیں زیادہ پڑھتے ہیں اور اچھی بری کتاب میں تمیز کرنے کے عمدہ ذرائع رکھتے ہیں۔

تقریر ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور معاملہ پر گفتگو کروں گا آپ کے مباحثوں میں بہت سی تقریریں اس مضمون کی ہوئی ہیں کہ یورپ بہر وحشیانہ جنگجوئی کی طرف مائل معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف اسلحہ جنگ کی تیاری ہے۔ عرصہ ہوا ہربرٹ سپنسر نے یہ میلان دیکھکر اس کا نام "تجدید وحشیت" رکھا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میلان کے پیدا کرنے میں اخبارات نے کہاں تک حصہ لیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے

کہ گو کوئی وزیر دولت غلطی میں مبتلا ہو۔ یا کوئی مستقل عہدہ دار سلطنت اپنی اکثر ضرورت سے زیادہ دکھائے۔ یا ایلچی اور سفیر کافی طور پر سیاسی مکر وحیلہ سے باخبر نہ ہوں یا حد سے زیادہ حیلہ گر ہوں۔ یا بڑے بڑے مدبر ذاتی نمود کی خاطر ملک کی بھلائی کو نظر انداز کریں۔ لیکن اِن سب اسباب کا بہ حیثیت مجموعی اِس میلان کے پیدا کرنے میں اتنا حصّہ نہیں۔ جتنا اکیلے پریس کا۔ اِس لیئے میں آپ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ سوچ کر اِس کا جواب دیں کہ آیا۔ پریس اِس ملک میں اور نیز سمندر سے پار کے حصص سلطنت میں برابر امن بین الاقوام کی کوشش کر رہا ہے یا نہیں؟۔ پریس فرائض عامہ کی ادائیگی کا ایک بڑا مرکز اور سرچشمہ اور اخلاقی قوت ہے۔ دنیا کے واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیئے ایک اچھا رہبر ہے اور علمی لیاقت کے حصول کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ مجھے آپ حضرات کے جلسے میں شریک ہونے سے نہایت خوشی ہوئی۔ اور مجھے نہایت فخر ہے کہ میں ایک وقت میں اِس معزز پیشے سے تعلق رکھتا تھا۔ جسکے آپ لوگ اِس جلسہ میں قایم مقام ہیں۔

محمد اکرام

رباعی

عالم اِسی عنا میں یا غنا میں گذرے ۔۔۔ یہ عمر بس اب راہِ وفا میں گذرے
جو سانس کٹے کٹے طلب میں تیری ۔۔۔ جو دم گذرے تیری رضا میں گذرے

ثاقب بدایونی۔

سارس کی تارک الوطنی

ارنشی کے وسیع میدان میں آدہی سے زیادہ رات گزر چکی تھی دامن کوہ میں خاموش چشمہ کے کنارے ایک سارس کا جوڑا تارک الوطن ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ گو ان کے دماغ (یعنی احساس انسانی کا مرکز) اُس قوت سے محروم تھے جو اس قصد کے نقائص و تکالیف انکی آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتی۔ تاہم وطن کی مفارقت کا اثر ان کے اعضاء جسمانی ان کی حرکات سکنات سے ظاہر تھا دونو خموشی کے ساتھ کھڑے پہاڑ کی بلند چوٹیوں کو حسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے آبشار بلندی سے گر رہے تھے اور اس بھولی بھالی مخلوق کی قوت سامعہ ہوا کے تیز جھونکوں کی بدولت معمول سے زیادہ کام رہی تھی دو ڈیڑھ گھنٹہ تک یہ جوڑا قدرت کی اس دلچسپی اور وطن کے ان دردیلوآ کو غور سے دیکھتا رہا۔ آخر چاند کی روشنی کا انحطاط سارس کی توجہ میں خلل انداز ہوا اور وہ آتش فشاں پہاڑ جو قمر چہار دہم کے اندر صاف و روشن نظر آرہے تھے دھندلے دکھائی دینے لگے۔

زمین اپنے محور کے گرد چکر کھاتی ہوئی رات کو کنار صبح تک لے آئی شیر اور چیتے جنگلی دہاڑوں نے تمام جنگل سر پر اٹھا رکھا تھا اپنے اپنے غاروں میں جانے شروع ہو گئے۔ اور ایک خوش الحان پرند نے تاڑ کے درخت پر سے صبح صادق کا مژدہ سنا دیا +

ایک خاص خیال میں اسقدر دیر تک متوجہ رہنے پر بھی نر کی قوت متخیلہ کچھ زیادہ کارآمد نہ ہوئی وہ نہ سوچ سکا کہ غربت میں کیا کیا مصیبتیں پیش آئینگی

اور کیسی کیسی دقتیں اُٹھانی پڑیں گی۔ چاند کی روشنی لمحہ بہ لمحہ پھیکی پڑ رہی تھی
سارس نے دفعتاً اپنا منہ مادہ کی طرف کیا اس کے کندھوں پر اپنی گردن رکھی
اس کے کاسنی پروں کو جو فاختائی مائل تھے آنکھوں سے لگایا۔ اور اسطرح
جذبات قلب پورے کر کے کہنے لگا۔ چل چل پیاری مادہ ایسے میں اُڑ چلیں
ٹھنڈے ٹھنڈے بہت دور نکل جائیں گے۔ ورنہ مشرقی شہسوار تخت
آسمان پر جلوہ گر ہو جائیگا اور پھر تیرے نازک بازو شاید گرم ہوا کا مقابلہ آسانی
سے نہ کر سکیں اُٹھ اُٹھ من موہنی مادہ چل کھڑی ہو۔ میری زندگی کی تمام
خوشیاں تیرے اِن چمکدار پروں میں پوشیدہ ہیں۔ تیرا یہ حسن دلفریب
میری زندگی برقرار رکھنے اور مجھکو ہمیشہ کامیاب بنانے کیلئے کافی ہے
چونکہ سارس اپنے سفر کا ارادہ اور اپنی ترک لوطنی کا قصد شام ہی سے
ظاہر کر چکا تھا اس لئے مادہ نے اپنے گلابی مائل سرخ رخسار قریب لاکر
پہلے سچی محبت کا جواب دیا اور پھر اِس طرح مخاطب ہوئی۔

مجھکو حکم کی تعمیل میں عذر نہیں مگر کیا کروں قدرت نے میری سرشت
میں یہ مادہ ودیعت کیا ہے کہ میں اِس مرغزار کے پتے پتے کی جدائی جہاں
میں چھوٹی سے بڑی ہوئی محسوس کروں۔ پہاڑ کی چوٹیاں اسوقت سے
میرے سامنے ہیں جب سے میری آنکھ کھلی آبشاروں کی آوازیں اسوقت
سے میرے کانوں میں ہیں جب سے میں ان کو سننے کے قابل ہوئی یہ
درختوں کی پتیاں اور کنارِ نہر کے خودرو پھول جو ہمیشہ سے میری آنکھوں
میں بسے ہوئے ہیں اِن کا فراق مجھے سخت تکلیف دہ ہوگا۔ اُس پار
پہنچکر نئی زمین ہوگی نیا آسمان۔ نیا دانہ۔ نیا پانی۔ یہ سرزمین جس کے
چپے چپے اور کونے کونے پر میرے قدم چلے ہیں مجھسے چھوٹ جائیگی

اور یہ ہوا جس نے مجکو تھپک تھپک کر لوریاں دی ہیں پھر کوسوں دور ہو جائے گی۔ آخر مجھے معلوم تو ہو وہ کیا چیز ہے جسنے آپ کو ایسا دل برداشتہ کیا کہ وطن جیسی چیز کو عمر بھر کے واسطے خیرباد کہا۔

سارس۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسی جگہ زندگی بسر کروں جہاں بیوفا۔ اور خودغرض انسان کا گذر ہو سکے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسی نفس پرور مخلوق کے خیالات سے متاثر ہو کر میری آیندہ نسل برباد ہو جائے۔

مادہ۔ اگر آپ مجھکو اجازت دیں تو میں اسقدر عرض کرنے کی جرأت کروں کہ ہمارا اِس حد تک انسان سے نفرت کرنا ایک قسم کی محسن کشی ہے۔ جو ہمارا شیوہ نہیں دنیا بالکل اجاڑ ہوتی۔ ہم ہی جیسے کائیں کائیں کرنے والے چاروں طرف آباد ہوتے۔ کائنات کی کل ہستی یہ ہوتی کہ لنگوروں کی چھلانگیں۔ چیلوں کی چل چل۔ ہرن چکارے۔ بارہ سنگے۔ سانپ۔ مچھلی کینچوے۔ کچھوے وغیرہ۔ وغیرہ

قدرت کو ضرورت تھی ایک ایسی مخلوق کی جو نظامِ عالم کی داد دے اور صنعتِ دنیا کو دیکھکر صانعِ حقیقی کے کمال کا اعتراف کرے پس انسان کی خلقت ضرورت سے قدرت کی اور یہ اِسی مخلوق کا کام تھا کہ اپنی محنت اور عقل کی بدولت پہاڑوں سے چشمے بہا دیئے اور آسمان پر بے پر وبال اِس طرح پونہچا کہ چاند تاروں تک کی حقیقت معلوم کر لی۔ کیا آپ کو اِس سے انکار ہے کہ یہ طرح طرح کے میوے۔ یہ ہرے بھرے کھیت۔ یہ لہلہاتے ہوئے درخت جن سے ہمارے گرد و پیش کی زمین مالامال ہے ہم کو محض انسان کی سعی سے میسر ہوتے ورنہ پہاڑوں کے سنگریزے ہماری خوراک ہوتی اور کوہ آتش فشاں کا ملغوبہ ہمارا پانی۔

ایسی اچھی اور کار آمد مخلوق جسکی محنت سے ہم ہر طرح مستفید ہوں اِس قدر نفرت کی مستوجب نہیں۔

سارس۔ مگر انسان جیسی دغاباز شے جو تری نگاہ میں اشرف اور میری رائے میں ارزل ہے ہرگز پسند کرنے کے قابل نہیں اسکی سرشت میں دھوکا اسکی طینت میں دغا اور اسکی گھٹی میں خودغرضی پڑی ہوئی ہے۔ افسوس مینے صبح ہی صبح ایک نہایت منحوس چیز کا نام لیا انسان کیسا انسان دغاباز مکار جسکی محبت جھوٹی جسکی باتیں بناوٹی جسکا دل ظلمتکدہ سچا احساس اس سے کوسوں دور اور اچھے خیال اس سے میلوں پرے اے مادہ سورج کی کرنیں پہاڑ کی چوٹیوں پر پڑنے لگیں اب ہمارا یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ افسوس آج کا سفر ملتوی ہوا۔ چل پہاڑ پر چل اور حیات انسانی کی کیفیت مجھسے سُن +

آٹھ دس برس کا عرصہ ہوا میں بچہ ہی سا تھا ایک رات جبکہ چاندنی چاروںطرف چٹکی ہوئی تھی۔ میرے باپنے باہر نکلکر دیکھا درختوں کے پتوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ایک نور سا برس رہا تھا۔ پیاری بی بی تجھے کبھی پردیس جانے کا اتفاق نہیں ہوا اگر رستہ میں میرا قدیمی مکان پڑا تو میں تجھے دکھاؤں گا کہ وہ کیا پرفضا مقام ہے۔ دامن کوہ سے چشموں کا اترا اترا کر اور مچل مچل کر چلنا تجھکو بتا دیگا۔ کہ فطرت نے میری پرورش کے واسطے کیسی دلفریب اور دلچسپ جگہ انتخاب کی تھی ہاں تو شب ماہ اپنا بناؤ سنگھار کیئے ہوئے دنیا پر جلوہ گر تھی والد مرحوم کا دل سیر کو چاہا مجھے اور میری ماکو ساتھ لیا اور ہم تینوں ہوا میں اُڑے ستاروں نے آسمان کی جبین عروس بنا رکھا تھا ہمکو کسی خاص جگہ پر جانا مقصود نہ تھا۔ ہوا کے

جھونکوں نے یورپ کیطرف دھکیل دیا اور ہم چاندنی کا لطف اٹھاتے اس ہی طرف روانہ ہو گئے۔

رات اٹھلا اٹھلا کے اپنا رستہ طے کر رہی تھی ہم جزیرۂ ارسیوان میں پہونچے۔ ہمارا گزر قصر سلطانی پر ہوا تو ہمنے دیکھا کہ شہزادہ الیاس بھی ہماری طرح شب ماہ کا لطف اٹھا رہا ہے اور اسکی معشوقہ برابر میں بیٹھی ٹھنک ٹھنک کر باتیں کر رہی ہے۔ الیاس ٹکٹکی باندھے اسکی صورت دیکھ رہا تھا۔ کچھ عجب قسم کی محبت اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ چونکہ محبت کا وہ مادہ ہمارے دماغ اور خیال سے ارفع و اعلیٰ ہے ہیں اسکی صراحت سے مجبور ہوں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہزادی کی ایک ایک ادا الیاس کا کلیجہ مجروح کر رہی ہے وہ دیوانہ وار شہزادی پر نثار ہو رہا تھا کبھی اس کے نازک ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھتا تھا کبھی آراستہ و پیراستہ زلف کو سونگھکر جھومتا۔ کچھ دیر تک تو اسطرح قلب مضطرب کو تسکین دی اور پھر بیتاب ہو کر کہنے لگا۔

سلطنت کا لطف بھی اسیوقت تک ہے جبتک کہ تو میری آنکھوں کے سامنے ہو ورنہ شہزادی تمام سامان عیش ہیچ ہے لاگل اندام اپنے پیارے ہاتھوں سے ایک جام دے۔

کچھ عورت کی فطرت ہی میں یہ داخل ہوگا کہ شہزادی الیاس کو اسقدر والہ و شیدا دیکھکر بے انتہا خوش ہوئی۔ اس کے حسن کی چمک پہلے سے ڈیوڑھی تھی۔ گلاب سے رخساروں میں سرخی جھلکنے لگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی چاہتی تھی کہ آگے بڑھکر شیشہ و ساغر اٹھائے الیاس نے اسکا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگا ان ہاتھوں کو اس قسم کی تکلیف دینا منشار قدرت کے خلاف ہے یہ کہکر شہزادہ الیاس نے جام بلوریں آگے رکھا شہزادی ساغر تیار کر رہی تھی کہ اتفاق سے

شیشہ ٹوٹا اور کلائی بالکل لہولہان ہوگئی اسوقت الیاس کی بیچینی بیان نہیں ہوسکتی۔ آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ رومال بھگو کر کلائی پر باندھا اور کہنے لگا اِس خون کا ہر قطرہ میرے کلیجہ سے نکل رہا ہے۔ کاش میرا پورا ہاتھ کٹ جاتا۔ میں مرجاتا شہید ہوجاتا مگر میرے وجہ سے اِس سرخ و سفید کلائی کو یہ اذیت نہ ہوتی۔

شہزادہ یہیں تک پہونچا تھا کہ میری ما اپنے خاصۂ فطرت کے موافق والد مرحوم کیطرف متوجہ ہوئی اور کہنے لگی۔

"سچ ہے انسان سے زیادہ محبت کی قدر کوئی مخلوق نہیں کرسکتی" یہ کہکر وہ اور اِس کے پیچھے پیچھے ہم باپ بیٹے اُڑے اور اپنے گھر کو واپس آئے۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ اِس واقعہ کے کتنے روز بعد ایک روز میں سمت مشرق سے آرہا تھا رستہ میں جزیرۂ ارسیوان پڑا میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ شہزادی کو جسکے ساتھ مجھے اُس رات اِتنی ہمدردی ہوگئی تھی بغیر دیکھے چلا جاؤں چنانچہ میں قصر سلطانی پر ٹھٹکا دوپہر کا سنسان وقت تھا اور گرمی نہایت شدت سے پڑ رہی تھی دیکھتا کیا ہوں کہ الیاس غمگین و محزون پڑا رو رہا ہے دفعتہً ایک شخص آیا اور خط دیکر چلا گیا۔ مجھے سخت تعجب تہا کہ الیاس نے سینکڑوں مرتبہ وہ خط کھولا پڑہا اور سر آنکھوں پر رکھا آخر بآواز بلند کہنے لگا ظالم ابتک اِسی ہٹ پر قایم ہے۔ "شہزادی کی زندگی میں مجھ سے کسی تعلق کی امید بالکل فضول" خیر یہ کیا بڑی بات ہے لاؤ آج اِس قضیہ کا بھی فیصلہ کردوں یہ کہکر الیاس اندر گیا اور ایک خنجر آبدار لیکر باہر نکلا اسکی دہار دیکھی اور کمر میں لگا کر اس کمرہ میں آیا جو میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ آہ پیاری مادہ آگے بیان کرتے ہوئے کلیجہ کٹتا ہے۔ وہی شہزادی جو کسیوقت الیاس کے دلپر اچھی طرح قابض

اور تمام سلطنت کی مالک بنی سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ اور آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے ایاس کی صورت دیکھتے ہی شہزادی گھبرا کر اٹھی گو وہ بالکل ساکت کھڑی تھی مگر سر سے پا تک ایک ناامیدی کی تصویر تھی اسکی بڑی اور رسیلی آنکھیں جو اسوقت گلابی ہوگئی تھیں بہ حسرت و یاس ایاس کے چہرہ پر تھیں اور اس کے تکلیف دہ خیالات کی پریشانی کا اظہار اس کی صورت سے ظاہر تھا۔ نرم اور نازک رخسار گلاب کی پتیوں کی طرح آفات ناگہانی سے مرجھا چکے تھے اور وہ دل جسمیں کبھی عشرت و شادمانی کا راج تہا اسوقت مصائب کی پوٹ بنا ہوا تھا۔

پہلو میں ننھا سا دل رکھنے والی مادہ مجھے اندیشہ ہے کہ اب واقعات تجکو دھلا نہ دیں۔ جبوقت سفاک ایاس نے کمر سے خنجر نکالا اس کی چمک دیکھکر شہزادی سہم گئی اوسان جاتے رہے تھر تھر کانپنے لگی۔ ایاس آگے بڑھا شہزادی کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور کہا تیرا جام عمر لبریز ہو چکا یہ خنجر تیرا کام تمام کر دے گا ادھر آ۔ اور مرنے کے واسطے تیار رہو۔

اتنا کہکر خنجر اُٹھایا چاہتا تھا کہ کام تمام کر دے۔ شہزادی نے بہ منت یہ الفاظ کہے :۔

میں بیگناہ ہوں جس دماغ میں آج سے پندرہ بیس برس پہلے میری محبت کے خیالات بھرے ہوئے تھے آج اسمیں قتل کی تجویزیں ہیں شہزادے جن آنکھوں سے آج خون ٹپک رہا ہے یہ کبھی میری طرف پیار و محبت سے بھی اٹھی ہیں اگر تیری کامیابی صرف میری موت پر منحصر ہے تو میں یہ جان قربان کرتی ہوں۔ لیکن نافرمانی کا الزام میرے اوپر بہتان ہے۔ ایاس وہ کام نہ کر کہ میرے دونوں بچے دنیا میں ذلت کی زندگی بسر کریں۔ میں جانتی ہوں

کہ تھوڑی دیر میں میرا جسم اس فرش پر تڑپ رہا ہوگا اور جبتک تیری آنکھیں مجکو مردہ نہ دیکھہ لیں تیرا دل ٹھنڈا نہیں ہوسکتا۔ میں اپنا خون معاف کرتی ہوں بائیس برس تیرے ساتھہ زندگی بسر کی تیری دولت دنیا کے لطف اٹھائے ایک ایسے رفیق کو جان نذر کردینی کوئی بڑی بات نہیں۔ اب میں اجازت دیتی ہوں کہ تو شوق سے اپنی خواہش پوری کر۔

ابھی یہ پہلا فقرہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ظالم الیاس نے آبدار خنجر کو حرکت دی اور عین اسوقت جبکہ مظلوم شہزادی کی آنکھیں اپنے خاوند کے چہرہ کو تک رہی تھیں اس کے کلیجہ میں بھونک دیا۔

کیوں مادہ؟ کیا وہ مذہب اور اخلاق اور قانون جسپر انسان بہت کچھ نازاں ہے اور سمجھتا ہے کہ ابتدائے دنیا سے آجتک ہمنے بہت کچھ ترقی کرلی یہی تعلیم دیتا ہے۔ کیا وہ شہزادی جسنے عفت وعصمت جیسی چیز قربان کردی کیا وہ عورت جسکو الیاس نے زبردستی اپنی محبت کا یقین دلایا اسی سلوک کی مستحق تہی؟ ۔ کسطرح سنگدل الیاس کا ہاتھہ ایک بیگناہ برسوں کی رفیق اور برسوں کی ساتھی عورت پر اُٹھا۔

یہ کچھہ ایسا دردانگیز سما تھا کہ میرے پرشل ہاتھہ پاؤں پڑ گئے طاقت پرواز نہ رہی۔ آفتاب غروب ہوچکا تھا۔ میں نے وہیں بسیرا لیا اور رات کو جسوقت میں نے یہ دیکھا کہ ایک نئی عورت الیاس کی خوابگاہ میں داخل ہوئی اور الیاس اس کے استقبال کو اٹھا مجھہ میں دیکھنے کی تاب نہ رہی میں اڑا اور راتوں رات اپنے گھر پہونچا۔

میرا دماغ اُسوقت بالکل صحیح نہ تھا پریشان خیالات نے میری تمام قوت زائل کردی تہی ہرچند چاہتا تھا کہ تھوڑی سی نیند لیکر دماغ کو تسکین دوں۔ مگر

بیگناہ شہزادی کی آخری گفتگو میرے کانوں میں موجود تھی اور میں کسیطرح نہ بھولتا تھا
بدقت تمام رات بسر کی لیکن کائنات کی اس قابل ناز شے یعنی انسان کے مطالعہ کا مجکو اسقدر شوق ہوا کہ میں پھر آبادی میں پوہنچا شہر میں ایک پہاڑی تھی جسپر سہ منزلہ اور چومنزلہ مکان بنے ہوئے تھے انہیں سے ایک بلند مکان دیکھکر میں ممٹی پر جا بیٹھا۔

قوت مشاہدہ میری مددگار تھی تمام شہر میری آنکھہ کے سامنے تھا اور میری آنکھہ افعال انسانی پر بغرض تحقیقات پڑرہی تھی میرا خیال تھا کہ وہ مابہ الامتیاز چیز جسنے اس مخلوق کو اشرف بنا دیا حیات انسانی کی رہنما ہو گی مگر مجھے یہ دیکھکر افسوس ہوا کہ ان سینکڑوں اور ہزاروں ذی روح لوگوں میں ایک متنفس ایسا نظر نہ آیا جسپر انسان کا اطلاق جائز ہو سکتا۔

اُن بخارات کی طرح جو شدت حرارت و تمازت افتاب سے پہاڑ کی چٹانوں یا تپتے ہوئے کرۂ زمین سے نکلکر ہوا میں اڑتے رہتے ہیں میری نگاہ ابھی تک کہیں ٹھیری نہ تھی اور مطالعہ انسان کے اشتیاق نے مجکو اسقدر بے تاب کر دیا تھا کہ قوت باصرہ کی رفتار حد اخر تک پوہنچ چکی تھی رنگ برنگ کی اشیا مختلف ہئیت وصورت کے اجسام سامنے سے گذر رہے تھے مگر چونکہ متجسس نگاہ سرعت کے ساتھہ دیکھہ رہی تھی میں انہیں سے کسی کو تمیز نہ کر سکا تھا کہ ایک زرد دوپٹہ بیچ میں آکر حائل ہوا اور میری تمام توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ دوپٹہ انسان کے اُس کمزور فرقے کے سر پر تھا جو عورت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کپڑا بجائے سُرخ رنگ اور چمکدار ہونے کے پھٹا ہوا اور میلا کچیلا تھا۔ ایاس کا ظلم اور شہزادی کی منت وزاری نے میرے دلمیں اہل فرقہ انسانی کی حمایت پیدا کر دی تھی میں نے سر سے پاؤں تک اس عورت کو

دیکھا گو شہزادی کیطرح اس کے پاس دلفریبی کا کوئی سامان نہ تہا اور باوجودیکہ ہوا کے ٹہنڈے ٹہنڈے جہونکے بجائے اس کے دل و دماغ کو تر و تازہ کرنے کے اس چار دیواری سے جسمیں یہ موجود تہی ٹکرا ٹکرا کر واپس جا رہے تہے تاہم اس کے چہرہ سے خوشی کا مینہ برس رہا تہا اور جہانتک میرا قیاس حیوانی کام دے سکا میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ فکر و غم کی گھٹا اس کے قلب سے بالکل نا آشنا ہے۔ افسوس میرے نتیجہ نے مجکو مغالطہ دیا میں نہ سمجھ سکا کہ یہ حالت اسکی مستقل نہیں عارضی ہے اور یہ زور کا چھینٹا تہوڑی دیر بعد کھل جائے گا اور یہ دل جو اسوقت باغ باغ ہے اسپر حوادثات کی بجلی چمک چمک کر اور کڑک کڑک کر گرے گی۔

یہ عورت ایک ٹوٹے سے کہرے کہٹولے پر صحن میں بیٹھی تھی اور اندر اسکی تین چار ہمجنسیں مختلف کاموں میں مصروف تہیں۔ اس زرد دوپٹہ میں مجہے کوئی چیز کلبلاتی ہوئی نظر آئی وہ کوئی بے جان نہ تہی جاندار تہی اور طاقتور تہی اور یہ کوشش کر رہی تھی کہ کسیطرح اس لپٹے ہوئے دوپٹہ کو ہٹا کر باہر نکلے۔ مگر عورت کی طاقت غالب تہی وہ چاروں طرف سے دوپٹہ کو چھپاتی تہی اور چاہتی تہی کہ یہ قوت اور اسکا یہ فعل ان ہمجنسوں کے علم میں نہ آئے جو سامنے ہیں۔ کچھ دیر تک ان دونوں میں کشمکش رہی اور بالآخر چھوٹی طاقت میں بڑی طاقت کیطرف سے تہوڑی سی محبت شامل ہوئی دوپٹہ سرکا تو میں نے دیکھا کہ ایک ننھا سا بچہ گود میں پڑا دودہ پی رہا ہے نرم رخسار و نپر ہنسی کی جھریاں پیارے پیارے ہونٹو نپر مسکراہٹ۔ اور ماں کے منہ پر ٹکٹکی تہی۔ بچہ کی یہ کیفیت دیکھکر چونکہ میں خود صاحب اولاد تھا کسقدر خوش ہوا ہوں بیان نہیں کر سکتا اسکا ننھا سا دل دنیا کے تفکرات سے

بالکل آزاد تھا اس کی تمام سلطنت ماکی گود تھی جسمیں پڑا ہوا حکومت کر رہا تھا جس پیار اور محبت سے ماکی نگاہیں اس بچہ پر پڑ رہی تہیں وہ کوئی میرے دلسے پوچھے۔ جھکتی تھی طرح طرح کے منہ بنا کر چمٹتی تہی مختلف ناموں سے پکارتی تہی۔ بھینچ بھینچ کر لپٹتی تہی۔ اسکی گود میں ایک ایسی لازوال دولت اور بیش بہا خزانہ تہا جسکی خوشی کا احساس کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا ماتا دماغ میں خیال اور خیال میں بلندیاں دل میں حوصلے اور حوصلوںمیں امیدیں پیدا کر رہی تہی اسکی حرکات قریب قریب مجنونانہ تہیں مگر کچھ ایسی خوشی سے لبریز تہیں کہ اسکا پتہ مجکو ان خوشیوں میں بھی نہ ملا جو ایک ایس دشہزادی کے پاس شب ماہ میں تہیں فرط محبت سے چومتے چومتے خیالات نے امیدونکو جامۂ کامیابی پہنایا چاہتی تہی کہ کلیجہ سے لگا کر ہولے ہولے تھپڑ مارے" دفعتہً ایک ہمجنس سنگدل کی خفگی اور اس فقرے نے اسکی امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔

"کیوں ری اناکمبخت تونے پھر اپنے بچہ کو دودہ دیا"

باقی آیندہ

راشد الخیری۔

رباعی

گلشن میں بہار کی نشانی کب تک
یہ بلبل و گل کی شادمانی کب تک
لازم ہے بشر کو دل نہ دنیا میں پھنسائے
گو خضر ہو کوئی زندگانی کب تک

محمد اظہر حسین اظہر

کلمبس

اہل تاریخ نے جو اسباب امریکہ کے ڈھونڈھنے کے لکھے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام اہل یورپ کو ہندوستان کی راہ ڈھونڈھنے کی فکر تھی اسی کوشش میں اہل پرتگال نے ساحل افریقہ کے کنارے کنارے پھر کر بہت جزائر نکالے اور اُن پر قبضہ کیا۔ اس کے علاوہ مارکو پولو ایک مرد سیاح یورپ سے نکلا اور اُس نے مدتوں خشکی اور تری میں سفر کیا اور اپنے سفر کے عجائب و غرائب بیان کیے کہ جاپان میں اس کثرت سے سونا ہے کہ وہاں کا بادشاہ قصر زریں میں سوتا ہے جس پر تمام سونے کے پتر جڑے ہوئے ہیں اس شخص کا سفرنامہ پڑھکر لوگوں کو اور بھی اشتعالک ہوئی کہ کسی صورت سے ہندوستان یا چین و جاپان پہنچنا چاہیئے۔ جہاز پہلے زمین کے کنارے کنارے چلاتے تھے۔ اس زمانے میں اصطرلاب سے کام لینے لگے اور خط مستقیم دریا میں جہاز کو چلانے لگے۔ اس سے جہاز رانی میں اور بھی آسانی پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں کلمبس ایک شخص تھا اوس نے بطلیموس سے جغرافیہ اور مارکو پولو کا سفرنامہ پڑھا کسی قدر علم ہئیات مسلمانان اندلس سے سیکھا تھا۔ ریاضی سے بھی واقف تھا۔ دریا کا سفر بہت کر چکا تھا اور نئے نئے جزیروں میں پھر چکا تھا اور جانتا تھا کہ زمین ایک کرہ ہے اور جزیرہ جاپان سے یکر جو منتہائے مشرق میں واقع ہے آزور تک منتہائے مغرب میں اہل پرتگال نے ڈھونڈھا ہے آفتاب کے سولہ گھنٹے کی راہ ہے

چوبیس گھنٹے میں فقط آٹھ گھنٹے تمام دور افتاب میں باقی رہ جاتے ہیں۔ ان آٹھ گھنٹوں کی مسافت اگر طے کیجائے تو ضرور ہندوستان یا جاپان کے مشرق میں ہم پہنچ جائیں گے۔ لیکن یہ ثلث (⅓) محیط ارض کی مسافت تھی جسکو اُس نے فقط چار ہزار میل سمجھا تھا۔ اور اس غلطی کے سبب سے اُسکی جرأت اِس مسافت کے طے کرنے پر اور بھی بڑھ گئی تھی کلمبس ایک متعصب نصرانی تھا۔ اندلس میں سلطنت اسلام کا خاتمہ اُس کے سامنے ہوا تھا۔ اور اِس فتح نمایاں کی یہ برکت تھی کہ تمام اہل یورپ کو سارے عالم پر قبضہ کر لینے کی اُمنگ پیدا ہوگئی کلمبس کو ہندوستان و چین و جاپان کی دھن بندھ گئی۔ کہتا تھا کہ ان ملکوں میں پہنچ کر وہاں کی دولت پر قابض ہو کر وہاں سے سونا جہازوں میں بھر کر لاؤں گا۔ اور اِس گنج شائیگاں کو مسلمانوں کے دفع کرنے میں صرف کروں گا۔ اور بیت المقدس سے اہل اسلام کو نکالنے کی کوشش کرونگا اِسی دھن میں یہ تمام شاہان یورپ کے پاس گیا اور اُن سے اعانت کی درخواست کی مگر کہیں دعا نہ قبول ہوئی۔ آخر کو بادشاہ اندلس کے پاس پہنچا۔ اوس نے اسکی تقریر کو سنکر اپنے ملک کے علماء شہر و فضلاء مدرسہ و اصارو راہبان کلیسا کی ایک مجلس مقرر کی کہ کلمبس کا امتحان لیں اور اوسکی تقریر کی تنقید کریں کلمبس نے اپنے تمام خیالات و دلائل اہل مجلس کے سامنے بیان کیئے۔ اُن میں سے اکثر لوگ سنکر متحیر ہوئے اور ساکت رہے۔ لیکن بزرگان کلیسا سے نہ رہا گیا۔ یہ بول اٹھے کہ یہ راے سراسر خلاف کتب مقدسہ ہے جس میں زمین کے مسطح ہونے کی تصریح ہے کون بے وقوف اس بات کو مانیگا کہ زمین گیند کی طرح گول ہے اور اس کے تمام اطراف میں جبنہ اثر اور ممالک ہیں اور ہمارے تلوے اُن لوگوں کے تلوؤں سے

مقابل ہیں۔ جو اُدھر کیطرف کھڑے ہیں۔ حاشا اسے عقل باور نہیں کرتی کہ ہم جس طرح زمین پر سیدھے کھڑے ہیں اُسیطرح ادھر کے لوگ اُلٹے کھڑے ہیں۔ یہ کہیں ہوسکتا ہے۔ سر نیچے ٹانگیں اوپر۔ اور گر نہیں پڑتے۔ خلاصہ یہ کہ اس مجلس سے بے وقوف بنکر کلمبس کو نکلنا پڑا۔ لیکن اکثر عقلا اسکی رائے کے ساتھ متفق تھے۔ انہوں نے کوشش و سفارش کرکے اس کا بیڑا بلا ملکۂ اندلس کے پاس پہنچا دیا۔ اور اُسکی تحریک سے بادشاہ نے تین جہاز دے کر اور کلمبس کو امیر البحر مقرر کرکے دریائے اوقیانوس کے مغربی جانب روانگی کی اجازت دی۔ کلمبس نے روانہ ہونے سے پیشتر نئے مال و ملک میں سے اپنا حصہ مقرر کروالیا۔ تسلط و حکومت کے عہد و پیمان بہت وسعت کے ساتھ طے کرلئے۔ لکھا پڑھی ہوگئی۔ سنہ ۱۴۹۲ء اگست کی ۳۔ تاریخ جمعہ کے دن تینوں جہاز ساحل اندلس سے روانہ ہوئے۔ سب ایک سو بیس آدمی تھے۔ پہلے وہ جزائر کناری میں گیا ایک جہاز کی مرمت کرنے میں وہاں بہت دن رہنا پڑا۔ ستمبر کی ۱۴۔ تاریخ تھی کلمبس نے دیکھا کہ قطب نما کی سوئی نے اپنی سمت کو چھوڑ دیا پہلے کبھی یہ واقعہ کسی کے سننے میں بھی نہ آیا تھا۔ اس نے اسکو بہت لوگوں سے چھپایا مگر چھپ نہ سکی۔ آخر لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ قطب نما کی سوئی سمت نہیں بتاتی اور اس سبب سے سب لوگوں میں نہایت تشویش پھیلی۔ مگر کلمبس نے اُن کو سمجھایا کہ سوئی کی سمت ستارۂ جدی کی طرف نہیں ہے بلکہ کسی نامعلوم نقطہ کیطرف ہے اور جدی ٹھیک قطب شمالی کے مقام پر نہیں واقع ہے۔ بلکہ وہ بھی مثل اور ثوابت کے روزانہ قطب کے گرد پھرا کرتا ہے۔ اِن لوگوں کو کلمبس کے علم و کمال پر ایسا اعتقاد تھا کہ اتنے ہی بیان پر سب کو تشفی ہوگئی آگے چلکر ہوائے مشرقی نے ایسی مساعدت کی کہ بآسانی راہ طے ہونے لگی۔

مغرب کی طرف سے ہری ہری گھانس بہ بہ کر آنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی چڑیاں اکثر جہاز کے گرد مبارک باد دینے کو آئیں مچھلیاں اس قسم کی جو زمین کے قریب ملتی ہیں پیشوائی کو پہنچیں۔ ایک آدھ کیکڑا بھی دکھائی دیا۔ یہ سب علامتیں زمین مغربی کی پیاپے ظاہر ہونے لگیں۔ لیکن اس پر بھی جوں جوں زمانۂ سفر کو طول ہوتا جاتا تھا لوگوں کی بے صبری بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک نوبت پہونچی کہ مشورہ کیا کہ کلمبس کو اٹھا کر دریا میں پھینکدیں اور یہاں سے یورپ کیطرف پلٹ چلیں کلمبس ان باتوں سے بے خبر نہ تھا اپنی حفاظت میں مشغول رہتا تھا اور حکمت عملی کا کام نکالتا تھا۔ کئی بار اُن لوگوں نے پلٹ چلنے پر اصرار کیا۔ اس نے کبھی لالچ دیکر پھسلایا۔ کبھی ڈرا دھمکا کر اُن کی ضد کو ٹالا کبھی شیریں زبانی سے کام نکالا۔ خدا خدا کرکے اکتوبر کی ۱۰-۱۱ کو جزیرہ ہسپانیولا میں جہاز پہنچ گئے۔ پہلے کلمبس نے اُتر کر سجدہ کیا اور زمین سے پسٹ کر بوسہ لیا۔ پھر تمام اہل جہاز نے اوسکی تقلید کی وہ جزیرہ اُن کی نظر میں بہشت کا طبقہ معلوم ہوتا تھا۔ آب خوشگوار کی نہریں، گنجان درخت کیسی کیسی خوبصورت جھاڑیاں، کہیں بڑے بڑے پیڑ جنکے نیچے قافلہ اُتر جائے نئی نئی قسم کے میوے درخت سب گھنگرو کی طرح لدے ہوئے انواع و اقسام کے طیور نغمہ سنج۔ طوطوں کی یہ کثرت کہ جیسے کبوتر کی ساتھ اُڑتے پھرتے ہیں

نعمتیں وادیٔ غربت میں بھی تو نے بخشیں

چھانوں ہے، سبزہ ہے، جنگل کی ہوا آتی ہے

اس بہشت میں اگر اہل اندلس کو حوریں ملیں تو وہاں کے رؤسا کی بہو بیٹیاں یہ سب کے سب مجرد اور وہ سرتاپا برہنہ خوف حاکم وہاں نہ تھا بس آپس ہی میں تلوار چلنے لگے۔ جب ان کو پہلے دیکھا تو وہاں کے لوگ سمجھے

کہ آسمان سے فرشتے اُتر آئے۔ انسان ایسے سُرخ و سفید اونھوں نے کاہیکو دیکھے تھے پہلے زرا جھجکے۔ جھاڑیوں میں چھپ چھپ گئے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد میووں کی ٹوکریاں۔ اُبلے ہوئے آلو۔ میٹھے پانی کی ٹھلیاں۔ جھینگے، مچھلیاں جو جو اُن کے امکان میں تھا لیئے ہوئے آئے اور مہمان نوازی و ضیافت کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ دعوتیں اُنہوں نے کیں۔ ناچ کے جلسے اُنہوں نے کیئے اِن کی خاطر و مدارات کو فرض عین سمجھا سو وہ اُندلس میں بھی خوشی خوشی چلنے کو موجود تھے۔ البتہ بعض جزیروں میں جنگجو قومیں بھی پائی گئیں۔ لیکن جزیرہ کیوبا اور ہسپانیولا کے لوگ انتہا کے خوش اخلاق پائے گئے اور ملنسار نکلے کہ یہاں ایک ایک اندلسی وہ بدہ قریہ بقریہ تنہا سفر کرتا پھرتا تھا۔ مخالفت و مزاحمت کا کیا ذکر۔ ہر مقام پر اسباب راحت و سامان ضیافت اوس کے لیئے موجود تھا کلمبس ملک ہند کی دھن میں نکلا تھا وہ اِن جزیروں کو جزائر ہند و ایشیا ہی سمجھا اور یہاں کے باشندوں کا نام ہندی رکھا۔ جہازوں سے اُترتے ہی اُن لوگوں کو پہلے یہی فکر ہوئی کہ سونا کس جگہ سے نکلتا ہے اسکا پتہ لگانا چاہیئے جس ملک میں مارکو پولو بیان کرتا ہے کہ قصر شاہی سونے کا بنا ہوا ہے وہاں کس قدر کانیں سونے کی ہوں گی۔ اہل جزیرہ سے بہت پوچھا مگر نہ اونکی بات یہ سمجھے نہ اِن کی وہ۔ آخر عورتوں کی ناک میں ذرا ذرا سی سونے کی کیلیں یا بُلاق دیکھکر ان کی جان میں جان آئی کہ یہاں سونا ضرور ہے۔ اور ہمیں ضرور ملے گا۔ اُن سے اشارہ سے پوچھا ؎

اجی یہ عرشِ معلے کے گوشوارے کا
گہر کہاں سے تمھارے بُلاق میں آیا

کہ یہ چیز کہاں پیدا ہوتی ہے۔ اون لوگوں نے بھی اشارہ سے بتا دیا کہ

اوپر جاؤ اور سونا ڈھونڈھو۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ سونے کے بھوکے ہیں۔ جو کچھ سونا
اون لوگوں کے پاس تھا۔ اُنہوں نے بطور ہدیہ پیش کیا۔ کلمبس نے اِس پر اکتفا
نہ کی۔ پوتھ کے گچھے، شیشے کے ترشے ہوئے موتی اُن لوگوں کو دکھائے
جسکو اونہوں نے گڑگڑ کر مول لینا شروع کیا۔ اِس کے پاس بہت سا سونا جمع ہوگیا
اِس تدبیر سے جہاں جہاں سونے کی کان کا پتہ لگتا تھا یا کوئی ساحل موقع
کا نظر آتا تھا کلمبس وہاں اہل یورپ کی بستی بساتا جاتا تھا۔ اور اندلس سے
برابر لوگ چلے آرہے تھے۔ مگر انتہا درجہ کے کثیر الحذر اور حد کے بدگمان۔ جہاں
بستی بسائی پہلے گڑھی بنائی۔ توپیں چڑھائیں۔ فیر کرکر کے اُن غریبوں کے
دل دہلادیے کہ رعب قایم ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ آیندہ یہ لوگ غلامی و فرمانبرداری
میں کسی طرح کا عذر کریں۔ مورخین افسوس کرتے ہیں کہ جسوقت گڑھی کے بننے
میں وہ بیچارے دوڑ دوڑ کر کام کرتے تھے اور ٹوٹ ٹوٹ کر محنت کیے جاتے
تھے۔ مٹی کھود کھود کر اور لکڑیاں لادلاد کر لاتے تھے اُنہیں یہ نہ معلوم
تھا کہ اِس نیکی کی جزا بدی، اِس مہماں نوازی کا صلہ محسن کشی ہے۔
گڑھی بنا کر اور بستی بسا کر کلمبس تو اُندلس کو روانہ ہوگیا۔ یہاں اِن لوگوں نے
زبردستی سونا چھینا اور اُن غریب بیچاری عورتوں پر بیجا و بیجا تصرف شروع
کیا کہ تمام اہل جزیرہ کا دل اِن کی طرف سے سرد ہوگیا۔ حفاظت ناموس کے
لیے جان دینا اور لڑنا صفت انسانی ہے جو اُن میں بھی موجود تھی۔ توپوں
اور بندوقوں کے مُنہ پر جا پڑے جانیں دے دیں۔ زر۔ زمین۔ زن۔ مایہ شر و فساد
ہے۔ آپس میں بھی آخر کار چھڑ گئی۔ خود گڑھی کے لوگوں میں بھی اتفاق نہ رہا
ایک نے ایک کو قتل کیا۔ افلاطون کی رائے تھی کہ عورتوں سے رسم ازدواج
اور جاگیر و جائداد پر سے ہر شخص کا قبضہ مالکانہ اٹھا دینا چاہیے۔ کہ یہ باتیں اتحاد

تمدن کے منافی ہیں جیسے حکیم یونانی۔ یہ چاہتا تھا کہ نکاح سے جو ایک پابندی عورت کو ہو جاتی ہے اُس سے بھی اس کو آزاد رہنا چاہیئے پارسیوں کے اواخر دولت میں مزدک ایک شخص افلاطون کا ہم مشرب پیدا ہوا۔ بادشاہ ایران نے اسکی متابعت کی اور لاکھوں آدمی اس کے اشجاع و انصار میں داخل ہو گئے اور زر زمین زن میں تمام ابنا جنس کا حق مشترک سمجھا جانے لگا۔ لیکن اتنا عرصہ نہیں گزرنے پایا کہ دیکھتے یہ اونٹ کس کل بیٹھتا ہے کہ کسریٰ نوشیرواں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ اور اس نے مزدک کو اعوان و انصار سمیت قتل کروا ڈالا۔ اور بہت جلد اوس مذہب کا خاتمہ ہو گیا۔ غرضکہ اندلس کے ترسایان زاہد شرب ان عورتوں کا حسن بے حجاب دیکھکر از خود رفتہ ہو گئے اپنے میزبانوں کو بد دل بنا لیا۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کشت و خون کیا بعض انیں سے وہاں کے سرداروں کی بیٹیوں کو بھگا کر اندلس لے گئے +

کلمبس کا بڑی دھوم دھام سے یورپ میں استقبال ہوا۔ شاہی رسالہ اوسکی اردلی میں چلنے کے لئے بھیجا گیا جس جس شہر میں سے ہو کر گزرا۔ تمام راہوں میں تماشائیوں کا مجمع عام کوٹھیوں پر نظارگیوں کا اژدہام نظر آیا چھ شخص امریکہ کے اوسیطرح سے سر پا تک رنگے ہوئے جیسی اونکی عادت تھی آگے آگے اوس کے چل رہے تھے۔ اور وہاں کے طیور و مواشی جو نئی قسم کے تھے وہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ بادشاہ اندلس نے تخت سے اُٹھکر اوسکی تعظیم کی۔ یورپ کے امرا دُور دُور سے اوسکی ملاقات کو آئے بہیرقیں لگائی گئیں۔ آئینہ بندی شہر میں ہوئی۔ جیسا کہ سلطنت روم میں کسی بڑے فاتح کا استقبال کیا جاتا تھا اوسی طرح کلمبس کا استقبال ہوا۔ فرڈنیڈ بادشاہ اندلس نے ایک تہنیت نامہ یورپ کی خدمت میں روانہ کیا کہ

سلطنت نصاریٰ کو ایک تازہ نعمت ملی۔ لیکن اوس زمانہ میں یورپ کی دو ہی سلطنتیں سمندر میں جزائر و ممالک کے ڈھونڈھنے میں مصروف تہیں۔ اوّل تو اہل پرتگال۔ اور دوسرے اہل اندلس۔ اس واسطے پوپ نے ایک حد مقرر کرنا چاہی کہ آپس میں نزاع نہو۔ ان دنوں پوپ اعتقاد نصاریٰ یورپ میں جانشین حضرت عیسیٰ اور نفترض الطاعۃ سمجھا جاتا تھا۔ دونوں بادشاہوں کے مابین یہ حد مقرر کی کہ جزیرۂ ازورس اور اس جزیرۂ ڈی ورڈی کے مغرب میں تیرہ سو میل کے اودھر جتنے جزائر و ممالک کا شمال سے جنوب تک پتہ لگے ان کی حکومت اندلس کے واسطے ہے۔ اور ادھر کے ملک اہل پرتگال کی سلطنت سے ملحق کیئے جائیں۔ اوس وقت تو یہ تقسیم محض خیالی تہی۔ مگر آیندہ اس کا یہ اثر ہوا کہ جنوبی امریکہ کا بڑا ملک برازیل پرتگال والوں کو مل گیا۔

۲۵ ستمبر ۱۴۹۳ء علی الصباح کلمبس پھر امریکہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ بہت سے بیپاری اور کاشتکار اور صناع و معمار اور پیادہ و سوار بحکم شاہی اور کتنے ہی لوگ سونا پیدا کرنے کی ہوس میں متعدد جہازوں میں سوار ہوکر امریکہ جا پہنچے۔ اور کلمبس نے اچھی جگہ دھونڈھ کر سونے کی کانوں کے قریب اہل یورپ کی بستی بسائی اور کچھ پیادہ و سوار ایک افسر کے ماتحت کر کے تمام جزیرہ میں پھرنے کا اور رعب قایم کرنے کا حکم دیا۔ اور خود جزیرۂ کیوبا کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں کے لوگ جدھر جدھر یہ گیا اس کے جہازوں کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے +

(باقی آیندہ)

انقلاب

گذشتہ اشاعت سے آگے

رات بھر کا جاگا ہوا مریض اُٹھا تو دن چڑھے اُٹھا، مگر درد میں افاقہ نہ ہونا تھا نہ ہوا! لیکن پھر بھی رات اور دن میں، زمین آسمان کا فرق ہے۔ نوکر چاکر، بول چال، آمد و رفت، کچھ نہ کچھ وہمیان بٹتا ہی تھا، اور تھوڑی بہت کمی ہوتی ہی تھی۔ اُن رئیس صاحب کو بھی خبر ہوئی، میاں رشید کے شاگرد بھی دیکھنے آئے، اور اب دو چار صورتیں اُنکی پٹی کے گرد نظر آنے لگیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن بیچارے رئیس صاحب نے بہت کچھ کوشش کی۔ حکیم کو بلوایا، نسخہ لکھوایا، دوا منگوائی، ٹھنڈائی بلوائی، مگر درد بالکل نہ تھما۔ ہاں! رہ رہ کر کسک ہوتی تھی! تھم تھم کر کسک ہوتی تھی! لیکن جب اُٹھتا تھا تو، توبہ توبہ، چھکے ہی چھڑا دیتا تھا۔ بلکان ہی کئے دیتا تھا۔ اِسی تکلیف میں آفتاب خط نصف النہار کو پھلانگ گیا، دن ڈھلا، اور تہانے کے گھنٹے نے دو بجائے۔ اِسوقت رشید پھر تھوڑی دیر سے اکیلے تھے، کہ ایک ڈاکیہ اندر گھسا اور دو خط ہاتھ میں دے گیا۔ خط ہاتھ میں لیتے ہی اِنہوں نے لیٹے لیٹے ایک خط کے لفافے سے کچھ پہچان کر پہلے اُسے کھولا، اور دل ہی دل میں پڑھنے لگے: لکھا تھا

"میاں رشید احمد صاحب!"

"آپ کا خط نہیں، بلکہ والا نامہ صادر ہوا۔ غریب اور سن رسیدہ باپ کو عزت بخشی۔ شاباش! شاباش!! شرمیلے، اور ناک والے ایسے ہی ہوتے ہیں!!! افسوس! صد افسوس!! میں اُسوقت کو نہیں پاتا جب کہ تم جیسے عقلمند اور ہونہار صاحبزادے میرے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ اچھا ہوتا کہ تمھاری

قسمت سے مجھے آگاہی ہو جاتی! اور میں تمہیں زندہ درگور کر کے تمام عمر کے
لیئے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ لیتا، مگر اس روسیاہی اور بدنامی سے تو چھوٹ جاتا
کیا یہ میرے کلیجے میں برچھیاں چلانے والی بات نہیں ہے کہ جس رشید
کے میں نے پچاس روپے ماہوار مقرر کئے، جس کی خوشی کو اپنی مرضی پر مقدم سمجھا
جس کے واسطے بیس روپے مہینے کا ماسٹر رکھا؛ وہ بچپیس روپلی پر گھر بار
کو چھوڑ، در بدر خاک بسر پھرتا ہے؟ کیا کروں؟ مجبور ہوں، لاچار ہوں،
نہ پائے رفتن نہ طاقت ماندن؛ روتا ہوں! اور یا نصیب و یا قسمت کہہ کر رہ جاتا ہوں
تم مجھے لکھتے ہو کہ میں جب سے آیا ہوں، نوکر ہوں، سچے ہو، آخر تم مجھے کیا سمجھتے
ہو؟ کیا میں نے یہ سر دھوپ میں ہی سفید کیا ہے؟ میرے لایق برخوردار!
میں بھی غدر کے ایام میں یک لخت دو برس بھوپال میں رہ چکا ہوں، وہاں
کی حالت سے واقف ہوں، ابھی بھولا نہیں ہوں، اور اب بھی میرے دو ایک
مرے گرے روشناس وہاں زندہ ہیں، جنکی بدولت آپکے اشغال و
و اطوار خوب خوب معلوم ہوتے رہے ہیں۔ خیر جو کچھ کیا اچھا کیا! اور جو کچھ
کرتے ہو اچھا کرتے ہو، تم جانو تمھارا کام، مجھے کیا؟ مجھ سے معافی چاہتے
ہو، اور اس سے خطا معاف نہیں کراتے جسکے خطا وار ہو، جسکی حق تلفی
کی سزا میں گرفتار ہو اور جسپر تم نے وحشیانہ ظلم کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ
تمہاری طبیعت پاجی پرست ہے، تم شریفوں کی قدر کیا جانو؟ خیر تم آنکی
اجازت مانگتے ہو۔ آؤ! تمھارا گھر ہے؛ لیکن ایک غیور دل اور ایک عالی دماغ،
لیکر آنا۔ اور بے حیائی اور بد اطواری کا جامہ، جو تم نے مدت دراز سے
زیب تن کر رکھا ہے، ہمیشہ کے لیے اتار کر آنا۔ اِسطرح آؤ تو آؤ! ورنہ
کبھی بھولکر بھی اِس دہلیز پر قدم نہ رکھنا! جہاں تمہاری طبیعت چاہے

جاؤ! اور جسقدر خاک چاہو اڑاؤ! نہ آیندہ کبھی مجھے خط لکھنے کی جرأت کرنا! اور نہ کسی سے یہ کہنا کہ میں تمھارا باپ ہوں! ہم سب تمھارے لیئے مر گئے! اور تم ہماری طرف سے دنیا میں نہیں ہو!! فقط راقم تمھارا بدنصیب ناصح ......

آپ سمجھ سکتے ہیں اس خط نے کیا کیا؟ نہ پوچھیے۔ ایک غریب الوطن، ایک بیمار، ایک غمزدہ کی آس توڑ دی۔ اُس کا دل بے چین ہوا، اُس کی طبیعت بگڑی، اُس کا درد بڑھا، اُس کی تکلیف میں زیادتی ہوئی، اُس نے ضبط کرنا چاہا، مگر کہاں وہ دیکھیئے گرم گرم آنسو نکل ہی پڑے! لڑیاں بندھ گئیں!! اور وہ دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر رونے لگا!!! ہائے! خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے مصیبت بُری بلا ہے۔ یہ انسان کے حواسوں پر بنا دیتی ہے، یہ دماغ کو معطل کر دیتی ہے، رشید گھنٹہ بھر رویا مگر دوسرے خط کا خیال بھی نہ آیا۔ جب آنکھوں نے کسیقدر فرصت دی، اور آنسوؤں کا سیلاب رُکا تو دوسرا خط یاد آیا: جسکو اسنے نہایت بے یوسی کے ساتھ کھولا، اور رک رک کر پڑھنے لگا۔ وہ الفاظ جنپر اسکی نظریں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں یہ تھے:-

"میرے پیارے شوہر!"

آج بہت دنوں کے بعد تمھاری خیریت اباجان کی زبانی معلوم ہوئی جس روز سے تم گئے ہو کسی طرح طبیعت کو قرار ہی نہیں، رہ رہکر یہ ہی سوچتی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو کر گئے ہو، سوائے اس کے اور کوئی جانیکی بات نہ تھی۔ میں غریب لاچار ہوں، اور سوائے خدا کے اور تمھارے کوئی میرا وارث و نگران نہیں۔ جب تم ہی ناراض ہو گئے تو بتاؤ میں کس امید پر جیوں۔ میں ہر وقت خطاوار ہوں، قصوروار ہوں، بری ہوں، نالایق ہوں، بدنصیب ہوں مگر تمھاری ہوں۔ تم اگر ناراض ہو تو خدا کے لیئے معاف کر دو، میں ہاتھ جوڑ کر معاف کراتی ہوں۔ اور ہاں! مجھ دکھیاری سے خفا ہو کر تم اپنا بھرا پُرا گھر کیوں چھوڑتے ہو؟ میں حاضر ہوں، تم آؤ! اور جو کچھ سزا چاہو مجھے دو۔ میں اگر

ہوں بھی کروں، یا مجھے دریغ ہو تو جو چور کا حال سو میرا حال. واقعی مجھ سے تمھیں آرام نہیں پونچا۔ میں بدتمیز ہوں، جو کچھ ہوں تمھاری لونڈی ہوں۔ میرا کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں جہاں میں جا پڑوں۔ صرف تمھارا گھر ہے جسمیں ساری عمر تیر کرنی ہے. اگر کوئی ایسا بڑا قصور مجھ سے ہوگیا ہے جو تم معاف نہیں کرسکتے تو خیر میں اِس دنیا ہی کو چھوڑ دونگی۔ جاؤں گی، مگر تمھاری دہلیز سے زندہ نہ جاؤنگی۔ فقط"

"تمھاری خطاوار۔ بدقسمت زُبیدہ"

گرم سُرخ توے پر ٹھنڈے پانی کا چھینٹا کیا کرتا ہے؟ اور گرمیوں کی تپتی ہوئی زمین پر دس پانچ منٹ کی بارش کیا اثر دکھاتی ہے؟ یہ ہی نا! کہ اور زیادہ بھڑکا دیتی ہے، بخارات کے بھپکے دُگنے ہو جاتے ہیں۔ بس یہ ہی زبیدہ کے نرم اور ملایم الفاظ نے کیا۔ رشید کی سنبھلنے والی طبیعت پھر گھٹی، پھر گذری ہوئی باتیں یاد آئیں، اور پھر کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ یہ گھبرا کر اُٹھے، پھر بے چین ہو کر لیٹے، اور پھر اشک اُمڈے برس گئیں آنکھیں، یہانتک کہ دل اِن کے اختیار سے باہر ہوا اور انھوں نے بہت زور سے ہائے ہائے کے نعرے مارنے شروع کر دیئے۔ اِس غُل میں وہ رئیس صاحب بھی آ گئے، اور اُنھوں نے گھبرا کر حکیم صاحب کے بُلانے کے ساتھ ہی، ان کے والد کے نام ایک تار بھی دے دیا کہ "رشید سخت علیل ہیں، فوراً آؤ"۔ ایک دن اور ایک رات غریب رشید کو بڑی تکلیف میں کٹا، کہ دوسرے روز اُن کے بہنوئی آئے اور رات کی گاڑی سے غم زدہ اور بیہوش رشید کو اپنے ساتھ لے گئے۔

(باقی آیندہ)

اُردو سبھا

بعض حضرات پوچھتے ہیں کہ جب اُردو سبھا کی تحریک ہر طرح سے پسند کی گئی ہے اور اطراف وجوانب سے اُس کی تائید ہوئی ہے تو قایم ہونے میں اب دیر کیا ہے۔ فوراً ایک جلسہ کیا جائے اور اس کی بنیاد ڈالدی جائے اُن حضرات کی ہمدردی اور گرمجوشی تو قابل شکریہ و داد ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ انہوں نے میری ابتدائی تجویز کو غور سے نہیں پڑھا۔ کیونکہ اس میں یہ صاف لکھا تھا کہ آیندہ سال یعنے ۱۹۱۱ء میں کوئی تاریخ اُردو سبھا کے پہلے جلسہ عام یا کانفرنس کے لیے مقرر ہو گی۔ اور وہ جو ایک جلسۂ مشورہ اس سے پہلے منعقد ہونا ہے۔ اس کے لئے بھی میرا خیال یہ ہے کہ کوئی ایسی تاریخ مقرر ہو کہ باہر سے جو صاحبان شریک ہونا چاہیں وہ بہ آسانی شامل جلسہ ہو سکیں۔ جتنی بڑی اور جتنی عالیشان یہ تجویز ہے۔ اس کا اہتمام بھی ہر اعتبار سے اسی پیمانے پر ہونا واجب ہے۔ یہ مناسب نہ ہو گا کہ اس کا کوئی جلسہ بالکل مقامی حیثیت رکھے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ کچھ صاحب دوسرے مقامات سے بھی شریک ہو سکیں اور کم از کم دور و دراز مقامات کے احباب کی رائیں فیصلۂ غلب امور کی نسبت پہنچ سکیں۔

اُردو جسقدر محتاج خدمت و توسیع ہے اُس کا احساس اب عام ہوتا جاتا ہے اور جا بجا مجلسیں قایم ہو رہی ہیں۔ جن کا مقصد اُردو کی خدمت اور ترقی ہے ان سب مجالس کے قایم ہونے سے مجھے سچی مسرت ہوتی ہے اور انہی سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ اگر اُردو سبھا کی وہ صورت جو میرے

ذہن میں ہے عالم خیال سے عالم وجود میں آگئی تو اِن انجمنوں کے کارکن اِس کے دست و بازو ہوں گے۔ اور یہ نہ صرف امید ہی امید ہے۔ بلکہ بعض مجالس کی طرف سے مجھے اِس قسم کی امداد کا یقین بھی دلایا گیا ہے۔ چنانچہ لاہور میں کچھ عرصہ سے ایک سوسائٹی بزم اُردو کے نام سے قایم ہے اُس کے اراکین نے ایک وفد کے طور پر تشریف لاکر اپنے اِس عزم کا اعلان کیا۔ کہ وہ ہر طرح کی امداد اُردو سبھا کے قایم ہونے کے موقعہ پر دیں گے اِس سوسائٹی کے ہفتہ وار جلسے کچھ عرصہ سے شروع ہوئے ہیں۔ جن میں اچھے اچھے مضامین نظم و نثر پڑہے جاتے ہیں۔ دو جلسوں میں مجھے بھی شریک ہونے کا موقعہ ملا ہے اور مینے اُن جلسوں کو مفید اور کارکنانِ بزم کو شوقِ خدمت اُردو میں سرگرم دیکھا۔ بزم اُردو کے جلسوں کی خبر اخبارات میں پڑھکر اور ایک جلسہ میں میرا نام بہ حیثیت صدر جلسہ پڑھ کر کچھ لوگوں نے مجھے خطوط لکھے ہیں۔ جن میں مجھے "بزم اُردو" قایم کرنے پر مبارکباد دی ہے مینے اِن حضرات کو نجی خطوط میں تو اطلاع دے دی ہے اور اب بذریعہ رسالہ بھی رفع شک کرتا ہوں۔ کہ "بزم اُردو" کے قایم کرنے میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ حاجی رحیم بخش صاحب۔ منشی بشیر حسین خاں صاحب۔ مولوی محمد حلیم صاحب انصاری خواجہ دل محمد صاحب ایم۔ اے۔ و دیگر اصحاب "بزم کے بانیوں اور ممبروں میں ہیں۔ میں فقط اُس کے بہی خواہوں میں ہوں۔

مخزن بابت ماہ مئی کے بعد جسمیں وہ خطوط شائع کئے گئے تھے جو ہر مذہب و ملت کے احباب کیطرف سے اُردو سبھا کی ضرورت کے متعلق آئے تھے۔ اِس قسم کی تائیدوں اور حوصلہ افزائیوں کی اطلاع شائع نہیں ہو سکی۔ اس اثنا میں معززین معاصرین میں سے

دو رسالوں نے زبردست تائید کی ہے۔ جو خصوصیت سے قابل ذکر ہے سب سے بڑھ کر امید دلانے والی تائید تو لکھنؤ سے آئی ہے۔ میرے نزدیک لکھنؤ سے اُردو سبھا کی حمایت کی صدا بلند ہونا گویا اس تجویز کا چل نکلنا ہے کیونکہ لکھنؤ زبان اُردو کا ایک بہت بڑا اور مستند مرکز ہے۔ وہاں کچھ عرصے سے ایک گلدستہ نظم و نثر کا نکلتا ہے جس کا نام معیار ہے۔ اور جو اپنے رنگ میں ایک اعتبار خاص حاصل کر چکا ہے۔ اسمیں دو مضمون لکھنؤ کے دو مشہور مضمون نگاروں کے قلم سے نکلے ہیں۔ میرے غائبانہ عنایت فرما میرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی نے اس تجویز کی تائید بالفاظ ذیل کی ہے

"دسمبر ۱۹۰۰ء کے رسالہ مخزن میں شیخ صاحب کی ایک مہتم بالشان رائے دیکھکر اُردو کے بہی خواہوں کو جو مسرت ہوئی اس کو ان کا دل ہی جانتا ہے۔ کیونکہ یہ تجویز ایسی نہیں کہ کسی ہمدرد کے دماغ میں نہ پیدا ہوئی ہو مگر اسکی اہمیت نے کسی کو ابھرنے نہ دیا۔ اس وقت یہ تحریک اُن کی منہ مانگی مراد ہے۔ جناب شیخ صاحب! آپ کا قدردان عزیز۔ اور انجمن معیار آپ کی اس بیش بہا تجویز پر اتفاق کا ہاتھ اٹھائے ہے جس قدر کام ہم لوگوں سے ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے ذمہ ہمت پر لینے کو تیار رہیں۔ عمل کارروائی شروع ہوتے وقت اس کے دستور العمل پر گہری نظر ڈالی جائے گی۔ اس وقت تائید کی آوازیں بلند ہیں۔ کہ اُردو کو ایک ایسی مجلس کی سخت ضرورت ہے"

دوسرا مضمون جو معیار میں شائع ہوا ہے وہ جناب محشر لکھنوی کے قلم سے نکلا ہے اس میں سے یہ تھوڑا سا اقتباس بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

ہمارے دوست اڈیٹر مخزن کی تحریک اور تجویز پر لکھنؤ یا دہلی کے

علاوہ اور اہل قلم کمر ہمت مضبوط باندھ لیں تو بہت جلد یہ خارزار گلستاں نظر آئے گا۔ کسی جگہ اور کسی مقام پر کوئی متنفس ایسا نہیں جو شیخ عبدالقادر صاحب کی اس بیش بہا تجویز کا تہ دل سے لبیک کہکر موئد نہ ہو۔ ہم سب ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہماری زبان اُردو ہے اس اُردو کے دامن عاطفت میں جن جن علوم نے پرورش پائی اس کو سب جانتے ہیں۔ بڑی بڑی مبسوط کتابیں۔ دیگر علوم کے درس و تدریس کے وقت انجام کار زبان عالم سے متعلم کے سامنے اُردو میں حل ہو کر پانی ہو جاتی ہیں۔ واعظوں کے دل و دماغ میں جو کچھ ہی ہو اسکو خدا جانے مگر منبر پر زبان اُردو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لکچرار کوئی ڈگری کیوں نہ حاصل کئے ہوئے ہو۔ اس کے خیالات عرش کمالات کی اعلیٰ بلندی پر متمکن ہوں۔ لیکن اسٹیج پر ہزاروں اَن پڑھ سننے والوں کے افہام و تفہیم کے وقت اُردو ہی سے مشکل کشائی ہوتی ہے۔ نامی نامی اخبار انگریزی یا کسی اور زبان میں ہوں۔ اُن کے روشن صفحات پر قابل نامہ نگاروں کے مضامین کی یہ حالت رہتی ہے کہ جیسے جواہر اور در بابیا دشاہ۔ مگر اُردو میں ترجمہ ہونے کے بعد یہ صورت ہوتی ہے کہ جیسے بارش باران رحمت۔ اور فائدہ عام۔

یہ تائیدی رائیں جو اب آ رہی ہیں۔ ان میں بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ محض شخصی رائیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ایک جماعت ایک ایک گروہ کی رائے ظاہر کرتی ہیں۔ رسالہ ترقی نے جو لاہور میں عیسائی "ریلجس بک سوسائٹی" کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اپنے جون کے پرچہ میں ایک مدلل مضمون "اُردو سبھا" کے عنوان سے لکھا ہے۔

جس سے کامل اُمید پڑتی ہے کہ ہماری عیسائی دوست اِس تحریک میں ہمارا ہاتھ بٹانے سے دریغ نہ کریں گے۔ اِس مضمون میں سے بھی تھوڑا سا حصہ بطور نمونہ درج کرنا ضروری ہے:۔

"ہمیں ہماری حالت پر سخت افسوس آتا ہے کیسی علم وفن کی ترقی کے واسطے کوئی سوسائٹی موجود نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی ہے بھی تو تحقیقات اِس کا مقصود نہیں۔ بلکہ اختلافات اور تنازعات باہمی کو بڑھانے اور دوستانہ تعلقات کو برباد کرنے کی کوشش کرتی ہے ایسی کوئی انجمن نہیں ہے۔ جس کا مقصود ایسا وسیع اور اعلےٰ ہو جس کی ترقی کے لیئے تمام فرقے اور گروہ مل کر کوشش کریں اور ہمارے ہاں کی ہفت رنگی آبادی اس میں دل وجان سے شریک ہو۔ اِس ضرورت کو ہمعصر مخزن کے پروپرائٹر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر نے محسوس کرکے اُردو سبھا کے قیام کی تحریک پیش کی ہے اور اپنے رسالہ میں ہر مہینے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ اِس کی غرض زبان اُردو اور اِس کے ادبیات کی ترقی اور اشاعت ہے۔ اِس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ اور سبھاؤں اور انجمنوں کو جو اِسی قسم کے اغراض ومقاصد کی بہبودی وبہتری کے واسطے قایم کی گئی تھیں۔ نقصان پہنچائے۔ شیخ صاحب موصوف کی تجویز نہایت معقول ہے۔ ہمیں اِس سے پوری ہمدردی ہے"

رائیں تو اور بھی بہت سی قابل اندراج ہیں مگر اِس مرتبہ انہی دو تین انتخابات پر اکتفا کرتے ہیں اُن سب حضرات سے جو مشورہ ابتدائی میں شریک ہونے پر آمادہ ہوں یہ دریافت کرنا چاہتا

ہوں۔ کہ اکتوبر میں کوئی تاریخ اِس جلسہ کے لیئے مقرر کرنے کی نسبت اُن کی کیا رائے ہے۔ ماہ اکتوبر کا آخری شنبہ و یکشنبہ یعنے ۳۰۔ و ۳۱۔ تاریخ بظاہر موزوں دن ہیں۔ اگر اُن پر کثرت رائے سے اتفاق ہو جائے۔

احباب جلد اپنی رائے سے مستفید فرمائیں تو کوئی تاریخ ابتدائی جلسۂ مشورہ کے لیئے مقرر کی جائے۔ اور اِس میں یہ بھی طے ہو جائے کہ کانفرنس یا جلسۂ عام سال آئندہ میں کہاں اور کن دنوں میں منعقد ہو۔

عبد القادر

غربت

سہتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں — راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں

سو شغل ہیں پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں — پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں

سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے

اندوہِ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد — جاتی نہیں افسردگیٔ خاطرِ ناشاد

جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد — ہر گام پہ دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد

اِک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ہوتی

منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر — منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر

جب ہو سفر خوف پریشان ہے خاطر — شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر

ہر طرح مسافر کے لیے رنج و تعب ہے

رہ جائے پسِ قافلہ تھک کر تو غضب ہے

زائیں؟

دو ستارے

آئے جو قِراں میں دو ستارے کہنے لگا ایک دوسرے سے
یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب انجام خرام ہو تو کیا خوب
تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو
ہم دونو کی ایک ہی چمک ہو
لیکن یہ وصال کی تمنا پیغام فراق تھی سراپا
گردش تاروں کا ہے مقدر ہر ایک کی راہ ہے مقرر
ہے خواب ثبات آشنائی
آئین جہاں کا ہے جُدائی
اقبال

رایتِ اسلام

افسوس کی بات ہے کہ حضرت بیانؔ یزدانی مرحوم جیسے قادر الکلام اور باکمال شاعر کلام ایسے پردۂ گمنامی میں چھپا ہو کہ ڈھونڈھے سے بھی نہ مل سکے حال میں ایک صاحب (جنکا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں) رامپور تشریف لائے مجھ سے بھی ملاقات ہوئی معلوم ہوا کہ شاعر ہیں۔ اُن کے شعر سننے ایک مرتبہ وہ حضرت میرے مکان پر تھے مینے اُن سے کلام سنانے کی فرمائش کی کہا کہ مینے ایک مشہور قصیدہ پر تضمین کی ہے جسکا مطلع ہے۔
شب سر شوریدہ بالیں پر مرا اک جانہ تھا دلمیں تھا اِک جوش لب پر نالۂ مستانہ تھا

مینے قبل اُن کی تضمین سننے کے یہ کہدیا کہ حضرت بیان ویزدانی نے بھی اس قصیدہ پر تضمین کی ہے سو وہ میرے پاس ہے۔ یہ سنتے ہی اُنھوں نے اپنی تضمین تہ کرکے جیب میں رکھ لی اور فرمایا کہ اول آپ وہ تضمین سنایئے مینے بہت اصرار کے بعد سنائی کہا کہ اب میں اپنی تضمین نہیں سنا سکتا اسلیئے کہ اسکی بندش سست ہی۔ ٹھیک کرکے سناؤں گا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ بجنسہ وہی تضمیں ہے جو بیان مرحوم کی میرے پاس تھی۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ ایک کتاب میں بھی میرے کئی مسدس وغیرہ ہیں مینے دیکھا تو اُسمیں سب کلام حضرت بیان کا ہے۔ افسوس ایسے باکمال شاعروں کا کلام ایسے نااہل اور ناقدرشناس لوگوں کے ہاتھ لگ جائے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ ابتک اُن کا کلام بحیثیت مجموعی کہیں نہیں چھپا۔ حضرت بیان کی یہ نظم جو آج ہدیہ ناظرین کرتا ہوں کہیں پرانے کاغذوں میں مل گئی تھی۔

حامد حسین قادری بچھرایونی

سناؤں ہمنفس آ تجھ کو داستاں اپنی
کہ تھا میں گردش گردوں سے ایک شب محزوں

یہ مجکو اپنی پریشانیوں سے کھٹکا تھا
کہ انتہائے تردد سے ہو نجائے جنوں

پڑا پلنگ پہ چت دونوں ہاتھ ملتا تھا
کہ دور سے نظر آتا تھا طالع واژوں

ہوا یہ ضعف کہ یکبار ہوگئی بند آنکھہ
پڑا کچھہ آنکھہ کے پردہ پہ خواب نے افسوں

فضلئے عالم رؤیا میں سیر کو نکلا
میں ایک سمت جو پہونچا تو دیکھتا کیا ہوں

پڑا ہے جانب مشرق لٹا ہوا اک شہر
اور اُسکے حال پہ روتے ہیں بام و سقف و ستوں

مٹے ہوئے نظر آئے بہت سے نقش و نگار
گرے ہوئے نظر آئے مکان بوقلموں

ہے وسط شہر میں افتادہ اک رفیع حصار
پر اُس کھنڈر سے نمایاں ہے قدرت بیچوں

اور اُس حصار میں دارالامارہ کی دیوار
ڈھئی ہوئی بھی ہے کو شکوہ سے افزوں

کھڑا ہوا ہے نشاں اُسکے بابِ عالی پر
گرا ہے کوہ الم اسلیئے کمر ہے نگوں

زبسکہ ضبط کا یارا نہ تھا میں رہ نہ سکا
علم کے پاس گیا لیکے انتشار دروں

دھواں یہ سنکے اُٹھا اُس علم کے سینے سے
اور اس ہوئیں سے ہوئے نالے اسطرح موزوں

کہ ہے بیاں یہی بستی مدینۃ الاسلام
میں ہی ہوں رایت دینِ خدائے کن فیکوں

تو دیکھتا ہے اس اجڑے ہوئے دیار کو کیا
چراغِ چشمِ جہاں تھا یہ بقعہ مسکوں

شہوں کو فخر تھی اِس در کی آستاں بوسی
سرِ نیاز جھکاتا تھا گنبدِ گردوں

جہاں کے ذی ہنروں کا ہجوم تھا اتنا
کہ یہ زمین تھی ستاروں سے بہر فلک سے فزوں

وہ اُنکی چاند سی پیشانیاں چمکتی تھیں
کہ اُنسے لیتے تھے انجم سعادتوں کے شگوں

اِسی سواد میں روشن تھا معرفت کا چراغ
یہیں تھیں جلوہ نما نورِ کبریا کی شیوں

لگا ہوا تھا وہ اعجازیاں کی ٹھوکر سے
کہ چل سکا نہ کسی کا کبھی فریبِ فسوں

زمیں لرزتی تھی جنبش سے جن شجاعوں کی
وہ میری چھاؤں میں رہتے تھے سب جنود و قشوں

لیا اوتار سرِ یزدجرد سے دیہیم
کئے خراب موتوقش کی بارگہ کے ستوں

سموں سے پرزے کیا رومیوں کے قاقم کو
قدم سے ٹکڑے کیا رومیوں کا سقلاطوں

کلاہِ خسروِ ایران کا بیخ کیا اطلس
قبائے ہرقل رومی کا لٹ گیا کسوں

سپہر گونج رہا تھا یہاں کے ڈنکے سے
تھی چار دانگ جہاں میں کُڑم کُڑم دُنیدوں

جنہوں نے صورتِ فرعون سر اُٹھایا تھا
یہاں کی گرد سے دب دبکے مٹ گئے قاروں

یہیں کے ڈر سے شہنشاہ بولجاتے تھے جیں
یہیں کی دھاک سے منہ زور کر نہ سکتے تھے چوں

اِنہیں کی قوت بازو سے ہٹتے تھے کہسار
انہیں کی جنبشِ زانو سے ہلتے تھے ہاموں

وہ اپنے خون سے غزا میں سنگہار کرتے تھے
کہ فتح و نصرت و اقبال اونپہ تھے مفتوں

اِسی سبیل سے سیراب تھے زمین و زماں
اسی سحاب سے شاداب تھے علوم و فنوں

آہ آہ

وہ لہر بہر وہ ٹھاٹھ آسمان نہ دیکھ سکا — وہ شان بان مٹا کر رہا زمانۂ دوں
بتا کہاں ہے؟ وہ عباسیوں کا جاہ و جلال — کہ جن کے حال پہ بغداد رو رہا ہے خوں
کیا تنزل عالم نے سبکو زیر و زبر — جو تخت پر تھے مکین زیر تختہ ہیں مدفوں
زمیں کے تنگ شکنجہ میں پھنس گیا منصور — لحد کے کیڑے مکوڑوں میں بٹ گیا مامون
جہاں میں گونجتے تھے جنکے نعرۂ تکبیر — گئے وہ شہر خموشاں میں چپکے چپکے یوں
پہنکے بیٹھتے تھے جو حریر عنبر و بہا — ہوئے اٹی ہوئی کملی سے خاک میں مکفوں
گیا ہے دین حجازی کا قافلہ وہ بچھڑ — وہ ساربان وہ شتر وہ سوار ہیں ہیہوں

رایت اسلام کہہ رہا ہے

تھے اپنے سایۂ رحمت میں جو گل دستار — تھے اپنے دامنِ دولت میں جو درِ مکنوں
پڑے ہیں آج جدا میرے سرخ پرچم سے — طبق زمین کا جن موتیوں سے تھا مشحوں
لگائے رہتے تھے چھاتی سے مجکو جو شہزور — اٹھاتے تھے وہ مری جھونک ہوتے تھے ممنوں
کھڑا ہوں خاک پہ چپ چاپ سا تحیر میں — کہاں گئے وہ رفیق اور کدہر وہ راہنموں
وہ مجکو جانتے تھے سرو قامت اک معشوق — تھی زلف لیلی پرچم سے الفتِ مجنوں۔

نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

ابرِ نوبہار

بپاس خاطرِ رندانِ بادہ خوار برس — برس برس کے دن اے ابر نوبہار برس
دعائیں مانگی ہیں ساقی نے کھولکر زلفیں — بسانِ دست کرم ابرِ دجلہ بار برس

کمی نہ بادہ پرستوں کے جوش میں ہوگی — ہزار بار برس یا کہ لاکھ بار برس

جہاں و دشت و گلستاں میں بھر دے آب جل تھل — نکال خوب سا دل میں جو ہے بخار برس

نگاہ جانب قبلہ ہے منتظر ہوں میں — ہوئے ہیں چار پہر آج مجکو چار برس

کوئی تو تربتِ عاشق پہ رونیوالا ہو — ذرا چمن میں برس کر سرِ مزار برس

بس انتظار ہی تیرا ہے بادہ نوشوں کو — لیئے ہیں ہاتھ میں ساغر ترے نثار برس

رکھا ہوا ہے خمِ مے چنے ہیں سب ساغر — میرے خدا یو ہیں برسے گھٹا ہزار برس

مقابلہ پہ اگر تیری پست ہے ہمت — تھمی ہوئی ہے میری چشمِ اشکبار برس

دلوں میں کچھ تو جمادات کی پڑے ٹھنڈک — نکل رہے ہیں ہر اک سنگ سے شرار برس

شبابِ حسن کی گرمی بڑھی ہوئی ہے بہت — دلوں کو شعلہ مزاجوں کے ہو قرار برس

گلوں سے بھر گئیں ہیں جھولیاں زمیں کی سب — نمو کا جوش ہے ہاں تو بھی بار بار برس

چمن ہو وسعتِ آبادی جنوب و شمال — سوئے یمین برس گہ سوئے یسار برس

صدف ہے قلزمِ مواج میں کشادہ دہن — گہر فشاں ہو۔ اب اے ابر قطرہ بار برس

پرانے داغ جو ہیں دلمیں بھر سے ہوں تازے — سرزمینِ گلستانِ لالہ زار برس

بڑھائے جوششِ دل سبزیِ بہار و کلی — رواں ہو چادرِ بارانِ آبشار برس

چمک رہی ہیں تپِ غم سے بجلیاں دلمیں — گھٹائیں غم کی اُٹھیں اے ابرِ نوبہار برس

ترے کرم سے ہی بارانِ لطف ساقی بھی — قریبِ مسکنِ رندانِ میگسار برس

تجھے بھی جوش ہی اواز رعد کہتی ہے — بھرا ہوا ہے میرے سر میں بھی خمار برس

نظر فریب بنا چوٹیاں پہاڑوں کی — بسوئے وسعتِ دامانِ کوہسار برس

نگارِ ساقی و مینائے مے کی صحبت ہے — بقدرِ ذوقِ تماشائیانِ یار برس

دکھاؤں جوشِ نہالِ برطسیع کا میں بھی — زمانہ دے مجھے مہلت جو پانچ چار برس

عزیز رشحۂ افکارِ نو سے ہی سرخوش — اگر ہو جوش تو اے ابرِ نوبہار برس

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

پہاڑ کا منظر

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائے خوشگوار　　زندگانی بخش ابر کوہسار

کیا لکھوں کیفیت خوش سبزہ زار　　کیا کہوں گلہائے خودرو کی بہار

مینہ کے قطرے بنکے دُرِ شاہوار　　ہو رہے ہیں قدرتِ حق پر نثار

لے گیا دل سبز رنگ اشجار کا　　حُسن دلکش اور جوبن کا اُبھار

لالہ رویانِ جہاں کو چھوڑ کر　　کر تماشائے جہانِ لالہ زار

قدرتوں میں نُدرتیں ہیں جلوہ گر　　نُدرتوں میں سینکڑوں نقش و نگار

دیکھکر گلہائے رنگا رنگ کو　　یاد آتا ہے خدائے کردگار

کوہ کے اِس سلسلہ کو دیکھکر　　معرفت کا بندہ گیا ہے ایک تار

شوکت و اجلال باری دیکھکر　　خوف سے روتی ہے چشم آبشار

سنگ کا دل بہ رہا ہے پھوٹ پھوٹ　　کہ رہا ہے یہ بچشم اشکبار

خوف سے شق ہو گیا سینہ مرا　　تیرے قرباں جاؤں اے پروردگار

اللہ اللہ کوہ کی شادابیاں　　نام کو دل میں نہیں باقی غبار

دل لُبھا جاتی ہے کوئل کی صدا　　چٹکیاں لیتی ہے دل میں بار بار

ہے دھواں یہ یا کہ انبوہ درخت　　سرخ پھول اُس میں ہیں مانند شرار

دیبیاں ہیں اونچی اونچی چوٹیاں　　ہے گلے میں حُسن کے پھولوں کا ہار

معرفت کے باب کھُل جائیں تمام　　وا اگر ہو جائے چشم اعتبار

ہیں نرالے ہی یہاں کے روز و شب　　کیا انوکھے یاں کے ہیں لیل و نہار

زندہ کر دیتی ہے تن کو مینہ کی بوند　　تازہ کر جاتی ہے آنکھوں کو پھوار

لوٹ لوٹا تب مزے کہسار کے　　پھر کہاں تم اور کہاں فصل بہار

(محمد نواب خان ثاقب)

تازہ غزلیں

بحالِ زار بیٹھے ہیں ذلیل و خوار بیٹھے ہیں
نکلکر اسکی محفل سے پس دیوار بیٹھے ہیں

ستائے دل جلے بہرِ فغاں تیار بیٹھے ہیں
کہاں کی دل لگی یاں جان سے بیزار بیٹھے ہیں

مٹانیکو ہمارے لاکھ سر پٹکا زمانہ نے
مگر ہم سخت جاں اتبک بحالِ زار بیٹھے ہیں

کوئی سمجھے کہ ہم دنیا کے سارے کام کر بیٹھے
جو یوں بیفکر بیٹھے ہیں جو یوں بیکار بیٹھے ہیں

متاعِ دو جہاں سے تھا فقط نامِ سلف باقی
صنم خانہ میں ہندوستاں کے وہ بھی ہار بیٹھے ہیں

چڑھا تھا کس بلا کا نشہ صدیوں میں نہیں اترا
وہی مخمور بیٹھے ہیں وہی سرشار بیٹھے ہیں

یہ میدانِ ترقی بھی غضب کی ہی کٹھن منزل
کہ جسکے دس قدم چلنے میں ہم سو بار بیٹھے ہیں

انیسانِ قفس پرواز کرتے ہیں عقاب آسا
مگر ہم سر جھکائے شکلِ بوتیمار بیٹھے ہیں

زباں چپ کچھ آفت نہ لائے کم زبانو پر
گھرے چاروں طرف اغیار سے سرکار بیٹھے ہیں

وفا کے مدعی بنتے تھے جو اہلِ وطن کل تک
چڑھائے آستینیں سر پیکار بیٹھے ہیں

رسائی اپنی بزمِ یار تک اعجاز مشکل ہے
کہیں دربان بیٹھے ہیں کہیں اغیار بیٹھے ہیں

مرزا اعجاز حسین اعجاز

رخصت اے صبر اس ستمگر کو عتاب آہی گیا
مژدہ باد اے نالہ وقت اضطراب آہی گیا

لیکے دلکو یوں ہوئے خواہاں وہ جانِ زار کے
چارہ نا چار اپنی آنکھوں کو حجاب آہی گیا

بندہ صبح کار گر جب تھی کہ ہم آزاد تھے
ابتو اک بت پر دلِ خانہ خراب آہی گیا

مر گیا بیمارِ غم کروٹ جو بدلی ضعف سے
عالمِ ہستی تھی آخر انقلاب آہی گیا

میرے نالے سننے کی آخر کو عادت ہو گئی
جاگنے والوں کو دنیا بھر کا خواب آہی گیا

قصد مئنوشی پئے تمہید وصلِ دوست تھی
کھینچ کے ہونٹوں تک ہی جامِ شراب آہی گیا

بخت نالۂ صور سے ہو گی قیامت ہی بپا — اہل دل سن لو مرے دل کا جواب آ ہی گیا

جاتے جاتے رخ سے گیسو تک نظر ہوش اڑ گئے — شام بھی ہونے نہ پائی تھی کہ خواب آ ہی گیا

چشم بد دور بس ادا پر دیکھنے والے نثار — نکلے یوں بیٹھے ہیں گویا انکو خواب آ ہی گیا

کسقدر نظارۂ نازک مزاجی سہل ہے — جب ذرا سی چھیڑ کی انکو عتاب آ ہی گیا

جاتے تھے توبہ کو محشر کر کے ترک انتظار
ناگہاں وہ مست صہبائے شباب آ ہی گیا

محشر لکھنوی

نظر جو آئی دلِ داغدار کی صورت — چمن کا رنگ بھی بھولا ہزار کی صورت

بدل کے رنگئی برق و شرار کی صورت — جو دیکھی میرے دلِ بیقرار کی صورت

خدا نہ رنگ دکھائے شبِ جدائی کا — نظر نہ آئی کسی غمگسار کی صورت

اٹھا بٹھا کے ہمیں ضعف دیکھوے آیا — تمھارے کوچے میں نکلی مزار کی صورت

ہوا ہے سوکھ کے کانٹا جدائی گل میں — یہ ہو گئی ہے مرے جسمِ زار کی صورت

کسی کے عارض رنگیں کی یاد ہے دلمیں — شگفتہ رہتا ہے باغ و بہار کی صورت

لگی ہوئی ہیں شبِ وعدہ ہوئے در پہ آنکھیں — بنا ہوں میں ہمہ تن انتظار کی صورت

خوشی سے پھولے سماتے نہیں ہیں پھر میخوار — نظر پھر آگئی ابر بہار کی صورت

پھنساتے ہیں مرا دل دامِ عشق میں صیاد — یہ خوب سوجھی ہے انکو شکار کی صورت

بٹھا عدو کو تمہارے دوست اپنے پہلو میں — ہمارے دلمیں کھٹکتا ہے خار کی صورت

کہیں ٹھہرتے ہیں شب کو نہ دن کو رہتے ہیں — بنے ہیں گردشِ لیل و نہار کی صورت

سوالِ وصل کا اچھا جواب آیا ہے — بنا کے بھیجدی ظالم نے دار کی صورت

ہمارے سامنے آنکھیں لڑانا غیروں سے — ستم کی شکل بنی کیسی پیار کی صورت

کہاں کا عزم ہے سرشار کیا ارادہ ہے
کہ مضطرب ہو کسی دلفگار کی صورت

سردار امرتسری

مخزن

اَخِیَّۃُ الفُتیان

صلیبی جنگیں اگرچہ بظاہر قہرِ خدا تھیں اور انسان کے وحشیانہ جذبات کو ابھار کر صدیوں تک خون کی ندیاں بہاتی رہیں لیکن درصل وہی پہلا موقع تھا کہ مغرب و مشرق کا ملاپ اور ایک کو دوسرے سے استفادہ کا اتفاق ہوا۔ مشرق اُس زمانہ میں حُسن اخلاق کا معدن اور تہذیب و شائستگی کا مرکز تھا۔ اور برخلاف اِس کے مغرب وحشیانہ جذبات کا کھیت تھا اِس لیے ظاہر ہے کہ اس اتصال سے زیادہ تر فائدہ مغرب کو پہونچ سکتا تھا۔ لیکن ایک انگریزی مثل ہے کہ کیسی ہی کالی گھٹا ہو اُس کا استر ہمیشہ روپہلی ہوتا ہے۔ اسیطرح اہل مغرب میں بھی باوجود بہیمیت کے غلبہ کے بعض اعلیٰ صفات موجود تھیں جن سے مشرق بھی سبق لے سکتا تھا۔ رہبانیت کو عیسائیت کے ساتھ جو مناسبت ہے

وہ محتاج بیان نہیں ہے اور اگرچہ ابتدا سے مذہب عیسوی کے پیرووں میں اُس کا زور چلا آتا تھا مگر پیٹروی ہرمٹ اور سینٹ برنارڈ کے جوش مذہبی نے اُسکو سپہگری کا جامہ پہنایا اور رہبان شہسواروں کے چند طبقے مثل نائٹز ٹمپلر اور نائٹز آف سینٹ جان کے قائم ہوئے جنکا قدم حمایت صلیب میں ہمیشہ سب سے آگے رہا۔ یہہ لوگ ترک دنیا کر کے مذہب کے لیئے اپنی زندگی وقف کر دیتے تھے اور نہ صرف مذہبی لڑائیوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے بلکہ زمانہ امن میں اُن کا کام راستوں کی حفاظت غریبوں کی دستگیری بیماروں کی تیمار داری اور بے نوا زائروں کی مہمان داری ہوتا تھا۔ ہمارے عالی خیال مورخوں کو لڑائیوں اور آپس کے فسادوں کی تفصیل سے اتنی فرصت نہیں ملی کہ ایسی باتوں کی طرف توجہ کرتے لیکن خوش قسمتی سے چند سفرنامے دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں جن سے اُس زمانے کی سوسائٹی کی حالت اور ابتدار زمانہ سے جو تغیرات اُس میں ہوئے ہیں اُن کی کیفیت کسیقدر معلوم ہو سکتی ہے ابن بطوطہ اگرچہ دنیا کے ایک کونے کا رہنے والا تھا مگر جس قدر وسیع اُسکی ہمت تھی اوسیقدر اُس کی نظر بھی باریک تھی۔ اگرچہ اُس کا اصلی سفرنامہ اُس کے مال و منال کے ساتھہ نذر آب ہوا لیکن جو مختصر نوٹ اُس نے اپنی یاد سے لکھا دیئے ہیں وہ بھی ایسی دقت نظر کا پتہ دیتے ہیں کہ میرے خیال میں اُس وقت تک بھی کسی سیاح کو کم نصیب ہوئی ہے جس شہر جس ملک سے اُس کا گذر ہوتا ہے ایک نگاہ میں وہاں کے تمام خصوصیات کو محصور کر کے اپنی ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے بلاد روم کے حال میں جس سے اُس کی مراد ایشیائے کوچک سے ہے اُس نے درویشوں کے

ایک عجیب طبقہ کا حال لکھا ہے جو تمام دیہات اور قصبوں اور شہروں میں پھیلا ہوا تھا اور کوئی مقام ایسا نہ تھا جو اُن کے زیر اثر نہو۔ اس طبقہ کا نام اخیتہ الفتیان یعنے برادریٔ نوجوان تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ بلاد روم میں کوئی شہر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا قریہ ہو یا قصبہ اس طبقہ کے لوگوں سے خالی نہیں ہے اور تمام پردۂ زمین پر کوئی شخص ان اخیہ (بھائیوں) سے بڑھکر مہماں نواز غریب الوطن لوگوں کی خاطر و مدارات میں اہتمام بلیغ کرنے والا بھوکوں کو کھانا دینے والا۔ غریبوں کی حاجتیں برلانے والا مظلوموں کی طرف سے ظالموں سے بدلا لینے والا۔ اور شریر اور ایذارساں اشخاص کو قتل کرنے والا نہیں ہے۔

وہاں کی اصطلاح میں اخی اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے ہم پیشہ لوگوں۔ یا دوسرے نوجوان اور مجرد لوگوں کو جمع کرکے ایک طبقہ قایم کرے اور خود اُس طبقہ کا پیشوا یا گرینڈ ماسٹر ہو اور اُس کا نام فتوت بھی ہے جو شخص اِس درجہ کا ہوتا ہے وہ ایک مکان خانقاہ کے طور پر بنواتا ہے اور اُس کا فرش و فروش اور سامان روشنی سے آراستہ کرتا ہے اور وہاں اپنے طبقہ کے لوگوں کو جو فتیان کہلاتے ہیں رہنے کے لیئے جگہ دیتا ہے۔ اور ہر روز صبح کیوقت اُن کو اُنکے پیشہ کے کاموں پر بھیجتا ہے۔ عصر کے وقت سب لوگ اپنے کام سے فارغ ہوکر خانقاہ میں آتے ہیں اور دن بھر کی کمائی جمع کرکے اخی کو دیتے ہیں اور وہ اُس کو کھانے اور فواکہات اور نیز درگاہ کے خرچ میں لاتا ہے۔ اگر اُس روز شہر میں کسی مسافر کا گذر ہوتا ہے تو نہایت انکسار و لجاجت کے ساتھ اُس سے مہمان ہونے کی درخواست

کرتے ہیں اور بہت عزت و احترام کے ساتھہ اُس کو خانقاہ میں لاتے ہیں اور جو کچھہ دن بھر کی کمائی سے خریدا ہے اُس سے اُس کی دعوت کرتے ہیں اور جبتک وہ مقیم رہے ہر روز اسی طور پر اُس کی دعوت میں اہتمام کرتے ہیں اور اگر وہ مہمان خود ہی چلا جائے تو خیر ورنہ اگر وہ مدتہائے دراز تک بھی ٹھیرے تو اُن کی طرف سے اُس کی خاطر و مدارات میں فرق نہیں آتا۔ اگر اتفاقاً کسی روز کوئی مہمان نہ ملا تو خود ہی جمع ہو کر کھانا کھا لیتے ہیں اور اُس کے بعد وجد و سماع اور سرود طرب میں مصروف رہتے ہیں۔ اور صبح کو پھر اپنے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں۔

ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ جس روز وہ شہر انطاکیہ میں پہونچا اُس کے دوسرے روز ایک شخص نہایت بوسیدہ کپڑے پہنے اور سر پر نمدے کی ٹوپی اوڑھے ہوئے شیخ شہاب الدین حموی کے پاس آیا اور اُن سے کچھہ ترکی زبان میں باتیں کیں شیخ نے کہا کہ کچھہ سمجھے اِس نے کیا کہا میں نے جواب دیا کہ میں زبان ترکی نہیں جانتا اسپر شیخ نے کہا کہ یہ شخص تمکو مع تمھارے تمام ساتھیوں کے دعوت دینے آیا ہے مجھے اِس سے بہت تعجب ہوا اور میں نے ٹالنے کے لئے کہدیا کہ اچھا مگر جب وہ چلا گیا تو میں نے شیخ سے کہا کہ یہہ بیچارہ بہت غریب معلوم ہوتا ہے اتنے آدمیوں کی ضیافت کا کیونکر متحمل ہو سکے گا ہم اسکو تکلیف دینا نہیں چاہتے شیخ میری زبان سے یہ جملہ سنکر بہت ہنسا اور کہنے لگا کہ اِس کے کپڑوں پر نہ جاؤ یہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اگرچہ یہہ موچی کا پیشہ کرتا ہے مگر فتیان داخیہ کے مشیوخ سے ہے

اسنے اپنے ہم پیشہ لوگوں سے دو سو آدمیوں کا جتھا قایم کیا ہے اور یہ ان سب کا پیشوا ہے۔ ان لوگوں نے ایک نہایت عمدہ خانقاہ بنائی ہے اور دن بھر جو محنت و مزدوری میں کماتے ہیں وہ رات کو مسافروں کی دعوت میں خرچ کر دیتے ہیں۔ مغرب کے وقت یہ شخص پھر آیا اور ابن بطوطہ کو مع اس کے ہمراہیوں کے خانقاہ کو لے گیا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نہایت عالیشان مکان ہے جس میں نفیس اونی قالین بچھے ہوئے ہیں اور شیشہ و آلات سے آراستہ ہے۔ روشنی کا سامان بھی نہایت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ محفل میں ایک جماعت نوجوانوں کی صف بستہ بیٹھی ہے جن میں سے ہر شخص گلے میں قبا اور پاؤں میں موزے اور سر پر ترکی ٹوپی پہنے ہے جس کی نوک پر ایک ٹکڑا کپڑے کا جو ہاتھ بھر لمبا اور دو انگل چوڑا ہے لگا ہوا ہے۔ اور کمر میں پیٹی جس میں دو ہاتھ کا لمبا چھرا ہے لگائے ہوئے ہے۔ جب سب لوگ بیٹھ گئے تو ہر شخص نے ٹوپی اوتار کر اپنے سامنے رکھ لی اور ایک چھوٹی ٹوپی زردخال وغیرہ کی جو نہایت خوشنما اور بڑی ٹوپی کے نیچے تھی اپنے سر پر رہنے دی۔ محفل کے بیچ میں تازہ وارد لوگوں کے لئے برتن جمائے گئے جب سب لوگ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو بہت کثرت سے عمدہ عمدہ کھانے اور میوے اور مٹھائیاں لائی گئیں اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ لوگ وجد و سماع میں مصروف ہوئے۔

شہر لاذق کے حال میں ابن بطوطہ نے انہیں لوگوں کے متعلق ایک عجیب پر لطف واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جب ہم شہر لاذق میں پہونچے تو ہمارا گزر ایک بازار میں ہوا۔ ہمارا دیکھنا تھا

کہ بہت سے لوگ دکانوں سے کود کر ہم پر آپڑے اور اُنہوں نے ہمارے گھوڑوں کی باگوں کو پکڑ لیا۔ یہ دیکھہ کر کچھہ لوگ دوسری طرف سے آئے اور اُنہوں نے چاہا کہ اُن کے ہاتھوں سے باگیں چھین لیں اِس پر اُن میں آپس میں تکرار ہونے لگی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ چھرے نکالکر لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ ہم یہ دیکھہ کر ڈرے کہ یہ غالباً جری قوم کے لوگ ہیں جو قزاقی میں مشہور ہیں اور ہم کو لوٹنا چاہتے ہیں اتنے میں اتفاق سے ایک حاجی آگیا جو زبان عربی سمجھتا تھا ہم نے اُس سے پوچھا کہ یہ کیا مضمون ہے اُس نے کہا کہ یہ لوگ طبقۂ فتیان سے ہیں اور پہلے جو لوگ آئے ہیں وہ اخی سنان کی جماعت سے ہیں اور بعد میں جو آئے ہیں وہ اخی طومان کے گروہ سے ہیں اور ہر جماعت کی یہ کوشش ہے کہ تم اُنہیں کے ہاں ٹھیرو۔ ابن بطوطہ کو ان لوگوں کی کریم النفسی پر بڑا تعجب ہوا۔ بالآخران لوگوں میں اِس امر پر مصالحت ہوئی کہ قرعہ ڈالا جائے اور جس کے نام قرعہ نکلے اُسی کے ہم مہمان ہوں۔ چنانچہ اخی سنان کے نام قرعہ نکلا اور جب اُس کو یہ معلوم ہوا تو وہ اپنے اصحاب کی بڑی جماعت کے ساتھہ ہماری پیشوائی کے لیے آیا اور جب یہ گروہ ہمارے نزدیک پہونچا تو سب نے ہم کو سلام کیا اور اپنی خانقاہ میں لیجا کر ٹھیرایا اور قسم قسم کے کھانے کھلائے اور اوس کے بعد ہمکو حمام میں لے گئے اور اخی سنان نے خود مجکو نہلایا اور اُس کے اصحاب نے میرے ساتھیوں کو تین تین چار چار آدمی ایک ایک شخص کی خدمت کرتے تھے جب حمام سے فارغ ہوئے تو عمدہ عمدہ کھانے اور مختلف قسم کے میوے اور مٹھائیاں کھلائی گئیں اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد

قاریوں نے آیات قرآنی خوش الحانی سے پڑھیں اور اُس کے بعد ذکر اور رقص وسماع شروع ہوا۔ دوسرے روز شام کو اخی صوبان مع اپنے تمام اصحاب کے آیا اور ابن لطوطہ اور اُس کے ہمراہیوں کو خانقاہ میں لے گیا وہاں بھی اُن کے ساتھہ ایسا ہی برتاؤ کیا گیا بلکہ اُسپر اِس قدر اور مستزاد ہوا کہ جب یہ لوگ نہانے سے فارغ ہوکر حمام سے نکلے اُنپر گلاب چھڑکا گیا اور کھانوں اور مٹھائیوں میں پہلے سے بھی زیادہ تکلف کیا گیا۔ ابن لطوطہ شام کے جتنے شہروں اور قصبوں میں گیا وہاں اخیۃ الفتیان نے اُس کے ساتھہ ایسا ہی برتاؤ کیا بلکہ کہیں کہیں اِس سے بھی بڑھکر خاطر ومدارات کی۔

ابن لطوطہ کا گزر ایک گاؤں میں ہوا جس کا نام کادیہ تھا وہاں اُسکو ایک عجیب پرلطف واقعہ پیش آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں ہم ایک اخی کے خانقاہ میں گئے۔ ہم نے اُس سے عربی میں باتیں شروع کیں جن کو وہ نہ سمجھا اور اُس نے ترکی زبان بولنی شروع کی جسکو ہم نہ سمجھے یہہ دیکھکر اُس نے ایک شخص سے کہا کہ فقیہ کو بلالاؤ وہ عربی جانتا ہے جب فقیہ آیا تو ہم نے اُس سے پہلے فارسی میں اور پھر عربی میں باتیں کیں مگر وہ نہ سمجھا۔ لیکن تھا بڑا چالاک اُس نے اخی سے کہا کہ " ایشاں عربی کہنہ می گویند ومن عربی نو میدانم " فقیہ کی جہالت اُن لوگوں کے حق میں آبِ حیات ثابت ہوئی کیونکہ اُن کو فقیہ کی عربی دانی میں تو شبہ نہ تھا اخی نے عربی کہنہ کے الفاظ سنکر اور بھی اُن کی خاطر ومدارات کی اور سب لوگوں سے کہا کہ یہ لوگ خاصکر واجب التعظیم ہیں کہ قدیم عربی جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان تھی بولتے ہیں۔

اگرچہ ابن بطوطہ نے صرف اِن لوگوں کی مہماں نوازی اور عام اخلاق اسلام کے حالات ہی لکھنے پر قناعت کی ہے کیونکہ اُس کو زیادہ تر انہیں باتوں کا تجربہ ہوا تھا لیکن اُس نے تمہید میں جو امور بیان کیے ہیں اُن سے اِس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف مسافروں کی خاطر و مدارات تک ہی اپنی کوششوں کو محدود نہ رکھتے تھے بلکہ اونہوں نے ایک باضابطہ منتظم سوسائٹی قایم کی تھی جس کے فرائض میں اہل احتیاج کو ہر قسم کی مدد دینا داخل تھا۔ اور اُن کے اپنی کمر میں لنبے لنبے چھرے رکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف راہ رووں کو ڈاکوؤں اور رہزنوں کے پنجے سے نجات دیتے ہوں گے بلکہ مذہبی لڑائیوں میں بھی حصہ لیتے ہوں گے غرضکہ اُن تمام فرائض کو ادا کرتے ہوں گے جو عیسائیوں میں نائٹس ٹمپلرز اور نائٹس آف سینٹ جان وغیرہ انجام دیتے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سوسائٹی میں داخل ہونے کے لئے کچھ امیر و غریب پیشہ ور یا عہدہ دار سرکاری کی قید نہ تھی بلکہ ہر فرقہ اور گروہ کے لوگ شریک ہو سکتے تھے چنانچہ ہم بتا چکے ہیں کہ شہر انطاکیہ میں اخی فتیان موچی تھا اور قیساریہ کا اخی فتی امیر اعلیٰ تھا جو اُس ملک کے کبار امرا سے تھا۔ اور شہر قونیہ کے فتیان کا سرگروہ وہاں کا قاضی ابن قلم شاہ تھا۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اِن لوگوں کا لباس بھی یکساں ہوتا تھا[۱] اور جس طور پر کہ صوفیوں کا خاص لباس خرقہ ہے اسی طور پر اِن لوگوں کا لباس فتوت سراویاں (پاجامہ) تھا۔ اس سے بھی اِن لوگوں کے فوجی مذاق کا پتہ لگتا ہے۔ اگرچہ اسلام نے

[۱] رحلہ ابن بطوطہ حالات انطاکیہ ۱۲

بمقتضائے لا رہبانیۃ فی الاسلام رہبانیت کو اپنے دائرہ سے خارج کر دیا تھا مگر یہہ لوگ مثل عیسائی رہبان شہسواروں کے عالم تجرد میں اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور فکر فردا سے اس قدر فارغ البال تھے کہ ہر روز کی کمائی اوسی روز خرچ کر دیتے تھے۔ انہیں عیسائی رہبانوں کے لحاظ سے اس قدر ترقی معلوم ہوتی ہے کہ اُن کی گذر صرف پرجوش مذہبی لوگوں کی خیرات پر تھی اور خود کسی پیشہ میں داخل ہونا گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ جس سے بعد میں نہایت بد نتائج پیدا ہوئے مگر یہ لوگ بمقتضائے الکاسب حبیب اللہ[1] مختلف قسم کے پیشے انجام دیتے تھے اور اپنے ہاتھ کی محنت سے اکل حلال پیدا کرتے تھے۔ یہہ امر کہ یہہ جماعت کیونکر عالم وجود میں آئی اسپر ابن بطوطہ نے کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے اور نہ اِس کے متعلق کوئی تاریخی مواد ہم کو مل سکا ہے لیکن اِس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے اِس امر کا پتہ لگانا ضرور ہے کہ وہ کس زمانہ میں قایم ہوئی۔ علامہ ابن جبیر اندلسی نے مشرق کا سفر ۵۷۸ھ ہجری میں شروع کیا تھا اور اُس کا گذر اکثر بلاد روم میں ہوا لیکن اُس نے کہیں اِس سوسائٹی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ورنہ اگر یہ اُس وقت موجود ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ایک غریب الوطن سیاح کو ایسی یادگار اور پُرخلوص مہماں نوازی کا تجربہ ہو اور وہ اُس کا ذکر نہ کرے برخلاف اِس کے ابن بطوطہ کی سیاحت ۷۲۰ھ ہجری میں شروع ہوئی ہے۔ پس اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِس سوسائٹی کا قیام اِسی سوا سو برس کے اندر ہوا اور چونکہ ابن بطوطہ نے

[1] کمائی کرنے والا خدا کا دوست ہے ۱۲

اُس کو نہایت منتظم حالت میں پایا اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ اُسکو
قایم ہوئے ایک عرصہ دراز گذر چکا ہوگا۔ پس اس تمام بحث سے یہ نتیجہ
نکلتا ہے کہ جب بلاد روم میں آل سلجوقی کی حکومت کمزور ہو کر طوائف
الملوک کا دورہ ہوگیا اور کوئی ایسی قوت باقی نہ رہی جو شہنشاہ روم یعنے
والی قسطنطینہ کا مقابلہ کر سکے اور اِس لیے آئے دن عیسائیوں سے
چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی ہوگی جس سے سخت بد امنی پیدا ہوئی ہوگی۔
اِس لیے قوم ترک کے بعض پر جوش نوجوانوں نے نائٹز ٹمپلر
وغیرہ کی تقلید سے اپنے ملک کی حفاظت اور اہلِ ملک کی مدد کے
لیئے یہ سوسائٹی قایم کی ہوگی۔ اور زمانہ کی ضرورت اور جوش مذہبی
کے تقاضے سے یہہ تحریک بہت جلد تمام ملک میں پھیل گئی ہوگی۔
گویا کہ یہہ سوسائٹی اُس زمانہ کی نیگٹرکشں پارٹی تھی۔ اِس امر کا ایک
ثبوت کہ اِس سوسائٹی کا قیام کچھ ایسی ہی ضرورتوں کے لحاظ سے
ہوا ہوگا یہہ ہے کہ ابن بطوطہ نے شہر قیساریہ کے حال میں ضمناً
لکھا ہے کہ ممالک شام کا یہہ دستور ہے کہ جس شہر میں کوئی سلطان
نہیں ہوتا وہاں کا حاکم اُس شہر کے فتیان کا اخی ہوتا ہے اور
وہی سلاطین کی طرح مسافروں کی تواضع علی قدر مراتب سواری و لباس
سے کرتا ہے اور اوامر و نواہی اور سواری کے جلوس کی ترتیب
میں وہ سلاطین کی مثل ہوتا ہے اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طوائف
الملوکی کی کمزوری سے آشنا ہو کر ان لوگوں نے اپنی ذاتی ایثار
نفس اور ہمدردی خلق اللہ اور جوش مذہب سے ایک ایسی قوت قایم
کی تھی جو کسی عظیم الشان سلطنت کی قایم مقام تھی۔ قیاس یہ بھی چاہتا

ہے کہ یہہ سوسائٹی ایشیائے کوچک میں آل عثمان کی حکومت مضبوطی سے قایم ہونے تک باقی رہی ہوگی اور جب آل عثمان نے قوت پکڑ کر ان تمام فرایض کو اپنے ہاتھ میں لیا ہوگا جو ایک قوی سلطنت سے متعلق ہیں تو ضرورت کے باقی نہ رہنے کی وجہ سے یہہ سوسیٹی خود بخود خاتمہ کو پہونچ گئی ہوگی بلکہ گمان غالب یہ ہے کہ صوفیہ کے جو بہت سے فرقے ہیں ان میں سے کسی ایک فرقہ میں شریک ہوکر عالم فراموشی کی سیر کررہی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر طبقات صوفیہ کا سلسلہ بیعت حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالی عنہ تک منتہی ہوتا ہے اسیطرح ان لوگوں نے بھی اپنا سلسلۂ فتوت شیر خدا سے ملایا تھا اور غالباً یہہ نام بھی اسیوجہ سے رکھا گیا تھا کہ پہلے فتے جیسا کہ مشہور ہے ”لافتی الا علی لاسیف الا ذوالفقار“ حضرت علی ہی قرار پائے تھے +

محمد عزیز مرزا

انسان کی نیرنگیاں اور اُسکی عزت۔ او دریائے نیل کے پانی سے پیدا ہوکر حجر اسود کی صورت بدلنے والے اور شجر طوبے کیطرح نشو و نما پاکر برّاق کی طرح سانس لینے والے تبلا! تو اتنا اترانے والا کیوں ہے؟ شاید اپنی انھی نیرنگیوں کی وجہ سے ورنہ تیری اصلیت تو ظاہر ہے۔ جمادی الاصل نہ سہی آبی الاصل سہی۔

نہیں نہیں! تیرا اترانا بجا ہے۔ وہ تو ہی ہے جس نے گوہر مقصود کو ڈھونڈھکر نکالا ہے گوہر بھی وہ گوہر نایاب جسکا کہیں ٹھکانا ہی نہ تھا نہ زمین میں نہ آسمان میں تیرے لیے ایک یہی وجہ ہوسکتی ہے اور صرف یہی وجہ تو لاکھہ موٹر کار اور ہوائی جہاز بنا اگر تیرے دل میں اُس مطلوب کی طلب نہیں تو کبھی سچی عزت کے قابل نہیں ہوسکتا۔ فقط راقم ہوشیار از ہوشیار پور

رسم الخط

کسی خط کی قدامت یا اولیت پر کسی کو بجا ناز ہو یا بے جا ہمیں اُس سے کوئی بحث نہیں۔ ہمیں صرف موجودہ چند خطوط کے حسن و قبح سے تعلق ہے۔ دیکھنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اگر ہمیں اختیار انتخاب دیا جاوے تو ہم کونسا خط اختیار کریں اور اگر ایک خط انتخاب کیا جاوے تو اُس کی وجہ ترجیح کیا ہوگی۔ سیدھی سی بات ہے۔ جو خط اپنی غرض و غایت کو بہ احسن وجہ قلیل تریں محنت سے پورا کر سکے۔ وہی خط اِس لایق ہوگا کہ انتخاب کا سہرا اُس کے سر بندھے۔ تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ خط کس غرض سے ایجاد کیا گیا۔

پہلے پہل جب انسان نے زبان کو آلہ اظہار خیالات بنایا تو بھلا اوسے کیا معلوم تھا کہ اِن الفاظ کو قیام کا جامہ پہنانے کی ضرورت بھی پیش آئے گی۔ سب سے پہلے تو حساب رکھنے کی ضرورت نے اُسے مجبور کیا ہوگا کہ کوئی علامت مقرر کی جائے۔ جس سے تعداد کا اظہار ہو سکے اور اِس طرح داد و ستد کے معاملات رہ سکیں جیسے کہ اب بھی ناخواندہ عورتیں دہوبی کا حساب دیواروں پر لکیریں کھینچ کر یاد رکھا کرتی ہیں تو گویا حافظہ کی کوتاہی ایجاد خط محرک ہوئی۔ اور عدد چونکہ ایک خیال ہے۔ اِس لیے جو علامات اُس کے لیے ایجاد ہوئیں وہ لامحالا اظہار خیال کی علامت تھیں نہ کہ اظہار صوت کی۔ اِس طرح ابتدا میں جو خط ایجاد ہوا وہ خط مصورہ (اڈیوگرافی) IDEOGRAPHY تھا۔

یعنے علامات سے خیالات ظاہر ہوتے تھے۔ آوازیں ظاہر نہیں ہوتی تھیں من بعد بھی جب تحریر کو وسعت دینے کی ضرورت پیش آئی تو بھی اظہار اصوات کی طرف ذہن منتقل نہوا۔ بلکہ خیالات مزید کے لیے مزید علامات مقرر کرلی گئیں اور اس طرح خط مصورہ کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔

اسوقت تو یہ کام چل سکتا تھا اور چل گیا۔ کیونکہ خیالات محدود تھے اُن کے لئے متعدد علامات کی ضرورت ہوئی۔ لتعداد قلیل تھی۔ وضع کرنا اور یاد رکھنا کچھ مشکل نتھا۔ لیکن تبدریج خیالات نے وسعت پائی علامات یعنے حرف مصورہ کی لتعداد بڑھنے لگی۔ اور یہ علم جو حافظہ کی مدد کے لیے ایجاد ہوا تھا خود حافظہ کے لیے بلائے جان ہوگیا عمر بھر کے خیالات کے لیے تا حد خیال علامات۔ بھلا اتنے حروف مصورہ کو کون یاد رکھے۔ آخر یہ خط دنیا کے بہت سے حصص میں اپنی طبعی موت مرگیا۔ اور اب اگر کہیں اسکا دم باقی ہے تو چین و جاپان میں۔ لیکن وہاں بھی اسکا دمِ واپسین ہے۔ زمانہ کی ضرورتیں دونوں ہاتھوں سے دھکیل کر اُسے دنیا بدر کررہی ہیں۔

اِس کے بعد خط کا دوسرا دور شروع ہوا۔ خدا جانے کسکو سوجھی مگر بلا کی سوجھی۔ محسن کا نام کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن ایک جہان ہے کہ اُس موجد کے خوان کرم کا زلہ ربا ہے۔ دنیا میں کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا نہو گا جو اُس موجد کا ممنون احسان نہو۔ خواہ وہ امریکہ میں رہتا ہو یا یورپ میں۔ آسٹریلیا و افریقہ میں یا ایشیا میں۔ ہر جگہہ اِسی موجد کا سکہ جاری ہے۔ اور جہاں علم کا وجود ہے وہاں اِس موجد کی ایجاد کا نور ہے۔

دنیا کے اِس محسن نے یہ سمجھ لیا کہ گو خیالات یا یوں کہو کہ اصوات مرکبہ (الفاظ) تو نامتناہی ہیں۔ مگر اصوات مفردہ معدود ہیں اور اگر اصوات مفردہ کے لیے علامات مقرر کردی جائیں تو چند حروف سے جملہ خیالات کا اظہار ممکن ہے۔ یہ سب سے پہلی ایجاد ہے جو کل دنیا کے علموں کی جڑ ہے۔ اگر یہ ایجاد نہ ہوتی تو آج دنیا میں علوم کی یہ رونق نہ ہوتی اور حضرت انسان کی عمر اہل چین کی طرح محض تحفظ حروف کی نذر ہو جایا کرتی۔ یہ معلوم نہیں کہ اِس موجد نے حروف کی کیا صورتیں وضع کیں اور وہ کون خط تھا جو سب سے پہلے دنیا میں ایجاد ہوا۔ لیکن چونکہ قدیم ترین خط جو اِسوقت بھی دنیا میں لکھا ہوا موجود ہے اہرام مصر کے حروف تصویری (ہیروگلفک HIEROGLIPHIC) ہیں اِس لیے یہ قیاس بعید از عقل نہ ہوگا کہ قدیم ترین تحریر صوتی خط تصویری ہے اِس خط میں جس صوت (آواز) سے کسی جانور یا چیز کا نام شروع ہوتا۔ اِس صوت کی علامت اِسی جانور کی تصویر مقرر رہتی۔ اور چونکہ تصاویر کو مخلوط کرنے سے اُن کا مابہ الامتیاز مٹ جاتا ہے اِس لیے اصوات مرکبہ یعنے الفاظ بنانے کے لیے تصاویر کو پہلو بہ پہلو لکھدیا جاتا ہے۔ یعنے حروف تصویری اور حروف مصورہ دونوں میں اتصال پانے کی استعداد موجود نہ تھی۔ اگر ا، دو کے لیے اِس قسم کا خط وضع کیا جائے تو مَ کی بجائے ہمیں مور کی اور بَ کی جگہ بَیل کی تصویر کھینچنی پڑے۔ ناظرین قیاس کرلیں کہ کس قدر زحمت برداشت کرنی پڑے۔ اور اگر ایک پوسٹ کارڈ لکھنا ہو تو وہ کتنے دنوں میں ختم ہو۔ اور اُس پر کسقدر مضمون آسکے۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ تجربے نے بتا دیا کہ گو شکل حروف میں اسقدر تمیز ضروری ہے کہ وہ بادی النظر میں ایک دوسرے سے ممیز ہوں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ خط جگہ کم گھیرے اور اوسپر محنت اور وقت کم صرف کرنا پڑے۔ اس لئے اب اُن حروف تصویری کی کتر بیونت ہونے لگی۔ اختصار نے یہاں تک زور دکھایا کہ بیل کے صرف سینگ رہ گئے اور مور کی صرف چونچ۔

جب حروف نے یوں صورت ذاتی حاصل کر لی تو یار لوگ لے اوڑے۔ یورپ نے اُن سے اپنے حروف وضع کئے اور ایشیا نے اپنے۔ لیکن وہ سب حروف تا حال جدا تھے جس طرح اب بھی انگریزی کے بڑے حروف باہم گرہ کھانے کی استعداد نہیں رکھتے۔ یہی عالم تھا۔ یہی حالت عبرانی خط قدیم پارسی خط۔ اور خط سنسکرت کی تھی۔ انہیں سے پارسی خط تو صفحہ ہستی سے معدوم ہو گیا۔ لیکن عبرانی و سنسکرت خطوط تا حال بوجہ حسن عقیدت دنیا میں تبرکاً موجود ہیں۔ رہا انگریزی خط۔ پہلے وہاں جرمن حروف رائج تھے جب یہ دیکھا گیا کہ رومن حروف مختصر سہل۔ و کم محنت طلب ہیں تو اونہیں اختیار کر لیا گیا۔ لیکن تحریر کی روانی اور سرعت کے لیے یہ امر ضروری معلوم ہوا کہ حروف باہم اس طرح اتصال پائیں کہ ایک حرف لکھہ چکنے کے بعد دوسرا حرف شروع کرنے کے لئے کاغذ پر سے قلم اوٹھانا نہ پڑے۔ بلکہ متصلہ حروف اس طرح قلم سے نکلیں گویا وہ ایک ہی حرف ہیں۔ اس غرض کے لیے بڑے حروف کو چھوڑ کر چھوٹے حروف کا استعمال شروع کر دیا گیا۔ اور انگریزی

خط نے وہ صورت اختیار کرلی جو اسوقت ہم دیکھتے ہیں۔

اگر انگریزی خط معراج ترقی پر ہوتا تو ہمیں آج شارٹ ہینڈ ShortHand ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ شارٹ ہینڈ کی ایجاد خود انگریزی خط کے اسقام کی زندہ دلیل ہے۔ یوروپ میں تو شارٹ ہینڈ آج ایجاد ہورہا ہے۔ مگر ایشیا میں جسے گہوارہ تہذیب کہتے ہیں اور جسے جملہ علوم و فنون دنیا میں اولیت کا فخر حاصل ہے وہاں آج سے صدیوں پیشتر ایک خط ایجاد ہو چکا تھا جس نے اہل ایشیا کو شارٹ ہینڈ کی ایجاد سے مستغنی کر دیا۔ اور دیگر جملہ خطوط میں جسقدر نقائص تھے اُن کو دور کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ خط جہاں پہونچا۔ اس ملک کے اصلی خطوط اُس کے لیے جگہ خالی کرتے گئے۔ یہ خط عربی خط تھا جس میں اسوقت عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ اُردو۔ پشتو۔ کشمیری۔ اور ہندوستان شمالی اور افریقہ کی اکثر زبانیں لکھی جاتی ہیں۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ عربی خط میں کیا خوبیاں ہیں اور اُس کے رقیب خطوط انگریزی و سنسکرت وغیرہ کہاں تک اُس کی ہمسری کا دعوے کر سکتے ہیں ہمیں اصول رسم الخط پر ایک بسیط نظر ڈالنی چاہیئے۔

(۱) سب سے پہلا جز و خط اصوات میں بہترین حروف تہجی وہ حروف ہونگے۔ جنہوں نے جملہ اصوات مفردہ کو حصر کر لیا ہو یعنے (۱) کوئی صوت مفرد ایسی نہو جس کے لئے حرف موجود نہو۔ (۲) کسی ایک صوت کے لیئے دو حروف (علامتیں) موجود نہوں۔ کیونکہ یہہ تحصیل حاصل اور محنت رائگاں ہے (۳) ایک حرف مختلف اصوات کو ظاہر نہ کرتا ہو۔ کیونکہ اسطرح علامت بے معنی ٹہرتی ہے اور غرض

ایجاد فوت ہوتی ہے (۴) مرکبات اصوات کو مفرد اصوات کے ساتھ مخلوط نہ کر دیا ہو۔ کیونکہ یہ وہی طولِ امل ہوگا جسکی وجہ سے خط مصورہ ترک کرنا پڑا۔

اب آپ مقابلہ کر کے خود دیکھ لیں کہ انگریزی یا سنسکرت حروف تہجی میں کوئی ایسی صوت ہے جو عربی یا اُردو حروف موجودہ سے ادا نہیں ہو سکتی۔ ایک صوت بھی ایسی نہ ملے گی حالانکہ انگریز خود کہتے ہیں کہ انگریزی زبان میں چالیس اصوات ہیں اور حروف صرف چھبیس ۲۶۔ اور ان میں سے بھی کئی کئی حروف ایک ہی آواز دیتے ہیں مثلاً سی۔ کے۔ کیو۔ ایس۔ سی۔ جے۔ جی۔ تو گویا انگریزی حروف خود اپنی زبان کی اصوات کی کفالت کے قابل نہیں۔ مگر عربی اُردو خط اب بھی اُن جملہ اصوات کو ادا کرنے کے لیے تیار ہے۔

(۲) عربی اُردو خط میں کسی ایک صوت کے لیئے دو حرف موجود نہیں شاید کوئی یہ اعتراض کرے کہ ث س ص۔ اور ز۔ ذ ض ظ۔ وغیرہ محض ایک ہی آواز دیتے ہیں۔ مگر یہ درست نہیں اُردو زبان میں محض س اور ز کی آواز ہے۔ اس لیے جو الفاظ ہندی الاصل ہیں ان میں ث ص۔ اور ذ ض ظ وغیرہ کبھی استعمال نہیں کیئے جاتے۔ اگر ان حروف کی آواز آپ کسی عرب کے منہ سے سنیں۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہر حرف کی صورت بالکل جداگانہ ہے۔ بخلاف اس کے انگریزی میں جیسا کہ اوپر ذکر آیا ایک ایک صوت کے لیئے تین تین حرف موجود ہیں۔

(۳) عربی اُردو خط میں کوئی ایسا حرف نہیں جو دو اصوات کی علامت ہو

حالانکہ انگریزی میں سی۔جی۔ وغیرہ دو دو اصوات کے قائم مقام ہیں۔

۴۔ پہلا دور حروف مصورہ کا تھا جس میں مرکب اصوات کی علامات مقرر کی گئی تھیں۔ بعدہ جو ترقی خط میں ہوئی اور جس ترقی نے انسان کی آئندہ ترقی کی بنیاد رکھی۔ وہ یہی تھی کہ مرکب اصوات کی جگہ مفرد اصوات کے لیے حروف وضع کیے گئے۔ تو جس خط میں مرکب اصوات کو بھی داخل حروف کیا گیا ہو اُس کے اسقام محتاج بیان نہیں۔ اگر کوئی شخص بے (ب) کہے تو صرف ہونٹوں کو حرکت ہوگی۔ اور ہے (ہ) کہے تو نرخرے کے پاس جبڑے کے نیچے والے عضلات کو اب بھے (بھ) کیے دیکھیے کہ ہونٹ اور جبڑے کے نیچے والے عضلات ہر دو شریک رہتے ہیں تب یہ ادا ہو سکتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ (بھ) مفرد صوت نہیں بلکہ مرکب ہے۔ کیونکہ دو مخارج سے پیدا ہوتی ہے۔ اور درحالیکہ ہم بھ پھ۔ تھ ٹھ۔ جھ چھ دھ ڈھ میں دیکھتے ہیں کہ ابتدا میں گو مختلف اصوات ہیں لیکن سب کے ساتھ (ہ) کی آواز مخلوط ہے تو خواہ مخواہ ہمیں خیال آئے گا کہ (ہ) ایک جداگانہ صوت ہے۔ لیکن جس موجد نے اِن جملہ اصوات مرکبہ کو داخل حروف ہجا کیا ہو۔ اُسکی نسبت یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا کہ وہ علم مخارج اصوات سے محض نابلد تھا۔ اور یہ سب حروف خط سنسکرت میں موجود ہیں۔ اور صرف اِسی پر بس نہیں ستم تو یہ ہے کہ۔ لرِی۔ کھشا نگیاں وغیرہ اصوات کو بھی مفرد سمجھ کر حروف ہجا میں داخل کیا ہے حالانکہ اُن کی مفرد اصوات کے لیے بھی حروف موجود ہیں۔ یہ تحفیل حاصل اور تضیع اوقات نہیں تو اور کیا ہے؟۔ اور اسقدر بھرتی کرنے کے باوجود ڑ اور ق کے لیے کوئی حرف مقرر ہی نہیں حالانکہ یہ خاص ہندی اصوات ہیں +

حروف علت ۔ حروف علت کی تعریف کرنے میں دنیا نے عجیب دہوکے کھائے ہیں۔ دانایانِ فرنگ تک غلطی سے محفوظ نہیں رہے۔ اور حروف علت (واول) ۔ [illegible] کی یہ تعریف کی ہے کہ حرف علت وہ صوات ہیں جو بلا مدد غیرے ادا ہوسکیں۔ اہلِ بصیرت اگر غور کریں تو اس تعریف کو امر واقعہ سے بہت دور پائیں گے۔ انگریزی کو ہی دیکھو جس میں بلا اختلاف پانچ حرف علت تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اے۔ ای۔ آئی۔ او۔ یو۔ انمیں سے اول چار حروف کو دیکھئے۔ ہر صوت الف مقصورہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور صوت علت کا ادا کرنا ممکن ہی نہیں جب تک کہ اسکو کسی حرف صحیح سے شروع نہ کیا جائے۔ خواہ وہ حرف صحیح الف مقصورہ ہو یا کوئی اور حرف صحیح جب یہ حالت ہو تو ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ صوت علت بلا مدد غیرے ادا ہوسکتی ہے۔ یہہ تعریف یوں ہونی چاہئے کہ اصوات علت وہ اصوات ہیں جو ہر حرف کی صوت میں شامل ہوتی ہیں۔ بلکہ یوں ہونی چاہیئے کہ ہر صوت کی ابتدا حرف صحیح اور انتہا حرف علت ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم اس قاعدہ کلیہ کے خلاف کوئی صوت نکالنے پر قادر نہیں۔ اور صرف یہی تعریف جامع ومانع ہوگی۔ اصوات حروف علت کسی مخرج صوت سے پیدا نہیں ہوتیں اُن کی ابتدا ہمیشہ ایک مخرج سے ہوتی ہے مگر اُن کی گوناگونی محض خلا رفم کی حالت پر موقوف ہے۔ اور ہر حرف خواہ کسی مخرج سے پیدا ہوتا ہو ہم اُسکو مفتوح۔ مکسور۔ مضموم۔ بالمد۔ یا بالقصر ادا کرسکتے ہیں۔ تو گویا اصوات علت کا جداگانہ وجود ہی نہیں۔ کیونکہ اُن کے لیے کوئی خاص مخرج ہی نہیں بلکہ ہر صوت مخرجی (صحیح) کے انتہائی

حصہ کا نام صوت علت ہے۔ اور جب[11] اصوات علت کا وجود بالذات
نہیں تو اُن کے لئے حروف وضع کرنا محنت رائے گاں ہے۔ مگر خدا کی
قدرت کہ اس قدر سیدھی بات کو کوئی نہیں سمجھا اور دانایانِ فرنگ
تک نے غلطی کی۔ مگر عربی اُردو خط اس غلطی سے بھی محفوظ رہا۔
ا۔ و۔ ی۔ وضع تو کیئے گئے ہیں مگر محض اصوات صحیح (یعنی ابتدائے
اصوات علت کو) ظاہر کرنے کے لیئے۔ اصوات علت (کی تمدید) کو
محض اس وقت ظاہر کرتے ہیں جب یہ کسی حرف کے موخر ہوں
ورنہ اصوات علت کا اظہار فی الحقیقت اعراب سے ہوتا ہے۔ اور یہی انتظام
قرین عقل بھی تھا۔ جو اصوات ہر حرف کے ادا کرنے کے لیے لازمی
ہوں اور ہر حرف میں شریک وشامل ہوں اور ان کا جداگانہ وجود
ممکن نہو تو پھر اُن کے لیئے جداگانہ حروف وضع کرنا کوتاہی عقل نہیں
تو کیا ہے۔ وہ اصوات جس سہولت سے مُنہہ سے نکلتی ہیں اور جس سہولت سے
دیگر اصوات میں شریک ہوتی ہیں ویسی ہی مختصر اور سہل علامات اُنکے
لیے ہونی چاہئیں۔ جو دیگر حروف کے ساتھ بسہولت شامل ہو سکیں۔
اور یہ مقصود جس خوبی سے اعراب ادا کرتے ہیں اور کوئی علامت نہیں
کرسکتی۔ حروف رومن R میں جو اسوقت کل یورپ میں
رائج ہیں اعراب مطلق نہیں۔ حرف علت سے ہی اعراب کا کام
لیا جاتا ہے۔ گو اعراب کی جگہ حروف لکھنا بے فائدہ محنت ہے
لیکن رومن حروف مقابلتاً مختصر ہیں بخلاف اس کے سنسکرت
حروف نہائت پیچیدہ اور شاخ در شاخ ہیں۔ سب سے ابتدائی اور سہل
ترین صوت الف مقصورہ کے لیے ایسی شاخ در شاخ علامت وضع کیگئی ہے

جس میں نصف درجن الف شامل ہیں۔

اور ستم یہ ہو کہ سنسکرت میں حروفِ علت کے علاوہ اعراب بھی درجن بھر ایجاد کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ محض یہی ہو کہ موجد خود ترکیبِ اصوات کو کما حقہ سمجھ نہیں سکا اور اپنی لاعلمی کو افراط حروف میں چھپانے کی کوشش کرتا ہو۔ (باقی آئندہ)

جناب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے دہلوی جوڈیشل پولیس اینڈ جنرل سیکرٹری و سیکرٹری لجسلیٹو کونسل و مشیر قانونی سرکار نظام ٹرسٹی علیگڈھ کالج و ممبر اسٹینڈنگ کمیٹی آل انڈیا محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس و پریزیڈنٹ انجمن اردو حیدرآباد دکن و پریزیڈنٹ بورڈ اوف ایجوکیشنل سرکار نظام و پریزیڈنٹ کمیٹی انتظام کتب خانۂ آصفیہ و وائس پریزیڈنٹ انجمن دائرۃ المعارف وغیرہ وغیرہ جنکی تصویر آج ہم شائع کرتے ہیں۔ ہندوستان کے اُن چند منتخب اصحاب میں ہیں جن کے وجود پر تعلیم جدید ناز کرسکتی ہو۔ مرزا صاحب ممدوح جامع اوصاف ہیں۔ انگریزی میں اعلیٰ قابلیت کے ساتھ علوم مشرقی سے عمدہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اردو نثر اُستادانہ لکھتے ہیں اور موجودہ لکھنے والوں میں اُن کا پایہ نہایت بلند ہو۔ باوصف ہز ہائنس حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ جیسے عالی مرتبت والیِ ملک کے ہوم سیکرٹری ہونے کے طبیعت عز و جاہ کے غرور سے آزاد پائی ہو اور باہم سرکاری میں مصروفیت کے باوجود علمی مشاغل کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ اردو کے سب مشہور رسالے اُن کے مضامین سے وقتاً فوقتاً مستفید ہوچکے ہیں۔ خود شائق علم و ہنر ہونے کے علاوہ علم و فن کی قدردانی بھی آپ کا حصہ ہو اور بہت سے مشہور اور نامور اہلِ قلم اُن کی امداد سے حضور نظام کے فیض عمیم سے بہرہ یاب ہوئے ہیں۔

جناب موصوف علیگڈھ کالج کے تعلیم یافتہ ملک کی تعلیمی ترقی کے بڑے حامی اور تمام مفید قومی کاموں کے معاون ہیں۔

شیخ علی حزیں

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

عجب نبود کہ جوہر حلقۂ بیرون در گردد چنیں کائینہ را عکس تو لبریز صفا گردد

میرزا غالب فرماتے ہیں ؎

اہل بینش نے بحیرت کدۂ شوخی ناز جوہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

بقتلم چوں کمر بندی مکن آگہ ترحم را مبادا ایں خصم سنگیں دل مجال فرصتے یابد

ترحم کو خصم سنگیں دل بتا کر حسن معنی کے جلوے دکھائے ہیں۔

افسردہ بود رنگ خزانم بہار را خون میچکید ز ناصیۂ خرمی ہنوز

شوکت الفاظ اور لطف معنی قابل دید ہیں۔

تسلیم نمائیم ودا اول نگہت جان پروانہ صفت گرد تو لبسیار نگردیم

اپنے عشق کی پختگی بیان کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ تو نے میری جانب دیکھا کہ میں نے جان دی۔ میں پروانہ سا کم ظرف نہیں ہوں کہ بار بار تیرے گرد پھروں۔ جب کہیں جان دوں۔

در ناصیۂ طالع ما نقش مرادیست آن نیست کہ خاک قدم یار نگردیم

کس خوبی سے بیان کیا ہے کہ "خاک قدم یار" ہونا عین فرخی طالع ہے۔

آن سرو سرفراز کجا جلوہ میکند تا شکوہ زکوتہے بال و پر کنم
اپنے بال و پر کی کوتاہی کا ثبوت ساتھ ہی دیتا ہے جب کہتا ہے کہ وہ سرو سرفراز کہاں ہے۔

در نا شنیدن سخن خلق نشارہاست گوش گران من شدہ رطل گران من

رفتم زخود چو در دلم آمد خیال تو تنہا نشستہ تو و خالی ست جای من!

نتوان رسانید بے یار زندگی را۔ از یاد قامت او پیری عصا گرفتہ
کہتا ہے کہ بڑھاپے میں اُس کے قامت کی یاد نے عصا کا کام دیا۔ کسقدر عمدہ تشبیہ ہے! اور شیخ نے اپنا مشرب بھی ظاہر کیا ہے کہ بے عشق زندگی کٹ نہیں سکتی۔ پیرانہ سری ہی کیوں نہ ہو۔
مصحفی کہتا ہے ؎
پیری میں بھی ہم الفت طفلاں سے نہ چھوٹے کچھ پڑھ بھی چکے قید دبستاں سے نہ چھوٹے
مولانا ظہوری اپنی خاص ترکیب سے فرماتے ہیں ؎
بطفلی خدمت پیری نہ کردم بہ پیری خدمت طفلے ضرور است
محمد فضل سرخوش (صاحب کلمات الشعرا) کا مطلع بہت پُر زور واقع ہوا ہے کہتا ہے ؎
بجوش آورد پیری بیشتر عشق خون ما قد خم کار ناخن کرد با داغ جنون ما

کدامین دیدہ سازد سرمہ گرد جلوہ گاہش را کہ چشم انتظار از نقش پا بیش است راہش را

کہتا ہے کہ آج اُس کی جلوہ گاہ کی گرد کس کی آنکھوں کا سرمہ ہوئی ہے۔ یعنی کس خوش نصیب کو اُس سے نیاز حاصل ہوتے ہیں کہ اُس کے رہگزر میں نقش پا کے شمار سے بھی زیادہ دیدہ ہائے انتظار ہیں +

زان عقدہ کہ دروی شکند ناخن تدبیر   درہم نشوی عقدہ کشائی تو ہمان است!

یعنے وہ گرہ کہ جسکے کھولنے میں ناخن تدبیر ٹوٹ جائے اصل میں خود عقدہ کشائی ہے مطلب یہ کہ دشواریاں آسانی کی تمہید ہیں۔ اس شعر سے ظاہر ہے کہ شیخ تدبیر کو زیر دست تقدیر سمجھتے ہیں۔

شکایت نیست مطلب نالہ آہنگ است مے نالم
ز دل تنگی نمی نالم۔ دلم تنگ است۔ مے نالم

غالب کہتا ہے ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابندِ نئے نہیں ہے

دلم لبریز داغ است از خیالِ خالِ مشکینش
کنوں خرمن شد آن تخمے کہ من می کاشتم روزے

(۶) متانت و پختگی کلام کی مثالیں

جنون را کار ہا باقیست با مشتِ غبارِ ما
کہ بازیگاہِ طفلان میشود خاکِ مزارِ ما

یعنے مرنے کے بعد بھی جنون کا ساتھ نہیں چھوٹا ہے۔ عنقریب ہے
کہ ہماری خاک بازی گاہِ اطفال بنے گی۔

سر آمد زندگی، وز نارسائیہائے خود دستے
بزلفِ او نزد بختِ پریشان روزگارے ما

"بختِ پریشان روزگار" کی ترکیب ملاحظہ ہو۔

ہلاک گوشۂ دامانِ بے نیازیٔ او   بشمعِ کشتۂ من منتِ صبا نگزاشت

یعنے میری شمعِ مزار کو صبا کا ممنون نہ ہونا پڑا۔ تیری بے نیازی کے
گوشۂ دامن نے اُسے گل کر دیا۔ ایک شعر اسی قبیل کا مرزا جلال اسیر
سے یادگار ہے جسکا جواب نہیں ہو سکتا ؎

باُمیدِ کسے نگزاشت بیداد ش دلِ ما را   خدا ابرے دہد در کشتنِ ما قاتلِ ما را

ندارم فرصتِ آن، کز سبومی در قدح ریزم
بہار از رنگِ گل پنداری آتش زیر پا دارد

زمانۂ عیش کے جلد گزرنے کی طرف اشارہ ہے۔ استعارہ کتنا
خوبصورت ہے ✣

پریشان خاطرم از ہم نشیناں عزلتے دارم   خموشی صحبت خاصیت با خود خلوتے دارم
نمی آرد دلِ آزردہ تابِ نکہتِ زلفش   دماغ آشفتہ ام از بوی سنبل وحشتے دارم
نہ جانِ ادِ دلِ دلجو اہے نہ دل راقوت آہے   منِ حسرت نصیب از زندگانی نہمتے دارم!

جہانیاں پئے رسوائی ہم اندتمام   خدا کند کہ نپرسد کسے زحال کسے

دوسرا مصرع کسقدر صاف اور درد آمیز ہے - ترجمہ یوں ہوسکتا ہے
خدا کرے کہ نپوچھے کسیکا حال کوئی۔ ۶

پریشان سنبلش دیباچۂ احوالِ من باشد
شب ہجرانِ اُو چون سایہ در دنبالِ من باشد

خوش آن ساعت کہ از فیضِ سحر شاداب برخیزی
زخواب صبح چوں خورشیدِ عالمتاب برخیزی

---

(۷) سہل ممتنع

مشیخ کبھی کبھی سہل ممتنع کہہ کر نیا مشق کرتے ہیں۔ شعر کو سہل الممتنع کہتے ہیں جب وہ سادہ اور با مزہ ہو، بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت آسانی سے کہا گیا ہے۔ مگر اصل میں ایسا نہیں ہے، سوائے استاد قادر الکلام کے کوئی کہہ نہیں سکتا۔ سعدی شیرازی ہلالی استر آبادی۔ اور مولانا وحشی - کرمانی۔ سہل ممتنع کے لیے مشہور ہیں۔ حافظؒ کے کلام میں سہل ممتنع کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔

تین شعر شیخ کے دیوان سے منتخب ہو کر درج ہوتے ہیں ؎

از فیضِ ریزشِ قطرہ ترشد دماغ ما   افتادہ سایۂ رگِ ابرے، بباغ ما

بے پردہ کرد عشق، نہانِ اجمالِ تو   دادم بدست دامنِ صبرِ جمیل را

قدح تا گرفتم بہارے بسر رفت بہارے مگو، روزگارے بسر رفت

---

(۸) حُسنِ بندش و لطفِ بیان کی مثالیں

اے خرد عمر تو کم، در غم دنیا منشیں اے جنوں وقت تو خوش، بوی بہاران ست غالب

گرگند عشوہ گری مغبچۂ بادہ فروش دل و دیں نیست متاعے کہ فدا نتواں کرد

دلم از عمر بے حاصل حزیں افسردہ خاطر شد
چراغِ کلبۂ ما آستینے آرزو دارد۔

دوسرا مصرعہ استعارے میں ادا کیا گیا ہے۔

بوے زلفے بگریبانِ صبا ریختہ اند طرفہ شورے بدماغِ دل ما ریختہ اند

بیک ایمای ابرو زندۂ جاوید گردیدم
اشارت سوے من کردی، ہلالِ عید گردیدم!

قافیہ کی برجستگی استادانہ انداز رکھتی ہے۔ "اشارت" اور "ہلالِ عید" میں کسقدر مناسبت ہے۔

قدم گر رنجہ میگردد، عبارے رحمت فرما براہِ انتظارت دیدۂ اُمید گردیدم

دارد ستارہ ریز مرا آفتابِ تو عالم خرابِ چشم و چشم خرابِ تو

کردی ورق ورق دلِ صد پارۂ مرا آیا کدام شد ورق انتخابِ تو؟

درین مدت کہ آہم نامہ بود و اشکِ من قاصد نہ یاد از نامہ ام کردی و نشاد م بہ پیغامے
فراموشی حدے دارد، تغافل مدتے دارد دعاگوی توام، دل را تسلی کن بہ پیغامے
مرا بخت سیہ سرگشتہ دارد ورنہ در کویش سفیدی میکند از انتظام دیدۂ دامے

کہتا ہے کہ برگشتگیٔ طالع سے میں پریشان پھرتا ہوں ورنہ ایک عمر سے اُس کے کوچے میں اُس کا دام میری گرفتاری کے لیئے چشم براہ ہے۔ سفیدی میکند یعنے از دیر انتظار دارد۔

دران عالم کہ عشقِ او مرا دارد، نمی باشد بیاضِ گردنِ صبحے سوادِ طُرۂ شامے

یعنے میں اُس عالم میں رہتا ہوں جہاں صبح و شام کی خبر نہیں ہوتی ہمیشہ ایک حالت رہتی ہے۔ عالمِ تجرد ہی مطلب ہے۔

خالی ز خلق مجلسِ ما دلکشاتر است بیگانگی بمشربِ ما آشناتر است

شیخ اپنا مشرب بیان کرتے ہیں۔ فی الواقع عزلت پسند تھے۔

غمِ دل با تو زاں گویم کہ دانم شاد میگردی چو گنج از خاطرِ ویرانِ من آباد میگردی
ز جامِ حسن بدمستی، بکارِ خویش ہشیاری نہ غافل از ستم نے آگہ از فریاد میگردی

---

(۹) رندانہ کلام

رندانہ کلام حافظ شیراز کا حصہ ہے۔ شیخ کا دیوان بھی رندانہ کلام سے

خالی نہیں ہے فرماتے ہیں ؎

کششے کز نگہہِ کافر او مے بینم ترسم از کعبہ بہ بت خانہ بردباز مرا

ساقی از ورع گیشاں مطرب از خموشانست بے صفاتر از مسجد بزمِ دُرد نوشانست

بے صفاتر از مسجد، کی شوخی ملاحظہ ہو۔

بعصائے خرد ایں راہ نشاید طے کرد گردنِ شیشہ بدستِ من سرگرداں دہ

ذوق مرحوم فرماتے ہیں ؎

شوق مستی ہے گلگشتِ چمن کا ہمکو چاہیئے جائے عصا گردنِ مینا ہمکو

حزیں کا شعر البتہ زیادہ وسعتِ معنی رکھتا ہے۔

زاہد تو چہ دانی، ز حریفانِ مُغاں پرس فیضے کہ شبِ جمعہ و ماہِ رمضاں داشت

غالب کا ایک شعر اسی قبیل کا ہے مگر مضمون دوسرا ہے ؎

بر طاعیاں فرخ و بر عشرتیاں سہل نازم شبِ آدینہ ماہِ رمضان را

چہ شُد از توبہ اگر دامنِ خشکے دارم پیشِ ابرِ کرمِ پیرِ مغاں انہمہ نیست

بود تا مے جوان با او لبصد جان عشق مے ورزم

مریدش میشوم از صدقِ دل چوں پیر میگردد

اور بھی کسی شاعر نے شراب کی تعریف اسطرح کی ہے دگو شیخ کا شعر زیادہ لطیف اور بامزہ ہے۔)

شرابِ کہنہ کہ غارتگرِ روانِ من است | مصاحبِ من او پیرِ من و جوانِ من است

ز ہر کنجِ خرابات مغاں برخاست جمشیدے | کسے از حلقۂ پیرہینہ گاراں برنمی خیزد
خزیں تر شد دماغ خشک زاہد از نوائے تو | چنیں مستانہ بوی از بہاراں برنمی خیزد

سبزہ شد خطِ لبِ یار بہار است بہار | اے جنونِ من سرشار بہار است بہار
دیدہ بحر یست پر آشوب جنون است جنوں | مژہ ابریست گہر بار، بہار است بہار
مطربا نالۂ جانسوز کہ شور است بسر | ساقیا ساغر سرشار، بہار است بہار

غالب مرحوم کی بہاریہ غزل قابلِ شنید ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مژدہ اے ذوق خرابی کہ بہار است بہار | طرز آشوب تراز جلوۂ یار است بہار
ہم حریفانِ ترا طرفِ بساط است چمن | ہم شہیدانِ ترا شمع مزار است بہار
جعد مشکینِ ترا غالیہ سا لیست نسیم | رخِ رنگین ترا غازہ نگار است بہار
وحشتے میدمد از گردِ پریشانی رنگ | از کمینگاہ کہ رم خوردہ شکار است بہار

چو آں کافر کہ اسلام آورد از بنیوائیہا | رہ دین میرود زاہد کہ دنیا نیست در دستش!

چو شمع انجمن افروز کفر و ایماں باش | بمدعای دلِ کافر و مسلماں باش

اپنی آزادمشربی کا ذکر کیا ہے۔

پیرِ مغاں اشارتم کرد بہ غسلِ توبہ | ریخت حریف میکدہ جامِ شراب بسرم

"غسلِ توبہ" میں شرارت بھری ہوئی ہے۔

ساقی از شربِ یہود انہ سالوس چہ فیض خونِ حسرت بہ ازاں بادہ کہ رسوا نکشم

شرب الیہود کے معنی چھپ کر پینے کے ہیں جیسا ذوق کے شعر سے ظاہر ہے ؎

پوشیدہ اُن نگاہوں میں سرخوش ہیں رات دن
شرب الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

---

(۱۰) شیوا بیانی

فغانی شیرازی کا مطلع مشہور ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست

اِن "شیوہ ہائے بسیار" کی جن کے نام نہیں ہیں اگر شعر میں توضیح کیجائے تو وہی شیوا بیانی ہے۔ رُخ و کاکل کی تعریف اور ان کی تشبیہ آسان ہے مگر شیوہ بیانی یعنے کرشمہ و ناز کی تفسیر نہایت مشکل ہے اور بہت کم شعرا کے حصے میں آئی ہے۔ شیخ کے دیوان سے اشعار متضمنِ شیوا بیانی منتخب ہو کر ثبت ہوتے ہیں ؎

گویا خط پیشانیت اے زہرہ جبین است
بیروں نتواں بُرد ز ابروے تو چیں را

چیں ز جبہہ وا کردی عیش عاشقاں خوش باد
خندہ از لبت گل کرد عیدِ بادہ نوشان است

نگہہِ عجز ز چشم تو ترحم مے خواست — از کمین غمزۂ بیباک تو برخاست کہ نیست!

زبانِ نکتہ سنجاں در دہن انگشتِ حیرت شد — تکلم الحق از چشم سخنگوئی تو مے آید

عشرت بکام خواہی، آئینہ را بہ پیر — عیش مدام خواہی، لب را مکید باید

جلوہ در خانۂ آئینہ بخود نمائی — گر بدانی کہ بمن حسرت دیدار چہ کرد!

میرزا غالب کا شعر بھی داد طلب ہے۔ ہائے کیا کہا ہے ؎

تماشا کر اے محو آئینہ داری — تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں!!

نگاہِ گرم چو رخسارِ آتشینِ تو بوسد — عرق چو شبنم گستاخ یاسمینِ تو بوسد

یعنے میری پُر اشتیاق نگاہ جب تیرے رخ کا بوسہ لیتی ہے تو تیرے رخ کو حیا سے عرق آجاتا ہے۔

چشمت از ناز نہ بست است دررا ز بمن — رسد از جنبش مژگانِ تو آواز بمن!

کتنا نازک شعر کہا ہے۔ بخدا کہ جواب نہیں رکھتا۔

دل طلب کرد از آں غمزہ عتابے کہ مپرس — باشارت نگہش داد جوابے کہ مپرس!

مولانا صائب کا مطلع ہے ؎

داشت امروز رخ یار حجابے کہ مپرس — زد بروی دِل مدہوش گلابے کہ مپرس!

دونوں مطلع شیوا بیانی کی پاکیزہ مثالیں ہیں۔ باقی آئندہ۔ رضا علی وحشت

حکیم بریان دواس

حکیم بریاں داس شہر کورینتیہ کا بادشاہ تھا۔ یہ حکیم زمانہ ادسلے کے فلسفیوں میں سے تھا اِس کا سال پیدائش اور سال وفات تحقیق نہیں ہوا۔ اِس حکیم کو ایک قسم کا جنون تھا۔ تعجب ہے کہ باوجود اِس کے اہلِ یونان نے اسکو منجملہ حکما رشمار کیا ہے وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس کی تمام حکمتیں ظرافت پر مبنی ہیں۔ اِس کے افعال و حرکات نہایت شنیع تھے۔ لیکن اسپر بھی اہلِ یونان اُسکی حکمتوں پر ایسے گرویدہ تھے کہ اُس کے افعال قبیحہ سے چشم پوشی کرتے تھے۔ تمام عمر اِس کی یہ کیفیت رہی ہے کہ بعض وقت تو حکما رجیسی باتیں کرتا تھا۔ اور بعض وقت حمقار کی سی۔ اور اپنی بدنامی سے مطلقاً نہ ڈرتا تھا۔ اسکی حرکات شنیعہ کا اِس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسکی ما کا شیشۂ عصمت بھی ٹوٹے بغیر محفوظ نہ رہا حالانکہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی احمق اور وحشی کیوں نہو ایسی حرکت کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

اُس نے یہ نذر کی کہ اگر میں اولمپق کے کھیلوں میں جیت گیا تو سونے کا ایک بت بنا کر بت خانہ جوپیٹر (مشتری) میں رکھوں گا اتفاق سے پہلے ہی مرتبہ میں کامیاب ہوگیا۔ مگر دیکھا تو اتنا مال نہ تھا کہ اپنی نذر پوری کرسکتا۔ اس لیئے جتنی عورتیں اُس کے پاس تھیں سب کے زیور اوتار لیئے اور اس ڈھنگ سے اُس نے اپنی نذر پوری کردی +

اِس حکیم کے باپ کا نام سبیلس تھا۔ اور ماں کا نام فیرقلیدس شہر کورنتیہ پر وہ عہد شاہ ہلیاطس میں قابض ہو گیا تھا۔ اِس نے لوسیس نبت امیر ابیدورسے شادی کی تھی اور اُس سے بے انتہا محبت رکھتا تھا۔ اُس کا نام بدل کر میلیس رکھا تھا۔ اِس بیوی کے بطن سے اُس کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام سبیلس تھا جو نہایت کم عقل تھا۔ اور چھوٹے کا نام اسکفرعون جو نہایت عقیل و ذکی تھا۔ اِسکی زوجہ میلیس بہت موٹی تازی بدصورت تھی۔ اتفاق سے اُس زمانہ کی بعض عورتوں نے اُس کی بھدی سی تصویر مذاقاً بنائی جس کو دیکھکر بریاندا اس کو بڑا غصہ آیا۔ اور فوراً اپنی بیوی کے پاس پہونچا سوراتفاق کہ وہ اِس وقت ایک سیڑہی پر چڑہی ہوئی تھی۔ بریاندر نے جاتے ہی اُس کے پیٹ میں اِس زور سے لات ماری کہ وہ سیڑہی سے نیچے گرکر فوراً مر گئی۔ اور اُس کے پیٹ میں جو بچہ تھا وہ بھی ضائع ہو گیا۔ اسکو مُردہ دیکھکر حکیم بہت ہی پچھتایا اور اِسی غم و غصہ میں اُن عورتوں کو پکڑوا بلایا جنہوں نے وہ تصویر بنائی تھی۔ اور اُس کی بیوی کی ہلاکت کا باعث ہوئی تھیں اور اُن سب کو جلوا دیا۔ جب اُس کی بیوی کی موت کی خبر اُس کے خسر کو پہونچی تو اُس نے اپنے نواسوں کو بلوا بھیجا تاکہ اُن ہی کو دیکھکر اپنی تسلی کرے۔ جب یہ اُس کے پاس پہونچ گئے تو اُس نے دونوں سے کہا کہ بھلا تمہیں معلوم ہے کہ تمھاری ماں کو کس نے قتل کیا ہے؟ بڑا چونکہ احمق تھا کچھ نہ سمجھا۔ مگر چھوٹے کو سخت رنج ہوا۔ اور اُس نے اُسیوقت اپنے دلمیں عہد کر لیا کہ شہر کورنتیہ

جاکر اپنے باپ سے کبھی کلام نہ کروں گا۔ اور نہ اُس کا کہا مانوں گا جب یہ دونوں پھر اپنے باپ کے پاس گئے تو اُس نے یہ معلوم کرنے کے لیئے کہ اُن کے نانا نے (جس کا نام ابرتقلی تھا) کیا کچھ کہا ہے بڑے بیٹے سے بہت سے سوالات کئے۔ مگر وہ اپنی حماقت کیوجہ سے صاف بات نہ بیان کر سکا۔ البتہ اتنا معلوم ہو گیا کہ اُن کے نانا نے اُن پر یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اُن کی ماں کے موت کا باعث اُن کا باپ ہی تھا۔ جب اُس نے بڑے بیٹے سے زیادہ پرسش کی تو اسکو وہ باتیں یاد آگئیں جو اُس کے نانا نے چلتے وقت دونوں سے کہی تھیں اور اُن سب کا اعادہ کر دیا۔ اس پر بریاندا اس نے چاہا کہ اپنے اور اپنے خسر کے درمیان اپنے چھوٹے بیٹے کو واسطہ بنالے۔ چنانچہ تمام اہل شہر کو حکم دے دیا کہ اگر یہ چھوٹا بیٹا کسی کے یہاں آئے تو اُسکو نکال دیا جائے تاکہ وہ یہ سمجھ لے کہ مجھے میرے باپ نے نکال دیا ہے یا نکال دینا چاہتا ہے چنانچہ لوگوں نے ڈر کے مارے ایسا ہی کیا۔ چند روز کے بعد بعض خیر خواہوں کو اسپر رحم آیا اور اُس کے باپ کی مخالفت کر کے اُسکو اپنے گھروں میں پناہ دینے کا ارادہ کر لیا۔ مگر بریاندا اس نے اُن کو بلا کر دھمکایا کہ اگر ایسا کرو گے تو چن چن کر قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اب تو کسی کو ہمت نہوئی۔ اور اُس مظلوم سے کوئی بات تک کرنے کا روادار نہوا۔ الیکفرعون دن رات مارا مارا پھرتا تھا لوگ اُس سے اِس طرح ڈرتے تھے کہ جیسے درندے سے۔ اس حالت میں اُس کا باپ اُس کے پاس آیا۔ تو اُسکو چار روز سے

بھوکا پایا۔ یہ دیکھکر اُس کا بھی دل پسیجا اور کہا کہ تم سمجھتے ہو کہ تم اس مصیبت میں کس وجہ سے پھنسے ہو۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تم میرے ملک و خزائن کے مالک بنو؟ آخر تم میرے بیٹے ہو اور شہر کوانتینہ کے امیر ہو۔ اگر تمہیں اپنے والدہ کے مرنے کا رنج ہے تو مجھے تم سے زیادہ رنج ہے۔ مگر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا آخر میں نے بھی اس پر صبر کیا ہے۔ تم اس حالت پر اپنے ہاتھوں پہونچے ہو۔ نہ اپنے باپ کی مخالفت کرتے نہ اِن دہاڑوں کو پہونچتے۔ اب تمھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ باپ کی مخالفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ میں اب بھی تیار ہوں کہ تم کو پھر گھر لے چلوں"۔ بیٹے کے پہلو میں باپ سے بھی زیادہ پتھر کا دل تھا اُس نے بے خوف خطر یہ جواب دیا کہ جو سزا تم نے میرے پناہ دینے والوں کے لیئے مقرر کی ہے اُس کے مستحق تم خود ہو"۔ بریاں دا اس نے بیٹے کی یہ حالت دیکھکر اُس کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ٹلنے کے لیئے قور قیسرہ بھیجدیا۔ جو اُسی کی مملکت میں واقع تھا۔ اور اُدھر اپنے خسر ابریقلی سے اس لیئے ناخوش ہوا کہ وہی باپ بیٹوں کی دشمنی کا بانی مبانی ہوا ہے اور انتقام لینے کے لیئے ایک بڑی فوج تیار کی اور خود اپنے خسر پر چڑھ دوڑا۔ اور نہایت آسانی کے ساتھ اُسکو گرفتار کر کے قید کر دیا۔

مدتوں کے بعد جب بریاندا اس بہت ہی بوڑھا ہو گیا تو اُس نے ایک شخص کو قور قیسرہ بھیجکر الیکفرعون کو بلایا۔ تاکہ سلطنت اُس کو دے کر خود الگ ہو جائے۔ الیکفرعون نے اِس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بریاں دا اس کو چونکہ اپنے اِس بیٹے سے بے انتہا محبت تھی اِس لیئے اُس نے اپنی بیٹی کو بھیجا کہ وہ اپنے بھائی کو جسطرح ہو سکے

سمجھا بجھا کرے آئے اِس نے جاکر اپنے بھائی کو بڑی بڑی قسمیں لائیں
اور کہا کہ کیا تم یہہ چاہتے ہو کہ سلطنت ہمارے خاندان سے نکلکر
دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے۔ کیونکہ شوکت اُس خوبصورت عورت
کی طرح ہے کہ جو عفیفہ نہو۔ آج ایک کے پاس ہے تو کل دوسرے
کے پہلو میں۔ کیا تمکو یہہ معلوم نہیں ہے کہ ہمارا باپ بہت ہی بوڑہا
ہو گیا ہے اور اُسکی موت کے دن قریب آ گئے ہیں۔ اگر تم جلد نہ پہونچے
تو ہمارا ملک و عزت سب جاتی رہے گی۔ اِس لئے تمھیں چاہیئے
کہ فوراً جاؤ اور یہہ عزت و جاہ جو تمھارا حق ہے ضائع نہ کرو۔"
الیکفرعون نے قسم کھائی کہ جب تک بریاند اس شہر کورنیتیہ میں
رہے گا میں ہرگز واپس نہ جاؤں گا۔ یہ سنکر اُس کی بہن واپس
چلی آئی۔ اور اسنے والد سے تمام قصہ بیان کر دیا۔ بریاند اسنے
پھر اپنے بیٹے کو کہلا بھیجا کہ" چونکہ تم قسم کھا چکے ہو کہ جب تک میں
اِس شہر میں ہوں تم اُس میں قدم نہ رکھو گے۔ اِس لئے میں نے
قصد مصمم کر لیا ہے کہ اپنی باقی عمر شہر قور قیرہ میں گزار دوں"۔ الیکفرعون
یہ سنکر راضی ہو گیا۔ اور دونوں نے اپنا اپنا قیام گاہ بدل لینے کی
تیاری کی۔ مگر جب اہل قورقیرہ کو یہ امر معلوم ہوا تو وہ بہت ڈرے
کہ ایک دیوانہ ہمپر مسلط ہوا چاہتا ہے۔ اس لیئے اُنہوں نے
الیکفرعون کو قتل کر دیا۔

بریاند اس کو اب اپنے بیٹے کی طرف سے یاس کُلی ہو گئی۔ اور اسکی
یادداشت میں اُس شہر کے بڑے بڑے آدمیوں کے تین سو لڑکوں
کو گرفتار کر کے ہلیاطس کے پاس بھیجدیا کہ اُن سب کو خصّی کر کے

اپنا غلام بنالے۔ اتفاق سے وہ کشتی جسمیں یہ بدنصیب لڑکے تھے۔ جزیرہ شامس میں پہونچی۔ وہاں کے لوگوں کو جب اِن مظلوموں کا حال معلوم ہوا تو اُن کو بڑا رحم آیا اور اُن سے خفیہ طور پر کہلا بھیجا کہ تم سب بت خانہ دیانہ میں چلے آؤ کہ وہاں سے پھر گرفتار کرنے کی کسیکو جرأت نہیں ہوسکتی۔ اور شہر کونیتیہ والونکو وہاں سے نکالنے کی کسی طرح ہمت نہ ہوگی۔ اِس طریقہ سے یہ بدنصیب بھی بچ گئے اور بریانداس کو بھی اُن لوگوں کے عذر کا خیال نہوا۔ مظلوموں کو آذوقہ پہونچانے کا اُن لوگوں نے یہہ انتظام کیا کہ ہر روز بہت سے آدمی مل کر بت خانہ کے سامنے ناچتے اور اثنائے رقص میں کھانے پینے کی چیزیں اُن کی طرف پھینک دیتے۔ شہر کونیتیہ والے بہت روز یہ تماشہ دیکھتے رہے آخر تھک کر چلے آئے۔ بریانداس کو یہ واقعہ سنکر اور بھی رنج ہوا کہ وہ حسب دلخواہ اپنے بیٹے کے قتل کا انتقام بھی نہ لے سکا۔

اِس وقت حکیم نے اپنے ہلاک ہونے کا ارادہ کیا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ میرے مدفن کی کسی کو اطلاع نہو۔ اِس لیے اُس نے یہہ تدبیر کی کہ دو جوانوں کو بلا کر اونہیں ایک غیر آباد راستہ کا پتہ دیا اور کہا کہ رات کو وہاں گشت کریں اور جو شخص تنہا اون کو نظر آئے اُسکو قتل کر کے فوراً وہیں دفن کردیں۔ اُن کو رخصت کر کے چار اور جوانوں کو بلایا۔ اور اُن کو حکم دیا کہ رات کو اُس موقعہ پر جو دو آدمی ایک جگہ ملیں اُن کو قتل کر کے فوراً اُسی مقام پر دفن کردیا جائے اُن چاروں کو رخصت کر کے اور بہت سے آدمیوں کو بلوایا۔ اور اِسی طرح

اِن چاروں کے قتل کا انتظام کر دیا۔ اور مقررہ وقت پر خود تنہا اُس مقام پر پہونچا۔ اور قتل ہو کر دفن کر دیا گیا۔ پھر اُس کے دونوں قاتل۔ اور پھر اُن کے قاتل۔

لیکن یہ تدبیر بھی بدقسمتی سے اُس کے لیئے کارگر نہوئی۔ کیونکہ اہل کورنیتیہ کو جب معلوم ہوا تو اُنھوں نے اُس کا بڑا مقبرہ بنایا اور اُس پر پچی کاری کی۔

یہ اول شخص تھا کہ حاکم ہو کر ظالم کہلایا۔ فقرا سے اکثر محبت رکھتا تھا۔ یہ اجازت نہ تھی کہ شہر کے لوگ سب مساوی درجہ کے ہوجائیں شرازیبولس کی رائے کو بہت مانتا تھا۔ سرازبیول نے اُس کو ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ میں نے اُس شخص سے کوئی بات نہیں چھپائی جسکو تم نے میرے پاس بھیجا تھا۔ لیکن اسکو تم نے ایسے وقت میں بھیجا کہ گیہوں بمشکل دستیاب ہوتا تھا۔ میں نے اُس کے سامنے ہی خوشوں سے گیہوں نکال کر اپنے ہاتھ سے پیسے۔ اگر تمھیں اپنے ملک و خاندان کی حفاظت کرنی ہے تو میرا اتباع کرو۔ دوست و دشمن کو برابر سمجھو۔ غاصب خواہ کتنا ہی عزیز کیوں نہو ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اُسکو امن دیا جائے۔ اُس کے بعض اقوال یہ ہیں:۔

اگر انسان کسی بات کو دلپر رکھے اور اُس میں پوری کوشش کرے تو ضرور ہے کہ اُس میں کامیاب ہو جائے۔ اور کیوں نہو انسان تو وہ چیز ہے کہ اگر چاہے تو دریاؤں کا رُخ بدل دے۔ انسان کو چاہیئے کہ نیکی کے عوض میں سونا یا چاندی قبول نہ کرے

بادشاہوں کے لیے اس سے بڑھکر اور کوئی فخر کی بات نہیں ہے کہ اُن کی رعایا اُن سے محبت کرتی ہے۔ راحت سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں ہے۔ آدمی کو اسی پر قناعت نہ کرلینی چاہیئے کہ شریر کو سزا دیدے۔ بلکہ اُس کو بھی سزا دینی چاہیئے کہ جو اُسکا رازداں رہا ہو۔ لطف زندگی برسات کی گھٹائیں ہیں کہ آتی ہیں اور نکل جاتی ہیں۔ انسان کو چاہیئے کہ سختی پڑے تو نرم ہو جائے اور مصیبت میں عقل سے کام لے۔ کسی کا راز امانت سمجھکر ظاہر نہ کرو۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے دوستوں سے یکساں سلوک رکھے خواہ آرام میں ہو یا تکلیف میں۔

حکمار کو بہت محبوب رکھتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ تمام حکمار کو اپنی دار السلطنت میں بلوایا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ اور اُن کا نہایت اکرام کیا +

چالیس سال سلطنت کی اور اندازاً قریب بیالیسویں ادلمبیاد میں جاں بحق ہو گیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دو حکیم اس نام کے ہوئے ہیں۔ اون دونوں نے جو کچھہ کہا اور کیا وہ ایک سے منسوب کردیا گیا ہے +   (باقی آیندہ)

خلیل الرحمن

انقلاب

(۴)

شیر علی

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد ، دولت زیادہ !!

کاٹ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی ، بی خدیجہ بیگم کی پہلی مرتبہ تو بہت خدمت کی گئی ۔ طرح طرح سے انکا کہنا مانا گیا ، سارا کا سارا گھر انکی پائنتی اور سرہانے ہی جمع رہتا تھا ۔ خانصاحب تو خاں صاحب ، اُن کی بیوی ہر وقت میری پیاری خدیجہ ، میری جان خدیجہ ، ہی کہتی رہتی تھیں ۔ مگر جب بیماری دراصل تو جاتی رہی لیکن بی خدیجہ پھر بھی وہی حالت بنائے رہیں ، تو ایک ایک کرکے سب کو بار معلوم ہونے لگیں حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اب نبض صاف ہے ، ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں کہ اب کچھ نہیں ہے مگر بی خدیجہ ہیں کہ وہی دن بھر ٹھنکنا ، رات بھر ہاتھ پاؤں مارنے ، بات بات پر بگڑنا ، خواہ مخواہ ہائے ہائے کرنا ، آنکھوں کی پتلیاں پھرانی ، ہاتھوں کی کلائیاں موڑنی ، دانتوں کی بتیسی بھیچ کرنی ۔ ایک وقت ہو دو وقت ہو تو کوئی اُٹھائے ، آٹھ پہر کی مصیبت کون جھیلے ؟ ہاں میاں شیر علی بیچارے چوبیس گھنٹے برابر ہاتھ پاؤں ہی سہلاتے رہتے ، لیکن اسپر بھی خدیجہ کرتیں تو یہ کرتیں کہ ۔ سب سے ہنستیں بولتیں ، باتیں کرتیں ۔ مگر جہاں شیر علی کیصورت دیکھی کہ بیماری کا دورہ شروع ہوگیا ، ہاتھ پاؤں کھنچنے لگے ، اور ہوں

ہوں کا تار بندھ گیا۔ جواب دنیا تو کیسا جس پٹی پر شیر علی بیٹھتے، اُدھر سے کروٹ لے لیتیں، اور شکل دکھائی بھی روا نہ رکھتیں۔

فطرت انسانی بھی عجیب چیز ہے۔ صحبت اور بچپن کے عادات بھی جوانی میں فطرت بنجاتی ہیں، اور پھر کسیطرح اُن کی اصلاح نہیں ہوسکتی۔ میاں محمود اور خدیجہ کی ماں دونوں کی غیر محدود نازبرداری نے بی خدیجہ کا ستیاناس کر دیا، اور اُنہیں دین و دنیا دونوں سے کھو دیا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ بی خدیجہ بدمزاج سہی! نازوں کی پالی سہی! مگر اوروں سے اِس قدر کیوں گھلتی ہیں؟ اُن کے مزاج اور عادات کا اندازہ لفظوں میں تو کیا جا نہیں سکتا، ہاں! کوئی دیکھے، اور کسیکو سابقہ پڑے، تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس درجہ بیہودہ ہیں، اور کس قدر اپنے حق میں کانٹے بوتی ہیں۔

خدیجہ کا مزاج بھی ایک عجیب ناقابل حل شکل تہا۔ وہ ہنس مکھ تھی، وہ چڑچڑی تھی! وہ ہر ایک میں بُرائی نکالتی تھی، وہ ہر شخص کی تعریف کرتی تھی! وہ منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی، وہ بات بات میں مذاق کرتی تھی! وہ بیمار تھی، وہ تندرست تھی وہ سیدھی بات میں بگڑجاتی، وہ بُرے سے بُرے لفظ کو ہنسی میں ٹال جاتی وہ بُری تھی، وہ اچھی تھی۔ وہ برابر والیوں میں بیٹھنے سے گھبراتی، مگر ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ دو دو گھنٹے چھلیں کرتی۔ ہاں! خدیجہ کی بیماری نہ آج جاتی تھی نہ کل! ہفتہ دو ہفتہ، مہینہ دو مہینے، بلکہ پورے چھ مہینے لگاتار خدیجہ بیمار رہی! اور گھر والوں کے ہاتھ میں بل بتّا ہی رہا! اُدھر میاں محمود کا تقاضا، روز آدمی بُلانے آرہا ہے ہمیشہ زور دیا جا رہا ہے، آخر تنگ آکر شیر علی نے ایکدن انہیں بھیج ہی دیا۔ اور یہ چلی ہی گئیں۔

وہاں جاکر معلوم نہیں یہ کس طرح رہیں، اور اِن کے مرض کی کیا کیفیت

رہی؟ لیکن۔ کان گنہگار ہیں۔ خاں صاحب کے ہاں سے جو ماما جاتی، وہ یہی کہتی آتی کہ "اللہ رکھے۔ کہنے والی بندی کے منہ میں خاک۔ اب تو چھوٹی دلہن گھوڑا سی دوڑتی پھرتی ہیں"۔ بی خدیجہ نے میکے میں ایک کروٹ مہینہ بھر رہیں۔ رہیں اور ہنسی خوشی رہیں۔ کیا ممکن جو کبھی آنکھ بز میل بھی آیا ہو۔ انگلی بھی دکھی ہو! ہاں عین اس دن جبکہ سسرال میں آئیں۔ ناطاقتی، کمزوری سر میں چکر، پیروں میں لڑکھڑاہٹ، سب ہی کچھ لے کر آئیں! اور دوسرے دن سے پھر چارپائی تھی اور ان کا پرانا مرض۔ بدمزاجی تھی اور ایک ایک سے لڑنا، بدنصیبی تھی اور شوہر سے نفرت۔ مگر شیر علی۔ لایق اور دور اندیش شیر علی۔ اب بھی ٹالتے رہے، اور کبھی ایک حرف بھی خدیجہ کے منہ پر نہ رکھا۔ زمانہ کی گردش جو گرانا چاہتی ہے گرا کر چھوڑتی ہے۔ پھر محمود صاحب نے بلانے کی دہائی ڈالی، اور پندرہ ہی دن میں تقاضوں کا تانتا لگ گیا۔ اس مرتبہ میاں شیر علی نے صاف انکار کر دیا۔ اور جو آیا اسے بری طرح جواب دیا۔ انکار کیا اور ہمیشہ کے لیے انکار کیا۔

اس کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں، کہ شیر علی کے ساتھ خدیجہ نے اچھا برتاؤ نہ کیا۔ ایک دو مرتبہ نہیں۔ ہزار ہا دفعہ لاکھوں بار۔ ایسا ہوا کہ شیر علی خوش خوش گھر میں گھسے، خدیجہ کے پاس ہنستے بولتے گئے! اور آئے تو مغموم آئے، خاموش آئے، اور فکروں کا ہجوم لائے۔ خدیجہ کی تنک مزاجی نے شیر علی کو ضرورت سے زیادہ بھاٹ بنا دیا۔ اور یہ اس کی محبت میں ایسے دیوانے ہوئے کہ اپنا رکھا کھویا بھی بھول گئے۔ آتے ہیں تو گھبرائے گھبرائے بیٹھتے ہیں تو بولائے بولائے۔ نہ تن کی خبر نہ بدن کا ہوش! ہر وقت "بیوی تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"، کہتے ہی کہتے انکا منہ سوکھتا تھا

مگر ناعاقبت اندیش خدیجہ خاموش، ہونٹ سے ہونٹ سیے، تیوری گھونٹے پڑی رہتی، اور اگر یہ زیادہ سر ہوتے تو ایک عجیب تنفر کے ساتھ اے توبہ ہے تم تو میری کان کھا گئے کہتی ہوئی منہ پھیر لیتی۔ اور انکی طرف سے کروٹ لے لیتی۔

ناز و انداز حسن کا زیور سہی! اور ناز برداری ایک چاہنے والے کا فرض سہی! لیکن موقع موقع کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ خدانخواستہ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ انسان ہر جگہ غصہ اور سختی سے ہی کام لے ہاں! یہ ضرور کہینگے کہ نہ اسقدر کڑوا ہو کہ ہر شخص چکھے اور تھوک دے، اور نہ اسقدر میٹھا ہو کہ جو پلے نگل جائے؛ ضرورت سے زیادہ خوشامد، اور خواہ مخواہ یورپ کی تقلید بھی اکثر اوقات اپنے حق میں آپ ہی کانٹے بُو دیتی ہے۔ نئی تعلیم اور نئی روشنی نے اگرچہ اصلاح کی ہے کہ مرد عورت کی قدر کرتا ہے اور پرانا جابرانہ حکومت کا برتاؤ نہیں کرتا! تو ساتھ ہی یہ بھی بس گھولا ہے کہ اکثر اوقات رسم انگلش کی تقلید۔ اور لیڈیز کی غیر محدود عزت کا خیال بُرا اثر پیدا کرتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ خدیجہ کو شیر علی نے بگاڑا! نہیں بلکہ خدیجہ۔ بذات خود، جاہل، ناعاقبت اندیش، بدمزاج، سب ہی کچھ تھی، تاہم اوّل روز سے خیال رکھا جاتا تو اٹھارہ اُنیس کچھ نہ کچھ تو فرق ہو ہی جاتا۔ تھوڑی بہت تو سنبھل ہی جاتی۔ کچی لکڑی تھی پھر بھی مُڑتے مڑتے مڑ ہی جاتی۔ مگر غضب تو یہ ہوا کہ خدیجہ بدسرشت تھی، تو شیر علی نرم! وہ بدمزاج تھی، تو یہ خوشامدی! وہ ناعاقبت اندیش تھی، تو یہ بے پرواہ! وہ بُرا کہتی، یہ بُرا نہ مانتے! وہ بگڑتی، یہ ہنستے! وہ نفرت کرتی، یہ بچھے جاتے خدیجہ سنبھلتی تو کیونکر؟

ہوتے ہوتے بدمزگی بھیلی ہاں کر رنجیاں شروع ہوئیں، چھوٹی چھوٹی

باتیں دونوں طرف ناگوار گذرنے لگیں، میاں شیر علی تو شیر علی۔ اب تو فرشتہ بھی خدیجہ کو ٹھیک نہ کر سکتا تھا! یہ روکتے وہ نہ رکتی! یہ سمجھاتے، وہ نہ مانتی! اور یہ بندشیں کرتے، وہ دُگنی ہوتی! چھ ہی مہینے کی پلٹی میں گھر مُرغوں کی پالی بنگیا؛ رفتہ رفتہ محبت بھی کم ہونی شروع ہوئی، خیال بھی پلٹا، شیر علی کو بھی مساوات ہوئی، اور اچھی خاصی ناچاقی کیصورت پیدا ہوگئی۔ یا تو خدیجہ کو ایک آن اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ یار دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا سب اُس کے کارن تج دیا تھا، یا اب پرواہ بھی نہیں، آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، قسم کھانے کو بھی نہیں پوچھتے۔ اور تو اور، میاں محمود نے بلایا، تو بغیر پس و پیش کئے بھیجدیا، اور بھیجا تو ایسا بھیجا کہ پلٹ کر خبر نہ لی! بھول کر پوچھا نہیں! اور چھ مہینے کا مل بلانے کا نام نہ لیا۔

شیر علی گریجویٹ، تعلیم یافتہ، مہذب، نیک چلن، سعادت مند، خجستہ اطوار، سب ہی کچھ سہتے، مگر پھر نوجوان! تھے! اُن کے پہلو میں بھی دل تھا، اور دل بھی اُمنگوں سے پُر! یہ بھی انسان تھے، اور انسان بھی خطاؤں سے مرکب! کہانتک پاک نفس اور پاک طینت رہتے؟ گھر کا یہ حال! بیوی کا یہ طریقہ! ساس سسر دونکا یہ ہنجار! پس کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ نیک اور نیک سرشت شیر علی کو بھی دنیا۔ ناپاک دنیا۔ تفرقہ بُرا! دنیا کی ہوا لگی، اور اُن کے قدم بھی گھر سے باہر نکلے۔ باہر نکلے کہ نظریں بھی اوپر اُٹھیں۔ دل بھی بے چین ہوا۔ بے چینی ہونی تھی، کہ ہاتھ بڑھا، بڑھنا تھا، کہ چڑھے: چڑھنا تھا کہ گرے: گرے اور تاریکی کے غار میں گرے! گناہ کی دلدل میں پھنسے!! اور بد اطواری کے لشکر میں گھرے!!!

(۵)

فتحیاب زبیدہ

جاڑوں کا موسم ہے اور کڑاکڑی کی سردی، رات کا وقت ہے اور ہر طرف سناٹا، ٹھنڈی ہوا ہے اور کپکپی کی شدت! ہوا چلتی ہے ٹھنڈک بڑھتی ہے، برف گرتی ہے، اور آدمی رضائیوں اور لحافوں میں ڈبکے جاتے ہیں! کمروں اور دالانوں میں گھسے جاتے ہیں! کواڑ بند کئے لیتے ہیں۔ پردے چھوڑے دیتے ہیں۔ اور طرح طرح سے کوشش کر رہے ہیں کہ سردی سے بچیں، اور کسیطرح ہوا کو اپنے تک نہ آنے دیں۔ مگر کہاں؟ ٹھنڈی ہوا میٹھی چھری بنکر کلیجے میں اُتری ہی جاتی ہے۔ اور مظلوم بیکس کی آہ کی مانند آہستہ آہستہ گھس کر چپ چاپ اپنا کام کیے ہی جاتی ہے! سردی سے بچنے والے۔ اُوڑھتے ہیں، لپیٹتے ہیں، کونوں کونوں گھستے پھرتے ہیں۔ مگر نہیں۔ ذرا توقف ہوا کہ پھر سی سی کرنے لگتے ہیں۔ا۔ اور گھٹنوں کو پیٹ میں دیئے لیتے ہیں!!

یہ سردی کی شدت ہے اور رات کا نصف سے زیادہ حصہ گذر چکا ہے، گھنٹے نے ابھی ابھی دو بجائے ہیں اور چوکیدار "جاگتے رہیو" کا غل مچا رہے ہیں، کہ۔ ہم اپنے خیالی سُبک سیر ایئر شپ میں سوار، عالم بالا ہی سے قاضی صاحب کے مکان پر ٹکٹکی باندھے گھورتے ہیں یہاں بھی چاروں طرف سناٹا ہے، اور کمروں کے کواڑ بھی بند ہیں۔ البتہ میاں رشید کے کمرے میں کس کمرے میں؟ جسمیں آپ کو یاد ہوگا غریب زبیدہ پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہوئی تھی۔ جسمیں اُسے سخت سست کہا گیا تھا اور

جس میں قابل رحم دکھیاری کو لاتیں مار کر شراب کے نشے میں پلنگ کے نیچے پھینک دیا گیا تھا۔ اس میں، ایک لیمپ جل رہا ہے، اور اسکی روشنی بیچ کے دروازے والے ٹوٹتے ہوئے کواڑوں کی جھری میں سے چھن چھن کر برآمدے میں آ رہی ہے۔ رشید کو یہاں آئے ہوئے مہینہ بھر ہو گیا۔ اور اُسنے نیمونیا کی تکلیف ایسی اُٹھائی کہ خدا دشمن کو بھی نہ دے، وہ مر مر کے بچا۔ اور اب اگرچہ مرض اُس کی گردش قسمت کی طرح چلتا پھرتا نظر آیا، تاہم کمزوری ہے اور بہت بڑھی ہوئی کمزوری ہے اسیوجہ سے سردی کی احتیاط بے حد کیجاتی ہے۔ کمرے کے تینوں دروازے بند ہیں، اور اندر ایک کونے میں رشید کا پلنگ بچھا ہے۔ جسپر میاں رشید ایک رضائی اوڑھے لیٹے ہیں، مُنہ کھولے پڑے ہیں۔ اس پلنگ کی پٹی کے نیچے ہی لوہے کی بڑی انگیٹھی رکھی ہے جسمیں راکھ اور جلے ہوئے کوئلوں کا ڈھیر بتا رہا ہے کہ یہ آگ کمرہ گرم کرنے کی غرض سے جلائی گئی ہوگی۔ پلنگ کے سرہانے ایک میز پر آٹھ دس موٹی موٹی جلد کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں، اور برابر ہی دوہری بتی کا لیمپ سبز رنگ کے گلوب سے ڈھکا ہوا روشنی کی شعاعیں پھیلا رہا ہے۔ اس پلنگ سے ہٹ کر کمرے کی دوسری طرف ایک اور پلنگ بچھا ہے جسپر ڈھیر کیطرح پڑا ہوا لحاف بتا رہا ہے کہ اسپر بھی کوئی سوتا تھا۔ ان دونوں پلنگوں کے درمیان انگیٹھی کے پاس دیوار سے پیٹھ لگائے، صرف ایک پتلی سی رضائی اوڑھے ہوئے، فرشتہ صفت زبیدہ نیند میں غافل ہو رہی ہے۔ مگر اس کی نشست اور حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کام میں مشغول تھی کہ بیٹھے بیٹھے پلک جھپک گئی، اور وہ دیوار سے سہارا لیکر غافل ہو گئی۔ میاں رشید آج مغرب ہی کے وقت سے سو گئے تھے۔ اور کھانا کھانے

کے وقت بھی نہ اُٹھے تھے۔ اِن کے والد نے بھی دو تین آوازیں دیں
مگر جب انہیں بالکل غافل پایا تو کسی نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ کمزوری کی
نیند آندھی کی طرح آتی ہے، یہ بھی سو یا کیے۔ لیکن کب تک سوتے؟ جاڑوں
کی پہاڑ سی رات، جو شام سے سوئے تو ڈیڑھ بجے آنکھ کھل گئی۔ اوّل تو
نیند بھر چکی تھی، دوسرے بھوک! یہ اُٹھے اور ایسے اُٹھے کہ نیند کوسوں بھاگ
گئی! لاکھ کروٹیں بدلتے ہیں، منہ پیٹتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں مگر نیند
کے نام اللہ کا نام! آخر مجبور لاچار۔ ہوشیار رہے تو اکیلے پڑے پڑے
گھبرانے لگے۔ انہوں نے گردن اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا، اور آہستہ
سے ہاتھ بڑھا کر ایک کتاب جسکا سرورق سُرخ تھا اُٹھائی۔ یہ کتاب
جادو نگار مسٹر کورلی کا مشہور ناول "تھلما" تھی انہوں نے اسے اُٹھایا
اور ایک جگہ سے جہاں سفید نشانی رکھی ہوئی تھی کھولا۔ پھر اسے ہاتھ میں
لیے ہوئے چت لیٹ گئے، اور اُس صفحہ سے دیکھنا شروع کیا جس کے
نیچے ۶۴۵ کا نمبر پڑا ہوا تھا۔ اور جس کے اوپر موٹے موٹے ٹائپ میں
(تیسرا حصہ۔ پہلا باب) چھپا ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے تھلما کی دلچسپ عبارت
نے انہیں بالکل اپنی طرف متوجہ کر لیا اور یہ ناول میں مستغرق ہوگئے
گھنٹے کی سوئی بڑھتی رہی اور طاق میں رکھے ہوئے ٹائم پیس نے
کھٹ کھٹ کرتے کرتے ٹن ٹن چار بجائے۔ میاں رشید بھی ہوشیار
ہوئے کہ اب رات ختم ہونیوالی ہے۔ انہوں نے کروٹ لی اور چاروں
طرف سے پھر رضائی کو لپیٹا، پھر کتاب ہاتھ میں لی اور پھر ان کی نظر صفحہ ۵۸۰
کے دوسرے پیراگراف پر بڑے شوق کے ساتھ دوڑنے لگی۔ ابھی
کچھ سیکنڈ ہی گذرے ہونگے کہ زبیدہ کو حرکت ہوئی اور وہ کلبلائی۔

رشید نے فوراً ہی کتاب کو رضائی میں دبکا لیا اور آنکھیں بند کر کے سوتے بن گئے۔

زبیدہ۔ لایق اور صابر زبیدہ اٹھی اور گھبرائی ہوئی اٹھی۔ آنکھیں ملیں اور انگیٹھی کی طرف دیکھنے لگی: نیند سے بند ہوئی جانے والی آنکھوں کو اب بھی کچھ نہ سوجھا یہ آگے بڑھی، اور اسنے انگیٹھی پر ہاتھ ڈالا: راکھ کا ڈھیر کوئلے بھسم، آگ تو آگ بھاپ بھی نہ تھی۔ یہ گھبرا کر کھڑی ہوئی اور گھور گھور کر گھڑی دیکھنے لگی۔ چار بج چکے تھے! یہ اور زیادہ پریشان ہوئی۔ اور "آگ لگے میری نیند کو: بھاڑ میں جائے میری نیند!" آہستہ آہستہ کہتی ہوئی، اپنا لحاف پلنگ پر سے اٹھا رشید پر ڈال، انگیٹھی ہاتھ میں لے، کواڑ کھول، باہر چلی گئی۔ اور ساتھ ہی کواڑ بھی بھیڑتی گئی۔ رشید جاگ رہے تھے، اور زبیدہ کی ایک ایک حرکت غور سے دیکھ رہے تھے۔ پرانی باتیں تو بھوپال کی مصیبت میں ہی ان کے دل میں گھر کر چکی تھیں، وہاں سے آتے ہی زبیدہ کی خدمت اور تیمارداری نے اور گہرے نقش بٹھائے؛ رشید بیہودہ حرکات سے متنفر تو تھے ہی، ان کی طبیعت تو پھر ہی چکی تھی، روز بروز زبیدہ کی محبت بڑھتی ہی رہی: اور اسوقت یہ حالت دیکھتے ہی، رشید کی ایسی نوبت ہوئی کہ جوں ہی زبیدہ دہکتے ہوئے کوئلوں سے بھری ہوئی انگیٹھی لیکر اندر گھسی، اور پٹی کے پاس رکھ کر پھونکنے لگی کہ یہ بے ساختہ اٹھے اور یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "خدا کے لیے ایک نالایق مصیبت زدہ کو اس قدر شرمندہ نہ کرو کہ وہ گھبرا کر جان دیدے!"

زبیدہ نے تعجب سے رشید کو دیکھا اور گھبرا کر کہا "ہیں! ہیں! تمھیں کیا ہو رہا ہے؟ ہوشیار ہو! کلمہ پڑھو! کیا کوئی برا خواب دیکھا"؟

رشید (آبدیدہ ہو کر اور رک رک کر) "برا خواب! اور نہایت برا خواب! میری گذری ہوئی زندگی خواب خرگوش ہے، پیاری زبیدہ!

میں آج تک ایسے ہی بیہودہ خواب دیکھتا رہا۔ مگر افسوس کہ ہوشیار نہ ہوا میری آنکھ نہ کھلی! بے شک میں کلمہ پڑھتا ہوں، نہیں نہیں! بلکہ ہمیشہ تمہارا کلمہ پڑھونگا۔ میں خطاوار ہوں! گنہگار ہوں! مگر۔ خدا کا۔ یا۔ یا۔ تمھارا!! میرے بیہودہ خواب کی تعبیر بس یہی ہے کہ تم میرے گذرے ہوئے قصور معاف کردو! خدا کے لیئے۔ کردو! ۔ رسول کے لیئے معاف کردو۔!!! ......" ابھی پورا فقرہ بھی ختم نہوا تھا کہ کمزور اور بیمار رشید کا سانس اُلجھا، بدن کانپا، ہونٹوں کو جنبش ہوئی، اور آنکھیں موتی برسانے لگیں!! ساتھ ہی زبیدہ نے دونوں ہاتھوں سے رشید کے پانوں پکڑکر یہ کہتے ہوئے اپنا سر رشید کے قدموں پر رکھدیا کہ "دیکھو! دیکھو! تم کیا کہتے ہو؟ بس! میں ہوں خطاوار! گنہگار! شرمندہ! کم نصیب! تمہاری لونڈی! تمہاری خادمہ! تمہاری۔ تمہاری کنیز!! ۔ تمہاری تمہاری۔ ......!!" اس کی بھی طبیعت گھٹی، دل بھرا، دماغ بگڑا، اور آنسو گرم اور ناسمجھ آنسو، مچل مچل کر رخساروں پر، پھول جیسے رخساروں پر شبنم کی طرح بہنے لگے!!!۔

رشید نے باعصمت اور نیک طینت زبیدہ کا سر اپنے قدموں سے زبردستی اُٹھا کر گود میں رکھ لیا، اور اپنے آنسوؤں کے سیلاب کو۔ نہ رُکنے والے سیلاب کو بمشکل روک کر، نہایت جوش کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا "زبیدہ! پیاری زبیدہ!! میری زندگی کی مالک زبیدہ!!! تم نے وہ احسان کیئے ہیں کہ میں تمام عمر گردن نہیں اُٹھا سکتا، آنکھ اونچی نہیں کرسکتا۔ میں نالایق تھا۔ تم شریف تھیں! میں وحشی تھا۔ تم خدمت گذار تھیں! میں بیہودہ تھا، میں آوارہ تھا، بے شک۔ آوارہ تھا، ناقدرشناس تھا!! اور تم۔ تم میری مطیع تھیں، فرمانبردار تھیں، مجھسے محبت کرتی تھیں!

مگر نہیں۔ وہ وقت گیا۔ وہ بات گئی۔ زبیدہ! پیاری زبیدہ! سنتی ہو یا نہیں
یہ رشید آج سے تمھارا غلام ہے۔ اور تم دیکھ لوگی کہ یہ اگر شریف خون
سے بنا ہے! تو پیاری زبیدہ کے محبت کے دائرہ سے کبھی باہر
نہ ہوگا!! خدا رشید کو اس وقت کو موت دے! جو وہ سوائے زبیدہ
کے کسی اور کا خیال بھی اپنے دلمیں آنے دے!!!۔ یا اُن آنکھوں
سے جن سے اپنی پیاری زبیدہ کو دیکھتا ہے کسی اور کو دیکھے"!!
یہ کہا اور زبیدہ کو گلے لگا کر پھر دل کے بخارات آنکھوں کے رستہ
نکالنے لگا! دل کے بخارات اور آنسوؤں کی جھڑی!! رُکی تو کب رُکی؟
جب موذن نے اللہ اکبر، کی مقدس آواز سنا کر بتا دیا کہ۔ آج سے
خدائے پاک اور بزرگ نام نے تمھارے عہد و پیمان کو اور تمھاری
محبت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مضبوط کر دیا!!!

سلطان حیدر جوش

نظام المشائخ :- دہلی کی صوفیہ انجمن نے جسکا نام حلقہ نظام المشائخ مشہور ہے جولائی سے اپنا ماہواری آرگن نظام المشائخ جاری کیا ہے۔ اس کے چیف ایڈیٹر حلقۃ المشائخ کے بانی مولانا خواجہ حسن نظامی ہیں۔ رسالہ تمام سلسلوں کے صوفیہ مشائخ کے خیالات کی حمایت و اشاعت کی غرض سے شائع کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں عربی فارسی انگریزی سنسکرت کے تصوفانہ لٹریچر کو مہیا کرا اسکا اعلیٰ منتا بنایا جاتا ہے۔

جولائی نمبر میں دعا۔ خواجہ کی چڑیاں طلسماتی تختہ آنسو وغیرہ عنوان سے تصوفانہ جذبات کا لطیف پیرایہ میں اظہار کیا گیا ہے۔

اگست کے پرچہ میں کلیم و درویشی کی تنگی۔ حب وطن۔ مکاشفات رؤیا۔ عبادت اور دعا۔ شان محبوب وغیرہ نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے کارآمد اور دلچسپ ہے۔

لکھائی۔ چھپائی۔ قابل اطمینان قیمت ۱ عہ سید محمد ارتضیٰ صاحب احدی نائب ایڈیٹر و منیجر سے منزلگاہ حلقہ نظام المشائخ دہلی کے پتہ پر دستیاب ہوتا ہے۔ نمونہ کا پرچہ ۳ پر ملتا ہے

کلمبس

گذشتہ اشاعت سے آگے

کلمبس جب کیوبا پہنچا کنارہ پر سے وہاں کے لوگوں نے میوے۔ اور کھانے پینے کی بہت سی چیزیں اہل جہاز کو دکھائیں۔ کہ یہاں اُترآؤ اور یہ ہدیے ہمارے قبول کرو۔ بلکہ اکثر اہل جزیرہ اپنی ناؤں میں بیٹھ بیٹھ کر جہاز کے پاس آئے اور بہت کچھ میوے اور ہدیے بلا معاوضہ خوشی خوشی دیکر چلے گئے۔ اِن لوگوں نے اون سے سونے کی کان کو پوچھا تو اُنھوں نے کہا کہ یہاں سے جنوب کیطرف جزیرہ جمیکا میں بہت سونا ہے۔ اور یہ بھی اُن لوگوں سے اس نے سنا کہ یہاں سے اور مغرب کیطرف جاؤ تو بڑا ملک ہے اور بڑی سلطنت ملیگی جہاں کے لوگ لباس بھی پہنتے ہیں کلمبس کو یقین ہوگیا کہ وہ ملک ایشیا مشرقی ہے اور سلطنت خاقان چین ہے جس کا ذکر مارکو پولو نے کیا ہے۔ اور کیوبا کو وہ یہ سمجھا کہ سرحد ملک مشرقی ہند ہی ہے۔ اگر دو تین دن اور وہ کیوبا کی گرد سفر کئے جاتا تو اُس کو معلوم ہو جاتا کہ کیوبا جزیرہ ہے۔ براعظم ایشیا نہیں ہے پہلے کیوبا کے مشرقی ساحل پر پہونچا پھر تمام ساحل جنوبی کو اُس نے دیکھا۔ پھر ساحل مغربی پر عرصہ تک پھرتا رہا فقط دو تین دن کی کسر رہ گئی کہ اُس نے بسبب زادِ راہ نہ ہونے کے پلٹنے کا مجبوراً ارادہ کرلیا۔ کیوبا کے ایک ساحل پر کلمبس اُترا۔ اور وہاں صلیب کو نصب کیا۔ وہاں کے لوگ بہت مدارات سے پیش آئے۔ اِس میں سے ایک شخص نے

کلمبس کے سامنے کھڑے ہوکر یہ تقریر کی کہ اے شخص تو صاحب فوج ولشکر وشکوہ و قوت ہے اور ہم لوگوں کے ملک میں آیا ہو سب تجھے ایکدن مرنا ہے۔ آخرت کی بہتری اگر چاہتا ہے تو جن لوگوں نے تجھے نہیں ستایا ہے ان کے آزار رسانی کا قصد نہ کرنا کلمبس یہ سنکر کانپ گیا اور اُسے بہت کچھہ تسلی دی۔ پانچ مہینے ان جزیروں میں پھرتے پھرتے کلمبس اور اُس کے ساتھہ والے علیل اور بے سروسامان و بے زاد راہ ہوگئے تھے آخر سفر کو موقوف کرکے اپنی بستی میں جونئی بسائی تھی واپس آ گئے۔ یہاں پہونچکر کلمبس کو معلوم ہوا کہ جس افسر کو جزیرہ میں دورہ کرنے کو حکم دے گیا تھا وہ بہت سے سوار و پیادے اپنے ساتھہ لیکر غریب دیسیوں کو ستاتا رہا اور وہ فوجیں وہیں چھوڑ چھاڑکر آپ اندلس کو روانہ ہوگیا ہے دورہ کرنے کا حکم تو بالائے طاق رکھا کلمبس کی شکایت کرنے کو دربار میں گیا ہوا ہے۔ فوج بے افسر کے اور بھی کھل کھیلی اور یہانتک نوبت پہنچی کہ اُن کے میزبانوں نے کہدیا کہ ہم تمھاری ضیافت کا بار آئندہ سے نہیں اُٹھائیں گے اب ان لوگوں نے اُنھیں لوٹنا شروع کر دیا۔ اور اونھوں نے بھی باہم اتفاق کرکے اندلسیوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ کلمبس نے اس واقعہ کو سنکر ... کی تادیب کے لیے فوج روانہ کی اکثر اُن کی بستیوں کو تباہ و تاراج کیا۔ دیسی ... میں ایک شخص جو بڑا جنگجو و شجاع تھا اُس سے بڑا اندیشہ تھا اس کے ... کلمبس نے ایک چالاک اور جیوٹ آدمی چنکر بطور سفیر کے روانہ کیا یہ مرد ... دیرفن دس سوار ہوشیار و آزمودہ کار اپنے ساتھہ لیکر بے خوف و خطر جنگلوں میں ہوتا ہوا اُس قوم کی سرحد میں جا پہنچا۔ وہ لوگ جاہل تھے مگر دلیر و شجاع ... سمجھتے تھے اسکی بڑی قدر کرتے تھے۔ اُنھوں نے کسی طرح کا ضرر سفیر کو نہیں پہنچایا۔ اور آشتی پیش آئے۔ سفیر نے اُس شخص سے بیان کیا کہ اہل اندلس کو تم سے ... اور بگاڑ کرنا نہیں منظور ہے کلمبس نے تم سے دوستی کی خواہش کی ہے

تمھیں چاہیے کہ وہاں چلو اور عہدنامہ صلح کا لکھدو اور اِس کے عوض میں عیسائی
گرجا کا بڑا گھنٹہ تمھیں پیشکش کیا جائے گا۔ یہ گھنٹہ تمام اہل جزیرہ کی نظر میں ایک
اعجوبہ شے تھی جس کی کرامات کی روایات و حکایات دُور دُور ان لوگوں میں مشہور تھے
کہ اُس کی آواز میں ایسا جذب ہے کہ تمام عیسائی اپنے گھروں سے کھنچے ہوئے
چلے آتے ہیں اور دم بھر میں اُسکی پرستش کے لیے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں
یہ سب لوگ بُت پرست تھے ہر ہر گھر کا بُت جُداگانہ ہوتا تھا جس بُت کی کسی کرامت
کا انہیں یقین ہو جاتا تھا پھر اُس بُت کو چُرا لے جاتے تھے کہ اپنے گھر میں اُسے
رکھیں تاکہ برکت اُترے۔ اِس امر سے سفیر واقف تھا اُس نے جو گھنٹے کا لالچ
دیا تو حریف راضی ہوگیا اور اندلسیوں کی بستی کی طرف تیاری کا حکم دیا۔ اور اُس کے
ساتھ چلنے کے لیے ایک لشکر جرار تیار ہوگیا۔ سفیر کو یہ دیکھکر تردد ہوا اور اُس سے
کہا کہ دوستانہ ملاقات میں اتنا بڑا لشکر ساتھ لیجانا مناسب نہیں ہے اُس نے
جواب دیا کہ چند لوگوں کو لیکر جانا میری شان کے خلاف ہے۔ غرض بڑی
شان و شوکت سے رئیس منودکلبس کی ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ ایکدن
ایک ندی کے کنارے مقام تھا سفیر نے ہتکڑیاں نکال کر اُسے دکھائیں
وہ لوہے کی تھیں مگر ایسی صیقل کی ہوئی کہ آئینہ کیطرح چمک رہی تھیں اور یہ
کہا کہ یہ زیور شاہی ہے کہ سلاطین اندلس جلوس کے روز یا عید کے دن اسے
پہنتے ہیں اور تمھارے واسطے بطور ہدیہ بھیجی گئی ہیں اسے پہنو اور میرے گھوڑے
پر سوار ہو کر فوج کو آج اپنی شان و شوکت دکھاؤ۔ رئیس دم میں آگیا اُس نے
کبھی لوہا دیکھا ہی نہ تھا گو سونے کی کانوں کا مالک تھا۔ نہ کبھی گھوڑے پر چڑھا تھا
غرض ہتکڑیاں پہنکر سفیر کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ گیا سفیر سوار ہوا اور اُس کے ساتھ کے
دسوں عیار گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے جنگلی درختوں کی آڑ میں اُس کو لے گئے

اور جب یہ دیکھا کہ لشکریوں کی نظر سے اوجھل ہو گئے تو سب نے تلواریں کھینچ کھینچ کر اُسے دھمکایا کہ اگر بھاگنے کا قصد کیا یا غل مچایا تو یہ سمجھ لو یہ سب تلواریں تمھارے خون سے سُرخ ہو جائیں گی۔ غرض اس حیلہ سے ہتکڑیاں ڈالکر اور اُسے باندھکر گھوڑے دوڑا دیئے اور کلمبس کے پاس لاکر حاضر کیا۔ ایسے بڑے دشمن پر قابو پانے سے کلمبس کو اطمینان تمام ہوا اُسے قید سخت میں رکھنے کا حکم دیا۔ بلکہ خود اپنی نگہبانی میں اُسے رکھتا تھا۔ اِس اثنا میں اندلس سے ایک قافلہ اور آیا۔ بہت سے صناع طبیب دواخانہ ورسد ان لوگوں کی راحت رسانی کے لیے پہنچا۔ کلمبس نے جتنا سونا جمع کیا تھا وہ اور پانسو دیسی اسیر یورپ میں بھیجنے کے لئے ایک جہاز پر سوار کر کے اپنی سرکار میں روانہ کئے۔ ملکۂ ازابلا نے رحم کھاکر حکم دیا کہ سب کو واپس کر دو۔ ادھر اہل جزیرہ نے جب یہ دیکھا کہ اُن کے ایک بڑے رئیس کو گورے دغا سے پکڑے گئے تو اُنھوں نے تمام رؤسائے قوم کو متفق کر کے ایک لشکر عظیم جس کا شمار قریب قریب لاکھ آدمیوں کے بیان کیا جاتا ہے آراستہ کر کے گوروں کی نئی بستی پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ کلمبس نے اپنی فوج آراستہ کی جسمیں دوسو پیادے بیس سوار اور بیس شکاری کتے تھے۔ پہلے اُنکے رئیسوں کے ملانے کی تدبیر کی۔ ایک شخص گواکانا گاری بڑا خوش عقیدہ تھا اپنی فوج سمیت آکر کلمبس کا شریک ہو گیا۔ اُس نے اپنی قوم سے عین وقت پر بے وفائی کی پھر توپوں سے اور بندوقوں سے اُس مجمع کو برہم اُس لشکر کو زیر و زبر کر کے زخمیوں پر گھوڑے دوڑائے۔ اور بھاگنے والوں کا تعاقب کر کے سینکڑوں کو سنگینوں میں چھید لیا۔ سیکڑوں کو تلوار سے چور نگ کیا۔ کتوں نے اُس برہنہ قوم پر حملہ کرنے میں شیرانہ جرأت دکھائی جاتے ہی ٹیٹوا چبا لیتے تھے یا پیٹ پھاڑ ڈالتے تھے۔ الغرض گورے

فتحمند ہوئے اور ہزاروں آدمی قید کر لیے گئے۔ ۲۷۔مارچ ۱۴۹۵ء کا یہ واقعہ ہے بمقام ویگا۔ یہ فتح ہوئی۔ اب کلمبس نے فاتحانہ دورہ اُس جزیرہ کا کیا اور جہاں جہاں گیا سب نے اطاعت و غلامی اختیار کی ہر ہر شخص پر جس کا سن چودہ برس سے زیادہ ہوتا تھا یہ جزیہ مقرر کیا۔ کہ ہر سہ ماہی میں بقدر ہ ڈالر بھر سونا لا کر دے اور جو روساے قوم اُن لوگوں میں تھے اُن پر بہت کثیر مقدار جزیہ کی معین ہوئی جن اضلاع میں سونے کی کانیں نہ تھیں اُن پر یہ جزیہ تھا کہ ہر شخص ہر سہ ماہی میں ساڑھے بارہ سیر روئی دیا کرے کلمبس نے ہر ہر بستی میں جزیہ وصول کرنے کے لیے ایک گڑھی تعمیر کی۔ تمام جزیرہ قبضہ میں آ گیا۔ اور تمام باشندے غلام ہو گئے۔ جہاں کسی نے اپنا جزیہ ادا کرنے میں تاخیر کی فوراً گرفتار ہوا اور سزا دی گئی۔ ایک ایک شخص صبح سے شام تک سونا ڈھونڈھتا پھرتا تھا یا روئی جمع کیا کرتا تھا یہ ہمیشہ کے بےفکری و آزادی کے عادی تھے۔ اب اس جزیئے کے فکریں اور سزا کے خوف میں مبتلا ہو کر زندگی سے بیزار ہو گئے کچھ دنوں تک وہ اس خیال سے اپنا دل خوش کر لیا کرتے تھے کہ چند روز کے بعد یہ سب لوگ ہمارے جزیرے کو چھوڑ کر اپنے وطن کو چلے جائیں گے۔ بلکہ اکثر سادگی سے پوچھا بھی کرتے تھے کہ یہاں سے کب تک تم لوگ واپس ہو گے۔ جب اُنہیں معلوم ہو گیا کہ یہاں کی نعمتیں اور برکتیں بےفکری و آزادی و عیش و شادی اب ہماری قسمت میں نہیں رہی اور ہمیشہ کی غلامی مقدر میں ہے تو شہر چھوڑ چھوڑ کر جنگلوں میں پہاڑوں میں بھاگ بھاگ گئے۔ بہت لوگوں کو اُن کے خداوندان نعمت پھر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے پکڑ لائے۔ اور بہتیرے جنگلوں میں فاقے کر کر کے مر گئے۔

باقی آئندہ

سارس کی تارک الوطنی

گذشتہ اشاعت سے آگے

خدا معلوم اِس فقرے کی تہ میں ایسی کیا چیز چھپی تھی جو بے فکر دل پر تیر کیطرح جاکر لگی اور ہشاش بشاش چہرہ کو جسپر رنج وغم کا نشان تک نہ تھا بالکل سہما دیا۔ انسان قدرت پر بھی بازی لے گیا۔ اتنی عمر ہونے آئی مگر آجتک اتنی جلدی میں ستے کبھی آسمان کو بھی رنگ بدلتے نہ دیکھا جس کے وہم وگمان میں بھی انقلاب کا اندیشہ نھا جو خلقت اور صنعت سب کو ہیچ سمجھ رہی تھی جس کی تمام خوشیاں جس کے تمام خیالات اس دو ڈھائی سیر کے لوتھڑے میں محدود تھے جس کے دماغ میں اس بے بہا نعمت نے اپنا سکہ بٹھا رکھا تھا اور جسکے دلمیں ننھا سا لال راج کر رہا تھا دفعتہً سٹ پٹا گئی بچے کو وہیں پٹخا اور سہمی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور گھگیا گھگیا کر کہہ رہی تھی۔

"نہیں تو بیگم! بڑی دیر سے رو رہا تھا میں نے گود میں اُٹھا لیا"۔

ماں کی گود کا فراق اور دودھ کا چھٹنا تھا کہ ننھا سا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تعجب تو یہ تھا کہ ہر چند چیخا چلایا مگر واقعات نے ماں کو اتنی اجازت نہ دی کہ اپنی صورت دکھا کر فوری رنج کی تلافی کر دیتی ہاں اتنا ضرور تھا کہ جوں جوں اظہار تکلیف میں جسکا ذریعہ رونے کے سوا بچے کے پاس کچھ اور نہ تھا۔ زیادتی ہوتی جاتی تھی ماں کا خون خشک ہوتا جاتا تھا۔ میں دور بیٹھا ہوا بہت کچھ تڑپا مگر بے بس تھا بہترا غور کیا مگر قیاس نے مدد نہ دی کہ

اِس سنگدل عورت کے فعل پر کوئی رائے قایم کرتا ہر چند وجہ ارتکاب سوچتا تھا مگر کوئی خیال ٹھیک نہ بیٹھا۔ باوجود اِس ناکامی کے کہ دماغ نے کوئی صائب رائے نہ دی۔ چونکہ افراط تخیلات کا مرض مجھکو لاحق ہے۔ میں اس جھگڑے کے اُلٹ پھیر میں پھنسا رہا۔ ممکن ہے کہ غلط ہو مگر میں جو قیاس لگا سکا اور جو رائے قایم کرنے پر مجبور تھا وہ یہ تھی کہ زرد دوپٹہ والی عورت کی کچھ ایسی اغراض اِن ہمجنسوں سے وابستہ تھیں جنکا پورا ہونا ضروریات زندگی میں شامل اور بقارحیات کا جزو لازمی تھا۔

مگر اے مادہ کیا بشریت اسی کا نام ہے اور ان حرکات کا فاعل انسان کہے جانے کا مستحق ہے؟ بول بول پیاری مادہ کس دل سے اِس شقی القلب عورت نے ماں بیٹوں کے دور محبت کو درہم برہم کر دیا۔ وہ ذرا سا دل جو آزادی سے پڑا ہوا کلکاریاں مار رہا تھا اِس سنگدل کی وجہ سے چیخیں مار مار کر رونے لگا اور اسکو پروا بھی نہوئی؟ محض اپنے بچہ کی محبت باعتبار تمول برتر ہونیکا زعم یا اسی کے قریب قریب کچھ اور ہونے کی رعونت کیا سب جائز تھے اِس کے کہ اپنی ہی جیسی عورت اپنی ہی جیسی انسان کی مامتا صرف اسوجہ سے کہ اسکی ضرورتیں اٹکی ہوئی ہیں۔ اپنی مامتا پر قربان کر دے اور ایسا ناجائز فائدہ اُٹھائے کہ مجھ جیسے جانور تک لعن طعن کریں؟ بول بول پیاری مادہ کچھ تو بول ننھے ننھے کلیجو نپر نیر لگانیوالی مخلوق مجروح دلونپر برچھیاں چلانیوالی مخلوق۔ اور اشرف؟ توبہ توبہ؟ اے آسمان پر بادشاہت اور زمین پر حکومت کرنے والے الامان الحفیظ بچائیو اِس مخلوق سے جو اتنی ارذل۔ اور پناہ میں رکھیو اِس فرقہ سے جو اسقدر خودغرض ہو +

مادہ پیاری مادہ۔ باتوں ہی باتوں میں دن کہیں کا کہیں پونہچا اور سورج سر پر آگیا میں نہ کہتا تھا کہ ایسی منحوس مخلوق کا صبح ہی صبح نام لیا خدا خیر کرے۔
خواہش یہ ہے کہ آیندہ کسی ایسی شے کا وجود بھی میرے ذہن میں ہو آ اور دامن کوہ میں چل جو کچھ کہا کچھ نہیں کہا ابھی بہت کچھ کہنا ہے۔
میں اِس تماشے میں ایسا محو اور اِس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ بھوک پیاس غارت ہوئی۔ ہر چند جی چاہا کہ نیچے اُتروں اور اپنے پروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے معصوم دماغ کو تر و تازہ کروں مگر اندیشہ اور اندیشہ کیا یقین تھا کہ اگر بھولے سے بھی اِن حدود میں داخل ہو جاؤں گا جہاں حضرت انسان کے قدم پہونچ سکیں تو آزادی کا خاتمہ ہوگا اور بر قینچ ہو کر کسی کونہ میں پھینکدیا جاؤں گا۔ اڑا اور جدھر منہ اُٹھا اُدھر کا رخ کیا جہاں انسان کی طرف سے اسقدر نفرت آمیز خیالات میرے دماغ میں جگہ پکڑتے جاتے تھے وہیں تحقیقات مزید کی خواہش اور یقین کی ضرورت بھی اسقدر محسوس ہوہی تھی کہ میں آبادی میں چکر لگاتا رہا۔ گرمی نہایت شدت سے پڑ رہی تھی اور چونکہ حرارت آفتاب اسوقت پورے زور پر تھی نازک مزاج انسان کو اتنی برداشت کہاں؟ کوئی تہ خانوں میں گھسا۔ کوئی خسخانوں میں ہاں ایک جگہ تین چار آدمی کھڑے ہوئے دکھائی دیئے اِن کو دیکھکر میں نے بھی طاقتِ پرواز کو کمزور کیا دیکھتا کیا ہوں کہ ایک موٹا تازہ آدمی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ادھر اُدھر ٹہل رہا ہے اتنا ہی موٹا مگر عمر میں کچھ چھوٹا ایک شخص جسکی صورت بڑے موٹے سے بہت ہی ملتی جلتی تھی ایک طرف چپکا کھڑا تھا دو تین آدمی اور بھی تھے۔ مگر مجھے دیکھکر تو کیا کسی ضرورت ہی سے سمجھنا چاہیئے باہر چلے گئے۔

گو پچھلے واقعہ نے اُس چیز کو جو انسانی وشیطانی حرکات میں مابہ الامتیاز ہے میرے دماغ سے قریب قریب غارت کر دیا تھا مگر پھر بھی میں ایسی اعلیٰ واشرف مخلوق سے بدظن نہ ہوا اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ انسانی تاریخ کے یہ بدنما دھبے شاید مذہب کے رگڑوں کا مقابلہ نہ کر سکیں اور جو طبیعتیں اصول مذہب جیسے مؤثر شے سے متاثر ہو چکی ہیں ان سے ایسی کمینہ حرکات کا ظہور نہو گا۔ مگر جانور اور مجھ جیسے آزاد کیواسطے یہ تو آسان نہ تھا کہ میں محض انسان کی صورت دیکھکر یہ پتہ لگالوں کہ یہ مذہب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے تاہم واقعات پر نظر ڈالنے سے پہلے میں نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے حکیم بخشیم کو اسی غرض سے دیکھا اسکا سر منڈا ہوا تھا گلے کا پر سفید ڈاڑھی پیشانی پر گٹے ٹخنوں سے اونچا پائجامہ مختصر یہ کہ کچھ ایسا تقدس ٹپک رہا تھا کہ میرے دل نے بلا تامل اس شخص کے انسان ہونے کی شہادت دی میں منتظر تھا کہ اس کے قول وفعل سے کسطرح واقفیت حاصل کر دوں دفعتہً اس بڑے موٹے نے چھوٹے موٹے سے کہا۔

یہ صرف فتنہ پردازوں کی شرارت ہے جو تمکو میری طرف سے بھڑکا رہے ہیں ہیں اگر تمھارا دشمن ہونگا تو دوست کسکا ہونگا یہ دولت اور ریاست سب ملنیوالی چیزیں ہیں مگر تم جیسا برابر کا بھائی۔ نہ ماباپ زندہ ہوکر آئینگے نہ نصیب ہوگا۔ صدقہ کر دوں تیر سے وہ جائداد جو تمہارے دل میں میری طرف سے گرہ ڈالے بھائی سلیم تمنے کسطرح یقین کر لیا کہ میں حکام کو تمھاری بغاوت کا یقین دلا رہا ہوں اور اس کمبخت موضع عزیز آباد کے واسطے لاحول ولاقوۃ اگر خدا کوئی چیز ہے اور مرنے کے بعد اسکے حضور میں افعال دنیوی کا جواب دینا ہے تو میں اُسکو شاہد کرتا ہوں کہ اگر تمسے دغا کروں تو خدا سے تم بلا تامل اس دستاویز پر دستخط کر دو واللہ باللہ ثم باللہ اسکو میری بدنیتی پر محمول نہ کرو تمھاری ریاست تمکو مبارک ہو میری ایہ کوشش دوراندیشی ہے

بنی ہے اگر خدانخواستہ ایسی ویسی ہوئی تو یہ آبائی نشانیاں جہاں باپ دادا کی ہڈیاں
گڑی ہوئی ہیں نیست نابود ہوجائیں باپ دادا کا نام لیتے ہوئے اس شخص کی آنکھ میں
آنسو بھر آئے اور کچھ ایسے درد سے تقریر کی کہ چھوٹے موٹے نے فوراً ہی دستخط
کر دیئے نہ معلوم اس کاغذ میں کیا خدائی کی دولت تھی کہ دستخط ہوتے ہی بڑا
موٹا باغ باغ ہوگیا۔ اور کاغذ ہاتھ میں لے یہ جا وہ جا ابھی اس شخص کو گئے
مشکل سے ایک گھنٹہ ہوا ہوگا کہ چند طاقتور لیمان رنگ برنگ کی وردیاں پہنے
قدانہ گھس آئے اور اس چھوٹے موٹے کو زنجیر و نمیں جکڑ ایک طرف لے چلے اس
شخص کی گریہ وزاری اور اظہار بیگناہی پر کلیجہ کٹتا تھا۔ زمین پر یہ چھوٹی سی
جماعت اور ہوا پر میں اکیلا۔ مختصر یہ کہ ہم سب ایک ایسی جگہ پوہنچے جو عدالت
کے نام سے تعبیر کی جاتی تھی سب سے پہلا شخص جسنے اس مظلوم کے باغی ہونے
کی شہادت دی وہی بڑا موٹا تھا۔ بس پیاری مادہ جلنے دے میں نے تیرے ننھے سے
دلکو بہت تکلیف پونہچائی ایسا نہ ہو۔ اس قسم کے واقعات تیری صحت پر برا اثر
کریں حقیقی بھائی سے زیادہ دوست کون ہوسکتا تھا اس شخص کو جلاوطنی کا حکم ہوا
جس وقت اسکو کشاں کشاں لیے چلے ہیں وہ نہایت حسرتناک وقت تھا قیدی نے
بڑے بھائی کیطرف دیکھا اور کہا بھائی جان موضع عزیز آباد میرے پاس ہے نہ تمہارے
پاس رہیگا چاروں کی زندگی کے واسطے تم نے مجھسے میرے پیارے چھوڑ دائیں تو چلا
لیکن اب تم اس جگہ چلنے کے واسطے تیار رہو جہاں میرا تمہارا آمنا سامنا ہوگا
اور جہاں میری شکایت کے بغیر اسکا فیصلہ ہوجائے گا ؀

بتا پیاری بتا کچھ تو بتا کیا اب بھی تو اس مخلوق کے ہمسایہ میں رہنا پسند کرتی ہے وہ
دن اور آج کا دن میں نے تو عہد کر لیا کہ آبادی کیطرف رخ نہ کرونگا لیکن کل شام کو میں نے یہاں بھی حضرت
انسان کی صورت دیکھی بس اڑا اور چل وطن کو خیر باد کہہ اور عزیز اقارب کو خدا حافظ۔ (راشد الخیری)

بہار

بہار کی تعریف میں ہر زبان کے شعرا نے رنگین بیانی کی داد دی ہے یہ مضمون کہنے کو تو پُرانا ہے مگر ہمیشہ نیا ہے۔ خصوصاً جب کوئی قادر الکلام شخص اِس پر طبع آزمائی کرے تو وہ اِس میں کچھ نہ کچھ جدت دکھا جاتا ہے اور اپنا رنگ پیدا کر لیتا ہے۔ مندرجہ ذیل نظم جناب مولوی احمد علی خاں صاحب شوق لکھنوی نے جو اِن دنوں بھوپال میں مقیم ہیں ہمیں عنایت کی ہے۔ ایشیائی شاعری کی خوبیوں کے ساتھ نیچر کا نقشہ کھینچنا آسان نہیں۔ مگر اِس مشکل شرط سے جناب شوق نہایت اچھی طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ہم اُن کا کلام شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ آیندہ بھی مخزن کو اپنی طبع رسا کے نتائج سے مستفید فرماتے رہیں گے:۔

ہوا چاروں طرف اقصائے عالم میں پکار آئی　　بہار آئی۔ بہار آئی۔ بہار آئی۔ بہار آئی

بہار آئی زمانے میں جو سرگرم نمو ہو کر　　خزاں چھپتی گری نظروں سے آخر زرد رو ہو کر

بہار آئی دکھائی قادرِ مطلق کی شاں اِس نے　　زمیں کی تہ میں جو مُردے تھے ڈالی اُن میں جان اُس نے

بہار آئی ہے نیچر اپنی نقاشی دکھاتا ہے　　بہت رنگین نقشے سامنے آنکھوں کے لاتا ہے

بہارِ دل رُبا کی شکل قدرت نے سنواری ہے　　زمین کی لاڈلی ہے نیتر اکبر کی پیاری ہے

گیا فصلِ خزاں کا کوکبِ اقبال پستی میں　　بہار اب حکمراں ہے ہر طرف اقلیم ہستی میں

جہاں سے مٹ گیا برگِ خزاں کا بدنما سکہ　　بہار اب ڈھالتی ہے اشرفی[1] کے پھول کا سکہ

---

[1] اشرفی ایک زرد رنگ کے خاص پھول کا نام ہے ۱۲

یہ زائیدہ بھی پروردہ بھی سورج کی ہے دنیا میں — حسیں بھی اور بے پردہ بھی ہے بزمِ تماشا میں

پرندوں کی نوا سنجی بڑھاتی ہے یہی آکر — ہوا کے دوش پر بوکو چڑھاتی ہے یہی آکر

دکھاتی ہے یہ تن کر بانکپن اپنا نہالوں سے — جوانی بن کے ہوتی ہے عیاں پھلوں کے گالوں سے

ہوائے صبح اس کے ساتھ پنکھا جھلتی آتی ہے — ہنسی پڑتی ہیں کلیاں جب یہ اُنکو منہ لگاتی ہے

پہاڑوں سے بہائی اسنے برفِ صاف پگھلا کر — رواں ہو کر وہی پانی سمندر سے ملا جا کر

بہت ہنستا ہے پا کر افسرِ یاقوت انار اس سے — ہوا تاجِ زمرد زیبِ فرقِ کوکنار اس سے

نسیم آتی ہے کس انداز سے آہستہ آہستہ — دُلھن چلتی ہے گویا ناز سے آہستہ آہستہ

شمیمِ باغ نے سیکھا چلن اترا کے چلنے کا — زمانہ آگیا پردے سے سبزوں[۱] کے نکلنے کا

بھری دیکھی ہوا نے نخلِ گل کی شاخ کلیوں سے — ہنسایا گدگدا کر ہو گئی گستاخ کلیوں سے

بڑھی ہے کونپلوں کے پھوٹنے سے رونقِ خوبی — کہ ہیں پیشِ نظر دوشیزگانِ قصرِ محبوبی

دُلھن کی شکل ہر گل نے لباسِ سرخ پہنا ہے — شجر کے جسم پر کیا خوشنما پتوں کا گہنا ہے

ہوا مشاطگی پر نیّرِ اعظم جو آمادہ — سنوارا مختلف رنگوں سے دنیا کا رُخِ سادہ

تعجب کیا جو ہیبت سے خزاں کے رُخ پہ زردی ہے — کہ وہ فوج اپنے غالب آئی جسکی سبز وردی ہے

ہوا خورشید حکمت سے علاجِ دہر پر مائل — کہ ہے اسکی چمک سے بردِ اطراف[۲] جہاں زائل

ہے لیا اعتدال آب و ہوا کے کارخانے میں — پتا ملتا نہیں اب سرد مہری کا زمانے میں

لبھاتی ہے دلوں کو گھاس ہر جانب ہری ہو کر — کبھی عاشق مزاجوں کی نگاہ میں پَری ہو کر

زمینِ دشت نے سامانِ آرائش نیا پایا — پرندِ[۳] سبزہ کا فرش اس نے کیسا خوش نما پایا

---

[۱] صرف لفظ "سبز" فارسی میں معشوق کے معنی میں ہے۔ والہ ہروی کہتا ہے ۱۲

خواہم کہ بہ محشر برم از بہر گواہی — سبزے دو آور معذرت نامہ سیاہی

[۲] بردِ اطراف وہ خاص حالت ہے جو اکثر مرض الموت میں بدن پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بدن ٹھنڈا ہو جاتا ہے

[۳] پرند ایک خاص سبز رنگ کے ریشمی کپڑے کا نام ہے ۱۲

ہوئی ہے حسن کی مربی کے ایسی ہوش سے باہر　　زمین کے راز اِسکے دل سے اکثر آ گئے منہ پر

نکل آئے حجابِ ارض سے گل پیرہن لاکھوں　　کہیں ہیں سرو قد لاکھوں کہیں غنچہ دہن لاکھوں

بڑھایا جوشِ سودا کو گلوں کے حسنِ صورت نے　　دماغ و دیدہ پر قبضہ کیا بو اور رنگت نے

زمیں کے بطن سے اعجازِ مریم ہے مگر پیدا　　ہُوا ہر نخل اس سے مثلِ عیسےٰ بے پدر پیدا

پلاتی ہے شجر کو وہ اپنا دودھ لا لا کر　　محبت سے ہوا منہ چومتی ہے بار بار آ کر

نمو کرتوں سے دیکر بھر اُسے مضبوط کرتا ہے　　لہو اسکی رگوں میں آب زیرِ خاک بھرتا ہے

جڑیں اندر ہی اندر پھیل کر قوت پکڑتی ہیں　　زمیں انکو جکڑتی ہے زمین کو وہ جکڑتی ہیں

لبھاتا ہے دلوں کو حسن بڑھکر اسکے پتوں میں　　کہ پانی رنگ بن جاتا ہے چڑھکر اسکے پتوں میں

کہا ہمنے کہ اِس دنیا میں عیسےٰ بے پدر آئے　　عدم سے تا وجود ایک اپنی ماں کے زور پر آئے

مگر کیوں سائنس اسکو قابلِ تسلیم مانے گا　　شگوفہ شاخِ نخلستانِ مذہب کا وہ جانے گا

سخن سنجانہ علمی مسئلے پر حرف لائے ہم　　مگر چکرا کے آخر فہم کے رستے پہ آئے ہم

گلوں کو ہمنے دیکھا انمیں بھی نر اور مادہ ہیں　　شجر دیکھے تو انمیں کچھ گلوں سے بھی زیادہ ہیں

غرض جو شے ہے وہ مجبور ہے قانونِ فطرت سے　　بنا قانونِ فطرت خالقِ عالم کی حکمت سے

خزاں قانون کے منسوخ صفحے دے کے جاتی ہے　　بہار اُسکے جدید اوراقِ رنگیں لیکے آتی ہے

بہار آتی ہے نیچر تختِ فیاضی پہ آ بیٹھا　　وہ ارواحِ نباتی کا خزانہ سب لٹا بیٹھا

زمیں نے کام کنجی کا لیا اپنی رطوبت سے　　کیا وا اُسنے قفلِ دانہ کو ترکیبِ فطرت سے

ہوئے ہیں رنگریزِ چرخ[۱] کے ہاتھوں شجر رنگیں　　کہ ہے ہر شاخ رنگیں برگ رنگیں اور ثمر رنگیں

وجودِ نخل میں داخل ہیں چیزیں خشک بھی تر بھی　　شکر بھی اسمیں ہے لوہا بھی ہے پانی بھی پتھر بھی

حجر کے جزو سے اشجار میں سختی کا عالم ہے　　چڑھا پانی زمیں سے ریشہ ریشہ اُس سے پُرنم ہے

عدم سے عالمِ ہستی میں جو شکلِ نبات آئی　　اُسے نیچر نے دیدی روح - وہ لیکر حیات آئی -

[۱] رنگریزِ چرخ چاند کو کہتے ہیں - پھلوں وغیرہ میں رنگ اسی کے اثر سے پیدا ہوتا ہے ۱۲

نہ ہو گر روح اسمیں تو نہ ہو بالیدگی اسکو
عطا کی جسنے روح اسکو اسی نے عمر دی اسکو

ہے سامانِ ضرورت ہر شجر کے پاس فطرت سے
ملی ہے ہر شجر کو قوتِ احساس فطرت سے

بڑھیں شاخیں اسی رخ جسطرف راہ گذر پائی
چڑھیں بیلیں اسی جانب گرفت اپنی جدھر پائی

شجر جو لالہ و گل کے ہیں سب پینے والے ہیں
کہ گل شاخوں میں یا رندوں کے ہاتھوں میں پیالے ہیں

کیا ہے پیکرِ کوہ سیہ کو سرخ لالے نے
لباسِ آل[1] پہنا ہے حبش کے رہنے والے نے

چمن اور دشت میں ہے ہر طرف انبار پھولوں کا
جدھر دیکھو زمین پہنے ہوئے ہے ہار پھولوں کا

جمے یوں سبزے کی نوکوں پہ قطرے گر کے شبنم کے
رکیں نوکِ مژہ پر جیسے آنسو چشمِ پُرنم کے

ہوا شبنم کے قطرے وقتِ شب سبزے کو دیتی ہے
زباں بنکر شعاعِ مہر دن کو چاٹ لیتی ہے

بہت وارفتہ ہوتی ہیں نہیں نگیں ادا پاکر
شعاعیں بوسہ باری کرتی ہیں پھولوں سے آ آ کر

عیاں سبزے پہ الفت کی ادائیں کی ہیں سورج نے
بڑھا کر ہاتھ کرنوں کے بلائیں لی ہیں سورج نے

ہیں روشن چاندنی کے پھول تارے سے چمکتے ہیں
کھلے ہیں پھول لالے کے کہ انگارے چمکتے ہیں

کیا ہے پُرشکن ہر رنگ نے پھولوں کی جبینوں کو
غرورِ حسن ہر صورت سے زیبا ہے حسینوں کو

گری شبنم زمین پر خشک گل کی پتیاں لیکر
خدا جانے ہوا اب جائیگی ان کو کہاں لیکر

ہوائے موسمی کا دل جو ٹھنڈک پر ہوا مائل
ردائے ابر کی مہر و زمیں کے بیچ میں حائل

دکھائی ابرِ تر نے جھوم کر ایسی سیہ مستی
کہ بیخود ہو کے پھینکے اپنے موتی جانبِ پستی

بخارات ابر بنکر جو ہوا پر پھیل جاتے ہیں
وہ پیڑوں کی کشش سے بنکے پانی کھنچکے آتے ہیں

دیا نیچر نے جوشِ فیض سے نیساں کو کیا جوہر
ہوا کے دوش پر پانی صدف کے بطن میں گوہر

یہ وہ موسم ہے جو کافور کو ہستی میں لاتا ہے
یہ ہے وہ کیمیا گر بنس لوچن جو بناتا ہے

بڑھا ہے جوش ایسا ملک گیری کی امنگوں کا
کہ قبضہ ہوگیا روئے زمین پر سبزہ رنگوں کا

وہی رنگت زمیں نے پائی جو آدم سے[2] پہلے تھی
وہی صورت ہی جو آبادیٔ عالم سے پہلے تھی

نتھرا کر صاف مثلِ آئینہ ہے نہر کا پانی
کناروں کے شجر کرتے ہیں پانی پر گل افشانی

۱؎ سرخ رنگ ۲؎ یعنی بہشت کی رنگت

وہ پانی صاف اور دھیمی ہوا سے موج زن کچھ کچھ | جبیں شفاف لیکن ناز سے ہے پُر شکن کچھ کچھ

کنارے پر پڑا پیڑوں کا سایہ ہاتھ لہروں کے | وہ لہریں لے رہا ہے آب جو میں ساتھ لہروں کے

صفائے آب سے روشن ہیں شب کو زیرِ آب اختر | بھرا ہے بیچ میں پانی فلک نیچے فلک اوپر

شجر کو جب اُگاتی ہے زمیں تب زرد کرتی ہے | ہوا کرنوں سے مِلکر سبز رنگت اُسمیں بھرتی ہے

ہُوا دانہ شجر۔ دورِ تسلسل آشکارا ہے | شجر سے گُل تو گُل سے پھل۔ تو پھل سے دانہ پیدا ہے

بہارِ حُسن کرتا ہے جو خورشیدِ فلک پیدا | سُنہرے رنگ کی پتوں سے ہوتی ہے چمک پیدا

ہوائے بد کے جھونکے مِل کے پیڑوں سے گذرتے ہیں | تو پتے اُسکے سَم کو کھینچکر نابود کرتے ہیں۔

ہوا کو گرم کرتا ہے جو سورج اپنی گرمی سے | تو سختی پختگی کی آتی ہے دانوں میں نرمی سے

کلی مِل مِل کے کرتی ہے یہ گُل کیساتھ سرگوشی | کلیدِ باد اب کھولیگی میرا قفلِ خاموشی۔

لکیریں پڑ چلی ہیں ہر کلی میں جابجا دیکھو | ہنسی سے پہلے زیرِ لب تبسم کی ادا دیکھو

نقاب برگ سے بو کو ہوا باہر نکالے گی | یہ رہ جائیگی ہنسکر اور وہ بو کو اُڑا لے گی

طبائع کی اُمنگیں رنگ اسی موسم میں لاتی ہیں | دلوں سے اُٹھتی ہیں ہونٹھوں پہ ہولی بنکے آتی ہیں

گُلال اور رنگ اُڑ کر رنگ دیتے ہیں حسینوں کو | چمن ملبوس کو۔ لالہ بناتے ہیں جبینوں کو

پپیہے کو کہیں کوئل سے ہے بحث ہم آوازی | کہیں ہے کوکلا کس حُسن سے محوِ نوا سازی

کہیں ہے نغمہ زا بلبل کہیں شاما کہیں دُہیَر | کہیں چنڈول اُڑتا اور گاتا ہے بلندی پر

کسی جا طوطیِ خوش لہجہ کی شیریں زبانی ہے | کہیں چھوٹا لٹورا[51] مائلِ رنگیں بیانی ہے

کہیں بھنگراج[52] دلکو کھینچتا ہے خوش نوائی سے | کہیں مینائیں غل کرتی ہیں آپس کی لڑائی سے

کہیں پیراہن پُر زر سے دلکش حسن موروں کا | کہیں اِٹھلا کے چلنا سرخ پانووں سے چکوروں کا

ہزاروں رنگ کی چڑیاں ہیں شکلیں خوشنما جنکی | ادائیں دل رُبا جنکی۔ صدائیں نغمہ زا جنکی

بہار آنے سے خوش ہیں ہر طرف اِتراتی پھرتی ہیں | ہوا تو ناچتی پھرتی ہے چڑیاں گاتی پھرتی ہیں

۵۱ لٹورا بڑا اور چھوٹا دو قسموں کا ہوتا ہے۔ چھوٹا ہزار داستاں ہے

۵۲ بھنگراج ایک کوہی چڑیا ہے سیاہ رنگ کی۔ قد میں کوئل سے بڑی بے انتہا بولنے والی اور ہزار داستان ہے

سبق چڑیوں سے شاعر لیتے ہیں رنگیں بیانی کا | شجر سے رنگ اُڑا لیتے ہیں خامے گل فشانی کا

گلوں سے مکھیاں رس لیکے شہد اُس سے بناتی ہیں | مزے سے بلبلیں آ کے انجیروں کو کھاتی ہیں

دیا ہے تتلیوں کو رزق کا ساماں پھولوں نے | کیا بھنوروں کو جوشِ فیض سے مہماں پھولوں نے

دکھائی پالنے والوں نے مقراضوں کی مشاقی | نہیں ہے اُون اب دُنبوں کے جسموں پہ کہیں باقی

زمیں پر مختلف رنگوں سے ہیں کیا خوشنما بوٹے | نگینے ہیں جواہر خانۂ قدرت کے یا بوٹے

وہ مول[1] آیا ہے آموں کے شجر پھل لانے والے ہیں | یہ گویا پیش خیمہ ہے ثمر اب آنے والے ہیں

نہال اب ہیں شجر پاس اُن کے سرمایہ ہے پتوں کا | خزاں میں بھی جہاں دھوپ اب وہاں سایہ ہے پتوں کا

کرامت دھوپ اور سائے سے ہے زیرِ شجر ظاہر | سحر میں شام ظاہر شام میں نورِ سحر ظاہر

شجر کے سائے میں دھوپ آتی ہے پتوں سے چھن چھن کر | چمکتی ہے زمیں تختۂ گلِ خورشید کا بن کر

زمیں پر آسماں سے چند سیارے اُتر آئے | ملی سائے کی تاریکی تو دن کو وہ نظر آئے

خوش آیا دھوپ میں سائے کا فیضِ عام خلقت کو | کہ اس کی سرپرستی[2] سے ملا آرام خلقت کو

چمن میں زر بکف آئے ہیں سب گل جتنے آئے ہیں | زمیں کی تہ سے نیچر کا خزانہ لوٹ لائے ہیں

ہوئے خوش برگ گل سے مردم دیدہ ورق لیکر | بہارِ باغ سے رنگیں بیانی کا سبق لے کر

چنے گل مردم دیدہ نے گلچیں بن کے گلشن میں | بہارِ باغ بھر لی اپنے نظارے کے دامن میں

پئے گلگشت گلرو آئے تو دیکھا شباب اُن کا | بنا ہنس کر چمن میں ہر گلِ تازہ جواب اُن کا

مگر پھولوں کو نیچر فیض سے جو رنگ دیتا ہے | وہ آخر گرم ہو کر سورج اِن سے چھین لیتا ہے

ہوا ہی نے کھلائے گل ہوا ہی پھر گراتی ہے | زمیں جس نے کیا پیدا وہی پھر ان کو کھاتی ہے

غرض اے شوق اترانا عبث ہے حسنِ فانی پر
گھمنڈ انساں کو نازیبا ہے دو دن کی جوانی پر

احمد علی شوق لکھنوی

[1] مول فارسی میں اُسی کو کہتے ہیں جسے ہندی میں بور کہتے ہیں مرزا بیدل نے آم کے متعلق فرمایا ہے
ع مول گل کرد دانبیا با ما آورد

[2] سرپرست کے معنی خادم کے اور سرپرستی کے معنی خدمت گذاری کے ہیں اور مربی گری کے معنی میں ان الفاظ کا

شالامار باغ[1]

چل رہی ہے گلشنِ عالم میں عبرت کی ہوا　　　آ رہی ہے ہر گلِ خوشرنگ سے بوئے فنا
نغمۂ حسرت ہے در دِ عندلیبِ خوشنوا　　　غنچۂ لب بستہ سے پیدا ہے ماتم کی صدا

قمریٔ کوکو نوا رکی گفتگو سے ہے عیاں
ہائے پہلا سا ہے اب وہ منظرِ دلکش کہاں

سوز و سازِ نغمۂ مرغانِ خوش آہنگ تھا　　　سرو تھا طنبور ہر برگِ شجر اک چنگ تھا
رقصِ طاؤسانِ بستان کا نرالا ڈھنگ تھا　　　لالہ ہم کیفیتِ جامِ مۓ گلرنگ تھا

تھی صبا مجرائی دربارِ شاہنشاہِ گل
مرجعِ بلبل نگاہاں تھی کبھی درگاہِ گل

کیا غضب ڈھایا یہ تو نے حیف اے دورِ زماں　　　کر دیا اس جنتِ ارضی کو پامالِ خزاں
اب نہ وہ سنبل۔ نہ وہ لالہ۔ نہ وہ سرِ چماں　　　تختہ ہائے گل اُڑاے صورتِ تختِ روان

اے فلک کیا تھا اسی صورت میں مشہور باغ؟
یونہی بے برگ و نوا تھا آہ! شالامار باغ؟

منتخب تھا اس چمن زارِ جہاں میں یہ چمن　　　تھے ثنا خواں میں لاکھوں لبِ رخِ غنچۂ دہن
گلشن آرا تھے ہزاروں سرو قد گل پیرہن　　　خود ہوا خواہوں میں اسکے تھے شہنشاہِ زمن

ناز پرورد توجہ ہر گلِ رعنا رہا
شاہجہاں اس باغ کا برسوں چمن پیرا رہا

آبشاروں کی روانی اور نہروں کی جھلک　　　پانی پانی کیوں نہ ہوتے کوثر و تسنیم تک
گوہرِ شبنم کی زینت اور زرِ گل کی چمک　　　ہائے کیوں دیکھی گئی تجھ سے نہ اے چشمِ فلک؟

[1] بزمِ اردو کے جلسہ منعقدہ ۸ جولائی میں یہ نظم پڑھی گئی۔

محوِ تماشا تھیں پریاں پرستاں چھوڑ کر
دیکھنے آتی تھیں حوریں باغِ رضواں چھوڑ کر

آفریں صد آفریں اے ہمتِ شاہ جہاں ۔۔۔ ہے زمانہ میں یہ تیری خوش نصیبی کا نشاں
یادِ تازہ ہے تری جنت ہی نقشِ بوستاں ۔۔۔ تیری عالی ہمتی ہے اس عمارت سے عیاں

سات تختوں میں سجائی تو نے ایسی گل زمیں
آٹھ گلشن خلد کے ہوتے تھے جس سے شرمگیں

حشمت و شوکت تری اے خسروِ والا گہر ۔۔۔ خطِ ریحاں میں لکھی ہے صفحۂ تاریخ پر
گرچہ تیری روح ہی اب طائرِ بے بال و پر ۔۔۔ دیکھنی ہو گی جہاں کے انقلابوں کو مگر

تھا ہمائے جلوہ تیرا جس جگہ سایہ فگن
اب وہاں رکھتے ہیں طرح آشیاں زاغ و زغن

آج اے بسمل وہ شیدائے قدامت ہیں کہاں ۔۔۔ دیکھتے ہیں جو ہر آئینے میں آثارِ جہاں
اس طرف بھی وہ ہمند عزم کی پھیریں عناں ۔۔۔ مٹ نہ جائے آہ نقشِ یادگارِ رفتگاں

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن لے ہوشیار
تا بماند نامِ نیکت تا قیامت برقرار

بسمل

زاری فراق

گلشن کو ہجرِ یار میں صحرا بنائیے ۔۔۔ ہر اک روش کو خونِ جگر سے سجائیے
اُس بے وفا کو ذرا ڈھونڈھ لائیے ۔۔۔ عمرِ گزشتہ کو کبھی مہماں بلائیے
قربان جان کیجئے آنکھیں نثارِ راہ ۔۔۔ روٹھے ہوئے خیال کو کیونکر منائیے
اِک چیز تھی کہ ساتھ گئی اک حبیب کے ۔۔۔ اُس عہدِ پُر فریب کو کیونکر بلائیے

اِک عمر ہو گئی نہ کیا بھول کر بھی یاد
ذکر اگلی الفتوں کا زباں پر نہ لائیے

کیسی ہے وہ جگہ کہ جہاں ہم نہ آسکے
کچھ ذکر اُس مقام کا اب تو سنائیے

ہم کون کسکو منع کریں کسطرح کریں
بس چل سکے تمھارا جہاں تک رُلائیے

ساری دعائیں منتیں بیکار ہی گئیں
الفت پہ خاک ڈالیئے، اچھا نہ آئیے

خاک ایسی زندگی پہ، کہ اک دل ہے وہ خراب
ہستی کا نقش لوحِ جہاں سے مٹائیے

میں خوش، مرا رسول بھی خوش، اور خدا بھی خوش
جی بھر کے ساری عمر مجھے اب ستائیے

غم کا کسے یقین ہو ثاقب، مگر کبھی
سینے کو چیر کر دل پُرخوں بنائیے

احسن اللہ خاں ثاقب

تنازع البقا

چشمہ جو یہ بہہ رہا ہے
کہتا ہے اپنی رو میں

دریائے زندگانی
میری طرح رواں ہے

عمدہ سُرمیں گاتا
طے کر رہا ہوں وادی

گہ سبزہ زارِ گلشن
میرے بنے ہیں مسکن

گہ جھاڑیوں میں اپنا
ڈیرا ہے میں نے ڈالا

پستی ہو یا بلندی
ہر جا پہ میں رواں ہوں

گو ٹھوکریں بہت سی
ہوں ہر قدم پہ کھاتا

زیر و زبر ہر ایک کو
میں نے یہاں کیا ہے

میری مخالفت میں
جس نے قدم بڑھایا

موجوں کی کشمکش میں
ہستی کو اپنی اُسنے

ناچیز خس کی مانند
بحرِ عدم میں پایا

جو زیر ہو یہاں پر — وہ کب بھلا بڑھا ہے
دریائے زندگانی — گو پُر ہے مشکلوں سے
اُس کا عبور کرنا — مشکل نہیں۔ مگر ہاں!
اپنی بقا جو چاہے — بڑھنے نہ دے کسی کو
جس طرح ایک پودا — بڑھنے نہیں ہے دیتا
کمزور اُس سے جو ہو — پاس اُس کے جو اُگا ہو

بدر الدین سیوہاری

یادِ رفتگان

کرتے ہیں تعریف حاتم کی کہ تھا مرد سخی — کرتے ہیں مدح و ثنا نوشیرواں کے عدل کی
کہتے ہیں تھے رستم و سہراب زور آور، شجیع — تھے فلاطون و ارسطو، کہتے ہیں، دانا ذکی
دیکھتے ہیں تذکرے ہم عادل و دیندار کے — سنتے ہیں ہم داستانیں ظالم و بدکار کی
ثبت کرتے ہیں اُنکی مر گئے جو نیک لوگ — بھیجتے ہیں اُن پہ لعنت جتنے گذرے ہیں شقی
سب یہ باتیں جانتے ہیں جو ہیں زندہ دہر میں — سب کو ہی معلوم نیکی کیا ہے اور کیا ہے بدی
وائے بدبختی، کہ با ایں حال بھی بدکار لوگ — فسق ہی کے نذر کر دیتے ہیں اپنی زندگی
کیونکہ بدکاری کے عادی خوار دنیا میں ہیں — کیونکہ عبرت گیر ہوتا ہی نہیں بدخو کبھی
کار بد سے باز رہ جاتے ہیں وہ انجام میں — عقل نے دی ہو جنھیں انجام بد سے آگہی
ورنہ جو ہیں نیک وہ راغب ہیں نیکی کی طرف — ہے بدوں کا میل خاطر اُن کے سو بدی
نامِ بد دنیا میں رہتا ہے بدوں کا حشر تک — یاد کرتے ہیں اُنھیں نیکی سے ہوں جو متقی
جسقدر ممکن ہو نیکی ہی کیے جاؤ ذہینؔ — نیکنامی کی ہے، قابل آفریں کی، زندگی

سید غلام مصطفےٰ ذہین

تازہ غزلیں

چلا جاتا ہے کاروانِ نفس — نہ بانگِ درا ہے نہ صوتِ جرس
برس کتنے گزرے یہ کہتے ہوئے — کہ کچھ کام کرلیں گے اب کے برس
نہ وہ پوچھتے ہیں نہ کہتا ہوں میں — رہی جاتی ہے دل کی دل میں ہوس
وہ حسرت زدہ صید میں ہی تو ہوں — ہے پرواز جسکی درونِ قفس

ستم ہے یہ وحشت تری غفلتیں
تجھے کاش ہوتا شمارِ نفس

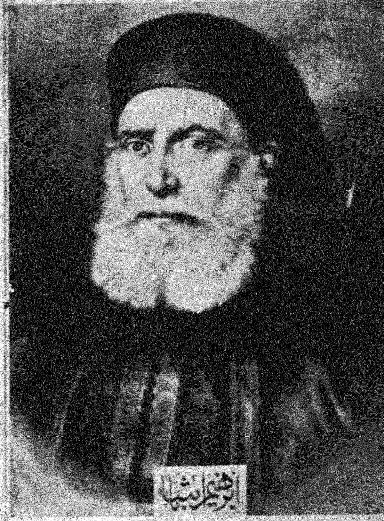
رضا علی وحشت (کلکتہ)

ہم اپنی زیست کا خود اہتمام کرلیں گے — یوں ہی وہ کہتے ہیں وہ کب بھلا خبر لینگے
کہاں نصیب کہ اُس در تلک رسائی ہو — ملے جو رستے گلی میں سلام کرلیں گے
یہ دل ہے شیشہ سے نازک ذرا خیال رہے — لگی جو ٹھیس تو پھر تم سے دام بھرلیں گے
کیا جو شکوۂ الفت بگڑ کے کہنے لگے — بھلا میں دیکھوں تو کیا آپ میرا کرلیں گے
ہمارے نالوں کو کچھ تجھسے کام ہی زاہد — تیری دعاؤں سے تھوڑا سا یہ اثر لیں گے
سئینگے آپ ہی سو بار زخم کے ٹانکے — وہ اور ہونگے جو احسان چارہ گر لیں گے
وہ اور میری عیادت کو آئیں اے توبہ — جنھیں خبر نہیں اپنی۔ وہ کیا خبر لیں گے
ابھی سے نیتِ شب ہے حرام اے ساقی — بہار آنے دے کچھ قرض و دام کرلیں گے
کبھی تو عیش کی صورت دکھائی دیگی ہمیں — جہاں میں جتنے مصیبت کے دن ہیں بھر لینگے
تسلیاں وہ مجھے دیں گے یا کہ دشمن کو — ہیں اک عذاب میں کس کس کی وہ خبر لینگے
خدا گواہ انھیں بھی ہے اُنس اے سجاد — سنینگے حال تو آنکھوں میں اشک بھر لینگے

سجاد۔ دہلوی عظیم آبادی۔


عباس باشا الاول
EGYPTE. — Abbas Pacha I


محمد علي باشا
EGYPTE. — Mohamed Ali Pacha


ابراهيم باشا
EGYPTE. — Ibrahim Pacha



محمد توفيق باشا

EGYPTE. — Moh[illegible] Tewfik Pacha



عباس حلمي الثاني خديو مصر

EGYPTE. — S. A. le Khédive Abbas Hilmi II



اسماعيل باشا

EGYPTE. — Ismail Pacha

مخزن

ہوا میں اُڑنا

صدیوں سے انسان کے دل میں یہ آرزو رہی ہو کہ باوجود بوجھل ہونے کے ہوا میں اُڑ سکے۔ بہت سی ناکامیاب کوششوں کے بعد بیلون یعنی غبارہ اس کام کے لئے استعمال میں آنے لگا۔ مگر دیر تک وُہ صرف تفریح کا مشغلہ اور ذاتی دلیری کی نمود کا سامان رہا۔ نقص اس میں یہ تھا کہ وہ ہوا کی مرضی کے تابع تھا جدھر ہوا کا رُخ ہو گیا چلا گیا۔ اگر اُڑنے والا بہت ہوشیار ہوا اور اُس نے اپنی حکمت سے کسی خاص طرف بھی چلانا چاہا جب بھی یہ ممکن نہ تھا کہ جہاں چاہے لیجائے اور جہاں چاہے اُتر پڑے۔ کئی دفعہ یہ ہوتا تھا کہ غبارے کو منزل مقصود کی طرف لیجانے سے مایوس ہو کر اُڑنے والا اُسے چھوڑ دیتا تھا اور خود ایک بڑی چھتری کی مدد سے (جسے پیراشوٹ کہتے ہیں) نیچے اُتر آتا تھا۔ مگر جُوں جُوں سائنس میں ترقی ہوتی جاتی ہی۔ انسان کی یہ آرزو کہ ہوا میں اُڑے روز بروز زیادہ ممکن ہوتی جاتی ہی اور وہ زمانہ بہت دُور نہیں کہ ہوائی جہاز شوقینوں کو ہوا کی سیر کرائیں اور ملکوں میں باہمی جنگ کے وقت غنیم کو ڈرانے اور نقصان پہنچانے کا ذریعہ ہوں۔

حال میں موسیو بلیریو نامی فرانس کے ایک ہوائی جہاز راں نے نہایت کامیابی

کے ساتھ انگلش چینل یعنی اُس رود بار سے جو انگلستان اور فرانس کے درمیان واقع ہے ہوائی جہاز کے ذریعے عبور کیا ہے۔ اس کا ہوائی جہاز اس قسم کی مشینوں میں سب سے بہتر تسلیم کیا گیا ہے۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مشین ہوائی جہاز رانی میں ایک انقلاب پیدا کر دیگی اور دُنیا کی مہذب اقوام کو ہوائی جہازوں کا خرچ اپنے اخراجات ملکی میں شامل کرنے کی فکر کرنی پڑیگی۔ انگلستان میں موسیو بلیریو اور ان کی بیوی کی بہت خاطر مدارات ہوئی ہے۔ کئی اخباروں کے نامہ نگار ہوا کے اس نامور فاتح اور اس کی بیوی سے ملنے کو پہنچے۔ ایک زنانہ اخبار کی نامہ نگار اُس دن وہاں موجود تھی۔ جب لارڈ نارتھ کلف کی طرف سے موسیو اور میڈم بلیریو کو لنڈن کے ایک بڑے ہوٹل میں لنچ کی دعوت دی گئی۔ وُہ مضمون نگار اُس موقع کا سماں یُوں بیان کرتی ہے:-

"لنچ کے بعد جب تقریریں ہو رہی تھیں اور ہوا کے فاتح کی ہمت استقلال اور لیاقت کی تعریفیں کیجاتی تھیں تو مَیں میڈم بلیریو کے مُنہ کو غور سے دیکھ رہی تھی کیونکہ میں سمجھتی ہُوں کہ موسیو بلیریو کی کامیابی میں ان کی بیوی کی ہمدردانہ امداد کو بہت دخل ہے۔ عورت کی حوصلہ افزائی مرد کی اُن اوقات میں ہمت بندھاتی ہے جب وُہ اپنی کوششوں میں عارضی ناکامی سے گھبرانے لگتا ہے یا مشکلات سے پریشان ہوتا ہے یا شکوک میں مُبتلا ہوتا ہے۔ کسی کی بیوی۔ کسی کی ماں۔ کسی کی بہن غرض یہ کہ عورت ہر لیڈر اور بہادر کے اُبھارنے میں چپ چاپ شریک ہوتی ہے جب کامیابی کا دن آتا ہے اور فتح کا سہرا کامیاب مرد کے سر بندھتا ہے اس وقت بھی اس کی فتح پر سچّی خوشی کرنے والی وہی عورت ہوتی ہے۔

جب میں نے میڈم بلیریو کی طرف دیکھا تو انہیں خیالات کا میرے دل میں ہجوم تھا۔ اُس کی کشادہ پیشانی اور خوشی سے چمکتا ہوا چہرہ یہ

بتا رہا تھا کہ کس قدر ہمدردی کتنی عقیدت اور کیسی مستقل مزاجی کے ساتھ اس عورت نے اپنے خاوند کی محنت اور تیاری میں حصہ لیا ہوگا۔ میرا یہ خیال جو محض قیافے سے پیدا ہوا تھا بعد میں گفتگو پر درست ثابت ہوا۔ کھانا ختم ہوتے ہی میں میڈم بلیریو کے کمرہ میں گئی اور اس سے حالات دریافت کرنے شروع کئے۔ اس کی میز پھولوں سے لدی ہوئی تھی جو اس کے شوہر کے مداحوں نے تحفے کے طور پر بھیجے تھے۔ میڈم کوہ پرنیز کے علاقہ کی رہنے والی ہیں اور سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں رکھتی ہیں جو وہاں کے حسن کا خاصہ ہے۔ انہوں نے مجھے نہایت مہربانی سے بٹھایا اور یہ بتایا کہ وہ شروع سے یقین رکھتی تھیں کہ ان کا شوہر جس کام میں مصروف ہے اس کو کامیابی کے ساتھ ختم کر کے چھوڑیگا۔ وہ سوائے اس گفتگو کے کوئی اور گفتگو نہیں کرتا تھا اور اس مضمون کے متعلق اور اس مشین کی ساخت کی بابت ہر وقت ایسی سرگرمی سے باتیں کرتا تھا کہ مجھے بھی نہایت دلچسپی اس مشین کی تکمیل میں پیدا ہو گئی تھی۔ میڈم بلیریو کو گو اب تک کبھی اپنے شوہر کے ساتھ ہیلون میں اڑنے کا اتفاق نہیں ہوا تاہم وہ شوق سے اس دن کا انتظار کر رہی ہیں جب ان کا شوہر اسی قسم کی مشین اتنی بڑی بنا سکے کہ جس میں دو آدمی بیٹھ سکیں اور اس کے بنتے ہی وہ بھی ساتھ جاوینگی۔

دریائے سین کے کنارے ایک خوبصورت مکان ہے جس کے ساتھ کارخانہ بھی ہے اور وہیں موسیو بلیریو معہ عیال رہتے ہیں اور اپنا کام کرتے ہیں۔ ان کے پانچ بچے ہیں جن میں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ میڈم بلیریو کہتی ہیں کہ اگر لڑکے بڑے ہو کر باپ کے فن کو اختیار کرینگے اور اس میں نام پیدا کریں گے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

موسیو بلیریو کی کامیابی کے سلسلہ میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جو راستہ اب موناپلین سے طے ہوا ہے۔ یہی راستہ سب سے پہلے ایک سو چوبیس برس ہوئے معمولی بیلون میں طے کیا گیا تھا۔ اس وقت بھی ایک فرانسیسی کے حصہ میں یہ عزت آئی تھی جس کا نام بلانشارڈ تھا۔ اسی زمانہ کا ایک اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقع یہ ہے کہ ایک انگریز لیڈی مسز سیج نامی نے ۲۹۔ جون ۱۷۸۵ء کو بیلون میں مقام ہیرو کے قریب سفر کیا اور یہ سب سے پہلی انگریز عورت تھی جس نے بیلون میں اڑنے کا حوصلہ کیا۔ مگر اس سے ایک سال پہلے ایک دلیر فرانسیسی عورت میڈم تھبلے نامی ہوا میں اڑ چکی تھی جو بمقام لیون تیرہ ہزار پانسو فٹ کی بلندی تک چڑھ گئی تھی۔ ایک اور عورت جس کا نام بیلونوں میں اڑنے کی تاریخ میں قابل یادگار ہے۔ مسز گریہم نامی تھی جو ۲۶۔ جولائی ۱۸۵۱ء کو رات کے وقت اکیلی بیلون میں گئی اور اس بیلون کا نام اسی کے نام پر رکھا گیا ✦

محمد اکرام

مسدس حالی کا ایک نہایت عمدہ مجلد اڈیشن نامی پریس کانپور نے شائع کیا ہے منشی رحمت اللہ صاحب رعد جو اردو فارسی کتابیں چھاپنے میں استادانہ تسلیم کئے گئے ہیں۔ اس مطبع کے مالک و مہتمم ہیں اور مسدس مد و جزر اسلام کا یہ اڈیشن انکے اعلیٰ مذاق کا تازہ ترین ثبوت ہے۔ نفیس ولائتی کاغذ کی جیبی تقطیع پر یہ کتاب چھاپی گئی ہے۔ عرب کا نقشہ اور دنیائے اسلام کا نقشہ اس کی دلچسپی بڑھا رہے ہیں۔ مولانا حالی مدظلہ کی تصویر ساتھ ہے۔ اور جابجا مفید حواشی نوٹوں کے طور پر ازاد کئے گئے ہیں یہ کتاب کتب خانوں میں رکھے جانے اور انعاموں میں تقسیم ہونے اور تحائف میں شامل ہونے کے قابل ہے۔ منشی صاحب موصوف نے باوجود ان سب خوبیوں کے اس کی **قیمت** صرف ایک روپیہ (عہ) رکھی ہے کہ ہر کہ و مہ اس سے مستفید ہو سکے ✦

خدیوانِ مصر

مصر کے بازار میں پھرتے ہوئے میری توجہ ایک دوکان کی طرف ہوئی جس میں یورپ کے شہروں کی طرح مشہور اشخاص اور مقامات کی تصویریں بک رہی تھیں۔ اُن تصاویر میں مجھے ایک مرقّع خدیوانِ مصر کا نظر آیا۔ جو معنی خیز معلوم ہوا۔ وہ مرقّع مَیں نے خرید لیا۔ اِس میں موجودہ فرمانروائے مصر کے جدّ امجد محمد علی پاشا سے لیکر حال تک کی تصویریں تھیں۔ اُن تصویروں میں سے چھ تصویریں مَیں نے ناظرینِ مخزن کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے انتخاب کی ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں کیا سبق دے رہی ہیں۔ قرآن مجید کی اُس آیت کی تفسیر ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں پلٹتا۔ جب تک وُہ خود نہ اپنے آپ کو بدل دے۔ بانیِ خاندان کو دیکھئے۔ چہرہ سے شاہی جاہ و جلال ٹپکتا ہے۔ اسکی نورانی ڈاڑھی اُس کے جوشِ اسلام کی نشانی ہے۔ لباس وہی عمامہ و قبا جو تُرک ایشیا سے اپنے ساتھ یورپ تک لے گئے تھے۔ آنکھ کہہ رہی کہ مزاج میں استقلال موجود ہے اور عزم میں قوّت۔ اس کے بعد ابراہیم پاشا پر نظر ڈالئے جو محمد علی پاشا کے قریب بیٹھے ہیں۔ اور جن کے خدّ و خال میں بہت سی مشابہت محمد علی پاشا کے ساتھ موجود ہے۔ مگر پھر بھی قیافہ زیادہ آسان طلبی اور راحت پسندی کی خبر دے رہا ہے۔ عمامے کے بوجھ کا تحمّل فرقِ مبارک کو گراں معلوم ہوا تو یورپ کی کسی قوم سے پھندنے دار ٹوپی مستعار لے لی جو رفتہ رفتہ صورت بدلتے بدلتے ترکی طربوش بن گئی۔ اِن کے بعد عبّاس پاشا اوّل کو دیکھئے۔ لباس فرانس کے نمونہ پر ڈھل گیا۔ تلوار ہاتھ میں ہے اور

پیٹی پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں۔ مگر ہر ادا کہہ رہی ہے کہ اصلی سپہگری کی جگہ نمائشی سپہگری آگئی۔ اور سادگی کی جگہ بناوٹ۔ قد و قامت بھی اسی نسبت سے رو بہ انحطاط ہے۔ اسمٰعیل پاشا بالکل جدید یورپین وضع میں تشریف فرما ہیں۔ فراک کوٹ۔ کالر۔ ٹائی۔ سارے تکلّفات موجود ہیں ترکی ٹوپی میں بھی کجکلاہی کا شوق نمودار ہے۔ محمد توفیق پاشا ایک آدھ قدم اَور یورپ کی طرف بڑھے ہیں اور خدیو حال ہز ہائی نس عبّاس حلمی ثانی تو ترکی ٹوپی کے سوا بالکل یورپین ہیں۔ خدا کے فضل سے بجائے خود نہایت وجیہ اور خوش رو جوان ہیں۔ مگر اُن اسلاف سے کیا نسبت جن کی تصویریں اِس مرقع میں خشونت کے ساتھ انکو گھور رہی ہیں۔ اور زبانِ حال سے یہ کہتی معلوم ہوتی ہیں۔ دیکھا تقلید کا مزا؟ اپنی وضع بھی کھو بیٹھے اور رعب بھی۔ بادشاہ ہو مگر پابند۔ حاکم ہو مگر محدود اختیارات رکھتے ہو۔ مختار بھی ہو اور مجبور بھی۔ اِس تقابل کے پیش کرنے سے ہمارا یہ مدّعا نہیں۔ کہ لباس یا وضع ظاہری پر ہی سارا دار و مدار ہے اور لباس کا تغیر ضروری علامتِ زوال ہے۔ لیکن لباس میں طرزِ جدید کی طرف رغبت کے ساتھ ساتھ قوّتِ ملکی اور اقتدار میں کمی اس مثال میں ایسی نمایاں تھی۔ کہ خود بخود توجّہ کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اِس لئے اسے نظر انداز کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ مشرقی اقوام یا دیگر اقوام جو مصریوں کی طرح مشرقی نژاد ہیں۔ آج کل عجب مشکل اور کشمکش میں ہیں۔ ایک طرف تو زمانہ کی ضرورتیں رواج عام کے زور سے انہیں مغربی عادات اور لباس کی طرف دھکیلے لئے جاتی ہیں۔ اور وہ یہ دیکھتی ہیں کہ اسوقت جو لباس مقبول ہے اور معزز سمجھا جانے لگا ہے اس کا اختیار کرنا ایک

نشانِ عزت اور لازمہ خودداری ہے اور دوسری طرف وہ دیکھتے ہیں کہ
اُن کا اعتبار اُن کا اقتدار اُس وقت میں زیادہ تھا جب اُن کے بزرگ
اپنے کھُلے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے اپنی سادہ وضع میں تمام دنیا
کے سامنے حوصلہ کے ساتھ سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور
جُوں جُوں وہ ظاہری بود و باش میں مغربی اقوام کے قریب ہوتے
گئے۔ اعتبار اور اختیار میں گھٹتے گئے۔ اور یہ ظاہری ترقی کسی اصلی
ترقی کا باعث نہ ہُوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسے یہ کہنا درست نہ ہوگا۔ کہ
جو نقصان ہوا وہ لباس جدید کی وجہ سے ہوا۔ اسی طرح یہ کہنا غلط ہوگا
کہ جو نفع زمانۂ گذشتہ میں تھا وہ پُرانے لباس کے سبب تھا۔ یہ سب چیزیں
صرف علامات ہیں۔ اصلی اسباب ترقی اور زوال کے اور ہیں۔ جن میں سے
بعض اختیاری ہیں اور بعض غیر اختیاری۔ اختیاری اسباب
کے متعلق ہر قوم کچھ نہ کچھ خود کر سکتی ہے۔ غیر اختیاری اسباب کے
متعلق ہر قوم ہر فرد بشر کی طرح ایک اعلیٰ ترین قوت کے تحت میں ہے۔
جس کے آگے اُسے سرِ نیاز جھکانا پڑتا ہے۔

لباس تو بدل رہا ہے اور بدلا جائیگا۔ لیکن مشرقی اقوام کو یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ
لباس کا بدلنا اُن کے عمدہ خصائل کا بدلنا نہ بنجائے۔ اور وہ اپنے بزرگوں
کے اُن اوصاف سے بے بہرہ نہ ہو جائیں۔ جن سے اُن بزرگوں نے بڑائی
حاصل کی تھی۔ قومی غیرت و حمیت اگر قائم رہے اور کفایت شعاری
اور سادگیٔ وضع اگر ہاتھ سے نہ جائے۔ وقت پر محنت برداشت کر سکنا اور
شوق و صلح کے ساتھ قوتِ جنگ کی حفاظت کرنا۔ یہ باتیں اگر اہلِ مشرق
میں موجود رہیں اور جہاں کہیں مفقود ہو گئی ہیں پیدا ہو جائیں تو لباس کا تغیر

نہیں کچھ ضرر نہ پہنچائیگا۔ ع در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش۔

زمانہ حال کی متمدن دُنیا کا لباس روز بروز یک رنگ ہوتا جاتا ہے اور جس قدر جلد یہ تفاوت کم ہوجائے۔ عام ترقی کے لئے بہتر ہے۔ مگر ہر قوم کچھ خوبیاں رکھتی ہی جو اس کا خاص ورثہ ہوتی ہیں۔ اُن کا زائل ہوجانا قومی زوال کا باعث ہوتا ہی اور وُہ محفوظ رہیں تو سب امیدیں قائم ہیں +

عبدالقادر

مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں ایک عرصہ سے مدرسہ صولتیہ قائم ہی جو جناب مولانا مولوی محمد رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار ہی۔ یہ مدرسہ گو اننک چھوٹے پیمانہ پر کام کرتا رہا ہی۔ مگر نہایت مفید کام کرتا رہا ہی اسکے مہتمم مولوی محمد سعید صاحب ایک نہایت سرگرم اور قابل بزرگ ہیں جو اسلامی دُنیا کے مشہور مرکز میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہیں اور صرف کبھی کبھی قدیم تعلقاتِ خاندانی اور وطن کی کشش سے ہندوستان آجاتے ہیں۔

کچھ عرصہ تک علاوہ عام امداد کی کمی کے مدرسہ کا کام محدود رہنے کا یہ سبب بھی تھا کہ ترکی حکومت کے بعض قوانین کسی انجمن کے رونق پانے کے مخالف تھے۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی اور ترکی سلطنت کے اطراف وجوانب میں ترقی کی تحریکیں شروع ہیں۔ اس لئے مدرسہ صولتیہ بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر کام کرنا چاہتا ہی۔ مولوی محمد سعید صاحب نے جو رپورٹ سالانہ کارگذاری کی تیار کی ہی۔ وُہ بہت حوصلہ افزا ہی اور منگاکر پڑھنے کے لائق ہی۔ یہ رپورٹ قیومی پریس کانپور میں شائع ہوئی ہی۔ جو صاحبان رپورٹ دیکھنا چاہیں وہ مطبع قیومی کانپور کے مہتمم منشی محمد قمرالدین صاحب سے خط وکتابت کریں اور جو حضرات کوئی رقم چندہ بطور امداد کے مدرسہ صولتیہ میں بھیجنا چاہیں وہ مولوی محمد سعید صاحب کی خدمت میں بتوسط مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی بھیج سکتے ہیں +

مشرق و مغرب

آں روز کہ توسنِ فلک زیں کردند آرائشِ مشتری و پرویں کردند
ایں بود نصیبِ ما ز دیوانِ قضا مارا چہ گناہ قسمتِ ما ایں کردند
(خیام)

مشرق کا کوئی حوصلہ مند اہلِ قلم جب اس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہو کہ "مغرب کا شہرۂ کمال تمام تر اِس بنیاد پر ہو کہ وُہ مشرق سے شرفِ تلمذ رکھتا ہو اور اُس کے بازارِ علم و فن میں آج جتنے سکے رائج ہیں، وُہ وہی ہیں جو ابتدا ئً مشرقی ٹکسال میں مسکوک ہو چکے ہیں" تو اس وسیع بحث میں مضمون نگار کا رنگ پھیکا پڑ جانے کی خاص وجہ یہ ہُوا کرتی ہو کہ مُدعی کی طرف سے دعوٰی میں واقعاتی پہلو نہیں دِکھائے جاتے، جو دعوٰی کے لئے پُر زور استدلال کا کام دے سکیں، لہذا دعوٰی بے دلیل ہونے سے نفیًا یا اثباتاً کسی پہلو پر حکم ترجیح نہیں لگایا جاسکتا، اور یہ بحث ادھُوری رہ جاتی ہو۔

پس ہم چاہتے ہیں کہ تمدّنِ جدید کو مُسلمانوں سے جو علمی استفادات ہُوئے ہیں اُس کے تاریخی نظائر پیش کرکے اِس بحث کو اسکی اصلی وقعت دیدیں، اور بحث کا خاتمہ کردیں۔

یہ واضح رہے کہ ترجمہ و تاریخ دونوں کی ہدایت سے ہم اس منزل کو طے کرینگے دُنیا آٹھ سو برس آگے نکل آئی ہو، مگر واقعات نظر آتے ہیں، اور صاف پڑھے جاتے ہیں، مُسلمانوں پر آفتابِ تمدن اپنی پُوری شعاع ڈال رہا ہو، بلکہ اگر سچ پُوچھو تو مُسلمانوں کے علم و عمل آسمانِ تمدّن کے مہر و ماہ بنے ہُوئے ہیں، اور دُنیا کے ممبر اوج پر اُنکے نام کا خُطبہ جاری ہو۔ حدودِ حکومت کے نقشہ میں بغداد سے

لیکر دمشق و اُندلس تک زر نگینِ اسلام ہی ایوانِ شاہی ہیں مذاکرہ کی مجلسیں ہیں کہ دُنیا کی زبانوں کی بولتی تصویریں بن جائیے اور علم کے چرچے ہر زبان میں سُن لیجیے۔ جو بلبلِ ہزار داستان اس چمن میں چہکتے ہیں، وہ محض باتوں کے نہیں ہیں، اُن کے علمی کارناموں کا بھی مشاہدہ ہوسکتا ہے، انہوں نے دار الکتب کو علمی مرقعوں سے نگارخانۂ چین بنا رکھا ہے، یونانی، سُریانی، فارسی، ہندی، زبانوں کے علومِ منطق سے لیکر الہیات تک اُنہوں نے عربی میں لے لئے ہیں، اور انہی نادر و بیش بہا جواہر سے یہ خزانہ مملو ہے۔

مُلکی نظم و نسق میں بھی تدبیر و ملکداری کے سانچے میں ڈھلے ہُوئے دماغوں نے نزاکت پیدا کر دی ہے۔ جسکے جلوے مشاہدہ کرنے والے قدم قدم پر پاتے ہیں، اور اُن خوش فکر دقیقہ سنجان رموزِ سیاست کی خوش تدبیری پر درود پڑھتے ہُوئے قدم اُٹھاتے ہیں، علم کے نئے شوقینوں کے لئے جا بجا مدارس، علم کا مذاقِ صحیح رکھنے والوں اور اس میں نکتہ آفرینی کرنے والوں کے لئے لائبریریاں، علمی انکشافات کی دُھن رکھنے والوں، اور آسمان سے سبق لینے والوں کیلئے رصدگاہیں (آبزرویٹریز) موجود ہیں۔

الغرض مشرق کا یہ ٹھاٹھ کہ اعلیٰ شیون لیقادم اور تہذیب و تمدن کی فانوسوں سے جگمگا رہا ہے اور ہمارا اپنا مدعی تہذیب یورپ مہذب و متمدن دنیا سے علیحدہ جہالت کی دریا میں غوطہ زن ہے، اور وہ دماغی جوہر جو آج طرح طرح کی سائنٹفک ایجادوں کی نذر ہے۔ عجیب و غریب مگر رکیک حرکات کی ایجاد میں مصروف ہے۔ جہالت نے اُس کی معلومات پر جو کثیف پردہ ڈالدیا ہے مشرق کا دستِ ترقی خود اُسے ہٹا سکتا تھا، جسکے بعد آسان تھا کہ وہ مشرقی تہذیب کا سبق لیتا۔ لیکن واقعات نے طبیعتوں میں رکاوٹ کے ایسے اسباب پیدا کر دیئے جن کی اصلاح کے لئے عمر درکار ہے، پیشوایانِ ملّتِ عیسوی جو قوم کی نفسِ ناطقہ

تھے، گو اُن کا مذہبی فرض تھا کہ قوم کو کجی سے ہٹا کر راہِ راست اور ٹھیک اُس عارض البلاد پر لاتے۔ جس سے وُہ آفتاب عالمتاب جو مشرق کے دائرہ نصف النہار پر چمک رہا تھا، کچھ اپنی آڑی ترچھی شعاعیں اُس پر بھی ڈال سکتا لیکن ؎

قاصد رقیب بود و من غافل از فریب بیدرد مدعائے خود اندر میانہ ساخت

اُن کے دل میں ایسا چور تھا جس کی کسی کو خبر نہ تھی، گو اُن کا دل جانتا تھا جو عظمت مشرقی دُنیا کی اُن کے خیال میں تھی، لیکن یہ وُہ حرف راز تھا جو زبان پر نہ آسکتا تھا، کیونکہ اگر قوم اخلاقی تمدنی، اصُول سے واقف ہو جاتی اور انسانیت کے صحیح مرکز پر آجاتی تو اُن کے وحشیانہ تقدس پر سرِ تسلیم خم کرنے والا کوئی نہ رہ جاتا، اور تہذیب و تمدن کی خوش گوار ہوا اگر کسی رُخ سے یہاں پہنچ سکتی تھی، تو وُہ مشرق کے کھلے میدان، سر سبز و شاداب مرغزار تھے۔ یہی سبب تھا کہ پادریوں نے اسے اپنی کامیابی کا بڑا ذریعہ قرار دے لیا تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے معاندانہ خیالات مسیحیوں کے دماغ میں بھرے جائیں۔ اور سب مِلکر اختلاف خیالی، و کینہ کی ایسی آسمانی دیوار مشرق و مغرب کے درمیان حائل کر دیں جس سے یہ طلسم کبھی نہ ٹوٹ سکے اور اس خیال کی تکمیل کیلئے پادری سیاح صورتِ واقعات بدل کر مشرق کے عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کی سفاکی و بے رحمی کی مصنوعی داستان سے مسلمانوں کے خلاف مُلک میں ایک مذہبی جوش پیدا کیا کرتے تھے جس میں مُسلمانوں کو جاہل، وحشی، اور ظالم قوم بتلاتے۔

یہ عجیب و غریب روایات جن میں واقعیت کا شائبہ نہ تھا، مذہبی یقین کے اثر سے دلوں میں راسخ اور شہرت عام حاصل کر چکی تھیں، جن کی وجہ سے یہی دُنیا

کا ہر فرد مسلمانوں پر غار کھائے بیٹھا تھا، کہ دفعتاً اُس حیرتناک جوشش کی بنیاد پڑی جس نے ایک تہلکہ ڈال کر حروب صلیبیہ کا سلسلہ چھیڑ دیا، مُنادی کی آواز پر مسیحی دُنیا کے اُفق سے لبیک کی صدا بلند ہوئی، اور عیسائی مجاہدین بحر و بر سے مور و ملخ کی طرح اُمنڈ پڑے۔

دیکھو! سارے جوشش میں گرمی حرب پیدا کرنے والا وہی خیال تھا۔ جو مسلمانوں کے متعلق ان کے مقدس واعظین نے واقعیت سے خارج ان میں پیدا کر رکھا تھا، رجز میں بھی وہی افسانہ یاد دلایا جاتا تھا جس پر مجاہدین میں تازہ رُوح پیدا ہو جاتی تھی۔ غرض کہ متواتر حملوں کے بعد ۱۰۹۹ء میں بیت المقدس پر عیسائیوں (فرانسیسیوں) کا قبضہ ہو گیا۔ اور یہ تسلط ۱۱۸۷ء تک قائم رہا۔ مگر اس کے بعد لڑائیاں روز کا دھندا ہو گئیں، آئے دن سوریا کے لق و دق میدان زور آزمائیوں کے عرصۂ مصاف بنگئے۔

بالآخر کسی غیر معمولی یورش سے ۱۲۹۱ء میں قوم فاتح کو نہ صرف بیت المقدس بلکہ ارض شام و حوالی مصر بھی چھوڑنے پڑے، اثنا راہ میں اُنہیں ایسی سرزمین طے کرنی پڑی، جو نزہت و شادابی میں بہشت کا چمن زار تھی۔ اور جسے دیکھکر ان کی آنکھیں کھُل گئیں۔ علم۔ تمدن۔ معاشرت۔ سیاست، غرضکہ جس نظر سے دیکھا اس سرزمین کے باشندوں کو یکتائے زمانہ پایا، سمجھے تو کیا، لیکن دل و دماغ نے ان کیفیتوں کو نہایت مزیداری سے محسوس کیا۔

ہزیمت یافتہ فرانسیسی ابھی اپنے حدود قلمرو میں پہنچکر دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ ان کی عام ملکی بے سروسامانی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھکر باُمید فتح آل عثمان نے دجن کا ستارۂ اقبال ایشیائے کوچک میں بلند ہو چکا

تھا، فرانس پر فوج کشی کی، یہ حملہ تاریخی نظر سے مشرق کی حمایت میں اُس حملہ کا جواب کہا جاسکتا ہی، جو اہل عرب نے مدد اسلام میں مغربی حمائت کے جوش میں ایشیائے کوچک پر کیا تھا،

الغرض معرکہ کا اختتام پندرھویں صدی کے وسط میں قسطنطنیہ کی فتح پر ہوا، جو اُس وقت یونانی ارباب فن کا مرکز، علمی بازیگروں کا دنگل، اور علم کے نادر و بیش بہا جواہر کا معدن مانا جاتا تھا۔

جب تُرک قسطنطنیہ پہنچے تو حکمت و فلسفہ کی اس یونانی بزم عشرت کو اس خوف و خطر نے برہم کردیا، جو ہر قوم مفتوحہ کو فاتح سے ہوا کرتا ہی لیکن ہوشمند یونانی قسطنطنیہ کو خیرباد کہتے وقت اُس بدحواسی و سراسیمگی کو کام میں نہ لائے جو ایسے مشکل مواقع پر انسان کو ہفتا دپشت کے مملوکہ و مقبوضہ سے بے پروا کردیا کرتی ہی، بلکہ انھوں نے اس اطمینان سے اپنا رخت سفر تیار کیا، کہ یہاں اُس یونانی دفتر حکمت کا ایک تقویم پارینہ بھی نہ چھوڑا یہاں سے جاکر وُہ تمام یورپ میں پھیل گئے۔ عیسائیوں نے اس موقع پر یہ بھی دیکھا کہ خانماں برباد یونانی جان و مال سے زیادہ جس چیز کو عزیز رکھتے ہیں، وُہ اُن کی پھٹی پُرانی کتابیں ہیں، جن فریخ دماغوں سے اسلامی تمدن کا احساس زائل نہیں ہوا تھا وُہ ان علمی خزانوں کے ساتھ انکا شغف دیکھکر ششدر و حیران رہ گئے۔

اسلامی ممالک سے لوٹتے وقت علم و عمل کے برکات کا جو خفیف نقش ان کے دل پر جما تھا، ان سادہ دلوں کا علمی ذوق، اور کتاب سے اسدرجہ عشق دیکھکر روشن ہوگیا، اور اس کے بعد جو ہوا، اُسے آپ حیرت سے سُنینگے اور تاریخی واقعات آپ کی نظر میں معما ٹھہرینگے۔ کیونکہ اُن کا رُخ

پلٹتے دیر نہیں لگتی ۔

اِن سب واقعات کے بعد کون کہیگا کہ مسلمانوں کی کوئی ادا عیسائیوں کو پسند آئیگی ۔ لیکن واقعہ اسکے برعکس ہے ، کیونکہ عیسائیوں کو مسلمانوں کی ہوسِ تقلید دامنگیر ہوئی ۔ مسلمانوں سے بجائے حریفانہ نسبت کے نسبت تلمذ رکھنا پوزیشن قرار پایا ، اور یہ سب اس وجہ سے کہ اُن کا کانشنس اب تک معطل تھا جس میں از سرِ نو احساس پیدا ہوا ، اُن کے دماغی افق پر ہلالِ عقل و امتیاز نمودار ہوا ، جسے آج ترقی یورپ نے ماہِ تاباں کی چمک دمک دے رکھی ہے ۔ غرضکہ اُنھوں نے تمدن و تہذیب کے کرشموں کو دیکھ کر اُس کے مبادی پر غور کیا ، تو عقل نے مستدلی علم کی ضرورت ثابت کی جسے سب نے تسلیم کیا ۔

نظامِ ارتقار کی بُنیاد یُوں ڈالی گئی کہ دل و دماغ میں ذوقِ علم کا جوہر پنہاں رکھنے والی بیچین طبیعتیں محض ذوق و شوق کا توشہ لیکر طالب علمانہ عزم و استقلال کی رفتار سے بغداد ۔ قرطبہ اور طلیطلہ کو روانہ ہوئیں ۔ جو اُس وقت کیمبرج اور اکسفورڈ کی طرح علوم کے مرکز تھے ۔

فرمانروایانِ یورپ یا قیاصرہ قسطنطنیہ کے درباروں میں کسی قسم کی کوئی علمی پیچیدگی پڑتی تو باوجود حریفانہ نسبت کے نیازمندانہ اکتساب کی حیا میں ڈوبی ہوئی نظریں بغداد و قرطبہ (کارڈوا) کے علمی کنگروں کیطرف اُٹھ جاتیں ۔ اور مجتہدانہ فتویٰ حاصل کئے بغیر نہ پلٹتیں ۔ الغرض نئے شوقین پڑھ پڑھ کے جب کسب و تعلم کا دماغی و ذہنی میدان پا پیادہ طے کر چکے تو ملکی رفاہ و ترقی کے خیال نے راہوارِ قلم لاکے پیش کیا ۔ ایثار نفسی ، و فرزانگی کا تازیانہ ہاتھ میں دیا ، جس پر وُہ نہایت تمکنت و خودداری

کی شان سے سوار ہوئے اور اقتباس و تراجم کے میدان میں شہسواری کے کرتب دکھانے شروع کیے۔

جس سیفِ زبان سے اُنہوں نے اِس معرکہ میں خصوصیت کے ساتھ مظفر و منصور کا لقب حاصل کیا وُہ یورپ کی عام زبانوں میں لاطینی زبان تھی - پھر اس دَور کے بعد علم کے شائقین کا گروہ جس قدر ترقی کرتا گیا اُسی قدر اس مبارک لٹریری خوشہ چینی کرنے والوں کا بھی ۔ اور آخرکار بیش وکم پانچ سو برس کے بعد ان کی قلمی عرقریزیوں سے اُسی تنگ و تاریک یوروپین لٹریچر میں وُہ جامع حیثیت پیدا ہوگئی جس کے زور پر اُسے مشرقی لٹریچر سے دعوٰیِ ہمسری کا حق ہوگیا ،

اِقتباس و تراجم کے اس نورافشاں عہد کی نوعیّت جدوجہد کے لحاظ سے مؤرخین نے چار تقسیمیں کی ہیں -

لہٰذا ذیل میں ہم بھی اُسی ترتیب سے مغربی لٹریچر کی عہد بہ عہد ترقیوں اور مشرقی گلزارِ علم و فن کی خوشہ چینی پر روشنی ڈالیں گے -

اِقتباس و تراجم کا یہ دریا تقریباً پانچسو برس تک موجزن رہا جس میں منطق، فلسفہ، طب، طبعیات اور الٰہیات، کی بڑی بڑی موجیں اُٹھیں اور بالآخر زمین کے ایک بڑے شور تختہ کو جس پر اب تک روئیدگی کا نام نہ تھا سرسبز و شاداب بنا کر یہ سیلاب رُکا ، تو میدانِ تصنیف و تالیف کے گازدشتیوں اور آہوؤں کا جولانگاہ تھا -

اِس عہد کی چار دوروں میں اس طرح تقسیم کی گئی ہے - دَورِ اوّل طورِ التمہید، دَورِ ثانی طورِ طلیطلہ العلم، دَورِ ثالث طورِ الفونس صاحب قشتالہ دورِ رابع طورِ اوریا (یورپ)

طورالتمہید ۱۰۰۰ سے ۱۱۰۰ء تک

سب سے پہلے یہ خیال جس روشن ضمیر کے دماغ میں آیا وُہ حکیم وقت سلفسٹر ثانی پاپائے رُوم تھا، اِس ایجاد کا فخر حاصل کرنے کے لئے پہلے یہ جربر نامے ایک معمولی درجہ کا شخص تھا، عرصہ دراز اُندلس میں رہا مسلمانوں کے فیضِ صحبت سے عالمانہ نشو ونما پائی تھی جس سے مروجہ مشرقی علوم میں کافی دستگاہ اور دیگر علمی مباحث سے اُسے طبعی مہارت پیدا ہوگئی تھی۔ اولوالعزم مُسلمانوں کی صحبت نے جو حوصلہ مندی و منچلے پن کا جوہر دل ودماغ میں ودیعت کر رکھا تھا اُس نے ہمّت و استقلال کا اُسے ایک خواب دکھایا جس کی آگے چل کر یہ تعبیر نکلی کہ اپنے ابنائے ملک کی ضیافتِ طبع کے لئے وُہ نہایت شدّ ومدّ سے علمی تراجم کی طرف متوجہ ہوا جوشیلی طبیعت اور اُس کے فطری زور وشور نے اِتنا اُبھارا کہ معمولی عیسائی سے اسقف بنا، اور اس درجہ سے پاپائیت کے جلیل القدر منصب پر فائز ہوا؛

اُس اولیت کے لحاظ سے جو اُسے اِس جدّت آفرینی میں حاصل ہوئی، یہ شخص مجدّدِ وقت کہلانے کا سچّا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اور آج یورپ کی فلک پیمائیاں دیکھکر اُس کی رُوح اِن موزون الفاظ میں نہایت ترانہ ریز ہے ؎

اوّل آنکس کہ خریدار شدش من بودم
باعثِ گرمی بازار شدش من بودم

اِس مہتم بالشان معنوی کشورکشائی میں اس کے دامن سے جس کا دامن وابستہ رہا وہ موسیو ادلریب نامے ایک شخص تھا،

قسطنطین افریقی جو ایک مشرقی عالم تھا، وُہ بھی اِس شخصی جدّوجہد کے زمانہ میں نمودار ہوا، اس نے مغرب (شمالی افریقہ) میں ایک مدت گذاری تھی،

وہاں سے اٹلی آیا، جہاں اپنی علمی حدود کو ایک بہت مدرسہ میں شریک ہو کر وسیع کیا۔ اور یہیں سے ہمدردی کا بھی سبق لیا،

مدرسہ سے نکلکر عربی زبان کی مختلف فنون کی نادر و مبسوط تصانیف (جن میں اہلِ عرب کی طبعزاد تصانیف کے علاوہ یونانیوں کی معرکۃ الآرا ترجمہ شدہ کتابیں بھی تھیں، لاطینی زبان میں ترجمہ کیں جو علاج۔ علم نباتات اور حمیات وغیرہ پر تھیں ان سب کا تفصیلاً ذکر آگے آئیگا، ان مخصوص ناموروں کے بعد چونکہ اور کوئی روشن مثال اس دور میں نظر نہیں آتی: اولوالعزم حوصلہ مندوں کی انجمن کی عام علمی جوش و ہیجینی کے ہنگامہ پر جمود اور خاموشی کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ اس لئے یہ دور بھی یہیں ختم کردیا گیا ہے،

طور طلیطلۃ العام ۱۲۰۰ سے

یہ دوسرا دور ہے، اور پیشروؤں نے جو مبارک رسم جاری کی تھی، چونکہ وہ قدردانی، شکرگذاری، اور وقعت کی نظروں سے دیکھی گئی۔ اربابِ مذاق نے ایسے پُرجوش نعروں میں ان مساعی جمیلہ کی داد دی کہ اس کی اصلی عظمت و وقعت دوبالا ہوگئی جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ دوسری تحریک پر اس کے اسٹاف میں کام کرنے کے لئے فرانس کے بڑے بڑے اربابِ علم و فن جمع ہوگئے۔

اس مرتبہ قدرتاً یہ تحریک ابتدا ہی سے منضبط صورت میں نمودار ہوئی۔

جن دنوں کا حال ہم لکھ رہے ہیں طلیطلہ پر ایک علمی شباب و عروج کا عالم تھا نویں صدی رشید و مامون کے عہد میں جس طرح بغداد کا بازار علم و فن گرم تھا، ہر طرف درس و تدریس کی مسندیں بچھی تھیں، اُستادوں پر طلبا پروانوں کی طرح ٹوٹ رہے تھے، لوگوں کے عام تذکرے بھی مناظرانہ گفتگوؤں سے خالی نہ ہوتے تھے اسی طرح وہی نقشہ، اور وُہی گرمجوشیاں آج طلیطلہ میں پائی جاتی ہیں، فرق یہ

ہو کہ ناموری عہد کی مالا اُن جواہرات سے مرصع تھی، جن کا مول صلہ و ستائش نقد و جنس تھا، بخلاف اس کے یہ لوگ محض ہمدردی و اجتماعی کشش کے موتیوں میں ٹلکر آئے ہیں،

وُہ راہب جنہوں نے اپنی پاک و بے ریا زندگی مذہبی عزلت گزینی پر نثار کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ملک و ملت کی ہمدردی کے جوش میں ڈوبے ہُوئے ہر طرف حلقہ ہائے درس میں نظر آتے تھے۔

اِس دَور کی کارروائیوں کی ابتدا ریمون سے ہُوئی۔ جو طلیطلہ کا اسقف اعظم تھا، اُس نے قبل اس کے کہ کوئی نمایاں کام شروع کرے۔ موجُودہ تراجم کی اشاعت کی یہ تدبیر سوچی، کہ یورپ کے علمی بازاروں میں اس دور کے تالیفات اور ترجموں کی ساکھ قائم کیجائے۔ جو اس کی آیندہ کامیابیوں کی کُنجی تھی؛ چنانچہ اس امر میں اُسے پُوری کامیابی ہُوئی۔ مشرق میں کوئی علمی سفینہ تیار ہوا اور سیلاب شوق و قدردانی نے اپنے پُرزور تھپیڑوں سے چشم زدن میں مغرب پہنچایا۔ دائرہ اشاعت کافی وسیع، اور معیار اعتنا ترقی پذیر ہو جانیکے بعد جس اہتمام کی اسے ضرورت محسوس ہُوئی وُہ ترجمہ کے ضبط و بسط کا اہتمام تھا، کیونکہ اب تک مترجمین کی نقص زباندانی کی وجہ سے تراجم میں جو خامیاں ہوتی آئی تھیں، اُنہوں نے نہایت عُروۃ الوثقیٰ استدلال سے اس کام کے لئے مجیدین فن، اور ماہرین علم ادب کی ضرورت ثابت کر دی تھی، لہٰذا اُس نے فی الفور ایسے دو شخص بہم پہنچائے جنمیں سے ایک عربیت کا ماہر تھا، اور دُوسرا لاطینی زبان کا ادیب اور مشہور انشاپرداز تھا،

ریمون نے انہیں دونوں کاملین کی مدد سے فلسفہ و نجوم کی بہت

سی کتابیں ترجمہ کیں، جو یورپ میں ہاتھوں ہاتھ بکگئیں اور نہایت غور و فکر سے پڑھی گئیں، اس نمایاں جدوجہد سے متاثر ہوکر اہل مذاق ارباب فن یورپ کے ہر ہر کونے سے نکلکر طلیطلہ کی طرف بڑھے، جہاں اب علمی ریاضتوں کا بڑا حلقہ جما تھا۔ اور جو فلسفیانہ اکتشافات کا بڑا مرکز قرار پاگیا تھا۔

ممالک یورپ سے آنے والی اس نئی کھیپ نے علوم و فنون کی مختلف شاخیں اختیار کیں، اور اپنی قیمتی کوششیں انہی کی نذر کیں، اُنکی خالص توجہ و سلیقہ کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ اور علوم کی طرح قرآنی علوم کے ساتھ بھی انہوں نے معقول اعتنا کی، اُن میں سے چند مشاہیر کے نام یہ ہیں،

افلاطون الیطبوری، ادبارالباطی، یوحنا الاشبیلی، کوندیسالنی، ہرمان لدلماتی، مرقس طلیطلی، روبرٹ رنینی، دانیال مارلے، اور انمیں بھی کثرت مشاغل کے لحاظ سے جو شخص پایہ امتیاز رکھتا ہے وہ اس دور کا واحد مولف جیرارکرمونی ہے، جس نے تقریباً ۸۰ مجلدات میں قدما کے تمام علوم فلسفہ، منطق، ریاضی، طبیعیات، کیمیا، کیمسٹری، نجوم، ہیئت، کا ملخص اُردو دکھایا جو یا تو یونانی فیلسوفوں مثل ارسطو، ارشمیدس، اقلیدس، بطلیموس بقراط یا حکما عرب مثل فارابی، ثابت ابن قرہ، خوارزمی، یعقوب کندی، فرغانی جابر ابن افلح، ابن ہیثم وغیرہ کی کتابیں سامنے رکھکر ترجمہ کیا گیا لیکن یہ سب عربی ہی سے منقول ہوا۔

خوبی زبان، اور طرز بیان کی حیثیت سے ریمون کی مخصوص لٹریری توجہ کے بعد جس قدر کتابیں لکھی گئیں، وہ نہایت برجستہ و جامع تھیں، جو سلیقہ شعار خوش مذاق مترجمین کی قادر الکلامی کی روشن دلیل ہے،

طور انفونس صاحب قشتالہ | صفحاتِ تاریخ میں تیسرا دور بالفاظِ عنوان پکارا گیا ہے، جس کی وجہ تسمیہ در اصل یہ ہے کہ فونس اس دنیا کا ایک الوالعزم و علم پرست تاجدار تھا، جو اسپین کہلاتی ہے، علوم و فنون پر اس کی ممتاز شاہانہ سرپرستی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ جس نے اپنی جامع الحیثیتی کی آب و تاب سے ماضی کوششوں کے روشن ستاروں کو ماند کر دیا تھا،

اس دور کا لٹریری سرمایہ پیش کرتے وقت چونکہ تاریخ اس کے ثمراتِ فیاضی سے بے نیاز نہ ہو سکتی تھی۔ لہٰذا تشکر و امتنان کے اعتراف میں اس کا نام زیبِ عنوان قرار دیدیا، یہ کوششیں ادھر تاریخ میں اگر اس کے نام پر ایک باب کا اضافہ کرتی ہیں، تو ادھر گذشتہ رُخ پر وہ ان علم خیز واقعات سے ٹکراتی ہیں جو خلافتِ بغداد کے شباب پر ظہور پذیر ہو چکے تھے،

فونس کے شاہانہ علمی جذبات کا آفتاب جب مطلعِ عمل سے نمودار ہوا، تو اس نے اپنی کرنیں دور تک پھیلائیں، جو ذرہ پر پڑیں تو اسے گوہرِ آبدار بنا چھوڑتیں، جس سے ہر صاحبِ احتیاج اپنا دامن بھر سکتا، لیکن اکابرینِ فن پر اس کی تیز شعاع پڑنے لگی، اور ان کے لئے دنیاوی کسبِ ضیا کا ذریعہ بنکر ان کی ضیائے علم کا خود اکتساب کرنے لگی،

اندلس کے نامور علما، فونس کی ایما سے اس کے دار الحکومت میں جمع ہوئے، جنھیں فونس نے عزت و احترام کی مسند پر بٹھایا، انکی قدردانی اپنا فخر سمجھا، اور جن میں سے بعض کو تو اس نے استاد کی طرح مانا اس کے علمی نورتنوں میں ذیل کے نام عزت سے لینے کے قابل ہیں۔

ابن راجل قبیصی۔ ابنِ موسیٰ۔ محمد۔ یوسف بن علی۔ یعقوب ابن سینا۔ ان کے علاوہ پیرس و عکونیہ سے جو اہلِ قلم طلب ہو کر آئے۔ ان کے ناموں

کی فہرست طول طویل ہی، اس مرتبہ ترجمہ کے ضبط و بسط کے اہتمام کا حق یہانتک ادا کیا گیا تھا کہ اولاً عربی سے خاص اسپینی زبان میں ترجمہ کیا جاتا تھا، پھر اس سے لاطینی زبان میں ترجمہ ہوتا تھا، چنانچہ بطور یادگار بہت سی کتابیں اسپین ہی کی زبان میں رہ گئیں۔ اور لاطینی میں ترجمہ کرنے کی نوبت نہ آئی۔

اغراض درس و تدریس کی تکمیل کے لئے اُس نے ملنیہ میں ایک یونیورسٹی بھی قائم کی، جو اسپین میں پہلی یونیورسٹی تھی، اور جو بعد میں سلنکہ کو منتقل کیگئی۔

الغرض مُلک کی علمی اصلاح و ترقی کے لئے فونس نے جیسا دل کھول کر روپیہ صرف کیا، اُس کی نظیر کم ملیگی، اُس کا پایۂ تخت علمی جوہر رکھنے والوں کا کعبۂ مقصود تھا، اور علوم و فنون کا مرکز،

وُہ مخیر جس فیاضی سے علم کی راہ میں صرف کرتا تھا اُس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہی کہ مترجمین کے کفاف کے لئے کوئی متعینہ مشاہرہ نہ تھا، بلکہ جس قدر اخراجات و رعایات وُہ چاہتے تھے وُہ سب روا رکھے جاتے تھے۔ خود ایک ذات کے لئے نہیں بلکہ اُن کے خاندان و قبیلہ کے لئے بھی،

یہ خوشگوار علمی بہار کا موسم تقریباً نصف صدی کا شمار کیا گیا ہی جن میں مندرجہ ذیل اشخاص نے خاص طور سے اپنا کمال دکھانے میں حصہ لیا ہے۔

یہوذا ابن موسیٰ - زلی ساج - حموئیل لیفی - فرنان الطلیطلی وغیرہ -

طور سائر اور با (تمام یورپ) اِس عہد کی نوعیت تین گذشتہ اطوار سے بایں حیثیت مختلف ٹھہرتی ہی کہ گذشتہ تین دوروں میں علمی سپرٹ نے عملاً مغربی زبانوں کی آراستگی کے لئے جو کچھ کیا تھا، وُہ اُندلس میں محصور رہکر کیا تھا، لیکن چونکہ اب دانایانِ فرنگ نے علمی و عملی شعبوں میں پوری دستگاہ حاصل کرلی

تھی اِس لیئے اُنکے جذبِ وطن کو تحریک ہوئی جس سے اُنہیں شوق ہوا کہ یہ علمی خانہ آبادیاں اب اگر ہمارے ہی وطن یا حدودِ حکومت میں رچائی جائیں تو اچھا ہے، زمانہ برسرِ اتحاد تھا، سفینۂ ارتقا کو واقعات کی ہوا نے سہارا دیا۔ اور کشتی ساحلِ آرزو کی طرف بڑھی،

فولس کی علمی سرپرستوں نے اُس کا نام روشن کرکے اُس کے ہم مرتبہ یوروپین فرمانرواؤں میں اِس زندہ جاوید طریق نام و نمود کی ہوس پیدا کردی تھی، فولس خود دُنیا سے جا چکا تھا۔ لیکن اُس کے واقعات کا نہایت خوشنما و دلفریب مرقع سب کے پیشِ نظر تھا۔ جس کے نقشِ قدم پر سب سے پہلے قدم رکھنے والا فریڈریک ثانی فرمانروائے اٹلی تھا۔ جسے اگرچہ پہلے علم کا مجازی و نمائشی مذاق تھا، تو بعد کو حقیقی اور واقعی مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ ارباب فن کی پایہ شناسی کے ساتھ قدر کرتا تھا، اور مشاہیر کو سرتاجی بخشتا تھا، اُس کی اِس قدردانی کی بدولت اُس کے ایوان میں ہر طرف فلاسفہ کے اجتہادی منبر بچھ گئے تھے۔ اور قصرِ شاہی ایک بڑے دارالعلوم کا نمونہ پیش کر رہے تھے، شہرت پا کر وہ قرونِ وسطیٰ کا ایک لٹریری ہیرو گردانا گیا،

فریڈرک کے بعد اُس کے بیٹے معرید نے بھی علم و اہلِ علم کی کماحقہٗ عزت و توقیر کی، جو اُسے اپنے والد بزرگوار سے وراثتہً ملی تھی۔ بلکہ اُس نے بنفسِ نفیس جو خدمت انجام دی وہ یہ تھی کہ ارسطو کی ایک نادر کتاب کا ترجمہ اُس نے خود ہی کیا، ہرمان الجانی۔ ایتان المسینی اُس کے ہر دو بازو تھے

فریڈریک کے چشمۂ فیض سے سیراب ہو کر جو نہالانِ علم پھلے پھولے اور بوئے خوش دی، اُن کی طولانی فہرست میں صرف دو نام فلیپ طرابلسی و ایتان انطاکی مشرقی اہلِ علموں کے نظر آتے ہیں، باقی سب مستشرق ہیں

اس دَور کی اوّل الذکر خصوصیت کا لحاظ کرتے ہوئے اس آخری خصوصیت سے اُن کے مہتم بالشان حوصلہ مندانہ کامیابی پر صدائے تحسین بلند کرنی پڑتی ہی، بحیثیتِ کارگذاری بھی یہ دَور کسی سے کم نہیں مینخائیل سکوٹ اس دور کا نامور انگریز مترجم ہی جس نے تقریباً ۲۰ ضخیم کتابوں کا ترجمہ کیا۔

اس کے بعد اور بادشاہوں نے بھی ایسی دلچسپیاں لینی شروع کیں اور اس طرح یورپ میں اس کا بازار گرم ہوگیا۔ قصہ مختصر۔ ان بادشاہوں کا عہد بھی علوم و فنون کی ترویج، توسیع، اور تراجم کی اشاعت کے اعتبار سے نہایت شاندار، اور عہد عباسی سے چشمک زنی کرتا ہُوا گذرا ہی،

اِن دَوروں کے بعد جب خاطر خواہ، و کافی علمی ذخیرہ، مغربی لائبریریوں میں جمع ہوگیا، علوم و فنون کے ہر ہر موضوع پر متعدد بسیط معرکۃ الآرا کتابیں مہیا ہوگئیں تو مغربی کوششوں کا رُخ تراجم سے تصنیف و تالیف کی طرف پھر گیا، جس کا وقت آچکا تھا، اور پھر اُنھوں نے اُس میں جو جو موشگافیاں کیں اُن کا جلوہ آج آفتاب کی طرح ہر جگہ نظر آتا ہی۔

آئندہ نمبر میں ہم عہدِ عباسی اور یورپ کے دَورِ ترجمہ پر مقابلۃً بحث کرتے ہوئے اس مسئلہ پر روشنی ڈالینگے کہ اس میں کون مہتم بالشان مانا جائے اور استقراری حیثیت سے کسے ترجیح حاصل ہی۔

باقی آئندہ

جوادعلی خاں عالی

شیخ علی حزیںؔ

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

(۱۱) دردِ کلام

شیخ کا کلام عموماً پُر درد ہوتا ہے اور خود تخلّص اُنکا اسی معنی پر گواہ ہے۔

منشی امیر احمد مینائی لکھنوی فرماتے ہیں ؎

شعر پُر درد جو لکھنے پہ طبیعت آئی ساہنے آکے مرے روحِ حزیں بیٹھ گئی

خود شیخ اپنے دردِ کلام کی طرف یُوں اشارہ کرتے ہیں ؎

در باغِ حزیں کس نکند فہم صفیرت ایں زمزمہ آں مُرغ شناسد کہ بدام است

ولہٗ

نبرُد جلوۂ گل جانبِ گلزار مرا می بُرد نالۂ مُرغانِ گرفتار مرا

کوتاہ صفیرم ہ قفسم را بگزارید جائیکہ رسد نالہ بفریاد رس ما

لُطف علی بیگ آذر اصفہانی صاحبِ تذکرہ آتشکدہ کا ایک شعر اسی رنگ کا ہے۔ مُلاحظہ ہو ؎

قوّتِ پرواز اے صیاد چوں سوئے تو نیست آنقدر نالم کہ سُوئے آشیاں آرم ترا

ملک قمی کا ایک شعر نہایت پاکیزہ ہے کہتا ہے ؎

ندارم قوّتِ رفتن بکہِ نشین بخت آنم کو کہ گویند ناتوانے داشتم اوراچہ پیش آمد

یعنی مجھ میں تو اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ اُس کے کوچے تک اپنے کو

پہنچاؤں - کاش میرے طالع اتنی یاوری کریں کہ اُس کے دل میں میرا خیال آجائے اور وُہ کہے کہ میرا ایک ناتوان عاشق تھا اُس کا کیا حال ہے - ذرا اُسے دیکھ تو آؤں -

آں ستمگر بود گر نفسے خوئے گرم تو · گریہ بکام دل نشد عاشق بے نصیب را

بنومیدی حزیں از کوئے او بار سفر بستم · خدا صبرے کند روزی دل امیدوارم را

گاہ گاہے دلم بخود سوزد · شمع آدینۂ مزار خودم

از خاک آستانم تا دیدہ دُور دارم · جاں بیقرار دارم دل بے حضور دارم
رفتی و در تب و تاب انداختی حزیں را · باز آکہ در فراقت دل ناصبور دارم

غالب کا ایک شعر اسی مضمون کا ہے اور اپنا ہی پُر درد ہے ؎

آکہ مری جاں کو قرار نہیں ہے · طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

(۱۲) تصوّف

تبنیخ کا کلام تصوّف کی چاشنی رکھتا ہے - انتخاب دیوان ملاحظہ ہو -

بگرد بام و در دیر و کعبہ می گردد · ازاں زماں کہ بدرگاہ عشق رد شد را

از دوست بکونین نگردیم تسلّی · ایں ہر دو بدست و کف افسوس ہمانست

غالب کا شعر ہے ؎

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا · یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

برتاب حزیں از دو جہاں دیدہ دل را　　عشق است دریں دائرہ درکار گرہ ہیچ

چوں کوہ تراشیدم بر فرق زنم تیشہ　　درکارگہ صورت بیکار نباید شد

زلف تو داشت جانب کوتاہ دستیم　　ہرگز زنار سائی خویشم زیاں نبود

کہتا ہے کہ تیری زلف میری کوتاہ دستی کی جانب دار رہی ہے یعنی ہرچند مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ تیری مدد سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔

پائے بستند و رہ سعی نشانم دادند　　دست و بازو بشکستند و کمانم دادند

غالب کے شعر بہت پُر زور واقع ہوئے ہیں ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　　شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

رُخ کشودند و لب ہرزہ سرائم بستند　　دِل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

شیخ فرماتے ہیں ؎

شمعہا بُردہ ام از صدق بخاکِ شہدا　　تا دل و دیدۂ خونابہ فشانم دادند

بستیم حزیں از حرم و بتکدہ محمل　　آما بہ درِ کعبۂ دلہا نرسیدیم!

عُرفی نے کیا خوب کہا ہے ؎

زکعبہ آیم و رشک آیدم بخونابے　　کہ از زیارت دلہائے خستہ می آید

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم　　آتش بسنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

گیرم کہ ہیم سزائے احساں بخشائش بے بہانہ ات کو
شادیم بہ تشنہ کامی اما ناموس شراب خانہ ات کو
وہی مطلب ہے "گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا"۔

دو عالم از فروغِ روئے او یک چشم بینا شد نہ بینی روئے ہجراں را اگر صاحب نظر باشی

---

(۱۴) خوبی تشبیہ و اشعار در رنگِ صائب

یہاں شیخ کے وہ اشعار لکھے جاتے ہیں جو حُسنِ تشبیہ کے لئے قابلِ قدر ہیں یا مولانا صائب کے رنگ میں کہے گئے ہیں۔ صائب کا کلام عموماً اس قسم کا ہوتا ہے کہ پہلے مصرعہ میں ایک بات کہی جاتی ہے اور دوسرے میں مثال سے اس کی تائید کی جاتی ہے۔ یعنی ایک طرف دعویٰ دوسری طرف دلیل۔ اِس انداز کے اشعار کہنے میں گو بڑی فکر اور مشق کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر شعر اکثر پھیکے اور بے مزہ ہوتے ہیں کیونکہ شعر میں جب گرمی نہ ہو دل میں جگہ نہیں کرتے۔ صائب سے پہلے بھی شعرا اس قسم کے شعر کہتے تھے مگر کم۔ صائب نے اس کو بہت ترقی دی اور حق تو یہ ہے کہ لاجواب اشعار کہے ہیں۔ بعد صائب کے یہ رنگ عام ہوگیا اور کثرت سے لوگ تتبع کرنے لگے چنانچہ شعرا اور ریختہ گو لکھنو کے اسی رنگ کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ صائب کے اشعار بے مزہ ہیں بلکہ خلاف اس کے ہم صائب کو ایک نہایت باوقار شاعر سمجھتے ہیں اور اُس کے کلام کو بغایت پُرلطف۔ دعویٰ دلیل والے اشعار کے علاوہ صائب کے کلام میں عاشقانہ اشعار بہت سے ہیں اور ایسے ہیں کہ شاید ہی زبانِ فارسی میں نکلیں۔ متاخرین میں صائب کو سبھوں نے اُستاد

مسلّم الثبوت تسلیم کیا ہے۔ خود صاحب کہتا ہے اور بجا کہتا ہے

ز صد ہزار سخنور کہ در جہاں آید یکے چو صائبؔ آشفتہ حال برخیزد

شیخ علی حزیں نے بخلاف اور شاعروں کے دعویٰ دلیل والے مضمون کم لکھے ہیں اور تتبع صائب کا نہیں کیا ہے۔ شیخ کے اشعار اب ثبت ہوتے ہیں

کلید از چارہ سازی بستگی ہرگز نمی بیند نمی افتد گرہ در کار خود مشکلکشایاں را

در دل تنگ بود جلوۂ جاناں ما را یوسفے ہست دریں گوشۂ زنداں ما را

تشبیہ اس شعر میں نہایت دلپسند واقع ہوئی ہے۔

کمن دشوار از تن پروری آزادی جاں را چہ محکم میکنی چوں ابلہاں دیوار زنداں را

آہ تو فاش میکند عشق نہفتہ را حزیں دُود دلیل می شود آتش ناپدید را

لطف و قہرت بمن سوختہ جاں ہر دو یکیست دانہ چوں سوخت بہاران و خزاں ہر دو یکیست

سودائے زلف یار بدیوانگی کشید فکرے کہ در دماغ بماند جنوں شود

در سینۂ شکستہ دلان تو آہ نیست چوں بشکند سپاہ علمہا نگوں شود

چو موج قافلۂ عمر را درنگے نیست کسے چگونہ دریں کارواں بیاساید

یہ مضمون تو حافظ کا حصہ ہے

مراد منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم جرس فریاد می دارد کہ بربندید محمل ہا

خجل در بزم عقل ناداں نشیند چو زاہد کہ در بزم مستاں نشیند
نشیند خیالِ تو در گوشۂ دل چو یوسف کہ در کنج زنداں نشیند
ہمیں بس کہ در فکرِ شبہای مجنوں سرِ زلفِ لیلیٰ پریشاں نشیند

گو حزیں کا تیسرا شعر صائب کے ذیل کے شعر سے مضمون میں بالکل جُدا ہی مگر تھوڑی سی جھلک صائب کی نظر آتی ہی - شعرِ صائب ؎

ازاں بہ تیرگیٔ شب خوشم کہ مجنوں را سیاہ خیمۂ لیلیٰ بود دلِ شبہا

جُدا از نعمتِ دیدار آں شیریں دہاں چشمم تہی چوں کاسۂ دریوزہ در دستِ گدا ماندہ
بحسرت تا کشید از سینہ ام صیاد پیکاں را دلم ماند بآں یارے کہ از یاری جُدا ماندہ

---

(۱۴) اشعار در ذکرِ اہلِ فن

شیخ نے اپنے کلام میں اکثر اہلِ فن کو یاد کیا ہی - حافظِ شیرازی علیہ الرحمہ کا ذکر جا بجا ہی اور مولوی رُومؒ کے تو خاص معتقد معلوم ہوتے ہیں - ہم نے شیخ کے دیوان سے وُہ اشعار انتخاب کر لئے ہیں جن میں اُنھوں نے اہلِ فن کا ذکر کیا ہی - یہ اشعار تضمینی ہیں یعنی جس سخنور کا ذکر ہی اُس کا ایک مصرعہ لیا ہی اور اس میں ایک مصرعہ اپنا ملا کر مقطع بنایا ہی - اسکو تضمین کہتے ہیں

انوارِ مرشدِ روم شد راہبر حزیں را جاناں قبول گرداں ایں جستجوی مارا

داریم حزیں ایں غزل از عارفِ رُومی اُو کافرِ کیشِ بت و مسلمانِ خرابات

با عارفِ رُومی شد ہم نغمہ حزیں کلکم اے ساقیِ جاں پُر کن آں ساغرِ نوشیں را

داریم حزیں ایں غزل از عارفِ رُومی — اُو کافرِ خویش است و مسلمانِ خرابات

خامہ خمُش کُن حزیں ایں غزلِ مولویست — شادی جانہائے پاک دیدۂ دلہائے عشق

با عارف رومی شد ہم نغمہ حزیں کلکم — ایں پردہ کہ می سنجم زاں جان جہانستے

شیخ اپنا مصرعہ دوبار کام میں لائے ہیں چنانچہ اوپر یہ مصرعہ آچکا ہے۔

داریم حزیں ایں غزل از فیض فغانی — ہر جا کہ رود ہمرہ یار است دلِ ما

تا پیرِ جام جُرعہ بما میدہد حزیں — سرجوشِ فیض بادۂ معنی بجام ماست

پیرِ جام سے مراد مولوی جامی علیہ الرحمہ

ایں آں غزل قاسمِ انوار کہ فرمُود — با عشق بزن تسبیح و مصلا نتواں گفت

می بُرد مصرعۂ حافظ دلم از دستِ حزیں — تکیہ بر عہدِ گل و باد صبا نتواں کرد

از یاد حزیں ندہی مصراع سنائی را — از یار بہر زخمے افگار نباید شد

تازہ کردی روشِ حافظِ شیراز حزیں — کہ ز انفاسِ خوشش بوی کسے می آید

حزیں یک شیحہ از فیض عراقی است — نخستیں بادہ کاندر جام کردند

یہ عراقی کی مشہور غزل کا مصرعہ ہے - عراقی کہتا ہے ؎

نخستیں بادہ کاندر جام کردند ز چشم مست ساقی وام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش عراقی را چرا بدنام کردند

ایں آں غزل کہ گفتہ پیش از حزیں سنائی ایں طرز گفتگو را از وے شنید باید

بشنو حدیث حافظ شیریں سخن حزیں دور فلک درنگ ندارد شتاب کن

ایں جواب غزل خواجہ سنائیست حزیں خواہد ایں تازہ غزل ناز بدیوان کردن

ایں آں غزل عراقی ماست آں پردہ سرائے عاشقاں کو

ایں جواب غزل قاسم انوار کہ گفت می بستاں بدہ و توبہ بہشیاراں دہ

بشنو چہ خوش سرود حزیں اوحدی ما اے روشن از رخ تو زمین و زماں ہمہ

حزیں ازیں غزلت تازہ گشت طرز فغانی سزد ز سدرہ فرو آید و زمین تو بوسد

---

(۱۵) اشعار در فخر خویش و شکایت زمانہ

فخریہ اشعار شیخ کے دیوان میں بہت سے ہیں اور زمانے کی شکایتیں
بھی جا بجا ہیں - شعرا کی خود بینی اور خود ستائی ایک رسم قدیم ہے اور اسکے

لئے شیخ قابلِ گرفت نہیں ہیں۔ اہلِ کمال جب دیکھتے ہیں کہ انکے کمال کی قدر نہیں ہوتی تو وہ زمانے کی شکایت کرتے ہیں اور مجبوراً اپنے کلام کی آپ داد دیتے ہیں۔ اہلِ موسیقی کا بھی یہی حال ہی۔ داد کے طالب رہتے ہیں اور کیونکر نہ ہوں۔ کس قدر خونِ جگر پینا ہوتا ہی۔ جب کہیں ایک مصرعہ رنگین ہاتھ لگتا ہی یا ایک ترنمِ دلگداز زبان پر پیدا ہوتا ہی۔ مستمع اگر قدر نہ کرے تو ستم ہی۔ شیخ زمانے سے عاجز آکر فرماتے ہیں ؎

قطعہ

لائقِ مدح در زمانہ چو نیست — خویشتن را ہمی سپاس کنم
ہر چہ گویم نہ تہمت است نہ لاف — از حسوداں چرا ہراس کنم
فرسِ طبع چوں برانگیزم — خاک در چشمِ بو فراس کنم
کلکِ معجز نگار چوں گیرم — نے بنا موسِ بو نواس کنم
سرِ کیواں بگردد از مستی — مے دانش اگر بکاس کنم
در دلم خوں فتد اگر از جوش — آتش از طور اقتباس کنم
بچہ امید در زمانۂ کور — شاہدِ طبع روشناس کنم
کس زبانِ مرا نمی فہمد — بعزیزاں چہ التماس کنم

مرزا غالب نے بھی ایک قطعہ اسی مضمون کا اسی زمین میں کہا ہی اور شیخ کے قطعہ کا آخری شعر اپنے قطعہ میں لاحق کیا ہی۔

شیخ کے دیوان سے اب وہ شعر انتخاب ہوکر درج ہوتے ہیں جن میں اُنہوں نے اپنا فخر ظاہر کیا ہی یا شکایتِ زمانہ لکھی ہی ؎

حزیں آبِ زلالِ جوئبارِ کلکِ جاں بخشت — بتاریکی نہاں دارد زخجلت آبحیواں را

بسکہ ابنائے زماں جملہ دنی طبعانند   از بہا می فگند جوشش خریدار مرا

پیش حزیں از سخن عرض تجمل مکن   تحفہ بخاقاں مبر موزہ و زنبیل را

نمی فہمد کسے افسانہ ما را دریں محفل   من و شمع و سیمہ زاغ از دولت آتش زبانیہا

در کام زاغ طعمہ طوطی مکن حزیں   بشناس قدر کلک شکر بار خویش را

در محفل ایں مردہ دلاں شمع مزارم   می سوزم و از سوز من آگاہ کسے نیست

بخصم عرصہ دعویٰ نمیدہم سخنم   کہ خامہ در کف اندیشہ ذوالفقار من است

حزیں از خامہ ات گل کرد سامان سیہ بختی   ز خجلت بلبل مخمور آمل بر نمی آید

بلبل آمل سے مراد طالب آملی ہے۔

نبود ترا حریف کسے در سخن حزیں   با خامۂ تو گوئی زمیدان کہ می برد

حزیں آزردہ دارد بے کمالاں را نوائے تو   ولی زاغ و زغن ہنر طوطی شیریں زباں رنجد

دریں چمن سر کلک تو سبز باد حزیں   کہ شعر بلبل ازیں شاخسار بر خیزد

سحاب خامهٔ من جز در خوشاب ندارد　　سفینهٔ غزلم موجهٔ سراب ندارد
بلند نشئهٔ حزیں از کدام رطل گرانی　　سیاه مستی کلک ترا شراب ندارد

حزیں از گفتگو در زیر لب پیمانه داری　　دل از خود می رود چوں با تو راه صحبتے یابد

پشتم چو تیغ خم شد از بار جوہر خویش　　جز پیش خود نیارم ہرگز فرو سر خویش

شمعی حزیں از زیبد خاموشیت بمحفل　　روشن بعالمے کن آتش زبانی خویش

در دہر حرامی زده شد سحر حلالم　　سرمایهٔ دزدان جہانست خیالم
کالا ز من و فخر و مباہات از ایشاں　　خرداں چه بزرگی که نکردند بمالم

حزیں اعجاز کلکم را ہوس کس دست دانی　　دم از انفاس عیسی میزند خر را تماشا کن

گر عندلیب خامه‌ات نزک نوا گوید حزیں　　گلشن بمرغان چمن بیت الحزن خواہد شدن

خوارم که نیست گلشن صورت سرائے من　　دہرم نمی خرد که نداند بہائے من

تر شد زابر کلک تو مغز خرد حزیں　　جاں تازه میکند رقم مشکبوئے تو

اے ہمت بلند که گردوں بخاک تست　　معذور بار منت بیجا چگونه

ناسازی است شیوۂ اجزائے روزگار با یک جہاں عدو تن تنہا چہ گونہ
در ظلمت زمانہ کہ جہل آفتاب اوست اے نور عقل دیدۂ بینا چہ گونہ

یہ شعر غالباً شیخ نے ہندوستان میں لکھے ہیں

حزیں افسانہ ام جادو دمان را مہر بر لب زد ببزم گفتگوئے عشق اعجاز مرا دیدی

سرمۂ خامشی دہد بلبل خوش نوائے را چون بسخن در آورم خامۂ مشکسائی را

متہم نے شد کہ دریں بزم سخن سازے نیست گوش چندانکہ دہم زمزمہ پردازے نیست

لب گویائی من چون شمع مقراض سخنہا شد زبانِ رشتۂ افسانہ سازِ انجمنہا شد

کسے دردِ سخن تا دل نگردد خوں چہ می داند رموزِ معنی از من پرس افلاطون چہ می داند

نوائے پردہ سوزم از کجا پیدا کند گوشے زباں فہمے نمی یابم کہ از دل وا کند گوشے

(باقی دارد)

رضا علی وحشت

حکیم شیلون

گذشتہ اشاعت سے آگے

یہ حکیم باونویں اولمپیاد میں بہت بوڑھا تھا۔ وہ تقریباً حکیم تھیافوس کی زندگی تک زندہ رہا۔ شہر لقدمونیا میں رہتا تھا۔ نہایت عقیل و فہیم شخص تھا۔ آرام ہو یا تکلیف ایک حالت میں رہتا تھا۔ بیٹھتا تھا تو نہایت عزت و وقار کے ساتھ ہمیشہ اپنے مکان میں رہتا تھا۔ کسی چیز کی طمع نہ رکھتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ انسان پر وہ زمانہ سب سے زیادہ سخت ہوتا ہو کہ جو سفر میں گذرتا ہو۔ عمر بھر باصدق و صفا رہا۔ لوگ اُس کی حسن تدبیر سے حیران رہ جاتے تھے۔ بہت کم کلام کرتا تھا۔ اور بہت زیادہ خاموش رہتا تھا۔ اسی لئے اُس کے اکثر اقوال پہچانے اور مانے جاتے ہیں۔ تمام امورِ معیشت کو اُس نے از رُوئے حکمت مقرر کیا تھا۔

سال پچپن اولمپیاد میں وہ شہر لقدمونیا کے محکمہ عالیہ کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس محکمہ کا یہ کام تھا کہ وہ بادشاہ پر نگران رہے اور اسکو رعایا پر ظلم نہ کرنے دے۔ اس سے اُس کے بھائی کو سخت حسد پیدا ہوا۔ شیلون نے اس سے کہا کہ "بھائی! میرا اس میں کوئی اختیار نہیں ہو۔ لوگوں نے خود ہی مجھ کو انتخاب کیا ہو۔ کیونکہ انھوں نے بہ نسبت تمہارے مجھ کو امورِ صعب پر زیادہ صبر کرنے والا سمجھا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا معمولی راحت و آرام بھی جاتا رہا اور میں بجائے آزاد کے مقید ہو گیا۔

اس کا قول ہے کہ کہانت اور پیشینگوئی کی مخالفت کرنی بیکار ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ انسان اپنی قوتِ عقلیہ سے آیندہ کی خبر دے سکے۔

ایک مرتبہ بقراط نے اولمپق کے کھیلوں میں قربانی کرنی چاہی۔ اور جب قربانی کا گوشت دیگچی میں ڈال کر سرد پانی ڈالا گیا تو وُہ فوراً گرم ہو گیا اور اُبلنے لگا۔ اور گوشت بغیر آگ کے قریب پکنے کے ہو گیا۔ شیلون اُس وقت وہیں موجود تھا۔ یہ واقعہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور کچھ تامل کر کے بقراط سے کہا کہ بہتر ہو کہ تم شادی نہ کرو۔ اور اگر بدقسمتی سے تم نے شادی کر لی۔ تو یاد رکھنا کہ دو باتوں میں سے ایک ہوگی۔ یا تو تمہیں اپنی بیوی کو طلاق دینی پڑیگی۔ ورنہ تمہاری جتنی اولاد ہوگی سب قتل کیجائیگی۔ بقراط یہ سُنکر ہنس پڑا۔ اور شادی کرنے سے باز نہ آیا۔ چنانچہ پیزسترانت اُسی کا بیٹا تھا کہ جس نے شہر ایتھنز کی سلطنت کو غصب کیا تھا۔ اور وہاں کی رعایا پر ظلم کیا تھا۔

جزیرہ قیتیرکی زمین کو دیکھ کر حکیم شیلون نے کچھ تامل کیا پھر نہایت افسوس کے ساتھ تمام لوگوں کے سامنے کہنے لگا کہ کاش اس جزیرہ کا وجود ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ یہی جزیرہ اہلِ لقدمونا کی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ چنانچہ آخر الامر ایسا ہی ہُوا کہ مدتوں کے بعد اہلِ اثینیہ نے اس کو فتح کر لیا۔ اور اس کی مدد سے بہت سے ممالک کو زیر و زبر کر ڈالا۔

یہ حکیم پستہ قد تھا اور چونکہ جلدی نہ بول سکتا تھا اس لئے بہت کم کلام کرتا تھا مگر جو کچھ زبان سے نکالتا تھا وُہ جامع و مانع ہوتا تھا۔

حکیم شیلون کے بعض اقوالِ حکمت یہ ہیں:۔

بھید کا پوشیدہ رکھنا اور زمانہ کو باحسنِ وجہ گزارنا بہت مشکل کام ہے۔

حکمت اس کا نام ہے کہ آدمی اپنی زبان کی حفاظت کرے خواہ حالت انبساط ہی میں کیوں نہ ہو۔ کسی کو بد دُعائیں دینا نامردی ہے۔ یہ عادت عورتوں کے خصائل میں بھی بدترین خصلت سمجھی جاتی ہے۔ کسی کی غیبت نہ کرو۔ کیونکہ اس سے دشمنی پیدا ہوتی ہے اور آدمی کو اپنی نسبت ایسی باتیں سُننی پڑتی ہیں جو اسکو ناگوار ہوں۔ اِنسان کو چاہیئے کہ بہ نسبت راحت کے دوستوں کی تکلیف کے وقت ہیں اُن سے زیادہ ملے۔ بہ نسبت حرام کی کمائی اور ظلم کے نقصان اُٹھا لینا اچھا ہے۔ بدخُلق و بدحال شخص کی تعریف نہ کرو۔ شجاع کو چاہیئے کہ وُہ نرم دِل ہو اور ایسے کام کرے کہ لوگوں میں محترم ہو نہ کہ لوگ خوف زدہ ہوں۔ کسی حاکم کی سلطنت میں سب سے بڑی سیاست تعلیم سیاست منزلی ہے۔ آدمی کو کبھی کسی احمق عورت سے شادی نہ کرنی چاہیئے۔ عیش ونشاط میں کبھی فضولخرچی نہ کرو۔ سونے اور چاندی کا امتحان پتھر پر گھس کر کیا جاتا ہے اور اِنسان کے قلب کا امتحان سونے اور چاندی سے لیا جاتا ہے۔ ہر امر میں جُزرسی کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ فضولخرچی اکثر ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ محبت ہو یا بُغض ہمیشہ قائم نہیں رہتا۔ جب کسی سے محبت کرو تو اپنے دِل میں اُس کی عداوت کی جگہ بھی رکھ لو۔ اور جب کسی سے عداوت کرو تو اُس کی دوستی کی جگہ رکھ لو۔ جو شخص کہ ضمانت دیتا ہے وُہ ضرور نقصان اُٹھاتا ہے۔ حکیم شیلون نے بُت خانہ آفتاب پر آب زر سے لکھوا دیا تھا کہ اپنے مقام و حیثیت سے زیادہ تمنا نہ کرو۔

حکیم پریانڈ اس نے ارادہ کیا کہ حکیم شیلون کو اپنے شہر میں لیجائے۔ اور اُس سے امورِ سلطنت میں مشورہ لیا کرے۔ شیلون نے اسکو جواب میں لکھا کہ "تم چاہتے ہو کہ مجھ کو جنگ و جدال کی مصیبت میں پھنسا دو۔ مجھ کو میرے

وطن سے اس لئے جدا کرنا چاہتے ہو کہ تم امن و امان کے ساتھ عیش کر سکو۔ حالانکہ حشمتِ شاہی کو بہت ہی کم ثبات ہوتا ہے۔ سب سے خوش نصیب بادشاہ وُہ ہے کہ باحشمت و شوکت مرجائے"۔

جب اُس کو یقین ہوگیا کہ اس کی موت قریب ہے۔ تو اپنے تمام دوستوں کو جمع کیا۔ اور کہنے لگا کہ "دوستو! کیا تم جانتے ہو کہ مَیں نے کبھی کوئی ایسا کام کیا ہے کہ جس سے مَیں نادم ہوں۔ جو کچھ مَیں نے تمہیں مشورے دیئے ہیں اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جس سے مَیں نادم ہُوں۔

ایک واقعہ البتہ ایسا ہے کہ جس کا اظہار ضروری ہے تا کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ آیا میرا فعل صحیح تھا یا غلط۔

"ایک مرتبہ ایک حکومت پر ہم تین دوست سرفراز تھے۔ ایک دوست سے ایسا فعل سرزد ہوگیا کہ جس کی سزا قانوناً موت تھی۔ مجھے سخت فکر ہوا کہ یا تو قانون کی مخالفت کرنی پڑیگی اور یا دوستی کی پاسداری۔ بہت فکر وغور کے بعد مَیں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ ایک تقریر میں وہ تمام باتیں بیان کردیں کہ جو ملزم کی مؤید تھیں۔ اور اسکو قتل سے بچاتی تھیں۔ میری تقریر ایسی زبردست تھی کہ میرے ساتھی دیگر حکام کو سوائے اس کے چارہ نہ رہا کہ اُنہوں نے ملزم کے بَری کرنے کا حکم دیدیا۔ اِس کے بعد بلا اس کے کہ مَیں دیگر حکام کو مطلع کروں مَیں نے خود اُس دوست کے قتل کا حکم دیدیا۔ اور اِس طریقہ سے مَیں نے حاکم ہونے کا اور نیز دوستی قائم رکھنے کا حق ادا کردیا۔ مگر اب بھی مجھے اطمینان کامل نہیں ہے کہ آیا میرا یہ فعل خطا سے خالی تھا یانہیں"!

اِس حکیم کی عمر اس قدر طویل ہُوئی کہ یہ بڑھاپے اور ضعف سے سخت تنگ آگیا

آخر مملکت بنیرہ میں انتقال کر گیا۔ موت کا باعث یہ تھا کہ اُس کا بیٹا ادمپیق کھیلوں میں جیتا۔ حکیم نے اس کو سینہ سے لگا لیا۔ اور اس درجہ خوش ہوا کہ شادی مرگ ہو گئی۔

اس کے مرنے کے بعد شہر والوں نے اُس کا بُت سونے کا بنایا تھا۔

باقی آیندہ

محمد خلیل الرحمن

مُرقّع خوشخطی

حصہ اوّل

منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہور نے نہایت محنت و جانفشانی سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شایقین خط کے واسطے خوشخطی کی ابتدائی کاپی تیار کی ہے۔ علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب موصوف نے اس کے اہتمام میں مدنظر رکھا ہے دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کے واسطے اس وقت ملک میں موجود نہیں۔ جسے دیکھ کر خط کے تمام نکات باسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ قواعد کے رُو سے حروف کی گہرائی کُرسی۔ وصل فصل۔ نوک پلک وغیرہ کا خوب لحاظ رکھا ہے۔ غرض مفردات کے ضروری نکات اس مختصر کاپی میں وضاحت سے بتا دیئے ہیں۔ ہم منشی صاحب کی اس محنت کی داد دیتے ہیں سرورق اس پر دو ہیں اندر کے سرورق کے منسلکہ صفحہ پر منشی صاحب کی تصویر چسپاں ہے۔ ہر صفحے پر بیل ہے اور سرورق نہایت شاندار ہے۔ باوجود معقول صرف اور محنت کے جو کاپی کے ملاحظہ سے معلوم ہو گا محض اس غرض سے کہ شایقین کو استفادہ حاصل ہو قیمت صرف ۵ر علاوہ محصولڈاک رکھی ہے +

منیجر مخزن پریس دہلی سے طلب کرو۔

رسم الخط

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

(ب) خط کا دُوسرا حصہ شکل حروف ہیں۔ (۱) حروف کی شکلیں ایسی ہونی چاہئیں کہ وُہ ایک دُوسرے سے فوراً تمیز ہو سکیں۔ (۲) حروف حتی الوسع مختصر ہونے چاہئیں تاکہ علامتِ تمیز تلاش کرنے میں دقت نہو اور لکھنے میں زیادہ محنت و وقت صرف نہو۔ (۳) شکلِ حروف اِس قسم کی ہو کہ چند حروف ایک ہی کشش میں لکھے جا سکیں تاکہ خط میں روانی اور تحریر میں سُرعت پیدا ہو۔ یہ نہیں کہ ہر حرف جُداگانہ بنانا اور قلم کو بار بار کاغذ پر سے اُٹھانا پڑے۔

عربی اُردو خط میں تو کافی تمیز موجود ہے۔ اور انگریزی خط اِس عیب سے پاک ہے۔ مگر سنسکرت خط کو پڑھنے والے جس قدر دھکے کھایا کرتے ہیں وُہ اظہر من الشمس ہیں۔ پُرانے پنڈتوں کو دیکھا ہے کہ ایک ہی کتاب کو تمام عمر پڑھتے رہے ہیں۔ بیسیوں دفعہ عبور کر چکے ہیں لیکن جب پڑھینگے حرف حرف پر ٹھوکر کھائینگے۔ یہ کیوں؟ محض اِس لئے کہ حروف باہم اس قدر مشابہ ہیں کہ علامتِ تمیز تلاش کرنے میں دقت ہوتی ہے۔ اُردو خط سب سے مختصر بھی ہے اور روانی میں تو فی الحقیقت عربی اردو خط تمام دُنیا کے موجودہ خطوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ باقی جس قدر خطوط ہیں اُن میں حروف کی اشکال بجنسہٖ قائم و موجود رہتی ہیں۔

ایک عربی خط ہی کہ جس میں مختصر اشکال کو باہم ملانے کے لئے مختصر کر دیا گیا ہی۔ اور آج شارٹ ہینڈ shorthand جو بات حاصل کرنا چاہتا ہی وہ پہلے ہی اس کو حاصل ہی۔ صرف ایک دندانہ سے ایک صورت ظاہر کرنا اور صرف نقطے سے حروف کی قلب ماہیت کر دینے کا گر شارٹ ہینڈ نے اسی عربی اُردو خط سے سیکھا ہی۔ حروف اس قدر مختصر ہیں کہ ایک حرف لکھنے کے لئے سنسکرت کی طرح شطرنج کی بساط کا نقشہ اُتارنا نہیں پڑتا۔ حروفِ سنسکرت تو زیادہ تر خطوطِ مستقیم پر مشتمل ہیں۔ اِس لئے صرف ایک حرف کی پُوری شکل بنانے کے لئے قلم کو کئی دفعہ کاغذ پر سے اُٹھانا پڑتا ہی۔ اِس سے تو انگریزی حروف بہتر ہیں۔ کیونکہ وُہ زیادہ تر دائروں پر مشتمل ہیں۔ اور فطرتاً انگلیوں کی طبعی حرکت مدوّر ہی۔ لیکن انگریزی کے حروف بھی جُدا جُدا رہتے ہیں اور ہر حرف کے لئے کم از کم ایک دائرہ اور ایک خطِ مستقیم ضروری ہوتا ہی۔ بخلاف اِس کے اُردو حروف مرکّبہ میں ہر حرف دائرے کا صرف ایک حصّہ یا خطِ مستقیم کا محض کوئی جزو ہوتا ہی۔ جس کی وجہ سے لکھنے میں سہولت۔ محنت و وقت میں کفایت ہوتی ہی۔ اور حروف ایک دُوسرے سے خوب اتصال پا جاتے ہیں۔

(ج) سمتِ تحریر۔ دُنیا میں بعض خط دائیں سے بائیں کو لکھے جاتے ہیں۔ جیسے عربی اُردو۔ بعض انگریزی کی طرح بائیں سے دائیں کو۔ اور بعض چینی خط کی طرح اوپر سے نیچے کو۔ آخرالذکر تو خطِ مصورہ ہی۔ اس لئے اس سے ہمیں بحث نہیں۔ کیونکہ یہ یقینی امر ہی کہ کوئی عقلمند قوم حروفِ تہجّی کو چھوڑ کر خطِ مصورہ اختیار نہ کریگی۔ باقی یہ سوال رہتا ہی کہ دائیں سے بائیں کو لکھنا ٹھیک ہی یا بائیں سے دائیں کو۔ ہر قوم اپنے خط کی پاسداری کرتی ہی۔

اور اپنی سمت تحریر کو بہترین بتاتی ہو۔ فیصلہ کرنے کی یہی ایک ترکیب ہو کہ فطرت کی خدمت میں اپیل کیجائے اور ساختِ انسانی خود بتائے کہ قلم کس طرف کو چلانا چاہئیے۔

آپ کو کبھی خیال تو آیا ہوگا کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر گوشت زیادہ اور پُشت پر کم ہو۔ اس کی وجہ کیا ہو؟ فطرت کا منشا یہی تھا کہ اُنگلیاں بند ہونے میں زور کیا کریں۔ اِسی لئے ہتھیلی کیطرف عُضلات قوی لگائے ہیں۔ تاکہ اُنگلی کے بند ہونے میں کوئی رُکاوٹ ہو تو اُس روک پر بھی عُضلات کی قوت غالب آسکے۔ لیکن یہ مُدعا فطرت نہ تھا کہ انگلیاں کُھلنے میں بھی زور کیا کریں اِس لئے پُشتِ دست کے عُضلات بہت پتلے بنائے گئے ہیں۔ اور ان کا کام صرف اسقدر رکھا گیا ہو کہ انگلیوں کے جوڑوں کی رگڑ کا مقابلہ کرسکیں اور بس۔ ضرورت سے زیادہ قوت ان عضلات کو نہیں دی گئی۔ کیونکہ ان کا منصب صرف اس قدر ہو کہ بند انگلیوں کو کھول دیں۔ رُکاوٹوں کا مقابلہ کرنا اُن کے فرائض میں داخل نہیں۔ یہی وجہ ہو کہ اگر کسی چیز کو کھولنا مقصود ہو تو بھی ہم اس کو ایسے طریق سے کھولتے ہیں کہ انگلیاں زور کرتے وقت بند ہوتی جائیں۔ مثلاً سونے کا ایک کڑا کھولنا منظور ہو تو یہ کوئی نہیں کرتا کہ ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اس میں داخل کرکے انگلیوں کو باہر کی طرف کھولے اور زور کرے۔ اگر کوئی ایسا کرے بھی تو کامیابی بعید از اُمید ہوگی کیونکہ انگلیاں اس طرح پر زور کرنے کے لئے نہیں بنائی گئیں۔ بلکہ وہ کڑے کو دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں سے مخالف سمت میں کھینچکر کھولیگا۔ کیونکہ انگلیاں اسی صورت میں زور کرسکتی ہیں جب وہ ہتھیلی کی طرف کو حرکت کررہی ہوں۔

علیٰ ہذا جب لڑکے بلور کی گولیاں کھیلتے ہیں تو دائیں ہاتھ کی انگلی کو بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے دباتے ہیں۔ مگر انگل کی اندرونی سمت باہر کو رکھتے ہیں اور اس کے سامنے گولی رکھتے ہیں۔ جس وقت بایاں ہاتھ ہٹا لیا جاتا ہے تو دائیں ہاتھ کی انگلی ہتھیلی کی طرف آنے کے لئے زور کرتی ہے۔ اور گولی کو دھکا دیجاتی ہے۔ حالانکہ سیدھی بات تو یہ تھی کہ انگل کے الٹی طرف کے سامنے گولی رکھی جاتی اور انگلی کھلنے میں گولی کو دھکا دے جاتی۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ اِس لئے مجبوراً انگل کے بند ہونے کی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اہلِ بصیرت ناظرین ذرا غور کریں گے تو بیسیوں مثالیں انہیں خود سوجھینگی۔ جن سے ثابت ہے کہ ہاتھ کی انگلیاں اُسی صورت میں زور کرسکتی ہیں۔ جب وُہ ہتھیلی کی طرف کو حرکت کر رہی ہوں۔

علیٰ ہذا کلائی پر بھی اور بازو پر بھی۔ اندر کی طرف گوشت زیادہ ہے اور باہر کی طرف کم ہے۔ کیونکہ یہاں بھی فطرت کا یہی منشا تھا کہ کلائی بازو کی طرف کو آنے میں۔ اور بازو چھاتی کی طرف جانے میں زور کرسکے۔

المختصر انسانی بازو کی فطری حرکت یہ ہے کہ انگلیاں ہتھیلی کی سمت کو آئیں۔ اور بازو چھاتی کی سمت کو حرکت کرے۔ طبعاً بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگر ہاتھ کھلا چھوڑ دیا جائے اور بازو کو حرکت دیجائے تو بازو چھاتی کی طرف کو آئیگا اور ہتھیلی چھاتی کے ساتھ لگ جائیگی۔

جب اِنسان کے بازو کی ساخت یُوں واقع ہُوئی ہے تو اگر ہم یہ چاہیں کہ قلیل ترین سعی سے کثیر ترین نتائج حاصل کرسکیں تو لابد ہمیں فطرت کا تتبع کرنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ درزی جب سُوئی چلاتا ہے تو اسی طرح چلاتا ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی کا رُخ چھاتی کی طرف رہتا ہے اور بازو چھاتی کی سمت حرکت

کرتا ہی۔ صنعت تحریر کو دُنیا بھر میں اگر کسی صنعت سے مشابہت ہی تو وُہ خیاطی ہی۔ درزی کی نشست۔ درزی کی انگلیوں کی حرکت جس قدر کاتب کی نشست و حرکات سے مشابہ ہی اور کسی صناع کی نشست و حرکت سی اس قدر مشابہ نہیں۔ درزی اکثر ناخواندہ و جاہل ہوتے ہیں۔ مگر خدا کی قدرت کہ ان جاہلوں کی سمجھ میں وُہ گُر آگیا جو ہمارے ودّیا والوں کی سمجھ میں نہ آیا۔ درزی فطری سمت میں سُوئی کو جس قدر حرکت بلاتکان دے سکتا ہی پنڈت یا انگریزی نویس اس قدر نہیں دے سکیگا۔

آجکل دو خط حریف مقابل اور زیر استعمال ہیں۔ فارسی دفاتر میں اُردو عربی خط اور انگریزی دفاتر میں انگریزی خط۔ اُن میں سے اوّل الذکر دائیں سے بائیں کو یعنی فطری سمت میں لکھا جاتا ہی اور آخر الذکر سمت غیر فطری میں یعنی بائیں سے دائیں کو۔ مگر نتیجہ کیا ہی۔ سب اہل قلم جانتے ہیں کہ سرکاری دفاتر میں فارسی محرّر کو جس قدر قلم رانی کرنی پڑتی تھی انگریزی کلرک کو نہیں پڑتی اور اس پر طرّہ یہ ہی کہ محرروں کو تنخواہ ہمیشہ قلیل ملتی ہی۔ یعنی محنت زیادہ اور خوراک کم۔ بخلاف اس کے کلرکوں کو تنخواہ اور غذا زیادہ اور محنت کم۔ لیکن اس پر بھی کبھی سُننے میں نہیں آیا کہ کسی محرر کو مرض خدرِ خطاطان (writer's cramp) ہو۔ یہ موذی مرض جب ملیگا انگریزی نویسوں میں وجہ کیا؟ یہی کہ انگریزی نویس عضلات سے خلافِ فطرت کام لیتا ہی اس لئے اسکو قوت ارادی زیادہ صرف کرنی پڑتی ہی۔ وُہ نہ صرف عضلات کو تحلیل کرتا ہی بلکہ اعصاب کو بھی تحریر کی بھینٹ چڑھا دیتا ہی۔ آخر اعصاب اس قدر فرسُودہ ہو جاتے ہیں کہ وُہ کام کرنے کے لائق بھی نہیں رہتے۔ دیکھنے میں ہاتھ بھلا چنگا ہوتا ہی۔

لیکن تحریر میں اور صرف تحریر میں ارادہ کی اطاعت نہیں کرتا۔ اسی ہاتھ سے مریض ہتوڑا چلائے۔ ہاتھ کام کریگا۔ لیکن تحریر کا حکم ملا اور ہاتھ نے انکار کیا۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ خلافِ فطرت سمت میں اس سے تحریر کا کام لیا گیا تھا۔ اگر درزی بھی اُلٹی سمت میں سُوئی چلایا کرے تو اس کو بھی یہ مرض ہو جاوے۔ لیکن نہیں ہوتا حالانکہ غریب درزی کو محرّروں سے بھی زیادہ عرصہ تک متواتر سُوئی چلانی پڑتی ہی۔ اور اُس کے ہاتھوں کے عُضلات کی حرکت بعینہٖ وُہی ہی جو کاتب کی اُنگلیوں کے عُضلات کی۔

غیر فطری خطوط میں صرف یہی ایک عیب نہیں کہ وُہ بائیں سے دائیں کو لکھے جاتے ہیں۔ بلکہ اس عیب کے لازمی نتائج اَور بھی عیوب ہیں جن سے مخلصی اسوقت تک ممکن نہیں۔ جب تک سمت تحریر کو نہ بدلا جائے۔ مثلاً غیر فطری خط ہو تو غیر فطری نشست لابدی ہوگی۔ جب تک سمت تحریر کو نہ بدلا جائے اُسوقت تک نشست کو بدلنا ممکن نہیں۔ انگریزی کو ہی دیکھ لو۔ اگر آپ بے تکلف میز کے سامنے کُرسی پر بیٹھ کر کلائیاں میز پر رکھ دیں تو ہاتھوں کی کیا حالت ہوگی؟ دونوں ہاتھو کی چھوٹی اُنگلیاں میز کے ساتھ مس کرتی ہونگی اور ہاتھ اپنے پہلو پر کھڑا ہوگا۔ دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے سمت الراس کی طرف ہونگے۔ اُنگلیاں از خود اندر کی طرف یعنی دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں آمنے سامنے ایک دُوسرے کی طرف جُھکی پڑتی ہونگی۔ کلائی کی بھی وہی ہڈی میز کے ساتھ مس کریگی۔ جو چھوٹی اُنگلی کی سیدھ میں ہی دُوسری ہڈی اس کے اوپر ٹھیک سمت عمودی میں ہوگی۔ اور دونوں پہونچوں میں چھاتی کے برابر نہیں بلکہ اس سے کم اور تقریباً اتنا فرق ہوگا جس قدر آپ کے سر کی موٹائی ہی۔ یہ اتنا فرق فطرت نے کیوں رکھا ہی محض اس لئے کہ آپ کے ہاتھوں کا کام آپکی آنکھیں دیکھ سکیں۔ اگر آپ اس

فطری نشست میں (داہنیں ہاتھ سے) کچھ تحریر کرنا چاہیں تو لابد ہے کہ آپ کا ہاتھ جسمانی کی سمت کو حرکت کرے اور آپ داہنیں سے بائیں کو لکھتے جائیں۔ تاکہ ہاتھ کا عمل پیشِ نظر رہے۔ لیکن اگر آپ خلافِ فطرت سمت میں یعنی بائیں سے داہنیں کو لکھیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ہاتھ کا عمل ہاتھ کی اوٹ میں آکر نظر سے اوجھل ہو جائیگا۔ اور بہ تقاضائے طبیعت آپ کو اپنی نشست میں اسقدر فرق کرنا پڑیگا کہ آپ کا سر بجائے دونوں ہاتھوں کے درمیان رہنے کے داہنے ہاتھ کی داہنی طرف پر آجائے تاکہ ہاتھ کا عمل پیشِ نظر رہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کا سر آپکی نشست گاہ پر عموداً واقع نہیں رہیگا۔ بلکہ کندھے گردن اور سر ایک طرف کو جھک جائینگے۔ اور بائیں پہلو کے عضلات پر ناحق کا زور رہیگا۔ داہنیں طرف کی پسلیاں جگر کو دبائے رکھینگی۔ اور دایاں پھیپھڑا کم اور بایاں زیادہ حرکت کریگا۔ جگر اور پھیپھڑے پر ناجائز اور نامساوی دباؤ پڑنے کے نتائج اِس قدر خطرناک ہیں کہ میں ان کا ذکر کرنا نہیں چاہتا۔ انگریزی خوانوں کی صحت خود اس کا پتہ دیتی ہے۔ مگر عضلات پر جو نامساوی تمدد پڑتا ہے اس کا نتیجہ ایک خاص مرض ہے جسکو Curvature of the Spine کہتے ہیں۔ یعنی کمر کا ایک طرف کو جھک جانا۔ اور یہ مرض بھی چپ نویسوں تک ہی محدود ہے۔

اگر چپ نویسی میں اسی قدر عیوب ہوتے تو بھی ہم صبر کرتے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ اس قسم کے خطوط مجمع عیوب ہیں۔ ایک دو پر بس نہیں۔ اس قدر عیب ہیں کہ انکا حصر کرنا ہمارے حیز امکان سے خارج ہے۔ لیکن جس ایک عیب کو ہم کسی طرح بھی قلم انداز نہیں کر سکتے۔ وہ یہ ہے کہ اس خط میں ایک محال عقلی بھی داخل ہے اور سمجھ میں نہیں آتا انسان اس مشقت کو کیونکر جھیلتا ہے اور برسوں کی مشق تحریر کے بعد کیوں حذف خطا طاں حملہ کرتا ہے۔ جلد تر کیوں نہیں کرتا۔ غضب ہے کہ ایک وقت میں ہاتھ سے دو مختلف السمت حرکتوں کا تقاضا

کیا جاتا ہے۔ انگلیاں اوپر نیچے دائیں بائیں کو چل رہی ہیں اور ہاتھ بخطِ مستقیم بائیں سے دائیں کو چلا جاتا ہے۔ اگر انگلیوں کی اور ہاتھ کی حرکت ایک ہی سمت میں ہو تو کچھ مشکل نہیں۔ لیکن ایک ہی وقت میں دو مختلف السمت حرکتوں کا موجود ہونا بالکل محال ہے۔ اور اس تقاضے کو طبیعت یوں پورا کرتی ہے کہ نہایت سرعت سے باری باری دونوں حرکتیں پیدا کرتی ہے۔ اس لئے گو ہمیں انگلیاں اور ہاتھ برابر حرکت کرتے معلوم ہوتے ہیں مگر حقیقت میں دونوں حرکات متواتر نہیں ہوتیں۔ جب طبیعت سے ایسے محال اور مشکل کام لے جائیں۔ تو وہ کیوں تعمیل ارادہ سے سرتابی نہ کرے اور خدر خطاطاں کی پناہ میں نہ چلی جائے۔ جس قدر خطوط میں حروف ہجا عندالاتصال اپنی صورتِ ذاتی ترک نہیں کرتے اُن سب میں یہ شنیع عیب موجود ہے۔ کیونکہ حروف اوپر سے نیچے کو بنائے جاتے ہیں اور بسا اوقات خلافِ فطرت نیچے سے اوپر کو۔ مگر ہاتھ کو ہمیشہ بخطِ مستقیم بائیں سے دائیں کو چلنا پڑتا ہے۔ تو گویا کلائی کی حرکت ہمیشہ انگلیوں کی حرکت سے قائم الزاویہ بناتی ہے۔ اور مستطیل قوتوں کے قاعدہ سے یہ دونوں حرکتیں مخلوط ہو کر ایک درمیانی سمت کی حرکت پیدا ہو جانی چاہئے۔ اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ مبتدی تو برسوں تک بلا رول سیدھی سطر لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ کہنہ مشق کلرک بھی کاغذ کو اپنے سامنے ترچھا رکھتے ہیں تاکہ سطر سیدھی آئے۔ اور دونوں قوتوں کے اجماع کی وجہ سے خط میں ذرا روانی پیدا ہو جاوے۔ بخلاف اس کے اُردو خط میں قطعات کے مختلف اجزاء مرکب ہمیشہ ایک دوسرے کے اوپر نیچے واقع ہوتے ہیں اور حروف مرکب کی تکمیل سے پہلے ہاتھ کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف انگلیوں کی حرکت سے ایک لفظ کامل یا اُسکا جزو مرکب بن جاتا ہے۔ اور جب ہاتھ کو حرکت دینی پڑتی ہے تو انگلیوں کی حرکت

رُک جاتی ہے -

یہانتک تو انگریزی کا ذکر تھا اب سنسکرت کو لیجئے - اِس میں تو ستم پر ستم ہی - چپ نویسی کے جس قدر عیوب میں اوپر بیان کر چکا ہُوں وُہ تو سب موجود ہیں مگر اُن پر ایک اَور اضافہ بھی ہی - یعنی قریبًا ہر حرف میں ایک خط اُفقی اور ایک خط عمُودی ضرور ہوتا ہی - اور اِن دونوں کی مثالی اس وضع کی ہی کہ اگر خوشخط لکھنا چاہیں تو ایک حرف لکھنے کے لئے نہ صرف قلم کو کئی مرتبہ اُٹھانا اور تحریر کو روکنا پڑیگا بلکہ کئی دفعہ گرفتِ قلم کو بھی بدلنا پڑیگا - اِس ردو بدل میں کاتب کی جس قدر محنت اور وقت ضائع ہوگا اس کا اندازہ خود ناظرین کر سکتے ہیں -

مَیں اِس مضمون کو زیادہ طُول دینا نہیں چاہتا ورنہ ابھی بہت کچھ کہنا ہی - ناظرین کو اگر تحقیقِ حق مقصود ہو تو غور کرنے پر از خود بہت کچھ منکشف ہو جائیگا - میرا منشا صرف ہندوستان کے رائجہ رقیب خطوط میں محاکمہ کرنا تھا - وُہ اسی قدر کافی ہوگا - میں نے چند اصُول کو جو ضرورتِ تحریر کے مطالعہ سے مجھ پر منکشف ہُوئے ہیں کسوٹی بنایا ہی - اور جملہ خطُوط کو اسی معیار پر پرکھا ہی - اور اسی لازمی نتیجہ پر پہنچا ہُوں کہ عربی اُردو خط سب سے بہتر ہی - گو مَیں نے زیادہ تر انگریزی اور سنسکرت خط کا ذکر کیا ہی - مگر اصُولِ مندرجہ عالمگیر ہیں اور ہر خط پر حاوی ہیں - خواہ وُہ خط گورمکھی ہو خواہ بنگالی - ناملی ہو یا گجراتی +

جی - ان - بی

کلمبس

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

وہ بدنصیب زمین جو اپنی قوم کو چھوڑ کر کلمبس سے مل گیا تھا وہ اور اُسکی رعایا بھی خراج گذاری سے اور جزیہ دینے سے مستثنےٰ نہ تھے۔ اپنی قوم کی تباہی اور داغ بے وفائی و روسیاہی دونوں باتوں نے اُسے زلیست سے بیزار کر دیا۔ آخر تنہا کسی پہاڑ کیطرف چلا گیا اور پھر کسیکو منہ نہ دکھایا۔ ٹکر اٹکرا کر مر گیا۔ اِس شخص کو مورخین یورپان الفاظ سے یاد کرتے ہیں راست باز۔ صادق الاقرار۔ زبان کا سچا۔ بات کا پکا۔ مہمان نواز۔ کریم الطبع تھا۔ آخر جزیرہ کے لوگ اِس قدر مطیع ہو گئے کہ گورے اُن کے کاندھو نپر ہوادار وغیرہ میں سوار ہو کر تمام جزیرہ میں سفر کرتے پھرتے تھے۔ اتفاقاً ایک گورا کچھ جُرم کر کے مواخذہ سے بچنے کے لیے روپوش ہو گیا پھرتے پھرتے ایک گانوں کی طرف نکل گیا۔ وہاں کی رانی اس پر مائل ہو گئی۔ ایک عرصہ تک وہاں محو کامرانی رہا۔ مگر کوئی اپنا ہمجنس و ہمزبان نہ پاتا تھا اِس سبب سے گھبرا گیا۔ رانی اِس بات کو تاڑ گئی کہ اِسکا دل اُچاٹ ہو گیا۔ سونے کی ایک کان اِس عورت کو معلوم تھی وہ اُسے بتادی۔ اور کہا کہ اپنے اہل وطن کو بھی یہاں بلا لو۔ اور جتنا سونا نکل سکے اِس کان سے نکالو۔ یہ کان دریائے ہینا کے کنارے پر واقع تھی وہاں اِس کثرت سے سونا نکلنا شروع ہوا کہ اتنا آجتک کہیں سے نہ نکلا تھا زیادہ تر عجیب بات یہ تھی کہ کچھ آثار اس کے بھی پائے گئے کہ کسی زمانے میں اِس کان کو کھود کر سونا نکالا جا چکا ہے اِس عصر کے جتنے دیسی باشندے تھے اُنمیں سے کیمیں یہ لیاقت نہ تھی کہ سونا نکالنا جانتے ہوں۔ اُن کے پاس جو سونا تھا وہ وہی تھا جو کہیں پڑا

ہوا اِل گیا اٹھایا۔ یا ندی کی تہ میں سے چُن لائے کلمبس کو گمان تو اِس بات کا تہا ہی کہ یہ ایشیا کا جزیرہ ہے اب یقین ہو گیا کہ یہ وہی کان ہے جس کا سونا حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس میں صرف کیا تہا اسجگہ کلمبس کے حکم سے ایک قلعہ تعمیر کیا گیا۔ مارچ کی ۱۰ تاریخ ۱۴۹۶ء کلمبس پھر اندلس کو روانہ ہوا۔ جہازوں پر بہت سے بیمار پریشان حال مصیبت زدہ لوگ سوار تہے جنکی تعداد سو اور دو سو تہی اور تیس آدمی دیسی بہی ساتھ تہے۔ وہ غنیم جسے ہتکڑیاں ڈال عیاری سے اسیر کر لیا تہا وہ اور اُسکا بھائی اور بھتیجا بھی بعد کو اسیر ہوئے تہے یہ تینوں بھی اِسی جہاز پر تہے اِبکی دفعہ کا سفر بہت تکلیف دہ تہا ہوا مخالف رہی رسد اور باربرداری کا سامان سب تمام ہونے پر آیا گوروں نے ارادہ کیا کہ دیسی لوگ جو جہاز پر سوار ہیں اونہیں کھالیں اور نہ کھائیں تو سب کو دریا میں ضرور پھینکدینا چاہیئے کہ اُن کو کھلانا تو نہ پڑے لیکن کلمبس نے سمجھایا کہ یہ سب لوگ بھی عیسائی ہو چکے ہیں اِن کا مارنا روا نہیں۔ یہ تمھارے برادر دینی ہیں۔ اور ان کو ڈھارس دی کہ عنقریب منزل پر پہنچے جاتے ہیں اِس اثنا میں وہ رئیس جسے قید کر کے لے چلے تہے رستہ ہی میں مارے غم کے مر گیا۔ کہتے ہیں کہ اِس نے مرتے دم تک اپنی آن بان نہیں چھوڑی کبھی کلمبس کی تعظیم نہیں کی اور ہمیشہ نفرت کی نظر سے گوروں کو دیکھا کیا۔ ۱۱ تاریخ جون کی یہ سب جہاز اندلس پہنچ گئے۔ یہاں سے دو جہاز ساز و سامان لاد کر جزیرہ نوآباد میں کلمبس نے بھجوائے اِبکی دفعہ بڑی مشکل سے لوگ امریکہ جانے پر راضی ہوتے تہے کلمبس نے اُن قیدیوں کو جن کے لیئے عبور دریائے شور کا حکم تھا بادشاہ سے کہا کہ وہاں بھجوا دیجئے۔ دریائے ہیناکی کان اور کیوبا کا ذکر بادشاہ سے کر کے اُس نے اُمید دلائی کہ چھہ جہاز اور مجھے ملیں تو اب کے اور ممالک و جزائر کا پتہ لگاؤں

لیکن بسکہ کارِ سے جہازوں کا ملنا اور جہازوں کا لوگوں سے بھرنا اور لوگوں کے لیے زاد و توشہ کا بہم ہونا اس میں بڑا طول ہوا۔ مئی کی تیئیسویں ۱۴۹۸ء کو یہ پھر امریکہ کیطرف روانہ ہوا۔ اب کے اِس نے خطِ استوا کی طرف جہازوں کو بڑھانا شروع کیا۔ اِس خیال سے کہ اکثر لوگوں سے سُن چکا تھا کہ گرم ہوا میں زر و جواہر کی کانیں ہوا کرتی ہیں لیکن جوں جوں خط استوا سے قریب ہوتا گیا۔ جہاز والے علیل ہونے لگے۔ کلمبس خود اور اکثر اُس کے ساتھ والے وجع مفاصل اور تپ میں مبتلا ہو گئے۔ ناچار پھر جہازوں کو شمال کی طرف دبانا شروع کیا۔ طول مسافت کے سبب پینے کو پانی کسی جہاز پر نہ رہا تھا ناگاہ تین چوٹیاں ایک پہاڑ کی دُور سے دکھائی دیں۔ کلمبس نے خوش ہو کر اُن کا نام ٹرنی ڈاڈ رکھا۔ کلمبس اِس جزیرہ کے جنوبی ساحل پر گذر رہا تھا کہ براعظم امریکہ کا ساحل اُسے دور سے دکھائی دیا۔ یہ اُس کو بھی جزیرہ سمجھا اِس کا جہاز پانی کی طغیانی سے از خود ایک ساحل پر جا لگا۔ جنوبی امریکہ میں برازیل کے قریب خلیج پیریا میں یہ جہاز سے اُترا بھی مگر جزیرہ ہی کا دھوکا اُسے رہا۔ وہاں کے لوگوں سے ملاقات بھی ہوئی اور اُن لوگوں نے بہت سے موتی گرانبہا اِس کے نذر کیے مگر جہاز پر زاد راہ نہ باقی رہی تھی دوسرے وجع مفاصل کے علاوہ اُسکی آنکھیں بھی کمزور ہو گئی تھیں کہ اچھی طرح دیکھ نہ سکتا تھا۔ وہاں ٹھہرنا اور اچھی طرح زر و جواہر کا پتہ لگانا غیر ممکن ہو گیا جزیرۂ نو آباد کی طرف مراجعت کی۔ کلمبس کوئی ڈھائی برس کے بعد پھر اندلس والوں کی بستی میں پہونچا۔ جب یہ اندلس کو روانہ ہونے لگا تھا تو اپنے بھائی کو اِس جزیرہ کا حاکم کر گیا تھا۔ گوروں نے اِسکی بغاوت کی اور اولاد کے ساتھ جزیرہ میں منتشر ہو گئے۔ اور اِن باغیوں کا جرگہ روز بروز زیادہ

ہوتا گیا۔ یہانتک نوبت پہنچی کہ اہل جزیرہ پر جو اندلس کی حکومت تھی وہ درہم و برہم ہوگئی اور جتنے گورے اپنے افسر کے ماتحت رہ گئے تھے اُن کا بھی اعتبار اُن کو نہ رہا تھا۔ باغیوں کے خوف کے مارے افسر کو قلعہ سے باہر نکلنا دشوار ہوگیا تھا۔ قلعہ کے لوگ باغیوں کے دھوکے میں آآکر قلعہ چھوڑ کر اُن کے جرگہ میں شریک ہوتے جاتے تھے۔ اِس میں دو لطف تھے ایک تو نوکری و فرمانبرداری سے آزادی۔ دوسرے جزیرہ والوں کی بہو بیٹیوں پر تسلط جو نہایت حسین و کم سن تھیں اور اُن کے ساتھ برہنہ ناچتی تھیں۔ باغیوں نے یہ افواہ اُڑا رکھی تھی کہ کلمبس دربار اندلس میں بے عزت کیا گیا اور اُس نے جو ظلم کہ گوروں پر اور رعایائے جزیرہ پر کیا تھا سب سرکار میں کھل گیا۔ اِس افواہ کو سن سنکر اور بھی رہے سہے قلعہ کے گورے بغاوت پر تلے ہوئے تھے کہ اِس اثنا میں وہ دونوں جہاز جو اندلس سے کلمبس نے بھجوائے تھے جزیرہ میں پہنچ گئے۔ اور سب لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ کلمبس کے بھائی کا تقرر اُسکی غیبت میں سرکار نے منظور فرمایا ہے اور بہت سے سرباز جوان مع ساز و سامان اِس افسر کے زیر حکومت اور آ گئے اب کسیقدر ان سب باغیوں کے تو وضو شکست ہوگئے لیکن تمام جزیرہ میں گوروں سے ایسی نفرت پھیلی تھی کہ خبر آئی کہ ویگا کا ایک سردار اندلسیوں کے قلعہ پر حملہ کرنے کو تیار ہے قلعہ کا افسر اپنی توپیں اور سوار اور بہت سے دیسی لوگ لیکر نکلا قتل عام کرتا بقیوں کو جلاتا پھونکتا ہزیمت یافتہ گروہ کے تعاقب میں دور تک گیا یہ سب لوگ بھاگ کر ایک دشوار گزار پہاڑ میں پناہ گزیں ہوئے میونابکس اِس پہاڑ کا حاکم جو رئیس تھا وہ بڑا شجاع و راستباز شخص تھا اِس نے سب کو پناہ دی اندلسیوں نے اُس سے کہلا بھیجا کہ ہمیں اپنا دوست سمجھو اور یہ سردار جو ہم سے بھاگ کر تمہاری سرحد میں آیا ہے اور پناہ گزیں ہوا ہے اُسے

مع عیال و اطفال گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیجدو تو ہمیں کچھ تم سے پرخاش نہیں ہے ورنہ یہ سمجھ رکھو کہ تمھاری سب بستیاں تباہ و تاراج اور تمام فوجیں عرضۂ تیغ بے دریغ ہو جائیں گی۔ یہ پیام سنکر اُس نے کہا اِن اندلسیوں سے کہدو کہ تم لوگ غاصب و غدار و سفاک و مردم آزار ہو تم کبھی سے دوستی کیا کرو گے اور یہ سردار ایک بھلا آدمی ہے اور میرا دوست ہے میں اُسے اپنی پناہ میں لے چکا زبان دے چکا اب جو مُنہ سے کہہ چکا اُس بات کو پورا کرونگا۔ حرب و دغا کی مصیبتیں جھیلوں گا لیکن مکر و دغا مجھ سے ہوئی ہے نہ ہوگی حقیقت میں یہ شخص بات کا بڑا دھنی تھا جو کہا تھا وہی کیا۔ اندلس والوں نے یلغار و کشتار میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا لیکن اِس نے اپنے مہمانوں کو نہ دینا تھا نہ دیا بستیوں کا اُجڑنا ریاست کا بگڑنا گھر کا لٹنا رفقا کا چھٹنا سب پر صبر کیا۔ آخر بے گھر بے در ہو کر ملک و مال کھو کر جنگل میں نکلا چلا گیا اندلسیوں نے اب بھی نہ دم لیا نہ لینے دیا۔ پہاڑ کے دروں میں گھاٹیوں میں جنگلوں میں جھاڑیوں میں تین مہینے تک ڈھونڈھتے پھرے۔ آخر میزبان کا پتہ لگ گیا کہ فلاں جنگل میں پناہ گزیں ہے بارہ گورے ننگے ہوئے اور سر سے پاؤں تک بدن کو رنگا بندوقوں اور تلواروں پر کھجور کے پتے لپیٹے دیسیوں کا بھیس بدلکر آفت ناگہانی و بلائے آسمانی کی طرح دفعتہً غریب پر ٹوٹ پڑے۔ اُسکی رانی اور بچے وفادار اور جانباز خادم بھی اُس کے ساتھ اسیر پابزنجیر افسر کے سامنے لائے گئے۔ وہ قیدیوں کو ساتھ لے کر قلعہ کی طرف پلٹ آیا۔ کہتے ہیں افسر کے دلمیں بڑا رحم تھا اُس نے سب کی جان بخشی کی۔ فقط رئیس قوم کو قید رکھا اِس سبب سے کہ تمام رعایا اُسکی ہوا خواہ و جاں سپار تھی۔ آیندہ بغاوت کرنے کا اندیشہ تھا آخر کو سردار دیگا جس کے پناہ

دینے سے ایک رئیس کی یہ بربادی و تاراجی ہوئی تھی۔ جنگل میں بھوکوں
مرنے لگا دشمن بھی تاک میں لگے ہوئے تھے۔ نکلنا تھا کہ آفت آگئی مہمان
و میزبان دونوں قید فرنگ میں ایک جا جمع ہوگئے۔ اس بستی کی یہ حالت
تھی۔ جب کلمبس یہاں پہنچا دیسیوں کی بغاوت تو فرو ہو چکی تھی مگر گورے
جو باغی ہو کر نکل گئے تھے اُن کا زور بہت ہوگیا تھا اس جزیرہ کا ایک
صوبہ اور ساحل اون کے قبضہ میں تھا۔ اولڈن ایک شخص اُن کا سرگروہ تھا
کلمبس نے راستہ ہی میں سے اپنے ساتھ کے جہازوں میں سے تین جہاز
جسپر بہت کچھ سامان و اسباب معیشت اور سلاح خانہ تھا علاوہ اندلس کے
بہت سے دائم الحبس قیدی سوار تھے سیدھے اس جزیرہ کی طرف روانہ
کر دیئے تھے۔ یہ تینوں جہاز ہوا کی زبردستی اور پانی کی طغیانی سے
باغیوں کے ساحل پر آ گئے۔ اولڈن نے چالاکی سے جا کر تمام ساز و سامان
اُتروالیا۔ اور تمام باغیوں کو ہتیار تقسیم کر کے مسلح کر دیا۔ پھر تمام قیدیوں کو
آزادی و عیاشی کی چاٹ دے کر اپنے جرگہ میں ملا لیا۔ کلمبس نے لاکھ لاکھ
چاہا کہ یہ لوگ راہ پر آئیں مگر کوئی تدبیر مؤثر نہ ہوئی۔ دربار اندلس میں شکایت
لکھی۔ وہاں بھی اولڈن کے طرفدار موجود تھے کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ اب ان
لوگوں کا دست تعدی اور بھی دراز ہوگیا۔ اولڈن نے اپنے لیئے جاگیر
اور اقتدار کلمبس سے لکھوا لیا۔ اپنے ساتھیوں کے لیئے تمام بنام زمینیں لیں
اور قانون نکلا کہ تمام دیسی رؤسا خراج داخل کرنے کے بدلے ہر فصل میں
اپنی رعایا میں سے کچھ لوگ ان زمینوں پر کاشتکاری کے لیے بھیجا کریں
اسی قانون نے غریب دیسی لوگوں کو مار کر لا انسیت و نابود کر دیا جزیرۂ
ہسپانیولا کے تمام بندگان خدا اندلس والوں کے غلام بن گئے۔ باقی آئندہ)

سید علی حیدر نظم طباطبائی)

مقصدِ اُلفت

کیا مرے حُسنِ دلاویز پہ تو مرتا ہی
شعلہ رُوئی پہ مری جان فدا کرتا ہی
یہ اگر سچ ہی تو جا مجھ سے محبت مت کر
نگہِ عشق رُخِ مہرِ جہانتاب پہ ڈال
حُسنِ ہمیشہ کو جس کے نہ اجل ہو نہ زوال

کم سنی پہ مری مائل ہی طبیعت تیری؟
حُسنِ نو خیز سے وابستہ ہی اُلفت تیری؟
یہ اگر سچ ہی تو جا مجھ سے محبت مت کر
تیری اُلفت کے ہی قابل رُخِ زیبائے بہار
جس پہ ہر سال نیا حُسن نرالا ہی نکھار

چاہتا ہی مجھے تُو کیا مری دولت کیلئے
دل ہی بیکل ترا میرے زر و حشمت کیلیے
یہ اگر سچ ہی تو جا مجھ سے محبت مت کر
چاہیے تجھ کو کرے بحرِ گہر خیز سے پیار
جس کے انمول جواہر کا نہیں کوئی شمار

پیار مجھ سے ہی تجھے کیا مری اُلفت کیلئے
دل ہی پروانہ ترا شمعِ محبت کیلئے
یہ اگر سچ ہی تو کر مجھ سے محبت پیارے
بہتر از مہر و بہاران دل شیدا مرا
بحر میں بھی نہیں ایسا گہرِ مہر و وفا

(ماخوذ)

نیرنگ

جنگل کی اندھیری رات

وہ اندھیری رات وہ جنگل وہ آفت کی ہوا — اور اسمیں سنسناتے ہوئے کچھ بے نوا
دیکھ کر سب کو اسی جنگل میں پیڑوں کا وجود — جن کے قائل ہیں مسلماں - دیو کے قائل ہنود
ہڈیاں بوسیدہ اپنی آگ بھڑکانے لگیں — واہمے کو خوف کی شکلیں نظر آنے لگیں
عقل کو مغلوب کر کے وہم غالب آگیا — فہم کی آنکھوں پہ ہیبت کا اندھیرا چھا گیا
وہم موجد شکل کا ہی اور صورت گر دماغ — کھینچتا ہی اس کا نقشہ خوف سی مل کر دماغ
خوف نیچر سے اگر پائے نہ دل انسان کا — غیر ممکن ہو خود انساں سے تحفظ جان کا
صرف جرأت ہی اگر ذی روح لائے خلق میں — ہو کے وہ بیخوف اکثر چوٹ کھائے خلق میں
کس کو کس کو کوئی سمجھائے کہ ڈر کچھ بھی نہیں — ایک صورت سامنے ہی تو - مگر کچھ بھی نہیں
واہمہ رکھتا ہی انساں میں وجود داخلی — اسکو خارج میں صفت خلاق ہونیکی ملی
لوگ جسکو غول کہتے ہیں وہ فرضی نام ہی — آتش افروزی پرانی ہڈیوں کا کام ہی
خاک میں ملجاتی ہی آخر کو خاکِ استخواں — اڑ کے آگ اپنے کرے کی سمت ہوتی ہی رواں
آئی اس جانب سی وہ سن سن ہوائے ہولناک — لائی اپنے ساتھ کانوں تک صدائے ہولناک
یہ صدا کس کی ہی جس سی کانپ اٹھا پہلو میں قلب — کر دیا جسکے اثر نے قوتِ جرأت کو سلب
اسکی صورت ہو گی کیسی جسکی یہ آواز ہی — دل تو کہتا ہی صدائے شیر کا انداز ہی
آگئی بنکر صدا - مل کر ہوائے بیشہ میں — شیر کی شکل مجسم دیدۂ اندیشہ میں
شیر آتا ہی کہ آواز آتی جاتی ہی قریب — شکل آفت یا مقدر - مرگِ غربت یا نصیب
پرشکن رخ سے دکھاتا ہی وہ جب شانِ غضب — خود غضب میں مبتلا ہو جاتی ہی جانِ غضب
زرد دانتوں کی وہ ہیبت نیلگوں آنکھوں کا رنگ — ناخنوں سے قبضۂ قدرت میں سب سامانِ جنگ

اِس اندھیرے میں بھی شکل اُسکی دکھاتا ہی خیال
وُہ کہیں اور اِس کا نقشہ کھینچ لاتا ہی خیال

اُس کی ہیبت ناک صُورت پھرتی ہی آنکھوں تلے
اُسکے دانتوں سی دبینگے ہم غریبوں کے گلے

دیکھو دیکھو میری بچّی کانپتی ہی خوف سے
کرکے آنکھیں بند مُنہ کو ڈھانپتی ہی خوف سے

بھوکھ سی روتا ہی بچّہ خوف سے سہما ہُوا
ہوگیا اندھیر جنگل میں۔ اندھیرا کیا ہُوا

ہی تو سب کچھ لیکن اِس جنگل میں ہُوں محتاج میں
چین بچّوں کے لئی لاؤں کہاں سی آج میں

قدرت اِس ظلمت کے پھیلانے پہ کیوں مائل ہوئی
کیوں زمیں مہر و نظر کے بیچ میں حائل ہوئی

پھٹ پڑی ظلمت زمیں گردش میں ہو یا آسماں
اب تو اپنی گردشِ قسمت کا رونا ہی یہاں

پھر رہی ہی میری آنکھوں میں نہیں کی سی چمک
شیر کی آنکھیں دکھاتا ہی ستاروں سی فلک

بانٹنا ممکن ہوا و نیچر جو ایسے مال کا
دُوں میں اِن بچّوں کو اک جزو اپنے استقلال کا

کیسی وحشت آشکارا ہی صدائے بوم سے
وہم خود مجبور ہی اِس خطرہ موہُوم سے

بُوم نے شاید کیا چھوٹی سی چڑیا کا شکار
پیڑ سے "چیں چیں" کی آواز آرہی ہی بار بار

وُہ ٹٹیری[۵] بول اُٹھی ۔ نکلا ہی کوئی جانور
خوف سے لنگور غل کرنے لگے ہیں پیڑ پر

بونک اُٹھا سامر ضرور اسکو نظر آیا ہی شیر
بال بچّے ساتھ میرے ہیں ہُوں گو میں دلیر

اسلحہ سی ہاتھ خالی ہیں لیکن کیا کروں
دِل مرا روتا ہی اسوقت شیر کیا کروں

کیا سوا اِن ناخنوں کے پاس میری ہی یہاں
شیر کے ناخن کہاں انسان کے ناخن کہاں

شیر سے بڑھکر ہی مجھ کو سانپ اور بچھو کا ڈر
وُہ نہ بولینگے ۔ نہ آئینگے اندھیرے میں نظر

سَن سے وُہ چڑیا جو نکلی میری بوٹی ڈر گئی
ظلم اندھیرے میں پروں کی سنسناہٹ کر گئی

وُہ گرل[۵] لڑتے ہیں شاید ہڈیوں پر جنگ ہی
کس قدر یہ جانور کم بخت بد آہنگ ہی

---

[۵] ٹٹیری کا بول اُٹھنا ۔ لنگوروں کا غل کرنا ۔ سامر کا بونکنا یہ سب کو جنگل میں شیر کے نکلنے کی سچی علامتیں ہیں +

[۵] گرل ایک جانور ہی ۔ اودھ میں اسکو گِرل کبسر گاف ورا ۔ اور ممالکِ متوسط میں زرخ کہتے ہیں +

وہ اُدھر سے آئی "کُوں کُوں" اور "ہو ہو" کی صدا
تیندوا یا شیر شاید سُون[۵۱] کتوں میں گھرا

گیدڑوں کا غل اِدھر ہے لومڑی کا شور اُدھر
یہ اِدھر چھینکا[۵۲] چکارا۔ بول اُٹھے وہ مور اُدھر

ریچھ وہ بولا۔ بشر سے اس ستمگر کو ہے کد
اسکی صورت بھی ہے اور اسکی سیرت بھی ہے بد

ہو کے دو پاؤں سے اِستادہ اُلجھ پڑتا ہے یہ
شور کر کے ناخنوں کے زور سے لڑتا ہے یہ

بس نہیں چلتا ہے آنکھوں کا کہ ہے منظر سیاہ
ڈالدی ظلمت نے دن کے نور پر چادر سیاہ

مہر اوپر تو نہیں زیرِ زمیں اب ہو تو ہو
ہم سے پنہاں اور مُلکوں میں کہیں اب ہو تو ہو

نور سے اس وقت ظلمت کو جو زائل کر سکے
مجھ کو نیچر مہر کی رجعت کا قائل کر سکے

ظلمتِ شب سے ہوئے شاید پریشاں سب نجوم
خوف سے مغرب کی جانب ہیں گریزاں کچھ نجوم

کیا ہوا اگر قطب استقلال میں مشہور ہے
اُس میں قوت ہی نہیں رفتار سے مجبور ہے

لاتی ہے شاخوں کو جنبش میں ہوا کس زور سے
کیا پریشاں کرتے ہیں پیپل کے پتے شور سے

چھیڑتی ہے۔ خشک پتوں کو اُڑاتی ہے ہوا
کھڑکھڑاتے[۵۳] ہیں جو انکو کھڑکھڑاتی[۵۴] ہے ہوا

جانور کے پاؤں کی آہٹ نہ مجھ تک آئیگی
وُہ تو ان پتوں ہی کی آواز میں دب جائیگی

آج میرے ساتھ بیوی اور بچے کیوں ہوئے
ساتھ آنا تھا تو ایسے دل کے کچے کیوں ہوئے

یہ تحمل کر سکیں اتنا کہاں ان کا دماغ
کم ہے ان میں عقل بھی کم وزن ہے جنکا دماغ

کہتی ہے بیوی کہ ٹوٹا دیکھنا نجمِ فلک
یا چلا شیطان پر یہ آتشیں گُرزِ ملک

وُہ تصور عورتوں کا ہے یہ مُلا کا خیال
ٹوٹنا تارے کا۔ چلنا گرز کا۔ دونوں محال

نجم کس سے لڑ پڑا کیونکر شکست اسکو ملی
اُڑ سکا کس طرح شیطاں کا وجودِ دخلی

---

۵۱ جنگلی کتے۔ سُون کتے ہی کہلاتے ہیں۔ بجنسہٖ کتے ہیں مگر سب ایک ہی رنگ اور ایک ہی شکل کے۔ یہ فرد فرد نہیں رہتے بلکہ انکا غول رہتا ہے۔ اور جانور درکنار شیر بھی ان کے غول میں پڑ کر مشکل سے بچ سکتا ہے۔

۵۲ چکارے کی فطرت میں ہے کہ جہاں رات کو اُسے کچھ شک ہوتا ہے۔ فوراً چھینک کی سی آواز دیتا ہے۔ اُس آواز کو شکاریوں اور صحرائیوں کی اصطلاح میں چھینکنا ہی کہتے ہیں۔

۵۳ یہاں کھڑکھڑانا لازمی کے معنی دیتا ہے۔ یہ مصدر لازمی بھی ہے اور متعدی بھی۔ ۵۴ یہاں کھڑکھڑانا متعدی کے معنی دیتا ہے۔

یُونہی روشن کرتی ہیں بچوں میں مائیں نام جہل
پختہ کرتی ہیں دماغ خام میں اوہام جہل

عورتیں ماہیتِ اشیاء سے ہیں بے خبر
علم کیا کہتا ہے۔ انکو کچھ نہیں اس پر نظر

اوج پر لیجاتی ہے اجزائے ارضی کو ہوا
جل کے آتش کے کُرے سے ہوتے ہیں وہ شعلہ زا

بعض میدانوں میں ان شعلوں سے کچھ تھے گرے
تھے کثیف اجزائے ارضی منجمد ہو کر گرے

لے۔ وہ بولا بیدوا۔ ظالم اِدھر ہی آ نہ جائے
دو یہ ٹکڑے میرے دل کے ہیں نہ انکو کھا نہ جائے

کوٹھری کاجل کی ہے اسوقت یہ جنگل نہیں
تیرے پاس او آسماں کیا چاند کی مشعل نہیں

کچھ ہیں شمعیں جگنوؤں کی نیم تاب اور دور دور
نور پر ظلمت کبھی غالب کبھی ظلمت پہ نور

آتے ہیں اُڑ اُڑ کے شپّر سامنے کے پیڑ پر
پیڑ شاید پُر ثمر ہے اور پکتے ہیں ثمر

ہے گراں کانوں کو انکے غل مچانیکی صدا
وحشت افزا ہے پروں کے پھڑپھڑانیکی صدا

اور آفت پر ہوئی آفت گھٹا بھی چھا گئی
ایک تھی ہی دوسری کالی بلا بھی آ گئی

برق تڑپے اسطرح پھر اس پہ کڑکے اسطرح
ڈر سے آنکھیں کیوں نہ جھپکیں دل نہ دھڑکے کسطرح

بادلوں کو اے ہوا اسوقت تو لائی ہے کیوں
پھر اُنہیں ٹکرا کے بجلی اُن سے چمکائی ہے کیوں

رعد بنکر تو جو گرجی گم ہوئے انکے حواس
مجھ سے بچہ۔ ماں سے بچی دونوں لپٹے ہیں جو پاس

ننھے ننھے اِن کے دل۔ انکی ابھی ہستی ہے کیا
ڈرتے ہیں جس شے سے اس شے کو یہ سمجھے ہیں کیا

دیکھ کر جگنو کو البتہ بہل جاتے ہیں یہ
"پکڑو پکڑو انکو" یہ کہکر مچل جاتے ہیں یہ

کوئل اُڑتی۔ بولتی۔ وہ جا رہی ہے اس طرف
پھر کے اس جنگل میں وقت اپنا وہ کیوں کرتی تلف

ہو نہ ہو آموں کا کوئی باغ ہے جنگل کے پاس
کیا تعجب ہے جو اُترے ٹھیک یہ میرا قیاس

باغ اگر ہوگا تو رکھوالے بھی ہونگے۔ آم بھی
حفظ کا سامان بھی کھانے کو بھی۔ آرام بھی

چل کھڑے ہوں ہم اُسی جانب مگر ممکن نہیں
یہ ہے جنگل اور اندھیری رات ہے۔ کچھ دن نہیں

ملک کوہی کیا عجب ہے ہو پہاڑی راہ میں
ہر قدم پر ہوگی دامن گیر جھاڑی راہ میں

سخت مشکل ہے نہ چلتے اور نہ رہتے بن پڑے
کیا مصیبت ہے نہ چلاتے۔ نہ سہتے بن پڑے

آتی ہے صرف ایک ہی صورت تحفظ کی نظر ۔۔۔ لے کے بیوی اور بچوں کو میں بیٹھوں پیڑ پر

لیکن اس ظلمت میں ایسا پیڑ پاؤں کس طرح ۔۔۔ فرض کر لوں یہ کہ "پایا" تو چڑھ پاؤں کس طرح

میں بڈھا بھی ہوں تو یہ عورت ہے - تھمنا ہے محال ۔۔۔ جسم کا سدھنا کٹھن - پاؤں کا جمنا ہے محال

نیند بیشک آئیگی مجبور ہے اس سے بشر ۔۔۔ یوں گرینگے پیڑ سے سب جس طرح ٹپکیں ثمر

تیندوا اور شیر دونوں دور ہو لیے - کٹ گئے ۔۔۔ ہے ہماری عمر ابھی باقی کہ ظالم ہٹ گئے

آج ہے شوال کی تاریخ اٹھائیسویں ۔۔۔ رات پوری ہے اندھیری - چاندنی مطلق نہیں

یہ اندھیری ہے تو کیا اور چاندنی ہوتی تو کیا ۔۔۔ بچ نہیں سکتی ہیں جانیں گر نہ حافظ ہو خدا

اب تو یہ شب کاٹنی ہے صبح کی امید پر ۔۔۔ شوق سچ کہتے ہیں سب - ہے زندگی امید پر

احمد علی - شوق - قدوائی

مایوس

ایک انگریزی نظم کا ترجمہ

نصف شب اور اس پہ کالی رات ۔۔۔ ماہِ قمری کی ہے ہلالی رات

چار سو ہے سیاہی چھائی ہوئی ۔۔۔ ہے شبِ تار رنگ لائی ہوئی

سارا عالم ہے خواب میں مدہوش ۔۔۔ باسفورس میں ہے نرالا جوش

لہریں پانی کا راگ گاتی ہیں ۔۔۔ موجیں اُٹھ اُٹھ کے دف بجاتی ہیں

سطح دریا پہ ہے ہمارا جہاز ۔۔۔ ہے تلاطم سے محوِ ناز و نیاز

موجیں لوری سنا رہی ہیں اُسے ۔۔۔ لہریں جھولا جھلا رہی ہیں اُسے

ننھے ننھے وہ خوشنما تارے ۔۔۔ چھوٹے چھوٹے وہ دلربا تارے

وہ ہمیں دیکھ کر ہیں دور سے خوش ۔۔۔ ہم اندھیرے میں انکے نور سے خوش

صاف پانی کی چادرِ مہتاب
دلِ مضطر کو کرتی ہے بیتاب

اس پہ تاروں کی خوشنما وُہ جھلک
گویا دُنیا پہ دوسرا ہی فلک

تہ میں لیکن ہر اک چھپا موتی
خوشنما اور بے بہا موتی

جس کو پایا نہیں کسی نے بھی
جس کو دیکھا نہیں کسی نے بھی

جس کی صُورت کو دیکھنے کیلئے
بحر میں سینکڑوں ہی ڈوب مرے

اس کو قبضے میں کوئی لا نہ سکا
شکل اس کی کوئی بتا نہ سکا

اُسے ملتا ہے وُہ نیا موتی
دلپذیر اور دلربا موتی

جو کہ حسرت نصیب دل رکھے
جو مصیبت نصیب دل رکھے

جسکو راحت سے ہو گیا پرہیز
جس کے غم کا پیالہ ہو لبریز

جسکو دُنیا بھی قیدخانہ ہو
دشمن اس شخص کا زمانہ ہو

سمجھے جینے کو موت سے بدتر
زندگی کو بسر کرے مرکر

نام ہے اس کا خود فراموشی
اسکے ملنے سے ہو سبکدوشی

اس کو لہروں نے ہی چھپا رکھا
اس کو موجوں نے ہی دبا رکھا

بیوقوفوں نے سینکڑوں غوطے
اپنی دیوانگی سے گرچہ کئے

پہ بجز رنج کچھ ملا نہ انہیں
ان کی کوشش نے کچھ دیا نہ انہیں

یہ سبب تھا کہ غم نصیب نہ تھے
اپنی مانند الم نصیب نہ تھے

آہ! اتنے میں کوئی کُود پڑا
شور موجوں میں ہوگیا برپا

رَو نے آخر دبا لیا اس کو
بدنصیبی نے آ لیا اس کو

بیکس و مضطر و خدائی خوار
تھا نہنگِ قضا سے وُہ دوچار

اِتنے میں آئی چیخ کی آواز　　　رُوحِ بیکس کی کرگئی پرواز
گویا موتی کو جا لیا اُس نے　　　مقصدِ دل کو پا لیا اُس نے
چھا گئی اس کے بعد خاموشی　　　وہی دریا وہی تھی تاریکی

محمد عبدالعزیز شوق

ناکامِ آرزو

آغازِ آرزو ہو کہ انجامِ آرزو　　　ہیں آرزو کے ساتھ ہی آلامِ آرزو
ہیچ آرزو و ہیچ تر انعامِ آرزو　　　کچھ مجھ سے پوچھ میں بھی ہوں ناکامِ آرزو
اے ہمنشیں نہ لیجیو پھر نامِ آرزو

مجھ پر چلا ہوا ہے کسی کا فسوں ابھی　　　یادِ طلسمِ کہنہ میں ہوں سرنگوں ابھی
بھولے نہیں ہیں دل سے لبِ لعل گوں ابھی　　　ہیں سرگراں خمارِ شبینہ سے ہوں ابھی
ساقی! نہیں ہے آرزوئے جامِ آرزو

ارمانِ دل وہ درد ہے جس کی دوا نہیں　　　حسرت وہ زخم ہے جو کسی سے بھرا نہیں
وہ کون ہے جو اس پہ چڑھا اور گرا نہیں　　　وہ کون ہے جو اس سے گرا اور مرا نہیں
ہر چند کچھ بلند نہیں بامِ آرزو

اے چارہ گر تو میرے مرض سے ہے بیخبر　　　پہلے تو جا کے وہم کا اپنے علاج کر
مجھ کو نہ ضعفِ دل ہے نہ کمزوریٔ جگر　　　ہوتا ہے دم مرا نہ ادھر اور نہ کچھ ادھر
میں نیم جاں ہوں کشتۂ صمصامِ آرزو

کیا ولولے تھے جب ہوسِ بازدید تھی　　　کیا جوش تھے جو حسرتِ گفت و شنید تھی

میرے نفس نفس میں صدائے نوید تھی | اُف! کیسی دل فزا مری صبحِ اُمید تھی

جا نکلا اس سے بڑھ کے ہر اک شامِ آرزو

وہ انتظارِ فصلِ بہاری کی کلفتیں | وہ برق و باغباں کے ستم کی شکایتیں

دورِ خزاں کی وہ دلِ پُرغم پہ آفتیں | صیاد! میں نے دیکھی ہیں لاکھوں مصیبتیں

تڑپا ہوں نہ مجھ کو تہ دامِ آرزو

کب تھا میں شمعِ مردہ کی مانند سوگوار | اک آگ میرے دل میں بھڑکتی تھی شعلہ وار

وہ جوشِ اشتیاق و تمنائے بیقرار | وہ دن بھی تھے کہ تھا ہمہ تن چشمِ انتظار

سنتا تھا ذوقِ شوق سے پیغامِ آرزو

پہلو میں دل ہے یوں مرا جیسے پڑا ہوا | سو جائے جیسے کوئی مسافر تھکا ہوا

اے برق! تجھ سے خوب مرا عقدہ وا ہوا | شاخِ مراد جل کے گری فیصلہ ہوا

پروان چڑھ چکا ثمرِ خامِ آرزو

ہاں ہمنشینِ حسرتِ مرحوم کون ہے؟ | کل شب سے نالہ ریز نہ معلوم کون ہے؟

مجھ کو بتا یہ شاعرِ مغموم کون ہے؟ | کیا پوچھتے ہو دوستو محروم کون ہے؟

ہے اک فریب خوردہ ایامِ آرزو

تلوک چند محروم

عشقِ ہندی و لعبتِ چینی

مپرس ای ہمدمِ دیرینہ از دردِ نہانِ من | کہ سرتاسر بود آشفتگی را داستانِ من

مگو از موج و کشتی کاضطراب و دلِ زارم | مخوان از برق و خرمن کاتشِ عشق ست جانِ من

من و خو کردگی با غم، تو گوئی عشق ما دارد | دلم با لذتِ دردو فلک با امتحانِ من

بسودائے محبت گر بپرسی - فنا الّم بنگر
وگر از جوہرِ غم دم زنی - اینک روانِ من

منم بر خوانِ عشق آں میہمانِ غم فراوانی
کہ خوردن را نیابد جز غمِ من میہمانِ من

غمِ عشقم ازل زاد است. لیک آہ از غمِ عشقم
کہ ہست آبستنِ جہاں غمِ عشقے از آنِ من

خوشم ناید سوادے جز سوادِ زلفِ نکویاں
بود ایں ظلمت آبادِ ہندوستانِ من

ز عشقِ گلرخانِ ہند دارم داغہا در دل
خوشا گل کردہ در پہلو بہارِ بوستانِ من

کنوں ہر چند از ہندوستاں فرسنگہا دورم
مگر یادِ بتانش ہست وردِ ہر زبانِ من

بخاکِ ہند و خوبانش کہ نیرنگِ جنون است ایں
کہ دور افگندہ از ہندم دلِ وحشت نشانِ من

بسوئے ملکِ چیں از مقتضائے عشق رو کردم
کہ تا تنہا نباشد آسماں یا رسانِ من

نہادم دل بسیرِ کشورِ چین و ندانستم
کہ باشد چینِ پیشانی ز مانعِ معنیانِ من

بہ چین رخت افگندم کہ تا زیبائے گل چینم
ز فریاد آرسید اینجا درائے کاروانِ من

نظر بازی نمودم وقفِ حسنِ لعبتانِ چین
شد آخر لعبتے از لعبتانش دلستانِ من

ربود از پہلوم دل نو نگارے ماہ رخسارے
نگاہش با ہمہ کوتاہ[1] چشمی مہربانِ من

نظر ہا باہمش - لیک آہ از ناسازیِ طالع
زبانہا مختلف - صد خندہ آرد بر فغانِ من

اگر ہم بزمِ او باشم بجز حیرت نیفزاید
بمن حسنِ کلامِ او - باو طرزِ بیانِ من

اشارتہائے شوق انگیزِ او اسرار گوئی او
نیازِ اضطراب آمیزِ من افسانہ خوانِ من

کہ و کو راز داں؟ تا رحمت آرد بر منِ گرد
بہ نزدم ترجمانِ او بہ پیشش ترجمانِ من

عجب مشکل کہ رازِ عشق گفتن بر نمی تابد
کہ گردد رازِ من ظرف آزمائے رازدانِ من

میسّر نیست پرسش اے دریغا احکامِ سخن کوتہ
بود ایں شعر با اندک تصرف[2] بر زبانِ من

زبانِ شوخِ من چینی و من چینی نمی دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

---

[1] اہلِ چین کی آنکھیں علی العموم (والنادر کالمعدوم) چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔
[2] اندک تصرف یہ کہ حضرت طوطیِ ہند علیہ الرحمہ کے شعر میں لفظ ترکی ہے

گلِ خزاں دیدہ

خوشا! وہ دن کہ میں آرائشِ صحنِ گلستاں تھا
خوشا! وہ دن کہ میرے فرق پر تاجِ زرافشاں تھا

خوشا! وہ دن کہ شوقِ جامہ زیبی تھا گلستاں میں
شمیمِ ناز سے میرا معطر جیبِ گریباں تھا

بہارِ جلوۂ حسنِ ازل تھا پردۂ گل میں
وہ جگنو تھا کہ کاشانہ فروزِ صحنِ بستاں تھا

نگاہیں بلبل و گلچیں کی بڑھ کے مجھ پہ پڑتی تھیں
بہارِ حسن تھی۔ جوشِ شبابِ فتنہ ساماں تھا

صبا گہوارہ جنباں۔ نغمہ گو بانگِ عنادل تھی
مرا چھوٹا سا بسترِ خوابِ آسائش کا ساماں تھا

فضائے لالہ و ریحان و گل پریوں کی محفل تھی
نسیمِ صبح کا جھونکا جو تھا تختِ سلیماں تھا

شمیمِ خلد اترائی ہوئی پھرتی تھی گلشن میں
ہر اک گل اک طلسمِ جلوۂ نیرنگِ امکاں تھا

ترنم ریز تھا شاخوں پہ میری طائرِ سدرہ
چمن کا میرے دست آموز اک مرغِ غزلخواں تھا

جوابِ خطۂ کشمیر میرا کنجِ دلکش تھا
بہارِ سبزہ و گل تھی۔ ہجومِ سرو ریحاں تھا

ادھر سنبل کو تھا ناز اپنے گیسوئے مسلسل پہ
ادھر نرگس کو گلشن میں غرورِ چشمِ فتاں تھا

کلی دوشیزہ ناکتخدا اک تھی گلشن میں
شگوفہ جو چمن میں تھا۔ عروسِ گل بداماں تھا

موافق مجھ سے تھی آب و ہوائے دہر اے ہمدم!
صبا تھی عطر آگیں۔ ابرِ رحمت گوہر افشاں تھا

نہ تھا یوں منتشر شیرازۂ جمعیتِ اجزا
برنگِ بو نہ جھونکوں میں ہوا کے یوں پریشاں تھا

ارم خانہ تھا مجھ کو آہ! کنجِ دلنشیں میرا
زمیں پر یوں نہ سیلی خوردۂ ریگِ بیاباں تھا

نہ یوں الجھے ہوئے تھے خارِ صحرا میرے دامن سے
نہ یوں ڈوبا ہوا خوں میں ہر اک تارِ گریباں تھا

گلِ خنداں تھا میں بھی باغِ عالم کے مرقع میں
نہ میں حسرت کا پتلا تھا۔ نہ میں تصویرِ حرماں تھا

نہ یوں نالہ کشِ بیتابیِ دل تھا بیاباں میں
نہ یوں شکوہ طرازِ گردشِ آشوبِ دوراں تھا

کہاں لائی اڑا کر آہ! تو بادِ خزاں مجھ کو
کہیں خارِ مغیلاں تھے۔ کہیں غولِ بیاباں تھا

یہ افسانہ ہے گل کا - کیا کہوں اے ہمنشیں تجھ سے
چمن میرا وطن تھا - میرا کاشانہ گلستاں تھا

بہارِ عالمِ نیرنگ تھی ہر رنگ میں میری
نہ تھا معلوم رنگِ انقلابِ دہر پنہاں تھا

شگفتہ کھل گئی - دورِ خزاں آیا جو گلشن پر
نہ تھا غازہ رخِ گل رنگ پر خونِ شہیداں تھا

ضیائے ہستیِ موہوم - موجِ شعلۂ حس تھی
شبابِ فتنہ زا دو چار دن کا آہ مہماں تھا

مرا حسنِ تعیش سوز تھا رقصِ شرر گویا
چمن میں میں گلِ شمعِ سرِ گورِ غریباں تھا

طلسمِ بے ثباتِ دہر تھا رنگِ بقا میرا
بساطِ گوشۂ مرقد مری ہستی کا میداں تھا

تحیر زا تھا منظر آہ! اک اک باغِ ہستی کا
وجودِ عالمِ امکاں - مگر خوابِ پریشاں تھا

[illegible]

آج!

کتنی امیدیں لگا رکھی تھیں ہم نے آج پر
ایک بھی پوری ہوئی ہو کیا! انہیں میں سے مگر

جلوہ گاہِ دہر میں آغوشِ فردا میں ہیں ہم
آنے والی کل کی بزمِ تمنا میں ہیں ہم

ہم سے رخصت ہو گئی جو یا کہاں تھی کل
اور جو ہے آنے والی دوستو وہ بھی ہے کل

ملتی ہیں یہ دونوں کل جس نقطۂ موہوم پر
یوں تو کہنے کو اسے ہم آج کہتے ہیں مگر

ہے وہ نقطہ ہے کہ ہے معدومیت کا اک نشاں
جلوۂ برقِ فنا ہے اس کی ہستی کا بیاں

یعنی اہلِ ہندسہ کا نقطۂ موہوم ہے!
ہے جگہ اس کی مقرر یہ مگر معدوم ہے!

نزع کے عالم میں ہو جیسے کوئی خستہ جگر
اور لگی ہو چھت کی جانب پُر حسرت نظر

یوں ہیں آئندہ کے منظر پر نگاہِ انتظار
ٹکٹکی باندھے ہوئے رہتی ہے ہر دم بیقرار

آہ! اس حسرتکدے میں ہم وہ ہیں حرماں نصیب
چپکے چپکے آنے والا وقت آتا ہے قریب

اور یوں چھوڑ کر نکل جاتا ہی ہم کو ناگہاں — چھوکے دامن جیسے ہوجائے ہوا۔ بادِ خزاں

تیزیِ رفتار میں ہی آہ! سرعت کس قدر — دیکھتے ہی دیکھتے رہ جاتی ہی حیران نظر

اگلی "کل" میں جا کے مل جاتا ہی یوں گویا نہ تھا!

خواب تھا عبرت فزا۔ بھولا ہوا افسانہ تھا!

"آج" کہتے ہیں جسے ہم جانیوالی ہی گھڑی — وہ گھڑی ہیں یعنی "کل" کی آنیوالی ہی گھڑی

یہ وُہ ساعت ہی کہ جو ہر دم ہی سرگرم گریز — کوئی طاقت کر رہی رفتار کو ہی اسکی تیز

جانیوالی "آج" کی گھڑیوں کو دیکھیں ہم اگر — ہم کو اپنی عُمر کی سرعت ہی آ سکتی نظر

وُہ مسرت خیز آنیوالی گھڑیاں خوشگوار — جن کی آمد کا رہا کرتا ہے ہم کو انتظار

شاذ و نادر آہ! اوّل تو وُہ آتی ہیں قریب — اور جو آتی ہیں تو ہوجاتی ہیں رخصت یوں غریب

آہ! اُنکے لُطف کی رہ جاتی ہی حسرت ہمیں!

وقت دیتا ہی ہم آغوشی کی کب فرصت ہمیں!

"آج" کا پیشِ نظر ہی آہ! حصّہ جس قدر — کچھ نہ پُوچھو ہم سے عبرت خیز ہی وہ کسقدر

لحظہ لحظہ میں ہی مضمر اک طلسمِ انقلاب — لمحہ لمحہ ہی محیطِ دہر میں نقش بر آب

ہی یہ قانونِ تبدّل بھی عجب حیرت فزا — شعبدہ ہی یعنی اِک اِک وقت کا عبرت فزا

ہم نگاہِ غور سے ہر "آج" کو دیکھیں اگر — آنے والی دوسری ساعت ہی اک پیشِ نظر

"آج" ہی خلوت میں ہم تھے ہمکنارِ آرزو — "آج" ہی پہلو میں ہوتا ہی فشارِ آرزو

"آج" ہی کا واقعہ وُہ آہ! ای غمخوار تھا — جبکہ دستِ شوق گردن میں کسی کی ہار تھا

اور مَل کر رو رہے ہیں دستِ حسرت "آج" ہی!

روزِ وصلت "آج" ہی تھا۔ روزِ فرقت "آج" ہی!

شاکر میرٹھی

باسی ہار

آج جس دم صبح کو مرغِ سحر نے دی صدا
آنکھ میری کھُل گئی میں اپنے بستر سے اُٹھا

تھا سُہانا وقت چلتی تھی نسیمِ مُشکبو
اور ہی کچھ اس گھڑی تھی باغِ عالم کی ہوا

از سرِ نو پڑ گئی تھی عالمِ فانی میں جان
پر صدائیں آ رہی تھیں شب کا سنّاٹا نہ تھا

نیند پوری ہو چکی تھی جمع تھے ہوش و حواس
ہاتھ مُنہ دھو کر برائے سیر میں گھر سے چلا

تھے ابھی تک میرے دل میں خوابِ شیریں کے خیال
کر رہا تھا غور اُن پر تھا عجب اُن کا مزا

جا رہا تھا میں اسی حالت میں پہنچا اک جگہ
بام کے نیچے جہاں سے آ رہی تھی اک صدا

تھی عجب آوازِ دلکش اُٹھ گئی میری نظر
اپنے دل کو تھام کر میں غور سے سُننے لگا

ہار کچھ باسی پڑے تھے اک طرف دیوار پر
با زبانِ حال می کردند این مطلب ادا

دیدۂ عبرت سے دیکھیں سب ہمارا حالِ زار
پہلے کیا تھے ہم ہماری قدر کیا تھی اب ہیں کیا

باغباں کی کوششوں سے اور اُمیدوں کے ساتھ
پہلے کلیوں سے ہوئی شاخوں میں اپنی ابتدا

پیارے پیارے خوبصورت خوشنما غنچہ تھے ہم
تھا گماں ہر ایک کو ہم پر دہانِ یار کا

سادگی کے ساتھ سبزی اور سفیدی ہم میں تھی
سبز و خامی نورِ آنکھوں کی صباحت دلربا

تھی قیامت سادگی سو شوخیاں جس پر نثار
تھی کلی یا سیم تن دوشیزۂ ناکتخدا

تازگی اُس کی چمک گلگونۂ روئے شباب
دیکھنے والوں کے دل سے پوچھیے اُس کا مزا

موسمِ گُل کے سبب سے تھا نمو ہر چیز میں
اس لئے لحظہ بہ لحظہ اپنا قد بڑھتا گیا

دستِ گلچیں خود بخود جنبش میں آئے دیکھ کر
یہ ہماری خوشنمائی نے اثر پیدا کیا

مالیوں نے قدر دانوں کے لئے توڑا ہمیں
اپنی شاخوں سے جُدا ہونا نہایت شاق تھا

خشک ہوجاتے اگر ہوتا نہ کوئی قدرداں — خیر قصہ مختصر اُس نے ہمیں یکجا کیا

رشتۂ اُلفت میں ہم سب اک جگہ گُوندھے گئے — لطف یکجائی جو پہلے تھا وہی حاصل ہوا

حُسن خوبی خوشنما ترتیب جب آئی نظر — بوسے لینے کو بڑھی مس شوق سے باد صبا

کھل کھلا کر ہنس پڑیں کلیاں مہک پیدا ہوئی — کھل کے ہر غنچہ دہانِ یار کی صُورت کھلا

جن کا غنچہ نام تھا اب اُنکو گل کہنے لگے — ہوگئے وُہ تھوڑی ہی مدّت میں کچھ کیا کیا

خوشنما پہلے سے تھے بو ہاں اب پیدا ہوئی — دلفریب دلرُبا تھے ہوگئے فرحت فزا

ہو چکے تھے حسن انسانی سے واقف باغ میں — ہم میں سے نرگس نے دیکھا ہم سے سوسن نے کہا

تھا حسینوں تک پہنچنے کا نہایت اشتیاق — خوبی تقدیر سے آخر ہمیں موقع ملا

مول ہم کو لے لیا اک نوجواں نے دیکھ کر — عشق اور جوشِ جنوں جسکے گلے کا ہار تھا

تھا ضرورت سے زیادہ شاد یہ رنگین مزاج — کہ رہا تھا صاف ہنسنا بے سبب ہر بار کا

تھا عیاں اُس کی نگاہوں سے بلا کا اشتیاق — سامنے کیا پیاری اُمیدوں کا تھا نقشہ کھنچا

خانۂ دل محشرِ صد حسرت و صد آرزو — حسرتوں کے مضطرب ہونے سے وہ بےچین تھا

تھا وُہ نوشہ پہلی شب تھی گھر میں آئی تھی دلھن — وُہ عروس مہ لقا تھا حُسن خود جسپر فدا

ہر طرف جوشِ مسرت ہر جگہ جوشِ طرب — اہتمامِ جشن ہر سو اور چرچا عیش کا

وُہ شبِ ماہتاب و تاروں کی کم کم روشنی — ہو نہیں سکتی زباں سے اُسکی کیفیت ادا

بام تھا خلوت کدہ حسرت نکلنے کی جگہ — تھی دلھن اس پر عروسِ مہ جبیں خود بام تھا

جتنی چیزیں تھیں وہاں سب سادہ سادہ پاک صاف — واہ کیسا صاف فرش پر تو مہتاب تھا

ایک ہلکی سی مسہری اس پہ اک زہرہ جبیں — سرو قامت سیمتن گل پیرہن نازک ادا

تھا عرق اسکی جبیں پر شرم سے آنکھیں تھیں بند — شوخیوں سے بھی زیادہ دل رُبا طرزِ حیا

اُس پسینہ سے کھلا تھا اور بھی رنگ شباب — ایک تو کندن پھر اُس کندن پہ اک تازہ جلا

اُف وہ اُس کا حُسن اُس کی کمسنی اُسکا شباب — دل مسلنے کے لئے جوبن وُہ گدرایا ہوا

رہتی قامت کی اعضا کا تناسب بے بدل
ہو گئیں آنکھیں لب نگیں رُخ نازک دست و پا

پھر تھی اُس حُسن پر وہ شرم اُسکی خامشی
سحر تھی نیرنگ تھی افسوں تھی ہر اسکی ادا

اس سمی کو دیکھ کر ہر ایک شے بیتاب تھی
لوٹنا بیجا نہ تھا کچھ پرتو مہتاب کا

جی میں آتا تھا کہ خود اُڑ کر گلے میں جا پڑیں
اتنے میں وُہ نوجواں ہم کو جو لایا تھا اٹھا

پہلے دیکھا رُوئے گلگوں کی طرف پھر شوق سے
لے لیے دو چار بوسے اور ہمیں پہنا دیا

سب سے پہلے ہم ہوئے اُس گلبدن سے ہمکنار
سب سے پہلے ہم نے لوٹا اُسکے جوبن کا مزا

مل گئی بوئے عروسی سے ہماری بھی مہک
منتشر خوشبو ہوئی فردوس کا در کھلگیا

زینت آغوش تھے ہم اور سینے کی بہار
رنگ تھا اپنا کہ سونے میں سہاگا ہوگیا

ہمکناری کی کشاکش نے کئی کیا کیا ستم
دب گئے پس پس گئے ہم پر نہ کچھ منہ سے کہا

بھول جائے لاکھ کوئی یاد ہوگا یاد کو
کیا ہوا برتاؤ ہم سے اور ہم نے کیا کیا

رات بھر ہم نے اٹھایا لطف جب آئی سحر
اور ہم میں سے ہر اک کمہلا گیا مل دل گیا

توڑ کر پھینکا ذرا پروا نہ کی اس بات کی
یہ گلے کا ہار تھا اسکو جدا ہم نے کیا

وُہ تو کہئے خادمہ نے قدردانی اتنی کی
اپنے جوڑے سے لپیٹا یہ کرم ہم پر کیا

الغرض خوشبو رہی جب تک ہماری قدر تھی
ہم ہیں یہ بیکار ہے کوئی نہیں اب پوچھتا

ہائے دیکھے تھوڑی ہی مدت میں کیا کیا انقلاب
رنگ ہی تغیر ہے اس عالمِ ایجاد کا!!

خشک ہو جائینگے بالکل جب رہیگی سخت دھوپ
آنیوالا وقت بد ہے اور بھی بڑھ کر سوا

گر پڑینگے خاک پر مل جائینگے ہم خاک میں!!
ہونیوالا ہے یہی اک دن نتیجہ عیش کا

تازہ غزلیں

محمد ارتضیٰ علی شہیر

کیا لکھے عاشقِ بیتاب حقیقت دل کی
جی بگڑتا ہے جو لکھتا ہے عبارت دل کی

جو رہی اور کوئی دم یہی حالت دل کی
آج ہی پہلوئے غمناک سے رخصت دل کی

نہیں ممکن ہے لُٹیروں میں حفاظت دل کی — پھر آؤں اُنہیں حل کر میں امانت دل کی
گھر چھُپا - شہر چھُٹا - کوچۂ دلدار چھُٹا — کوہ و صحرا میں لئے پھرتی ہے وحشت دل کی
غمِ دلدار ہے خواہاں تو حوالے کر دے — تجھ کو اے عاشقِ بیتاب ضرورت دل کی
بنگیا نافِ سویدا گرہِ چرخِ کبود — سینہ تنگ ہیں اللہ یہ وسعت دل کی
تم گلستانِ جہاں میں گلِ یکرنگ ملے — کان لاؤ تو سُنا دوں میں حکایت دل کی
کوچۂ یار میں گھبرا کے نکلنا کیسا تھا — دل کو ہے شکوہ مرا مجھکو شکایت دل کی
مُنہ خفا ہو کے بنا لیتے ہو اتنے کے لئے — ایک بوسہ میں نکل جائیگی حسرت دل کی
دل کو چھیدے ہُوئے نکلا جو کہیں تیر ترا — دل کے ساتھ آج نکل جائیگی حسرت دل کی
مہندی مَل کے مرے سینے کو جو پامال کیا — دل کے ساتھ آج نکل جائیگی حسرت دل کی
اب کسی یار سے مطلب ہے نہ اغیار سے کام — کنجِ عُزلت میں رہا کرتی ہے صحبت دل کی
دیکھ لیتے تھے اسی طرح کسی کو اُس میں — آئینہ دیکھ کے یاد آتی ہے صورت دل کی
پہلوے عاشقِ غمناک میں اک آبلہ ہے — اُنکو کیا کہتے جو رکھ دیتے ہیں تہمت دل کی
ہے ہر اب اُسکے تصوّر کو جگہ دوں کس میں — بیدلی میں کبھی بڑھ جاتی ہے حاجت دل کی
دیکھئے آنکھوں میں جالے پڑے روتے روتے — اب تو چھن چھن کے نکلتی ہے کدورت دل کی
راستہ چھوڑ دیا اُس نے اِدھر کا آسی — کیوں بنی رہگذرِ یار میں تربت دل کی

نہ ہے سیرِ صحرا نہ گلگشتِ باغ — رہا جب نہ دل تو رہے کیا دماغ
امیری فقیری کا ہے ایک حال — زمانے میں حاصل ہے کس کو فراغ
نجانوں کبھی دل بھی تھا یا نہ تھا — مجھے تو یہی اک نظر آیا داغ
بہت حسرت افزا ہے شمعِ مزار — بجھایا مجھے جب جلایا چراغ
مجھے جی کا کھونا ہوا اب ضرور — کہ گم گشتہ دل کا نہ پایا سراغ
اُٹھائیں نہ کیا کیا پشیمانیاں — رہا دوستی کا نہ مجھکو دماغ
ہے وحشت مجھے ماتمِ مرگِ قیس
یہی اک تھا صحرا کا چشم و چراغ

رضا علی وحشت
کلکتہ

مخزن

مشرق و مغرب

(۲)

اقتضاء فطرت ہی کہ انسان دو متحد النوع اشیاء کو دیکھ کر اُن کا موازنہ شروع کر دیتا ہی جس کے لئے اُسے کسی مستقل عزم و ارادہ کی حاجت نہیں ہوتی۔ اور بسا اوقات اسی موازنہ سے مفید مطالب کا بھی استنباط کر لیتا ہی۔ اسی اصول پر ایک علمی تاریخ جاننے والے شخص کا ذہن جب وہ علوم کی ارتقائی تاریخ کے مسئلہ پر غور کرتا ہی، عہدِ عباسی اور یورپ کے دَورِ تراجم کے موازنہ کی طرف بھی از خود رجوع ہو جاتا ہی۔ لیکن اس موازنہ کی مخصوص اہمیت اُسے توجہ خاص سے بے نیاز نہیں رہنے دیتی چنانچہ وہ موازنہ کا معیار ذیل کے مقدمات کی ترتیب سے قائم کرتا ہی:-

(۱) دونوں دَوروں میں سے جس کی تمہید میں تصنیف و تالیف پر بہ نسبت نقل و ترجمہ زیادہ اہتمام کیا گیا۔

(۲) خوشہ چینی کے لئے جس کا دامنِ نیاز زیادہ وسیع نہیں ہوا،

(۳) اور جس میں شروع سے مترجمین و نقالوں کا شمار بمقابلہ مصنفین و مؤلفین کم رہا

(۴) جس میں اجتہاد و استقرار پر زیادہ مدار رہا: وہی دَور یقیناً مہتم بالشان اور معرکۃ الآرا کہلانے کا زیادہ مستحق ٹھہریگا۔

مقابلہ کی اس میزان پر جب ہم دونوں دوروں کو رکھتے ہیں، تو صاف نظر
آتا ہی کہ عربوں نے جس قدر استفادہ* اضعافاً مضاعفہ ہی۔ یعنی عربوں نے تھوڑا
میٹریل لیکر اُسے بہت پھیلایا، اور اُس میں وُہ وُہ نکتہ نوازیاں اور موشگافیاں
کیں کہ جس سے یونانی علوم و فنون کو شرم آنے لگی، بخلاف اس کے اہل مغرب
نے عربوں سے مادہ بہت لیا، لیکن عرصہ دراز تک اسی پر قناعت کرتے
رہے، جس کا خلاصہ آپ اس کے پہلے نمبر میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

اہل فرنگ نے جس قدر کتابیں عربی سے بواسطہ عبرانی۔ قشتالی یا بالراست
لاطینی زبان میں ترجمہ کیں۔ اُن کی فن وار فہرست دیکھئے:-

نمبر	فن	کتب مترجمہ
۱	فلسفہ و طبعیات	۹۰
۲	ریاضی و نجوم	۷۰
۳	طب	۹۰
۴	کیمیا وغیرہ	۴۰
		۲۹۰

اس کے ساتھ ہی اگر عربوں کا یونانیوں سے استفادہ دیکھنا ہو تو اس فہرست
کی تنصیف کر دیجیے۔ علیٰ ہذا مترجمین کے شمار و تخمینہ کی فہرست بھی اسی نسبت
سے مرتب کیجاتی ہی۔

عہد عباسی کے کل مترجمین کا شمار ۳۰ کیا گیا ہی۔ درآنحالیکہ مغربی مترجمین
کی فہرست میں پچاس سے زیادہ نام درج ہیں۔

عہد جدید نے جن مشرقی علما کے مخلوقات فکر سے اپنا کاشانہ علم
آباد کیا، وُہ اُن یونانی علما سے جن کے علمی دُرِ ناسُفتہ کو عربوں نے
گوہر شاہوار بنا دیا، وُہی نسبت رکھتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئی۔ یعنی عربوں نے

* یونانی علوم و فنون سے کلیۃً اسکے مقابلہ میں اہل فرنگ کا عربوں سے استفادہ ۶

اگر دو یونانیوں سے نقل و ترجمہ کی نسبت پیدا کی، تو اہلِ فرنگ نے دو اور دو چار عربوں سے، یورپ کی ترجمہ شدہ کتابوں کے باب میں جو شخص تفصیلی معلومات کا خواہاں ہوگا، وہ سرسری تحقیقات سے ہمارے اوپر کے بیان و شمار سے اتفاق نہ کریگا، لیکن جب وہ یورپ کی اس موٹی چال کو سمجھ لیگا کہ اس نے اُن تمام کتابوں کو جو عربوں نے یونانی زبان سے ترجمہ کیں، عربی سے ترجمہ کرکے اُن کے اصلی مؤلفین کی طرف منسوب کیا، جس سے نقل النقل کا دھبہ اُن پر نہ لگے۔ اور دیکھنے والا اُنہیں اصل کی نقل سمجھے تو یہ راز آشکارا ہو جائیگا اور ہر صاحبِ نظر آسانی سے ہمارے بیان کی تصدیق کریگا،

یورپ کے اس مُدرِسانہ طرزِ انتساب نے اُس طبقہ کی جس سے ترجمہ و نقل کے غیر مادی طریقہ سے اُس نے سندِ علمیت حاصل کی، دو تقسیمیں کردیں۔

ایک وہ جن سے بواسطہ علمائے شرق یورپ نے استفادہ کیا،

دوسرے وہ جن سے اُنہوں نے بالراست یا بلا واسطہ استفادہ کیا،

جن میں سے چند مشاہیر کے نام ذیل میں بقیدِ فنِ استفادہ ہم درج کرتے ہیں،

۱۔ فلسفہ۔ کندی۔ قسطا ابن لوقا، فارابی، ابن سینا، غزالی، ابن رشد، ابن ماجہ، ابن طفیل، ابن جبرئیل، حنین ابن اسحاق، سرخسی وغیرہم۔

۲۔ ریاضی و نجوم۔ ثابت ابن قرہ، اولادِ موسیٰ، خوارزمی، ابن ہیثم، فرغانی، بتانی، جابر ابن افلح۔ بزوجی، ابن صفار، قبیصی، زرقالی، وغیرہم۔

۳۔ طب۔ سرابیون اکبر، سرابیون اصغر، ماسویہ اکبر، اصغر، رازی، ابن جزار، زہراوی۔ علی ابن عباس، عیسیٰ ابن علی، ابن سینا، ابن زہر، اسحٰق اسرائیلی، ابن بطلان۔ ابن جزلہ، وغیرہم۔

نوعِ اول کے لوگ جن میں ارسطو۔ افلاطون۔ بقراط۔ جالینوس۔ اقلیدس

ارتمیدس، وغیرہ شامل ہیں، اور اُنکی تصانیف جن کے ترجموں کا ترجمہ یورپ میں ہوا، اس حیثیت سے کہ اُن کا انتساب اُنہیں کی طرف کیا گیا۔ ہماری بحث سے خارج ہیں، اِس لئے اُن کے قلم انداز کرنے کی ہم ناظرین سے معافی چاہتے ہیں۔

لیکن نوع ثانی، یعنی وُہ اربابِ کمال جن کے نام سے آپ اوپر واقف ہو چکے ہیں، جن کے وُہ دماغی و ذہنی انکشافات وطبعزاد معارف جو یورپ کے علمی قالب کے لئے روحِ رواں ثابت ہُوئے۔ اُن کی تفصیل غالباً ناظرین کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگی، لہذا ذیل میں ہم اُن مستندات وجوامع کی فہرست بقیدِ اسم مولف ومترجم درج کرتے ہیں، جو مشتے نمونہ از خروارے کا مصداق ہو۔

نمبر شمار	نام کتاب	مولف	مترجم
۱	السمع والبصر	کندی	گریمونی
۲	غایہ	"	"
۳	الاحکام	"	"
۴	التوحید	"	"
۵	الاسباب المختلفہ	"	نامعلوم
۶	مستقبل المعرفہ	"	"
۷	خصائص العناصر	فارابی	"
۸	السمع الطبیعی	"	گریمونی
۹	المنطق	"	"
۱۰	مطلع العلم	"	گندبسالفی
۱۱	اقسام الفلسفہ	"	نامعلوم

نمبر شمار	نام کتاب	مولف	مترجم
۱۲	العلوم	فارابی	گریمونی
۱۳	العقل والمعقول	"	نامعلوم
۱۴	الکیمیاء	"	"
۱۵	الحاری	رازی	فراغوٹ
۱۶	المنصوری	"	گریمونی
۱۷	الضوء	"	"
۱۸	الاقسام	"	"
۱۹	المدخل فی الطب	"	"
۲۰	الاغذیہ	رازی	"
۲۱	علل المفاصل	"	نامعلوم
۲۲	امراض الجلد	"	"
۲۳	الترياق	"	"
۲۴	الجدری والحصبہ	"	"
۲۵	القانون	ابن سینا	گریمونی
۲۶	قلب الانسان	"	فیلنوف
۲۷	الارجوزہ فی الطب	"	ارمنکو
۲۸	الشراب	ابن سینا	باغوس
۲۹	النفس	"	اشبیلی
۳۰	مابعد الطبیعہ	"	کوندیسالفی
۳۱	الطبیعیات	"	"

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف	مترجم
۳۲	السماء والعالم	ابن سینا	کوندیسالفی
۳۳	مختصر الحیوان	"	سکوٹ
۳۴	التحریفات	"	مجہول
۳۵	الکیمیاء	"	"
۳۶	الحجر الفلسفی	"	"
۳۷	الحدود	"	"
۳۸	المنطق	"	"
۳۹	الفلسفۃ الاولی	"	"
۴۰	الکلیات	ابن رُشد	ارمنکو
۴۱	شرح ارجوزہ ابن سینا	"	"
۴۲	الادویہ المفردہ	"	ماین
۴۳	التریاق	"	مجہول
۴۴	السموم	"	"
۴۵	شرح السماء والعالم	"	سکوٹ
۴۶	النفس	"	"
۴۷	القوی الطبیعیہ	"	"
۴۸	الوجم	"	"
۴۹	المجسطی	ثابت ابن قرہ	"
۵۰	الاوزان	"	"
۵۱	ترکیب الدوائر	"	"

نمبر شمار	نام کتاب	مولف	مترجم
۵۲	التصوّر	ثابت ابن قرہ	اشبیلی
۵۳	السیارات	"	مجہول
۵۴	الثوابت	"	"
۵۵	التقارب والتباعد	"	"
۵۶	الدائرۃ المثمنہ	"	"
۵۷	التناسب	"	"
۵۸	احکام النجوم	ماشاء اللہ	اشبیلی
۵۹	احکام القرانات والممازجات	"	"
۶۰	الاسطرلاب	"	مجہول
۶۱	الدّائرہ	"	گریمونی
۶۲	البول	اسحق اسرائیلی	قسطنطین
۶۳	الحُمّیات	"	"
۶۴	العناصر	"	گریمونی
۶۵	الاغذیہ	"	"
۶۶	الحدود	"	"
۶۷	الجراحہ	زہراوی	"
۶۸	الرق	"	سمحان الجوی
۶۹	النظر والعمل	"	مجہول
۷۰	التصریف	"	"
۷۱	الملکی	علی ابن عباس	قسطنطین

نمبر شمار	نام کتاب	مؤلف	مترجم
۷۲	تقویم الابدان	ابن جزلہ	فراغوٹ
۷۳	الصحہ	ابن بطان	ـ
۷۴	تذکرۃ الکحالین	عیسیٰ ابن علی	مجہول
۷۵	التیسیر	ابن زہر	بنا فینوش
۷۶	البسائط	سرا بیون	سمعان الجوی
۷۷	صناعہ جالینوس	ابن رضوان	گریمونی
۷۸	الکتب الاربعہ	ـ	فونس صاحب قشتالہ کے ایما سے اسکا ترجمہ ہوا
۷۹	الزیج	خوارزمی	ادبار الباطی
۸۰	الطبیعہ وما بعدھا	الغزالی	کوندیسالفی
۸۱	المدخل	خوارزمی	ادبار الباطی
۸۲	الجبر	ـ	کریمونی
۸۳	الهندسہ	اولاد شاکر	ـ
۸۴	ینبوع الحیاۃ	ابن جبریل	کوندیسالفی
۸۵	حرکات النجوم	البستانی	طیبوری
۸۶	مائۃ مسئلہ	ـ	مجہول
۸۷	القانون	ـ	ـ
۸۸	الجبر	ابوکامل شجاع	گریمونی
۸۹	الاسطرلاب	ابن الصفار	مجہول
۹۰	للمثلثات الکرویہ	جابر ابن افلح	ـ
۹۱	النصرانیہ والاسلام	البروجی	سکوٹ

نمبر شمار	نام کتاب	مولف	مترجم
۹۲	المدخل فی النجوم	قبیصی	اشبیلی
۹۳	الشفق	ابن ھیثم	گریمونی
۹۴	الحُمّیات	ماسویہ	مجہول
۹۵	الجراحہ	"	فراغوٹ
۹۶	الایساغوجی	حنین	مجہول
۹۷	المختصر	سرابیون	گریمونی
۹۸	المنطق	سرخسی	مجہول
۹۹	النفس والروح	قسطا ابن لوقا	اشبیلی
۱۰۰	النجوم	فرغانی	گریمونی
	وغیرہ	وغیرہ	

یہی وُہ بعض علمی نایاب جواہر ہیں جنہیں یورپ نے عربی کے سلیقہ شعار مصنفین جوہریوں سے لیا، اور انہیں نمائشگاہِ عالم میں رکھکر شہرت دی۔ قدردانی کے ہاتھوں میں جو چیز دی گئی تھی، وُہ اب تک زمانہ کے سفاک ہاتھوں سے محفوظ رہی، چنانچہ یورپ کے بڑے بڑے مخازن کتب مثلاً (پیرس۔ اکسفورڈ۔ کیمبرج۔ برلن۔ لندن۔ فینا۔ رومیہ۔ منشن کے کتبخانے) آج بھی ان علمی گرانبہا خزانوں سے مالا مال ہیں، اور مرحلہ پیما شائقین کی خاطر ان شاہدانِ علم کے روشن چہرہ سے نقاب برداری کے لئے تیار ہیں۔

جوشِ قدردانی و اعتراف عظمت و استناد نے بعض کتابوں کو مکرر سہ کرر یورپ کی مختلف زبانوں کے قالب میں نمودار کیا، مثلاً قانون ابن سینا کتاب النجوم فرغانی۔ حاوی الم الرازی۔ تیسیر ابن زہر اور دیگر مبسوط و

معرکۃ الآرا تصانیف شیخ الرئیس ابن سینا۔ ابونصر فارابی۔ ابن رشد ایسے ہیں جن کے یورپ کی دو چار زبانوں (انگلش۔ فرنچ۔ طالی، المانی) ترجمہ ہوئیں۔ لیکن اُن میں سے بعض عربی نسخے امتدادِ زمانہ کی تاریکی میں ناپید ہوگئے۔ اس افسوسناک گم گشتگی کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابلِ افسوس ہو کہ ضابطینِ اخبار کی لاپروائی و عدمِ احتیاط سے اکثر جیّد مؤلفین کے ناموں نے ایسی محرفہ صورت اختیار کرلی ہو کہ اصل سے بالکل مخالف یا بعید الفہم ہوگئے ہیں، ہم ثبوت میں چند نام معہ انگلش کی محرفہ صورت کے پیش کرتے ہیں، ع "ببیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بکجا"

۱۔ ابو الحسن ابن بطلان Ellchasen Ellimatar
۲۔ ابو القاسم ابن علی الموصلی Canamusali.
۳۔ ابن وافد Eben Guefith.
۴۔ ابن زُہر Avenzoar.
۵۔ ابن جبریل Avicebron.
۶۔ ابن ماجہ Avenpace.
۷۔ ابن ہیثم Alhacem.
۸۔ ابو معشر بلخی Aboumasar.
۹۔ ابو اسحاق النقاش الزرقالی Arzachel.
۱۰۔ الرازی Rases.
۱۱۔ ابو القاسم زہراوی Abulcases.
۱۲۔ ابن رُشد Averroes.
۱۳۔ ابن سینا Avisenne.
۱۴۔ الغزالی Algazel.

۱۵- ابن داؤد ———— Avendout.

باز آمدم بر سرِ مطلب (یہ ایک معترضہ بحث تھی) موازنہ کے ۳ مقدم الذکر اجزاء پر پوری روشنی پڑ گئی، جس سے غالباً اس مسئلہ کی کماحقّہ توضیح ہو گئی ہوگی کہ عربوں نے یونان سے اتنا استفادہ نہیں کیا جتنا اہلِ فرنگ نے عربوں سے کیا، جس کا لازمی نتیجہ ذہنی مقدمات کی ترتیب سے یہ نکل سکتا ہے، کہ آغاز ترقی ہی سے عربوں کے دماغی و ذہنی مطلع پر روشنی پیدا ہو گئی تھی، جو بات یوروپ کو مدتوں بعد جاکر حاصل ہوئی۔ جو موازنہ کے چوتھے جزو کا منشا ہے یہ بیان کرنا نقل واقعہ ہے کہ عربوں نے علوم کے اختراعی میدان میں جو جوہر دکھائے اور جس سلیقہ سے اُنہوں نے اس میں قدم رکھا اُس کی نظیر نہیں، یہ اُنہیں کا دل و دماغ تھا کہ اپنی حیرت خیز منطق سے جزئیات میں کلیات کی شان پیدا کر دی، جنہیں ملیں تو مختصر سی کتابیں، لیکن انہیں سے اپنی جدت آفرینی و قوتِ اجتہاد و استدلال کے زور پر فنون کو مدوّن کیا، علمی دُنیا اب تک ایک سنگلاخ و سنسان وادی کی مثال تھی، جسے شیریں چشموں، سرسبز و شاداب مرغزاروں، اور نغمہ خوان بلبلوں سے ایسا گلزارِ ارم بنایا، کہ اس میں جنّت کی ہوائیں آنے لگیں۔ قدما کے سرمایہ ناز علوم و فنون میں ایسے مضامین تراشے، نکتہ نوازیاں کیں کہ زمانہ نے اگلوں کو فراموش کر دیا، اگلا عروج، پستی، اور اوج، حضیض نظر آنے لگا،

جن فنون نے سے ذوق کو زیادہ ممارست ہوئی۔ اُن کے کشت زاروں میں تو یہ ابر ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ جن سے تا قیامت علمی زراعت بالیدگی و نشو و نما میں بے نیاز نہیں ہو سکتی،

الغرض جس علم یا فن کو عربوں نے لیا، اُسے تحقیق و تدقیق کے عرشِ اعلیٰ پر پہنچا دیا، جس کے بعد کوئی دماغی و اجتہادی درجہ باقی نہ رکھا۔ اربابِ نظر کے دِل سے اُن کی اس معنوی عظمت کا نقش کبھی نہ محو ہوگا۔

دراصل یہی چوتھا جزو اس موازنہ کی جان ہی، جو تفوق و امتیاز کا جواہر نگار تاج عربوں کے سر پر رکھتا ہے۔ اور اس طریقہ سے اس موازنہ میں عہدِ عباسی کے مقابلہ میں یورپ کا علم و کمال وزنی نہیں ٹھہرتا،

مجملاً جو ہمیں کہنا تھا، اُس کے لئے یہ چند فقرہ بس ہو سکتے ہیں، لیکن اس بات پر پہنچکر اگر ہم اُس ضروری بحث سے گریز کریں تو معلومات کا خون ہوگا، اور شریعتِ تاریخ میں ہم گنہگار ٹھہرینگے۔ جس نے علماء عصرِ جدید اور قدیم عالمانہ عظمتوں کے معترفین کے درمیان یہ اختلافی مسئلہ چھیڑ کر بحث میں ایک خاص فلسفیانہ اہمیت پیدا کردی ہی، کہ آیا؟ علوم جدیدہ بصورتِ موجودہ بھی مشرقی علوم کے خوشہ چین کہے جا سکتے ہیں، یا مشاہدہ والرای بالعین کی طرح انہیں جدت پسند دماغوں کے مخلوقات فکر ہیں۔ جنکی آج علمی دُنیا میں سکہ رانی ہی۔ اور ہر ہر فریق اپنا اپنا نغمہ سُنا تا ہی۔

ہمیں اُمید ہی کہ اس بحث کی بساطت کے خیال ناظرین بھی اسے آیندہ پر اُٹھا رکھنے سے ہمارے ساتھ متفق ہونگے۔ اور آیندہ اس سے دلچسپی بھی لینگے ؎

عاشقاں راہمہ آئینِ عمل خواہد گشت
ماجرائے کہ میانِ من و تو خواہد بود

باقی آیندہ

جواد علی خان عالی

حکمتِ عملی

ہندی کی مثل ہے "سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے" نون نفی بیچ میں خوب آیا ہے۔ چاہے اِدھر سمجھ لو چاہے اُدھر۔ چاہے دونوں طرف۔ معنی تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن مصداق کسی صورت میں مفقود نہیں ہوتا۔

پہلی صورت یوں ہوئی "سانپ مرے نہ۔ لاٹھی ٹوٹے" یعنی سانپ کا نام سنتے ہی بے اوسان ہو کے جھپٹے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ رکھ کے جو دوہتّی دیتے ہیں تو لکڑی کے دو اور سانپ کو خبر نہیں۔ یہ کیفیت اُن لوگوں کی ہوتی ہے جو بے سوچے سمجھے ہر کام کے کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

دوسری صورت ہے "سانپ مرے۔ نہ لاٹھی ٹوٹے" یعنی ہاتھ پاؤں سنبھال کے موقع کو دیکھ بھال کے ایک ہی ہاتھ ایسا ٹھکانے کا لگایا کہ سانپ وہیں اُلٹ گیا اور نہ لکڑی ٹوٹی نہ ہاتھ میں جھٹکا آیا۔ اس کو حکمتِ عملی کہتے ہیں اور اس مثل کا اصل مطلب بھی یہی ہے۔ گو عوام النّاس اکثر بے محل استعمال کرتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے "سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے" یعنی ہاتھ میں لکڑی ہے سانپ سامنے سے چلا جا رہا ہے آپ الگ کھڑے اِنّھم یکیدون کیدا[1] پڑھ رہے ہیں ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ اسکو پست ہمتی کہتے ہیں۔ بعض آدمی ہر کام اور ہر مشکل کے وقت اپنے تئیں دبے[2] ہوؤں میں شمار کر لیتے ہیں

[1] بعض خوش اعتقاد مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آیہ اِنّھم یکیدون کیدا و اکید کیدا پڑھ کر پھونک دینے سے سانپ کیل جاتا ہے یعنی نہ بھاگ سکتا ہے نہ چوٹ کرتا ہے۔ [2] دبے ہوئے کا اشارہ اُس مثل کی طرف ہے کہ ایک شخص کاہل الوجود ہر کام سے جی چُراتا تھا۔ ایک روز اُس کی بیوی نے کہا یوں پڑے پڑے

چوتھی صورت ایک اور ہو سکتی ہے۔ بالنفی "سانپ مرے پر لاٹھی ٹوٹے" یعنی سانپ کو تو مار لیا لیکن اِدھر لکڑی کا فیصلہ ہوا اُدھر گھی کا مرتبان شہید ہوا۔ اسکو بے ڈھنگا پن کہتے ہیں۔ ایسے آدمیوں سے کام کو کہ کے بھی پچھتانا پڑتا ہے۔

یہ چار صورتیں کارکنی یعنی اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی ہیں۔ اسی طرح چند صورتیں کارفرمائی یعنی کام لینے کی ہیں۔ بعض آدمیوں کو کام لینے کا ڈھنگ ایسا اچھا آتا ہے کہ رستہ چلتے سے کام لے لیں اور اُسے ناگوار نہ گذرے اسکو بھی حکمت عملی کہتے ہیں۔ زمانے کی ایسی کایا پلٹی ہے کہ الفاظ کے معنی اور اِصطلاحات کا مفہوم بھی بدل گیا۔ حکمتِ عملی دغابازی کو کہنے لگے۔ انگریزی کے ندیدوں نے عملی اور نظری سے الگ ایک اور حکمت نکالی ہے اور اُسکا نام پالسی رکھا ہے (لام موقوف۔ بروزن پالکی) وجہ تسمیہ یہ قرار دی ہے کہ ایسی کارروائی کیجائے جیسی پولیس والے مجرموں کی گرفتاری اور سزا دلانے کی غرض سے عمل میں لاتے ہیں حالانکہ خود لفظِ پولیس کے معنی محکمہ انتظامی اور پالیسی کے معنی حسنِ انتظام ہیں۔ پالیسی کہو یا حکمتِ عملی مُدعائے اصلی جو ہے وُہ یہ ہے:۔

به رفق و مدارا و لطف و خوشی
توانی که پیلے به مُوئے کشی

اگلے لوگوں کا اس پر بہت ہی عمل تھا۔ صدہا نہیں ہزاروں مثلیں اسی اصول پر مبنی تھیں اور اب تک کام آتی ہیں۔ تین چار برس ہوئے ملک بندیلکھنڈ کے ایک قصبے میں مجھ کو چند روز قیام کا اتفاق ہوا۔ مَیں جس مکان میں مقیم تھا اُسکے سامنے ایک کھاتے پیتے برہمن کا گھر تھا۔ تھا تو کچا لیکن صاف ستھرا۔ اُجلی نئی کھپریل۔ سیدھی صاف دیواریں۔ پنڈول کی دودھیا صندلی رنگت سے آنکھوں میں ٹھنڈک آتی تھی۔ شہروں میں گلی کے لڑکے استرکاری کا ناس

کر دیتے ہیں - ایک اِس سرے سے چلا تو چیکے سے کنکری اُٹھا کے اُس سرے تک برابر لکیر کھینچتا چلا گیا - دُوسرا اُدھر سے آیا تو ذرا نوکدار سی ٹھیکری دیکھ کے لیتا آیا - دیوار سو کھنے نہیں پاتی کہ سارے ہندوستان کی ریلوں کا نقشہ اُتر آتا ہی - محلّے والوں کے ساتھ مالکِ مکان کا برتاوٴ معلوم کرنا ہو تو کچھ کسی سے پُوچھنے کی ضرورت نہیں - اُسی دیوار پر جا بجا مختصر جُملے لکھے ہوتے ہیں - گاؤں کے لڑکے ایسے شریر کم ہوتے ہیں اور اُن کا مذاق بھی کچھ اَور ہوتا ہی - اور بات یہ بھی ہی کہ چونا گچی کی دیوار پر لکیریں کھینچنے میں جو مزا آتا ہی وُہ مٹّی کی دیوار میں کب آسکتا ہی - غرض یہ کہ مہاراج کی دیوار لڑکوں کی طبع آزمائی سے محفوظ تھی اور سِیوائے جا بجا اُنگل چھلّے گیرو کے ٹھپکے کے کسی قسم کا داغ دھبّا نہیں تھا - یہ معلوم ہوتا تھا کہ سال میں کئی دفعہ سارا گھر لیپا جاتا ہی - سامنے ہی مکان کا دروازہ تھا کواڑ کُھلتے تھے تو ڈیوڑھی میں بھی ایسی ہی صفائی نظر آتی تھی - اس مکان میں بارہا دیکھنے کا اتفاق ہُوا کہ صبح کے وقت ایک عورت ڈیوڑھی میں بیٹھی یا چوکھٹ پر کھڑی ہی اور جو عورت باہر سے آتی ہی پہلے اِس کے قدم چھوتی ہی اس کے بعد اندر جاتی ہی - انسان کیسا ہی بیوقوف کیوں نہ ہو اپنی عقل کو کامل اور رائے کو صائب جانتا ہی - میں نے بھی کسی سے پُوچھا نہ زیادہ غور کیا اپنے دِل میں سمجھ لیا کہ گھر کی بڑی بُوڑھی ہی ہو گی جس طرح ہمارے یہاں سلام کرنے کا رواج ہی ان کے یہاں پاؤں پُوجا کا دستور ہو گا - برہمنوں میں سلام کی جگہ کہتے بھی پالاگن ہیں - گئی گذری بات ہُوئی پھر کچھ خیال بھی نہ رہا - ایک روز دیکھتا کیا ہُوں کہ بڑی بُوڑھیاں اپنے سے چھوٹی کے پاؤں پڑ رہی ہیں - اب کوئی صاحب اس پہیلی کو بُوجھیں میں نے تو بہت سوچا کوئی وجہ معقول ذہن میں نہ آئی - آخر اُس برہمن کو

بُلایا۔ دوچار اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے پُوچھا مہاراج یہ تمہارے یہاں کیا رسم ہی؟ مہاراج کو یقین تھا کہ پُوچھنے کا سبب پردیسی کی ناواقفیت ہی۔ اعتراض یا تحقیر کا شُبہ ہوتا تو جواب میں تاویل و تامل کا اندیشہ تھا۔ مہاراج نے نہایت خوشی سے اپنی بندیلکھنڈی زبان میں میرے سوال کا جواب اس طرح دیا کہ صبح کے وقت جب سب عورتیں اپنی روزمرہ کی ضرورت سے باہر جاتی ہیں تو ایک نہ ایک گھر میں بھی رہ جاتی ہی اور سارے گھر کی جھاڑو بہارو کر کے زمین پر اور تھوڑی تھوڑی دیواروں پر پوتا پھیر دیتی ہی نہیں تو گھر رات کا جھوٹا پڑا رہ جائے۔ جب تک وُہ عورتیں جنگل تالاب سے فراغت ہو کے لوٹیں گھر بھیتر سے باہر تک چندن ہو جاتا ہی۔ تو صاحب ہمارے یہاں کا قاعدہ یہ ہی کہ جب تک اُس صفائی کرنے والی کے پاؤں نہ چھولیں اس کی لیپی ہُوئی زمین پر قدم نہیں دھرتے۔ اتنا سُنتے ہی بیساختہ دل میں خیال آیا کہ حکمتِ عملی اسی کا نام ہی۔ لیپنا پوتنا ذرا مشکل کام ہی۔ خاصکر جاڑے میں لیکن پاؤں پُوجا کے لالچ سے سب عورتیں خوشی خوشی کرتی ہونگی۔ نئی دُلہن جو گھونگٹ نکالے سارے کام کرتی ہی اور ساس نندوں کے طعنوں پر گھونگٹ ہی میں مُنہ بناتی ہی لیپنے پوتنے کے کام کو وُہ بھی دوڑتی ہوگی تھوڑی دیر کو تو گھر کی رانی بنجاتی ہی۔ ساس نندیں دیورانیاں جٹھانیاں چاہے دن بھر مُنہ سے نہ بولیں مگر صبح ہی صبح پاؤں تو ضرور پڑجاتی ہیں۔

تشفی کے واسطے مہاراج کا اتنا جواب کافی تھا لیکن مَیں نے سوچا کہ دیکھوں مہاراج جی کو خود بھی اس پاؤں پُوجا کی حکمت معلوم ہی۔ تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد مَیں نے کہا ہاں تو پھر مہاراج ایسا کیوں ہوتا ہی؟ اس پر مہاراج کچھ کھسیانے سے ہو کر بولے کہ صاحب کیوں تو ہم جانتے نہیں

بڑوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ سب باتوں کی کیوں تو وہ جانے جو مڈل پڑھا ہو۔

یہ دُوسرا مڈل کا لطیفہ بھی خاصہ معنی خیز تھا۔ واقع میں تھوڑا علم بہت خطرناک ہوتا ہے۔ خصوصاً فلسفہ منطق طبیعات وغیرہ۔ جہاں ذرا شدہ بُدہ ہُوئی ہر بات کی علّت دریافت کرنے لگے جو اپنی عقل میں آگئی تو ٹھیک ورنہ فضول بلکہ غلط۔ اِس سے تو بالکل بے علم آدمی بھلا کہ اُس سے کہدیا یہ مُبارک ہے یہ منحوس ہے۔ اِس سے برکت ہوتی ہے اس سے نیستی۔ یہ اچھی بات ہے یہ بُری۔ بس کافی ہے۔ ہر بات کی حکمت ہر شخص کے ذہن نشین کون کرسکتا ہے۔ اِس لئے اگلے لوگوں نے اپنے تجربوں کا نتیجہ صرف امر و نہی کی صورت میں بیان کردیا کہ یہ کام کرنا چاہیئے یہ نہ کرنا چاہیے۔ اسی امر و نہی کا نام کہیں مبارک و منحوس رکھدیا۔ کہیں اچھی بات بُری بات۔ غور سے دیکھا جائے تو اصولِ معاشرت حفظِ صحت تہذیب اخلاق وغیرہ وغیرہ سبھی کچھ ان اقوال و امثال میں بھرا پڑا ہے۔ مَیں تو کہتا ہُوں جاہلوں کے ٹوٹکے ٹونے بھی حکمت سے خالی نہیں۔ یہ اَور بات ہے کہ بعض صُورتوں میں جہالت شامل ہوگئی ہے۔ ہم روزمرّہ اپنے گھروں میں ہزاروں ایسی باتیں دیکھتے سُنتے ہیں۔ لیکن توجہ نہیں ہوتی۔ ایک فقط مکان کی صفائی کے متعلق بیسیوں کہاوتیں مشہور ہیں۔ مثلاً "رات کو جھاڑو نہیں دیتے" بظاہر یہ ایک بیوقوفی اور جہالت کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر نہیں اس میں بھی مصلحت ہے۔ رات کے وقت چھلّا انگوٹھی پتّہ بالی دوانی چونّی کا نظر آنا مشکل ہے۔ جھاڑو میں چلا جانا آسان۔ صبح ہی کُوڑے کے ساتھ حلال خوری کے ٹوکرے میں گئی۔ "پردیسی سدہارے ہیں جھاڑو نہ دو" ظاہر ہے کہ سفر

کی تیاری میں چھوٹی بڑی چیزیں بار بار کھلتی بندھتی ہیں۔ ایک آدھ رہ بھی جاتی ہے۔ پھر سب کے دل مغموم و پریشان ہوتے ہیں۔ یہ حالت بھی کچھ رات کی تاریکی سے کم نہیں ہوتی۔ اِسی طرح ہر کام اور ہر محل کے متعلق ہزاروں مقولے ہیں۔ خدا فرصت دے تو یہ کام بھی اچھا ہے کہ پُرانی مثلوں کہاوتوں اور بڑے بوڑھوں کی نصیحتوں کی چھان بین کرکے اُن کی حکمتیں بتائی جائیں۔ اہلِ یورپ نے تو ان مثلوں کہاوتوں سے بھی بہتیرے کام نکالے ہیں۔ ہمارے یہاں شوق ہی نہیں۔ بلکہ پُرانے طریقے خواہ کیسے ہی معقول کیوں نہ ہوں اُن کی روائت کی دلیل صرف قدامت ہے کافی سمجھی جاتی ہے۔

اشرف حسین

ادلّة الکرام فی اثبات عقائد الاسلام

منشی عطا محمد خاں صاحب نے عقائدِ اسلام کو فلسفہ جدید اور علم الٰہیات کے مطابق نہایت محنت و قابلیت سے ثابت کیا ہے حقائق اشیاء واجب الوجود جبر و اختیار وغیرہ وغیرہ پر مدلّل طریقہ سے بحث کی ہے اور سچ یہ ہے کہ جس طرح علم کلام کا وجود فلسفہ یونان کے مقابلہ میں ضروری تھا۔ اسی طرح آج فلسفہ جدید کے مقابلہ میں مُسلمانوں کو اس قسم کی کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ منشی صاحب کی یہ دماغ سوزی و عرق ریزی رائگاں نہ جائیگی اور نئے تعلیم یافتہ اس کتاب کے مطالعہ سے اپنے متزلزل عقائد کو مستحکم اور شکوک کو رفع کرینگے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ضخامت ۱۶۰ صفحہ قیمت ایک روپیہ مصنف سے کٹڑہ اہلووالیہ متصل نیومارکیٹ امرتسر مل سکتی ہے +

حرم اور یورپ

اقوام یورپ کے ذہن میں مسلمانوں کی برائیاں کچھ ایسی جاگزین ہیں کہ اگر کسی شخص کو شقیق القلب - بیرحم - سفاک اور سنگدل کے الفاظ سے متصف کرنا ہو تو بجائے اتنے سارے اسمائے صفت استعمال کرنے کے ایک چھوٹا سا لفظ مسلمان کہدینا کافی ہے - ان کے خیال میں ہم تمام اعلیٰ جذباتِ انسانی سے معرا ہیں - اپنی عورتوں کی عزت کرنی ہمیں نہیں آتی - اُنکی محبت سے ہمارے دل ناآشنا - اُنکے آرام و آسایش کے ہم جانی دشمن - گویا ہماری زندگی کا بڑا مقصد عورت کے لئے دُنیاہی میں دوزخ تیار کرنا ہے - اس میں شک نہیں کہ اُنہی اقوام میں وُہ روشن دماغ مبصرین بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنی بیش بہا زندگیاں وقف کر کے اسلامی رسم و رواج کی چھان بین کی اور اپنی عمر بھر کی جانفشانی کے ماحصل سے عوام الناس کی غلط فہمیاں رفع کرنے میں حتی الامکان کوشش کی مگر باوجود ان کی سعی بلیغ کے بعض متعصب مصنّفوں اور واعظوں نے جو بُرا خیال اہلِ فرنگ کے دل میں پیدا کر دیا تھا اُس کا کافی استیصال نہیں ہوا - جو جھوٹی اور بے بنیاد روایتیں اہل اسلام کے برخلاف اشتعال پیدا کرنے کی خاطر زمانہ سابق میں رائج کی گئی تھیں وُہ یورپ میں اب تک زبان زدِ خلائق ہیں - تعجب یہ ہے کہ بعض باطل افسانوں کو متعصب لکھنے والوں نے تاریخی جامہ پہنا کر خواہ مخواہ ایسا قابلِ وقعت بنا دیا کہ خود مسلمانوں کو حقیقت کا دھوکہ ہونے لگا مثلاً کتب خانہ اسکندریہ کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے جلایا جانا - حالانکہ فہم عام کی رُو سے اس کا وقوع صریحاً ناقابلِ تسلیم ہے - وُہ اُمت جسکے ہادی نے باوازِ بلند

فرمایا ہو اُطلبُوا العلمَ ولوکان بالصّینِ ہرگز اپنے سردار کی ایسی سخت نافرمانی کی مرتکب نہیں ہوسکتی کہ تحصیلِ علم کی بجائے ذرائع علم کو برباد کردے۔ تاریخ کے بے لاگ صفحات شاہد ہیں کہ مُسلمان از حد علم دوست تھے اور خصوصًا تاریخ کا شوق تو اس قدر تھا کہ قدیم واقعات کے انکشاف میں جان و مال سے دریغ نہ کرتے تھے۔ اس مضمون پر مولانا شبلی نے علمی پہلو سے ایک محققانہ بحث کر کے واضح طور پر ثابت کردیا ہی کہ درحقیقت اسکندریہ کے کتبخانے کو مسلمانوں کے قبل از ورُود عیسائی خاکستر کرچکے تھے اور مسیحی دُنیا کو بدنامی کے دھبّے سے بچانے کی اس سے احسن تدبیر نہ ہوسکتی تھی کہ یہ بہتان اسلامی فتّاحوں کے سر تھوپا جائے۔ یہ مثال مُشتے از خروارے ہی۔ اسی طرح اور بہت سی حکایتیں ایسی ہیں جو ہمارے متعلق عام طور پر مشہور ہیں۔ مگر جن کی اصلیت سوائے متعصّبین کے دماغوں کے اور کہیں موجود نہیں۔ اس قسم کی اکثر غلط فہمیاں اُس قبل از وقت رائے کا نتیجہ ہیں جو یورپ والے کسی امر کی تحقیق سے پہلے اپنی ذہانت پہ بھروسا کر کے قائم کرلیتے ہیں اور اس وجہ سے اکثر اوقات وہ ہر پہلو پر اُس چشمہ سے نظر ڈالتے ہیں جو پہلے ہی سے ناک پر چڑھا ہوا ہی۔ بعض دفعہ اُن کی وجہ یہ ہوتی ہی کہ وُہ ہماری زندگی کے خانگی طریقے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر کوئی ایسا موقع میسّر نہیں آسکتا کہ کونے کھدرے میں سے ہمارے گھروں کے اندر جھانک بھی سکیں۔ اِس لئے لامحالہ اپنے خیالی گھوڑوں کی لگام چھوڑ دیتے ہیں اور واقعات کے راز وا کرنے میں قیاسات سے کام لیتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر قدم پر ٹھوکر کھاتے ہیں اور اصلیت سے کوسوں دُور رہتے ہیں چنانچہ ترکی حرم جہاں پہنچتے ہوئے مغربیوں کے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ ایک ایسا راز ہے جس کی بابت یورپ میں صدہا

مختلف روایتیں مشہور ہیں اور جس کی سرپستگی نے یورپ کے قصہ نویسوں کے لئے نہایت دلچسپ مصالحہ فراہم کیا ہے۔ اسرار حرم نے انگریزی علم ادب پر جو اثر ڈالا ہے اُس سے ہر انگریزی خوان تھوڑا بہت واقف ہے۔ انگریز ناول نویسوں نے اپنی قوت دماغیہ کے پورے صرف سے کرۂ ہوائی میں وہ وہ عالیشان محلات تیار کیے ہیں کہ جنکو دیکھ کر سچ مچ اینٹ اور چونے کا شبہہ ہوتا ہے۔ اُس پر طرّہ یہ کہ ایسے ناول جنکے نام سے جھوٹ عیاں ہے لوگ تاریخ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہر مفروضہ واقعہ کو اصل تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ جو اظہار ہمدردی یورپ میں ترکی خاتونوں کے ساتھ اُنکے فرضی مصائب پر کیا جاتا ہے وہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ مگر خدا بھلا کرے نوجوان ترکوں کا جنہوں نے اپنے پڑوسیوں کو دن رات کے سوز و گداز اور ہر وقت کے ہیجان سے رہا کیا۔ یہ ہمدردان بنی نوع انسان (مغربی عیسائی) راتوں کو چونک پڑتے تھے جب کبھی انکو حرم کی مصیبتوں کا خیال آتا تھا۔ بعض اوقات تو تکیہ پر آرام سے سر رکھنا محال تھا۔ بھلا یہ کب ہو سکتا تھا کہ یہ محبان بنی آدم تو نرم نرم گدوں پر میٹھی نیند سوئیں اور انکے ہم جنس جانوروں کی طرح حرم میں بند ہوں۔ یہ ترکوں کے سچے اور بے لاگ دوست بصد عجز و نیاز اہل حرم کے لئے آزادی کی دعا میں شبانہ روز مشغول رہتے تھے۔ آہ! قدرت نے کیسی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے کسی کو تکلیف میں دیکھ ہی نہیں سکتے۔ آخر خدا نے انکی گریہ و زاری سُنی اور ان کی بیکلی دُور کرنے کے لئے جوان ترکوں کو بھیجا۔ ان سپاہی زادوں نے بجائے اپنی حرم کا پردہ اُٹھانے کے غلط فہمی کا وہ پردہ جو تمام یورپ پر چھایا ہوا تھا سرتاسر چاک کر ڈالا۔ اسی پر تو یہ عاشقان خلق خدا دنگ رہ گئے۔ جس چاردیواری کو قید خانے کی سنگین فصیل تصور

کیے بیٹھے تھے وہ اصل میں باغ دیوار نکلی۔ اِس طلسم کے ٹوٹتے ہی انکو ہوش آیا کہ جس طرزِ معاشرت پر یہ اتنے نازاں تھے وُہ حرم کی زندگی کے مقابلہ میں ہیچ ہی۔ جس کو کل بنظرِ تنفر و حقارت دیکھتے تھے وُہ آج قابلِ تقلید ہی۔ اب آنکھیں کھلیں کہ اس مقدس احاطہ کی چار دیواری ساکنانِ حرم اور دُنیا و ما فیہا کے درمیان حدِ فاصل نہیں بلکہ وُہ سدِ سکندری ہی جس کے پار دنیوی فضولیات اور ممنوع لہو و لعب کا گذر دشوار ہی لیکن حقیقی مسرت کے جانے پر روک ٹوک نہیں۔ اس خوشگوار مگر محدود گلستاں میں سچی محبت نیکی اور عفت کے پودے سرسبز و شاداب ہیں۔ یہاں کے لہلہاتے غنچوں میں عصمت کی ایسی مہک ہی جس سے سارا چمن معطر ہے۔ البتہ بُرائی کا بیج اس زمین میں نہیں پھوٹتا یا تو اس وجہ سے کہ زمین کی خاصیت ہی اس کے موافق نہیں اور یا اگر کسی جگہ اس نے جڑ پکڑی بھی تو آب و ہوا کے اثر سے بہت جلد مُرجھا جاتا ہی۔

انگلستان میں حرم کے متعلق رائے میں جو فرق آیا ہی اُس کا اندازہ اِس سے ہوسکتا ہی کہ اگر دو سال پہلے یہاں کسی مرد یا عورت سے حرم کی تعریف پُوچھی جاتی تو وُہ تقریباً یہ ہوتی۔ حرم اس قید خانے کا نام ہی جہاں مسلمان اپنی خواہشاتِ نفسانی پُورا کرنے کے لیے ایک سے زیادہ عورتوں کو اُنکی مرضی کے خلاف بند کرکے طرح طرح کے عذاب میں مُبتلا کرتے ہیں"۔ مگر آجکل جو ٹرکی گھروں کی بابت عام رائے ہی وُہ مفصلہ ذیل مضمون سے ظاہر ہی۔ یہ مضمون ۱۶ اگست کے "ڈیلی کرونیکل" میں جو انگلستان میں نہایت وسیع الاشاعت اخبار ہی شائع ہوا تھا۔ اس سے ترکوں کی خانگی زندگی پر روشنی پڑتی ہی۔ ساتھ ہی ایڈیٹروں کے جملوں میں جو خلوص کا لہجہ پنہاں ہی اُس سے انگریزوں اور

ترکوں کی موجودہ دوستی آشکارا ہے۔ واضح ہو کہ میں نے اس مضمون میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ سوائے اس کے کہ راقم کے خیالات پر سے انگریزی الفاظ کا چست لباس اُتار کر اُردو کا ڈھیلا ڈھالا جامہ پہنا دیا:۔

رُوم میں طریق بود و باش

زنانِ رُوم کا مقولہ | حسنِ ظاہری کے ساتھ حسنِ باطنی سے آراستہ ہو کر سچی وفادار بیویوں اور مہربان ماؤں کے فرائض ادا کرنا۔

"ترکی عورتوں کی زندگی کے چند صفحات" کے نام سے جو کتاب مشہور ہے۔ اس کے مطالعہ سے زنانِ رُوم کی بابت اُن عام خیالات میں جو درحقیقت اس ملک میں غلط رائج ہیں کم از کم ترمیم ضرور ہو جائیگی یہ کتاب ایسے معمولی اوراق کا مجموعہ نہیں ہے جن میں کسی جوشیلے سیّاح کے سرسری مشاہدات قلمبند ہوں بلکہ اس کی مصنّف ڈیمیٹرا واکا[1] (ایک عیسائی خاتون) خود روم کی رہنے والی ہے۔ اتفاقاتِ زمانہ سے اس کا امریکہ جانا ہُوا اور چھ سال کے قیام کے بعد اب معاودت وطن کی ہے۔ اس عرصے میں ترکی گھروں کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہُوئی تاہم مصنّف کا بیان ہے کہ اگرچہ کسی اور چیز میں تغیر نہیں ہوا مگر میں خود بدل گئی۔ اپنے ملک واپس آنے پر میں نئے خیالات اور مغربی نکتہ چینی کے اصُولوں کا نیا خزانہ اپنے ساتھ لائی ہُوں۔ میری بچپن کی سہیلیاں اکثر ترکی لڑکیاں ہیں۔ ان کے گھروں کے طریقے پہلے تو معمُولی سمجھا کرتی تھی۔ کیونکہ میرے بزرگوں کی پیڑھیاں ان ہی لوگوں میں گذریں اور میں خود ان ہی کے درمیان بڑھی پلی اس لئے انکے طریق اپنے تصوّر کرتی تھی مگر اب ان کو نئی روشنی میں دیکھتی

[1] Demetra Vaka.

ہوں ۔ امریکہ کے اثنائے قیام میں میں نے لوگوں کو رُوم کا ذکر نہایت حقارت
اور نفرت کے ساتھ کرتے سُنا ۔ یہاں کے لوگوں کو ترکوں کے نام سے گھِن
آتی ہے اور اُنکی عورتوں کو بدنصیب ذی رُوح جو مردوں کے غیظ و غضب کا نشانہ
ہیں ٹھہرایا جاتا ہے ۔ اس قسم کے تذکرہ پر میں ہکّا بکّا ہر ایک کا منہ تکتی تھی اور اکثر
اپنے دل سے پوچھتی تھی کہ کیا دراصل تُرک ایسے ہی ہیں جیسا امریکن لوگ بیان
کرتے ہیں ۔ مگر ہر دفعہ یہی جواب ملتا تھا "نہیں ہرگز نہیں" یہ عیسائی لیڈی
گھر واپس آکر اپنی پچھلی زندگی پر ایک بدلی ہوئی نظر ڈالتی ہے اور دل ہی دل
میں اپنی پُرانی ہمجولیوں کا امریکہ کی لڑکیوں سے مقابلہ کرتی ہے ۔ جو فرق نظر آتا
ہے وُہ تُرکی لڑکی کی اعلیٰ صفات ہیں ۔ اس کی دو سہیلیاں ایک پاشا کی بیویاں
تھیں وُہ ایسی خوش و خرم تھیں جیسے شفاف پانی کی سیراب ندیاں جنکی
بساط محدود مگر جنکو دریا بننے کی تمنّا نہیں ۔ اُنکا دِلی مقصد خاوند کی جان
کو آرام دینے کے سوا اَور کچھ نہ تھا اور بچّوں پر تو جان قُربان کرتی تھیں ۔
قدرت کی ہر ایک چیز اُنکو بھلی معلوم ہوتی تھی اور کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے
یہ اپنی پچھلی زندگی کا خیال کرکے پژمردہ ہوں ۔ جب میں نے اُن سے انٹ
کی سنٹ باتیں کرنی شروع کیں ۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ انکے دِل پر کیا
اثر ہوتا ہے تو اُنھوں نے حیرت سے مجھ کو دیکھا اور ایک ہنسکر بولی ۔ "ہائیں بوا!
اللہ نے عورتوں کو اِس لئے بنایا ہے کہ نیک ہوں خوبصورت ہوں سچّی
وفادار بیویاں بنیں اور اپنی اولاد پر جان صدقے کریں ۔ عورت کو اِس
سے زیادہ اَور کیا چاہیئے ؟"
مجملاً تُرکی خاتون کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے اگرچہ اب زمانہ
کی رفتار کے موافق بہت سی عثمانی دوشیزہ لڑکیاں مرد کی محبت کے علاوہ

دُنیا کے اور صیغوں میں بھی فتح حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ڈیمیٹر اوا کا کی سب سے اچھی سہیلی جمیلہ سلیم پاشا کی چوتھی بیوی ہے۔ اس گھرانے کے قواعد نہایت سخت ہیں۔ والدہ۔ پاشا کی بیاہتا بیوی اور گھر کی مالکہ۔ دسترخوان کے صدر پر بیٹھتی ہیں اور بکاحتا اُن کے مقابل تیسری پہلی کے دائیں جانب اور چوتھی دوسری کے۔ اس ترتیب میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ خواصہ پہلے بڑی کے سامنے آتا ہے اور اُن کے اشارہ سے گفتگو آپس میں شروع ہوتی ہے۔ نیز مہمانوں کو بلانے یا دوسری جگہ مہمان جانیکی اجازت بھی والدہ ہی دیتی ہیں" مصنف کا بیان ہے کہ جہاں تک مَیں اندازہ لگا سکی ان میں کسی طرح کا رشک وحسد نہیں۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں مشرقی اور مغربی خیالات کا تفاوت واکا اور جمیلہ کی گفتگو سے ظاہر ہے۔

جمیلہ۔ تمہارے اُس وحشی ملک امریکہ میں رہنے سے مجھ کو ازحد نفرت ہے خدا کے لئے! تم یہاں رہکر اپنی شادی کیوں نہیں کرلیتیں؟

واکا (اسی بھولے پن کے لہجے میں جس میں جمیلہ نے سوال کیا تھا) اچھی! یہ تو بتاؤ کہ مَیں ایک چوتھائی خاوند لیکر کیا خاک خوش ہونگی"۔ اس پر جمیلہ کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے اور جب خوب دل کھول کر ہنس چکی تو کہنے لگی۔

جمیلہ۔ میری ننھی بُوا۔ یہی تو تمہاری سمجھ کا فرق ہے۔ کہیں خاوند کے حصّے بخرے بھی ہوتے سُنے ہیں۔ مجھ کو تمہاری فرنگنوں کی کم عقلی پر ہنسی آتی ہے۔ دراصل تم مرد کی طبیعت سمجھنے سے قاصر ہو۔ ایک اکیلی بیوی رہنے کی خاطر تم خدا جانے کیا کیا مصیبتیں جھیلتی ہو۔ مرد عورت کی طرح ماں نہیں بنتا۔ قدرت نے اُسے کئی بیویوں کے لئے بنایا ہے۔ دُنیا میں اُس کے پیچھے ہزاروں جھگڑے ہیں کبھی سلطنت کے معاملات اُس کا سارا وقت لے لیتے ہیں بعض اوقات اپنی عزت آبرو کا خیال اسکو دامنگیر ہوتا ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہو ایک عورت کی محبت

ہرگز اسکو سیر نہیں کرسکتی۔ جب مرد کی طبیعت ہی خدا نے ایسی بنائی ہی کہ کئی عورتوں سے محبت کرسکے تو ہماری متبرک شریعت کے مطابق وہ اُن سے شادی کرسکتا ہی۔ اُن سے اُلفت کرتا ہی اور عزت سے پیش آتا ہی۔ ان بیویوں سے جو بچے ہوتے ہیں وہ اسی کے نام اور مال کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ اب تم اپنے ملکوں کی حقیقت سنو کہ تمہارے مرد دوسری عورت سے شادی کرنے کی خاطر تم کو بڑی ذلت کے ساتھ کوئی تہمت لگا کر طلاق دیدیتے ہیں اور گذارے کا خرچ بھی واجبی سا دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچے باپ کی صحبت سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ اور اگر مرد طلاق نہیں دیسکتا تو عورت کو کتے کی کھوپری میں پانی پلواتا ہی اور خود آوارہ گردوں کی زندگی بسر کرتا ہی۔ اور اگر بالفرض اسکو کسی دُوسری عورت سے محبت ہوگئی اور وہ اس کے ساتھ رہنے لگا تو ایک تو عورت ذلیل زندگی گذارتی ہی۔ دُوسرے بچے نا اہل ہوتے ہیں۔

ڈیمیٹرا واکا نے اسی طرح باری باری سے چاروں بیویوں سے گفتگو کی اور اُن میں سے ہر ایک نے زندگی کا ایک نیا پہلو اُسکو دکھایا سب کی باتیں دلچسپ اور معقول تھیں۔ واکا کا بیان ہی کہ اُن خاتونوں کی شرافت سرشتہ ہی اور اعلیٰ خیالی اِنکا زیور ہی۔ دُوسرے تُرکی بیویاں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی سی چیزوں میں اس قدر فراخ حوصلہ ہیں کہ میری فرنگی بہنوں کو ہونا مشکل ہی۔ پھر مزا یہ کہ برخلاف مغربی اصول ایثار کے تشکریے یا احسانمندی کی خواہاں نہیں۔ مرد کے آرام کے لئے اپنی ذات کے مٹانے میں جو مرتبہ انکو حاصل ہی وہ مغربی دُنیا کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔

اِس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مغربی عورتیں اصل کھری ہیں یا مرد کے لئے آرام دہ نہیں۔ وہ ضرور فراخ حوصلہ ہیں مگر اُس اعلیٰ پیمانہ پر نہیں جو ان خاتونوں کی رُوحانی صفت ہی۔ تُرکی خاتون کے حُسن باطنی کے ساتھ ظاہری خوبی کا

تذکرہ بھی لازمی ہے۔ میرے لئے ہنوز یہ راز سربستہ رہا ہے کہ وہ ترک جو ایسی عصمت کی دیبیاں اور چاند کے ٹکڑے پیدا کر سکتے ہیں کہ جو ہماری مغربی تہذیب یافتہ قومیں عالم تصور میں بھی نہیں بنا سکتیں اُنکو اس قدر جابر۔ ظالم اور بوالہوس کیوں کہا جاتا ہے۔ اکثر جب میں لاطینی یا انگریزی قوموں کے بچوں پر نظر ڈالتی ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ ان کے ماں باپ میں کیسی جانوروں کی سی محبت ہوگی جو بچوں کی آنکھوں سے بھی وحشی پن ٹپکتا ہے۔ ترکی بچے ان سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ بارہا جب میں بچوں کو کسی ایک جگہ اکٹھا دیکھتی ہوں اور خصوصاً لڑکیوں کے جھرمٹ کو تو دیکھ کر کھڑی کی کھڑی رہجاتی ہوں۔ کیونکہ اُن کے ایسے معصوم بھولے بھولے پیارے چہرے ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے مُنہ پر نحیین برستا ہے

اہل فرنگ کو جو حرم کی زندگی پر نظر ثانی کرنے کا خیال پیدا ہوا اس کی صریح بنا انقلاب رُوم ہے۔ محاصرہ قسطنطنیہ کے زمانے میں ترکوں کے متعلق علاوہ تصویروں اور نقشوں کے ذرا ذرا سی فروعات پر اخباروں کے صفحے کے صفحے کالے ہوتے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ اُنکی خانگی زندگی اور عورتوں کی طرز رہائش پر روشنی نہ ڈالی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو کر اہل یورپ کو اپنی رائے نہ صرف ترکوں کی تمدنی قابلیت کے متعلق بلکہ اُنکی خانگی زندگی کی بابت تبدیل کرنی پڑی اور اس سارے تغیر کا سہرا نوجوان ترکوں کے سر رہا۔ تین چار سال ہوئے دُنیا میں ان کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ کوئی یہ تک نہ جانتا تھا کہ ترک بھی نوجوان ہوتے ہیں۔ ہاں یہ بچہ بچہ کو معلوم تھا کہ یورپ کے گوشہ میں پڑا ہوا ایک قریب المرگ مریض دم توڑ رہا ہے اور ملک ملک کے ڈاکٹر چیر پھاڑ کے اوزار ہاتھ میں لئے آخری سانس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ تاکہ مُردے کی

لاش کے برابر حصے کریں - مگر یہ لبوں دم آدمی جو اتنے عرصے سے بسترِ مرگ پہ پڑا موت کی گھڑیاں گن رہا تھا - ایک دفعہ ہی جھرجھری لیکر ایسا اُٹھا کہ بڑے بڑے نبّاضانِ جہاں دنگ رہ گئے -

"بیمار آدمی" (روم کا پرانا لقب) کی اولاد بھی عموماً آئے دن کی مریض رہتی ہی مگر رُوم میں سارے عالم سے انوکھی بات وقوع میں آئی - وہی تُرک جن کی فوج کچھ عرصہ پہلے پھٹے حال بُرے احوال ساری دُنیا کی نکتہ چینی کا نشانہ بنی ہوئی تھی یکایک یورپ کی تعلیم یافتہ اور شائستہ افواج میں شمار ہونے لگی - برّاعظم فرنگستان کی سب سے ردّی حکمراں قوم ترک خیال کئے جاتے تھے اور دُنیا کی طاقتوں میں انگریزوں کو جو درجہ حاصل ہی وُہ اظہر من الشمس ہی - اِس لئے اَور ملکوں کی تو خبر نہیں مگر انگلستان میں ہر کہ و مہ کی زبان سے یہ کلمہ سُنکر کہ "نوجوان تُرکوں نے حیرت انگیز دماغ پائے ہیں" ایک انجان کو خواہ مخواہ تعجب ہوتا ہی کہ اگر تُرکوں نے اپنی ملکی حالت ذرا درست کرلی تو ایسا کونسا رتیر مارا جو انگریزوں تک کو اپنا مدّاح بنالیا - جس اخبار کو اُٹھا کر دیکھو جوان تُرکوں کی تعریف میں قلم فرسا ہی - جس ماہواری رسالہ یا ہفتہ وار پرچہ پر نظر ڈالو جوان تُرکوں کی صفات سے بھرا پڑا ہی - جس جلسے میں جاؤ جوان تُرکوں کی مثال ہر مقرر کی زبان پر رواں ہی - جس تصویر والے کی دُکان کے پاس سے گزرو اَنور اور شفقت کی تصویریں الماریوں میں آراستہ ہیں اور اگر اس تُرکی غل غپاڑے سے تنگ آکر دریائے ٹیمز کے کنارے تنہائی کے متلاشی ہو تو وہاں بھی چند زندہ دِل انگریز تُرکی ٹوپیاں اوڑھے کشتیوں میں بیٹھے نوجوان تُرکوں کا نمونہ پیش کرتے ہیں - یاالٰہی! یہ جوان تُرک نہ ہوئے ایک عذاب جان ہوگئے کہ جہاں جاؤ اور جو کچھ کرو پہلے اِن کی ثنا میں تھوڑا سا وظیفہ ضرور پڑھ لو -

قومی جوش کی وُہ مجسّم تصویر۔ حُبّ الوطنی اُنکی گھٹی میں پڑی ہُوئی ۔ ایثار نفسی ان کا ذاتی جوہر۔ شائستگی اُنکا لباس ۔ ذہانت اُنکی رہبر۔ فراخ حوصلگی اُنکی طینت۔ یہ آوازیں ہیں کہ برابر کان میں چلی آ رہی ہیں۔ مگر ان سب کو ملا کر جو گونج پیدا ہوتی ہی اُسکا اظہار اگر کسی لفظوں میں ہوسکتا ہی تو وُہ غالبًا یہ ہونگے ۔ اسلام ان کا مذہب اور تلوار ان سب صفات کی بنا۔ غرض عثمانی مردون کی کایا پلٹ کا قصّہ تو بہت طول طویل ہی مگر اُن کا لُبّ لباب یہ ہی کہ اثنائے رستخیز میں اگر ایک طرف آنور کے نورِ قلب نے یورپ کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رکھی تھی تو دوسری طرف شفقت کی قوتِ منتظمہ قسطنطنیہ کے رہنے والے مبہوت فرنگیوں کو بسو رتا دیکھ کر اُن کے سروں پر دستِ شفقت پھیر رہی تھی ۔ حتّٰی کہ طلعت کی روشن دماغی نے حلمی کی بُردباری کو سبکدوش کر کے اندرونی معاملات کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی ۔

اگرچہ اس مضمون کے عنوان کا تعلق ظاہرا صرف ترکی خاتونوں سے ہی اور مردوں سے اسے کچھ سروکار نہیں مگر ساتھ ہی ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ آج جو رُومی خاتون اپنی فرنگی بہنوں سے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکتی ہی وُہ انہی مردوں کے طفیل۔ اور انہی کے بل پر وُہ زمانہ بھی جلد آنے والا ہے ۔ جب ایک مغربی تہذیب یافتہ خاتون اور مسلمان ترکن میں امتیازِ مذہب کے علاوہ کسی اور فرق کی تفتیش تضیعِ اوقات ہوگی +

رؤف

(از لندن)

~~~~~~
~~~~~~

مفلسی

الٰہی تو سب کچھ دے مگر ایک مفلسی نہ دے۔ بیماری ہوگی اُسے بھگت لینگے۔ بے علمی ہوگی اُسے سمجھ لینگے۔ کمزوری بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ تلواریں بھی کھا سکتے ہیں۔ پر ایک تنگدستی نہیں اُٹھا سکتے۔ یہ کلموئی جس گھر میں جاتی ہے۔ سو سو رُوپ لاتی ہے۔ بھوکا یہ سلائے۔ پیاسا یہ پھڑکائے۔ معصوم بچوں پر ترس یہ نہ کھائے۔ بوڑھے اپاہجوں پر رحم اسے نہ آئے۔ جی کو یہ جلائے جان کو یہ گھلائے۔ جیتے جی یہ مارے۔ زبردستی ہری یہ بلوائے۔ بھلے چنگے کو بیمار یہ ڈالدے۔ ساہ کو چور یہ بنادے۔ حکمت میں لقمان ہو اور گرہ میں کچھ نہ ہو تو کوئی مُنہ نہیں لگاتا۔ مرتبہ میں ولی ہو اور کچھ فیض نہ پہنچائے۔ تو کوئی اُسکے پاس نہیں پھٹکتا۔ فاضل بھی اُس کے آگے اپنا فضل و ہنر بھول جاتا ہے۔ اور عامل بھی اس جن کے سامنے بولجاتا ہے۔ الٰہی افلاس کس بلا کا جادو ہے۔ کہ جہاں اذان دینے میں اُدھر دھیان جا پڑا اور مؤذن غوطے کھانے لگا۔ قرآن پڑھنے میں اُدھر خیال گیا۔ اور متشابہ نے اپنا رنگ جمایا۔ نہ تو نماز ہی میں دل لگتا ہے۔ اور نہ خدا ہی یاد آتا ہے۔ پیٹ میں پڑتی ہے۔ تو سب کچھ سوجھتا ہے۔ بقول شخصے پیٹ پڑی روٹیاں تو سب گلاں موٹیاں۔ مفلسی میں ہنر بھی کام نہیں آتا ہے۔ اور نہ طاقت ہی کچھ ساتھ دیتی ہے۔ اگر ہنرمند کے پاس دام نہ ہوں تو کہاں سے اوزار خریدے۔ کس سے قرض اُدھار لائے۔ مفلس اگر بے غرضانہ سلام بھی کریگا تو اس کے سلام کو سلام روستائی سمجھیں گے۔ اور جو کسی بات کی سچی تعریف بھی کریگا۔ تو اُسے بھٹئی جانینگے۔ اگر کوئی کتاب بنائیگا۔ تو کبھی مقبول عام نہ ہوگی۔ اور جو کسی امر

میں دانشمندانہ صلاح دیگا۔ تو وہ کبھی بے غرضی پر محمول نہ ہوگی۔ اگر مفلس کسی
تقریب میں جائیگا اور وہاں شیرینی بٹتی ہوگی۔ تو سب کو اگر چار چار ڈلیاں ملیں
تو اُسے دو ہی ملینگی۔ وُہ بھی ناک بھوں چڑھا کر۔ بیحیا یہ کہلوائے۔ بے شرم یہ ہوائے
جس کا کوئی مرجاتا ہے۔ اُسکے ہاں نہایت درجہ تین دِن ماتم رہتا ہے۔ مگر مفلس کا
گھر سدا ماتم کدہ اور ماہ محرم بنا رہتا ہے۔ دولتمند سے کوئی قصور ہو۔ تو سب چھپا
ڈالیں۔ مفلس سے کچھ خطا ہو جائے۔ تو بانس پر چڑھا دیں۔ مفلس کا مُردہ بھی خراب
اور اُس کی زندگی بھی خراب۔ بھلا جب جیتے کو کوئی نہیں پُوچھتا تو مُردہ کو کب
پُوچھیگا۔ اُسکا جنازہ بھی اُٹھائینگے تو اِس لحاظ سے کہ کہیں ہمارا محلہ نہ سڑ جائے۔
بیماری نہ پھیلے۔ کسی کو بھُوت بنکر نہ چمٹے۔ جی چاہا تو شرما شرمی کچھ کفن بھی دیا۔
نہیں تو یُونہی دبا دیا۔ دُنیا میں بھی مٹّی خراب ہے۔ اور آخرت میں بھی عذاب ہے۔
پیٹ بھرتا تو عبادت کرتا۔ ثواب کماتا۔ وہاں کے عذاب سے چھُوٹتا۔ اب کیا کرے
جیسی پڑی ویسی بھرے۔ ہائے رے مفلسی اگر بیوی ہے تو گہنے پاتے کو ترستی ہے۔
چُوڑی مہندی کو پھڑکتی ہے۔ سُہاگن ہے تو بیوہ سے زیادہ۔ ماں مہت والی ہے پر دِل
افسردہ۔ بیوی تو بیوی میاں کے کپڑے بھی دیکھو گے تو بنئے کے توشہ خانے
میں نظر آئینگے۔ کوئی سُود کے بدلے پڑا ہوگا۔ کوئی مول میں دھرا ہوگا۔ اگر گھر کا مکان
ہے تو بی مفلسی اُسکی کڑیاں بکوا رہی ہے۔ کواڑ اُکھڑوا رہی ہیں۔ زنجیر کے چنے لئے
جاتے ہیں۔ قلابے دُوسرے دِن کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ اور جو چھپّے ہیں تو بانس
کباڑئے کی دُکان پر پہنچے۔ پھُونس جلانے کے کام آیا۔ یا بھٹیارے کے
ہاتھ بیچا گیا۔ جب کاٹ کباڑ ہو چکا تو اینٹوں کی نوبت پہنچی۔ جو پہلے مکان کہلاتا
تھا۔ اب کھنڈر کہلانے لگا۔ چوڑے میں کھڑے رہ گئے۔ رات کو اوس کھائی۔
تو دن کو دُھوپ نے گرمائی دِکھائی۔ مینہ برسا تو بندر کی طرح بھیگا کئے۔ جاڑا پڑا

تو اکڑ گئے۔ آندھی آئی تو خاک میں اَٹے۔ اولے پڑے تو سر پھٹے۔ مفلسی کیا آئی کہ قیامت آئی۔ اگر خدا نے چاند سی صورت دی ہو۔ معشوق بنایا ہو۔ اور بی مفلسی بھی اُس پر ریجھ گئی ہیں۔ تو اُسی خوبصورتی میں سو رخنہ نکال دیتے ہیں۔ چاند سے مُنہ کا طباق سا مُنہ ہو گیا۔ بڑی بڑی آنکھوں کی پھٹی پھٹی آنکھیں کہلانے لگیں۔ اگر چھریرا بدن تھا تو چھپکلی نام رکھا گیا۔ اور جو بھرا بھرا بدن تھا تو گولہ دن نام ہوا۔ جتنی بھلائیاں تھیں سب بُرائیوں سے بدل گئیں۔ کیا تو لوگ انہیں دیکھنے آیا کرتے تھے۔ کیا یہ خود اُنکا ہاتھ تکنے کو جانے لگے۔ نہ وُہ قدر رہی نہ وُہ بات رہی۔ غریب کی جوانی جاڑوں کی چاندنی کی طرح بے لُطفی سے کٹی۔ اگر میاں **مفلسا بیگ** کسی پر عاشق ہوئے اور بی مفلسی بیگم بھی خبر لگا کر پہنچیں تو وہی مثل ہوئی۔ ایک تو کریلا دُوسرے نیم چڑھا۔ اُنہوں نے جاتے ہی بنتا ہوا معاملہ بگاڑ دیا۔ اول تو یُوں ہی بیچارے عاشق کی قدر نہیں ہوتی۔ مگر جب یہ سبز قدم بھاگ بھری تشریف لائیں۔ انکا پہرا ایسا ہوا۔ کہ معشوق کے دل میں بھی سو طرح کی بدگمانیاں پیدا ہو گئیں ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہو مرد کا اعتبار کھوتی ہو

اگر اُس کے گھر گئے تو یہ گمان ہوا کہ مال تاکنے آیا ہو اگر اِس سے بچے تو غریب مفلس سے کیسے بچا جاتا ہو۔ کوئی خود دھکے دیتا ہو۔ کوئی اپنے نوکروں سے نکلواتا ہو۔ جس سے کبھی تم نے نہیں سُنا تھا۔ وُہ بھی تو کہنے لگا بھن کا آپ آپ حضرت حضرت کہتے ہوئے مُنہ سُوکھتا تھا اب اَبے تبے کہتے ہوئے انہیں شرم نہیں آتی۔ اِس مفلسی کے طفیل گالیاں بھی سُنیں۔ اور جُوتیاں بھی کھائیں۔ حاکم کے ہاں گئے تو وہاں بھی اُسکی سلامتی میں داد کو نہ پہنچے۔ چپراسی دو انگل کا پٹا ڈالے ہُوئے جدا بھونکنے لگے۔ اہلکار جُدا پھاڑ کھانے کو دوڑے۔ حاکم نے بھی بے اعتبا

ٹھہرایا۔ لاچار ہو کر روتا پیٹتا اپنے گھر چلا آیا۔ شرافت کو اس سے بٹا لگتا ہے دُنیا کے عیب اس میں آجاتے ہیں۔ اور خوبیاں خود بخود دولت کی طرف گھسٹ کر چلی جاتی ہیں۔ اگر بیچارے مفلس نے جُوں توں کر کے اپنی دختر بد اختر کا بیاہ ٹھہرایا تو اِدھر جہیز کے لالے پڑے۔ اُدھر کمینوں میں چرچے شروع ہوئے۔ کہ اس کے گھر کی کس اُمید پر ٹہل کریں۔ یہاں سے کیا خاک ملیگا۔ اِدھر سے حلال خوری آئی گُڑیوں کا سا جہیز دیکھ کر ہنس گئی۔ اُدھر سے چماری آئی تو رچھدرا پلنگ دیکھکر دانت نکال گئی۔

اور جو خُدا نے کوئی برخوردار دیا ہے اور وُہ مثل بھی صادق ہوئی ہے کہ مفلسی میں آٹا گیلا اور مفلسی میں برخورداری اور اسی حالت میں اُسکے بیاہ رچانے کی بھی دل میں آگئی۔ تو یہاں اس کمبخت کی اَور بھی چڑھ بنی۔ طرح طرح کی رسوائی دکھائی کیسا باجا کیسا گاجا۔ کیسی روشنی۔ کیسے براتی۔ کیسا جوڑا۔ باپ براتی ہے تو ماں سمدھن ہے۔ برات چڑھی تو اِس دھوم سے اور بیاہ کرنے چلے تو اِس خواری سے کہ شہدے تھپڑی پیٹ رہے ہیں۔ بھاٹ سُوم کا گڈا بنا رہے۔ کوئی لُولُو کہتا ہے۔ گھر میں آئے تو پوچھئے آگ نہ گھڑے پانی۔ دُلہن نے سُسرے کو کھٹو ٹھہرایا۔ بیٹے نے باپ کو نالائق بنایا۔ غرض اِس مفلسی کے سبب بیٹی یُوں پروان چڑھی۔ بیٹا یُوں بیاہا گیا۔ آدمی کیسا ہی عقلمند ہو۔ مگر مفلسی اِس کو بیوقوف بنائے بغیر نہیں چھوڑتی۔ عقیل کو بھی ایکدفعہ بے دُم کا گدھا کھلوا دیتی ہے۔ کوئی بے دال کا بودم کہتا ہے۔ کوئی احمق کی دُم کہتا ہے۔ ع چوں زر نیست عشق ٹیں ٹیں۔ بیچارے مفلس کے ناخن دیکھو تو کدالیں سی نکل رہی ہیں۔ مُوچھوں پر نظر ڈالو تو مُنّہ کے اندر جا رہی ہیں۔ ریچھ کے سے بال بڑھ رہے ہیں۔ ساری قیدیوں کی سی شکل بن گئی ہے۔ لوگ اُس سے بھاگتے ہیں۔ وُہ لوگوں سے شرماتا ہے۔

ٹوٹی جوتی ہی تو پھٹا انگرکھا ہی۔ ٹوپی کا چندوا ہی تو گردہ ندارد۔ اور گردہ ہی تو چندوا غائب۔ دولتمندی کے زمانے میں سو شریفوں کے ایک شریف تھے۔ اب سو کمینوں کے ایک کمینے ہیں۔ تعظیم و تکریم تو درکنار اب کوئی آنکھ بھی نہیں ملاتا جو لوگ پہلے مسند پر بٹھاتے تھے۔ اب جوتیوں پر بیٹھنے نہیں دیتے۔ جہان کے بدمعاش ہیں تو یہ ہیں۔ اُٹھائی گیرے ہیں تو یہ ہیں۔ اگر مسجد میں خدا کا گھر سمجھ کر جا نکلے تو وہاں سے بھی نکالے گئے۔ کسی نے کہا جوتیاں چرانے آیا ہی۔ کوئی بولا بوریے سمیٹنے آیا ہی۔ کسی نے کہا کہ کل یہی تو بدھنیاں لے گیا تھا۔ کسی نے فرمایا سقابہ بھی خراب کر جاتا ہی۔ کائیں کائیں کر کے سب مُلّا نے جھپٹ گئے۔ اور بیچارے کو دھکے دیکے نکال دیا۔

انگلستان کی سلطنت جو اس زمانہ کی سلطنتوں پر فوق رکھتی ہی۔ اُس کا یہی سبب ہی کہ وُہ دولتمندی میں کسی کو اپنے برابر نہیں ہونے دیتی۔ اور نہ کسی کا حق تلف کرتی ہی۔ لین دین کی بڑی کھری ہی۔ انگلستان کا نوٹ ہر جگہ فائدہ سے بکتا ہی اور دیگر سلطنتوں کا نوٹ بٹّے سے بھی کوئی نہیں خریدتا۔ یہ ساری باتیں اہل انگلینڈ کی کفایت شعاری۔ سوداگری اور آزادی کا ثمرہ ہیں۔

کاش ہمارے بھائی بھی مفلسی کا ساتھ چھوڑیں۔ محنت سے۔ ایمانداری سے حرفت سے۔ صنعت سے۔ مزدوری سے۔ اُجرت سے چار پیسے کمائیں دو اُٹھائیں اور دو ایسے وقت کے لئے بچائیں۔ اصل قناعت کفایت شعاری ہی اور سب سے بڑی دولت پس اندازی۔ اپنی قوم میں۔ غیر قوم میں۔ حاکم میں۔ حکیم میں۔ دُنیا میں۔ دین میں چار پیسے کی عزّت ہی۔ ہاں جو عزّت اور حرمت کو دو لونڈیاں سمجھ کر آزاد کردے وہ چاہے جس طرح بسر کرے۔

سیّد احمد دہلوی

شیخ علی حزیںؔ

(۶)

(سلسلے کے لئے ماہ اکتوبر کا مخزن ملاحظہ ہو)

(۱۶) شکائتِ ہند

چند شعر شکایتِ ہند میں شیخ نے کہے ہیں وہ درج ہوتے ہیں ؎

سوادِ ہند خاطر خواہ باشد بیکمالاں را ۔ نماید خانۂ تاریک روشن چشمِ عریاں را

قطعہ

فلک افتادۂ من بود بہندم انداخت ۔ عاقبت کیں زمن عاقبت اندیش کشید
پس ازیں روئے بہی دہر نخواہد دیدن ۔ ہر کجا لونِ خرے بود فلک پیش کشید

مشنو فسونِ زُہد کہ در تیرہ خاکِ ہند ۔ ہرکس نیافت دولتِ دُنیا فقیر شد

ہمارے شاہ صاحبوں کی خوب خبر لی ہے !

دیدہ جز بوالعجبی ہیچ نہ بیند در ہند ۔ فلک انداختہ مارا بدیارے عجبے

(۱۷) یادِ وطن

ہند میں شیخ کو وطن کی یاد بیتاب رکھتی تھی چنانچہ فرماتے ہیں ؎

حزیں از دیدہ می بالم نگاہِ حسرت آلودے کہ از آغوشِ مژگاں دادہ ام خاکِ صفاہاں را

حزیں دُور از وطن زیں صعب تر دردے نمی باشد بلائے اُلفتِ دوناں غمِ مہجوریِ یاراں

---

(۱۸) شوقِ سخن

چند شعر جن میں شیخ نے اپنے شوقِ سخن اور فکرِ مضمون کا ذکر کیا ہی درج ہوتے ہیں

در دہر حزیں از نۓ کلکت بنوائیم ازیں دریں غمکدہ یارے شدہ مارا

می تراود زلبم زمزمہ بیخودست حزیں میتواں یافت دریں پردہ سخن سازے ہست

حزیں از جوئے خاطر سرو کلکِ سر فرازمن چہ خوں ہا میخورد تا مصرعے سیراب میگردد

شاہنشہی ست عشق و در ششِ قلم حزیں تسخیرِ ملکِ نظم باقبالِ وی کنند

چو شمع از جانگدازی میکنم محفل فروزیہا حزیں تا من نمی سوزم نمی سوزد چراغ من ہا

کس قدر بلیغ شعر کہا ہی اور مضمون کیسا دردخیز ہے!

شیخ کی چند غزلیں

منتخب اشعار بہت سے لکھے جا چکے اب چند غزلیں درج ہوتی ہیں جو حزیں کے خاص رنگ کی ہیں، یعنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی۔

غزل

چہ دستم در زکلک و خامہ خبر نہاں فرستم بتو نالہ سنج خواہم نۓ استخواں فرستم

گل سجدہ کہ زیبد سر عرشش تکیہ گاہش — زنیاز جبہہ سایان بتو سر گران فرستم

نشود اگر بسینہ رہ قاصد نفس گم — دو سہ حرفِ خونچکانے بتوارمغان فرستم

ز معاشرانِ دیرین نکند وفا فراموش — قدحے بپارسایان زمے مغان فرستم

بدو روزہ عشقبازی زبلند ہمتی ہا — بذخیرہ سازیٔ دل غم جاودان فرستم

ادبم نمی گذارد پئے عذر میگساری — کہ بجا کبوس نو بہ لب میچکان فرستم

غزلے حزیں شگفتہ ز بہارِ طبع رنگیں

بمشامِ بوشناسان گلِ بیخزاں فرستم

غزل

باایں تنک سرمائگی زحمت مکش زاری مکن — ہمچشمی مژگان من اے ابر آزاری مکن

شاید کزیں خونِ بحل یاد آرد آں بیرحم دل — اے تیغ ہجرِ جانگسل زخم مرا کاری مکن

شاید بسر وقتت رسد لغزیدن مستانہ — اے عقل عالی منزلت بیصرفہ خودداری مکن

یکبار در جولاں ببیں آں قامتِ ناز آفریں — ناز خرامش بر زمیں اے کبک کہساری مکن

بگزار بارو شستہ لاں آں صفحۂ رخسارہ را — اے سبزۂ خط بیش ازیں آئینہ زنگاری مکن

از اول ایں جور و جفا خود بر سر آوردی مرا — اے چشم کافر ماجرا بیہودہ خونباری مکن

نتواں گسستی متصل بر کین عالم بست دل — اے غمزۂ خونریزی بہل اے عشوہ خونخواری مکن

گر تر نکردی خنجرے سیعے کہ تا مژگاں رسی — اے قطرۂ خوں بیش ازیں بر دل گرانباری مکن

جائیکہ گردد در جہاں کلک حزیں عنبر فشاں

اے نافۂ مشکیں نفس شوریدہ گفتاری مکن

غزل در تصوف

مطلوب در لباسِ طلبگار آمدہ — خود را بصد نیاز پرستار آمدہ

جز یائے ہیچکس سوئے بازارِ عشق نیست | یوسف بشیوہ ہائے خریدار آمدہ
از چشمِ خویش تا نگرد روئے خویش را | گردیدہ دیدہ طالبِ دیدار آمدہ
گہ آتشِ خرمن شدہ گہ شمعِ انجمن | ہم خانہ سوز و خانہ نگہدار آمدہ
اے دل ز دیدہ پردہ پندار دور دار | گوہر فروز دیدہ بیدار آمدہ
یک پرتو است کردہ جہانے پُر از ظلال | یک جلوہ است مختلف آثار آمدہ
عالم سوادِ نافہ آں خالِ مشکبوست | یک نفحہ زاں شمیم بتاتار آمدہ
سنبل بتاب و لالہ سیہ مست و گل بناز | یک جلوہ زاں جمال بگلزار آمدہ
در گوشِ دل گدائے خراباتِ عشق را | اِنّی اَنَا اللّٰہ از در و دیوار آمدہ
عنقائے مغربی کہ جہانے ز بال اوست | ق | از بوالحسن بحضرتِ عطار آمدہ
از فیض اوست کایں دلِ شوریدہ حزیں | بحرِ محیط و مخزنِ اسرار آمدہ
گاہے فتادہ مست بپائے خمِ مغاں | گاہے بصدر مصطبہ ہشیار آمدہ

غزلِ مسلسل

سوئے محراب شدم لب مے ناب آلودہ | در بغل مصحف و دامن بشراب آلودہ
دل سیہ مست و خراب از اثر بادہ دوش | بے صفا میشود آئینہ آب آلودہ
با چنیں حال کشودم سرِ طامات و حدیث | ہمہ بیہودہ چو افسانہ خواب آلودہ
مجلسِ موعظہ ام گرم نگردید و رسید | از پیم ساقی سرمست شراب آلودہ
رُخ برا فروختہ از غیرتِ بیباکی من | عرقِ شرم گلشن را بگلاب آلودہ
سُنبل آشفتہ، دل آزردہ، نگہ تشنہ بخوں | ابروئے تلخ تبسم بعتاب آلودہ
گفت شرمت ز خراباتِ نشیناں نامد | کہ در و دامن شیخست چو شباب آلودہ
رند میخانہ کجا مسجد و محراب کجا | نہ کنی نامہ اعمال ثواب آلودہ

بہجابانہ زدم لعل لبش بوسہ حزیں
بازگشتم بخرابات حجاب آلودہ

غزلِ مسلسل

صبوحی از چمن مستانہ پیراہن قبا کردہ
چو بوئے گل گزشتی تکیہ بر بادِ صبا کردہ

بمغز نوبہار از عطرِ گیسو عطسہ افگندہ
دماغِ غنچہ را از بوئے سنبل مشکسا کردہ

غزالانِ حرم را سر بصحرا دادہ از وحشت
نگاہِ سرمہ سا را آہوئے دشت خطا کردہ

زموجِ مے تبسم در لبت رشکِ شفق گشتہ
صبوحی زن، برنگِ صبح، پیراہن قبا کردہ

زخطِ عنبریں خورشید را در مشک تر بستہ
ز زلفِ پرشکن صد عقدہ در کارِ صبا کردہ

گریباں چاک و سرخوش ہمچو نرگس جامِ مے در کف
چو گل تا پیرہن بندِ قبائے ناز وا کردہ

کبابِ دل ز شورِ گفتگویت در نمک خفتہ
تبسم را چو موجِ نکہتِ مے نشا رزا کردہ

بکف تیغِ تغافل طرفِ دامن بر میاں بستہ
زخونِ بیگناہاں کوئے خود را کربلا کردہ

دہن را در لطافت موجِ گردابِ بقا کردہ
کمر را معنیِ باریکِ دیوان ادا کردہ

ز ابرو زخمہا بر تارکِ تیغِ قدر راندہ
بمژگاں رخنہا در سینۂ تیرِ قضا کردہ

کمندِ ناز در گردن ز کاکل مستِ رعنائی
بتقریبِ نگہ چشمِ سیہ را فتنہ زا کردہ

حرامم باد بے لعلِ تو ذوقِ میگساریہا
بجائے بادہ خوں در ساغرم ساقی بجا کردہ

حزیں از ہر سرِ موئے رواں دار دشطِ خونی
نمیدانی کہ مژگانِ تو با جانش چہا کردہ

غزل سادہ عاشقانہ

سیمیں بدنا شمعِ شبستانِ کہ بودی؟
من سوختنم آرائشِ ایوانِ کہ بودی؟

شب با کہ نشستی؟ کہ زلفت بکف افتد؟ — جانانِ من آرامِ دل و جانِ کہ بُودی؟

پیدا بود از لعلِ تو پیمانہ کشیہا — اے عہد شکن بر سرِ پیمانِ کہ بُودی؟

بے لعلِ تو الماس بُود روزیٔ داغم — اے شورِ قیامت نمکِ خوانِ کہ بُودی؟

بگذاشتہ دین بخراباتِ نشینان — در صومعہ غارتگرِ ایمانِ کہ بُودی؟

خارِ عجبے بُود بچشم از رگِ خوابم — دوشینہ گلِ جیب و گریبانِ کہ بُودی؟

آشفتہ شد اے بادِ صبا از تو دماغم — در سلسلۂ زلفِ پریشانِ کہ بُودی؟

ہر زخمِ تو لب میمکد از جوشِ حلاوت — اے دل ہدفِ ناوکِ مژگانِ کہ بُودی؟

آرام نگردید دریں دشت نصیبت — اے سیلِ خروشانِ کہ جوشانِ کہ بُودی؟

جان مست حزیں می شود از طرزِ صفیرت
دستان زنِ خوش لہجۂ بستانِ کہ بُودی؟

غزل

بلذت گفت با صیاد خون آغشتہ نخچیرے — بایں تعقیدہ صحرا آمد آخر آبِ شمشیرے

بیا ساقی خمارم سیکشد جامے تعلق کن — سرت گردم روا بود بکارِ خیر تاخیرے

بگردان شمع من برگردِ سر پروانہ خود را — کہ دارد کامِ جانم ذوقِ بال افشانی از دیرے

برنگِ شمع بود از رشتہ جان تار افغانم — شبِ عمرم سحر گردیدہ با آہِ گلوگیرے

حزیں از گوشۂ بیت الحزن افسانہ سرکن
نوائے عندلیبان چمن را نیست تاثیرے

اس زمین میں رشیدا کا ایک مطلع مشہور ہے اور واقعی اس سے بہتر مطلع اس زمین میں نکالنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ رشیدا کا مطلع یہ ہے:۔

تو از تمکین من از حیرت نیاید نے تقریرے — بداں ماند کہ ہمبزم است تصویرے بتصویرے!

وصال شیرازی کا مطلع بھی اچھا ہے ؎

نہ از آہم باور اہے، و نے با نالہ تاثیرے ۔ من و این درد بے درمان کہ ہیچش نیست تدبیرے!

یغمائے جندقی کی غزل اس زمین میں نہایت پُر لطف ہے۔ کہتا ہے : ؎

بجانان حالِ دل ناگفتہ ماند، کے نطق انقریرے ۔ زبان رانیست یارائے سخن، اے خامہ! تحریرے!

بیک زخم از تو قانع نیستم تعجیل اے قاتل! ۔ بجان مشتاقِ زخم دیگرم، اے عمر! تاخیرے!

بود کاں مہ بفریادم رسد، فریاد اے افغاں ۔ شود کاں سنگدل رحمے کند، اے آہ! تاثیرے!

بکارِ خود فرو درماندہ یغما پند اے ناصح ۔ جنونش ساخت رسوائی جہاں، اے عقل! تدبیرے!

غزل

ساقی دمِ صبوح است خورشید جام گرداں ۔ دورِ زمانہ یکدم حسب المرام گرداں

مہرِ جہاں فروزی فیضت گراں ندارد ۔ از مے ہلالِ ساغر ماہِ تمام گرداں

در مشربِ فتوت مے را حلال کردی ۔ در مذہبِ مروت غم را حرام گرداں

یک جرعہ میر ساند از فرش تا بعرشم ۔ خاکی نہادِ خود را عالی مقام گرداں

رندی و مستیم را، شاہد پرستیم را ۔ مشہورِ خاص کردی معلومِ عام گرداں

مقطع چنداں قابلِ توجہ نہ تھا۔ اس لئے چھوڑ دیا۔ اب کلامِ نظیری ملاحظہ ہو ؎

غزل لاجواب نظیری

ساقی صلائے عام است، کارے بکام گرداں ۔ داماں خم فراخ است، دورے تمام گرداں

ما و تو اندریں شہر چوں حسنِ نو غریبیم ۔ او را عزیز کردی، ما را غلام گرداں

آزاد خاطراں را فکرے عناں نگیرد ۔ گر غم گراں رکاب است، دل تیز گام گرداں

بے کیمیائے مستی تبدیلِ غم محال است ۔ یا مے حلال فرما، یا غم حرام گرداں

هرچند بے بہائیم گنجشکِ این سرائیم　　قربانِ سر نیزرم برگردِ بام گرداں
بے تو بتلخ کامی شبہا بروز بردیم　　با ما بشادمانی یک روز شام گرداں

حکم شراب و شاہد پنہاں مکن نظیری
پیغام خاصِ خود را دستورِ عام گرداں

غزل

تو اگر بشعلہ شوئی خطِ سر نوشت ما را　　نشود سترده ہرگز غمت از سرشت ما را
چہ کنم اگر نہ چوں نے ہمہ را نالہ پوئم　　کہ جہاں بشادمانی نفسے نہ ہشت ما را
زدہ در شکنجِ مجمر بسپند طعنِ خامی　　تفِ سینہ وانہ دل چہ قدر برشت ما را
بہزار داغِ حسرت چہ کنم چرا نسوزم　　کہ پئے فتیلہ گردوں رگ و ریشہ رشت ما را
چہ کرم کدام منت زخرابہ جہانم　　کہ بزیرِ سر شبے ہم نگذاشت خشت ما را
برو از دلِ پر آتش ہمہ شب چراغ دارم　　کہ دہد نسیم کویت خبر از بہشت ما را
بدرِ دگر چہ پویم سر و خاک بے نیازی　　چو مرادِ دل برآمد ز درِ کنشت ما را
نہ بنخلِ طور دلہرم نہ ببدرہ التفاتے　　کہ ازیں میانہ دہقاں بکنار کشت ما را

نبود حزیں از انم بزلالِ خضر ذوقے
کہ برات عمر ساقی بقدح نوشت ما را

اس زمین میں ایک شعر ملا ذوقی اردستانی کا مشہور ہے۔ واقعی لاجواب ہے
نہ شگوفہ نہ برگے نہ ثمر نہ سایہ دارم　　ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت ما را
مولانا نظیری کی غزل قابل توجہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎
تو اگر ز کعبہ راندی وگر از کنشت ما را　　غمِ بندہ پرورِ تو بدرے نہ ہشت ما را

چو حدیث راست گویاں ہمہ مذاق تلخ — بسفینۂ عزیزاں نتواں نوشت مارا

گل و برگ خانۂ ما ہمہ بلبلانِ مست اند — کہ بعاشقی برآمد ہمہ کار و کشت مارا

کہ نشست نیم ساعت برِ ما زلال طبعاں — کہ ز پردہ بر نیامد ہمہ خوب و زشت مارا

زعتاب تلخ ساقی دلِ ما غبار دارد — بحلاوتِ حریفاں نتواں سرشت مارا

بتواضعِ جم و کے سرِ ما فرو نیاید — کہ حدیثِ عشق و سودا شدہ در سرنوشت مارا

بصداع غم نظیری زخمار بادہ رستم
نکند دماغ خوشبو گل صد بہشت مارا

صہبائی دہلوی نے بھی اچھی غزل لکھی ہے اور تتبع استاد کا حق ادا کیا ہے۔

غزل صہبائی

نہ ہوائے کعبہ در دل نہ سر کنشت مارا — چو ازو شدیم دیگر چہ زخوب و زشت مارا

نہ چو روئے دوست حورش نہ چو کوئے او قصورش — بچہ میتواں کشیدن بسوئے بہشت مارا

نظر قضا نداند کہ قدر چو نقش عنقا — بصحیفۂ ارادت بکجا نوشت مارا

پس ازانکہ ذرہ ذرہ ببرد ہوا بغارت — شود از تو باز خرمن ہمہ کار و کشت مارا

بنظارہ گاہِ محشر دل و دیدہ باز بخشند — بشدیم خاک آخر غم او نہ ہشت مارا

سر جلوہ داشت حسنش غم عشق چون سجنجل — بصفائی دیدہ دل ہمہ تن سرشت مارا

دلِ خرم از دو عالم دلِ ما و یکجہاں غم — بود از غبارِ خاطر خطِ سرنوشت مارا

نہ رسیدہ گردم قلنم حویش خود را
نشود کہ بفگند کس بجفائے خشت مارا

مولوی ابوالحلیم عاصم مرحوم متوطن کلکتہ (جن کا انتقال ۱۸۹۹ء عیسوی میں بمقام کانپور ہوا اور جن کی ذات پر بنگالہ کو ہزارہا ناز تھے) اخبار "زمانہ" مین جو کانپور

سے ہفتہ وار شائع ہوتا تھا ایک فارسی ڈراما نکالتے تھے۔ اُس ڈرامے کا ایک کیرکٹر "میرزا محسن" ہے۔ اس کی زبانی دو غزلیں اس زمین میں سنی جاتی ہیں۔ یہ غزلیں گو عاصم مرحوم کی عادت کے مطابق نہایت جلد اور بے پروائی کے ساتھ لکھی گئی تھیں پھر بھی نہایت پاکیزہ اور دلفریب ہیں۔ میرا مطلب ان کے یہاں درج کرنے سے یہ نہیں ہے کہ انکا مقابلہ نظیری یا حزین کی غزل سے کیا جائے بلکہ صرف اس لئے درج کرتا ہوں کہ یہ سب غزلیں ایک ہی زمین میں ہونے کی وجہ سے ایک قسم کا باہمی تعلق رکھتی ہیں جو علاوہ دلچسپ ہونے کے اربابِ فن کی نظر سے مخفی نہیں ہے۔

غزلِ عاصم

زبہشت نیست پروا کہ غمت بہشت مارا — نزدیم کعبہ ہرگز چو شوی کنشت مارا
چو بکارگاہِ عشقی ہمہ خوب و زشت ہیچ است — بچہ کار چشم خود بیں پے خوب و زشت مارا
بادائے لطف ساقی دل و جاں سیاہ مست است — سرِ خم چو باز کردہ بسپرد خشت مارا
چہ نوشتہ بود کاتب بجبینِ ما ندانم — کہ مدام آں ستمگر بستم نوشت مارا
بتو حور و جامِ کوثر بہ بہشت باد زاہد — کہ بس است یار و بادہ بکنار کشت مارا
بسگت نوید جاناں کہ جہان بے مروت — سرِ آتشِ محبت ہمہ تن برشت مارا

وطن و وطن پرستی تو زمن مپرس عاصم
کہ فلک بخاکِ غربت زازل سرشت مارا

دُوسری غزل جو لکھی ہے اُس میں "بچہ کار کشت مارا" سے "کشت" کو ردیف کرلیا ہے اُور "کار" کو قافیہ۔ اس سے زمین نہایت مشکل ہوگئی ہے مگر عاصم کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ مطلع کتنے زور کا کہا ہے ؎

ز دو فصل دستِ قدرت بکنار کشت ما را — نہ خزاں و ماند ما را نہ بہار کشت ما را

گلہ اے شکستہ بالی کہ بموسم بہاراں
تو ز باغ دور بردی بہ ہزار گشت ما را

نہ ثمر بدست دارم نہ گلے بہار کردم
مگر اینکہ چرخ شاخے ز چنار گشت ما را

نکنیم شکوہ ہرگز سر لطف و نسیہ زاہد
تو بگیر باغ جنت بگذار گشت ما را

ہمہ سختی جہاں را دلِ خندہ ناک دارم
کہ چمن طرازِ خلقت چو انار گشت ما را

نہ شدیم سبزِ عاصم بہ ہزار آبیاری
بزمینِ ہند دہقاں دو سہ بار گشت ما را

رضا علی وحشت

سفرنامۂ یورپ

منشی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور نے اپنے اُس سفر کے حالات جو صاحب موصوف نے سنہ ۱۹۰۰ء میں پیرس اور دیگر ممالک قسطنطنیہ وغیرہ کا کیا کتاب کی صُورت میں نہایت مفصّل طور پر شائع کئے ہیں۔ یہ دلچسپ ہونے کے علاوہ مفید اور کار آمد بھی ہیں۔ گو بحیثیت مجموعی کتاب میں کوئی نمایاں نقص نہیں لیکن اگر زبان کی احتیاط زیادہ کی جاتی تو کتاب کا لُطف دوبالا ہو جاتا۔ ضخامت ۹۰۰ صفحہ لکھائی چھپائی خاصی۔ قیمت (للعہ) ۸/

اڈیٹر صاحب پیسہ اخبار لاہور سے ملتی ہے۔

فریبِ جہان

آہ! روزِ اوّل ہمیں طلسم بندیٔ دُنیا کے احوالِ جگر فرسا سے کچھ بھی آگاہی نہ ہوئی کہ کاروانِ عدم کو اس جہان کے دوراہے میں سخت منزلیں پیش آئینگی اور دشوار گذار مراحل کا سامنا ہوگا۔ دین وایمان کے دشمن۔ جان کے خریدار۔ آبرو کے گاہک سدِّراہ ہونگے۔ صفِ کارزار آراستہ کرینگے اور ہم کو بغیر جنگ کئے کسی طرح منزلِ مقصد تک پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔ کیونکہ اس وادیٔ مرگ انجام میں وقتِ نزولِ کارواں سے تا ہنگامِ رحلت کوئی متنفّس خوش اور امن نہ رہیگا۔

ہنوز اس خرابہ جنت نما میں قدم بھی نہ جمے تھے کہ دشمن نفسِ امّارہ کو فوج جرّار اور حربہائے مختلف کے ساتھ کمین گاہ میں مستعد پیکار دیکھا۔ حالانکہ شہنشاہ اعظم نے ایمان سا مستحکم قلعہ اور احکامِ شریعت کی سی جان نثار فوج عنایت کی تھی۔ سلطان اعضائے جسم نے زور سے پہلو میں ٹھوکر دیکر کہا کہ جلد قلعہ بند ہوکر حریف کا بہ آسانی مقابلہ کر۔ ہر چند وزیر عقل نے للکارا کہ ہمت نہ ہار۔ جی نہ چھوڑ۔ میں آشنائے راہ ہوں۔ جلد قدم بڑھا کہ تجھے قلعہ میں داخل کرکے اپنے حقِ خدمت سے ادا ہوں۔ مگر افسوس! ہمارے ہوش ایسے گئے کہ پھر کسی طرح نہ آئے۔ وہ حالت ہوگئی کہ جیسے بجلی کی چمک سے آنکھیں بند اور بادل کی گرج سے دل تپاں اور لرزاں ہوجاتا ہے۔ نامساعدتِ طالع نے اُس وقت تک ہوش نہ آنے دیا جس وقت تک کہ دشمن سلح شور کا محاصرہ کامل نہ ہولیا۔ جب سر سے پانی گذر جائے تو کیا علاج ہو۔ حریفوں نے دوست کو بھی دشمن بنالیا اور ہمیں فریب آمیز تسلیوں اور دلداریوں میں ایسا پھانسا کہ اُن کی

دشمنی مرتے مرتے نہ کھلی اور ہم اس کمبخت نفس امارہ کو مخلص صادق اور حبیب راسخ سمجھنے لگے۔ قلعہ بند بھی نہ ہوئے کہ غنیم کو شکست دیں اور اسکے حملوں سے محفوظ رہیں۔ اسکے تیروں کے آماجگاہ نہ ہوں۔ چنانچہ بہ اطمینان تمام بستر عیش پر دراز ہوئے۔ اور اس فرودگاہ عارضی کے سامان زیب و زینت اور نقش و نگار کو دیکھ کر ایسا محو ہوئے۔ گویا ہم یہیں کے لئے آئے تھے اور اب ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔

آہ! باغ جہاں کے میوے ایسے خوش ذائقہ معلوم ہوئے کہ اعتدال سے زیادہ کھانے لگے جس کے باعث سیر خوری یا حرام خوری کے عادی ہو گئے کہ حالت اس درجہ پہنچ گئی کہ احکام شریعت کو ایک فعل عبث سمجھ کر ان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان میووں میں خدا جانے کہاں کی ایسی لذت تھی جن کے کھانے سے حریص ہو گئے کہ سال میں تیس روزوں کا بھی پرہیز گرسنگی نہ کر سکے۔

آہ! چمنستان جہاں کی ہوا کیسی خوشگوار تھی جس کے ایک ہی جھونکے نے دیدہائے آخربیں کو جھپکا دیا اور دوسرے جھونکے نے تو دونوں جہان سے غافل ہی کر دیا۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے بیخبر ہو گئے اور جب فرشتۂ قابض ارواح نے للکارا تو آنکھیں کھلیں اور رخساروں پر اشک انفعال بہا کر ایسی بند ہوئیں کہ روز حشر شور صور اسرافیل سے وا ہوئیں۔

ہم کو خواب پریشان کی طرح خیال ہے کہ پہلے ہمارا کارواں جس عالم میں تھا وہ ایسا روح پرور تھا کہ وہاں سے دوسری جگہ جانے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ دفعتاً کسی کا جمال دلفریب دیکھ کر سودائے عشق میں گرفتار ہو گئے اور آتش حسن نے وہ گرمی پیدا کی کہ شعلہ ہائے ذوق وصال بھڑکنے لگے۔ تمنائے باز دید نے کمر ہمت مضبوط باندھی۔ شوق ناصیہ سائی آستانۂ یار نے

رہ نوردی پر آمادہ کر دیا اور رفتہ فلک عشاق سُبحان ربّنا کہتا ہوا ازل سے ہستی کو روانہ ہوا اور یکے بعد دیگرے سرائے دہر میں کہ منازلِ عدم سے پہلی منزل ہے مقام کرنے لگا۔

اہلِ کاروان کیا جانتے تھے کہ یہ منزل سرتاسر طلسم بند قدرت ہے۔ نہ اس دہر کو ثبات ہے نہ اسبابِ دہر کو استحکام۔ بظاہر تو یہاں کے ویرانے تک آبادیوں سے زیادہ بہار خیز معلوم ہوتے ہیں۔ خارستان گلشن سے زیادہ نظر فریب اور خاروں میں گلوں سے زیادہ نرمی محسوس ہوتی ہے۔ حالانکہ ان میں برچھی کی انی سے زیادہ سختی اور تیز نگاہ سے زیادہ تیزی ہے۔ یہاں کی بہار البتہ عجیب بہار ہے مگر بالکل ناپائدار اور خزاں کے تحت میں ہے۔ یہاں کی زندگی عجب پیاری زندگی ہے۔ گو اس زندگی پر موت سی جابر اور نا آشنائے رحم کی حکمرانی ہے۔

افسوس اس نفس امارہ کا جادو ہم پر چل گیا اور ہم ایسے مسحور ہوگئے کہ خود داری نہ ہوسکی۔ دشمنانِ دین دوستوں کے بھیس میں اپنا کام کر گئے۔ انکی چرب زبانیوں نے ہمیں بالکل شیشہ میں اُتار لیا۔ ہمرزموں نے غمخواری کے پردہ میں ہمارے ساتھ عداوت کی اور ہمیں مار رکھا۔ پہلے تو اپنی نرم اور شیریں کلامیوں سے ہمیں موہ لیا بالآخر خود غرضیوں دُنیا داریوں کے پردے ہماری آنکھوں پر ڈالدیئے خود نمائی نخوت و کبر کی ایسی قہقہا دیوار ہمارے آگے اُٹھا دی کہ ساحل نجات ہماری نگاہ سے بالکل اوجھل ہوگیا۔ حتّٰی کہ ہم اپنے زعمِ باطل میں فنا کو بقا سمجھ کر با اطمینانِ تمام زندگی بسر کرنے اور مزے سے خرّاٹے لینے لگے۔

اے وزیر با تدبیر۔ اے عقل صائب رائے! اس میں شبہ نہیں کہ ہماری غفلتوں اور سہل انگاریوں نے تجھے ہدفِ تیرِ ملامت بنادیا۔ لیکن اب ہماری تقصیر سے درگذر کر۔ اور لاپروائیوں سے قطع نظر کرکے از سرِ نو بیاضِ شریعت سے قوانین

قدرت پڑھ کر سُنا دے اور اُنہیں ازبر کرا دے۔

عقلِ خرد پیشہ بادلِ ناخواستہ ہچکیوں اور آنسوؤں سے رو رو کر یُوں کہنے لگی کہ اَے غافل انجام! خوابِ خرگوش سے چونک اور چشم آخربیں کھول۔ قاصدِ اجل تیری بالین پہ آیا چاہتا ہے۔ اُسے قصد کرنے میں جو کچھ دیر ہو ورنہ طے مسافت میں کچھ عرصہ نہیں گذرتا۔ پھر وُہ کسی کو مُہلت نہیں دیتا۔ جو جس حال میں ہو اُسی حال میں اُسے کشاں کشاں لیجاتا ہے۔ بلکہ جو سامانِ سفر اور زادِ راہ نہیں رکھتا اُس پہ اَور زجر و توبیخ کرتا ہے اور بڑی بے رحمیوں سے کام لیتا ہے اور جن کے پاس سازِ سفر ہیں۔ اُن کا سفرِ آخرت بہت جلد تمام ہو جاتا ہے خیر۔ میں تیرے آگے ہوتی ہوں۔ تو میرے ساتھ ہولے۔ کہ مَیں تجھے شاہراہِ نجات پر لگا دوں اور پھر اگر بھٹکنا تو رہنمائے شریعت سے رجوع کرنا وُہ چشم زدن میں تجھے منزلِ مقصود کا راستہ بتا دیگا۔ وہاں پہنچتے ہی اعمالِ شریعت تعلیم کردۂ اُستادِ ازل کی مزاولت شروع کر دینا اگر طالع نے رہبری کی تو اثنائے عمل خوانی میں گہری نیند آجائیگی اور پھر آنکھیں کُھلینگی تو اپنے تئیں دولت سرائے جاناں پر پائے گا +

سیّد علی سجّاد - دہلوی عظیم آبادی

گذشتہ پرچہ کے ساتھ ہم دو گروپ خدیوانِ مصر کی تصویروں کے دے چکے ہیں اُن میں سے ایک گروپ نومبر کے پرچے کے حصّہ کا تھا۔ مگر چونکہ اُن تصویروں کے ساتھ جو مضمون دیا گیا تھا وُہ بے لطف ہو جاتا اگر ایک گروپ اکتوبر کے مخزن کے ساتھ اور دُوسرا نومبر کے پرچے کے ساتھ دیا جاتا۔ اِس لئے اکتوبر میں دونوں کو یکجا کر دیا اور یہ پرچہ بلا تصویر آتا ہے۔ دسمبر کے پرچے کے ساتھ حسب معمول تصویر ہو گی +

مینیجر مخزن

حکیم اکلیوبول

حکیم اکلیوبول ہمعمر و ہمعصر حکیم سونوں تھا۔ اگرچہ اعتبار کے لحاظ سے یہ حکما میں کمتر تھا۔ لیکن متمول آدمی تھا۔ اس کے باپ کا نام دجراس تھا۔ اور خاندان ہرقول سے منسوب تھا۔ شہر لنڈہ میں پیدا ہوا تھا جو جزیرہ اڈوسی میں سے ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ اس کے ظہور کے وقت شاہ اکرسیوس شہر لایا پر حکمران تھا۔ یہ بچپن ہی سے بڑے عقلا میں شمار ہوتا تھا۔ درمیانہ قد وجیہ اور قوی شخص تھا۔ ابتداء عمر ہی میں اس زمانہ کی رسم کے موافق فلسفہ پڑھنے کے لئے مصر چلا گیا تھا واپس آکر ایک مشہور عورت سے شادی کی جو نہایت ناز و نعمت عزت و حرمت کے ساتھ پلی تھی۔ اسی کے بطن سے اس کی لڑکی اقلوبین پیدا ہوئی۔ بڑی ہو کر یہ بھی اپنے باپ سے علوم حکمت حاصل کر کے ایسی حکیمہ ہوئی کہ اپنے زمانہ کے حکما سے سبقت لیگئی۔ خصوصاً اس امر میں کہ کلمات حکمت بر سبیل چیستان کہہ جاتی تھی جو اس کے باپ کا خاصہ تھا۔ بڑی ادیبہ۔ نیک طینت اور خوش خلق عورت تھی۔ اس کی خوش خلقی کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جو شخص اس کے باپ سے ملنے آتا خواہ کسی درجہ و رتبہ کا ہوتا اس کے پیر دھویا کرتی تھی۔

حکیم اکلیوبول ایک چھوٹی سی حکمت کا حاکم تھا۔ اپنے منصب کو اس نے باحسن وجہ نباہا۔ اس کی حسن تدبیر تھی کہ تمام رعایا سلطنت بمنزلہ ایک خاندان کے آدمیوں کے تھی۔ ان امور سے کہ جنکا انجام جنگ ہو بہت ہی بچتا تھا۔ اور دیگر بلاد و ممالک سے اتفاق رکھنا اسکو بہت پسند تھا۔ پردیسیوں سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس کے بڑے کلمات حکمت ان خطوں میں ہونے

تھے کہ جو وہ لوگوں کو لکھا کرتا تھا۔ اُن خطوط میں اکثر مسائل کو اس نے نہایت دِقّتِ نظر کے ساتھ حل کیا تھا۔ یا وُہ خط خود ایک چیستان مملو از حکمت ہوتے تھے اس قسم کی چیستان گوئیاں مصر میں مروج تھیں اور وہیں سے وُہ اس ڈھنگ کو سیکھ کر آیا تھا اور ملکِ یُونان میں رواج دیا تھا۔ اور اُن ہی کی وجہ سے اُس نے یہاں بڑا شہرہ پایا تھا۔ اس کی چیستانوں کا ایک نمونہ یہ ہے کہ میں بارہ بیٹوں کا باپ ہوں۔ اُن میں سے ہر ایک بیٹے کی تیس تیس لڑکیاں ہیں۔ ان لڑکیوں میں سے بعض بعض لڑکیاں تو نہایت خوبصورت ہیں۔ اور بعض نہایت بدشکل۔ یہ سب کی سب فنا ہونے والی نہیں ہیں۔ مگر ہر ایک کی عمر ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔" اس چیستان کا جواب ہے۔ سال و ماہ و روز۔

اسی حکیم نے شاہ میداس کی قبر پہ کتبے لکھے تھے۔ اور اس بادشاہ کی بے انتہا تعریف کی تھی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ کتبے اومیروس نے لکھوائے تھے۔ مگر یہ خیال اس لئے غلط معلوم ہوتا ہے کہ اومیروس شاہ میداس سے بہت پہلے مر چکا تھا۔

اس حکیم کے بعض اقوال یہ ہیں:۔

اصل فضائل یہ ہے کہ آدمی ظلم سے برکنار اور بدیوں سے فرار رہے۔ ہر چیز میں ترتیب و تامل ملحوظ رکھنا چاہئیے۔ تاکہ احمق ملک سے دُور رہیں۔ ہر شخص کو اپنے مرتبہ کے موافق زندگی گذارنی چاہئے۔ دُنیا میں احمقوں سے زیادہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اِنسان کو ہمیشہ اس میں کوشش کرنی چاہئیے کہ عظیم الرائے ہو۔ جاہل و خائن نہ ہو۔ دوست و دشمن کے ساتھ نیکی کرو کہ دوستوں کے ساتھ دوستی قائم رہے اور ممکن ہے کہ دشمن بھی دوست ہو جائیں۔ گھر سے نکلنے سے پہلے جس ارادے سے نکلے ہو اس پر غور کر لو۔ اور گھر میں واپس آکر

جو کچھ کیا ہے اُس میں تامل و فکر کرو - کم بولو - اور زیادہ سوچو - کسی کی نسبت بے ادبی و گستاخی نہ کرو - ہمیشہ اُن لوگوں سے مشورہ کرو کہ جنکو تم اپنے سے زیادہ عقیل سمجھتے ہو - اس طرح زندگی بسر کرو کہ لوگ تم کو تمہاری خوش نصیبی کا طعنہ نہ دے سکیں - اگر کوئی تمہارا دشمن ہو تو اُس سے صلح کر لو - کسی سے کوئی چیز قہر و غلبہ سے حاصل نہ کرو - اپنی اولاد کی تربیت و تعلیم میں کوشش کرو - غریبوں سے تمسخر نہ کرو - اگر زمانہ تمہارے موافق ہو تو مغرور نہ ہو جاؤ - اور اگر تنگی آجائے تو بیقراری نہ دکھلاؤ ہمیشہ اپنے کفو میں شادی کرو اگر ایسی عورت سے شادی کروگے جو حسب میں تم سے اچھی ہوگی تو اُسکے تمام رشتہ دار بمنزلہ تمہارے آقا کے ہونگے اور اس پر بھی تم ہی پر احسان رکھینگے - ہر باپ کو لازم ہے کہ اپنے بیٹوں کے لئے ایک تمیز خصوصی رکھے اور اُن کی قدر کرے - ایسا ہرگز نہ کرنا چاہیئے کہ بیٹوں کے بالغ ہوتے ہی اُنکی شادی کردی - بلکہ بعد اس کے کہ اُنکو کمال عقل اور حسن رُشد حاصل ہو جائے - آدمی کو چاہیئے کہ اپنی بیوی کی تعریف اجنبیوں کے سامنے نہ کرے - اور نہ اُن کے سامنے بیوی سے لڑے جھگڑے - ورنہ پہلی صورت میں وہ اپنا ضعف ظاہر کریگا - اور دوسری صورت میں دیوانہ سمجھا جائیگا -

جب حکیم اکلیوبول کو معلوم ہوا کہ حکیم سونون نے اپنے وطن کو بالکل چھوڑ دیا ہے تو حکیم موصوف کو لکھا کہ میں جانتا ہوں کہ تمہارے بہت سے ایسے دوست ہیں کہ جو اپنے گھروں کو تمہارا گھر سمجھیں مگر ساتھ ہی میرا یہ خیال ہے کہ تم اپنے ملک میں بھی اس آرام سے نہ رہوگے جیسے کہ شہر لندہ میں - یہ شہر بحریہ ہے اور بالکل آزاد - یہاں بیز ستراپت کا بھی کوئی خوف نہیں ہے - نیز آپکے دوست یہاں بیخوف و خطر آپسے آکر مل سکتے ہیں

حکیم اکلیوبول نے تمام عمر متوسط الحال لوگوں کی طرح گذاری - دُنیا کا فکر و غم عمر بھر اسکے پاس نہ آیا - اپنی بیوی بچوں اور اہل وطن کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا اور ہمیشہ

مہاکوی کالیداس

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا،
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلیے۔

زبانِ سنسکرت جو آج سے ہزارہا برس پیشتر سرتاجِ عالم تھی اور جسکو اب بھی اُم الالسنہ ہونے کا فخر حاصل ہو۔ اُس میں نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعری کے دفتر پائے جاتے ہیں۔ عرفانِ حقیقی کا نہایت عالیشان کام اور فلسفہ اور حکمت کا اشراقی اور الہامی چارج شاعری کے سپرد تھا۔ نیز خدماتِ مذہبی اور شاہی دربار کے بہت سے کام شاعری ہی سے متعلق تھے۔ اب بھی پرانے شلوکوں سے اُن کا پتہ چلتا ہو سنسکرت بجائے خود ایک ایسی زبان ہو جو دیوتاؤں کی زبان کہے جانے کی سزاوار خیال کیجا سکتی ہو اور اگرچہ اس کے اصول نے ہمیشہ اُسے اختلاطِ عام سے بچائے رکھا تاہم اُس کی شاعری نے وہ بلند مرتبہ حاصل کیا جو آپ ہی اپنا نظیر ہو؛ آج تک اُس کا حسن اور اُس کی بہتایت کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہوئی۔ مہابھارت اور رامائن کے زمانہ سے بہت پیچھے کئی بڑے بڑے اور ایسے مشہور شاعر گذرے ہیں کہ جن کی طبّاعی نے سنسکرت زبان کی شاعری کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔

جن شعرائے سنسکرت کی فکرِ بلند پرواز نے انکو اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی میں پہنچا دیا۔ اُن میں مہاکوی کالیداس کو نہائت بلند مرتبہ حاصل ہو! وہ صرف آسمانِ ڈراما پر ہی آفتاب ہو کر نہیں چمکا بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کا رزم نگار شاعر بھی گذرا ہی۔ یہ وہ مشرقی شاعر تھا کہ جسکی طبّاعی کی تیز شعاعوں نے مغرب کو بھی مطلع انوار بنا دیا۔ وہ صرف اپنے ہموطن شعراء کا ہی سرتاج نہیں بلکہ ساری دنیا نے اسکی اُستادی کا

لوہا مان لیا ہے!

اگرچہ زبانِ سنسکرت میں کئی مقبول شاعر ہوگذرے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ کالیداس کو اُن سب پر فوقیت ہے۔ جو حُسنِ قبول اس کے کلام کو حاصل ہوا وُہ کسی اَور کو میسّر نہیں ہوا۔ برتری تو ایک طرف کوئی اس کی ہمسری کا بھی دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اسکی تصانیف میں طبیعت کی روانی اور کلام کی متانت ایسی اعلیٰ درجہ پر واقع ہوئی ہے کہ اسکی کوئی دُوسری نظیر اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

بعض ماہرانِ فن کا قول ہے کہ زبانِ سنسکرت کی شاعری جو مبالغہ سے گذر کر غلو کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ مہا کوی کالیداس کے کلام میں اعتدال کی پابند نظر آتی ہے۔ اسکا کلام حسنِ شاعری کا ایک لطیف مرقع پیش کرتا ہے! یہ اس کا زورِ طبیعت ہی نہیں بلکہ اعتدال و رسلاست کا بھی سبب ہے کہ جرمن کا مشہور شاعر گوئیٹھے[۵۱] اسکا مسخر ہوگیا۔

مگر کالیداس کی سب سے بڑی تعریف جس کا ہم اوپر اشارۃً ذکر کرچکے ہیں یہ ہے کہ وُہ تمام اصنافِ سخن پر قادر تھا۔ جس طرح اُس کے ڈرامے بے نظیر مانے جاتے ہیں اُسی طرح اسکی رزمیہ نظمیں بھی لاثانی تسلیم کی گئی ہیں! جس طرح اُس نے ڈرامے کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا اُسی طرح اس کی شاعری بھی اس کے طبع رسا کے ذریعہ بلندی اور شہرت کے فلک الافلاک پر چمکی۔ اُس کی تصنیفات میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اُن کے مضامین نہایت پاکیزہ ہیں اور جن اشخاص کا اُن میں ذکر آیا ہے وُہ وفاداری اور نرم دلی کے ساتھ متصف ہیں! ایک اَور کمال یہ بھی ہے کہ جو کچھ اُس نے حوالۂ قلم کیا۔ اُس سے بہت زیادہ خود ناظرین کے متخیلہ کے لئے چھوڑا ہے۔

[۵۱] گوئیٹھے جرمن کا سب سے اعلیٰ شاعر گذرا ہے۔ وہ ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا ۱۸۳۲ء میں وفات پائی۔ اعلیٰ درجہ کا شاعر ہونے کے علاوہ وُہ ناولسٹ۔ آرٹسٹ۔ فلاسفر اور سائنسٹ بھی تھا۔

مہاکوی کالیداس کی اعلیٰ شاعری کا اثر کچھ ہندوستان ہی میں محدود نہیں ہے۔ بلکہ ممالکِ غیر کے علما بھی بے حد اُس کے کلام سے مستفیض ہوئے ہیں، وہ یکزبان ہوکر اس بات کے مقر ہیں کہ کالیداس شعرائے سنسکرت کا سرتاج ہے! بلکہ مشہور سیاح اور فلاسفر دُون ہمبولڈ[1] نے اُسکو تمام اقوام عالم کے شعرا میں ممتاز درجہ دیا ہے۔ اور سر مانیر ولیمس[2] و دیگر باکمال عُلمار نے اُسے شیکسپیئر[3] کا ہم پلہ کہا ہے! یہ تعریف کچھ کم نہیں ہے۔ جن لوگوں نے کلیات شیکسپیئر کو دیکھا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ شیکسپیئر صرف انگلستان کا نہیں بلکہ دُنیا کا نہایت بلند خیال اور اپنے پایہ کا اکیلا شاعر گذرا ہے، کالیداس فی الحقیقت اُسی کا ہم پلہ ہے! لیکن آخر وہ کیا چیز تھی جس نے اُس کے کلام کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کا درجہ عطا کیا؟ اس کا جواب مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے اِسطرح دیتے ہیں کہ

"کالیداس کا طرز بیان نہایت سادہ ہے" مگر سادگی دلکشی اور جامعیت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ گویا کہ دوسرے الفاظ میں سہل ممتنع ہے۔ وہ پورانوں کی لفاظی سے بھی اسی طرح دُور ہے جس طرح متاخرین کے تصنع سے اور اعجاز نما ایجاد نے اُس میں ایک خاص خوبی پیدا کر دی ہے۔ اگرچہ اُس کے کلام میں بھی صنائع و بدائع موجود ہیں مگر ان میں آورد کا نام نہیں ہے اور خاص کر تشبیہ میں اسکو یہ کمال ہے کہ ہر تشبیہ معنی کے لحاظ سے دلفریب اور باعتبار موزونیت تام ہے۔ اس کا طرزِ ادا اس کی پیاری گنگا کے

---

[1] الگزنڈر وون ہمبولڈ گذشتہ صدی کا نہایت مشہور فلاسفر محقق اور سیاح گذرا ہے۔ وہ ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا اور ۱۱ فروری ۱۸۵۹ء کو وفات پائی۔ [2] سر مانیر ولیمس زبان سنسکرت کے ایک عالم و فاضل تھے۔ وہ ۱۸۱۹ء میں بمقام بمبئی پیدا ہوئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور وہیں ۱۸۶۰ء میں زبان سنسکرت کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اُنکی تصنیفات بے شمار ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں انکو بموقعہ افتتاح انڈین انسٹیٹیوٹ "(واقعہ آکسفورڈ) "نائٹ" کا خطاب ملا۔ یہ انسٹیٹیوٹ اُنہی کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی۔ [3] ولیم شکسپیئر انگلستان میں سب سے بڑا ڈراما نویس اور رزم نگار شاعر گذرا ہے جو اپنے اہل وطن کی قدردانی کے باعث "ملک الشعرائے انگلستان" کہلایا۔ ماہ اپریل ۱۵۶۴ء میں یہ پیدا ہوا اور ۲۳- اپریل ۱۶۱۶ء [illegible]

مشابہ ہے۔ جس کا صاف شفاف پانی عجیب دلربا شان سے گنگناتا

لہراتا آہستہ آہستہ بہتا چلا جاتا ہے اور دونوں طرف ہرے بھرے

کناروں پر رنگ برنگ کے قدرتی پھول معشوقانہ انداز سے جلوہ فروشی

کرتے ہیں۔ اسکو دوسرے شعرا پر فکر کی بلند پروازی اور علو خیالات میں

خاص ترجیح ہے۔ مناظر فطرت کے بیان میں اسکو بڑی قدرت ہے اور

اس کے الفاظ کچھ ایسا طلسم کرتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور انسان

علائق دنیا کو بھول کر کسی اور عالم میں پہنچ جاتا ہے"!

فی الحقیقت کالیداس کی شاعری کی سچی تعریف یہی ہے کہ وہ الفاظ میں قدرت کی چلبلی تصویر کھینچکر سامنے کھڑی کر دیتا ہے اور انسان کے دل میں داخل ہو کر اس کی اندرونی جذبات اور خیالات کو عجیب پیرایہ اور اس کے اصلی روپ اور رنگ میں دکھاتا ہے اگرچہ اس میں کلام نہیں کہ اس کی شاعری مبالغہ سے خالی نہیں ہے اور شعرائے مشرق کے تتبع میں بعض بعض جگہ مبالغہ سے گذر کر اغراق و غلو سے بھی کام لیا ہے لیکن اس کی تشبیہیں اور استعارے اس غضب کے ہیں کہ ان سے صرف جذبات طبعی و بلند پروازی کا اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ کالیداس کا مطالعہ قدرت نہایت زبردست اور وسیع تھا۔ جن لوگوں کو اس کا کلام سمجھنے کی صلاحیت ہے وہ اس کے ایک ایک شعر پر تصویر حیرت بنجاتے اور عالم بیخودی میں محو ہو کر پکار اٹھتے ہیں "سبحان اللہ! کیسا ذہن رسا پایا ہے"! گویا باتوں ہی باتوں میں رگ جان پر نشتر لگانے کی اس کو قدرت حاصل ہے۔

کالیداس کے حالات زندگی اس قدر پردہ اخفا میں ہیں کہ یورپین محققین و مبصرین بھی انکا کچھ سراغ نہ لگا سکے۔ البتہ بندہ مالا کے مصنف نے جو اس عدیم المثل شاعر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ کالیداس راجہ

بکرماجیت[۵۱] والی اُجین کے دربار میں راج کوی (ملک الشعرا) کے درجۂ اعلیٰ پر فائز تھا - بکرماجیت کے دربار میں وہ مشہور عالی دماغ عالم تھے - جو نورتن کہلاتے تھے - اُنہی میں کالیداس بھی ایک تن تھا جیوتر و دیا بھرن کے مصنف نے نورتن کے ناموں کی صراحت اس طرح کی ہو :- (۱) دھنونتری (۲) کشپنک (۳) امرسنگھ (۴) شنکو (۵) بیتال بھٹ (۶) گھٹ کھرپر (۷) کالیداس (۸) وراہ مہر (۹) دروچی - اِس روایت سے کل محققین نے اِتفاق کیا ہو - کیونکہ کالیداس نہ صرف درباری رسم و رواج سے پُورے طور پر آگاہ نظر آتا ہو - بلکہ اُس کی تصنیفات میں جہاں کہیں بکرماجیت کا نام آیا ہو اُس نے اُسے نہایت ادب و احترام کے ساتھ لیا ہو، اسی طرح اُجین کے بیانات میں بھی حب الوطنی کی بو آتی ہو - پس ان حالات سے یہی نتیجہ اخذ ہو سکتا ہو کہ وُہ بکرماجیت کے دربار کا ایک بے بہا جوہر تھا -

کالیداس نے اپنی تشبیہوں اور استعاروں میں جس قدر درختوں اور بیل بوٹوں سے کام لیا ہو وُہ کوہ ہمالیہ کے سلسلہ میں پیدا ہوتے ہیں اور اُن میں سے زیادہ تر کشمیر میں پائے جاتے ہیں - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہو کہ وُہ کشمیر کا متوطن تھا لیکن یہ خیال کہاں تک صداقت پر مبنی ہو؟ ہم اس پر کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے - کُتب تواریخ سے اُس کے حالات پر کچھ روشنی نہیں پڑتی ہو اور نہ اس کی ولادت وغیرہ کا حال ہی کھلتا ہو - روایات سے صرف اسی قدر معلوم ہوا ہو کہ کالیداس

---

۵۱ بکرماجیت خود بھی ایک عالم پنڈت تھا - اس سے نہ صرف اسکی مملکت میں علم و ہنر کا رواج ہوا بلکہ اس کی قدردانی - نے ایسے ایسے قابل آدمی پیدا کئے جو سابق کے علما پر بھی بدرجہا سبقت لیگئے -

۵۲ مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی - اے کے خیال میں کالیداس قوم کا برہمن تھا - لیکن ہم اس رائے کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں - کیونکہ برہمن خواہ کتنی ہی پستی کی حالت میں بھی رہے ہوں - وُہ داس (غلام) ہرگز نہیں کہلا

قوم کا گڈریہ تھا۔ لیکن علما کی صحبت اور اپنی لائق اہلیہ ودیا دھری کی تعلیم کی برکت سے وُہ کمال حاصل کیا کہ ایک بھی اسکی باریک بینی و نکتہ سنجی کی گرد تک کو نہ پہنچ سکا۔ اسکی تصانیف و نیز روائیتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسکو سیاحت کا بھی بیحد شوق تھا اور بالخصوص شمالی ہند کا اُس نے بہت دَورہ کیا۔ وُہ سیر و شکار کا بھی دلدادہ تھا اور از بسکہ اس کی طبیعت حُسن پرست تھی مگر وہ عیاش نہ تھا۔ اُس کی تصانیف اس امر پر بھی روشنی ڈالتی ہیں کہ مذہب و فلسفہ مذہب پر بھی اُسکو خاصا عبور تھا، نیز یوگ اور ویدانت سے بھی واقف تھا اور قدرے طب اور نجوم میں بھی دخل رکھتا تھا۔ یہ بھی تحقیق ہوا ہے کہ آخری عمر میں کالیداس سنیاسی[۱] ہو گیا تھا۔

شاکت مت والے "قدرت پرستی" کے دعویدار ہیں اور چونکہ کالیداس کو قدرت کے ساتھ ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا۔ وُہ اس کے "شرنگار" مواصلت کی کیفیت عمدہ الفاظ میں بیان کر سکتا تھا۔ لہذا یہ لوگ اس کو شکتی کا بھگت سمجھکر بیحد عزت و تعظیم سے پیش آتے تھے اور اپنی ضعیف الاعتقادی سے اسکو وہ درجہ دینے کو تیار تھے جسکو ہر سلیم الطبع شخص ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا۔ اُجین میں چھپرا ندی کے کنارے پر اس لاثانی شاعر کی سمادھی (مقبرہ) ہے۔ یہ وُہ جگہ ہے جہاں قدرتی مناظر انسان کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتے ہیں اور جہاں دریا کی فیاضیوں نے ایک لہلہاتا ہوا سبزہ زار چرندوں اور پرندوں کے مسکن کے لئے بنا دیا ہے۔

کالیداس کے نام سے ایک اَور بھی سنسکرت زبان کا مشہور شاعر گذرا ہے۔

[۱] منوسمرتی کی شرع کے رو سے برہمن کے سوا کسی اور ذات کا آدمی سنیاس اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ سنیاسی کے معنے "تارک" کے ہیں اور تارک ہونے کے لئے کسی قوم کے آدمی کو بھی ممانعت نہیں ہے پس یہ قرین قیاس ہے کہ تارک کے معنوں میں لفظ سنیاسی کا استعمال کیا گیا ہو ۔

اس کا ذکر راجہ بھوج کے عہدِ حکومت میں آتا ہی - اسکی نسبت مشہور ہی کہ وہ ورنگل (صوبہ مدراس) کا رہنے والا تھا - اس سے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ کالیداس بکرماجیت کے زمانہ سے لیکر بھوج کے زمانہ تک زندہ رہا - مگر یہ خیال ہر پہلو سے غلط ہی - اوّل تو ان دونوں کی شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہی - دوم ایک طول طویل زمانہ دونوں راجوں کے درمیان حائل ہی - یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہی کہ ایک ہی کالیداس اس دراز مدت تک موجود رہا ہو - چنانچہ بان بھٹ اپنی کتاب ہرش چندر میں لکھتا ہی کہ

"کالیداس کے زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں وہی لطف آتا ہی جو تُلسی کی منجری دیکھنے سے ویشنوؤں کو حاصل ہوتا ہی"۔

بان بھٹ شالباہن کے سمت ۵۰۲ میں گذرا ہی اور بھوج کا جلوس سمت ۹۰۴ (شالباہن) میں ہوا تھا - اس سے صاف ظاہر ہی کہ کالیداس بھوج سے کہیں پہلے ہوا ہی - اس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں! اگر بھوج کا کالیداس بھی زبان سنسکرت کا ایک عالم شخص تھا اور بہت سی تصنیفات اس کی یادگار ہیں -

مہاکوی کالیداس برہسپتی کے زمانہ میں تسلیم کیا گیا ہی - اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہی کہ وہ پہلی صدی عیسوی میں گذرا ہی - اس پر کل محققین نے اتفاق کیا ہی - سید محمد حسین رضوی نے اپنی کتاب "ڈراما پر ایک دقیق نظر" میں ہندوستان میں ڈراما کا آغاز پانچویں صدی عیسوی میں بتایا ہی - یہ ایک ایسی رائے ہی کہ جسکو کوئی صحیح العقل ماننے کے لئے تیار نہوگا - اوّل تو خود کالیداس ہی اوّل صدی عیسوی میں ہوا ہی جسکو سنسکرت ڈراما کی رُوح روان کہنا چاہئے - علاوہ ازیں مہابھارت میں صاف لکھا ہی کہ سری کرشن جی کے بیٹے بہ نفسِ نفیس ایک

ڈراما میں پارٹ لیتے تھے اور جدید محققین کی تسلیم کردہ رائے کے مطابق بھی مہابھارت سن عیسوی سے چودہ سو برس پیشتر کی تصنیف ہی۔ پانینی جو زبانِ سنسکرت کا ایک نہایت عالم و فاضل اور علمِ صرف و نحو کا مقبول مصنف گذرا ہی۔ اپنی شہرۂ آفاق کتاب میں شیلالین اور کرسو کا ذکر کرتا ہی جو ڈراما نویسی کے آفتاب تھے۔ یہ مصنف بھی قبل از مسیح گذرا ہی۔ بہرکیف یہ وُہ تاریخی واقعات ہیں کہ جن میں اب اختراع کی گنجائش نہیں!

کالیداس کی تصانیف کثیر التعداد بتائی جاتی ہیں۔ لیکن محققین نے سولہ کتابیں اس سے منسوب کی ہیں اور بعض کی رائے میں کسوٹی پر کسنے سے صرف سات ہی پوری اُترتی ہیں یعنی:-

(۱) **رُت سنگھار**۔ اس میں ہندوستان کے چھ موسموں کو چھ نظموں میں اس خوبی اور لطف کے ساتھ دکھایا ہی کہ مطالعہ سے موسمی کیفیت کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔

(۲) **کمار سنبھو**۔ اس میں جنگ کے دیوتا کارتکیا کی پیدائش کا ذکر ہی۔

(۳) **رگھو بنس**۔ یہ بڑی مشہور نظم ہی۔ اِس میں رگھو کے باپ راجہ دلیپ سے لیکر راجہ رام چندر کے خاندان کے حالات اور اس کی اور اُس کے دادا رگھو کی مہمات کا حال نہایت دل کش پیرایہ میں لکھا گیا ہی۔

(۴) **میگھ دُوت** (یعنی قاصدِ ابر) اِس میں ایک ہجر کے مارے قیدی نے ابر کو قاصدِ محبت بنایا ہے۔

(۵) **شکنتلا**۔ اس کا قصہ مہابھارت سے اخذ کیا گیا ہی۔ یہ وہ مشہور ناٹک ہی جس کی چار دانگ عالم میں شہرت مچی ہوئی ہی۔ بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہی۔ یورپ و امریکہ کے بعض مقامات میں اس کا تماشا بھی کیا جاتا ہی۔ اس میں ایک خاص خصوصیت یہ ہی کہ اعلیٰ ذات والوں کی گفتگو تو شستہ سنسکرت میں تحریر کی گئی ہی اور ادنیٰ اقوام کی پراکرت میں جو نیچ اقوام کی سنسکرت کہلاتی ہی[۱]۔

---

[۱] سنسکرت ڈراما کی سب سے ممتاز اور عجیب خصوصیت یہی ہی کہ اس میں کل ڈراما کے اشخاص اپنے خیالات کا اظہار ایک ہی زبان کے ذریعہ سے نہیں بلکہ اپنے طبقے اور حیثیت کے لحاظ سے مختلف زبانوں میں کرتے ہیں۔ یہ اظہارِ خیالات کی تدبیر عجیب ہی کسی دوسرے ملک کے ڈراما میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف سنسکرت ہی کا حصہ ہی۔

(۶) **وکرم اُروسی**[1] - یہ بھی ایک مشہور ناٹک ہے - اس میں پریاگ کے راجہ وکرم اور پری اُروسی کے عشق کا قصہ لکھا گیا ہے - یہ پری درخت کی ایک بیل کی صورت بن گئی تھی -

(۷) **مال وکاگنی متر** - یہ بھی ایک ناٹک ہے -

جن محققین نے کالیداس سے سولہ کتابیں منسوب کی ہیں - وہ متذکرہ بالا سات کتابوں کے علاوہ ان نو کتابوں کو بھی کالیداس کی تصنیف مانتے ہیں (۸) مہاپد ناٹک (۹) گنگا تشٹک (۱۰) رشتش کاویہ (۱۱) کرپور منجری (۱۲) شرت بودھ (۱۳) پرشنوتر مالا (۱۴) اسجن رجن (۱۵) شرنگار - (۱۶) ہاسیارنو -

کالیداس کی تقریباً کل تصنیفات کا ترجمہ زبانِ انگریزی میں ہوچکا ہے - اور بعض کا ترجمہ فرانسیسی - لاطینی - بنگالی و دیگر زبانوں میں بھی ہوا ہے - لیکن کس قدر حیرت و استعجاب کا مقام ہے کہ وکرم اُروسی کے ترجمہ کے سوا کوئی اور بہترین ترجمہ زبانِ اُردو میں نہیں ہوا جس سے ہمارے لٹریچر (علم ادب) میں اضافہ ہوسکے - اگر ہمارے باکمال شعراء **کالیداس** کی تصنیفات کو ملاحظہ فرمائیں تو دیکھینگے کہ اُن کی طبع رسا اور بار آور قوتِ خیال کے لئے کیسا وسیع میدان موجود ہے اور اُن کی جدت پسند طبائع کے لئے ان میں کیسے کیسے اچھوتے مضامین بھرے پڑے ہیں - اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارا لٹریچر بھی ایسے صنفِ کلام کے فیض سے محروم نہ رہے - جس سے دوسرے ملک والوں نے بیحد فائدہ اُٹھایا ہے - اور چونکہ **کالیداس** کی تصانیف میں وہ خاص تاثیر موجود ہے جو انسان کے دماغ کو بلند پروازی کی طرف مائل کرسکتی ہے - اس لئے ہمیں اُمید رکھنا چاہیئے کہ ہمارے شعرائے نامدار اس طرف توجہ فرماکر نہ صرف اپنے ملک کے لٹریچر کو فائدہ پہنچائینگے بلکہ خود بھی سچی اور لازوال شہرت حاصل کرینگے !!!

پیارے لال شاکر میرٹھی

[1] وکرم اروسی کا اُردو ترجمہ ہمارے مکرم مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی - اے نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کیا ہے اسکی قیمت صرف ۱۲ ہے *

ہندوستان کی حسین لڑکی اور اس کی ہنسی

دل کو لبھا رہا ہے انداز اس ہنسی کا
پیش نظر ہے نقشہ کھلتی ہوئی کلی کا

یہ دانت صاف اس کے یہ ہونٹھ لال اسکے
دو نیم رنگ گل ہیں چہرے میں گال اس کے

قدرت نے ان لبوں کو کیا لال کر دیا ہے
دو حرف لکھ کے گویا شنجرف بھر دیا ہے

چمکے وہ دانت اس کے رنگیں دہن میں دیکھو
ہیروں کی کان نکلی ملک یمن میں دیکھو

دونوں لبوں کو دیکھو۔ رخ دیکھ کر دہن میں
جوڑا یہ لال کا ہے رہتا ہے جو چمن میں

اپنی ہنسی کی شاید اسکو خبر نہیں ہے
کیا پھول کھل رہے ہیں اس پر نظر نہیں ہے

واقف نہیں کہ کتنا زیبا ہے حسن اس پر
واقف نہیں کہ اس نے بجلی گرائی کس پر

خود حسن کو سمجھتی تو شرم اس کو آتی
ہونٹوں کو بند کرتی دانتوں کو یہ چھپاتی

گالوں میں پڑ گئی ہے کچھ کچھ شکن ہنسی سے
چمکا ہے حسن فطرت اس حسن عارضی سے

دانتوں کے نور سے دل وارفتہ ہے ہنسی پر
کی ہے جلا ہنسی نے اس حسن قدرتی پر

چشمے میں منہ کو دھونا اور بار بار ہنسنا
کیا لطف دے رہا ہے بے اختیار ہنسنا

پانی میں دیکھتی ہے رخ اپنا پیارا پیارا
خوش کر رہا ہے اسکو شاید یہی نظارا

جنبش میں عکس رخ کو ہنس ہنس کے دیکھتی ہے
لہروں سے کھیلنے کا شاید سبب یہی ہے

منہ دھو رہی ہے جس جا ہیں مچھلیاں بھی اس جا
شاید ہنسا رہا ہو نظارہ مچھلیوں کا

مچھلی پکڑ رہی ہے چاؤ میں دل لگی سے
ملتی نہیں وہ اس کو ہنستی ہے یہ اسی سے

ہنسنے کا جو سبب ہے وہ اب سمجھ گئے ہم
دانتوں کے کھولنے کا مطلب سمجھ گئے ہم

آئینہ ہے نہ اس دم پاس اس کے آرسی ہے
دانتوں کو مانج کر یہ پانی میں دیکھتی ہے

پانی میں صورت اپنی اس نے جو دیکھ پائی
سمجھی کہ اور کوئی اس کے مقابل آئی

واقف نہیں کہ ہی یہ اپنا ہی عکس پیدا
یہ راز ہو نہ یارب اس پر کبھی ہویدا

سمجھیگی عکس اپنا تو چھپ جائیگی یہ
ہنس ہنس کے بھولے پن سے کیونکر چڑھائیگی یہ

کانوں میں سبز بُندے کیا لطف دے رہے ہیں
ہل ہل کے خوب بوسے گالوں کے لے رہے ہیں

ہلنے سے اِن کے شاید کچھ لطف آرہا ہو
بُندوں کا گدگدانا اس کو ہنسا رہا ہو

چھوٹی سی شاخِ گل کو کرتے میں رکھ لیا ہی
کانٹے نے چبھ کے شاید اُسکو ہنسا دیا ہی

پیڑوں کو دیکھ کر یہ ہنستی ہی کس ادا سے
خوش کر رہی ہیں چڑیاں آواز نغمہ زا سے

پانی میں گر پڑی یہ پھر بھی ہنسی نہ چھوڑی
اُٹھتے ہی پھول اُٹھایا اور اوڑھنی نچوڑی

نازک ہیں ہاتھ اسکے پانی نچڑ سکے کیا
کاش اوڑھنی یہ دیتی اور میں نچوڑ دیتا

جھٹکا رہی ہی دیکھو ہنس ہنس کے بال اپنے
آنچل سے پونچھتی ہی ہر بار گال اپنے

آنچل تو خود ہی تر ہی گال اس سے خشک ہوں کب
دھوپ اور ہوا سے پانی ہو جلد جذب یارب

کیا کھکھلا رہی ہی اسکی ہنسی تو دیکھو
رُخ پر لٹیں پڑی ہیں وارفتگی تو دیکھو

قدرت کا ہر کرشمہ اسکو ہنسا رہا ہے
اِک کھیل بنکے اسکی نظروں میں آرہا ہی

ظاہر ہی بھولے پن سے قدرت کی کارسازی
خوبی کو ناز اس پر خود اسکو بے نیازی

کیا لطف ہو جو یہ لب باتوں سے آشنا ہوں
گو اب بھی خوش ادا ہیں تب اور خوش ادا ہوں

چھیڑوں میں اسکو لیکن چھپنے تو منہ چرا کے
چل دے تو لطف میرا حسرت کا داغ کھا کے

غم سے کبھی نہ یارب اسکی ہنسی ہو زائل
رکھے لڑکپن اسکا۔ اسکو ہنسی پہ مائل

یہ گل رہے شگفتہ یونہی ہنسی کے مارے
برجِ دہن سے یونہی چمکا کریں ستارے

حاصل نہ ہو مسی سے دانتوں کو روسیاہی
پانوں کا رنگ ان پر دوڑے نہ یا الٰہی

کیا چیز ہے لڑکپن۔ پروا نہیں کسی کی
اے شوق عمرِ طفلی ہی جانِ زندگی کی

(احمد علی شوق قدوائی لکھنوی)

گذشتہ رسالے میں مولوی احمد علی صاحب قدوائی لکھنوی کی نظم جنگل کی اندھیری رات میں دو غلطیاں ہیں ناظرین مخزن براہ کرم تصحیح فرمائیں (صفحہ ۵۹ کی تیسری سطر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ بد چھوٹ گیا ہی صحیح مصرعہ یوں ہی اسکی صورت بھی ہی بد اور اس کی سیرت بھی ہی بد) صفحہ ۶۰ کی پندرہویں سطر کے دوسرے مصرعہ میں بجائے اسکو کے اُن کو چھپ گیا ہی۔ صحیح مصرعہ یوں ہی بگڑو بگڑو اسکو یہ کہہ کر مچل جاتے ہیں یہ ✦

مئی کا جوان چاند

یہ اشعار ٹامس مور کی ایک نظم سے مقتبس ہیں

جوان چاند! مئی کا وُہ چمکا اے پیاری — بساطِ خواب سے اُٹھ ہی یہ وقتِ بیداری
فلک کواکب و مہتاب سے ہوا روشن — زمیں پہ لیمپ ہیں جگنو کے جابجا روشن
یہ چاندنی کی بہار اور یہ خوشگوار فضا! — یہ دلفریب مناظر یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
وُہ مورنا کے درختوں کا جھنڈ۔ اے پیاری — گھنے گھنے وُہ شجر ہر طرف وُہ گلکاری
زمانہ نیند کا متوالا دیکھتا ہی خواب — مگر ہے اوڑھے ہوئے سر سے چادرِ مہتاب
چڑھا ہی ایک رُوپہلا ورق زمانہ پر — برس رہا ہی تجلی کا ابرِ خوش منظر
فضائے عرصۂ گیتی ہی مطلع الانوار — چمک رہا ہی تجلی کا طالعِ بیدار
چمک ستاروں کی اپنے دکھا رہا ہی فلک — نظر اُٹھا تو ذرا جگمگا رہا ہے فلک
نہیں ہی وقت معیّن کوئی خوشی کے لئے — خوش اپنے دل کو رکھے جب تلک جہاں میں جیے
اُٹھ اب زمانے کا کچھ اور رنگ ہی پیاری — زمانہ دیکھ کے یہ سین ڈنگ ہی پیاری
ہی طول زیست کا بہتر طریقہ یہ سب سے — چُرا لیا کریں ہم رات کے بھی کچھ گھنٹے
یہ جاگتی ہی؟ نہیں سو رہی ہی سب دُنیا — سویرے صبح تلک لیگی کروٹ اب دنیا
مگر نہیں ہیں زمانے میں اُس کی آنکھیں بند — گھڑی ستاروں کی ہی اور پیر دانشمند
وُہ دیکھتا ہی نظامِ ثوابت و سیار — کبھی نظر میں ہی اجرامِ چرخ کی رفتار
ہی دو دلوں کو فقط ذوقِ لذتِ دیدار — میں جاگتا ہوں ادھر۔ اُس طرف ہی وہ بیدار
مرا ستارہ ہی اُسکے ستارہ سے روشن — وُہ کیا ہی؟ آنکھ تری جو ہی شوخ اور پُرفن
یہ وقتِ خواب نہیں جاگ اے مری پیاری — سہانا وقت ذرا دیکھ لے مری پیاری

یہ دوربین سے دیکھے کہیں وہ تیری آنکھ — پڑیگی رشک و حسد سے پھر اُس پہ میری آنکھ
وہ دیکھتا ہے ان اجسام نور کی پرواز — کرے نہ محو کہیں تیری آنکھ کا اعجاز

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

سری کرشن

تجھ میں دیکھے سیکڑوں چشم عقیدت نے ہنر — اہل بینش نے جگہ دی تجھ کو ہفت افلاک پر
برہمن نے تجھ میں پائی شانِ ایزد جلوہ گر — بھر گئے تیرے محامد سے تمامی بحر و بر
کشتیِ ملت کا رہبر۔ رہنما ایسا تو ہو
"جس پہ دھوکا ہو خدا کا۔ ناخدا ایسا تو ہو"

گوکل اور متھرا میں اب تک شور رہی برپا ترا — گونجتی ہے بانسری کی اب تلک بن میں صدا
تیرے اوصافِ حمیدہ کا اثر یاں تک ہوا — دیکھنے آتی ہے خلقت تجھ کو ہر صبح و مسا
برج کا خطہ ترے دم سے ہوا رشک جناں
گاؤں چھوٹا سا بنا معبد پئے اہل جہاں

نام نامی ہے ترا عاشق مزاجوں میں رقم — ہے بجا تجھ کو کہیں سرخیل اہل درد ہم
ہے صدائے عشق تیری بانسری کی زیر و بم — کعبۂ اہل معانی ہے ترا بیت الصنم
چشمِ بدبیں میں نہ کھٹکے تیرا طرزِ نام و بود
تھا معائب سے مبرا سر بسر تیرا وجود

وہ ترا بچپن - وہ تیری سیدھی سادی زندگی — وہ جوانی تیری - وہ چہلیں تری وہ دل لگی
وہ ترا بن بن میں پھرنا اور وہ تیری بانسری — ہائے رے اس دم خیال آیا مجھے کچھ اور ہی
زندگی کہتے ہیں اسکو جس میں ہو آرام دل

ہیں نشاط انگیز اس عالم کے سارے آب و گل

کیا عجب ۔ ہو نردبان عشق حق عشق مجاز　　کیا عجب محمود ہی آخر کو نکلے خود ایاز

غور کے قابل ہیں اے دل آفرینش کے یہ راز　　ان سے واقف ہیں وہی بینا ہیں ہیں جو پاکباز

دانہ دانہ یوں ہی بڑھتے بڑھتے اک خرمن ہوا

پھول جو اسلوب سے پھولا وہی گلشن ہوا

حبّ وطن

قصد غربت سے ہو جب سوئے وطن جانیکا　　قدرتاً ہوتا ہی اک جوشِ مسرت پیدا

بڑھتا جاتا ہی جو انسان کا آگے کو قدم　　دل دھڑکتا ہی محبت سے وطن کی پیہم

دور سے شکل وطن جبکہ نظر آتی ہے　　دفعتاً جان میں اک جان سی آجاتی ہی

مردہ دل کیا کوئی زندہ ہی جہاں میں ایسا　　جسکو احساس نہیں حُبّ وطن کا اصلا

کون ہی جو نہیں ہی شیفتۂ حبِ وطن　　کیا کسی بلبل شیدا کو نہیں عشق چمن

کون ہی دل میں نہیں جس کے محبت اسکی　　یہ پری زینت آغوش نہیں ہی کس کی

کیا کوئی ہی کہ نہیں ہی جسے کچھ حُبّ وطن　　اور اگر ہی ۔ تو سنا دو اُسے میرا یہ سخن

لاکھ حاصل ہو تجھے دولت و ثروت اتنی　　کر سکے آدمی ملنے کی تمنا جتنی

نام اونچا ہو خطابات بڑے ہوں تیرے　　کچھ نہیں ہیچ ہیں بے حبِ وطن یاد رہے

نیک نامی تجھے دولت سے نہ حاصل ہوگی　　نہ خطابات پہ دنیا ترے مائل ہوگی

کچھ خوشامد تو کرائے گی یہ دولت تیری　　دل سے کوئی نہ کرے گا کبھی عزت تیری

وصف تیرا کوئی شاعر نہ کبھی لکھے گا　　کوئی لکھے گا تو کچھ ہجو تیری لکھے گا

غم تیری موت کا اصلا نہ کریگا کوئی　　اور ستم یہ ہی تو بے موت مرگیا دہری

اس طرح عالمِ فانی سے گزر جائیگا کہ ترے ساتھ ترا نام بھی مرجائے گا

(سر والٹر اسکاٹ) (مترجمہ سید علی حیدر زیدی)

نوحۂ غم

میدانِ وغا میں ہے شجر ایک تناور تنہا ہے کھڑا سبز سی اوڑھے ہوئے چادر

واں سایہ تلے بیٹھا ہے اک مرد سپاہی ہے فوجِ اجل جس کے لئے لائی تباہی

آلودۂ خوں جسم ہے اور زرد ہے چہرا بے حس ہے بدن ہوگیا بیچارے کا ٹھنڈا

پتھرائی ہوئی آنکھیں ہیں اوپر کو اٹھائے تاڑی ہے کوئی چیز کہ ہے تاک لگائے

اے وائے یہ لاشہ ہے کسی مردِ خدا کا اللہ مرے! آنکھوں نے کیا سانحہ دیکھا

غربت میں شہادت کا مگر اسکو بدا تھا کیوں کالی عبا ورنہ یہ پہنے ہوئے آتا!

اس لاشۂ بیکس کو زمیں پر سے اٹھاؤ آرام سے چپکے سے تہِ خاک سلاؤ

دیکھو تو سہی اس کفِ بیجان میں کیا ہے اس پرزے پہ کاغذ کے یہ کیا لکھا ہوا ہے

یہ رازِ درونی ہے کہ پیغام کسی کا کھولو اسے اور دیکھو جو ہے نام کسی کا

واحسرتا! مرحوم کی بیٹی نے لکھا ہے "تو بابا مرے! مجھ کو مگر بھول گیا ہے

میں شام و سحر زار و زبوں رہتی ہوں ہر دم کھاتا ہے ہر اک آن اداسی کا مجھے غم

یاد آتی ہے رہ رہ کے مجھے تیری محبت آ جلد مرے ماتھے پہ دے بوسۂ الفت

باقی ہے فقط یاں مجھے اماں کا سہارا مونس ہے جو وہ میری تو میں اس کی دل آرا

وہ موجبِ تسکین و طرب ہے مرے دل کی اور مارگریٹ اسکے لئے مایۂ شادی"

جلد آکے مجھے اس غمِ فرقت سے چھڑالے مجھ سوختہ دل سوختہ جاں کی تو دعا لے"

کاغذ تھا سفید اس پہ سیاہی سے لکھا تھا وقفوں کی جگہ خون سپاہی کا گرا تھا

جس جس نے یہ جانکاہ وہاں دیکھا نظارا　　آنکھوں سے رواں اس کے ہوا خون کا دریا

اے کاش! کسی طرح تغیر ہو یہ پیدا　　لیجائے محبت کو بھی بس ساتھ ہی مُردا

سو جائے دلِ خون چکاں بھی کہیں دردا　　خوابیدہ ہیں مقتولوں کا جوں قبر میں لاشا

پر ہائے عزیزوں کو بھلایا نہیں جاتا
داغ اُن کا کلیجے سے مٹایا نہیں جاتا

شیخ غلام محمد

(لیگن ڈبرن)

فسانہ حسن و عشق

ذیل کی نظم ہمارے محترم دوست مولوی ابوالمکارم فضل الوہاب صاحب محافظ کتبخانہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی جودت طبع کا نمونہ ہے۔ چونکہ واقعیت کا رنگ اس سے مترشح ہے اور قدما کی بحر سے کام لیا گیا ہے تاثیر دوبالا ہو گئی ہے اور ایک خاص انداز پیدا ہو گیا ہے۔

رضا علی وحشت

زار ہے بیمار ہے ہم عشق کے یہ آثار رہے　　اُٹھیں کیا کیا دل میں اُمنگیں ہائے مگر ناچار رہے

رات ہو دن ہو کوئی گھڑی ہو دل مضطر ہی بیتاب رہا　　ہم تو اپنی جان سے بیٹھے اس باعث بیزار رہے

شغل ہو کوئی کوئی جگہ ہو یاد ہی تیری دل سے لگی　　ہم تو تیرے عشق کی مَے سے ہر ساعت سرشار رہے

سمجھے تھے ہم آزادی سے اپنے دن اب کاٹینگے　　وائے مصیبت مرتے دم تک عشق ہی کے بیمار رہے

پڑ گیا جب سے یہ دلِ وحشی پیچ میں تیری لٹوں کے　　رنج و مصیبت کلفت و وحشت اپنے گلے کا ہار رہے

گھر میں وحشت ہوتی ہے اور باہر جی گھبراتا ہے　　تیری گلی میں آنا جانا بس یہی کاروبار رہے

اس اُمید پہ اپنے گھر میں اے بے پروا غفلت کیش　　شاید تو آجائے کبھی ہم چشم بر ہشیار رہے

ہم نے ہی خط لکھا پہلے۔ مانا۔ رنجش کیوں ہے بتا　　دل کی گھبراہٹ سے جب مجبور ہوئے۔ ناچار رہے

کوئی تمنا اور نہ تھی گو تم نے کیا نہ خیال کیا　　ہم تو اوّل سے آخر تک مشتاقِ دیدار رہے

ہم کو جو کچھ آپ نے لکھا اچھا لکھا خوب کیا
خوب بخارِ دل جب نکلے پھر کیوں دل میں خار رہے

دل نے یہ ہم کو سمجھایا۔ ہم نے فکر جہاں تک کی
کھا لیں زہر کہ جھگڑا جائے لیکن جی کو مار رہے

جی میں پھر یہ پیار آیا اسکی کچھ تفصیل لکھیں
یہ سمجھا دیں خوب کہ ہم تو شوق ہی کے بیمار رہے

جوشِ جنوں میں پھر خط لکھا جسکا صرف یہ مطلب تھا
فیصلہ دل کا ہو جائے بس اب نہ کوئی تکرار رہے

مرنے پہ ہم مرتے ہیں اب جینے کو ہے سات سلام
ایسے جینے ہی میں مزا کیا کوئی نہ جب غمخوار رہے

دل تو پہلے دے ہی چکا تھا جان بھی بھیجی خط کے ساتھ
تاکہ نہ اب اِس راہِ وفا میں کوئی کھٹکتا خار رہے

قاصد وہ تمہارے پہنچا تم کو تنہا جب پایا
ہاتھ میں نامہ دے آیا تم غفلت سے سرشار رہے

مانگتے کیا ہم خط کا جواب اللہ ری تمہاری سنگدلی
پیار کی باتیں کوئی کہے واں گالی ہی سرکار رہے

رحم جو آیا سوچ سمجھ کر قاصد کو ٹھہرا رکھا
ہر مضمون لکھا وہ کہ دل کو پیچ رہے آزار رہے

اُٹھ کے چلے بس خط کے پاتے یا میں آپ ہی آتا ہوں
تیری ایسی عنایت پر کیوں دل نہ ترا بیمار رہے

جی میں تو آیا جائیں وہاں اور چومیں تیرے قدم لیکن
شاید تو آ جائے اِسی امید میں ہم اے یار رہے

ہم مایوس پڑے تھے گھر پر تیسرے دن تم آ پہنچے
جب ہو مسیحا پاس کوئی کیوں جینے سے بیزار رہے

زندہ ہوئے ہم گویا مر کر اس سے ترا یہ مطلب تھا
اور کوئی آزار نہ ہو ہاں الفت کا بیمار رہے

اب نہ جفا کر اب نہ ستم کر روک نہ آنے جانے سے
کیا ہی لطف کہ مجھ سے تیری رنجش کی گفتار رہے

ہم ہیں اب اور تیرا کوچہ ہم ہیں اب اور تیری یاد
تو ہی تو جب دل میں بسا ہو کس سے دل کو پیار رہے

گو ہوں میں تیرا شیدائی دل ہے پاک طبیعت پاک
تجھ کو مرے ملنے سے پیاری بتلا پھر کیوں عار رہے

میں نے تم سے چاہ بڑھائی تم نے مجھ پہ عنایت کی
خط جب لکھا جملے اُس میں پیار کے بھی دو چار رہے

مجھ کو جو عزت سے نگہباں مجھ پہ کرو تم جان فدا!
ظاہر میں ہو مجھ سے رکھائی باطن میں یہ پیار رہے

ان باتوں پر کیوں نہ مکارم تجھ پہ رہے ہر آن فدا
کیوں نہ تری الفت کی مے سے ہر دم وہ سرشار رہے

دے نہ مکارم طولِ سخن کو اب یہ دعا اللہ سے کر | تو رہے اس کا دل سے بندہ وہ دلبر دلدار رہے

ابو المکارم فضل الوہاب

اُمّید

قاضی فضل حق صاحب مشتاق حضرت بیان یزدانی مرحوم کی یہ غیر مطبوعہ نظم مخزن کو عنایت فرماتے ہیں اور آئندہ کے واسطے اَور کلام بھی روانہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ نظم شکریہ کے ساتھ درج کی جاتی ہے :-

زمانہ اگر صحنِ باغِ ارم ہے | تو تو اے امید اسکی ابرِ کرم ہے

شگوفوں میں چھپتی ہے تو مسکرا کر | تو ہی کھلکھلاتی ہے پھولوں میں آکر

تمنا کے کھیتوں میں ہلچل ہے تیری | تمدن کے میداں میں چہل پہل ہے تیری

تو ہی یہاں کے پودوں کو دیتی ہے پانی | ہرا تجھ سے ہے گلشنِ زندگانی

شگوفوں کے کوچوں میں تو دوڑتی ہے | یہ تو دوڑتی ہے کہ بو دوڑتی ہے

ترے سر پہ تاجِ شہی سج رہا ہے | ترے در پہ کوسِ شہی بج رہا ہے

چڑھی تو مخالف پہ لشکر کو لیکر | پھری باجے لیکر چلی تاج لیکر

دیا تو نے سلطاں کو خلعت سنہرا | ہوا میں تری اُڑ رہا ہے پھریرا

رہی کودتی عشق کے دنگلوں میں | پھری قیس کے ساتھ تو جنگلوں میں

تہِ چاہ یوسف کو تو نے سنبھالا | کیا تو نے یعقوب کے گھر اجالا

خلیلِ خدا کو جب آتش میں بھیجا | کیا تو نے چھینٹوں سے ٹھنڈا کلیجا

تو ہی ہم جوانوں کے گھوڑوں کی کاٹھی | تو ہی ہے ضعیفوں کے ہاتھوں کی لاٹھی

اُٹھایا اپاہج کو بستر سے تو نے | جلایا ہے مُردوں کو ٹھوکر سے تو نے

جگاتی ہے چھینٹوں سے تو غافلوں کو ۔۔۔ اُٹھاتی ہے شوخی سے تو کاہلوں کو
رگوں میں لہو بن کے تو دوڑتی ہے ۔۔۔ ترے ساتھ ساتھ آرزو دوڑتی ہے
تو ہی ڈوبتی ناؤ کا ہے کنارا ۔۔۔ تو ہی دیتی ہے ڈوبتے کو سہارا
دولہن کربلا میں بنی تو مچل کر ۔۔۔ بن آئی شہادت کا بانا بدل کر
سمندر میں نلسن کو لیکر بڑھی تو ۔۔۔ ولنگٹن کو میداں میں لیکر چڑھی تو
کلمبس کو تیری ہی لہر آرہی تھی ۔۔۔ ڈگاما کی آنکھوں میں لہرا رہی تھی
گئی جیت تو بازئے نیچرل بھی ۔۔۔ سُنا دے پھڑکتی ہوئی اِک غزل بھی

غزل

کلیسا میں بُت کی ادا بن گئی تو ۔۔۔ حرم میں پہنچکر خدا بن گئی تو
یہ پردے کی ہے بات سُن لے نہ کوئی ۔۔۔ کہ پردے میں کیا جانے کیا بن گئی تو
اکٹھا کیا تو نے بچھڑے ہوؤں کو ۔۔۔ کہ جنگل میں بانگِ درا بن گئی تو
رہے تیرے چھینٹوں میں بے بس پیاسے ۔۔۔ بیاباں میں کالی گھٹا بن گئی تو
اڑے تیرے جھونکوں سے بیکس مُسافر ۔۔۔ کہ صحرا میں ٹھنڈی ہوا بن گئی تو
لگائی ہے لو تجھ سے اُجڑے ہوؤں نے ۔۔۔ اندھیرے گھروں کا دیا بن گئی تو
تیری لاگ سے زور گھٹنوں میں آیا ۔۔۔ کہ دکھیا ننوں کی عصا بن گئی تو
سکندر نے تاکا اندھیرے میں تجھ کو ۔۔۔ تجلائے آبِ بقا بن گئی تو
گریباں میں چل کر جنوں ہو گئی تو ۔۔۔ دوپٹے میں چھپ کر حیا بن گئی تو
ہر ایک راہ میں راہبر ہو گئی تو ۔۔۔ ہر اک ناؤ میں ناخدا بن گئی تو
ہر اک رنج و غم کو کیا محو تو نے ۔۔۔ ہر اِک درد دکھ میں دوا بن گئی تو
یہاں تو وہاں تو سقر تو جناں تو ۔۔۔ جزا بن گئی تو سزا بن گئی تو
دلوں میں اُتر کر تمنا ہوئی تو ۔۔۔ زبانوں میں چڑھ کر دعا بن گئی تو

بیاں اسکے سوا تو نے سب سے نباہی　　　یہیں آن کر بے وفا بن گئی تو

قاضی فضل حق مشتاق بی۔اے

غزل

تا نرگس تو عربده انگیز نبوده است　　　این مملکت حسن بلاخیز نبوده است

نبود عجب ار گرم وَرآمیخت به اغیار[51]　　　شوخے که به ما نیز کم آمیز[52] نبوده است

واعظ! نگرت کار به لعل لبش افتاد　　　زیں گونه حدیث تو دلاویز نبوده است

واغم که بهار چمن خوبی امسال　　　بر عادت پیشینه جنوں خیز نبوده است

هرچند غلط نیست که تشبیه دل و دین با ختنت　　　این حرف و لے مصلحت آمیز نبوده است

غزل حسرت موہانی

(جو الہ آباد سنٹرل جیل میں بزمانہ قید لکھی گئی)

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　　اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مانا کہ نہیں تجھ کو کچھ پاس وفا لیکن　　　دنیا میں کوئی شے ہے اے یار مروت بھی

جو چاہو سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو　　　پر ہم سے قسم لیلو کی ہو جو شکایت بھی

دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر　　　اے صاحب میخانہ کچھ لطف و عنایت بھی

دل بسکہ ہے دیوانہ اس حسن گلابی کا　　　رنگین ہے اس رو سے شاید غم فرقت بھی

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لیگی　　　اے حسن حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

برسات کے آتے ہی توبہ نہ رہی باقی　　　بادل جو نظر آئے بدلی مری نیت بھی

عشاق کے دل نازک اس شوخ کی خو نازک　　　نازک اسی نسبت سے ہے کار محبت بھی

اے شوق کی بیباکی وہ کیا تری خواہش تھی　　　جس پر انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی

ہر چند ہے دل شیدا حریت کامل کا　　　منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

ہیں شاد و صفی شاعر یا شوق و وفا حسرت[53]　　　پھر ضامن و محشر ہیں اقبال بھی وحشت بھی

---

[51] گرم وَرآمیختن گرم جوشی سے ملنا۔ [52] کم آمیز جو شخص لوگوں سے کم ملتا جلتا ہو۔

[53] سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی۔ سید علی نقی صفی لکھنوی۔ احمد علی صاحب شوق لکھنوی۔ حکیم عبد الباری وفا رامپوری۔ حضرت ضامن کنتوری۔ مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی۔ پروفیسر اقبال و رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ ۱۲

مخزن

مشرق و مغرب

۲

آنچہ از گرمی ہنگامۂ محشر گفتند
ہست بزمے کہ تو صد بار بہم بر زدہ

زمانۂ حال کی مہذب و علمی سوسائٹیوں میں جب یہ مسئلہ بنظرِ تحقیق پیش ہوتا ہے۔ کہ "علمائے مشرق کا یہ دعوی کہانتک قابلِ اعتماد ہے کہ تمدنِ جدید و علومِ جدیدہ کا ماخذ یا سرچشمۂ استنباط مشرقی علوم کا دفترِ بے پایان ہے، مشرقی ہی ساخت کا آئینۂ تہذیب سامنے رکھ کر یورپ نے سارا بناؤ سنگار کیا ہے، اور یورپ نے مشرقی پُرسطوت و ادب آموز درباروں میں بیٹھ بیٹھ کر تہذیب کا راگ سیکھا جس کا نام ملمع سازی کر کے تہذیبِ جدید رکھ لیا"۔

تو وہ سطحی گروہ جس نے تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھا ہے بے نیازی کے لہجہ میں آفتاب چشم و ابرو بنا کر صاف یہ پکار اُٹھتا ہے:۔

"کہ یورپ کی ادب شناسی کا آغاز ضرور مشرق میں ہوا، لیکن اس "جدید تہذیب و ترقی کا چراغ ملک نے اپنے نور افشاں دماغ سے روشن کیا" جس میں اس قدیم طریق ادب کی اب بلکہ لعاً باقی نہیں، وہاں جو کچھ تھا"

"زبانی، یہاں تجربہ و مشاہدہ سے، طبعی انکشافات، کیمیاوی تجربے،
آلات مکرسکوپ، کے مشاہدے نہ مشرق کو خود حاصل تھے، نہ یورپ
نے اُن سے پائے۔ بہرحال اخذ و استنباط کے تو یہ معنی تھے کہ علوم
جدیدہ میں کچھ ماخذی علامات پائی جاتیں، لیکن آج ترقی یورپ
بالکل اس سے بے نیاز ہو کہ اُس میں قدیم ترقی کا شائبہ بھی موجود ہو۔"

یہ جواب اُس گروہ کا ہو جو یورپ کی ہر ہر ادا کا شیدا اور اُسکی تقلید جامد پر مٹا ہوا
ہو، لیکن اس کوتاہ بینی کے جواب سے مشرق کی قدیم ترقیوں کے نام لیوا کب
نچلے بیٹھ سکتے ہیں، آخر ایک مغربی اسٹیج سے قریب ہو کر ذیل کی تقریر شروع ہی
کر دیتا ہے۔

ا۔ "اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا کہ علوم جدیدہ علوم قدیمہ کا کچھ سرمایہ اب بھی
رکھتے ہیں، اور اس نگارخانہ یورپ میں کوئی نقش قدیم صنعت کا اب بھی رہ گیا ہو
یا نہیں؟ موجودہ زمانہ میں تاریخ کے ایک پیچیدہ مسئلہ کو حل کرنا ہو، جسے جدید
معلومات نے طلسم بنا رکھا ہو،

اس میں شک نہیں کہ مشرقی مطلع علم کو چمکانے والے عربوں نے بہت سے
علوم کے مبادی دوسری قوموں سے لئے۔ لیکن کلک اجتہاد سے اُن متون پر
ایسا شارحانہ اضافہ کیا، کہ متن قدر فاضل ہو گیا۔ دانایان فرنگ نے یہی علوم
عربوں سے حاصل کئے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ انصاف کا حکم قطعی یہی ہوگا
کہ ان تمام علوم کا انتساب موجد کی حیثیت سے عربوں کی طرف ہو، البتہ وہ علوم
جن پر کسی قسم کا اضافہ اہل عرب نے نہیں کیا بلکہ انہیں اپنی اصلی حالت پر قائم رکھا
اُن کا انتساب اصل مدونین کی طرف حق بجانب ہو"

جیسے جغرافیہ مجسطی کا انتساب بطلیموس، کتاب البلدان کا بقراط

صناعۂ طبیہ کا جالینوس، ہندسہ کا اقلیدس اور سر الاسرار، حواس اور سیاست کا انتساب ارسطو کی طرف کیا جاتا ہی، اور ہونا بھی چاہیئے۔ بخلاف اس کے جو مفید، کارآمد، و نادر تصانیف یورپ نے عربوں سے پائیں خواہ انکی طبعزاد ہوں، یا ایسی منقولات جن کا سُراغ بجز اُن کے اور کسی نے نہ لگایا ہو جو حکماً انہیں کی مانی جائینگی۔ لیکن اُن کا انتساب یورپ عربوں کی طرف کرنے کے لئے تیار نہیں، مثلاً یونانی تالیفات سے تموخارس۔ ارشلوس منیلاس۔ تاوؤن فارسی زبان سے کلیلہ دمنہ سُریانی زبان سے کتاب فلاحۃ النبطیہ (جسے ابن وحشیہ نے بڑی عرقریزی کے ساتھ عربی لباس پہنایا تھا) یہ سب جلوے آج دُنیا نے منمخانۂ مشرق ہی میں جاکر دیکھے، اور علمی آنکھوں کو اُن سے منوّر کیا،

علاوہ ان مستقل استفادات کے جو بمنزلۂ موجُودات قرار دی گئی ہیں، وُہ استفادات بھی جو حقائق یا معارف کے حکم میں ہیں، (جن کی نسبت یہ دعوی کہ وُہ محض عربوں کے نکتہ سنج اور جدت آفرین دماغوں کی یادگار ہیں، اور جن سے قدما بھی محض خالی الذہن تھے کالنور والسُرور ہی) علی السبیل الاستشہاد اُن کا تذکرہ تاریخ دانی کے ایک اہم فرض سے سبکدوشی حاصل کرتا ہی،

۲- علم الابدان یا تجربیاتِ طب میں مداخلت (جس سے علمی و دماغی قویٰ کی ترقی کا بیمہ ہوجاتا ہی۔ جوارح اور ذہنی ملکات کے لئے بصورت تعطل ایک خاطرخواہ کمک پہنچائی جاسکتی ہی، اور مُردہ قالبوں میں جان ڈالنا جسکی ایک ادنی مسیحائی کہلاتی ہی) تہذیب اور روشنی کے احساس کی ایک باوقعت ضمانت ہی، عربوں نے اس کا جتنا مصالحہ تیار کیا وُہ آج تک بجنسہ کارآمد ہی، اولاً جو سلسلۂ علاج اُنہوں نے بتلایا تھا، اُس سے آج تک سرمو اختلاف نہیں کیا گیا، گو موادِ مستعملہ بدل گیا۔

داغ ویکر زخم کا علاج انہی نے نکالا، یرقان کا علاج، آنکھ کو قدح کرنا، امراض خبائث کا پچکاری سے علاج، اور چیچک وغیرہ کے تیر بہدف معالجات انکی عیسیٰ نفسی کے ادنیٰ ادنیٰ شعبدے ہیں، جن کی تقلید سے اطبا کا گروہ آج بھی بہرہ اندوز ہو رہا ہے۔

۳۔ علیٰ ہذا کیمسٹری یا یں کیمیاگری و تبدیل ماہیت عربوں ہی کے موضوعات دماغ میں سے ہے، جڑی بوٹیوں کی تقطیر و ترشیح کے جدید طریقہ انہیں کے نکالے ہوئے ہیں، دوا فروشی کی رسم بھی انہیں نے قائم کی تھی۔ جس میں یورپ اُن کا متبع ہے،

کیماوی اور طبی اجزا لیکر انہیں ترکیب دی، معلوم مگر کوڑیوں کے مول اجزا کو نامعلوم طریقوں سے ترکیب دیکر خاصیت میں اکسیر، اور جواہرات کے مول بنا دیا، نتریک۔ کبرتیک۔ کلوریک۔ رُوح نوشادر۔ سنگِ دوزخ۔ سنگِ سلیمانی۔ ملح الطرطیر۔ ملح البارد۔ پھٹکری۔ سرمہ۔ چونا۔ بورق وغیرہ وغیرہ اشیاء کے طبی اور کیماوی استعمالات کی تفتیش عربوں ہی کے اکتشافات و اختراعات دماغی ہیں، جنکے بغیر تمام طبی تجربے اور اعمال کیمیا آج بھی ناقص و غیر مکمل ٹھہر جاتے ہیں۔

۴۔ علمِ نباتات۔ علمِ نجوم۔ علمِ ریاضی۔ جغرافیہ۔ جبر و مقابلہ ایسے ایسے زبردست علوم کی سرپرستی میں مغرب مشرق کے معلمانہ احسان سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ جن کے علم زراعت کا مدار ابن وحشیہ کی کتاب فلاحۃ النبطیہ پر ہے، نجوم کے احکام و قواعد جو مشرقی اصول سے ماخوذ تھے۔ اگرچہ اب بہت سے بدل گئے تاہم کواکب کے نام اور دیگر علمی مصطلحات سے ماخذ کی طرف اب بھی ذہن آسانی سے رجوع کر جاتا ہے۔ جن کے لئے آثار باقیہ کا خطاب ایک حد تک

بجا ہو سکتا ہے، جبر (الجبرا) کا نام ہی اس بات کی معتبر شہادت ہے کہ یہ مشرقی ملکہ عربی کی کسال کا ایک سکہ ہے، ریاضی کے رسم اعداد میں ہندی کی تقلید عربی میں، اور عربی کی فرنگ میں اب تک ہو رہی ہے،

۵ - تاریخ عالم اور بالخصوص مشرقی تاریخ کی حفاظت میں بھی نہیں عربوں نے ید طولیٰ حاصل کیا، چنانچہ آج جو کچھ بھی اہل فارس ہنود اور عربوں کی قومی تاریخوں کا ذخیرہ موجود ہے، وہ اہل عرب ہی کی ترتیب و تحفظ کا ثمرہ ہے۔

۶ - معلومات کا طویل، عریض، ضخیم اور لامتناہی سلسلہ - موسوعات العلوم - دائرۃ المعارف یا آجکل کی مہذب اصطلاح میں انسائیکلوپیڈیا مشرقی چمن زار معارف کا ایک خوشنما پھول ہے، اسی نہج پر جس کی ترتیب و تدوین میں اہل فرنگ نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا،

الحمد للہ ان تین نمبروں میں ہم نے جو منزل طے کی، ارادہ کے اوائل میں ہمیں وہ مسافت نہایت دشوار گذار نظر آتی تھی - لیکن اب غالباً ناظرین با تمکین کو پورے طور سے ہمارے اُن دعاوی کا ثبوت پہنچ گیا ہوگا - جو اس کے ہر نمبر میں مختلف نوعیتوں کے کئے گئے ہیں، یعنی مغرب کا تمام تر ادعار کمال اس بنا پر ہے کہ وہ مشرق سے شرف تلمذ رکھتا ہے۔

مشرق کی اجتہادی و اختراعی عظمت مغرب کے مقابلہ میں قابل تسلیم رہ چکی ہے، اور مشرق کے علمی اکتشافات کے جلوے آج بھی مغربی علوم میں ہویدا ہیں، غور سے دیکھئے تو خود ہی نظر آجائینگے۔

اے اہل مشرق! پستی و عروج کے نقشہ آپ نے دیکھے، اپنی اُس قدیم تاریخی عظمت کو یاد کیجئے اور خیام کی زیب عنوان رباعی کو پڑھیئے۔

آں روز کہ توسن فلک زیں کردند آرایش مشتری و پرویں کردند

ایں بود نصیبِ ما زدیوانِ قضا ما را چہ گنہ قسمتِ ما ایں کردند

اہلِ فرنگ نے آپ کے اسلاف سے سبق لینے کی قابلیت بہت جلد پیدا کر لی تھی، لیکن آپ ابھی اس قابل بھی نہیں نظر آتے کہ اُن کے محاسن کو اُستادانہ عظمت مان کر حاصل کیجئے۔

قعرِ ذلّت سے آسمانِ ترقّی پر پہنچانا، اور پھر خود قعرِ گمنامی میں گر پڑنا، آج یہ آپ کا قومی افسانہ یا قومی تاریخ بنگیا ہی، لہٰذا آپ کو ان انقلابات سے سبق لینے کا جتنا حق حاصل ہی اُتنا کسی کو نہیں،

آپ جب اُسکو حاصل کرنے کے لئے بڑھینگے تو بجائے کسی صدائے احتیاج کے آپ کی زبان پر یہ حوصلہ افزا کلمات ہونے چاہئیں۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وُہ اِک گلدستہ ہی ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

یعنی گویا کہ آپ اپنی ہی چیز، اور وُہ بھی وُہ جو کوئی غیر معمولی نہیں، اُس کے لینے کو بڑھ رہے ہیں، آپ کے ارادوں میں عزیمت، ہمّت میں اِستقلال، بازو میں قوّت دینے والا خُدائے قادر و توانا ہی۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ط

جواد علی خان عالی محمد پوری

سخاوت

تا کے ہوسِ سیم و زر و لعلِ یمن آتا نہیں مال کام بعدِ مُردن
گر حق نے تجھے دیا ہے تو غیر کو دے خورشید سے ہے مہ ہی ہالہ روشن

احمد حسین امجد

علمِ ادب

لارڈ مورلے کے نام نامی سے ہندوستان کا ہر ایک تعلیم یافتہ واقف ہی آپ آجکل وزارتِ ہند کے اعلیٰ عہدہ پر ممتاز ہیں اور اس حیثیت سے اہلِ ہند کی قسمت کا فیصلہ اُن کی دانش و تدبیر پر انحصار رکھتا ہی - جب سے اُنہوں نے اس عہدہ کا چارج لیا ہی ہندوستان کا بچہ بچہ اُن کے نام سے واقف ہو گیا ہی - حال ہی میں اُنہوں نے اخبار نویسوں کی عالمگیر کانفرنس کے اجلاس میں جو لنڈن میں منعقد ہوئی تھی ایک زبردست تقریر ادب اور اخبار نویسی کے تعلقات پر کی ہی - جس کا ترجمہ میرے دوست شیخ محمد اکرام صاحب کی عنایت سے مخزن میں شائع ہو چکا ہی - لارڈ مورلے کو جو گہری دلچسپی علمِ ادب سے ہی وہ مقتضی اس بات کی ہی کہ اُنکے دیگر مضامین کو بھی اُردو زبان کا لباس پہنایا جائے میری اپنی رائے یہ ہی کہ ایسے ترجموں سے ایک ایسے لٹریچر پر جو بچپن کے زمانہ سے نکل کر جوانی میں قدم رکھنے لگا ہو اور جس کی ترقی حیرت انگیز ہو بڑا مفید اثر پڑ سکتا ہی - لارڈ مورلے مسلّمہ طور پر انگلستان کے زندہ مشاہیر سے گوئے سبقت لیگئے ہیں اور جو بلند پروازی راست گوئی اور عمدہ اخلاق اُنکے ادبی مضامین میں ملتا ہی کسی دوسرے زندہ ادیب کی کتابوں میں کمیاب ہی - جب سے میں نے لارڈ مورلے کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا ہی مجھے اُنکے ساتھ ایک قسم کا شغف ہو گیا ہی ۲۶ - فروری ۱۸۸۷ء کو اُنہوں نے لنڈن سوسائٹی کے سالانہ جلسہ پر جو یونیورسٹی تعلیم کی اشاعت کے لیے قائم کی گئی تھی - طلبا کے روبرو ایک زبردست تقریر کی - جس کا عنوان علم ادب کا مطالعہ تھا - وہ تقریر کئی وجوہ سے قابل ہی

کہ ناظرینِ مخزن اِس سے مستفید ہوں اِس لئے اس کا ترجمہ مَیں نے کیا ہی۔

جب میرے دوست مسٹر گوشن صاحب نے مجھ سے آج شام کو لکچر دینے کی فرمائش کی تو مجھے بہت سے تامل کے بعد اُن کی فرمائش کو منظور کرنا پڑا۔ مسٹر گوشن کا منشا تھا کہ مَیں تعلیم کے ادبی پہلو پر کچھ کہوں۔ جن اصحاب کا تعلق علم ادب سے رہا ہی وُہ میرے ساتھ اتفاق کرینگے کہ تعلیم کے اِس شعبہ کے متعلق کوئی نئی بات کہنا قریباً ناممکن ہی۔

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند تہی خمخانہ ہا کردند و رفتند

مگر مَیں نے مناسب خیال کیا کہ جس عرقریزی اور جانفشانی سے مسٹر گوشن نے علم ادب کی خدمت کی ہی وُہ مقتضی اِس بات کی ہی کہ جن اصحاب کو وُہ اس بارہ میں اپنا ہاتھ بٹانے والا سمجھیں وُہ اُن کی حتی الوسع مدد کریں۔ مَیں لارڈ میر صاحب کا شکر گذار ہوں کہ اُنھوں نے میری نسبت اس حُسن ظن کا اظہار فرمایا ہی کہ مَیں انگریزی علم ادب پر لکچر دینے کی خاص اہلیت رکھتا ہُوں مگر مَیں لارڈ میر صاحب کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ مَیں اب علم ادب کی پگ ڈنڈی کو چھوڑ کر صحرائے سیاسیات کا آوارہ گرد ہو گیا ہُوں اور مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تبدیلی میری اُن آرا میں جو ادبی مضامین سے تعلق رکھتی ہیں کس قدر پختگی پیدا کر سکتی ہی۔ یا ادب کے مُطالعہ کی حمایت میں میری دلائل کو کس قدر تقویت دے سکتی ہی۔ سرزمین سیاسی ایک ایسا دشوار گذار مرحلہ ہی جسکو طے کرنے کے لئے عمل کی رہبری درکار ہی اور جہاں عموماً دو غلط راستوں میں سے ایک نہ ایک کو اختیار کرنا پڑتا ہی ادب اور سیاست دونوں میں باعتبار موضوع و غایت نیز بلحاظ طریق حصول بیّن فرق ہی۔ تاہم جہانتک مجھ سے ہو سکیگا مَیں علم ادب کی خصوصیات بیان کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھوں گا اور مَیں ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رکھوں کا کہ مجھے

بھی ایک ایسی تحریک میں شامل ہونے کا موقعہ ملا ہی جو آجکل کی تمام تحریکوں سے بہ لحاظ اہمیت و وسعت کہیں بڑھ چڑھ کر ہی۔

اس تحریک کا کیا مدعا ہی اور اس کے حامی کیا چاہتے ہیں۔ میری رائے میں اُنکی یہ کوشش ہی کہ جہانتک ہوسکے عمدہ سے عمدہ تعلیم جو قابل اور لائق اُستادوں کے ذریعے میسّر ہوسکتی ہی۔ قوم کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ فرد قوم کی دسترس میں ہو۔ اُن کا منشا ہی کہ عامۂ خلائق اس اعلیٰ اور باقاعدہ تعلیم سے بہرہ اندوز ہوں جو بالفعل اُن معدودے چند افراد کو میسّر ہوتی ہی۔ جن کے پاس اس قدر روپیہ اور وقت ہوتا ہی کہ وہ اکسفورڈ اور کیمبرج میں جاسکیں۔ وُہ یہ چاہتے ہیں کہ دماغی علم کے سرسبز و شاداب کرنے والے پانی کو بذریعہ ہزارہا چھوٹی چھوٹی آبپاشی کرنے والی نہروں کے دارالعلوم کے سرچشموں سے نکال کر انگلستان کی سخت زمین پر چاروں طرف منتشر کیا جاوے۔ صاحبان! یہ ایک مہتم بالشان امر ہے۔ گوئٹے کا مقولہ ہی کہ کوئی شخص اُس اُستاد سے زیادہ خطرناک نہیں جو صرف اُسی قدر جانتا ہو جس قدر کہ اُسے طلبا کو بتانا ضروری ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے مضمون میں ماہر ہو وہ اُسے دوسروں کے لئے بھی دلچسپ بنا سکتا ہی۔

ہم جمہوریت کے دلدادہ ہیں۔ جمہوریت ہمارے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہی۔ اور مَیں بوثوق تمام کہتا ہوں کہ اس تحریک سے بڑھکر اور کوئی تحریک جمہوری نہیں ہوسکتی۔ جمہوری حکومتوں میں جو نقائص پیدا ہو جاتے ہیں یہ تحریک اُنکو بالکل رفع کرسکتی ہی اور جمہوری طرز سلطنت کو اُن اعلیٰ رتبہ تک پہنچا سکتی ہی۔ جہاں کوئی اور طرز سلطنت نہیں پہنچ سکا۔ اس تحریک سے کوئی اور تحریک زیادہ معقول اور جمہوری نہیں ہوسکتی۔ جس کا منشا یہ ہی کہ

شمالی کان کنوں اور لندن کے معماروں و دیگر حرفت پیشہ اشخاص کو ایسی ہی عمدہ و اعلیٰ تعلیم میسّر ہو سکے جیسی کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلباء کو حاصل ہوتی ہے۔ ایسا ہی قابل تعریف وُہ شوق ہے جس کی وجہ سے آئے دن بڑے قابل اور لائق و فائق اہل ہنر مثلاً لینگ۔ جووٹ۔ لیف وغیرہ نے پُرانی یونانی کتابوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس واسطے کیا کہ جو اشخاص یونانی زبان سے واقف نہیں ہیں وُہ ان کتابوں کا مطالعہ بذریعہ انگریزی ترجموں کے کر سکیں۔ اِن تمام کوششوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ علمی خیالات سوسائٹی کی علمی اور زندہ طاقتوں کے ساتھ شامل ہو جائینگے اور صنعتی انگلستان بھی تعلیمیافتہ دُنیا کی علمی روایات میں حصّہ لے سکیگا۔ مَیں خوب سمجھتا ہُوں کہ یہ اندیشہ بھی بہت دنوں میں جاگزین ہے کہ جو مسلسل اور لگاتار کوششیں ابتدائی درمیانی اور اعلیٰ تعلیم کو رواج دینے کی ہو رہی ہیں۔ اُن کا نتیجہ کسی حد تک شاید بُرا ثابت ہو۔ فریق مخالف اس حجّت کو پیش کرتے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انگلستان میں صنعت اور دستکاری مفقود ہو جائیگی اور ہر ایک شخص محرر بنجائے گا بلکہ بعض کا تو یہ خیال ہے کہ وُہ وقت آگیا ہے جب کہ بہت سی عملی تکلیفیں اور مصیبتیں اِس رجحان کا نتیجہ ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ چند سال ہُوئے امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ میں بھی یہی بحث چھڑی تھی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر یہ میلان طبائع واقعی موجُود ہے تو یہ خود بخود درست ہو جائیگا ورنہ یہ بیہودہ اور سخت نقصان دہ خیال کہ علم کو اہل حرفت سے کچھ تعلّق نہ ہونا چاہئیے کسی طرح سے بھی ادب کا پیدا کیا ہُوا نہیں ہے۔ حکیم پیریکلیز کا وہ مشہور فقرہ جس میں وُہ اُس قوم کی شان و شوکت کا بیان کرتا ہے جس کا وہ خود ستارہ تھا مجھے

اس وقت یاد آتا ہے۔ وہ کہتا ہے ہم اہلِ ایتھنز حسن کے شیدا ہیں مگر باوجود اس کے اپنے مذاق میں سادہ ہیں۔ ہم اپنے دماغ کو نشو و نما دیتے ہیں مگر جوانمردی کو ہاتھ سے نہیں دیتے مگر اس مقولہ پر غور کرتے وقت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایتھنز میں سوسائٹی کی بنا غلامی پر تھی۔ اہلِ ایتھنز حسن کے شیدا مگر باوجود اسکے سادہ مذاق اور دماغی تربیت میں مصروف اور ساتھ ہی اپنی جوانمردی کو قائم رکھنے والے تھے اسکی یہ وجہ تھی کہ اُن میں سوسائٹی کی محنتِ شاقہ و مزدوری وہ شخص کرتے تھے جن کا دُنیا کی اچھی چیزوں میں کچھ حصہ نہ تھا۔ ہماری حالت خوش قسمتی سے دگرگوں ہے۔ ہم سب کے سب کم و بیش ایک ہی سطح پر ہیں۔ ہمارا مُدعا ہے (اور اس وجہ سے ہماری سوسائٹی اہلِ ایتھنز سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے) کہ پیریکلیز کے خیالات دربارہ حُسن۔ سادگی دماغی نشو و نما اور جوانمردی اُن شخصوں تک پہنچا دیویں جو دُنیا میں محنتِ شاقہ غلاموں کی طرح کرتے ہیں۔ مَیں بلا خوفِ تردید یہ کہنے کو تیار ہوں کہ ہم اِس مدعا کو حاصل کرنے میں کسی طرح سے بھی اپنے دستکاروں کے ہنر کو خراب یا اپنی قومی زندگی کی جوانمردی کو کمزور نہیں کرینگے۔ اس سے ہمارے ابنائے وطن کے عملی قوائے کسی حال میں بھی بے حس و حرکت نہیں ہو سکتے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اگر انسان علمِ ادب میں دسترس حاصل کرے تو وُہ عملی کاموں میں شریک ہونے کے قابل نہیں رہتا اور پبلک اِسکو خیال بند (تھیوریسٹ) کا خطاب دیتی ہے مگر آخرکار اگر ہم عملی قوت کی اعلےٰ ترین صُورت یعنی حکومت کو لیں تو یہ اعتراض فضول اور بالکل غلط ٹھہرتا ہے مَیں یہ کہنے کو تیار ہُوں کہ موجودہ گورنمنٹ کے ارکانِ اعظم میں سے کم از کم

تین صاحب ایسے ہیں کہ اگر وہ ادب کو اپنا پیشہ اختیار کریں تو بڑی عمدہ طرح سے اپنی روزی کما سکتے ہیں پچھلی گورنمنٹ کے زمانہ میں بھی ما سوائے وزیر اعظم کے تین ممبر صاحب علم و فضل تھے اور میں نے کبھی نہیں سنا کہ وہ اپنے جلیسوں سے کم معاملہ فہم تھے۔ آج کل ایک کمیشن کرنسی[۱] جیسے مشکل اور پیچیدہ مضمون پر غور کرنے کے لئے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اہل کمیشن میں سے ایک شخص بھی ایسا ذہین اور تیز فہم اور ان پیچیدگیوں اور مشکلوں کو سمجھنے والا جن کا سامنا ہوگا اور ان ضروری دلائل پر اچھی طرح غور کرنے والا جو دوران بحث میں پیش ہونگی نہیں ہے جیسا کہ صدر کمیشن اور یہ وہ شخص ہے جو عملی آدمی کی تعریف میں تو نہیں آسکتا مگر مسلمہ طور پر صاحب علم و کمال ہے۔

صاحبان! اکثر بہترین عملی اشخاص جنہوں نے اس ملک میں جنم لیا ایسے تھے جنہوں نے کالج میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور مطالعہ کتب سے جن کا شغف رہا۔ یہ درست ہے کہ ہم بذریعہ اس تحریک کے عوام الناس کو اُس لطف کا جسکے بیان کرنے کے لئے الفاظ ناکافی ہیں۔ احساس نہیں کرا سکتے جو اکسفورڈ اور کیمبرج کے پر تمکین اور دیرینہ کمروں سے وابستہ ہے ہم آپ میں سے ہر ایک کو اُن عالیشان کمروں۔ خاموش مگر قابل تعظیم کتب خانوں۔ سنجیدگی سے پر گرجاؤں۔ اور مطالعہ کے اُن پرانے باغوں میں جو قدیم زمانہ سے موجود ہیں نہیں لے جا سکتے۔ نہ ہم آپ کے اردگرد عالیشان یادگاریں اور مقدس اثر پیدا کرنے والی صحبتیں لا سکتے ہیں۔ ان عالموں۔ شاعروں۔ عابدوں اور فلاسفروں کی مجلسیں جو زمانہ سابق میں ایک پر جلال جلوس میں گذر چکے ہیں اور جنکے طفیل اکسفورڈ اور کیمبرج

[۱] سکہ ہائے رائج الوقت کے متعلق معاملات ۱۲

گوشِ دل کے لیے ارغنون۔ اور خیال میں مستغرق آنکھ کے لیے خوشی
کا خواب ہیں۔ ہم آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ مگر میں امید
کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس تحریک کے جو حامی ہیں اور جو اس میں
مجھ سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اُن کا منشا ہی کہ اس سوسائٹی کا ہر فرد ان دو مشہور
مرکزی دارالعلوں سے صرف تعلق ہی نہ رکھے بلکہ اُن سلسلوں میں سلسل ہو
جو پُرانے انگلستان کو موجودہ انگلستان سے ملاتے ہیں۔ آپ نے اپنی سالانہ
رپورٹ میں اس دل خوش کُن امر کا ذکر کیا ہی کہ پچھلے موسمِ گرما میں چار وظیفہ دس
دس پونڈ کے۔ نارتھمبرلینڈ جیسے کان کن ضلع میں اُن دستکاروں کے لئے
مقرر کیے گئے ہیں۔ جو امتحان میں اوّل درجہ پر رہیں اور اس غرض سے کہ وہ
موسمِ گرما کی تعطیلات میں ایک مہینہ کیمبرج میں خرچ کریں اور اس کے عجائب خانوں
اور لیبورٹیریوں[۵۱] میں وہ کام کریں جو وہ اپنے مقامی ضلع میں موسمِ سرما میں کرتے
رہے ہیں۔ یہ تجویز آپ کی طرف سے عمل میں نہیں آئی۔ بلکہ یونیورسٹی کیمبرج نے
اسکو پیش کیا اور اس پر عملدرآمد کیا۔ مجھے اُمید ہی کہ جو اہلِ لندن اس یونیورسٹی
میں تعلیم کے لئے جاوینگے وہ محسوس کرینگے کہ یہ دونوں تاریخی مقام تسخیر
قلوب میں یکتا اور اپنی طرف کھینچنے کے لئے مقناطیسی کشش میں کیسے
دلربا ہیں۔ تین چار سو سال ہوئے۔ ہزاروں غریب طلبا سردی گرمی اور
افلاس کی تکلیف اُٹھا کر اکسفورڈ میں آتے تھے تاکہ وہ علم کی بھوک اور پیاس کو
وہاں آکر بجھاویں۔ کیا اچھا ہو کہ نارتھمبرلنڈ کے کان کن بھی جیسا کہ آپ اپنی
رپورٹ میں ذکر کرتے ہیں۔ اپنے دن کے کام سے فارغ ہو کر اور سردی اور
تاریکی میں چار پانچ میل کی مسافت طے کرکے اکسفورڈ اور کیمبرج میں لیکچر سننے

۵۱ وہ کمرے جو علم کیمیا کے تجربات کے متعلق سامان اور آلات سے آراستہ رہتے ہیں۔

دانا اور نادان کے خیالات

دانا رضا الٰہی یعنی فطرت اللہ کا جویا ہوتا ہے۔ قوانین فطرت سمجھنے اور بجا ہی اتباع کرنے کی سعی جمیل کرتا ہے۔ اپنے جذبات و تردّدات کو انہیں ناقابلِ تغیر قوانین کی اطاعت میں چھوڑ دیتا ہے اور اس اطاعت کو فقط ناگزیر ہی نہیں بلکہ ماحصلِ زیست اور سرمایہ راحت یقین کرتا ہے۔ یہانتک کہ اس کی ہر خواہش قدرت کے ہم آہنگ اور اس کا ہر مقصد قدرت کا ہم پیرایہ ہو جاتا ہے۔ اُس کے کام منشاء قدرت کے موافق ہوتے ہیں۔ اِس لئے وہ ہر حال میں راضی بہ رضاء الٰہی اور ہر رنگ میں بامراد و شادکام و شادمان رہتا ہے۔ ناکامی اور غم کے بہت ہی شاذ اتفاقات پیش آتے ہیں۔

نادان رضاء الٰہی سے بے بہرہ ہوتا ہے اور بہرہ حاصل کرنا بھی نہیں چاہتا اُس کے جذبات و اغراض گویا اہتماماً فطرت کے برعکس ہوتے ہیں۔ اُس کی خواہشیں اور مقاصد حقائقِ قدرت سے روگردان رہتے ہیں۔ اُس کا ہر فعل فطرت اللہ کی ضد۔ ہر کام منشاء قدرت کے خلاف ہوتا ہے۔ اِس لئے ہر حال میں غیر قانع مضطرب۔ شاکی رہتا ہے۔ کامگاری اور انبساطِ قلبی کے اسکو بہت ہی کم مواقع ملتی ہیں۔

موجودات اور سوانح موجودات یعنی اشیاء اور حوادث لیل و نہار کو دانا اُنکی صحیح اور اصلی حالت میں دیکھتا ہے۔ اشکال سے دھوکا نہیں کھاتا حقیقت پر نظر رکھتا ہے۔ اجسام و صور اسکے نزدیک کچھ مال نہیں نہ اُس کے تعمقِ نظری کو اپنے سطح فی الخارج پر روک سکتے ہیں۔ وُہ چیزوں کی مادّی اور ذہنی ہستیوں

سے گذر کر تہ میں پیوست ہو کر اصلی ہستی تک پہنچتا ہی۔ اور اُسی کو پیار کرتا ہی اسی کا خواہشمند رہتا ہی۔ اس کے سوا جو کچھ ہی اُس کے نزدیک از قسم زوائد۔ ہیچ اور بے بُود ہی۔

نادان اصل سے بے خبر اور بطانتِ اشیا سے ناآشنا ہی۔ ظاہری صورتوں اور واقعات کے بیرونی مفاد و مضار کا پرستار ہی۔ اسے جملہ موجودات خارجی اور داخلی میں فقط ہیات ظاہری نظر آتے ہیں۔ انہیں کے حُسن و قبح کو دیکھتا اور اسی سے متاثر ہوتا ہی اور اسی کی قربت یا دُوری حصول یا ترک میں کوشاں رہتا ہی۔ اس لئے نادان بھلا چاہتا ہی اور بُرا ہوتا ہی۔ فائدے میں رہا چاہتا ہی مگر رہتا ہی ٹوٹے میں۔ تمام آدمیوں کی طرح ہرچند کہ خود بھی آزادی پسند ہی لیکن سچی آزادی کے درکِ صحیح میں غلطی کر کے جسمانی آزادی پر اکتفا کرتا ہی۔ جو نعمتِ کبریٰ کہ حقیقی اور تحقیقی آزادی ہی کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ البتہ جسمِ خاکی اسکا ضرور آزاد رہ سکتا ہی۔ لیکن دل اور رُوح غلاموں کی طرح قید رہتی ہی۔ اگر وہ ایک مُطلق العنان بادشاہ بھی ہو جائے تو بھی اپنی حرص و ہوا کا بندہ اور اپنی غلط فہمی اور جہل کا قیدی ہی رہیگا۔ وُہ محتاجی سے محفوظ رہنے کے لئے دولت پیدا کرتا ہی۔ لیکن دولت جُوں جُوں ترقی کرتی ہی اپنے کو دولت کا محتاج تر پاتا ہی۔ کیونکہ افزائشِ دولت احتیاج کو اور ترقی دیتی ہی۔ اسکو بہت سی خواہشیں ہوتی ہیں اور وُہ سمجھتا ہی کہ خواہشوں کے پُورا ہونے میں راحت ہی۔ لیکن خواہشیں جب پُوری ہو جاتی ہیں تو بجائے راحت کے تکلیفِ مزید کا سبب ٹھہرتی ہیں کیونکہ پُورا ہونا خواہشوں کو بڑھا دیتا ہی۔ اُسکی رُوح کچھ تلاش کرتی ہی اور وُہ محسوس کرتا ہی کہ مجھے کسی چیز کی تلاش ہی مگر نہیں جانتا کہ کس کی تلاش ہی۔ دراصل وُہ راحتِ قلبی ہی جس کے لئے رُوح بھٹکتی پھرتی ہی لیکن اُسے معلوم نہیں ہوتا اسلئے

اس مطلوبہ شے کو وُہ تلاش کرتا ہی لذیذ کھانوں - عُمدہ کپڑوں - صبا رفتار سواریوں سر بفلک کشیدہ محلوں میں - یہ سب چیزیں مل جاتی ہیں - مگر اُن میں وُہ شے جس کی تلاش تھی نہیں ملتی کیونکہ راحتِ قلبی زر و مال سے خریدی ہوئی غرور پرور تن آسانیوں میں نہیں ہی - وُہ مجلسِ طرب اور مشاغل تعیش میں انبساطِ خاطر ڈھونڈھتا ہی لیکن پایان کار یہ اور زیادہ باعث اندوہ و تعب ہوتی ہیں - وُہ اس خیال سے شہرت اور نام آوری کی تمنا کرتا ہی کہ شہرت سے بہت خوشی ہوگی - لیکن سخت جد و جہد کے بعد جب شہرت حاصل ہو جاتی ہی تو یہ دُنیا کی دُوسری چیزوں سے بھی زیادہ ہیچ - ناکارہ - محض اک لفظی اور ہوائی ڈھانچہ - اندر سے بالکل تہی ثابت ہوتی ہی - غرض کہ نادان کو کسی شے کا اندازہ صحیح نہیں ہوتا وُہ واقعی چیزوں کی تمنا میں غیر واقعی چیزوں تک پہنچتا ہی - انہیں کو اختیار کرتا ہی - اُس کے تمام اکتسابات و تصرفات تحصیل حاصل ہوتے ہیں دانا خوب سمجھتا ہی کہ زندگی کی اصلی اور ناگزیر ضرورتیں زیادہ نہیں ہیں پس وُہ اُنکی فطرتی تعداد کو بصحت تحقیق کرتا ہی - یہی وجہ ہی کہ اُنہیں آسانی سے پورا کرسکتا ہی - دُنیا کی وُہ چند نعمتیں جن پر اُسے قدرت حاصل ہوتی ہی اُس کی معدودہ ضروریات کے لئے کافی ہوتی ہیں - اور اگر کافی نہیں ہوتیں تو یہ اُنکے لئے کافی ہوتا ہی - اس لئے ہمیشہ فارغ البال اور مستغنی رہتا ہی -

نادان اپنی ضرورتوں کو مہمول الاعمال سے بڑھا لیتا ہی - اپنی خیالی خواہشوں کو لاتعد و لاتحصیٰ کر لیتا ہی - عُمر گذر جاتی ہی پر اس کی ضرورتیں پُوری نہیں ہوتیں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

باقی رہ جاتی ہیں - اس میں ذرا شک نہیں کہ دُنیا کی تمام نعمتیں بھی اگر اُسے ملجائیں تو بھی اُس کی خیالی ضروریات اور روز افزوں خواہشوں کے لئے ناکافی ثابت ہوں اس لئے یہ محتاجی اور بے اطمینانی سے کبھی نجات نہیں پاتا -

دانا بخوبی واقف ہوتا ہے کہ زندگی کے اصل غم قلیل ہیں اور نیز یہ کہ اصلی مسرتیں اِن سے بھی قلیل تر ہیں۔ پس اِن مسرتوں کو مغتنم جان کر اُن سے جیسا کہ چاہیے متمتع ہوتا ہے اور ساتھ ہی غموم و آلام کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لیے بدل و جان آمادہ رہتا ہے۔ غموم کو اپنی ہستی کا ایسا ہی جزو لاینفک خیال کرتا ہے۔ جیسا کہ مسرت کو اِس لئے واہمہ حوادث اس کی دلجمعی اور سکونِ خاطر کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

نادان زندگی کی اصلی مسرتوں کی تعدادِ قلیلہ کو تمتعاتِ دنیاوی کی مسرّت نما اشکال کے الوانِ بوقلمونی میں گم کر دیتا ہے۔ سچی اور جھوٹی مسرتوں میں کوئی شئے مابہ الامتیاز باقی نہیں رہتی۔ اِس لئے اصلی مسرتوں سے ہمیشہ محروم رہتا ہے اِس کے ساتھ ہی اس کی غلط فہمیاں اس کی فضول کاریوں سے مدد پاکر اسکی جان کے لیے ہزاروں خیالی غم پیدا کر دیتی ہیں جنکو وُہ بہت ہی بُرا خیال کرتا ہے اِس لئے ہر غم انتہا کا جانگسل گذرتا ہے۔ اور از بسکہ غم اُٹھانے کے لیے بطیبِ خاطر کبھی مستعد و آمادہ نہیں ہوتا۔ تھوڑا غم بھی بہت ستاتا ہے۔ نادان کے غموم کی اگر محققانہ چھان بین کیجائے تو شاید فی صدی بمشکل ایک غم ایسا ثابت ہوگا جو اصلی اور ناگزیر غم ہو۔ ورنہ تمام غموم موہوماتِ ذہنی اور مفروضاتِ خیالی نکلینگے جو اُس نے اپنے توہم سے خواہ مخواہ پیدا کر لیے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے ساتھ بہت محبت ہے۔ وُہ اپنی ناچیز خوبیوں کو بزرگ اور اپنے بزرگ عیوب کو ناچیز سمجھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری خوبیاں تکمیل کو کمتر پہنچتی ہیں۔ تاہم ہماری کمزوریاں بیشتر قوی و شدید ہو جاتی ہیں۔ اِدھر ہمارے خیال میں کسی نیکی کا قصد گذرا اُدھر اُس خیالی قصد پر ہم نے اپنے تئیں نیک سمجھ لیا۔ گو وُہ نیک خیال عملی شکل میں کبھی روبکار نہ آئے۔ ہر شخص کو علی العموم

اپنے حسنِ خیال پر حسنِ عمل کا خیال ہوتا ہے۔ انسان اپنی حالت پر اگر بصحت غور کرے تو اپنی خوبیوں کو بہت ہی کم فخر کے قابل پائے۔ لیکن اگر وہ اپنی خوبیوں کا اندازہ دوسروں کے مقابل میں کرے تو اُسے فخر کے بہت موقع ملجائینگے۔ اگر خود اسکی ذاتی خوبیاں فخر کا موقع نہ دینگی تو دوسروں میں خوبیوں کا نہ ہونا یہ موقع دیگا۔ یعنی اگر اُس کی خوبیاں بجائے خود کثیر و کامل نہونگی تو دوسروں میں خوبیوں کی قلت اور عدمِ کمال کے مقابل کثیر و کامل معلوم ہونگی۔ انہیں بنیادوں پر دانا اور نادان کے خیالات میں زمین و آسمان کا بل ہے۔

اول الذکر اپنے اوصافِ حمیدہ کے کمالِ ذاتی کا متمنی ہوتا ہے۔ موخرالذکر دوسروں پر اپنے اوصافِ حمیدہ کے اظہار کو اپنا کمال سمجھتا ہے۔ دانا اپنے عیوب و نقائص کے مقابل اپنی خوبیوں کو قلیل پاتا ہے۔ نادان دوسروں کے معائب کے مقابل میں اپنی خوبیوں کو کثیر تصور کرتا ہے۔ دانا کو اپنے جہل کا علم ہوتا ہے اور اس جہل کو کم کرنا چاہتا ہے۔ نادان اپنے جہل کو علم سمجھتا ہے اور اُسکو بڑہانا چاہتا ہے۔ دانا اپنی خوبیوں کی قلت کے علم سے اپنے نقائص پر منفعل ہوتا ہے۔ نادان اپنے نقائص سے بےخبر رہ کر اپنے محاسن پر فخر کرتا ہے۔ دانا اُن خوبیوں کی تحصیل کی فکر کرتا ہے جو اس میں نہیں ہوتیں۔ نادان بس انہیں خوبیوں کو بہت سمجھتا ہے جو اُس میں ہوتی ہیں۔

دانا کو اپنے دل کی عزت و وقعت آپ حاصل کرنے کی آرزو ہوتی ہے اور نادان دوسروں کی نظر میں وقعت پیدا کرنے کی فکر میں رہتا ہے کیونکہ یہ سہل اور وہ مشکل۔ یہ دروغ اور وہ راستی ہے +

سید محمود حسین جعفری

شیخ علی حزیں

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

رباعیاتِ حزیں

ساقی قدحے کہ دورِ گلزار گذشت مطرب غزلے کہ وقتِ گفتار گذشت
اے ہمنفس از بہرِ دلِ زار بگو افسانۂ آں شبے کہ با یار گذشت

آں غنچہ کہ نشگفد بگلشن، لبِ ماست کامے کہ روا نمی شود، مطلبِ ماست
در عشق دو چیز است کہ پایانش نیست اوّل سرِ زلفِ یار و آخر شبِ ماست

اوضاعِ زمانہ لائقِ دیدن نیست وضعے خوشتر ز چشم پوشیدن نیست
دانی ز چہ پا کشیدہ ام در داماں دنیا تنگ است، جائے جنبیدن نیست

بلبل سر کرد نالہ ہنگامِ صبوح پیمانہ گرفت لالہ ہنگامِ صبوح
احوالِ خمارِ شب بساقی گفتم پُر کرد مرا پیالہ ہنگامِ صبوح

در دہرِ دنی کہ ہست شیرینش تلخ یکدم نزدیم خوش نہ در شام نہ بلخ
قدم چو ہلال شد ز بارِ مہ و سال تا چند بریم غرہ را باز بہ سلخ

آنانکہ بسودائے تو داغ افروزند — ازشعلۂ شوقِ تو دماغ افروزند
چشم ار کنم از روئے تو روشن چہ شود — رسم است چراغ از چراغ افروزند

سامانِ غمے و ثروتے نہ شد جمع، چہ شد — بازیچۂ دولتے نہ شد جمع، چہ شد
گر عاقلی از فقر پریشاں نشوی — سرمایۂ حسرتے نہ شد جمع، چہ شد

بلبل بنوائے آشنا مے نازد — گلشن بدمِ پاکِ صبا مے نازد
ما گرچہ بکلکِ خود بنازیم حزیں — تا ہست سخن بہ کلکِ ما مے نازد

از رہگذرِ دوست صبائے نرسید — چشمم بوصالِ خاکپائے نرسید
دردا کہ ز دردِ ما کسے آگاہ نشد — فریاد کہ فریاد بجائے نرسید

حسنش ہمی از حجاب بیروں آمد — عریاں آتش ز آب بیروں آمد
آمد سحرے بر سرِ بالینم و گفت — برخیز کہ آفتاب بیروں آمد

ساقی قدحے از مئے گلفام بیار — ہنگامِ صبوح گو ز آں جام بیار
آں ناصیہ سوزِ خرد جام بدہ — واں چہرہ طرازِ کفر و اسلام بیار

از ہستئ خویش کناعت میخواہم و بس — عُمرے بنشاطِ فرصت میخواہم و بس
گاہے کہ بود بکامِ دل در نجف است — از بہرِ ہمیں حیات میخواہم و بس

رباعیات شیخ علی حزیں کی بہت سی ہیں اور عموماً خوب ہیں۔ کہاں تک انتخاب کروں۔ جسکو پڑھتا ہوں وہی بھلی معلوم ہوتی ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

مضمون بھی طول کھینچتا جاتا ہے۔ اب صلاح یہی ہے کہ مولانا نظیری کے مطلع پر عمل کروں ؎

نمی گردد کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

ہم نے شیخ کی غزلوں کا انتخاب پیش کیا ہے اور چند رباعیاں بھی نقل کی ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن کی مثالیں تحریر نہ کیں۔ سبب یہ ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ غزل اور رباعی میں انکو خود خاص طور پر مزہ آتا تھا اور اسی لئے انہیں دو صنفوں میں اپنے جوہر بیش از بیش دکھائے ہیں۔ کلام کی نسبت انتخاب کے ضمن میں مختلف مقامات پر ہم نے اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہاں اعادہ منظور نہیں لیکن ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ زوالِ سلطنتِ مغلیہ کے عہد سے آج تک کوئی شاعر ولایت سے شیخ کی ٹکر کا ہند میں نہیں آیا۔ اہلِ ہند ان کو خاتم الشعراء ایران کہتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ قدیم طرزِ سخن میں ان کا جواب پھر کسی سے نہ ہوا۔

علی قلی خاں والہ داغستانی نے جو شیخ کے بڑے رفیق تھے "ریاض الشعرا" میں اُن کا حال شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور اُنکے کلام کی بڑی داد دی ہے۔ خانِ آرزو باوجودیکہ شیخ سے حسد رکھتے تھے اور اُنکے بہت سے اشعار پر اعتراضات بھی کئے ہیں۔ اپنے تذکرہ "مجمع النفائس" میں اُن کے کلام کی توصیف سے قاصر نہیں ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی جنہوں نے شیخ کی صحبت اُٹھائی ہے۔ اُنکے بڑے مداح ہیں اور "خزانہ عامرہ" میں اُنکے کلام کی نسبت

فرماتے ہیں "زبانِ او از غایتِ صفا آب زلال می ماند و کلام او از نہایتِ آبداری نسب بہ سلکِ لآلی می رساند"۔ ہمارے میرزا غالب کہ جن کی داد نکتہ دانوں کے لئے سند ہی اور جو بڑے بڑے نام آور شعرا کو خاطر میں نہیں لائے تھے شیخ کے مداح ہیں (یعنی انکو اپنے برابر سمجھتے تھے!) ؎

توبدیں شیوہ گفتار کہ داری غالب		گر تمنی نکنی شیخ علی را مانی

اپنے دیباچہ دیوان میں شیخ کو "انہاے آرزوے متقدمین و ابتدائے آبروے متاخرین" لکھا ہی اور "مثنوی باد مخالف" میں جہاں اپنے کو اور اساتذہ کا معتقد بتایا ہی۔ وہاں حزین کا بھی ادب سے ذکر کیا ہی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اے تماشائیانِ بزم نگاہ		ہاں بگوئید حسبۃً للہ

کہ چساں از حزیں بہ پیچم سر		آں سجادو دمے بدہر سمر

اور خاتمہ دیوان میں اساتذہ کے فیضان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "شیخ علی حزیں بخندہ زیر لبی بیراہ روی ہائے مرا در نظرم جلوہ گر ساخت"۔

ہر چند شیخ علی حزین کی قدر ہندوستان میں اُنکے کمال کے اندازے پر نہ ہوئی لیکن پھر بھی اُنکے ماننے والوں کا حلقہ کچھ کم وسیع نہیں ہی۔ بنارس کی اقامت کے زمانے میں بفراغت بسر کرتے تھے۔ ہزار روپیہ[۵۱] کا ماہانہ صرف تھا۔ اکابرِ عصر اُن کی ملاقات کو دور دور سے آتے تھے اور بمشکل بار پاتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہی کہ ایک امیر اُنکی ملاقات کو آئے۔ شیخ اپنی چاندی کی پرتکلف پلنگڑی پر لیٹے تھے۔ اِنکو رئیس اور صاحبِ تمیز سمجھ کر اُٹھ بیٹھے اور نام پوچھا۔ اُنھوں نے اپنا نام محمد یوسف بتایا۔ مگر یوسف کا تلفظ بالفتحِ سین کیا۔ سُنتے ہی شیخ پھر پلنگڑی پر لیٹ گئے اور التفات نہ کیا۔

---

۵۱ سیر المتاخرین۔

لطیفہ ایک بار ایک صاحب ان سے ملنے آئے۔ دربان نے جو اپنے آقا کے مزاج سے واقف تھا دروازے پر روکا۔ ان صاحب نے دیکھا کہ یہاں رئیسانہ ٹھاٹھ ہے۔ منّت سماجت سے کام نکالنا چاہا لیکن ایک پیش نہ گئی۔ ایک پُرزے پر یہ مصرع لکھ کر حوالے کیا اور برہم ہو کر چل کھڑے ہوئے مصرع یہ تھا "درِ درویش را درباں نباید"۔ مصرع جب شیخ نے پڑھا فوراً یہ مصرع جواب میں بہم پہنچایا "بباید تا سگِ دُنیا نیاید" اور دربان سے کہا کر دَوڑنا۔ وُہ شخص میرا بھی مصرع سُنتا جائے۔

جب کبھی اتفاق سے کوئی اہلِ فن مِل جاتا تو شیخ نہایت خوش ہوتے۔ چنانچہ ایک بار کا ذکر ہے کہ نور العین واقف لاہوری بغرضِ ملاقات بنارس گئے میاں واقف قلندرانہ زیست کرتے تھے۔ ایک سیاہ کمبل اوڑھے فقیرانہ انداز سے پہنچے اور بلا تکلف شیخ کی پلنگڑی پر جس پر بادشاہِ وقت کو بھی بیٹھنے کی اجازت نہ تھی بیٹھ گئے۔ شیخ متحیّر کہ یا الٰہی یہ کون بلا ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ فرمایا کہ "از کجائی"۔ کہا "از لاہورم" شیخ نے پھر پُوچھا "از واقف واقفی"۔ جواب دیا "بلے واقفم" جواب کی بے ساختگی سے شیخ پھڑک گئے اور گلے لگایا۔ کہا کہ بھئی کچھ شعر اپنے سُناؤ۔ واقف نے نہایت دردانگیز لہجے میں یہ شعر پڑھے جنکو سُنکر شیخ سر دُھننے لگے ؎

ہر غنچہ بشگفت الّا دلِ من ۔۔۔ اَے وا دلِ من لے وا دلِ من

یارب چہ سازد باسنگِ طفلاں ۔۔۔ نازک دلِ من مینا دلِ من

شیخ کی دُنیا سے بے نیازی کا انداز اور آزادانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ نہایت پاکیزہ تھا۔ عالمِ تجرید کے بادشاہ تھے۔ ایک کثیر جماعت اُنکی تعظیم اس طرح کرتی تھی جس طرح اولیا کی ہوتی آئی ہے۔ خود شاہِ عالم نے اُن کی

آستاں بوسی کو فخر سمجھتا تھا اور پولٹیکل اُمور میں بڑے بڑے اُمرا اُنکی رائے لیتے تھے۔ چنانچہ شاہ عالم جب بنگالے میں انگریزوں کے ساتھ جنگ کرنے کے خیال سے آئے تو اِن سے مشورہ کیا۔ شیخ نے کہا کہ انگریزوں سے لڑنے میں شکست ضرور ہوگی اور واقعی ہو کر رہی۔ صرف مسلمان ہی شیخ کی تعظیم و تکریم میں سعی بلیغ نہیں کرتے تھے بلکہ ہندو و انگریز بھی اُنکے معتقد تھے اور اُن کی وفات پر ہر ملت کے لوگوں کی آنکھیں تر ہوئی تھیں۔ رحمت حق بخاک پاکش باد!

سُنا جاتا ہی کہ شیخ ریختہ بھی کہتے تھے۔ واللہ اعلم

رضا علی وحشت

بڑی جنتری سنہ ۱۹۱۰ء

نامی پریس کانپور کا کام اور اس کے مہتمم منشی محمد رحمت اللہ صاحب رعد کا نام محتاج تعارف نہیں سنہ ۱۹۱۰ء کی یہ بڑی جنتری نامی پریس نے حسب دستور مرتب کی ہی جسمیں سلطان محمد خاں مس فرمانروائے ٹرکی، مرزا سلطان احمد شاہ والی ایران، سلطان محمود غزنوی وغیرہ کی رنگین تصویروں کے علاوہ مسٹر ولبر رائٹ کا ہوائی جہاز۔ پارسی ول۔ زپلن وغیرہ فلاینگ فش ائیرشپ جہازوں کے بھی نقشے دیئے گئے ہیں۔ یُوں تو ہر تصویر بجائے خود کارآمد و دلچسپ ہی لیکن سیاح قطب جنوبی لفٹنٹ شکلٹن اور اس کی جماعت کی تصویروں نے جنتری کی وقعت کو دوبالا کر دیا ہی۔ تاریخی مضامین دیکھنے کے قابل ہیں۔ خمسہ متحیرہ فہرست تعطیلات وغیرہ وغیرہ سب کام کی چیزیں ہیں لیکن اس سے پہلے کہ ہم نامی پریس کی اس محنت کی داد دیں اتنا کہینگے کہ اگر آیندہ اس میں صرف وہی اشتہار درج کئے جائیں جو درجہ متانت سے گرے ہوئے نہ ہوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ملک و قوم کی خواتین ایسے نایاب ذخیرہ سے مستفیض نہ ہوں۔ قیمت ۸/ نامی پریس۔ کانپور سے مل سکتی ہی۔

مذہب کیا ہے؟

تمہید | مذہب کی قوت کا اندازہ کرنا امرِ محال ہے۔ تاریخ انسان پر نظرِ غائر ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ اُس کے واقعات کا سب سے بڑا محرک اور مُوجب یہی ہوتا رہا ہے۔ اقوام اسی کے وسیلہ سے متحد ہوتی ہیں۔ اور اسی کی طفیل سے اُن میں مُہلک تفرقہ پھیلتا ہے۔ سلطنتوں کی بربادی اور اقبالمندی اسی کے وسیلہ سے وقوع میں آتی رہی ہے۔ وُہ اس کی اجازت سے بگڑیں اور بنیں جن سخت وحشیانہ مظالم سے بنی آدم کے تاریخی اوراق سیاہ ہیں۔ وُہ اِس کے نام سے عمل میں آتے تھے۔ نہایت بُرے دستور اور مذموم ترین رسوم اس کی پروانگی سے مجلس پر غالب ہی ہیں۔ مردانگی اور شجاعت کے کارناموں کا یہ محرّک ہوتا ہے۔ ایثار علی النفس اور نفس کُشی کے کاموں کو یہ تحریک دیتا ہے۔ بارہا لاکھوں کروڑوں بندگانِ خدا کا خون اس کے نام سے بہایا گیا ہے۔ دنگہ۔ فساد اور بغاوت اِسی کے ایما سے عمل میں آتی رہی ہے۔ کروہ قسم کے جور و جفا اسکی خوشنودی کے واسطے ہوئے ہیں۔ قوموں کی آزادی۔ امن و سکون عالم اور بنی آدم کی راحت و آسائش کا یہی باعث ہوتا رہا ہے۔ کبھی ظلم و ستم کا طرفدار کبھی اس کا مخالف۔ کہیں غلامی قائم کرنے میں حمایت کرتا ہے۔ کہیں آزادی کے لئے تگ و دو کرتا ہے۔ تمدن اور ترقی اس کے ادنیٰ اشارہ سے عالمِ وجود میں آتی ہیں۔ وُہ اُنکی سرپرستی کرتا ہے۔ کبھی علوم و فنون کی نشو و نما میں ساعی اور مساعد ہوتا ہے۔ اور کبھی آرٹ اور سائنس کا جانی دشمن بنکر اس کی بیخ کنی میں مصروف رہتا ہے۔ کبھی قومی ترقی کے گلے

میں سانپ بنکر لپٹ جاتا اور اس کی زیست کا خون پینے میں خوش ہوتا ہی۔ کبھی افراد کو پُرانے رسم ورواج ترک کرنے کی ترغیب دیتا اور انہیں میدانِ ترقی میں قدم رکھنے کی کشش دیتا ہی۔

الغرض مذہب کے کرشمے اور مظاہر نہایت عجیب ہیں۔ اِس وقت مقصُود یہ ہی کہ اس کی حقیقت اور نوعیت اور اس کی مختلف صُورتوں پر غور کیا جائے۔

مذہب کی اصلیت کی بابت عُلما کی رائے

تھوڑے عرصہ سے علمِ مذہب نے مغرب میں سائینس کا درجہ حاصل کرلیا ہی۔ یعنی طبعیات۔ ریاضیات۔ ارضیات۔ فلکیات وغیرہ کی طرح یہ بھی ایک سائینس قرار دیا گیا ہی۔ پروفیسر میکس مُولر صاحب اس کے مُبدا تھے۔ انکی دیکھا دیکھی۔ جرمنی۔ فرانس۔ اور امریکہ میں بھی مذاہب اور معتقدات کا علمی مطالعہ اور تحقیقات شروع ہُوئی مگر آخر الذکر ملک میں اس کی طرف اس قدر توجہ نہیں ہُوئی۔ جس قدر انگلستان اور جرمنی میں ہُوئی ہی۔ میکس مُولر صاحب مقابلۃ الالسنہ (Comparative Philology) کے محقق اُستاد تھے۔ اِس وجہ سے اُنھوں نے مذاہب اور معتقدات کی تحقیقات میں بہت ترقی کی تھی۔

روایات اور میتھالوجی سے غیر متمدن اقوام کے عقائد دریافت کئے۔ مغربی فاضلوں کی برسوں کی دماغ سوزی اور عرقریزی کے قیمتی اور قابلِ قدر نتائج ہبرٹ لیکچرز کے سلسلۂ طویل میں ظاہر کئے گئے جو ۱۸۷۸ء سے پروفیسر میکس مُولر سے شروع ہوکر ۱۸۹۷ء تک رہا۔ اور ڈاکٹر جیمز ڈرمنڈ پر ختم ہوا اس سلسلہ میں دُنیا کے تمام قدیم وجدید مذاہب۔ معتقدات۔ روایات اور قصے کہانیوں پر بسیط بحث کی گئی ہی۔

مذہب کیا ہے؟ یہ سوال بڑا ادق اور جامع ہے۔ اس کا ایسا جواب دینا جس سے اس کا مفہوم حقیقی کما حقہ سمجھ میں آ جائے۔ بہت مشکل ہے۔ مذہب مہد سے لیکر لحد تک انسان کی زندگی پر حاوی اور اس کی عقلی و رُوحانی فطرتوں میں خمیر کی طرح گھُلا مِلا رہتا ہے۔ اس سے کسی طرح رہائی ممکن نہیں ہے اس وجہ سے اس کی تشریح و توضیح دشوار ہے۔ تاہم بڑے بڑے بزرگوں کا اس کی نسبت جو خیال ہے اس کے مختلف پہلو ظاہر کر دیئے جائینگے۔

"مختلف قوموں۔ قبیلوں۔ گروہوں اور فرقوں کا جداگانہ طریقہ سے اپنے اپنے خیال کے مطابق الٰہی ہستی کی عبادت کرنے کا نام مذہب ہے"[1]۔ یہ تشریح غیر مبہم سی ہے۔ اور اس کے متعلق کئی اعتراض پیدا ہو سکتے ہیں۔ جہانتک الفاظ کا علاقہ ہے۔ اصل معنی سے کوئی بحث نہیں۔ "مذہب[2] اس تصوّر کا نام ہے۔ جو انسان ایک یا ایک سے زاید ذی عقل ہستیوں کی بابت رکھتا ہے۔ جسے یا جنہیں وُہ فوق العادت تصوّر کرتا ہے۔ اس میں اس کا وہ خیال بھی شامل ہے۔ جو اس کے اور اس ہستی کے تعلّق باہمی کی بابت ہے۔ جو ایک خاص حد تک اس کی کوشش اور خاص خاص وسائل سے قابلِ ترمیم ہے"۔ اس میں مذہب کے دو بڑے پہلو تسلیم کیے گئے ہیں۔ جو مظاہر مذہبی کی پیچیدگی کے مُوجب ہوتے ہیں یعنی عملی اور اصُولی۔ مذہب کے اصُولی پہلو سے یہ مراد ہے۔ کہ انسان اُن فوق العادت ہستیوں کی فطرت اور نوعیت کی بابت جن پر اُس کا اعتقاد ہے۔ ایک خاص تصوّر رکھتا ہے۔ مذہب کا عملی پہلو یہ ہے کہ انسان پر وُہ ہستی یا ہستیاں غلبہ حاصل کرتی ہیں۔ یا وُہ اُن پر ایک قسم کی طاقت یا اختیار حاصل کرتا ہے۔ مذہب کا اثر

---

[1] "انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا مضمون مذہب"۔ [2] نیو انٹرنیشنل انسائیکلو پیڈیا مطبوعہ نیویارک ۱۹۰۵ء جلد سترہ ملاحظہ ہو مضمون "مذاہب امثالی" (Comparative Religions)

اور تعلق جو قدر معنوی سے ہے۔ اس پر گہری نظر ڈالنے سے مذکورہ صدر تشریح معقول معلوم ہوگی۔ یہ ایک فلسفیانہ خیال ہے جو مذہب کی بابت ظاہر کیا گیا ہے۔ جرمنی کا مشہور فلاسفر اور عالم الٰہیات شلائر میکر (۱۷۶۸ء سے ۱۸۳۴ء) جس نے مذہب کے قیام۔ اور ترقی کے واسطے اپنی زندگی میں بیحد کوشش کی ہے۔ کہتا ہے۔ "ہم طبعاً ایک شے کی احتیاج مطلق سے باخبر ہیں۔ جو ہماری زندگی کی رہنمائی کرتی اور اُسے ترتیب دیتی ہے۔ مگر ہم اس پر اختیار حاصل نہیں کر سکتے"[1]۔ مگر یہ تشریح ادھوری ہے۔ احتیاج بالغیر پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ پروفیسر میکس مولر تسلیم کرتے ہیں۔ کہ شلائر میکر کا خیال کا ادھورا اور نامکمل اقتباس ہے۔ اور فلاسفر اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ جب جرمنی کے ایک نہایت مشہور فلاسفر یعنی ہیگل (۱۷۷۰ء سے ۱۸۳۱ء) کی نظر سے یہ تشریح گذری۔ تو اُسے کہا۔ اگر مطلق احتیاج بالغیر مذہب کا لُبّ لباب ہو۔ تو کُتّا سب سے زیادہ دیندار اور پابند مذہب ہونا چاہئے۔ وہ اپنے آقا پر اس درجہ بھروسا کرتا ہے اور اپنے تئیں ہر بات میں اس قدر محتاج سمجھتا ہے۔ لیکن جب ہم شلائر میکر کے خیال پر غور کرتے ہیں۔ تو اس کی تشریح اس قدر قابل اعتراض معلوم نہیں ہوتی جس قدر بادی النظر میں وہ کہتا ہے۔ "جس طاقت پر ہم وثوق کلی رکھتے ہیں۔ ہم روحانی طور پر اسکے سخت محتاج ہیں"۔ مذہب نہ تو علم ہے اور نہ عمل۔ بلکہ ہمارے خیالات اور تاثرات کا وہ رجحان ہے۔ جو خدا پر یقین مطلق رکھنے کی ضرورت میں ظاہر ہوتا ہے"۔ اس کے خیال کو میکس مولر صاحب اپنے گفرڈ لیکچرز" صفحہ ۶۸ پر یوں نقل کرتے ہیں۔ غیر محدود کے اندر جو کچھ محدود واقع ہے۔ اور ازلی کے اندر عارضی ہے اسکے علم بلا واسطہ کا نام مذہب ہے"۔ اب شلائر میکر کا پورا خیال ظاہر ہوگیا

[1] ہبرٹ لیکچرز صفحہ ۱۹ بمقام ۱۸۷۸ء پروفیسر میکس مولر صاحب۔

ہوگا۔ احتیاج بالغیر کے احساس کے ساتھ زندگی کی غیر محدود حقیقت کی تکمیل بھی شامل ہے۔ اور اس کے ساتھ دُوسرا احساس یہ ہے کہ ہماری اس طاقت کے ساتھ رُوحانی رفاقت اور معنوی اتحاد بھی ہے۔ جس پر ہم کامل بھروسہ رکھتے اور اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

ہیگل حُریت کا حامی اور مددگار ہے اور اسے مذہب کا جوہر قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وُہ کہتا ہے۔ "مذہب کامل آزادی ہے اور یہی ہونا چاہئیے"۔ مگر اس آزادی کے ساتھ فطرۃً ایک خاص قسم کی احتیاج بالغیر لازم آتی ہے۔ پروفیسر میکس مولر صاحب گفرڈ لیکچرز[۵۱] (۹۶ صفحہ) میں ہیگل کے تصورِ مذہب کا پُورا اقتباس دیتے ہیں۔ "مذہب وہ علم ہے جسکی بدولت محدود رُوح اپنے جوہر اور گُن (Essence.) بحیثیت رُوح قائم بالذات کے حاصل کرتی ہے"۔ اس تشریح سے یہ ظاہر ہوگا کہ فلاسفر موصُوف محدود رُوح کو اس کے قیود سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن جب مذہب کی یہ تشریح کیجائے کہ "الٰہی رُوح محدود و منشر و طارُوح کے وسیلہ سے اپنے وجود مُطلق سے باخبر ہو جانے کا نام ہے"۔ تو بقول ڈاکٹر بائڈ کارپنٹر (بشپ آف رپن)[۵۲] آزادی سچی احتیاج بنجاتی ہے۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ ظاہر ہو جائیگا کہ احتیاج اور آزادی مذہب کے دو زبردست خواص ہیں۔ جو انسان کی زندگی پر غلبہ حاصل کرنے کے واسطے آپس میں کشاکش کرتے رہتے ہیں۔ اور انسان کی زیست انکے اظہار کا وسیلہ بنتی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر یُوں کہنا بجا ہوگا کہ محدود اور غیر محدود کے تعلق فیمابین کے تصور کا نام مذہب ہے۔

---

[۵۱] "اوریجن آف ریلیجن" میکس مولر صاحب صفحہ ۲۰ ۔

[۵۲] بمپٹن لیکچرز ۱۸۸۷ء صفحہ ۳۶ (تمہید) ۔

جرمنی کا ایک نہایت نامور فلاسفر اور عالم الٰہیات یعنی پفلائی ڈرر[51] (Pfleiderer.) نے اپنی ایک کتاب میں مذکورہ بالا تشریح کی ہے اور اس سے مشہور ڈچ تھیالوجین ٹیل[52] (Tiele.) نے اتفاق کیا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ مذہب۔ آزادی اور احتیاج کی آمیزش اور ترکیب کا نام ہے۔ محدود اور مشروط رُوح آزاد ہو جاتی ہے۔ اور اپنی قوار سے کامل آزادی سے کام لینے پر قادر ہے۔ اور اپنے آپ غیر محدود رُوح کی احتیاج محسوس کرتی ہے۔ ایک معنی میں اوّل الذکر مؤخرالذکر کے ساتھ رفاقت رکھتی اور اس کی قربت اور وصل کا حظ حاصل کرتی ہے۔ آزادی جو اُسے حاصل ہوتی ہے۔ وُہ قوت ہے۔ جسے وہ حسب منشا ظاہر کر سکتی ہے اور اس سے کام لیتی ہے۔ حالانکہ اس کے بغیر آخرالذکر کا اظہار پذیر ہونا محال ہے۔ خدمت گذاری میں آزادی[53] حاصل ہوتی ہے۔ ہم اوروں پر اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعہ سے حکومت کرتے ہیں۔ یہ خدا کے بندوں کی حُریت ہے۔ یہ خُدا کی وُہ خدمت ہے جو کامل آزادی ہے +

باقی آئندہ

---

[51] ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ اب تک زندہ ہے۔ کئی مشہور کتابوں کا مصنّف ہے۔

[52] لنڈن میں ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ تھیالوجی کا زبردست ماہر تھا

[53] ڈاکٹر بانڈ کا رونسٹر بمپٹن لیکچرز"۔

کلمبس

(سلسلہ کے لئے اکتوبر ۱۹۰۹ء کا پرچہ ملاحظہ ہو)

کلمبس ہمیشہ موتی اور سونا اور روئی وغیرہ جو خراج میں ملتا تھا اندلس بھیج دیا کرتا تھا۔ اب کے بھی اُس نے دو جہازوں کی روانگی کا حکم دیا اور اجازت دی کہ اندلس والوں میں سے جس کا جی چاہے ان جہازوں پر وطن کو مراجعت کریں بہت سے لوگ جانے پر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اکثر ان میں اولڈن کے جرگہ والے تھے۔ وہ اپنے ساتھ بہت سے غلاموں کا قافلہ لیکر سوار ہوئے۔ اور اکثر رؤسائے شہر کی بیٹیوں کو بھگا لے گئے۔ کلمبس کا ان لوگوں سے کچھ بس نہ چلتا تھا اُس نے سرکار میں سب حال مفصل لکھ بھیجا کہ مجھے مجبور کر کے اور میرے ساتھ بغاوت کر کے ان بدذاتوں نے زمین پر قبضہ ء جزیرہ میں اقتدار حاصل کیا ہے۔ اور کسی حاکمِ عادل کو یہاں فصل خصومات کے لئے بھیجنا چاہیے۔ کلمبس کے بعض بدخواہ و حاسد جو اندلس میں تھے اُنہوں نے اسی زمانے میں یہ چالاکی کی (کہ خلیج پیریا کا نقشہ اور طول و عرض بلد اور دریائے اوقیانوس کا راستہ جو کلمبس نے لکھ کر سرکار میں بھیجا تھا۔ اُس نقشہ کی نقل لی اور ایک تاجر جغرافیہ دان و جہازران جس کا نام امریگو تھا۔ چار جہاز ساتھ لیکر جنوبی امریکہ میں جا پہنچا۔ اور بندگانِ خدا کو غلام بنانے کے لئے جہازوں میں بھر کر اندلس لے گیا۔ اور اسی تاجر کے نام اس نئی دُنیا کا نام امریکا رکھا گیا۔ یہ لوگ جاتے جاتے جزیرہ ہسپانیولا میں بھی اُترے اور باغیوں کے شریک ہو کر

کلمبس کے لوگوں سے محاربہ بھی کیا۔ ان لوگوں نے دربار اندلس میں جاکر کلمبس کی بے انتہا شکایتیں کیں اور بیجا الزام لگائے۔ بہت سی عرضیاں فریادیوں کی پیش کرادیں۔ آخر دربار اندلس سے ایک شخص منصف مقرر ہوکر اُن الزامات کی تحقیق و تدارک کے لئے جزیرہ ہسپانیولا کو روانہ ہوا۔ یہ شخص کلمبس کا بڑا دشمن تھا اُس نے آتے ہی کلمبس کے تمام مال و اسباب و زر و جواہر کو قرق کرلیا اور ہضم بھی کرگیا۔ اس کے بعد اس حکیم کو پابہ زنجیر اندلس کو روانہ کیا۔ راہ میں رئیس مرکب نے چاہا کہ کلمبس کے پاؤں سے زنجیر اُتارے مگر وُہ اس بات پر راضی نہ ہوا کہا کہ مَیں یہ زنجیر پہنے ہوئے ملکہ کے سامنے جاؤنگا۔ اور اگر آزادی ملی تو اس زنجیر کو اپنی خدمت کا صلہ سمجھ کر ہمیشہ اپنے پاس رکھونگا اور اپنے ساتھ قبر میں لیجاؤنگا اور اُس نے ایسا ہی کیا اور آخر سنہ ۱۵۰۰ء میں قیدی اندلس پہنچ گیا۔ غرناطہ کے دارالامارۃ الحمرا میں ہر شخص کی زبان پر یہ عبرت خیز فقرہ تھا کہ جس حکیم نے نئی دنیا کا پتہ لگایا تھا وُہ وہاں سے زنجیروں میں جکڑا ہوا آیا ہے۔ تمام شہر کو اس واقعہ پر نہایت عبرت و حیرت تھی (فرڈیننڈ۔ وایزبلا نے غرناطہ سے فرمان جاری کیا کہ فوراً کلمبس کو قید سے رہا کردیا جائے۔ اور خود کلمبس کو ایک شُقہ آیا کہ ہم دونوں آدمی تمہاری اِس بے عزتی ہونے پر نہایت ملول ہیں اور تم غرناطہ میں چلے آؤ۔ کلمبس جب دربار میں پہنچا تو بادشاہ ملکہ نے بڑی محبت و شفقت سے اس سے مُلاقات کی۔ ملکہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور یہ دیکھکر کلمبس بھی خُوب رویا فرڈیننڈ گو بظاہر کلمبس سے بہ شفقت پیش آیا۔ مگر دل میں اس کے بڑا حسد اس بات کا تھا کہ کلمبس غیر ملک کا رہنے والا ہے اور اس سے کچھ عہد و پیمان ہوگیا ہے اُس کے بموجب جس جس ممالک کا پتہ لگتا جائیگا اسکو بھی حصہ اُن میں سے دینا پڑیگا اور اب

اس شخص کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خود سرکاری آدمی جا کر تمام ممالکِ جدیدہ پر قبضہ و انتظام کر سکتے ہیں۔ عرصہ تک اُس نے کلمبس کو فقط زبانی ہی مہربانی پر ٹالا۔ اور حیلہ حوالہ میں لگا رکھا۔ وہاں جزیرہ میں نالائقوں نے بادشاہی کرنی شروع کی کشتکاری و کوہ کنی میں غریب دیسیوں سے ایسی سخت مشقت لینے لگے کہ جانور بھی اس محنت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ سب کو اپنا غلام بنا لیا وہاں کے رئیسوں کی بیٹیاں ان کی خادمہ تھیں۔ یا معشوقہ ہُوا دار میں سوار ہو کر پھرتے تھے آٹھ آٹھ آدمی کا کاندھا دیتے ہوئے ایک چھتری لگائے ہوئے ایک پنکھا جھلتا ہوا ساتھ دوڑ رہا ہے۔ ایک ایک نفرے کے ساتھ خادموں کی قطار چلتی تھی۔ جس گاؤں میں پہنچے اُسے لوٹ لیا اور رئیس دہ کی بہو بیٹیاں ناچنے کے لئے پکڑوا بلوائیں۔ ذرا ذرا سی خطا پر بلکہ اکثر بلا سبب ٹھوکر اور گھونسوں کے علاوہ بندوق مار دینا کوئی بات نہ تھی۔ ان مظالم کی خبریں ملکہ کو پہنچیں اور اس کا دل بہت کڑھا۔ آخر کار سرکار کی طرف سے ایک شخص تمام جزیرہ کا حاکم منفتدر منفرر ہو کر تیس جہاز ساتھ لیکر جس پر ڈھائی ہزار آدمی سوار تھے اندلس سے فروری ۱۵۰۲ء کی ۱۳ تاریخ روانہ ہوا۔ اُدھر کلمبس نے اپنی بیکاری کے زمانہ میں (بیت المقدس) پر حملہ کرنے کی بہت کوششیں کیں۔ پوپ کو عرضیاں بھیج بھیج کر بہت اُبھارا تمام والیانِ ملک کو نامے لکھے کہ جس طرح اندلس سے مُسلمانوں کو نکال دیا ہے اسی طرح بیت المقدس کو بھی اُن کے قبضہ سے چھڑا لینا چاہئے۔ یہ چاہتا تھا کہ پانچ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے فراہم ہو جائیں لیکن یہ لوگ اس کوشش میں تھک کر بیٹھ رہے تھے کچھ سود مند اس کا نکلنا نہ ہوا۔ اِسی زمانہ میں پرتگال والوں نے افریقہ کے کنارے کنارے پھرتے پھرتے بحر ہند تک رسائی کی اور ہندوستان جنت نشان کے مغربی

ساحل پر پہنچ گئے۔ کالی کٹ اور پرتگال کے درمیان تاجروں کی آمد و رفت ہونے لگی اس کامیابی کی خبر تمام یورپ میں مشتہر ہو گئی۔ کلمبس کو پھر جوش آیا اور اُس نے بادشاہ سے کہا کہ ان لوگوں نے تو مشرقی سیاحت میں ہندوستان کا پتہ لگایا میں مغرب کی طرف اس سے زیادہ تر آسان و قریب کی راہ ہندوستان میں جانے کی نکال سکتا ہوں۔ بادشاہ نے اسے اس کام کے لئے مغرب کی جانب روانہ ہونیکی اجازت دی۔ لیکن جزیرہ ہسپانیولا میں اُترنے کی ممانعت کی۔ مئی ۱۵۰۶ء کی ۹ تاریخ کلمبس پھر امریکہ کو روانہ ہوا۔ چھوٹے بڑے سب ملا کر چار جہاز اور ڈیڑھ سو آدمی اس کے ساتھ تھے۔ ہسپانیولا میں جانے کا ارادہ اس کا نہ تھا مگر راہ میں طوفان کے آثار دیکھ کر یہ مجبور ہو گیا۔ اُس نے چاہا کہ ہسپانیولا میں طوفان سے پناہ لے اس لیئے حاکم جزیرہ کے پاس ایک شخص کو بھیجا۔ محض طوفان کے خوف سے میں چاہتا ہوں کہ میرے جہازوں کو ندی میں آنے کی اجازت ملے اُس نے سخت ممانعت کی کلمبس بمجبوری اپنے جہازوں کو ایک اَور جزیرہ میں لیچلا اور خوفِ طوفان سے اُس کو وہاں سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہوئی اُس نے دیکھا تھا کہ ہسپانیولا سے اندلس کو بہت سے جہاز روانہ ہونے والے ہیں اُن لوگوں کو بھی اُس نے طوفان سے ڈرایا مگر اُنہوں نے اس پر استہزا کیا۔ اُدھر کلمبس نے ایک جزیرہ پر جا کر پناہ لی۔ اُدھر اندلس کو جانے والے جہازوں پر سب لوگ کلمبس کے مخالفین اور معاندین بہت سا مال و زر جو فتنہ و شر سے پیدا کیا تھا ساتھ لیکر سوار ہوئے تھے سرکاری خراج کا بہت سا سونا خزانہ میں داخل کرنے کو لیکر چلے تھے دو ہی دن کے بعد کلمبس کا کہا پیش آ گیا۔ وہ سخت و تند طوفان آیا کہ سب جہاز تباہ ہو گئے وُہ منصف جس نے کلمبس کو ملزم بنا کو زنجیر پہنا کر اندلس میں بھیجا تھا۔ اولڈان جو باغیوں کا سرگروہ تھا اور کلمبس کے تمام مخالفین اور سب مال و زر جو غریبوں پر ظلم کر کے

جمع کیا تھا۔ دامِ موج میں صید اور حلقۂ گردباد میں قید ہو کر دہنِ گرداب کا نوالہ ہو گئے قارون خزانہ سمیت تحت الثریٰ میں پہنچ گیا۔ منتقمِ حقیقی کی یہ شان دیکھئے کہ اتنے جہازوں میں ایک چھوٹا سا جہاز جس پر کلمبس کا مال و اسباب حاکمِ جزیرہ نے روانہ کیا تھا بے خوف و خطر بغیر گزند و ضرر اندلس میں جا پہنچا۔ ایک دیسی سردار جو کئی سال سے قیدِ فرنگ میں گرفتار تھا وُہ بھی انہیں جہازوں میں سوار تھا۔ ہوا کی چکی جو چلی تو گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس گیا۔ مگر اس طُوفان میں کلمبس کے جہازوں کو بھی بہت ضرر پہنچا تھا۔ اُس نے پہلے جہازوں کی مرمّت کی اُنکی درستی سے فارغ ہو کر ہندوستان کی راہ ڈھونڈھنے کے لئے روانہ ہوا۔ برِاعظم امریکہ تک اُس کے جہاز پہنچ گئے مگر اس دُھن میں کہ زمین کے درمیان سے کوئی نہ کوئی آبادی اِسے ضرور ملیگی جس میں سے ہندوستان تک پہنچنے کی راہ نکل آئیگی۔ یہ کنارے کنارے جنوب کی طرف بڑھتا گیا۔ لیکن ہوا کی مخالفت گرمی کی حدت امراض کی شدت راہ کی دشواری زادِ راہ کی قلت نے مجبور کر دیا۔ وہاں سے پلٹ کر وریگوا میں اُتر پڑا یہاں کے لوگ پہلے تو بے اعتنائی سے پیش آئے۔ لیکن آخر میں اُنہوں نے بہت سا سونا اور ہدایا پیش کئے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ سونا تم کہاں سے لاتے ہو۔ اُن لوگوں نے بلا عذر وُہ مقام بتا دیا اور جہاں تک اُن سے سونا چنا گیا سطحِ زمین پر سے اور درختوں کی جڑوں میں سے چُن کر کلمبس کے پاس لا کر ڈھیر لگا دیا اور بیان کیا کہ اس سرزمین پر کوسوں سونا ہی سونا نظر آتا ہے۔ کلمبس نے یہاں بستی بسانے کا اور چھاؤنی چھانے کا حکم دیدیا۔ دریائے بیلن کے کنارے چھپّر ڈالے گئے۔ گدام بنائے گئے اور اسّی آدمی انتخاب ہوئے کہ وُہ اس نئی بستی میں بس جائیں اور کلمبس باقی لوگوں کو ساتھ لیکر اندلس روانہ ہوا۔ لیکن جس وقت کلمبس اس ندی میں جہازوں کو لایا تھا۔ ندی چڑھی ہُوئی تھی اور روانگی کے وقت کلمبس نے دیکھا کہ پانی

اس قدر اُتر گیا تھا کہ جہاز کا چلنا دشوار تھا۔ ناچار ہو کر بارش کا انتظار کرنا پڑا اور روانگی میں تعویق ہوئی۔ اسی اثنا میں یہ خبر آئی کہ ان لوگوں کے رہ پڑنے پر رئیس قوم ناراض ہے اور وہ لوگوں کو جمع کر رہا ہے کہ شبخون مارے۔ تمام بستی اور چاروں جہاز جلا دیئے اور سب کو قتل کر ڈالا۔ اس خبر کو سنکر چھتر آدمیوں کی ایک جماعت جہاز میں بیٹھ کر دریا کے کنارے اندھیری رات میں رئیس کے مکان پر یکایک چڑھ دوڑی اس کو اور اسکے عیال و اطفال و ملازمین کو گرفتار کر کے ہاتھ پاؤں باندھ کر جہاز پر لے آئے۔ اس کا مال وزر اور خزانہ و تاج و زیور سب لوٹ کر جہاز میں بھر لیا۔ وہ رئیس تو اُسی شب پہرے والے کو دھوکا دیکر رسّی سمیت دریا میں کود پڑا باقی جتنے اسیر تھے وہ سب کے سب جہاز کی ایک کوٹھری میں کئی دن تک بند رہے۔ ایک دن اتفاق کر کے اپنے گلے میں پھانسی لگا کر سب کے سب مر گئے۔ قاتلوں کو اطمینان تام ہو گیا کہ اس زمین زرخیز کا جو مالک تھا وہ تو دریا میں ڈوبا جو اس کے وارث تھے وہ بھی پھانسی لگا کر مر گئے۔ اب کچھ فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ رہا۔ لیکن یہ گمان اُن کا غلط تھا۔ مالک اُسی رسّی میں بندھا ہوا پیر کر کنارے پہنچا اور پانی سے نکل کر آتش حرب کو اس نے مشتعل کر دیا۔ اندلس والوں کو نئی بستی چھوڑ کر جہاز پر بھاگنا پڑا۔ ایک ناؤ پر جتنے لوگ تھے کپتان سمیت سب کو دشمنوں نے مار ڈالا۔ آخر کلمبس کی یہ رائے ہوئی کہ بالفعل اس زمین کو چھوڑ کر یورپ کی طرف مراجعت کرنا چاہئے۔ وہاں سے بہت سی فوج لاکر پھر اس پر قبضہ کرینگے۔ غرضکہ اواخر اپریل ۱۵۰۳ء میں کلمبس ورَیگوا سے روانہ ہوا ایک جہاز ندی میں پھنسا رہ گیا۔ اُسے وہیں چھوڑا باقی کے تین جہازوں میں بھی اتنا دم نہ تھا کہ یورپ تک صحیح و سالم پہنچ جائیں۔ دوسرے زادراہ اس قدر نہ تھی کہ اتنے بڑے سفر کے لئے کافی ہو۔ مجبور ہو گیا اور پہلے ہسپانیولا میں جانا ضرور ہوا

وہاں سے جہازوں کی مرمت کر کے اور زادِ راہ لیکر اندلس کو روانہ ہُوا لیکن اس دریا میں پانی کا بہاؤ مغرب کی طرف تھا اور چڑھاؤ کا سُنا پڑتا تھا۔ جب بہت تھکتے تھے تو تھوڑی راہ طے ہوتی تھی۔ بہت دِن گذر گئے۔ زادِ راہ ہو چکی فاقے ہونے لگے ایک جہاز راہ میں ٹوٹ گیا تین جہازوں کے آدمی دو میں ہو گئے۔ اب ہسپانیولا تک پہنچنا بھی محال ہو گیا۔ یہ فکر ہُوئی کہ کوئی جزیرہ مل جائے تو وہاں اُتر پڑیں۔ خدا خدا کر کے جُون کی ۲۴ تاریخ جزیرۂ جمیکا میں یہ لوگ پہنچ گئے۔ جہاز اس قابل نہ رہے کہ گہرے پانی میں کھڑے رہیں کلمبس نے ساحل سے ایک تیر کے فاصلہ پر ریتی میں تینوں جہازوں کو لاکر کھڑا کیا دُھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے عرشہ کو اُوپر سے چھا لیا ان سب سے کہ نیچے سب جہازوں میں پانی بھر آیا تھا اور دیسیوں کا حملہ روکنے کے لئے جہاں تک ممکن ہُوا بندوبست کر لیا۔ اُس نے قطعی ممانعت سب کو کر دی کہ ہرگز کوئی جہاز پر سے اُتر کر زمین پر نہ جائے اور دیسیوں کی ناگوار طبع کوئی بات نہ ہونے پائے جزیرہ کے لوگ جہاز دیکھ کر کنارے پر آئے۔ جہاز والوں نے اُن کے ہاتھ جھوٹے زیور کو فروخت کیا اور اُن سے اس کے عوض میں کھانے پینے کی چیزیں اور ناویں مول لیں۔ اِدھر کے لوگ بڑے بڑے درختوں کو بیچ سے خالی کر کے ناؤ بنا لیا کرتے تھے۔ کلمبس نے جزیرہ کیوبا والوں کی ناؤ بنائی ہُوئی ایک ناؤ دیکھی تھی جو تیس گز لمبی اور آٹھ گز چوڑی تھی۔ غرض ایک عرصہ تک اہل جزیرہ ان سب لوگوں کو اسبابِ معیشت پہنچاتے رہے۔ لیکن انکو اپنی بیکسی اور بے بسی پر صبر نہ تھا۔ آپس میں کہتے تھے کہ ان وحشی دیسیوں کا کچھ اعتبار نہیں جب جائینگے رسد موقوف کر دینگے اور ہم سب بھوکوں کو مار ڈالینگے اسی اندیشہ میں بعض لوگوں نے جان جوکھوں گوارا کی اور چھوٹی سی ناؤ میں بیٹھ کر دیسی ملاحوں کو ساتھ لیکر کلمبس کا خط لئے ہُوئے ہسپانیولا کی طرف روانہ ہُوئے کہ وہاں سے کوئی جہاز مول لائیں اور سب کو اس خطرہ سے نجات

دیں ان لوگوں کو گئے ہُوئے بھی کتنے ہی مہینے گذر گئے کچھ حال معلوم نہ ہوا سب کو یہی اندیشہ تھا کہ بڑے سمندر میں چھوٹی ناؤ کیا چل سکتی ہے۔ شاید سب لوگ ڈوب گئے۔ بے صبری اُنکی حد سے بڑھ گئی۔ کلمبس پر اپنا غصّہ نکالا۔ صدہا باتیں سنائیں سخت دہائی کی دس ناویں دیسیوں سے جو کلمبس نے مول لیں تھیں۔ اڑتالیس آدمی اُن میں سوار ہو کر اور بہت سے دیسیوں کو ساتھ لیکر کلمبس کا ساتھ چھوڑ کر دغا دیکر ہسپانیولا کی طرف روانہ ہُوئے جمیکا کے کنارے کنارے مشرق کی طرف چلے راہ میں دیسیوں کی جو بستی نظر آئی اُترے اور اُسے لُوٹا یہانتک کہ مشرقی کنارے پر جزیرہ کے پہنچے اور ساحل کو چھوڑ کر بڑی دریا میں ناؤ کو ڈالا ابھی پندرہ سولہ میل نہ چلے ہوں گے کہ ہوا کا زور اور پانی کا شور ناؤ کو الٹنے لگا۔ مجبور ہو کر پھر زمین کی طرف مُڑے۔ ناؤ کو ہلکا کرنے کے لئے غریبوں کا مال۔ جو لُوٹ لُوٹ کر بھرا تھا دریا میں پھینکنے لگے اس پر بھی وزن کی کمی نہ ہُوئی تو سب دیسیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر سمندر میں پھینکدیا وُہ بیچارے پیرتے ہُوئے ساتھ ساتھ چلے اور یہ تلواریں کھینچتے ہُوئے انکو ناؤ پر چڑھنے سے روکتے تھے جہاں کسی نے تھک کر ذرا دم لینے کے لئے ناؤ کا کنارہ پکڑ لیا کہ موجِ شمشیر سر سے گذر گئی یا ہاتھ قلم ہو گئے۔ یہ تو کنارہ پر صحیح وسالم پہنچ گئے۔ لیکن وُہ غریب دریائے خون میں ڈوب مرے۔ طُوفان نکل جانے کے بعد ان باغیوں نے پھر تین دریا سے عبور کرنا چاہا مگر واپس آنا پڑا۔ آخر یہ ٹھان لی کہ جمیکا کی بستیوں کو لوٹینگے اور دیسیوں کا گلا کاٹ کر پیٹ پالینگے انکی حرکتوں نے اہل جزیرہ کو اندلس والوں سے بیزار کر دیا۔ کلمبس اور اُسکے ہمراہی فاقے کرنے لگے رسد ملنا اب موقوف ہو گئی اور جھوٹے زیور کی بھی کچھ قدر نہ رہی۔ کلمبس علم ہیئت سے واقف تھا اُسے معلوم ہوا کہ اس جزیرہ میں چاند گہن پُورا ہونے والا ہے اُس دن اُس نے

تمام دیسی رئیسوں کو جو اس کے قرب جوار میں رہتے تھے جمع کیا اور اُن لوگوں سے کہا کہ ہم سب لوگ آسمان والے خدا کے طاعت گذار ہیں۔ تم لوگوں نے رسد بند کر کے ہمارے مار ڈالنے کا ارادہ کیا ہے۔ اِس سبب سے ہمارا خدا تم لوگوں پر نہایت غضبناک ہوا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر آسمان سے عذاب نازل ہو۔ اگر تمہیں باور نہیں ہے تو آج ہی رات کو اُس کے قہر و غضب کا نمونہ تم سب کو چاند میں دکھا دونگا۔ مترجم سے یہ تقریر سُنکر سب لوگ خائف ہوئے اور رات ہونے کے منتظر رہے۔ جُوں ہی اُنہوں نے دیکھا کہ چاند پر سیاہی دوڑنا شروع ہوئی۔ مارے خوف کے کانپنے لگے۔ جب سارا چاند گہن میں آگیا اور اُس کا غضبناک چہرہ اُن لوگوں نے دیکھا تو دَوڑ دوڑ کر کلمبس کے پاؤں پر گر پڑے اور کہنے لگے کہ اپنے خُدا کے قہر و غضب کو فرو کرو۔ ہم لوگ ہمیشہ تمہاری اطاعت کرینگے اور تمہارے لئے حسب دستور اسباب معیشت پہنچائینگے۔ یہ سُنکر کلمبس جہاز پر گیا تاکہ خُدا سے دُعا کرے کہ غصہ اپنا روک لے۔ جب وقت انجلا قریب آیا تو اُس نے جہاز پر سے آکر اُن لوگوں سے کہا کہ اس شرط پر کہ تم ہمیشہ رسد پہنچایا کرو گے۔ ہمارے خُدا نے اپنا غضب روک لیا اور اب چاند کا رنگ پھر اصلی حالت پر آجائے گا۔ یہ اس کا کہنا تھا کہ چاند کا کنارہ چمکنا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ نور بڑھتا گیا اور ظلمت گھٹنے لگی۔ یہانتک کہ سارا قرصِ ماہ تنور خسوف سے نکل آیا اور اندلیسیوں کو روٹی ملنے کا سامان اور رسد کے بھیجنے کا عہد و پیمان پختہ ہوگیا۔ دیسیوں کو اعتقاد ہوگیا کہ کلمبس کے پاس آسمان کی خبر آتی ہے۔

ایک سال اُنہوں نے کلمبس کو اور اسکے رُفقا کو کھلایا۔ اڑتالیس آدمی باغی جو جزیرہ کے لوگوں کو لُوٹتے پڑے پھرتے تھے اُن کا سردار پوراس تھا اُس نے سب کو اغوا کر کے باغی بنایا تھا اُس نے سب کو اس بات پر آمادہ کیا کہ کلمبس کے

جہازوں کو چلکر لوٹ لو اور اُس کے پاؤں میں بیڑی ڈالدو اور مجرم و ملزم بناکر رکھو ہسپانیولا میں اُس پر ظلم وجبر کا الزام قائم ہوچکا او بیڑیاں پہن چکا ہے - سرکار سے اسی جزیرہ کی حکومت پھر اُسے نہ ملی اور دُوسرا حاکم مقرر ہوگیا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم لوگ اس کے زیر حکم رہیں اور اُس کا ظلم سہیں - سب لوگ کلمبس کی اسیری پر بلکہ قتل پر آمادہ ہوگئے - کلمبس ایک عرصہ سے وجع مفاصل میں مُبتلا اور صاحب فراش تھا - اس یورش کی خبر اسکو معلوم ہوگئی - اس کے ساتھ جو چند لوگ خیر خواہ باوقار تھے اُنکو انتخاب کیا اور بارتھولومیو کو اُنکا سردار مقرر کر کے پوراس کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر اب بھی تم لوگ ان ہتکنڈوں سے باز آؤگے تو تمہارا قصور معاف کردیا جائیگا اور تم سے برعایت وشفقت پیش آونگا - یہ سُنکر پوراس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ بھائیو تم کو دغا سے بلاتا ہے کہ قابو میں آجاؤ تو خوب قصاص لے غرضکہ جنگ چھڑ گئی - تلوار کھنچ گئی - چند آدمیوں نے ملکر بارتھولومیو پر حملہ کیا - یہ شخص بڑا کار آزمودہ وجہاندیدہ وجری تھا - اُن میں سے کئی شخصوں کو تلوار کے گھاٹ اُتارا - اسی ہنگامۂ کشت وخون میں پوراس نے بڑھ کر ایک تلوار ماری کہ سپر میں در آئی اور اُس کے ہاتھ کو بھی زخمی کیا - ابھی تلوار سپر میں سے نکلی نہ تھی کہ بارتھولومیو نے اس مفسد کو قضا کی طرح دبوچ لیا اور بھی کئی شخص آکر لپٹ پڑے - غرضکہ باغیوں کا سردار اور کئی شخص اور زندہ گرفتار ہوگئے - یہ دیکھ کر باقی لوگ منتشر ہوگئے اُنکا تعاقب کرنا بھی خلافِ مصلحت تھا - کلمبس کے گروہ میں سے فقط دو شخص زخمی ہوئے جن میں سے ایک مرگیا - بارتھولومیو سب قیدیوں کو لئے ہوئے جہاز پر آیا اُسکے دُوسرے ہی دن سب باغیوں نے کلمبس سے معذرت کی اپنے گناہ کا اعتراف کیا طلبگار عفو ہوئے کلمبس نے سب کا قصور معاف کردیا فقط پوراس کو قید رکھا تھا کہ اندلس میں پہنچ کر دادخواہی کرے - اسی اثنا میں

کلمبس کی طرف سے جو لوگ ہسپانیولا میں گئے ہُوئے تھے دو جہاز ساتھ لیکر آگئے حاکمِ جزیرہ کلمبس کا بدخواہ تھا چاہتا تھا کہ جمیکا میں کلمبس فاقے کر کے مر جائے یا دیسیوں کے ہاتھ سے مارا جائے۔ اعانت کرنے میں اور جہاز بھیجنے میں اس نے مہینوں لگائے اور حیلہ حوالہ کر کے اتنے دنوں ٹالتا رہا۔ آخر ایک سال کے بعد جزیرہ جمیکا سے سب اندلس والے جُون کی اٹھائیسویں ۱۵۰۴ء کو روانہ ہُوئے ہسپانیولا پہنچے۔ حاکم نے گرمجوشی سے کلمبس کا استقبال کیا اپنے یہاں اُتارا مگر پوراس کو قید سے رہا کر دیا اور لڑائی میں جو کئی شخص مارے گئے تھے۔ اُن کے قتل کا الزام کلمبس کے گروہ پر رکھا۔ کلمبس ہسپانیولا میں آکر کچھ خوش نہ ہوا۔ اُس نے دیکھا کہ اس حاکمِ جدید نے جو انتظام کیا ہے وُہ سابق کے انتظام سے بڑھ کر ظالمانہ ہے اس کے ساتھ یورپ سے ڈھائی ہزار آدمی فقط اسی واسطے آئے تھے کہ جہانتک جلد ہو سکے سونا جمع کر کے دولتمند ہو جائیں۔ جا بجا اُنھوں نے زمین کھودنی شروع کی اور غریب دیسی لوگ انکے کوڑوں کے نیچے مرنے لگے محنتِ شاقہ کرتے کرتے انکی یہ نوبت پہنچی کہ ہزاروں نے خودکشی کی۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو مار ڈالا کہ جی کر کیا کرینگے بڑے ہو کر مصیبت تو نہ بھرینگے اُنکو کھانے کو اس قدر کم دیتے تھے کہ ہزاروں بھوکہ بھوکہ کہکر مر گئے۔ یہ اکثر ہوا ہی کہ کام سے فارغ ہو کر جب گھر جانے لگے تو کوئی راستہ میں گر کر مر گیا کوئی کسی چشمہ کے کنارے پانی پی کر ٹھنڈا ہو گیا۔ کوئی کسی درخت کی چھاؤں میں لیٹ کر سو گیا اور ایسا سویا کہ پھر نہ اُٹھا اس کے علاوہ جزیرہ کے شرقی صوبہ کا جو رئیس تھا اس نے اپنی زمین میں ابھی تک یورپ والوں کو دخل نہیں دیا تھا۔ حاکمِ جزیرہ نے اس کے فتح کرنے کے لئے فوج روانہ کی جس نے وہاں کی تمام بستیوں کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا اور قتلِ عام بچے بوڑھے عورتیں تک ماری گئیں۔ مالکِ زمین کو

پابہ زنجیر حاکم کے پاس بھیجا اُسے پھانسی دیدی گئی۔
اِس سے بڑھ کر ایک رانی کی حکایت اور اس کے ملک و مال کی تباہی عبرت انگیز ہی۔ یہ کلنگ کا ٹیکا اندلس والوں کے نامۂ اعمال سے کبھی نہ میٹیگا۔ یہ رانی ہمیشہ سے طاعت گذار و فرمانبردار اور وقت بد میں ان سب اندلس والوں کی معین و مددگار رہا کی ہی۔ حاکم کو جھوٹ موٹ یہ خبر دی گئی کہ وُہ بغاوت کیا چاہتی ہی۔ یہ ظالم چار سو مسلح سوار اور ستر زرہ پوش سوار ساتھ لیکر اس راجواڑہ کی طرف چلا اور کہلا بھیجا کہ دوستانہ ملاقات مقصود ہی۔ رانی اپنی بیٹی کو اور تمام اعیان و رؤسا و بلدہ کو ساتھ لیکر اپنے مہمانوں کے استقبال کو آئی۔ فوراً اشارہ کر دیا کہ ساری فوج نے دفعتہً تلواریں کھینچ لیں اور ان نہتوں کو بلا امتیاز زن و مرد کھیت کی طرح کاٹ کر رکھدیا۔ سواروں نے بسملوں کو ٹاپوں کے نیچے کچل ڈالا۔ اسّی نوّے شخص رؤسائے قوم میں سے ایک مکان میں استقبال و خیر مقدم کے لئے جمع تھے اُس مکان کا محاصرہ کر لیا اور ہر ایک شخص کو چوروں کی طرح ایک ایک ستون میں بندھوا دیا۔ اُن پر عذاب شدید کر کے یہ کہلوایا کہ تم لوگ بغاوت کیا چاہتے تھے اُس کے بعد اُس مکان میں آگ لگا دی کہ ہر ایک ستون اُن بے گناہوں کے خون سے سرو چراغاں بن گیا۔ رانی کو بھی یہ تماشا دکھانے کے بعد پھانسی دیدی گئی۔ بے رحموں نے اس پر اکتفا نہ کی۔ چھ مہینے تک اُس راجواڑہ کے لوگوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اور چُن چُن کر قتل کیا۔ یہ ایک شمہ ان مظالم کا ہی جو کلمبس کی غیبت میں اور انتظامِ جدید میں بندگانِ خدا پہ کیا گیا۔ کلمبس کی نیت یہ تھی کہ اُن لوگوں کو تعلیم و مذہب کی تلقین کرے۔ چند دن میں وفادار خراج گذار رعایا بنائے وُہ یہ نہ چاہتا تھا کہ سب نیست و نابود کر دیئے جائیں۔ اُس نے دربار اندلس میں سب اپنا دردِ دل لکھ کر بھیجدیا۔ اُس خط میں وہ لکھتا ہی کہ اس جزیرہ میں سات میں سے چھ حصہ لوگ فنا ہو گئے ایک حصہ فقط باقی ہی۔ حاکم سے اور کلمبس سے اکثر باتوں میں نا اتفاقی رہنے لگی۔ زیادہ

وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ یورپ میں چلا آیا۔ نومبر ۱۵۰۴ء کی سترھویں کو نئی دنیا سے پھر پرانی دنیا میں پہنچ گیا۔ اس کو وجع مفاصل کا دورہ پھر ہوا۔ صاحب فراش ہو گیا دارالامارۃ تک نہ پہنچ سکا۔ اپنی بیماری میں بہت سی عرضیاں بادشاہ کو لکھیں اور مرتے مرتے اُسے آرزو رہی کہ پھر ہسپانیولا کا حاکم مقتدر مقرر ہو کر جائے اور بادشاہ اپنے عہد کو پورا کرے مگر وہاں سے جواب تک نہ ملتا تھا۔ اچھے ہونے کے بعد یہ خود بھی دربار میں گیا مگر فرڈینڈ نے زبانی وعدہ وعید پر مہینوں ٹالا اُس کے حصّہ کی جو زمین ہسپانیولا میں تھی۔ وہاں سے اتنی بھی آمدنی نہ ہوئی کہ اندلس میں کوئی مکان تو اپنے رہنے کے لئے بنا سکتا۔ سراؤں میں رہا کرتا تھا اور قرضخواہوں میں گھرا رہتا تھا۔ بار بار مرض کا دورہ ہوا ضعف بڑھتا گیا۔ سمجھ گیا کہ نہ بادشاہ وعدہ کو وفا کریگا نہ اب عمر ہی وفا کریگی۔ دونوں طرف سے مایوسی ہو گئی۔ سفر آخرت پر آمادہ ہو گیا وصیت نامہ اپنی زمین و جائداد کے متعلق جو اُس نے لکھا ہی اُس میں یہ مضمون تھا کہ "حاصل زمین سے ایک مقدار ہمیشہ بنک میں جمع ہوا کرے۔ جب معتد بہ مقدار ہو جائے تو بیت المقدس پر حملہ کرنے میں اُس دولت کو صرف کیا جائے"

ستر برس کی عمر میں مئی ۱۵۰۶ء کی بیسویں تاریخ عالم آخرت کو راہی ہوا۔

سید علی حیدر نظم طباطبائی

کمال دہلی - منشی پیارے لال صاحب رونق اور منشی چندی پرشاد صاحب شید اکی اڈیٹری میں یہ سالہ جون ۱۹۰۹ء سے نکلنا شروع ہوا ہی۔ نومبر کا رسالہ ۴۶[1] صفحہ پر ختم ہوتا ہی۔ ابتدائی ۳۴ صفحوں میں سات مضمون نثر کے ہیں اور اسکے بعد ایک نظم اور غزلیں۔ گو ابھی منشی صاحبان کی کوشش کا آغاز ہی لیکن رسالے کی مجموعی حیثیت اتنا یقین دلاتی ہی کہ اگر ملک نے اس محنت کی داد دی تو حضرت رونق و شید اکمال کو معراج کمال پر پہنچانے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرینگے۔ **قیمت** سالانہ دو روپیہ (عہ) **نئی سڑک - دہلی**

[1] ناول کے دو ورق علیحدہ ہیں۔

شہر شنگھائی

واہ رے یورپین جہاں جائیگا جنگل کو منگل کر دیگا۔ ایشیا کا شاگرد اور اِس وقت اُس ہی کا مسلّم اُستاد بنا ہوا ہے۔ دشت و بیابان کو اس نے گلزار ارم بنا دیا ہے۔ خاک کو کیمیا کر دیا ہے۔ بالخصوص پہاڑوں اور سمندر کے ساحلوں کو تو دُنیا میں کہیں رنگی سے خالی نہیں رکھا۔ کہیں صحت افزائی کے لئے اور کہیں تجارت کی منفعت کے لئے۔ یُوں تو سب یورپین قوموں میں اولوالعزمی بڑھ چڑھ کے موجود ہے لیکن انگریز سب سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ جس شہر کا نام عنوان پر درج ہے اُس کی کیفیت خالی از دلچسپی نہیں۔

شہر شنگھائی جو اس وقت اس نام سے مشہور ہے۔ نوآباد شہر ہے۔ پُرانا شہر بھی اسی نام کا موجود ہے لیکن اس کی جانب اب کوئی رُخ بھی نہیں کرتا۔ یہ نیا شہر ساحل جنوبی چین پر بطریق بندر کے آباد ہے۔ اور مُلک چین کی تجارت اور ممالک غیر کی تجارت کا آج کل مرکز بنا ہوا ہے۔ دریائے وہنگ پو کے بالائی سمت پر واقعہ ہے جہاں ایک بند بنا ہوا ہے۔ اور وہاں تک جہاز پہنچتے ہیں۔ جون و جولائی چند روز سخت گرمی پڑتی ہے۔ باقی حصّہ سال میں سردی ہوتی ہے۔ سردی پنجاب سے زیادہ ہوتی ہے۔ لوگ پوستین پہنتے ہیں اور آگ جلا کر گذارہ کرتے ہیں۔ اسوقت دُنیا بھر کی سب قومیں اس میں آباد ہیں۔ اندازہ سے کہا جاتا ہے کہ بیس تیس قومیں یورپین امریکن جاپانی وغیرہ وغیرہ وہاں رہتی ہیں اور ہر قوم تجارت میں مصروف ہے۔ میوجات اعلیٰ قسم کے افراط سے اور ارزاں دستیاب ہوتی ہیں۔ یورپین آبادی قریب بارہ ہزار کے ہے اور کُل آبادی ڈھائی لاکھ ہے۔ یورپینوں میں سے سب سے زیادہ برٹش۔ پھر

اُن سے دُوسرے درجہ پر پرتگالی - اُن سے کم امریکن اور چوتھے درجہ پر جرمن اور بعدازاں دیگر اقوام ہیں - جب سے جاپان روس کی لڑائی ہُوئی ہے تب سے جاپانی بکثرت یہاں آگئے ہیں اور انہیں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور تجارت میں بھی وہ دست دراز ہیں -

عہدنامہ پیکین کے وقت یہ بندرگاہ تجارتِ ممالکِ غیر کے لئے کھولدیا گیا تھا - اور اُس کی حالت بجنسہ مطابق کلکتہ کے ہے - دریا کے ہر دو جانب شروع میں کاشت ہوتی ہے اور قدرے آگے جا کر کارخانجات و مکانات شروع ہوتے ہیں - انگریزی کانسل - جرمن کلب - بنک اور جاپانی کانسل کے مکانات اور اُن کے احاطے وسیع و عظیم الشان ہیں - سڑکیں نہایت عُمدہ اور صاف اور کھُلی ہیں - دیگر عمارات نہایت خوبصورت اور صنعدار پاکیزہ بنی ہوئی ہیں - بجلی کی ٹریم بازاروں میں چلتی ہے - سڑکوں پر گاڑیوں سے چھڑکاؤ ہوتا ہے اور ہندوستانی پولیس اُن بازاروں اور سڑکوں پر مامور ہے -

میونسپل کمیٹی کا اِنتظام اپنے آپ ہی نظیر ہے - اگر کہیں ایشیا میں میونسپل کمیٹی اپنے فرائض ادا کرتی ہے تو شنگہائی کی - اُس نے ایک باغ فرحتِ خلائق کے لئے بنایا ہے - جس میں ہر روز انگریزی باجہ بجتا ہے اور کھانے کے وقت کے بعد بھی وہاں گانا بجانا ہوتا رہتا ہے - علاوہ دیسی ممبروں کے یورپین آبادی کے حال سے نو ممبر ہیں - جنمیں سات انگریز ہیں - کمیٹی میں طول طویل بحث نہیں ہوتی - یہ ممبر محض کام کرنے کے لئے آتے ہیں اور جملہ کاروبار خوش اسلوبی سے چلتا ہے - پسندترین طریق ٹیکس تجویز ہوتے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ عوام الناس کو ٹیکس کا پُورا پُورا مفاد حاصل ہوتا ہے - ہندوستان کی میونسپل کمیٹیوں کو اس کمیٹی سے سبق لینا چاہئیے - شہنشاہ چین کی طرف سے جسے ایشیائی محاورہ میں فغفورِ چین بولتے

ہیں۔ ڈاکخانہ شاہی جاری ہیں لیکن یورپین آبادی اپنے ہی ٹکٹ اور اپنے اپنے مختصر ڈاکخانوں سے کام لیتی ہے۔

اس آبادی مرکب میں جہاں مختلف اقوام آباد ہوئی ہیں۔ عدالتوں کا طریقہ بھی نرالا ہے۔ ہر ایک قوم کا کانسل ہے اور اُسی قوم کے جج ہیں۔ چینی عدالت میں چینی جج جلیس ہوتا ہے۔ اگر کوئی برٹش قوم کا مدعی ہوتا ہے تو ایک برٹش اسیسر عدالت میں بیٹھتا ہے اور اس طرح سے انصاف کے پلڑے درست رکھے جاتے ہیں۔

شہر شنگھائی کے قریب سے سائبیریا ریلوے ملجاتی ہے جو مسافر کو یورپ میں ۱۲ روز میں پہنچا دیتی ہے کرایہ تقریباً اسی قدر ہے جو ہندوستان سے یورپ تک جہازی سفر کا کرایہ ہے۔ اور اکثر لوگ دنیا کی سیر اسی طرح سے کرتے ہیں کہ اول ہانگ کانگ آجاتے ہیں۔ وہاں سے جاپان اور چین کی سیر کرتے ہوئے سائبیریا کی ریلوے سے یورپ پہنچ جاتے ہیں اور واپس آتے ہوئے دوسرے راستہ سے آجاتے ہیں۔

سیاح لکھتے ہیں کہ شنگھائی تجارت کا مرکز بنگیا ہے اور وہاں اس قدر رونق بڑھتی جاتی ہے کہ شاید کسی دن کو یہ شہر ایشیا کا ایک سب سے بڑا نامی بندرگاہ بنجاوے روز بروز تجارتی ضرورتیں اُس کی رونق بڑھا رہی ہیں اور جیسے پرانے زمانہ میں اسکندریہ تجارت کا مرکز تھا اسی طرح۔ شنگھائی بنجاویگا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ جہاں یورپین کا قدم پہنچا وہاں ہر قسم کی تراش خراش ہو کر گل دستہ بننا شروع ہو گیا۔ نہ صرف عمارات تجارتی اس شہر میں اعلیٰ درجہ کی بن گئی ہیں۔ بلکہ رومن کیتھلک گرجا نہایت خوشنما اور خوبصورت تعمیر ہو گئے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم کے جہاز مال اسباب سے لدے ہوئے یہاں آتے اور جاتے ہیں۔ اور ایسی گرمی بازار ہے کہ ہندوستان کے شہروں میں سے صرف کلکتہ اور بمبئی اسکے مقابلہ میں ٹھہرتے ہیں۔ طرفہ یہ ہے کہ عہد و پیمان کی کیسی پابندی ہے کہ ہر قوم تجارت میں مصروف ہے اور آپس میں شاذ و نادر تنازع ہوتا ہے۔ کاش کہ ہمارے ہندوستان کے باشندے اس مسئلہ کو سمجھتے کہ خود بھی رہو اور اوروں کو بھی رہنے دو۔

(تسنیم)

تیتری

تمام کائنات کی آنکھوں میں، ایسے جیسے وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو، سکون مطلق میں کچھ جنبش پیدا ہوتی ہی. آفتاب، پری سحر کے رخساروں کو ایک محبت بھرا بوسہ لیکر دمکا دیتا ہی.

وہ پُر آب نگاہ اشتیاق یعنی زہرہ، آسمان کے گلرنگ چہرے میں سے پہاڑ کی چوٹی کے پیچھے سے، مخمور و سرمست پری ناچتی ہی، جھلکتی دمکتی ہی. ساحل میں ایک گہری اور لبھانیوالی خوشبو پھیلی ہوئی ہوتی ہی. درختوں کی جھاڑوں میں سے، مسکراتی ہوئی روشنیاں کھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں، دلربا آوازیں سُنائی دیتی ہیں.

تمام نیچر پر پڑی ہوئی وہ رات کی رقیق، گیلی چادر رنگین ہوجاتی ہی: شبنم چمک اٹھتی ہی. ہوا کے سست سست جھونکے ادھر سے اُدھر اس طرح چلتے ہیں گویا دن جاگ کر جمائیاں لے رہا ہی. اُس منتشر خوشی میں کبھی کبھی مرغ کی بانگیں کچھ غلغلہ ڈالدیتی ہیں، ہر چیز میں ایک لرزش حیات پیدا ہوتی ہی، کائنات خوشی کے آہنگ کے اوپر محظوظانہ رقص کرتی ہی کہ اتنے میں کرہ آفتاب، آنکھوں کو خیرہ کرنے والی چمک دار ہیبت کے ساتھ اُفق میں پہاڑ کی چوٹی پر سے نمودار ہوتا ہی.

ایسے وقت میں، اس طرح جیسے نسیم نے ہلکا سا جھونکا لیا، نمعلوم کہاں سے تیتری پیدا ہوتی ہی. آفتاب اپنے زریں تلاطم سے ہر چیز کو غرق کر رہا ہوتا ہی، یہ تیتری اُس نور کے دریا میں اپنے آب گوں بازوؤں کے ساتھ پُر ذوق او[illegible]

حریر کی پشواز پہنے ناچنا شروع کرتی ہی۔

اب، اُس نازک غنچے کو جو چھپ چھپ کے ہنس رہا ہی، لرزتی ہوئی جاتی ہی اور چھونا چاہتی ہی۔ اس کی چاروں طرف جو نور کی بارش ہو رہی ہی، اس میں خوش اور مستانہ وار جھوم جھوم کے پیراکی کرتی ہی؛ اور وہ نور بھی اُسے اپنے آغوشِ پرستش میں لیتا ہی۔

اب شاید آفتاب کی حدت سے کچھ تھک جاتی ہی یا کیا، کہ اُس کے زرّین پروں کی حرکتوں میں کچھ سستی آتی ہی؛ اور وہ پروں کو سمیٹ کے جھجھکتی ہوئی کانپتی ہوئی، اُس پر نور کف کی طرح، جو موج سے علیحدہ ہو گیا ہو، ہوا میں معلق لرزتی ہی۔ لیکن پھر تھوڑی دیر میں اُڑنا شروع کر دیتی ہی، اور اُس غنچے کے پاس ہو جاتی ہی جو اپنے تنگ قبا میں سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہی؛ اور قبا کی تنگی کی وجہ سے ہوا میں فریاد کر رہا ہی اور بیہوش ہوا جاتا ہی۔ مزے لے لے کر وہ اُن اوراقِ گل کے گرد چکّر لگاتی ہی جن پر قطرۂ شبنم پڑے ہیں جو نیچر کے گویا اشکِ پرستش ہیں؛ وہ چکّر لگاتی ہی اور بیٹھ جاتی ہی، مزے لے لے کے چکّر لگاتی ہی اور پھر بیٹھ جاتی ہی۔ اُف! وہ بہت بدمعاش ہی۔ اُس کی محبت ایک بوسے ہی پر ختم ہو جاتی ہی۔ بوسہ لیتی ہی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہی۔ وہ بہت ہرجائی ہی وہ بہت سیلانی ہی، وہ کسی کی ہو کے نہ رہیگی۔

اُس وقت غنچہ ایک آہ حرماں کے ساتھ اپنا سینہ اُبھارتا ہی، اور شاخ پر ہل ہل کر، گویا لمبی، حزین اور عاشقانہ، نمناک نگاہِ ابتلا سے اُسے دیکھتا ہی۔



یوں کہئے کہ تیتری محویتِ عاشقانہ کی حالت میں پری بہار کے جسم سے نکلی ہوئی اک خوشبو ہی جس نے شکل اختیار کر لی ہی؛ یا وہ نیچر کے سب سے زیادہ موسیقی

رنگوں سے مرکب اک شہپر ہی جس میں لرزشِ حیات پیدا ہوگئی ہی، یا اک نورِ سیال ہی جسے پریوں نے چھو کر خطرے میں تبدیل کر دیا ہی۔ یا یوں کہئے کہ تیتری، کہ اک نسیم ہی کہ چلتی ہی، اک نفس ہی کہ آہ کر رہا ہی۔ اک قطرہ ہی جس میں تلاطم پیدا ہو گیا ہی؛ اک خندہ ہی کہ ہونٹ پر جم گیا ہی؛ اک تبسم ہی کہ ریزاں ہی، اور سب سے بہتر یوں کہئے کہ تیتری اک سودا ہی بے قرار، اک نسیم ہی معنبر، اک بوسہ ہی ذی روح اک شعر ہی، رقصاں۔

گھنگریالے بالوں والا، گلابی گالوں والا، شوخ چمکیلی آنکھوں والا اک پیارا پیارا بچہ، اک طرف کو نظر گاڑے دیکھ رہا تھا کہ ہماری تیتری اُسے نظر پڑی۔ اک دم اُس کی نظروں میں اک شعلہ حرص بھڑک اُٹھا، مُنہ کُھل گیا، آنکھ اس پر جم گئی، چہرہ شوق سے سُرخ ہو گیا! اُس نے اپنے بازو اس اُڑتی تیتری کو پکڑنے کے لئے بڑھائے، اور چلا کے کہنے لگا: "آآں، آآں ہ تیتری" وُہ شوق کی ہنسی سے ہنستا ہی، اچھلتا ہی، اُس کے ہونٹ شدتِ اشتیاق سے کانپ رہے ہیں، اور وہ تیتری کے پیچھے دوڑ رہا ہی۔ اُف کیا ہی حسین منظر ہی۔ حُسن، حُسن کا تعاقب کر رہا ہی۔ اُس کے سُنبل کے سے بال جو ہوا میں لہرا رہے ہیں، پسینے میں تر ہو جاتے ہیں۔ گال گرم ہو جاتے ہیں، سُرخ ہو جاتے ہیں؛ سانس اکھڑ جاتا ہے، اب وُہ تھک گیا ہے، گرتا پڑتا بھاگتا ہی۔ اُف! تیتری اُس کے ہاتھ نہیں آتی۔ ماں چلا چلا کے کہہ رہی ہے: "بیٹے، دوڑ مت گر پڑے گا" تیتری، یا دُوسرے الفاظ میں وُہ پریشاں، بے تواں، لرزاں پر، اِدھر سے اُدھر بے محابا اُڑ رہی ہے۔ اب پھر کوئی مثال دیجئے اور کہئے کہ تیتری اک نور ہی،

پاشیدہ ، آخر کار بے طاقت ہوکر، وہ اک پھول پر گر پڑتی ہے ۔
اور اُسے اک مدہوشانہ غیرت اور شدت سے لپٹ کے چوسنے
لگتی ہے ۔ اب یوں کہئے کہ تیتری اک ہونٹ ہے کہ بوسہ لینے
کے لئے پیدا ہوا ہے ، اک نفس ہے کہ سونگھنے کے لئے پیدا
ہوا ہے ۔ عشق ہے کہ لپٹنے کے لئے پیدا ہوا ہے ، اِس قدر
حریص ہے ۔

بچہ ، خوشی کی آواز سے چلاتا ہے : "آہاں ، پکڑ لی"۔ اور خوشی کے
مارے اپنے لرزتے ہوئے ، ہاتھ بڑھا کے دکھاتا ہے ۔ لیکن ۔ الٰہی پناہ!
اُس رعشہ ناک ، ننھی سی جان کے لئے جو بچے کو نومیدانہ نگاہ سے دیکھ
رہی ہے ، اس کی شوخ چمکدار آنکھوں میں کچھ رحم ، ذرا اماں نہیں ۔

اُف ! چھوڑ دے ، اے بچے چھوڑ دے ، میں تجھ سے کہتا ہوں ۔
وہ آج ہی کی صبح ، آج ہی صبح ، پوشش سحر ، اور لرزش حریر سے پیدا ہوئی
تھی ۔ اس نے آج صبح ہی سے زندگی شروع کی ہے ۔ اس نے ابھی ہی تو
اُڑنا شروع کیا تھا ۔

چھوڑ دے ، ارے چھوڑ دے ، میں تجھ سے کہتا ہوں ۔ وہ بھی بالکل تیری
ہی طرح ہے ۔ وہ بھی تیری ہی طرح کھلنڈری ہوکر جینا چاہتی ہے ۔ دیکھ ابھی اس پھول تک
تو وہ پہنچی ہی نہیں ۔ چھوڑ دے ، چھوڑ دے ، اُف چھوڑ دے ۔

بچہ ، فاتحانہ اور مظفرانہ طریقہ سے دوڑ کے آتا ہے ، اور ہنستا اور اچھلتا اور
کودتا ہوا ، اپنا ہاتھ بڑھا کے ہتھیلی کھول دیتا ہے ۔ اُسکی گلرنگ ہتھیلی میں سوا اک
خاک گرفتہ ہے [illegible] اک باریک ، زرین اور خوشبودار خاک ۔

اب کہئے کہ
تیتری اک غبار رنگین ہے ۔

(ملخوذ) سجاد حیدر

ادھم پاشا

آج مخزن کو اس شجاع و جری فیلڈ مارشل کی تصویر شائع کرنے کا فخر ہے جسکی ہمت و مردانگی نے نہ صرف فریقِ مخالف ہی کے چھکے چھڑا دیے بلکہ ایک عالم سے اپنی تدبیر و بہادری کی داد لے لی۔ غازی ادھم پاشا مرحوم کی تصویر دیکھیے صورت سے استقلال ٹپک رہا ہے اور خد و خال اس جوش و دلاوری کا پتہ دے رہے ہیں جس نے یونان کی زبردست لڑائی میں فتح کا سہرا اس بہادر کے سر پر باندھا۔

[illegible] کی مشہور لڑائی کے وقت جو روس و روم میں ہوئی اور جس میں ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا اپنے ملک و قوم پر قربان ہو گئے۔ پاشائے مرحوم ایک بریگیڈ کے جنرل تھے۔ ۱۸ ستمبر کو فوج کا ایک دستہ لیکر اکیتی سے پلونا روانہ ہوئے ۲۱ - ۲۲ ستمبر وہ دن تھے جب اس بہادر ترک کو روسیوں کے مقابلہ میں اپنی ہمت دکھانے کا موقع ملا۔ ابھی منزلِ مقصود دور تھی۔ غنیم نے یہ موقعہ غنیمت جانا اور کئی ہزار فوج ادھم کے چھوٹے سے دستے پر ٹوٹ پڑی۔ دو روز کی متواتر خونریز لڑائی کا نتیجہ ادھم کی فتح تھی۔ جس نے بہادر ترک کو ایک حصہ فوج کی کمان سپرد کی اور غازی ادھم پاشا بحیثیت کمانڈر جنرل کریلو کے مقابلہ میں آیا۔ ترکی خون رگ رگ میں دوڑ رہا تھا اور عثمانی تلوار اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ گو اس معرکے میں ادھم سخت زخمی ہوا مگر اس کی شجاعت کا سکہ روسیوں کے دل پر بیٹھ گیا۔ جس کے بعد یہ فخرِ ملک و قوم قسطنطنیہ کا دلیر ترک پلونا پہنچا ہر ۲۴ ستمبر تھی مقابلہ شروع ہوا۔ بازارِ موت گرم تھا اور یہ شیرِ میدان جان پر کھیل رہا تھا۔ روسی فوج ادھر ادھم کی دلیری اور اس کا استقلال ادھر اپنے عزیز رفقا کی لاشیں خون میں ڈوبی دیکھ کر

کامیابی سے نااُمید ہوئی اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ دامِ مکر پھیلا کر اس شیر کی طاقت کمزور کردیں۔ ادھم کا جوش لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہا تھا۔ دفعتہً رُوسی فوج نے کہا لڑائی بند کیجئے۔ "عثمان پاشا نے علمِ صلح بلند کر دیا"۔

ناممکن تھا کہ ادھم اپنے کمانڈنگ آفیسر کے متعلق یہ اطلاع پا کر لڑائی ختم نہ کر دیتا اب یہ فیصلہ مہذب دنیا کے انصاف پر ہے کہ وُہ اسکو ادھم کی غلطی پر محمول کرتے ہیں یا اسلام کی اس سچی تلقین پر جو اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہُوئے تھی اور جس نے مکر دریا سے ایسے نیک نفس بندوں کو ہزاروں کوس دُور کر دیا تھا۔

لڑائی ختم ہوگئی مگر معزول عبدالحمید کی نگاہ نے اپنے جواہرات پرکھ لئے۔ اور ایک روز ایسا آیا کہ یونان کے مقابلہ میں ادھم پاشا مرحوم فیلڈ مارشل تھا۔

گو روسیوں کے دھوکے میں آکر ادھم پاشا نے میدانِ جنگ میں ہاتھ روک لیا۔ لیکن جس وقت یہ راز افشا ہوا تو ادھم کے غیض و غضب کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ تیغِ عثمانی اُسی روز سے منتظر تھی کہ کب نیام سے باہر نکلے۔ یونانیوں سے جنگ کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوتی تھی کہ برسوں کے حوصلے اور مدتوں کی خواہش پُوری ہونے کا وقت آگیا۔ جوں جوں لڑائی کی خبر گرم ہوتی جاتی تھی غازی کا خون چلوؤں بڑھتا جاتا تھا۔ یہانتک کہ یکم مارچ ۱۸۹۷ء کو ۲۰ سال کی دبی ہُوئی آگ میں شعلے بھڑک اُٹھے اور اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی ادھم پاشا قسطنطنیہ سے روانہ ہُوا۔ گو اسوقت تمام یورپ ٹرکی کا مضحکہ اُڑا رہا تھا اور سچ یہ ہے کہ مضحکہ کچھ بیجا بھی نہ تھا ۲۰ ہزار فوج یونانی جمِ غفیر کے مقابل کیا کر سکتی تھی مگر بڈھا مریض تجربہ کار عبدالحمید اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہی نقیر جنپر آج دنیا ہنس رہی ہے بڑے بڑے امیروں اور اچھے اچھے شہزدوں کو خون کے آنسو رلوا دینگے۔

ابھی سیلانیوں کے ٹھٹھے ختم بھی نہ ہُوئے تھے کہ تُرکی شیر میدانِ جنگ

میں پہنچا یونانیوں نے بھی اس موقع پر جانیں لڑا دیں۔ دل کے دل گرد و نواح سے اُمنڈ آئے مگر بیس برس کی میان کی ہوئی تلوار ایک آفتِ ناگہانی تھی جس نے خون کے دریا بہا دئیے اور دفعتہً کانوں میں یہ صدا پہنچی کہ ادھم پاشا نے ۲۴ اپریل کو ٹرناوس اور ۲۵ کو اوریا پر قبضہ کر لیا اور وُہ یونانی جو نشۂ غفلت میں چُور اس اُمید پر نکلے تھے کہ قسطنطنیہ میں بہار اپھر یا اُڑیگا تھسلی کو بھی ادھم کی نظر کر گئے۔

ابھی تو ان واقعات کو تیرہ چودہ ہی برس گذرے ہیں۔ مگر نہیں جب تک تھسلی روئے زمین پر موجود ہے اسکا چپہ چپہ ترکی سپہ سالار غازی ادھم پاشا کی شجاعت کا گیت گائیگا۔

پاشا ۱ے مرحوم فرہاد آفندی کے ہاں جو دربار سُلطانی میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوا۔ قسطنطنیہ کے جنگی مدرسہ میں تحصیل علم کی اور فارغ التحصیل ہو کر پریسیڈنٹ کونسل حربیہ کا ریڈیکانگ مقرر ہوا اور یہاں سے ترقی کرتا ہوا گاردِ سلطانی میں پہنچا۔ روس کے برخلاف جو شجاعت ظاہر کی تھی وُہ بیکار نہ گئی اور قدردان سُلطان نے محکمۂ عسکریت میں استانہ کی کمان عطا فرمائی۔ ان تمام فرائض کو کچھ ایسی اچھی طرح انجام دیا کہ چند ہی روز بعد کریٹ کا گورنر یہی بہادر ترک تھا اور بالآخر یونان کے مقابلہ میں تمام سُلطانی فوج کا سپہ سالار۔

باوجود اس دلیری اور ہمت کے مزاج میں حد سے زیادہ رحم تھا۔ مظلوموں کی مدد بےبسوں اور بیکسوں کی اعانت اور پھر یہی نہیں کہ اپنے ہوں نہیں دوست ہوں یا دشمن ادھم پاشا کا خاص شیوہ تھی۔ یہانتک کہ جانی دشمن اور خون کے پیاسے بھی اگر وقت پڑے پر عفو ادھمی کے طلبگار ہوتے تو ادھم کا دل اُنکی تکلیف گوارا نہ کرسکتا۔ زیتیوں میں جب وقت وہ سنگدل ارمنی جنھوں نے تقریباً پانچ سو

بزرگوں کو قتل کر دیا تھا اسیر ہو کر سامنے آئے اور باوجود اس عداوت قلبی کے انہوں نے عفو کی درخواست کی تو پاشائے موصوف سے انکی تکلیف و مصیبت نہ دیکھی گئی اور اُن کے قصور سے درگذر کی۔

اس اعزاز پر بھی جو قسطنطنیہ نے اُسے بخشا۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ ادھم پاشا سے زیادہ محنتی جفاکش آدمی مشکل سے ہوگا۔ ایک عیسائی تجربہ کار شخص کا بیان ہے۔ میں نے اُسے رات کے دو دو تین تین بجے اور صبح کے پانچ پانچ بجے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف پایا ہے۔ مسٹر مانٹگمری فرماتے ہیں جب نعیم پاشا ویسٹنو کے فتح کرنے میں ناکام رہا تو میں غازی ادھم پاشا کی خدمت میں اطلاع دینے کے واسطے روانہ ہوا۔ اس وقت آدھی رات گذر چکی تھی۔ میں ٹھیک ایک بجے خدمت اقدس میں پہنچا اور مفصل کیفیت بیان کی۔ پاشائے موصوف نہایت اطمینان سے میری گفتگو سنتا رہا۔ چہرہ پر کسی قسم کی گھبراہٹ کے آثار یا پریشانی نہ تھی نقشہ ہاتھ میں تھا۔ مجھ سے سوال کرتا جاتا تھا اور نقشہ کو بغور ملاحظہ۔ جب گفتگو ختم ہو چکی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسوقت تقریباً دو بجے ہونگے۔ صبح کے وقت اُٹھا تو آفتاب نہ نکلا تھا۔ دیکھتا کیا ہوں۔ بارہ ہزار فوج کا پورا دستہ نعیم کی مدد کو چلا جا رہا ہے۔

پاشائے مرحوم میں بڑی تعریف کی بات یہ تھی کہ کبھی اپنی فتوحات یا شجاعت پر گھمنڈ نہ کیا۔ نہایت منکسر المزاج اور حد درجے کا عبادت گذار۔

الحق کہ وُہ عثمانی شرفا کا بہترین نمونہ تھا اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک نامہ نگار کے ان الفاظ کا یقین نہ کریں۔ "ادھم رحیم۔ کم سخن۔ صادق الاقرار غرض وُہ تھا جس کا ہر شخص شیدا اور ثنا خواں رہا"۔

حیات مستعار کا لازمی نتیجہ موت جس نے ادھم جیسے لاکھوں اور کروڑوں

کو ہمیشہ کے واسطے سُلا دیا آخر اس جری تُرک کو بھی آبادی سے جنگل میں لیگئی اور وہ شخص جو رات کو بھی بہ مُشکل سوتا تھا۔ اب ہمیشہ کے واسطے آرام کر رہا ہے۔ اور جس شخص کو دم بھر لیٹنے کی بھی فرصت نہ تھی آج مٹی اس کو تھپک تھپک کر سُلا رہی ہے۔

وہ دماغ جو پیچیدہ سے پیچیدہ گُتھیاں آناً فاناً سُلجھا لیتا تھا آج معطل۔ وہ ہاتھ جو میدانِ کارزار میں اپنی بہادری دکھاتے تھے۔ آج بیکار۔ وہ آنکھیں جو موقعہ جنگ پر چاروں طرف دیکھ بھال رکھتی تھیں آج بے نُور۔ المختصر وہ ادھم پاشا جس کی جرأت و ہمت کا لوہا ایک دُنیا مانے ہوئے تھی آج مُردہ پڑا ہے۔

یُوں تو ہر صاحب انصاف پاشائے مرحوم کی مَوت پر افسوس کریگا مگر اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ادھم کی مَوت ٹرکی کو ایسا نقصان پہنچا گئی جسکی تلافی آسان نہیں۔

مخزن ادھم پاشا کی تصویر پیش کرتے ہوئے اس فخر پر نازاں ہے کہ یہ وہ تصویر ہے جو پاشائے مرحوم نے اپنے ہاتھ سے شیخ عبدالقادر صاحب کو عطا فرمائی +

راشد الخیری

رباعی

دعوٰی باطل کہ مُدّعی نے مارا ۔ تہمت جھوٹی کہ خودکشی نے مارا
الزام فرشتوں پہ الٰہی توبہ ۔ جس نے پیدا کیا اُسی نے مارا

ثاقب بدایونی

خیر مقدم گرامی

شیخ غلام قادر صاحب گرامی شاعر خاص حضور نظام دکن کے نام سے کون واقف نہیں۔ فارسی شاعری کا نام اُنکی بدولت اس مُلک میں زندہ ہے۔ اُن کا مولد و منشا پنجاب ہے۔ اور وہ اِن دنوں دکن سے رخصت لیکر وطن میں تشریف لائے ہوئے ہیں ۳۱۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء کو جالندھر کے علم دوست ہندو مسلمان معززین کا ایک جلسہ ہوا جس میں اہلِ شہر کی طرف سے ایک منظوم ایڈریس پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی نے پڑھا اور اس کی ایک مطلا نقل صاحب میر مجلس نے کمخواب کے مقوے میں رکھکر حضرتِ گرامی کی نذر کی۔ جس کا شکریہ نظم میں صاحب ممدوح نے ادا کیا۔ اہلِ کمال کی اس طرح کی قدردانی کی یہ پہلی مثال ہے۔ اور ہمارے خیال میں قابلِ تقلید ہے۔ ادیب مُلک کے قالب میں رُوح کا حکم رکھتے ہیں اور اُنکی جانکاہی کے مقابلہ میں بہت سے مشاہیر کی محنتیں کم ہوتی ہیں۔ مگر عام میلان یہ ہے کہ سیاسیات کے میدان میں شہرت اور قدردانی مُلک بہت جلد نصیب ہوتی ہے اور ادیب عموماً کس مپرسی میں رہتے ہیں۔ جناب کیفی صاحب کی خوش خیالی اور محنت قابلِ داد ہے جس کی بدولت یہ جلسہ ہوا۔ ایڈریس نہایت پُرلطف اور مفید مضامین سے مملو تھا اس کے نو بند تھے۔ اس میں سے چند بند ہدیۂ ناظرین ہیں:۔

خیر مقدم پھر وطن میں اَے عزیزِ دوستاں ذات پر تیری ہے نازاں آج کُل ہندوستاں
اَے گرامی گھر میں پھر آنا مُبارک آپ کو یہ وطن سے آپ کی اُلفت ہے عظمت کا نشاں
قصبۂ گنجاہ کو بخشا غنیمت نے جو فخر اُس سے اونچا آج جالندھر کا ہے نام و نشاں

تخت پر تھا مصر کے پہلو میں تھا کنعاں کا عشق ہو یونہی یوسف ہمارے تم کو حبِ ہندوستاں
کب بدخشاں سے نکل کر لعل نے کی بازگشت بوئے گل کا باغ سے جا کر نہ لوٹا کارواں
کب لبِ ساحل کئے تہ گوہر خوش آب نے مادرِ موتی کی بھری ہیں پیار سے کب گودیاں
مشک یوں تاتار سے نکلا کہ قیدی قید سے بزم سے جا کر نہ آیا عود کا واپس دھواں
لیکن اپنے مولد و منشا سے تم کو ہے جو عشق قالبِ حبِ وطن کی ہے وہی روحِ رواں

انتخابِ ہفت کشور گرچہ یہ پنجاب ہے
چار چاند اسکو لگے ہیں تم سے اسکی آب ہے

اے دیارِ ہند اے شعر و حکمت کی زمیں اے مرے پیارے وطن اے رشکِ خلدِ بریں
تیرے اوصاف ایسے اعلیٰ اور ہیں نادر مثال بھولنا چاہیں بھی ہم تو بھول انہیں سکتے نہیں
کیسے تلسی، سور اور کالی کو ہندو دیکھئے جنکو آنکھوں پر بٹھاتی ہے صدی بیسویں
وہ زباں اپنی تھی ان میں شاعری کی دی جو داد مستحق وہ اس قدر توصیف کی شاید نہیں
فارسی میں ہو گئے لیکن یہاں جو باکمال نغمہ سنج انکی ثنا میں بلبلان ہیں ہمقیں
خسرو، فیضی اور غنی۔ بیدل، غنیمت اور ضمیر انکی سحر آہنگیاں ایراں کو مفتوں کر گئیں
اور وہ شیرِ بیشۂ نازک خیالی و کمال میرزا غالب۔ زباں میں سب کی جس نے بند کیں

اہل ایراں نے اگر انکی آگے مارا دم نہیں
تو کسی سے آج یہ اپنا گرامی کم نہیں

آجکل بدلا ہوا ہے طرح رنگِ زمن اختراع و نسخ کا شیدا ہوا ہے چرخ کہن
خیرہ ہیں آنکھیں تو چھائی سر میں بھی ہے خیرگی لیمپ نے بجلی کے ٹھنڈی کردی شمعِ انجمن
دھن نہ بدلے کیوں نوا سنجوں کی اب بزم میں چنگ و بربط بین کی جا ہیں پیانو آرگن
آنکھ ہے بدلی ہوئی نرگس کی سوسن کی زباں بولتے ہیں بولی ٹھولی اور ہی مرغِ چمن
دخترِ مشرق کا اب تقویم پارینہ ہے خطاب معرضِ تغییر میں ہے اس قدر اپنا وطن

چاہیے تھا ہم کو کر کے گرم و سرد شرق و غرب اعتدالِ طبع کی ترتیب کا کرتے جتن

کیا عجب ہو جائے گر نیچر کا جادو کارگر

ایلپس کی اب برف برسے قطب کے مینار پر

کیا سلف میں خوبیاں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں صفحۂ تاریخ پر ہاں کچھ نمایاں ہوگئیں

بھول کر بھی اب نہیں آتی کسی کو انکی یاد سب وہ اگلی صحبتیں خوابِ پریشاں ہوگئیں

وہ فضائل اب کہاں ہیں ہند کی تہذیب میں جن پہ شرق و غرب کی اقوام قرباں ہوگئیں

اب رہے باقی ادیب اگلے نہ وہ علم و ادب سب پرانی شکلیں زیبِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

چرخِ کجرفتار کیا سے کیا دیا تو نے الٹ تیری چالیں گردشِ چشمِ حسیناں ہوگئیں

دین جن کا شعر تھا اور جنکا مذہب تھا ادب نیتیں انکی بھی اب رندوں کا ایماں ہوگئیں

سوز ہو دل میں تو ہو آہ و فغاں میں بھی اثر آہیں دل کی اب چراغِ زیرِ داماں ہوگئیں

روشنی نے غرب کی سر اور خیرہ کر دیا برکتیں ہم تک جو پہنچیں فتنہ ساماں ہوگئیں

جو پڑا عقدہ گرہ بندِ قبا کی بن گیا گتھیاں جو کھل گئیں زلفِ پریشاں ہوگئیں

اب تری ہر زندگی کی شق میں ہے پھیلی ہوئی

شاعری بھی ہائے اسکی صید اب ہونے لگی

گر یونہی تغیر کا شیدا جہاں ہو جائے گا اب سے دور اک دن قیامت کا سماں ہو جائیگا

گر یہی چولا بدلتے کا اسے لپکا رہا تو برہنہ ایک دن ہندوستاں ہو جائیگا

یہ ہوا ہے باغ کی تو شاہدِ گل ایک دن سبزے کی مانند بیگانہ یہاں ہو جائیگا

نرگس و سنبل صنوبر ہونگے سب نقشِ خزاں لانِ ٹینس کی جگہ یہ گلستاں ہو جائیگا

اب گراموفون میں غنچوں کی گونجیگی چٹک باغ پر احساں صبا کا رائیگاں ہو جائیگا

چار آنکھیں کسکی اب نرگس سے ہونگی باغ میں کون سوسن سے چمن میں ہمزباں ہو جائیگا

خندۂ گل کی ادا پہ لوٹ ہوگا کس کا جی بلبلوں سے کون اب ہمداستاں ہو جائیگا

ہم نوا اسکے آجکل سُن لو گرامی کو کہ پھر — نغمۂ بلبل سے خالی بوستاں ہو جائیگا

کہتے ہیں اک تازہ لٹریچر بنا ہونیکو ہے
دیکھتے ہیں ہم کہ یہ فن ہی فنا ہونیکو ہے

زمینِ گور

کیا جذبۂ محبت ہو او زمین! تجھ میں — لیٹے ہیں مُنہ چھپائے لاکھوں حسین تجھ میں
وارفتہ کس قدر ہو رنگِ بہار تجھ پر — لوگ آتے ہیں چڑھانے پھولوں کے ہار تجھ پر
شاخیں شجر کی تجھ پر مستانہ جھومتی ہیں — ہردم تجھے ہوائیں آ آ کے چومتی ہیں
سُورج سے روز لیکر سونے کے تار کرنیں — تیرے لئے زمیں پر لاتی ہیں بار کرنیں
کرتی ہو دُھوپ دِن کی پیدا جو تجھ میں تڑپ — پانی چھڑک کے شبنم کرتی ہو سردشب کو
بے دم ہوا ہو پڑکر جو پنجۂ اجل میں — کس پیار سے لیا ہو تونے اُسے بغل میں
تو جسم کو جگہ دے جب رُوح چھوڑ بھاگے — جو تیرے پاس سوئے وُہ پھر کبھی نہ جاگے
لڑکا۔ جوان۔ بوڑھا جو چلتے چلتے ہارا — لوگوں نے اسکو تیری منزل میں لا اُتارا
تیرا گھر او زمیں ہو اِک بزمِ جاں فروشاں — لیکن سکوت سر ہے وُہ مجمعِ خموشاں
جاتی ہو خلق تجھ میں حسرت کا داغ لیکر — ظلمت میں جائے کوئی جیسے چراغ لیکر
بھُوکی مگر بدن کی پیاسی مگر لہُو کی — جو چیز ہاتھ آئی کھانے سے تو نہ چُوکی
اِک جُزو اپنا دیکر ہستی میں لاتی ہو تو — پھر سانپ بنکے اپنے بچوں کو کھاتی ہو تُو
پروا نہیں تجھے کچھ ہو پاک یا نجس ہو — جو تیرے ہاتھ آئے وُہ لقمۂ ہوس ہو
اجسام کو دبایا گو پنجۂ ہوس میں — لیکن نہ لاسکی تو رُوحوں کو اپنے بس میں
کھُلتا نہیں یہ پردا تو کہدے او زمیں کچھ — رُوحوں کو کچھ تعلق ہو تجھ سے یا نہیں کچھ

برزخ کہاں ہو آخر تجھ میں کہ دُور تجھ سے — رکھتے ہیں کیا علاقہ اہلِ قبور تجھ سے
منکر نکیر تجھ میں آتے ہیں کس طرف سے — کُوچہ نہ در ہے ذرہ رستا پاتے ہیں کس طرف سے
ہی میل جول تجھ میں اور آسماں میں کیونکر — جاتی ہو خلق تجھ سے باغ جناں میں کیونکر
کس جا چھپے ہیں شعلے کس جا دھواں نہاں ہو — دوزخ کی آگ آخر تجھ میں کہاں نہاں ہو
فانی ہی جسم لیکن رہتی ہی روح باقی — ساکن ہو یا لحد میں آتا ہو اتفاقی
ہی خارجی وجودِ خلد و جحیم کیونکر — ہوتی ہیں جا کے رُوحیں اُنمیں مقیم کیونکر
ہوتی ہو رُوح خود ہی آئینہ دار شاید — اعمال کا نظارہ ہو خلد و نار شاید
قُدرت کا راز ہی یہ ممکن ہو تو نہ کھولے — ہاں ۔ تو تو بے زباں ہو بولے تو خاک بولے
کوئی حسین صُورت او گور تو جو پائے — کاش اُس پہ رحم آئے کم ہو اسکو تو نہ کھائے
جو چھین لے دلوں کو حُسن شباب پاکر — ہوتا ہی رنج اُسکی مٹی خراب پاکر
زلفوں کے گھونگھروں سو جو دل پہ جال ڈالے — افسوس ہو اُسے تو بے رحم بے سکے کھالے
مُردہ حلال تجھ کو انسان حلال تجھ کو — مذہب کا کیوں نہیں ہو آخر خیال تجھ کو
باہر چراغ روشن اور گور میں اندھیرا — وہ شب ہو شوق ایسی جس کا نہیں سویرا
ظُلمت سو منتشر ہو جس دم دماغ یارب — ایماں کا نُور کردے روشن چراغ یارب

احمد علی شوق قدوائی

داستانِ شوق

شوقِ بہار میں کوئی دیکھے بہارِ شوق — دیوانہ ہوں چمن کا غرہ ہے کاروبارِ شوق
مانا کہ جامِ وصل ہی لبریز صد نشاط — رُکتا ہو کوئی گریہ بے اختیارِ شوق
پرچم ہر گلِ امید سے دامنِ خیال کا — کتنا نظر فریب ہو نقش و نگارِ شوق

نے دام تھا کہیں نہ کہیں صیاد گھات میں — اس صیدگاہِ عشق میں ہم ہیں شکارِ شوق

تجھ کو قسم وفا کی، نہ رکھنا قدم دریغ — اُٹھے جو کوئے عشق سے ظالم غبارِ شوق

بیتابیاں بگاڑ نہ دیں میرے کام کو — رعبِ جمال کا شکے ہو پردہ دارِ شوق

فرطِ حیا سے تیری تو نیچی نگاہ ہے — بیتاب کر نہ دے نگہِ بیقرارِ شوق

بدمست ہوں تصورِ جاناں کے جام سے — دیتا ہوں دل کو مژدہ بوس و کنارِ شوق

اتنی ہی ہے خبر کہ ہوں سر تا سر اشتیاق — میں جانتا نہیں جو بتاؤں شمارِ شوق

پیشِ نظر ہے گرمی ہنگامۂ قدیم — ہے یادِ عہدِ شوق مجھے یادگارِ شوق

وحشت لگا کے چھوڑ گیا جسم کو بھی آگ
دل پھونک کر رہیگا نہ یونہیں شرارِ شوق

رضا علی وحشت

ہُوالباقی

میں بڑا ہی سخت جان ہوں غرّہ رمضان ۱۳۲۶ھ کی بلا انگیز تاریخ کو مجھ پر مصیبتوں اور آفتوں کا جو پہاڑ یک بیک ٹوٹ پڑا اُس کے نیچے آسمان بھی پسکر سُرمہ ہو جاتا مگر میں ابھی تک زندہ ہوں۔ رودِ موسیٰ کی قیامت آفریں طغیانی دکن کی تاریخ میں تو ہمیشہ یادگار رہیگی۔ لیکن میرے صفحۂ دل پر اُس نے رنج و الم درد و کرب یاس و حسرت کے جو آتشیں نقش مرتسم کئے ہیں وہ کسی طرح نہ مٹیں گے۔

دوستوں کی فرمائش ہے کہ اس ہولناک واقعہ کے متعلق جسکی یاد سے میری رُوح لرزتی ہے دماغ چکراتا ہے۔ اپنی قوتِ حافظہ پر ظلم اور ناظرینِ مخزن کی لاعلمی

کے خیال سے جو کچھ ہو سکے سپرد قلم کروں۔ لیکن افسوس تو یہ ہو کہ نہ دماغ کام دیتا ہو نہ قلم۔ لکھوں تو کیا لکھوں۔ خیال میں وہ اگلی سی رعنائی نہیں اور قلم سے گذشتہ روانی مفقود ہو ؎

سر کنم نالہ اگر تاب شنیدن داری سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

سید احمد حسین امجد

میں مورد حرمان و گرفتار بلا ہوں ماں باپ سے بچھڑا ہوا بچوں سے جدا ہوں
گہ محو فغاں ہوں کبھی مصروف بکا ہوں معلوم نہیں خود مجھے۔ میں کون ہوں کیا ہوں
بیہوش کبھی ہوں۔ کبھی ہوجاتا ہوں سکتا
وہ عالم حیرت ہو کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

افسانہ کہوں کیا دل بیتاب و تواں کا کیا ذکر کروں۔ رنج و غم و درد نہاں کا
ہوتا نہیں کمبخت اثر آہ و فغاں کا ہے کون کہ ہمدرد بنے سوختہ جاں کا
کرواقف ماتیست کہ از دیدہ چہا رفت
سیلاب سرشک آمد و طوفان بلا رفت

جو ہم نے سہا ہو نہ سہا ہوگا کسی نے دیکھا ہو جو کچھ ہم نے۔ وہ دشمن بھی نہ دیکھے
کچھ ایسے دیئے چرخ ستمگار نے چرکے یک لخت ہوئے قلب و جگر کے کئی ٹکڑے
لختے بردا ز دل۔ گذرد ہر کہ ز پیشم
من قاش فروش دل صد پارہ خویشم

رونے کے سوا کام نہیں ہر کوئی دن بھر منظور نظر ہو نہیں سکتا کوئی منظر
تاریک ہو دنیا مری نظروں میں سراسر سورج کو سمجھتا ہوں میں جگنو کے برابر
در زندگیم روز مرا نور نماندہ است
در عمر مرا جز شب دیجور نماندہ است

ناکامیوں نے دل میں مچا رکھا ہے اندھیر   چلتی ہے تمناؤں پہ مایوسی کی شمشیر
جینے سے خدا کی قسم اب ہو گیا جی سیر   پھر آنے میں کس واسطے کرتی ہے اجل دیر

ہاں اے ملک الموت! ازیں بند رہا کن
سنجے بمنِ سوختۂ بے سر و پا کن

اے وائے مری تقدیر۔ میں دنیا میں جب آیا   چالیسویں دن ہی نہ رہا باپ کا سایا
جو باقی تھے۔ دریا نے کیا انکا صفایا   کمبخت نے اک دم میں عزیزوں سے چھڑایا

زخمِ دلِ صد چاک ہم اب کس کو دکھائیں؟
افسانۂ شوریدہ سری کس کو سنائیں؟

وہ رات کا سناٹا۔ وہ گھنگھور گھٹائیں   بارش کی لگاتار جھڑی۔ سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا۔ وہ چیخوں کی صدائیں   وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں

پانی کا وہ زور۔ اور وہ دریا کی روانی
پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ سکے پانی

دم لینے کی طاقت تھی۔ نہ ستانے کی تاب آہ   تھی زندگیٔ خرد و کلاں نقش بر آب آہ
کرتی تھی الگ سیلِ رواں۔ خانہ خراب آہ   لوٹے کی طرح آنکھیں بدلتے تھے حباب آہ

جاں لینے کو ہر اک متنفس کے بڑھی تھیں
بے وجہ نہیں تیوریاں موجوں کی چڑھی تھیں

پابوسیٔ دریا نے غضب ڈھا دیا کیسا   تاریکیٔ شب میں عجب اندھیر تھا برپا
ٹخنوں سے کمر تک بڑھا۔ پھر سینہ تک آیا   اونچا ہوا جب سینہ سے۔ پھر تا بگلو تھا

شب بھر رہے سب پانی میں۔ فوارے کے مانند
ہوتے ہی سحر۔ ڈوب گئے تارے کے مانند

مادر کہیں اور میں کہیں با دیدۂ پُرنم   بی بی کہیں۔ اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم

عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم　　کیوں رات نہ ہو۔ ڈوب گیا نیرِ اعظم

(یعنی اعظم النسا)

سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے

حیرت تھی۔ کہ دن کو نظر آنے لگے تارے

بیٹی! نہ تجھے باپ نے افسوس بچایا　　دستِ ستمِ سیلِ فنا سے نہ چھڑایا

دریا نے ترے حال پہ کچھ رحم نہ کھایا　　کیا بھولی سی صورت پہ اُسے رحم نہ آیا

یہ جسم ترا پھول سا۔ دیواروں سے ٹکرائے

سیلاب میں بہ جائے تری ننھی سی جاں۔ ہائے

فرقت میں تری کیا کہوں۔ کیا گذری ہے مجھ پر　　ہر وقت ہوا جاتا ہے دل آپ سے باہر

ہے آمد و شد سانس کی۔ چلتا ہے اک خنجر　　بھرتا نظر آتا نہیں۔ زخمِ دلِ مُضطر

تو عزمِ سفر کردی و خستی جگرِ ما

بستی کمرِ خویشتن و شکستی کمرِ ما

غم چٹکیاں لے لے کے نہ کیوں روح کو تڑپائے　　آتی ہے کہاں دل سے نہ ہر وقت صدا ہائے

کیوں چشمِ جہاں بیں میں اندھیرا نہ چھا جائے　　جب نورِ نظر ہی نہ ہو۔ کیا خاک نظر آئے

روشن مرے کاشانۂ تاریک کو کر جا

اے نیرِ اعظم! مری آنکھوں میں اُتر جا

مانا۔ کہ ہے دنیائے دُنی منزلِ فانی　　دو روز میں مٹ جاتی ہیں لذاتِ جہانی

پر۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی ہو جائیگی کہانی　　دل ہی میں رہی آرزوئے تسمیہ خوانی

باقی تھیں بہت سی ابھی۔ اعظم! تری رسمیں

تنگ آ گئی دُنیا سے تو کیوں چار برس میں

وہ بوٹا سا قد۔ اور وہ ڈھلکے ہوئے رخسار　　وہ چاند سی پیشانی تری مطلعِ انوار

وہ ابروئے خمدار تری۔ ننھی سی تلوار　　وہ آنکھیں جنہیں دیکھ کر دشمن بھی کرے پیار

تیغِ اجل! اک آن میں تڑپا گئی تجھکو
اے نورِ نظر! کس کی نظر کھا گئی تجھکو

وہ چاند سی صورت مجھے اے چاند دکھا جا | کچھ میٹھی سی باتیں لبِ نازک سے سنا جا
باقی نہیں اب صبر کی سینہ میں ذرا جا | چھاتی سے پھر اکبار لگا لوں تجھے آجا
رستہ ترا تکتے ہوئے تنگ آگئیں آنکھیں
اے نورِ نظر! دیکھ - کہ پتھرا گئیں آنکھیں

دنیا کا طریقہ ہے - کہ جب مرتا ہے انساں | رو دھو کے غرض کرتے ہیں تکفین کا ساماں
لیجاتے ہیں سب مل کے سوئے شہرِ خموشاں | ہاتھوں سے تہِ خاک اُسے کرتے ہیں پنہاں
مٹی کا لگا دیتے ہیں انبارِ گراں ایک
کہتے ہیں موئے آدمی کا ہے یہ نشاں ایک

کرتا ہے اگر تنگ بہت ہی دلِ مضطر | بیساختہ تربت سے لپٹ جاتے ہیں جاکر
دو پھول چڑھا دیتے ہیں بیکس کی لحد پر | کرتے ہیں خطاب اُس سے کبھی رو رو کے دن بھر
فی الجملہ حرارت تو نکل جاتی ہے دل کی
گو کچھ نہ ہو - ہوتی ہے مگر پھر بھی تسلی

کس جا سے بس اب ڈوبی ہوئی نعش کو لاؤں | مٹی کا پتا کیا ہے - کہاں بی بی کو پاؤں
دوں کس کو کفن - کس کا میں تابوت بناؤں | ہے قبر کہاں - پھول کہاں جاکے چڑھاؤں
ہے ہے - ہدفِ رنج و محن کر گئیں اماں
افسوس - کہ بے گور و کفن مر گئیں اماں

اے موسیِ فرعون صفت! کچھ تو کرم کر | اے موج! ذرا دیکھ - مری حالتِ مضطر
ہاں اے لبِ ساحل! نہ رکھ اب مجھ کو مکدر | کہدے - کہ کہاں ہے مرا کھویا ہوا گوہر
ہاں اے صدفِ صاف! خدا کے لئے منہ کھول

چُپ کیوں ہو! تو اے ماہیِ سر بر زدہ کچھ بول

خاموش تو کس واسطے اے برقِ تپاں ہو　　　آخر ترے مُنہ میں بھی تو اے رعد! زباں ہے

اے مہرِ جہاں تاب! مرا چاند کہاں ہو　　　کس چاہ میں وُہ یوسفِ گم گشتہ نہاں ہے

اے قافلہ ریگِ رواں! تو ہی بتا دے

کس جا ہو مری مادرِ مرحُومہ۔ پتا دے

جب انجمنِ عیش و طرب ہو گئی برباد　　　افسردہ بھلا کیوں نہ رہو۔ خاطرِ ناشاد

تنہائی میں آتی ہو عزیزوں کی اگر یاد　　　بیساختہ کرتا ہے دلِ غمزدہ فریاد

اشک آنکھوں سے جاری ہیں کبھی لب پہ فغاں ہو

مرنے کے لئے مرتے ہیں۔ یہ موت کہاں ہو

ہر وقت بچھی رہتی ہو دل میں صفِ ماتم　　　ہوتا نہیں رونا کبھی دم بھر کے لئے کم

سب چل بسے۔ باقی نہ رہا ایک بھی ہمدم　　　بیٹی کا۔ کہ بی بی کا۔ کہ مادر کا کروں غم

آتا نہیں اب آہ! سمجھ میں کوئی مضموں

حیراں ہُوں۔ کہ دو آنکھوں سے کس کس کو میں روؤں

جنگل سے سروکار۔ نہ جی لگتا ہو گھر میں　　　غم۔ شام و سحر چُٹکیاں لیتا ہو جگر میں

پھرتی ہو عزیزوں ہی کی تصویر نظر میں　　　سو مرتبہ یاد آتی ہو ماں۔ آٹھ پہر میں

سنگِ غمِ مادر دلِ نازک پہ گراں ہے

یہ زیست خدا کی قسم اب کاہشِ جاں ہے

لِلّٰہ یہ بگڑی ہُوئی تقدیر بنا لو　　　ہیں خاک پہ گرنے کو ہوں۔ لو! جلد سنبھالو

امجد کو بھی۔ اعظم کی طرح پاس بُلا لو　　　اِکبار ذرا پھر سے مجھے چھاتی سے لگا لو

دل میں مرے اب صبر کی طاقت نہیں۔ اماں!

دُنیا میں بغیر آپ کے راحت نہیں۔ اماں!

اُٹھنے کی طاقت نہیں سست و پا ہیں بے زور ہوں میں　　　پامال زمانہ صورتِ مور ہوں میں
اماں! نہ سمجھنا کہ جہاں میں خوش ہوں　　　بے گور ہو تم۔ تو زندہ در گور ہوں میں
(امجد)

ترکِ محبّت

یہ جی میں ٹھانی ہے اب ملونگا کبھی نہ اُس شوخ سیمبر سے
بلائے جاں ہو یہ عشقبازی بچوں گا میں اس کی رہگذر سے

میں چیر ڈالوں گا ایسے دل کو کروں گا لیکن نہ یہ گوارا
کہ یہ تڑپ کر نہ مجھے ستائے بہائے خوں میری چشمِ تر سے

میں کاٹ ڈالوں گا ایسے پاؤں چلیں جو راہِ طلب میں تیری
مٹاؤں نقشِ قدم پرانے میں تیرے کوچے کی رہگذر سے

مجال کیا دل کے آئینے میں تمہاری تصویر مُنہ دکھائے
نسیم کی تاب ہے تمہاری شمیم لیکر چلے ادھر سے

خدا گواہ ہو کبھی نہ اُلفت کا نام دل سے زباں پہ لاؤں
جلا کے چھوڑوں گا صفحۂ دل سے حرفِ عشق آہ کے شرر سے

کہاں تری دید کی تمنا میں خانۂ چشم سے نکالوں
نگاہِ شوق اپنی تا کبھی پھر کرے نہ شوخی رُخِ قمر سے

نہ آپ جاؤں صنمکدے میں نہ غیر کو اس میں راہ دونگا
لگی ہے دل سے مٹا کے چھوڑوں صنم پرستی جہان بھر سے

میں بھول جاؤنگا یاد تیری کروں فراموش تیرے وعدے
رکھوں نہ خواہش جوابِ خط کی نہ مدعا کچھ پیامبر سے

اب مزے سے بسر کرینگے نہ دل میں سوزش نہ لب پہ نالہ
نہ منتظر آنکھ ہی رہیگی کسی کی آمد کی پیشتر سے

شب جدائی نہ ہوگی ہماری تو کون تارے گنا کرے گا
وصال کی رات ہی نہ ہوگی تو کیا گلہ مرغ سحر سے
نہ درد فرقت سے آنکھ اپنی مثال ساغر چھلک پڑے گی
نہ اب ڈبوئے گی ایک عالم یہ باندھ کر شرط ابر تر سے
مرے تقاضوں سے اب ملیگی تمہیں بھی فرصت کہ عاشقوں کو
دکھاؤ تم سحر سامری کے کرشمے ناز آفریں نظر سے
ادھر نہ ایفائے عہد پر اب کرے گا مجبور تم کو کوئی
ادھر نہ کھٹکا کوئی رہے گا نہ مجھے تمہارے اگر مگر سے
وہاں نہ سوتے میں تم کو ہرگز کرینگے بیچین میرے نالے
نہ کوئی شکوہ نہ کچھ شکایت یہاں مجھے آہ بے اثر سے
یہی یہ سب کچھ مگر بھلا اے نیاز آشنا تو تم بتاؤ
کروگے کیا جب نظر تمہاری لڑیگی اس شوخ کی نظر سے

بندہ نواب الدین نیاز

تازہ غزلیں

شرط ہو زینت آغوش گلستاں ہونا — ورنہ دشوار نہیں چاک گریباں ہونا
جوہر آئینۂ عقل ہے حیراں ہونا — عین جمعیت خاطر ہے پریشاں ہونا
حسرتیں کہتی ہیں رو رو کے دل عاشق سے — تیری تقدیر میں تھا گور غریباں ہونا
ہائے وہ وعدۂ فردا پہ مسرت میری — وعدہ کرتے ہی وہ ظالم کا پشیماں ہونا

نمک سے ہے ذوق جراحت پہ زیادہ طلبی — چاہئے کان نمک صرف نمکداں ہونا
اس کف خاک کو دوزخ میں کیوں جھونک دیا — جس کی تقدیر میں تھا قالب انساں ہونا
شمع فانوس سے کہتا ہے کسی کا انداز — تجھ کو پردہ میں بھی آتا نہیں پنہاں ہونا
صورت آئینہ اے کاش میسر ہو مجھے — لیکے ایک شخص کو آغوش میں حیراں ہونا
حسرتیں چند فراہم ہیں مگر گنتی ہے پاس — بہت آباد ہے دل چاہئے ویراں ہونا

دل تو قائل ہے زباں نے ہی یہ کہہ کہ مرزا
ہم کو غالب نے سکھایا ہے سخنداں ہونا

غزل

(نواب زبدۃ الدولہ سید محمد خاں مصاحب رفیق واجد علی شاہ مرحوم)

یارا کسے اُس کی ہمسری کا — لاکفولہ ولا شریکا
زیبا ہے تجھے ردا خودی کی — شایاں ہے تجھے نام خودسری کا
بھیجا ختم الرسل کو تو نے — ہے خاتمہ بندہ پروری کا
گیسو کو نہ حد سے بڑھنے دیجے — دعویٰ نہ کرے برابری کا
لیتی گئی ہوش سُرمئی کاکل — اُڑتا مرا تخت تھا پری کا
شمشاد کی آن ہے اجل کیا — دعویٰ ہے جو تجھ سے ہمسری کا
عالم کو کیا تباہ اے عشق — قائل ہوں تری ستمگری کا
کیا وحشت کی دھوپ کا اثر ہو — سایہ مجھ پہ تو ہے پری کا

دبتے نہیں خاک ہو کے بھی صید
دعویٰ ہے فلک سے ہمسری کا

غزل

جنوں کا تھا یہ قول اکثر زلیخا کے گریباں سے
ملا دونگا ترا رشتہ کبھی یوسف کے داماں سے

گلہ ہی شوق کو دستِ جنونِ فتنہ ساماں سے
ارے کمبخت الجھنا تھا کسی ظالم کے داماں سے

بقدرِ شوق ہوتی کاش وسعت کوچۂ لیلیٰ کی
غرض کیا وحشتِ مجنوں کو ورنہ کوہ و بیاباں سے

خلش نے اسکی ربط اتنا بڑھایا او تغافل خو
کہ دل کو عشق ہی اب تجھ سے بڑھکر تیرے پیکاں سے

یہی تھا مقتضائے عشق و حسن ای گل کہ زینت ہو
جگر کو میرے داغوں سے جبیں کو تیری افشاں سے

گلہ اے پاسِ غیرت سامنے غیروں کے اپنوں کا؟
دلِ بیکس ہو کیونکر بارکشِ جورِ عزیزاں سے

سخنور سیکھ لیں اوس بت سخنگو کی سخندانی
تری چشمِ سخنگو سے مری طبعِ سخنداں سے

ازل سے دیکھتی ہیں ہم کہ مشقِ فتنہ خیزی میں
قیامت دو قدم پیچھے رہی رفتارِ جاناں سے

ترا اقرار بھی رکھتا ہی اک انکار کا پہلو
نہیں سے ہی جو کچھ مطلب وہی مقصود ہاں سے

مرا دل وحشت آبادِ تمنا ہے بجا کہئے
خیالِ یار کی وابستگی اس محشرستاں سے

نمازِ عیدِ قرباں - رخ بسوئے کعبۂ ابرو
وضو اے طفلِ دل کر پہلے آبِ چشمِ گریاں سے

قیامت ہی کسی پردہ نشیں کا پردہ در ہونا
سرشکِ چشم میں محجوب کیا کیا دردِ پنہاں سے

سوالِ بوسہ اے رعب او رو دیکھی یوں سرِ محفل
نکلوائے گی اک دن ناصبوری غنچہ دہاں سے

ابوالفتوح رعب

غزل

شعلہ ہا در دل ز تاثیرِ دعا افتادہ است
بال ما بیتاب را برق از نوا افتادہ است

عارفاں را نیک خوئی جوہرِ تہذیبِ ما
بلبلاں را بوئے گل دامِ بلا افتادہ است

ما نہ خوش شوقیِ یاراں دلیلِ دشمنی است
لب بخندہ دین زیدیکہ جدا افتادہ است

ناتوانی از سیہ چشماں نظربازی مکن	عشوۂ جادو نگاہاں فتنہ زا افتادہ است
تیرہ دل را گر جوانی رفت فرسنج فالی است	پیشتر از چاہ اعمیٰ را عصا افتادہ است
عشق را در ہر دمے ہنگامہ بیتابی است	برق را شوق طپیدن جا بجا افتادہ است
ما نہ اہل ہنر ماندہ بہ پیش منعماں	مردہ لب تشنہ بر آب بقا افتادہ است
اضطراب دل گواہ جلوۂ یار است و بس	عکس در آئینہ از موج صفا افتادہ است
تیرہ دل را کام دل از ما نہ گمراہی است	دزد را تاریکی شب رہنما افتادہ است

شمع ساں شمسی ہمی سوزیم و خاموشیم ما
توتیا از داغ دل در کام ما افتادہ است

غزل

اٹھایا پردہ حیرت نے سمہائے جدائی کا	بنا پہلو میں دل آئینہ انکی خود نمائی کا
ہوئی آزاد دام ہجر سے بلبل بہار آئی	چٹک کر بولنا غنچوں کا مژدہ ہے رہائی کا
چل اے شوق شہادت آزما لیں آج تجھکو بھی	ارادہ آج وہ رکھتے ہیں خنجر آزمائی کا
نہ اٹھا میں سر منزل جو بیٹھا نقش پا بنکر	نہ نکلا کام کچھ مجھ سے میری بے دست و پائی کا
خیال بت سے ہم ہے دل زاہد خدا حافظ	نہ ٹوٹے سنگ سے ٹکرا کے شیشہ پارسائی کا
کیا آزاد احسان نگاہ شوق سے مجھ کو	اڑایا رنگ حیرت نے تری بے اعتنائی کا
دل حیراں میں حسن یار کے لاکھوں تلون ہیں	اس آئینہ میں گویا عکس ہے ساری خدائی کا
خدا کا شکر پہنچے سایہ بنکر کوئے جاناں تک	نکالا حوصلہ افتادگی نے جبہ سائی کا

لیا کرتا ہوں میں ذوق جراحت تیغ قاتل سے
مرا ہر زخم دل توفیق کاسہ ہے گدائی کا

تمہارے دل میں کہ آنکھوں میں گھر کروں کہ نہیں — تمہیں کہو کہ کہیں میں بسر کروں کہ نہیں

فلک بھی ہجر کی شب ہے ستم شریک اس کا — خدا سے پوچھ رہا ہے سحر کروں کہ نہیں

ہے اب تو فیصلۂ آخری کا خواہاں عشق — تمہارے حسن پہ میں منحصر کروں کہ نہیں

اسے بھی ان کی نزاکت پہ رحم آتا ہے — کہ آہ سوچ رہی ہے اثر کروں کہ نہیں

جنوں میں صبر ہے داغوں کے چند ٹکڑوں پر — کسی طرح سے میں آخر گزر کروں کہ نہیں

جو اس کے سر میں نزاکت سے درد ہو تو پھر — میں اس سے شکوۂ دردِ جگر کروں کہ نہیں

بہت بڑھا میرے جینے سے شوقِ قصۂ درد
میں جان دے کے اسے مختصر کروں کہ نہیں

احمد علی شوق قدوائی

اب دیکھتے ہیں مجھکو وہ خود دیکھنا مجھے — حیرت کے صدقے جس نے کیا آئینا مجھے

اے چشمِ یار اتنا بتا دے ذرا مجھے — یہ تو نے اک نگاہ میں کیا کر دیا مجھے

خوش ہوں کہ دردمند تغافل نہیں ہوں میں — یعنی کرم ہے یہ ستمِ ناروا مجھے

اے آرزوئے دید خدارا نہیں نہیں — تابِ تجلیِ نگہِ فتنہ زا مجھے

کیوں دشنہ ریز سینہ و دل ہے نگاہِ قہر — پہلے بتا تو دیجیے میری خطا مجھے

وہ ہیں کہ شرم انکے لیے پردہ دارِ حسن — میں ہوں کہ شوقِ دید ہے بے انتہا مجھے

خودداریوں نے پردہ دوری بنا دیا — اے بیخودی خدا کیلئے تو اٹھا مجھے

اللہ رے تصورِ باطل کہ انتظار — لیکر چلا ہے جانبِ دربار ما مجھے

میں محوِ حیرت اور شبِ وصل مختصر — روتی ہے حسرتِ دلِ دردآشنا مجھے

اے نازِ یار اف رے تری بے نیازیاں — پھر پھر کے دیکھتی ہے مری التجا مجھے

ان حسرتوں کے ہاتھ سے ہوں جاں بلب بشیر
مل جائے کاش اک دلِ بے مدعا مجھے

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل ایگزامینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسروں نامور ڈاکٹروں والیانِ ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کے سند یافتہ ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سُرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے۔ ضعفِ بصارت۔ تاریکیٔ چشم۔ دھند جالا۔ پڑوال۔ غبار۔ پھولا سیل سرخی۔ ابتدائی موتیا بند ناخنہ۔ پانی جانا۔ خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم بجائے اور ادویہ کے آنکھوں کے مریضوں پر اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں۔ چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کی بھی حاجت نہیں رہتی بچے سے لیکر بوڑھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت اسلئے کم رکھی ہے کہ خاص و عام اس سرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں۔ قیمت فی تولہ جو سال بھر کیلئے کافی ہے۔ ممیرے کا سفید سرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ سے خالص ممیرہ فی ماشہ عسہ مصری سرمہ فی تولہ ۱۲؍ خرچ ڈاک ذمہ خریدار درخواست کے وقت اخبار کا حوالہ ضرور دیں۔ **المشتہر** پروفیسر ستیا سنگھ الحوالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور

ان سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ ممیرے کا سرمہ جو ستیا سنگھ الحوالیہ نے ایجاد کیا ہے بڑی بیش قیمت اور مفید دوا ہے بالخصوص مفصلہ ذیل امراض کے لئے بمنزلہ اکسیر ہے۔ آنکھوں سے پانی کا بہت جانا۔ دھند۔ سوزش۔ ہر قسم جسکو آنکھ آنا کہتے ہیں جلن اور کمزوری نظر۔ ناخنہ باہر اور اندر کی جھلی کا زخم اور ان سے پیپ کا گرنا۔ چونکہ اس سرمہ میں کوئی مضر کمیسیائی شے نہیں ہے۔ اسلئے ہر کسی کے لئے اس کا استعمال مفید ہے مفصلات میں جہاں لائق ڈاکٹروں کا ملنا مشکل ہو وہاں ایسی مفید دوا کو ضرور پاس رکھنا چاہئے۔ اس لئے میں بلا شک شبہ دیتا ہوں کہ مذکورہ بالا امراض کیلئے ممیرے کا سرمہ ضرور ہی مفید ہے راقم ڈاکٹر ایم۔ بی سانگل صاحب بہادر ایم ڈی ایم ایس سند یافتہ یونیورسٹی ایڈنبرگ انگلینڈ امرتسر

(۲) جناب سردار صاحب تسلیم میں نے آپکا ممیرے کا سرمہ استعمال کر کے میں تصدیق کرتا ہوں کہ بیشک یہ سرمہ کمزوری چشم کیلئے بہت مفید ہے۔ میری آنکھیں بالکل کمزور تھیں۔ لگاتار ایک پہر کام کرنے سے معذور ہو جاتا تھا۔ اب میری کیفیت ہے کہ صرف ۴ روز کے استعمال سے تین تین پہر تک تمام اچھی طرح کام کر سکتا ہوں۔ راقم میاں خورشید محمد خان خلف نواب حسین محمد خان صاحب بہادر رئیس اعظم ریاست بہاولپور

پانچ ہزار روپیہ انعام — اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی سندات میں سے جو ترتیب پا کر ہمارے پاس ہیں ایک کو بھی فرضی ثابت کر دے اسکو مبلغ پانچہزار روپیہ انعام دیا جائیگا۔ جو لاہور کے بنک میں اسی مطلب کے لئے مارچ ۱۹۰۶ء سے جمع کیا گیا ہے

فریڈرک اسٹرنس اینڈ کمپنی دوا سازان ڈیٹرائٹ ملک امریکہ کی مشہور عام ادویہ

اسٹرنس ہیڈیک کیور

ہر قسم کے واسطے بلا ضرر۔ زود اثر اور یقینی فائدہ رساں دوا نقلی مت خرید۔ صرف اسٹرنس کی اصل ہے ۱۲ قرص ۱۲

اسٹرنس منتھلائڈس

کسی قسم کی اور کیسی ہی شاید کی بیماری ہو اسکے پینے سے دور ہو جاتا ہے۔ [illegible] کوئی دوا نہیں آج تک کبھی ناکامیاب نہیں ہوئی بہترین [illegible] گولیوں [illegible] یقینی [illegible]

اسٹرنس زائیمول ٹوتھ پوڈر

دانتوں کو سفید مسوڑوں کو مضبوط اور خوشرنگ بنانے کو نہایت عمدہ [illegible] بنا ہے [illegible]

اسٹرنس کا رڈیل کیا ہے

یہ کاڈ مچھلی کے تازہ جگر کے تیل کا جوہر مفید ہے جس میں

پیپٹونیٹ آف آئرن مع ہائپو فاسفائٹس آف کیلسیم۔ سوڈیم۔ پوٹاسیم۔ مینگانیز شامل ہے اور وائلڈ چیری جیسے مفید اور با اثر اجزا شامل کئے گئے ہیں۔

اس میں بد [illegible] نہیں مرکب میں خاص کیمیاوی طور سے کشید کر کے کاڈ مچھلی کے تازہ جگر کا جوہر شامل ہے۔ روغنی بدبودار اجزا سے پاک خوش ذائقہ اور باشتہا جملہ مروجہ مرکبات مقویہ سے افضل و بہتر ہے۔ امراض [illegible] اور خاص کمزوری کے لئے نہایت مفید ہے اب کسی مریض کو مناسب نہیں ہے کہ اس مرکب کے ہوتے دوسرے [illegible] کے [illegible] مرکبات استعمال کرے۔ اس عجیب و غریب اور سب سے سادی [illegible] میں سب کے مفید اثر موجود ہیں۔

اسٹرنس کا رڈیل

(۱) کسی عطائی کا نسخہ نہیں ہے۔ (۲) دوران ساخت [illegible] ہاتھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) قیمت بہت گراں نہیں غریب امیر سب استعمال کر سکتے ہیں۔

(۴) کوئی شے جو مضر صحت یا کسی مذہب کے خلاف ہو نہیں ڈالی جاتی۔

گورنمنٹ امریکہ کے فوڈ اینڈ ڈرگس ایکٹ نمبر ۹۹ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۶ء کے بموجب اس مرکب کے جملہ اجزا کی پاکیزگی اور لطافت کی ضمانت کی جاتی ہے۔

[illegible] ادویہ ڈیٹرائٹ ملک امریکہ کے مفصل حالات میں [illegible] ڈیپو کشمیری دروازہ دہلی سے مفت اور بلا محصول طلب کرو